منازل العرفان

فی تفسیر القرآن الکریم

تالیف

شیخ التفسیر والحدیث
حضرت مولانا سید عبدالستار شاہ صاحب مدظلہم العالی

جلد سوم

بقیہ سورۃ البقرہ تا سورۃ آل عمران

جامعہ اسلامیہ دارالعلوم رحیمیہ
نیلا گنبد جمرک روڈ ۰ کوئٹہ

بسم الله الرحمن الرحيم

منازل العرفان

فی

تفسیر القرآن الکریم

شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا

سید عبد الستار شاہ صاحب مدظلہم العالی

جامعہ اسلامیہ دار العلوم رحیمیہ

نیلا گنبد سرکی روڈ ⊙ کوئٹہ

جل جلالہ بسم اللہ الرحمن الرحیم عم نوالہ

منازل العرفان

فی

تفسیر القرآن الکریم

جلد سوم

بقیہ سورۃ البقرہ تا سورۃ آلِ عمران

شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا

سید عبد الستار شاہ صاحب مدظلہم العالی

جامعہ اسلامیہ دار العلوم رحیمیہ

نیلا گنبد سرکی روڈ • کوئٹہ

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین منازل العرفان جلد سوم

	مضامین	صفحہ نمبر
☆	آیات ۲۱۱ تا ۲۱۲ معارف ومنازل	۲۲
☆	آیت ۲۱۳ معارف ومنازل	۲۶
☆	آیت ۲۱۴ معارف ومنازل	۳۳
☆	آیت ۲۱۵ معارف ومنازل	۳۶
☆	ایک تفسیر فائدہ:	۳۷
☆	آیت ۲۱۶ معارف ومنازل	۳۹
☆	مسئلہ	۴۲
☆	آیات ۲۱۷ تا ۲۱۸ معارف ومنازل	۴۳
☆	اَشہرِحرم میں حرمتِ قتال کا منسوخ ہونا	۴۴
☆	فائدہ:	۴۵
☆	ایک ضروری تنبیہ	۴۶
☆	بدنصیب مرتد کے سارے اعمال غارت ہوجائیں گے	۴۶
☆	آیت ۲۱۹ معارف ومنازل	۴۸
☆	حرمتِ شراب کے چار ادوار	۴۹
☆	تدریجی احکام کا خلاصہ	۵۰
☆	شراب کے مظنونہ فوائد، اور واقعی مفاسد کا بیان	۵۰

☆	میسر، قمار اور جوا کا بیان	۵۳
☆	شراب اور قمار کے سماجی اور اجتماعی نقصانات	۵٦
☆	آیت ۲۲۰ معارف ومنازل	۵۹
☆	آیت ۲۲۱ معارف ومنازل	٦۱
☆	شان نزول آیتِ مناکحت	٦۲
☆	آیت کریمہ کا خلاصہ	٦۲
☆	نکاح میں کفو و برابری کی حیثیت	٦۷
☆	آیات ۲۲۲ تا ۲۲۳ معارف ومنازل	٦۸
☆	کیا حیض عذاب ہے، یا کسی گناہ کا نتیجہ؟	٦۹
☆	حیض، نفاس اور استحاضہ کا حکم	٦۹
☆	آیات ۲۲۴ تا ۲۲۷ معارف ومنازل	۷۵
☆	قسم کی اقسام	۷٦
☆	ایلائی کا مسئلہ	۷۷
☆	فائدہ	۷۸
☆	آیت ۲۲۸ معارف ومنازل	۷۹
☆	مغربی معاشرہ پر ایک نظر	۸۰
☆	قُرُوء سے کیا مراد ہے؟	۸۲
☆	مسئلہ	۸۳
☆	آیت ۲۲۹ معارف ومنازل	۸۵
☆	طلاق کی قسمیں	۸٦

☆	خلع کا بیان اور تفصیلات	۸۶
☆	خلع کے متعلق چند ضروری باتیں	۸۷
☆	آیت ۲۳۰ معارف ومنازل	۸۸
☆	تین طلاق، اور اس کے احکام	۸۹
☆	اہل سنت والجماعت کے دلائل	۹۱
☆	حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہما	۹۳
☆	حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کے جوابات	۹۴
☆	آیت ۲۳۱ معارف ومنازل	۹۶
☆	آیت ۲۳۲ معارف ومنازل	۹۷
☆	شان نزول	۹۸
☆	اسی شان نزول کی روشنی میں آیت کا کریمہ کا مطلب سمجھئے	۹۸
☆	آیات ۲۳۳ معارف ومنازل	۱۰۱
☆	حقیقی ماں کی تین صورتیں	۱۰۲
☆	مدت رضاعت	۱۰۲
☆	زوجہ کا نفقہ ہر حال میں مرد پر واجب ہے، یہ رضاع کے ساتھ وابستہ نہیں	۱۰۳
☆	آیت ۲۳۴ معارف ومنازل	۱۰۵
☆	آیت ۲۳۵ معارف ومنازل	۱۰۸
☆	آیات ۲۳۶۔۲۳۷ معارف منازل	۱۰۹
☆	فائدہ	۱۱۱
☆	آیات ۲۳۸۔۲۳۹ معارف ومنازل	۱۱۲

☆	آیات ۲۴۰ تا ۲۴۲ معارف ومنازل	۱۱۴
☆	آیت ۲۴۳ معارف ومنازل	۱۱۵
☆	فائدہ	۱۱۷
☆	آیات ۲۴۴۔۲۴۵ معارف ومنازل	۱۱۸
☆	آیات ۲۴۶ تا ۲۴۸ معارف ومنازل	۱۲۳
☆	آیات ۲۴۹ تا ۲۵۲ معارف ومنازل	۱۲۸
☆	فائدہ روح المعانی میں لکھا ہے کہ طالوت کے لشکر میں تین قسم کے لوگ تھے	۱۳۲
☆	تِلْكَ الرُّسُلُ آیت ۲۵۳ معارف ومنازل	۱۳۵
☆	تقدیر پر ایمان لانا فرض ہے، اور تقدیر نا قابلِ فہم ہے	۱۳۹
☆	فائدہ مہمہ	۱۴۰
☆	اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت کا بیان	۱۴۰
☆	آیت ۲۵۴ معارف ومنازل	۱۴۱
☆	آیت ۲۵۵ معارف ومنازل	۱۴۳
☆	آیت الکرسی کے فضائل	۱۴۳
☆	آیت الکرسی کا مجرّب عمل	۱۵۷
☆	آیت ۲۵۶ تا ۲۵۷ معارف ومنازل	۱۵۸
☆	تاریخ کا ایک ورق	۱۶۲
☆	طاغوت کیا ہے؟ علماء کے اقوال	۱۶۷
☆	آسمانی فیصلہ کہ مسلمانوں کا دوست اللہ ہے، اور کافروں کا شیطان ہے	۱۶۹
☆	آیت ۲۵۸ معارف ومنازل	۱۷۱

☆	فائدہ	۱۷۲
☆	آیت ۲۵۹ معارف ومنازل	۱۷۶
☆	فائدہ	۱۸۰
☆	فائدہ	۱۸۳
☆	فائدہ	۱۸۳
	آیت ۲۶۰ معارف ومنازل	۱۸۴
☆	حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام ومرتبہ	۱۸۴
☆	علم کی اقسام اور مراتب	۱۸۶
☆	ایک مثال کے ذریعے وضاحت	۱۸۶
☆	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۱۸۸
☆	آیات ۲۶۱ تا ۲۶۳ معارف ومنازل	۱۸۹
☆	آیت کریمہ کی تفسیر اور ترغیب	۱۹۰
☆	فائدہ کسی نیک کام میں پیسہ خرچ کرنے کی تین ہی صورتیں ہو سکتی ہیں	۱۹۱
☆	صدقات کی قبولیت کی شرائط	۱۹۲
☆	فائدہ	۱۹۳
☆	آیات ۲۶۴ تا ۲۶۵ معارف ومنازل	۱۹۵
☆	آیت ۲۶۶ معارف ومنازل	۱۹۸
☆	آیات ۲۶۷ تا ۲۶۹ معارف ومنازل	۱۹۹
☆	حکمت کے معنی اور تفسیر	۲۰۲
☆	فائدہ	۲۰۳

☆	آیات ۲۷۰ تا ۲۷۱ معارف ومنازل	۲۰۵
☆	آیت ۲۷۲ معارف ومنازل	۲۰۸
☆	آیت ۲۷۳ معارف ومنازل	۲۰۹
☆	اصحاب صفہ کی بے پناہ استغناء	۲۱۰
☆	آیت ۲۷۴ معارف ومنازل	۲۱۲
☆	آیات ۲۷۵ تا ۲۷۷ معارف ومنازل	۲۱۳
☆	سودخور کا عبرت ناک انجام	۲۱۵
☆	اب سود کی حرمت کی حکمت کا بیان	۲۱۷
☆	آیات ۲۷۸ تا ۲۷۹ معارف ومنازل	۲۱۹
☆	حکایت	۲۱۹
☆	سودخوروں کے خلاف اعلانِ جنگ	۲۲۰
☆	اسلامی نظام معاش کی ہمہ گیر برکات	۲۲۱
☆	آیات ۲۸۰ تا ۲۸۱ معارف ومنازل	۲۲۵
☆	آیات ۲۸۲ تا ۲۸۳ معارف ومنازل	۲۲۹
☆	ضابطہ شہادت	۲۳۰
☆	فائدہ	۲۳۴
☆	حکایت	۲۳۶
☆	آیت ۲۸۴ معارف ومنازل	۲۳۷
☆	قصد کے درجات	۲۴۰
☆	فائدہ	۲۴۲

☆	خلاصہ	۲۴۲
☆	آیت ۲۸۵ معارف ومنازل	۲۴۲
☆	سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں کے فضائل	۲۴۳
☆	تفصیل	۲۴۴
☆	ایمانیات اور اصول ایمان کی تفصیل	۲۴۶
☆	آیت ۲۸۶ معارف ومنازل	۲۴۸
☆	سورۂ آل عمران	۲۵۴
☆	ربط ومناسبت	۲۵۶
☆	مختصر موضوع	۲۵۷
☆	آیات ۱ تا ۲ معارف ومنازل	۲۵۹
☆	لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اسم اعظم ہے	۲۶۰
☆	ایک ضروری وضاحت	۲۶۲
☆	آیات ۳ تا ۴ معارف ومنازل	۲۶۳
☆	توحید کا وظیفہ سارے انبیاء علیہم السلام میں مشترک ہے	۲۶۴
☆	فائدہ	۲۶۷
☆	آیات ۵ تا ۶ معارف ومنازل	۲۶۹
☆	آیت ۷ معارف ومنازل	۲۷۰
☆	متشابہات کے متعلق اصولی بات (قرآن کریم میں تین قسم کی آیتیں ہیں)	۲۷۱
☆	آیت ۸ تا ۹ معارف ومنازل	۲۷۵
☆	آیات ۱۰ تا ۱۲ معارف ومنازل	۲۷۷

☆	آیت ۱۳ معارف ومنازل	۲۸۰
☆	شہدائے بدر رضی اللہ عنہم کے نام	۲۸۲
☆	آیات ۱۴ تا ۱۷ معارف ومنازل	۲۸۴
☆	دنیا کی محبت فطری ہے، اور اشیاء ستہ کی تزیین کی حکمت کا بیان	۲۸۶
☆	جنت کا مختصر تعارف	۲۹۵
☆	فائدہ	۳۰۱
☆	آیت ۱۸ معارف ومنازل	۳۰۱
☆	آیت کریمہ کے فضائل، اور شان نزول	۳۰۲
☆	آیات ۱۹ معارف ومنازل	۳۰۴
☆	نجات اخروی صرف اسلام میں منحصر ہے	۳۰۷
☆	فائدہ	۳۰۹
☆	آیت ۲۰ معارف ومنازل	۳۱۰
☆	آیات ۲۱ ۲ معارف ومنازل	۳۱۲
☆	آیات ۲۴ تا ۲۵ معارف ومنازل	۳۱۵
☆	آیات ۲۶ تا ۲۷ معارف ومنازل	۳۱۸
☆	شان نزول اور تلقین دعاء	۳۱۹
☆	آیات ۲۸ تا ۳۰ معارف ومنازل	۳۲۸
☆	کفار اور غیر مسلموں کے ساتھ محبت قطعاً حرام ہے	۳۳۳
☆	دوستی اور دشمنی میں اللہ تعالیٰ کی رضا ضروری ہے	۳۳۴
☆	آیات ۳۱ تا ۳۲ معارف ومنازل	۳۳۶

☆	محبت کا مفہوم اور خلاصہ	۳۳۷
☆	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی اللہ تعالیٰ کی محبت کی چابی ہے	۳۴۱
☆	آیات ۳۳ تا ۳۴ معارف ومنازل	۳۴۲
☆	آیات ۳۵ تا ۳۷ معارف ومنازل	۳۴۵
☆	اللہ تعالیٰ کے نام پر نذر جائز، اور غیر اللہ کے نام پر گناہ اور شرک ہے	۳۴۶
☆	حضرت مریم صدیقہ علیہا السلام کی کفالت	۳۴۷
☆	آیات ۳۸ تا ۴۱ معارف ومنازل	۳۴۹
☆	آیات ۴۲ تا ۴۴ معارف ومنازل	۳۵۲
☆	قرعۂ فال حضرت زکریا علیہ السلام کے نام پر	۳۵۳
☆	حضرت مریم علیہا السلام، حضرت آسیہؓ، حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی فضیلت	۳۵۴
☆	آیات ۴۵ تا ۴۷ معارف ومنازل	۳۵۶
☆	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش	۳۵۶
☆	کم سنی، بچپن میں کلام کرنے والی شخصیات	۳۵۸
☆	آیات ۴۸ تا ۵۱ معارف ومنازل	۳۶۰
☆	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عظیم الشان معجزات	۳۶۰
☆	آیات ۵۲ تا ۵۴ معارف ومنازل	۳۶۳
☆	آیات ۵۵ تا ۵۸ معارف ومنازل	۳۶۶
☆	آیات ۵۹ تا ۶۳ معارف ومنازل	۳۶۸
☆	فائدہ	۳۷۰
☆	مباہلہ کی حقیقت	۳۷۰

☆	واقعہ مباہلہ اور ردّ روافض	۳۷۱
☆	فائدہ	۳۷۲
☆	آیت ۶۴ معارف ومنازل	۳۷۳
☆	فائدہ	۳۷۸
☆	آیات ۶۵ تا ۶۸ معارف ومنازل	۳۷۹
☆	دینی ومذہبی نسبت، اور اس کی اقسام	۳۸۴
☆	آیات ۶۹ تا ۷۱ معارف ومنازل	۳۸۶
☆	آیات ۷۲ تا ۷۴ معارف ومنازل	۳۸۹
☆	تنبیہ	۳۹۲
☆	فائدہ	۳۹۳
☆	آیات ۷۵ تا ۷۶ معارف ومنازل	۳۹۳
☆	آیات ۷۷ تا ۷۸ معارف ومنازل	۳۹۶
☆	اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے محروم لوگ	۴۰۰
☆	آیات ۷۹ تا ۸۰ معارف ومنازل	۴۰۳
☆	آیات ۸۱ تا ۸۲ معارف ومنازل	۴۰۸
☆	اللہ تعالیٰ سبحانہ کے تین عہد	۴۰۸
☆	میثاق سے کیا مراد ہے، اور یہ کہاں ہوا؟	۴۰۹
☆	تمام انبیاء علیہم السلام سے ایمان ونصرت کا مطالبہ	۴۱۰
☆	سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت عامہ جامعہ	۴۱۰
☆	آیات ۸۳ تا ۸۴ معارف ومنازل	۴۱۳

☆	فائدہ احکام کی دو قسمیں ہیں	۴۱۴
☆	آیات ۸۵ تا ۸۹ معارف ومنازل	۴۱۵
☆	اسلام کی تعریف اور اس کا مدارِ نجات	۴۱۶
☆	آیات ۹۰ تا ۹۱ معارف ومنازل	۴۱۹
☆	فائدہ	۴۲۰
☆	لَنۡ تَنَالُوۡا	۴۲۲
☆	مسائل ثمانیہ جزئیہ	۴۲۵
☆	آیات ۹۳ تا ۹۵ معارف ومنازل	۴۲۷
☆	آیات ۹۶ تا ۹۷ معارف ومنازل	۴۳۱
☆	مسجد اقصیٰ کی بناء کا سلسلہ یہ ہے	۴۳۳
☆	کعبہ شریف کے فضائل بے شمار ہیں	۴۳۴
☆	فائدہ	۴۴۰
☆	آیات ۹۸ تا ۱۰۱ معارف ومنازل	۴۴۰
☆	آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ معارف ومنازل	۴۴۳
☆	مسمانوں کی اجتماعی قوت کے دو اہم اصول تقویٰ اور باہمی اتفاق	۴۴۴
☆	تقویٰ کا حقیقی مفہوم	۴۴۵
☆	اسلامی وحدت واتفاق کی بنیاد قرآن کریم ہے	۴۴۸
☆	قرآن پر ایمان رکھنے والوں سے درخواست	۴۵۰
☆	فائدہ	۴۵۲
☆	بہرحال! ان آیات میں مسلمانوں کے لیے چند ہدایات ہیں	۴۵۳

☆	مسلمانوں کی قومی اور اجتماعی فلاح دو چیزوں پر موقوف ہے	۴۵۴
☆	امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مسلمان پر فرض ہے	۴۵۸
☆	فائدہ	۴۵۹
☆	آیات ۱۰۵ تا ۱۰۹ معارف ومنازل	۴۶۰
☆	چہرے کی سفیدی، اور سیاہی سے کیا مراد ہے؟	۴۶۲
☆	سفید چہرے والے، اور سیاہ چہرے والے کون لوگ ہیں؟	۴۶۳
☆	فائدہ	۴۶۴
☆	نکتہ لطیفہ	۴۶۵
☆	آیت ۱۱۰ معارف ومنازل	۴۶۶
☆	اس امت کی خیریت کے چند اسباب وخصوصیات کا بیان	۴۶۹
☆	آیات ۱۱۱ تا ۱۱۵ معارف ومنازل	۴۷۱
☆	آیات ۱۱۶ تا ۱۱۷ معارف ومنازل	۴۷۸
☆	آیت ۱۱۸ معارف ومنازل	۴۸۱
☆	آیات ۱۱۹ تا ۱۲۰ معارف ومنازل	۴۸۳
☆	آیات ۱۲۱ تا ۱۲۲ معارف ومنازل	۴۷۸
☆	غزوۂ احد کا پس منظر	۴۸۸
☆	سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی جنگی ترتیب غیروں کی نظر میں	۴۸۹
☆	جنگ کا آغاز	۴۹۰
☆	اُحد کے واقعہ سے چند سبق	۴۹۱
☆	فائدہ	۴۹۲

☆	آیات ۱۲۳ تا ۱۲۵ معارف ومنازل	۴۹۴
☆	غزوۂ بدر میں نصرت کے تین وعدوں میں مناسبت	۴۹۷
☆	فائدہ	۴۹۸
☆	فائدہ	۴۹۸
☆	آیات ۱۲۶ تا ۱۲۹ معارف ومنازل	۴۹۹
☆	مطلب اور خلاصہ	۵۰۳
☆	آیات ۱۳۰ تا ۱۳۴ معارف ومنازل	۵۰۵
☆	حضرت علی (زین العابدین) ابن حسین رضی اللہ عنہ کا واقعہ	۵۱۴
☆	آیات ۱۳۵ تا ۱۳۸ معارف ومنازل	۵۱۵
☆	آیات ۱۳۹ تا ۱۴۳ معارف ومنازل	۵۱۹
☆	جنگ اُحد کی عارضی شکست کے اسباب	۵۲۱
☆	جنگ اُحد کا نہایت مختصر خلاصہ	۵۲۳
☆	آیات ۱۴۴ تا ۱۴۵ معارف ومنازل	۵۲۷
☆	خبر وفات میں حکمت الٰہی	۵۳۱
☆	تنبیہ	۵۳۲
☆	حکایت	۵۳۴
☆	آیات ۱۴۶ تا ۱۴۸ معارف ومنازل	۵۳۵
☆	ربط	۵۳۶
☆	آیات ۱۴۹ تا ۱۵۱ معارف ومنازل	۵۴۰
☆	آیات ۱۵۲ تا ۱۵۳ معارف ومنازل	۵۴۵

☆	فائدہ	۵۴۶
☆	شان صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین	۵۴۷
☆	خلاصہ یہ ہے کہ طلب دنیا دو قسم پر ہے	۵۴۸
☆	آیات ۱۵۴ معارف و منازل	۵۵۲
☆	فرمایا غزوۂ اُحد کی شکست تمہارے مقدر میں لکھی ہوئی تھی جس کی حکمت یہ ہے	۵۵۶
☆	فائدہ	۵۵۶
☆	آیت ۱۵۵ معارف و منازل	۵۵۶
☆	آیات ۱۵۶ تا ۱۵۸ معارف و منازل	۵۵۸
☆	آیات ۱۵۹ تا ۱۶۰ معارف و منازل	۵۶۳
☆	آیت کریمہ کا مختصر خلاصہ و تعارف	۵۶۴
☆	مشورہ اور اس کے فوائد و برکات	۵۶۵
☆	آیات ۱۶۱ تا ۱۶۳ معارف و منازل	۵۷۰
☆	قیامت کی رسوائی نہایت خطرناک اور تباہ کن ہے	۵۷۱
☆	ملکی بیت المال، سرکاری خزانہ، ملک اور حکومت میں چوری وخیانت کا بیان	۵۷۳
☆	واقعۂ عبرت	۵۷۴
☆	فائدہ	۵۷۵
☆	آیت ۱۶۴ معارف و منازل	۵۷۷
☆	آیات ۱۶۵ تا ۱۶۸ معارف و منازل	۵۸۲
☆	آیات ۱۶۹ تا ۱۷۱ معارف و منازل	۵۸۷
☆	شہداء فی الآخرۃ کی اقسام، اور ان کی فہرست کا بیان	۵۹۳

☆	آیات ۱۷۲ تا ۱۷۵ معارف ومنازل	۵۹۶
☆	آیات ۱۷۶ تا ۱۷۸ معارف ومنازل	۶۰۱
☆	آیت ۱۷۹ معارف ومنازل	۶۰۵
☆	آیت کریمہ کا خلاصہ	۶۰۷
☆	آیت ۱۸۰ معارف ومنازل	۶۰۸
☆	مختصر ایمان کی شاخوں کا بیان	۶۱۰
☆	آیات ۱۸۱ تا ۱۸۲ معارف ومنازل	۶۱۴
☆	آیات ۱۸۳ تا ۱۸۵ معارف ومنازل	۶۱۸
☆	آیت ۱۸۶ معارف ومنازل	۶۲۳
☆	آیت ۱۸۷ معارف ومنازل	۶۲۹
☆	فائدہ	۶۳۲
☆	آیات ۱۸۸ تا ۱۸۹ معارف ومنازل	۶۳۵
☆	آیات ۱۹۰ تا ۱۹۱ معارف ومنازل	۶۳۸
☆	آیات ۱۹۲ تا ۱۹۴ معارف ومنازل	۶۴۶
☆	آیت ۱۹۵ معارف ومنازل	۶۵۲
☆	آیات ۱۹۶ تا ۱۹۸ معارف ومنازل	۶۵۴
☆	آیت ۱۹۹ معارف ومنازل	۶۵۸
☆	آیت ۲۰۰ معارف ومنازل	۶۶۰
☆	رباط فی سبیل اللہ کی اقسام	۶۶۱
☆	رباط کی پہلی قسم اسلامی سرحدوں کی حفاظت	۶۶۲

☆	سورۂ آل عمران کی تلاوت کے فضائل	٦٦٣

سورۂ بقرہ

(آیت ۲۱۱ سے آخر تک)

سورۂ آل عمران

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

ترجمہ: آپ بنی اسرائیل سے پوچھیں کہ ہم نے ان کو کتنی واضح نشانیاں دیں، اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی نعمت کو تبدیل کرے گا اس کے بعد کہ وہ نعمت اس کے پاس پہنچ چکی، پس بیشک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے ﴿۲۱۱﴾ مزیّن کی گئی ہے دنیا کی زندگی ان لوگوں کے لئے جنہوں نے کفر کیا، اور وہ ٹھٹا کرتے ہیں ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے، اور وہ لوگ جو ڈرتے رہے وہ ان کے اوپر (بلند) ہوں گے قیامت کے دن، اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے بغیر حساب کے روزی دیتا ہے ﴿۲۱۲﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں یہ بتایا گیا کہ واضح دلائل اور انعامات پر شکر کرنا چاہئے، اگر کوئی ناشکری اختیار کرے تو تکوینی سزا کا حقدار ہوگا۔ موجودہ آیات میں اسی کے نمونہ اور مثال کا بیان ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل قوم پر ہر قسم کی نعمتوں کا دروازہ کھولا، اور انہیں طرح طرح کی ظاہری وباطنی نعمتوں سے نوازا۔ چار سو سالہ فرعونی غلامی سے نجات، فرعون کی ہلاکت، دریا کا ان کے لئے شق ہونا، اور دریا میں ان کیلئے بارہ راستوں کا بننا، چار ہزار پیغمبروں کی بعثت، موسیٰ علیہ السلام کے سارے معجزات، پتھر سے پانی کے چشمے کا جاری ہونا، اللہ تعالیٰ سبحانہ سے ہم کلامی، میدانِ تیہ میں بادلوں کا سایہ، روشنی کا ستون، منّ وسلویٰ کا نزول، تورات شریف کا نزول۔ تقریباً اسی سورۂ بقرہ میں چالیس کے قریب نعمتوں کا ذکر ہو چکا، مگر اس ناشکر اور نافرمان قوم نے کسی ایک نعمت کا بھی شکر بجا نہیں لایا، جس طرح ماقبل میں چالیس کے قریب نعمتوں کا تذکرہ ہوا۔ اسی طرح چالیس کے قریب ان کی نافرمانیوں کا تذکرہ بھی ہو چکا۔

جب یہ لوگ بجائے نعمتوں پر شکر کرنے کے الٹا نافرمانیوں میں مبتلا ہوئے، اور قصد وارادہ کے ساتھ گمراہیوں میں پھنس گئے، تو قانونِ الٰہی کے تحت مختلف سزاؤں اور طرح طرح کے عذابوں میں ڈالے گئے، حتیٰ کہ بندر وخنزیر کی شکل وصورت میں مسخ ہو کر ذلیل وخوار ہوئے۔ تو ارشاد فرمایا:

﴿سَلْ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذرا بنی اسرائیل کے علماء اور مذہبی پیشواؤں سے پوچھئے، دریافت کیجئے کہ ہم نے ان کو کتنی واضح نشانیاں عطا کیں؟ اور نعمتوں کی بارشیں برسائیں۔ یہ عظیم اور کثیر نعمتیں مادی بھی ہیں، اور روحانی بھی، جن کا ابھی تذکرہ ہوا، مگر انہوں نے ان نعمتوں کا بجائے شکر اور اطاعت کے ناشکری ونافرمانی کے ساتھ جواب دیا، اور جب ان کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی، تو اللہ تعالیٰ نے قانونِ مجازات، یعنی ﴿لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴾ [ابراھیم:۷] (اگرتم نے شکر ادا کیا تو میں لازماً اور زیادہ دوں گا، اور اگرتم نے ناشکری کی، تو بیشک میرا عذاب سخت ہے) کے تحت انہیں خوار وذلیل کر کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔
قانونِ مجازات کا دوسرا پہلو یہ ہے: ﴿وَمَن يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی نعمت کے پہنچ جانے کے بعد جو اسے بدل ڈالے، بجائے شکر والتزامِ طاعت کے ناشکری اور نافرمانی پر اتر آئے، تو ایسے مجرموں کو اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کا وجودِ مسعود سب سے اعلیٰ اور معیاری نعمت ہے۔ اس مجرم اور ناشکری قوم نے بجائے اتباع واطاعت کے چارسو کے قریب عظیم ہستیوں اور قابلِ قدر پیغمبروں کو شہید کیا۔ یہ اتنا ناقابلِ معافی جرم ہے کہ اس کی معافی کا کوئی امکان بھی نہیں ہے۔ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک عام مسلمان کا خون کعبہ شریف سے زیادہ محترم اور قیمتی ہے، چہ جائیکہ انبیاء علیہم السلام کے، جن کو اس برگشتہ قوم نے بلا قصور شہید کیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ربّ العزّت سبحانہ نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی اعلیٰ نعمت سے تعبیر فرمایا: ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ﴾ [إبراھیم:۲۸] کیا تو نے مشرکینِ عرب کو نہیں دیکھا، جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمت کے ساتھ کفر کیا؟ اس نعمت سے مراد سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارکہ ہے۔ [بخاري]

انبیاء کرام علیہم السلام مطلقاً اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت اس لئے شمار ہوئے کہ انسانیت کا شرف وکمال انہی پر موقوف ہے، کیونکہ انسانیت کا کمال وعروج روحانی ترقی پر موقوف ہے، اور عالمِ اسباب میں اس کی بنیاد دو چیزیں ہیں: علم اور عمل، اور یہ دونوں وحی الٰہی پر موقوف ہیں، یا یہ کہا جائے کہ یہ دونوں وحی الٰہی سے حاصل ہوتے ہیں، اور وحی الٰہی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے، اس وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کا سرچشمہ نبوت ہے، جس سے اوپر کوئی نعمت نہیں، لہٰذا فلاح وسعادت اگر کسی کو دستیاب ہوئی، یا اگر کوئی فلاح وسعادت کا طالب ہو، تو

سوائے اتباعِ نبوت کے دوسرا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو تبدیل کرتے ہیں، اور بجائے شکر کے ناشکری اور گمراہی اختیار کرتے ہیں، پس اس سرکشی کے اسباب مختلف ہوسکتے ہیں، مگر سب سے بڑا سبب حبِّ جاہ حبِّ مال اور حبِّ دنیا ہے، اسی بارے میں ارشاد ہے: ﴿زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، ان کے لئے دنیا کی زندگی مزیّن کی گئی ہے، جس پر وہ ہمہ تن جھکے ہوئے ہوتے ہیں، اور یہی وہ منحوس نظریہ ہے جو سارے شر و فساد کی جڑ ہے۔

جب کوئی دنیا کی محبت میں اس قدر غرق ہوجائے کہ صرف اسی کو اپنا مقصدِ حیات تصور کرے، تو پھر اس میں طرح طرح کی خرابیاں جڑ پکڑنے لگتی ہیں، اور وہ شخص **مجموعة الشر والفساد** بن جاتا ہے۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: "حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ"۔ [مشکوٰۃ] دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے۔ بہت سارے عالم، دانشور، عقلمند، عقل و دانش کے مالک جب حبِّ دنیا، اور متاعِ دنیا کے عشق و محبت میں مبتلا ہوجاتے ہیں، تو قابلِ رحم ہوجاتے ہیں۔ ان کا علم و ہنر، عقل و دانشمندی سب ضائع ہوجاتا ہے، پھر ان کے اندر وہ حرکات و اعمال پیدا ہوجاتے ہیں کہ جنہیں سن کر، اور دیکھ کر عام آدمی انگشت بدندان رہ جاتا ہے۔ ؎

اے بسا مرد خردمند و فہیم ☆ کثرت دنیا ترا کردہ لئیم

"لئیم" بمعنی کنجوس، بخیل اور ناداں کے ہیں۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو دنیا سے ایسے بچاتا ہے، جس طرح کوئی اپنے مریض کو مضر اشیاء سے بچاتا ہے۔ دنیا کی محبت سے پہلے جو چیز انسان میں پیدا ہوتی ہے وہ کبر و غرور ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ دولت مند آدمی اکثر مغرور اور لاپروا ہوتا ہے۔ تواضع و انکساری کے لئے اس کی حریم و دولت کدہ میں کوئی جگہ نہیں ہوتی، اور یہی غرور اور سرکشی ادنیٰ گناہ سے لے کر کفر تک تمام معاصی کی جڑ ہے۔ غریبوں پر زیادتی کرنا، ان کی حق تلفی کرنا، حقارت کی نگاہ سے دیکھنا، ان کی زندگی پر استہزاء وغیرہ، یہ عام طور پر امراء، حکام اور سرمایہ داروں کا شیوہ اور عادت ہے۔ اسلام سے پہلے اور اسلام کے اندر تا قیامت یہ غیر منقطع سلسلہ جاری رہے گا۔

جب روزِ قیامت حساب کا مرحلہ آئے گا، تب ہر کہتر و مہتر کی آنکھیں کھلیں گی، اور يَالَيْتَنِي يَاوَيْلَتِي کا سلسلہ شروع ہوجائے گا، کوئی فائدہ ہاتھ نہیں آئے گا۔ غریب، مفلس اور نادار متقی لوگ میدان مار کر بلند و بالا درجات پر پہنچ کر دنیاداروں کا مذاق اڑا کر دنیاداروں سے اپنا بدلہ لیں گے۔ پوری تفصیل "سورۃ المطففین" میں دیکھی

جائے۔ واللہ اعلم

﴿وَاللّٰہُ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ﴾ (اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بغیر حساب رزق دیتا ہے)۔ مقصد یہ ہے کہ رزق کی فراوانی اللہ تعالیٰ کے مقرب ہونے کی دلیل نہیں ہے، اور رزق کی کمی اللہ تعالیٰ سے دوری کی علامت نہیں ہے۔ وہ پاک ذات مالک الملک ہے۔ رزق کا بسط و کشادگی، اس کی حکمت و مصلحت پر موقوف ہے۔ ﴿اَللّٰہُ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیَقۡدِرُ﴾ [الرعد:۲۶] (اللہ رزق فراخ کردیتا ہے جس کے لئے چاہے، اور تنگ کردیتا ہے)۔ جب چاہے کسی کا رزق فراخ کرے، کسی کا رزق تنگ کردے، اس کی مصلحت کو انسان نہیں جان سکتا۔

پھر رزق صرف مال کا نام نہیں، عقلمندی، ہوشیاری، صحت وتندرستی، علم وعمل، استعداد، اولاد اور عزّت ومرتبہ، یہ سب رزق ونصیب شمار ہوتے ہیں۔ کسی کے پاس مال کی فراوانی ہے، مگر عقل ندارد، یا اولاد کی کمی ہے، کہیں اولاد اور عقل کی فراوانی ہے، مال نہیں ہے، صحت نہیں، یا کہیں صحت ہے، تو اور کسی نعمت کی کمی ہے، کہیں دیکھو تو علم وعمل اور عقل ہے، مگر مال نہیں ہے، صحت نہیں ہے، یا کسی اور نعمت کی کمی ہے۔

بہر حال! ظاہری اور باطنی نعمتوں کی بھرمار ہے، اور تقسیم میں عجیب وغریب مصلحتیں اور حکمتیں کارفرما ہیں، کوئی ایسا آدمی نہیں کہ یہ سب نعمتیں اس کے پاس مہیا ہوں، اور نہ ہی ایسا کوئی ہے کہ ان تمام نعمتوں سے خالی دست اور محروم ہو۔ البتہ! تجربہ ضرور ہے کہ مالداروں اور اقتدار والوں کے پاس عقل، دیانت، دین، صحت، سکون، صبر وشکر جیسی نعمتوں کی کمی ہوتی ہے، اور عقلمندوں کے پاس اگرچہ مال کی کمی ہوتی ہے، مگر علم، دین شکر، صحت بہادری وغیرہ نعمتوں کی چنداں کمی نہیں ہوتی۔ یہ سب کچھ مالکِ حقیقی کی تقسیم ہے، جو ہزاروں مصلحتوں اور ان گنت حکمتوں پر مبنی ہے۔

البتہ! اتنا ضرور زیرِ نظر رہے کہ اصلی سرمایہ اور بنیادی عروج وکمال دین میں ہے، دین ہے، تو سمجھو سب کچھ ہے، دین نہیں، تو یقین کریں کہ کچھ بھی نہیں۔ ایک ہی دین وتقویٰ ہے کہ جن کی حکمرانی تمام نعمتوں پر مسلَّم ہے، قیامت کے دن بڑے بڑے بادشاہ، جنہوں نے ہفت اقلیم کے تمام براعظموں پر حکمرانی کی، ہمارے پیشوا سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خادمِ خاص اور موذن سیدنا بلال حبشی رضی اللہ عنہ کے مقام کے گرد وغبار تک نہیں پہنچ سکتے۔

ایک ادنیٰ متقی مسلمان اربوں کافروں پر بھاری معلوم ہوگا، اور سارے فیصلے معبود کی بنیاد پر ہوں گے۔ کسی کا معبود حق تعالیٰ ہے، کسی کا مال، سرمایہ، اور خواہشات، کوئی کرسی وسلطنت کا پجاری، کسی کا بت، کسی کی دنیا، کسی کا کچھ اور، یہ سارے فیصلے معبود کی بنیاد پر ہوں گے، پس جس کا معبود ربّ تعالیٰ ہو، اس کی جیت ہوگی، باقی سب جہنم کے

ایندھن اور کوئلہ بنیں گے۔

.......❁.......❁.......❁.......

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ
الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا
الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

ترجمہ: سب لوگ ایک ہی امت (دین ملّت) پر تھے، پس اللہ تعالیٰ نے نبی بھیجے خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے، اور ان نبیوں کے ساتھ سچی کتاب اتاری، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان اُس بات میں فیصلہ کریں جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں، اور نہیں اختلاف کیا اس میں مگر ان لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح باتیں آچکی تھیں، (یہ اختلاف کیا انہوں نے) آپس میں سرکشی کرتے ہوئے، پس اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ہدایت دی اپنے حکم سے، جو ایمان لائے، اُس بات میں جس میں وہ اختلاف کرتے تھے حق سے، اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سیدھے راستے کی ہدایت دیتا ہے ﴿۲۱۳﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیتوں میں فتنہ وفساد کی اصل جڑ حبِّ دنیا بتائی گئی، اب ان آیتوں میں یہ کہا جارہا ہے کہ نفسانی خواہشات، ضدوہٹ دھرمی بھی اختلاف وفتنہ کا اسی طرح سبب ہے جس طرح حبِّ دنیا، چونکہ تخلیقِ کائنات کا مقصد توحید باری تعالیٰ، اور ربُّ العزّت کے کمالات کا اظہار ونشاندہی ہے، لہٰذا ضروری ہوا کہ اس کی تاریخ کی ابتداء معلوم ہو۔ فرمایا: ﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ سب لوگ ایک ہی عقیدہ، مذہب، نظریہ اور خیال پر تھے۔

''اُمَّةً'' کے معنی ملّت کے ہیں، یعنی عقیدہ ونظریہ۔ امت یا ملّت اس جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد کے افکار وخیالات ایک جیسے ہوں۔ [راغب] ملّت حق بھی ہوتی ہے، اور ملّت باطل بھی، جیسے حدیث میں ہے: اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ۔ یعنی سارے کافروں کے خیالات، عقائد اور نظریات ایک جیسے متحد ہیں۔ قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ﴾ [یوسف: ۳۷] (لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے، اور روزِ آخرت سے انکار

کرتے ہیں، میں ان کا مذہب چھوڑے ہوئے ہوں)۔ ﴿مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ﴾ [ص:۷] (پچھلے مذہب میں ہم نے کبھی اس کو نہیں سنا)۔ اس کے علاوہ ملّتِ حق جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب ہے، اس کا تذکرہ و بیان قرآن کریم میں آٹھ مقامات پر ہے، اور ملّتِ باطلہ کا تذکرہ سات مقامات پر ہے۔

اس آیت کریمہ میں ﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ اسی طرح دوسرے مقام پر ﴿وَمَا كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ [یونس:۱۹] ایک اور مقام پر ارشاد ہے: ﴿اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ﴾ [الأنبياء:۹۲] اسی طرح: ﴿وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ﴾ [المؤمنون:۵۲]

تمام مفسرین کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ امتِ واحدہ، یعنی ملّتِ واحدہ سے مراد اسلام ہے، اور وحدۃ سے مراد مذہب، مسلک، توحید و ایمان اور عقائدِ صحیحہ ہیں، اور ملّتِ واحدہ سے وحدتِ کفر ہرگز مراد نہیں، کیونکہ انسانوں کی فطری پیدائش اسلام پر ہوتی ہے، نہ کہ کفر پر، جیسے ارشاد نبوی ہے: "كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى فِطْرَةِ الْإِسْلَامِ"۔ [متفق علیه]

اب رہا یہ مسئلہ کہ تمام لوگ ملّتِ واحدہ، یعنی ایمان، توحید، عقائدِ صحیحہ پر کب تھے؟ اور وہ کونسا زمانہ ہے؟ اس سلسلے میں تین اقوال ہیں: حضرت اُبی بن کعب اور بعض دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق عالمِ ارواح کے ساتھ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے تمام ارواح کو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے پیدا فرمایا، اور میدان میں انہیں حاضر کرکے ارشاد فرمایا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟ تو سب نے یک زبان ہو کر اقرار کیا: ﴿قَالُوْا بَلٰى﴾ اے مولا! کیوں نہیں! تو ہی ہمارا ربّ ہے۔ اس وقت تمام لوگ امتِ واحدہ تھے، ان میں کوئی ایک بھی کافر و منکر نہیں تھا۔ سب موحد تھے، اور توحید پر اقرار کرکے بَلٰی کہتے رہے۔ پوری تفصیل سورۃ أعراف میں آنے والی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

دوسرا قول جمہور علماء و مفسرین کا ہے کہ ملّتِ واحدہ کا زمانہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ادریس علیہ السلام تک کا زمانہ ہے۔ یہ عرصہ ایک ہزار برس کا ہے۔ اس عرصہ میں سوائے عام گناہوں کے کوئی کفر و شرک اور بت پرستی کا وجود ہی نہ تھا۔ تمام لوگ ایک ہی ملّتِ توحید پر قائم رہے۔ ان کا دین بعینہ وہی تھا، جو حضرت آدم علیہ السلام کا تھا، ان میں کوئی دینی اختلاف نہیں تھا، مگر یہ سلسلہ کب تک قائم رہ سکتا تھا؟ تکوینی طور پر کفر و شرک اور جہنم کا فیصلہ جب ہو چکا تھا،

تو لازمی نتیجہ یہی ہوتا کہ اختلاف پیدا ہو، اسی بناء پر اختلاف ظاہر ہوا، اور ابلیس نے روزِ اول جو قسم کھا کر کہا تھا، جس کی مہلت بھی دی گئی تھی، اسے پورا ہی ہونا تھا۔

درکارخانہ عشق از کفر ناگزیر ست ☆ دوزخ کرابسوزد گر بولہب نباشد

اور چونکہ یہ جہاں خیر و شر، کفر و اسلام دونوں کے لئے ہے، اگر کفر نہ ہو، جہنم کے کیا معنیٰ؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو بے مقصد اور مہمل پیدا نہیں فرمایا۔ پس صحیح دین کو قیامت تک باقی رکھنے میں تکوینی فیصلہ کا خلاف ہوتا، لہٰذا حضرت ادریس علیہ السلام کے بعد یہ اختلاف پیدا ہوئے، اور انہیں عروج بھی حاصل ہوا، حتی کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت کا فیصلہ ہوا، تا کہ کفر و شرک کا قلع قمع کیا جائے۔ نوح علیہ السلام کے طوفان سے وسیع پیمانے پر تطہیر ہوئی۔ سارے لوگ مارے گئے، غرق ہوئے، صرف چند محدود، یعنی بیاسی (۸۲) لوگ بچ گئے۔ یہ بھی ایک مختصر عرصہ تک۔

پھر ملّتِ واحدہ کا قیام عمل میں آیا، مگر کب تک یہ سلسلہ جاری رہ سکتا تھا؟ "أصحاب السفينه" (کشتی والے) مر گئے، اور انسانی نسل کی پیداوار حضرت نوح علیہ السلام کے تینوں بیٹے سام، حام اور یافث کی پشت سے جاری ہوئی۔ اس عرصہ کے اندر ان کی نسل میں چند وقت کے توقف کے بعد پھر شرک و بت پرستی کا زور وشور کے ساتھ دور شروع ہوا۔ قومِ عادِ اولیٰ، شداد، فراعنۂ مصر، اور دو سو سال بعد اسی جزیرۂ عرب میں قومِ ثمود کا زمانہ آیا، یہاں تک کہ یہ سارے لوگ عذابِ الٰہی کی لپیٹ میں آ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹ گئے، مگر کفر و شرک کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا، بلکہ یہ مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی۔

فارس و خراسان میں مجوسیت، اور عراق و بابل میں آشوری دور کی وہ ہمہ گیر بت پرستی، صابئیت، کواکب پرستی اپنے عروج پر رہی، اب اس ہمہ گیر اور عظیم حکمتوں کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ابو الانبیاء حضرت ابراہیم الخلیل علیہ السلام کی بعثت ہو، اس کی تفصیل گزر چکی۔

تیسرا قول یہ ہے کہ امتِ واحدہ کا زمانہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کا زمانہ ہے۔ آپؑ کے بعد ڈیڑھ ہزار سال تک لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سچے دین پر قائم رہے، اور ان کی تعلیمات پر قائم رہے، تا آنکہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے ساڑھے چار سو سال پہلے قبیلۂ خزاعہ کا سردار عمرو بن لحی بن قمہ نے عربوں میں (حجاز، شام، یمن، نجد) بت پرستی کو رواج دیا، یہاں تک کہ قریش نے، جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، کعبۃ اللہ شریف میں تین سو ساٹھ بت رکھوا کر ان کی پوجا شروع کی۔ فتحِ مکہ کے روز سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

قیامت تک کے لئے کعبہ شریف کو ناپاک بتوں سے پاک وصاف فرمایا۔

یہ آخری قول کمزور بھی ہے، اور مخصوص نسل (عرب) اور مخصوص خطہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ صحیح اور مشہور قول جمہور علماء ومفسرین حضرات کا قولِ دوم ہے۔ وعلیہ الاعتماد۔ واللہ اعلم

﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ﴾ بعثتِ انبیاء کی علّت جو کہ اختلاف اور کفر ہے، وہ اس آیت میں مذکور نہیں ہے، لہٰذا اسے محذوف ماننا پڑے گا، کیونکہ "اَلْقُرْاٰنُ یُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا..."۔ سورۃ یونس کی آیت میں وہ کلمہ موجود ہے۔ ﴿وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا﴾ [یونس:۱۹] تو یہاں بھی فاختلفوا مقدر ہے، جو کہ بعثتِ انبیاء علیہم السلام کے لئے علّت ہے، فَصَارَ الْكَلَامُ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فاختلفوا فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ۔

جب بھی دنیا میں شرک وکفر کا مرض پیدا ہوا، تو انبیاء علیہم السلام باری باری مبعوث ہوتے رہے۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی علّت کفر اور شرک قرار پائی، اور بعثت کا مقصد توحیدِ الٰہی کی ترویج واشاعت قرار پایا۔ شبِ معراج سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب سارے انبیاء علیہم السلام سے ان کی بعثت کا مقصد پوچھا، تو سارے انبیاء کرام علیہم السلام نے جواب دیا: بُعِثْنَا لِلتَّوْحِيْدِ، ہمیں توحید کی اشاعت کے لئے بھیجا گیا ہے، تاکہ ہم لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دیں۔ قرآن حکیم نے بھی اسی مقصدِ بعثت کا بار بار تذکرہ فرمایا۔ سورۂ یونس، سورۂ ہود، اور سورۃ الشعراء میں تفصیل کے ساتھ یہ بات مذکور ہے۔

﴿مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾ یہ فرائضِ نبوت کا بیان ہے، کہ ایمان والوں کو مغفرت اور جنت کی خوشخبری سناتے ہیں، اور کفار ومشرکین کو اللہ تعالیٰ کے عذاب اور جہنم سے ڈراتے ہیں، یہ اس لئے کہ ﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ [النساء:۱۶۵] (تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کو خدا پر الزام کا موقع نہ رہے)۔ اور کفار قیامت کے دن یہ عذر پیش نہ کرسکیں کہ ﴿مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ﴾ [المائدۃ:۱۹] (ہمارے پاس کوئی خوشخبری سنانے یا ڈرانے والا نہیں آیا) جب وہ یہ عذر پیش کریں گے، تو فوراً انہیں جواب ملے گا: ﴿فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [المائدۃ:۱۹] سو (اب) تمہارے پاس خوشخبری سنانے اور ڈرانے والے آگئے ہیں، اور خدا ہر چیز پر قادر ہے)۔

پھر ظالموں پر اتمامِ حجت ہوجائے گی، نیز یہ مقصد بھی ہے کہ ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ [الاسراء:۱۵] (اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج دیں عذاب نہیں دیا کرتے)۔ اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے، حتی الامکان وہ بھی

چاہتا ہے کہ میرے بندے ہدایت قبول کر کے جہنم سے نجات پائیں، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۖ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ [یونس: ۲۵] (اور خدا سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے)۔

اسی طرح فرمایا: ﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ﴾ [النساء: ۱۴۷] (کیا کرے گا اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر؟ اگر تم حق کو مانو اور یقین رکھو، اور اللہ تعالیٰ قدردان ہے سب کچھ جاننے والا) تو مطلب صاف واضح ہے کہ جب تک تم خود اپنے لئے عذاب کا انتخاب نہ کرو، اللہ تعالیٰ قطعاً تمہیں عذاب نہیں دے گا۔

﴿وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾ ان کے ساتھ سچی کتاب بھی نازل فرمائی۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اور رسول بھیجے، اور ایک سو چار کتابیں نازل فرمائیں، ان میں سے چار بڑی کتابیں ہیں: تورات، انجیل، زبور اور قرآن حکیم، اور ایک سو چھوٹے چھوٹے صحیفے ہیں، جو مختلف انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کل نبی کتنے ہیں؟ فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار، ان میں سے ایک بڑی جماعت تین سو پندرہ رسول تھے۔ یہ روایت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے رسولوں کی تعداد تین سو تیرہ بتائی ہے، اور جن پیغمبروں کے صریح نام قرآن مجید میں آئے ہیں، بعض کہتے ہیں وہ اٹھائیس ہیں، بعض نے ستائیس بتائے، اور چھبیس کا قول بھی ہے۔ مگر مشہور پچیس ہے۔ جو حضرات چھبیس کہتے ہیں وہ حضرت لقمان حکیم کو انبیاء میں شمار کرتے ہیں۔

ستائیس کہنے والے فرماتے ہیں کہ سورۃ مؤمن میں ہے: ﴿وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ﴾ [غافر: ۳۴] یہ پیغمبر یوسف بن یعقوبؑ کے علاوہ ہیں۔ ان کی نسل میں سے نہیں، ان کا نسب یہ ہے: ''یوسفؑ بن ابراہیم بن یوسفؑ بن یعقوب علیہم السلام''۔ اور اٹھائیس کہنے والوں نے حضرت مریمؑ والدہ حضرت عیسیٰؑ کو شمار کیا ہے۔ مگر جمہور کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ نبوت کا منصب مردوں کے ساتھ مخصوص ہے، لقولہ تعالیٰ: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى﴾ [یوسف: ۱۰۹] (اور ہم نے تم سے پہلے بستیوں کے رہنے والوں میں سے مرد ہی بھیجے تھے)۔

عجیب بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی یہ تعداد (ایک لاکھ چوبیس ہزار) بہت مشہور ہے، اور زبان زد خواص و عوام بھی ہے، مگر حافظ ابن کثیر دمشقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے، پھر وہ ایک دوسری روایت نقل کرتے

ہیں جس میں انبیاء علیہم السلام کی تعداد آٹھ ہزار بتائی گئی ہے۔ فرماتے ہیں: یہ روایت ضعیف نہیں۔ مزید تفصیل منازل العرفان سورۃ الفاتحہ کے فوائد میں ملاحظہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ ساری آسمانی کتابوں کا موضوع ایک ہی رہا، یعنی ایمان و توحید کی تبلیغ، اور خلقِ خدا کی اصلاح، اور تعلق مع اللہ کے رشتوں کی مضبوطی کی نشاندہی وغیرہ۔

﴿لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ﴾ (تاکہ لوگوں کے درمیان اس بات کا فیصلہ کریں جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں)۔ یہ ہے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کتابیں نازل کرنے کا مقصد، اور دیگر آسمانی کتب کی طرح قرآن کریم کے نزول کا مقصد بھی یہی بیان کیا گیا ہے، فرمایا: ﴿لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ﴾ [النساء: ۱۰۵] (جو چیز اللہ تعالیٰ نے آپ کو سمجھائی ہے، اس کے مطابق فیصلہ کریں)۔

آگے اس امر کی وضاحت کی جارہی ہے کہ اہلِ کتاب میں اختلاف کسی غلط فہمی کی بناء پر نہیں ہوا تھا، بلکہ یہ احکامِ الٰہی سے بغاوت اور سرکشی کی وجہ سے تھا، جس طرح کہ ان کی عادت اور مکارانہ مزاج ہے، فرمایا:

﴿وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ﴾ اور اس میں صرف انہی لوگوں نے اختلاف کیا جنہیں کتاب دی گئی، اور ان کے پاس واضح نشانیاں آچکی تھیں، اور انہوں نے ہر قسم کے معجزات کا بھی مشاہدہ کیا تھا، اس کے باوجود وہ سرکشی اور بغاوت پر اترے۔

اس کی وجہ ان کی خودغرضی اور عناد و حسد تھا۔ قرآن حکیم نے جابجا اس قوم کی نافرمانیوں کی وضاحت سے بیان کیا ہے، فرمایا: ﴿يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۴۶] (وہ ان (ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانا کرتے ہیں)۔ ہزاروں علامات کے باوجود بھی نہ پہچانے، ﴿حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ﴾ [البقرۃ: ۱۰۹] اس حسد نے انہیں اندھا اور بے عقل بنا کر راہِ راست سے بیگانہ کیا، اور حق کا دشمن بنا دیا۔ سب سے بڑا حسد یہ تھا کہ نبوت بنی اسرائیل سے نکل کر بنو اسماعیل عرب میں کیوں منتقل ہوگئی؟ یہ ہرگز ہدایت کے طالب نہیں رہے۔ یہ وہ بدقسمت و بدنصیب قوم ہے جنہوں نے تمام آسمانی ہدایات اور خدائی فیصلوں کو چیلنج کیا، اور نہیں مانا۔ مگر یہ مشیتِ ایزدی تھی کہ ختمِ نبوت کا تاج سید الانبیاء خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر مبارک پر رکھا گیا۔ وہ آپس میں جب بیٹھتے اور تبادلۂ خیال کرتے، تو یہ اقرار کرتے کہ جس آخری پیغمبر کی صفات اور حلیہ جو تورات میں ہے، وہ سو فیصد یہی نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، مگر ایک دوسرے کو قسم دے کر کہتے تھے کہ کسی صورت میں اس کا

اظہار نہ کرنا۔

سبحان اللہ! مالک الملک عزّوجل کا جب خاص کرم متوجہ ہوتا ہے، تو شرک وکفر، بغض وحسد اور حبِّ جاہ و مال کے اندھیروں میں شمعِ ہدایت روشن کرتا ہے، تو فرمایا:

﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ﴾ پھر اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں (امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنے حکم ولطف سے وہ راہِ حق دکھادی، جس میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ ''مِنَ الْحَقِّ'' یہ مَا کا بیان ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کا اختلاف قبلہ میں تھا، کوئی مشرق کی طرف نماز پڑھتا تھا، کوئی مغرب کی طرف، اور کوئی بیت المقدس کی طرف۔ اس بارے میں امتِ محمدیہ کو اللہ تعالیٰ نے کعبۃ اللہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم دیا، اور ان کا اختلاف روزوں میں بھی تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں رمضان المبارک کے روزوں کا حکم دیا، اور اسی طرح عبادت کے دنوں میں بھی ان کا اختلاف تھا۔ نصاریٰ نے اتوار کا دن، اور یہود نے ہفتے کا دن لے لیا۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے سید الایام جمعۃ المبارک کا دن عطا فرمایا۔

اسی طرح یہود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا ہم مذہب یہودی، اور نصاریٰ نے نصرانی کہا، مگر ربّ العزّت نے ان دونوں کی تردید فرما کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رشتہ ہمارے پیشوا عالی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی امت کے ساتھ جوڑا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان یہودیوں نے گھٹا کر انہیں حرامی کہا (نعوذ باللہ)، اور نصاریٰ نے انہیں بڑھا چڑھا کر ابن اللہ کہا (نعوذ باللہ)، اللہ تعالیٰ نے ہماری رہنمائی فرما کر انہیں عبداللہ ورسولہ کہنے کا حکم دیا۔ [مظھري]

﴿وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ یہ وہی صراطِ مستقیم ہے، جسے یہود ونصاریٰ نے مسترد کر کے چھوڑ دیا، تب ہی تو وہ مغضوب علیہم اور ملعون وضالّین بن گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف وکرم سے ہماری رہنمائی فرمائی، ارشاد فرمایا کہ اے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ یہ کہو: ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ﴾ [الأنعام: ۱۵۳] (اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے، تو تم اسی پر چلنا)۔ ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بے شک تم پیغمبروں میں سے ہو سیدھے راستے پر) [یس: ۴]

امتِ محمدیہ کو حکم ہوا کہ پانچوں نمازوں میں ہر رکعت میں یہ کہا کرو: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ) غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ (وَهُمُ الْيَهُوْدُ) وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾

(وَهُمُ النَّصَارٰى)۔ اور یہ دونوں ظالم و بے انصاف رہے ہیں، فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [آل عمران: ۵۷] (اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا) اور ﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [آل عمران: ۸٦] (اور اللہ ظالم لوگوں کو راستہ نہیں بتاتا)۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ
قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

ترجمہ: کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ تمہارے پاس پہلے لوگوں کے سے حالات نہیں آئے؟ ان کو سختی اور تکلیف پہنچی، اور وہ متزلزل کئے گئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور اس پر ایمان لانے والے کہنے لگے: اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی؟ فرمایا: آگاہ رہو، بیشک اللہ تعالیٰ کی مدد قریب ہے ﴿۲۱۴﴾

معارف ومنازل

مسلمانوں کو خطاب ہو رہا ہے کیا تم ابتلاء و آزمائش کے بغیر جنت میں جاؤ گے؟ پہلے مذکور ہوا کہ دشمنوں کے ہاتھ سے انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی امتوں کو ہمیشہ ایذائیں پہنچیں، تو اب اہلِ اسلام کو ارشاد ہے کہ کیا تم کو اس بات کی طمع ہے کہ بغیر مشقت جنت میں داخل ہو جاؤ؟ حالانکہ اگلی امتوں کو جو ایذائیں پیش آئیں، وہ ابھی تک تم کو پیش نہیں آئیں، کہ ان کو فقر و فاقہ، مرض اور خوف اس درجہ پیش آئے کہ مجبور اور عاجز ہو کر نبی اور ان کی امت بول اٹھی کہ دیکھئے اللہ تعالیٰ نے جس مدد اور نصرت کا وعدہ فرمایا تھا، وہ کب آئے گی؟ اور اس کے آنے میں کیوں دیر ہوئی؟ یعنی بہ تقاضائے بشریت (کیونکہ انسان بیچارہ فطرتاً تنگدل ہے) پریشانی کی حالت میں ناامیدی کے کلمات سرزد ہونے لگے، اور تنگدلی پیدا ہوئی۔

اس طرح کے کلمات کسی شک کی وجہ سے نہ تھے، بلکہ بحالت اضطرار اور بمقتضائے بشریت اس کی نوبت آئی۔ لہٰذا ان پر کوئی الزام نہیں ہے، کیونکہ ان اندوہناک پریشانیوں کو ہاتھی اور شیر جیسے جانور بھی برداشت نہیں کر سکتے، اور بڑے پہلوانوں کے قدم بھی اکھڑ جاتے ہیں۔

دوسرے مقام پرارشاد ہے:﴿حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا﴾ [یوسف: ۱۱۰] (یہاں تک کہ جب پیغمبر ناامید ہو گئے، اور انہوں نے خیال کیا کہ اپنی نصرت کے بارے میں جو بات انہوں نے کہی تھی (اس میں) وہ (لوگوں کی سمجھ کے مطابق) سچے نہ نکلے، تو ان کے پاس ہماری مدد آ پہنچی)۔ اس کی تفصیل اپنے موقع پر آنے والی ہے۔ ان شاء اللہ۔ اسی طرح دوسرے مقام پرارشاد ہے:﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ﴾[آل عمران:۱۴۲] (کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ (بے آزمائش) بہشت میں داخل ہو جاؤ، حالانکہ ابھی خدا نے تم میں سے جہاد کرنے والوں کو تو اچھی طرح معلوم کیا ہی نہیں، اور (یہ بھی مقصود ہے) کہ وہ ثابت قدم رہنے والوں کو معلوم کرے)۔

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ (کیا تم گمان کرتے ہو کہ بغیر کوئی مشقت اور بغیر کسی تکلیف کے تم جنت میں پہنچ جاؤ گے؟)۔ کیا محض کلمہ پڑھنے سے کوئی جنت میں داخل ہوگا؟ ہرگز نہیں! بلکہ شدید آزمائشوں اور تکالیف برداشت کرنے، اور پریشانیوں کی گھاٹی عبور کرنے کے بعد دخولِ جنت کا مرحلہ آئے گا۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے: "حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ"۔ جنت کی باڑ مشکلات ہیں، انہیں عبور کرنے کے بعد دخولِ جنت کی نوبت آئے گی۔ [مشکوۃ] اب اس کی وضاحت ہے:

﴿وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَّسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ﴾[الآیۃ] کیا تمہیں پہلے مؤمنین کے حالات معلوم نہیں ہیں، اور تمہیں ان کی داستان نہیں پہنچی؟ اگر نہیں! تو سنو کہ ان پر کیسی کیسی دلگداز سختیاں اور تکلیفیں آئیں! وہ زوردار ہاتھوں سے ہلا دیئے گئے۔ ان کو ایسے مصائب کا سامنا کرنا پڑا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے ہو، ان تمام تکلیفوں اور مصائب کے برداشت کرنے کے بعد وہ جنت کے حقدار ہو گئے۔ أصحاب الأخدود، جن کا واقعہ سورۃ البروج میں ہے، تمہارے سامنے ہے، اسے مطالعہ کرو، اور غور کرو۔

حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ مشرکینِ قریش کی ایذاؤں اور ناقابل برداشت مصائب سے تنگ آ کر میں سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں پہنچا، اس وقت وہ کعبۃ اللہ شریف کے سایہ میں تشریف رکھتے تھے، روتے ہوئے میں نے عرض کیا: اَلَا تَدْعُوْ لَنَا (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے لئے کیوں دعا نہیں فرماتے کہ کفار کے مصائب سے جان خلاصی ہو؟)

پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چادر پر تکیہ لگا کر بیٹھے تھے، پھر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، اور ارشاد فرمایا: افسوس ہے! تم

کیوں بے صبری کا مظاہرہ کررہے ہو؟ حالانکہ تم سے پہلے ایسے اہلِ ایمان گزرے ہیں جن کے سروں پر آری رکھ کر انہیں چیر دیا گیا، مگر وہ اپنے دین پر ثابت قدم رہے، اور ایسے لوگ بھی تھے، جنہیں لوہے کی کنگھیوں سے نوچ دیا گیا، مگر ان کے پائے استقلال میں جنبش نہ آئی، میں تم کو بتلا دینا چاہتا ہوں، وَاللهِ لَيَتِمَّنَّ هٰذَا الْأَمْرُ۔ اللہ کی قسم! یہ معاملہ پورا ہوکر رہے گا، اور اسلام کو غلبہ ہوگا، اور امن وامان کا دور دورہ ہوگا، حتی کہ ایک عورت تنہا صنعاء سے حضر موت تک (یہ دونوں یمن کے صوبے ہیں) سفر کرے گی، مگر اسے سوائے ربّ العزّت کے کسی اور چیز کا خوف نہیں ہوگا۔ انسان تو کجا! کسی بھیڑیے کو بھی جرأت نہ ہوگی کہ کسی کی بکری کو کھائے، مگر تم جلد بازی کرتے ہو۔ (صبر کرو بے صبری نہ کرو)۔ [متفق علیہ]

﴿اَلْبَاْسَآءُ﴾ اندرونی وبیرونی ہر قسم کی سختی اور پریشانی کو ''اَلْبَاْسَاءُ'' کہتے ہیں، اور ضَرَّاءُ جسمانی تکلیف، خواہ کسی قسم کی ہو۔ زُلْزِلُوْا بے چینی، گھبراہٹ، خوف وخطرہ، جس سے قدم اور عزم وحوصلہ ڈگمگائے۔ جب بمقتضائے بشریت ناامیدی کے عالم میں کہنے لگے: کہاں ہے اللہ کی مدد، اور کب آئیگی اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت؟ تو ارشاد ہوا: گھبراؤ مت! اللہ تعالیٰ کی مدد پہنچنے والی ہے، اور بالکل قریب ہے۔ ماقبل میں ارشاد ہوا تھا: ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ﴾ [البقرۃ:۱۸۶] (جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے پوچھیں (تو انہیں بتاؤ) کہ میں قریب ہوں)۔ تمہارا ربّ بالکل قریب ہے، اور اس کی مدد بھی قریب ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ [ق:۱۶] (اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی اس سے زیادہ قریب ہیں)۔

اسی طرح ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ [الحدید:۴] (آپ جہاں بھی ہو، وہ آپ کے ساتھ ہے)۔

کتنی پیاری وجد آفرین باتیں ہیں؟ فرمارہے ہیں کہ میں خود بھی قریب ہوں، اور میری نصرت بھی قریب ہے۔ یہ ایسی تسلّی ہے کہ اگر مردہ کے کان میں خاموشی کے ساتھ کہا جائے، تو یقیناً وہ بھی زندہ ہوجائے، دردِ دل رکھنے والے نیازمند بندے سوچیں کہ ہجومِ بلا میں، طوفانِ مصائب میں، گردابِ ہلاکت میں شکستہ دل اور پریشانی سے چور انسان کے لئے ان چند لفظوں میں اطمینان وسکون کا کیا روح پرور پیغام ہے؟ یہ قریب کیا ہے؟...... اس میں کائنات کے بڑے بڑے راز مخفی ہیں، اس میں راحت واطمینان کی ایک دنیا سمیٹ کر رکھ دی گئی ہے۔

کسی فصلِ بہار کی نسیمِ سحر میں، کسی ابرِ نیسان کے حیات بخش وجان افزا قطروں میں، وہ پر لطف اثر کہاں جو

اثر اس لفظ قریب میں ہے؟ دکھ، درد کا مارا ہو، پراگندہ خیال اور حاجت مند انسان جب یہ سنتا ہے کہ میرا مالک مجھ سے الگ تھلگ کہیں دور نہیں، کہ اسے میری پراگندگی کا علم نہ ہو، میرے رنج والم کی خبر نہ ہو، بلکہ وہ قریب اور بے انتہا قریب ہے، رگِ جان سے بھی زیادہ نزدیک ہے، تو اسے کتنا قرار وسکون میسر آتا ہے؟ تمہاری زبان پر آئی ہوئی بات تو کیا، تمہارے دل میں منہ چھپا ہوئے اسرار جو قوتِ گویائی کو اپنا چہرہ دکھانے سے شرماتے ہیں، افکار اور اندیشوں کے وہ نازک ولطیف آبگینے جو ہوائی صوتی لہروں کو بھی برداشت نہیں کر سکتے، ان سب کو وہ جانتا ہے۔

وہ قریب بھی ہے، مجیب بھی ہے، قادر وقیوم بھی ہے، سمیع وبصیر بھی ہے، رحمن ورحیم بھی ہے، حکیم وعلیم اور خبیر بھی۔ تم ذرا نزدیک تو آؤ! دستِ دعا دراز تو کرو! دامنِ طلب پھیلا کر بیٹھو، دل کے ہاتھوں سے اس کے درِ رحمت پر دستک تو دو! اس نے کب کہا کہ نیکیوں کا انبار لے کر میرے در پر آؤ؟ ہاں اس نے یہ ضرور کہا کہ گناہوں کا پہاڑ لے کر آؤ، مجھے آزماؤ تو سہی، میں تمہاری فریاد سنوں گا، تمہاری دعا قبول کروں گا، تمہاری بگڑی ہوئی حالت تبدیل کروں گا، سینکڑوں سالوں کی خرمستیوں سے درگزر کروں گا۔

البتہ! تم بھی خیال رکھو! ذرا مجھ سے حیا کرو، اپنی عاقبت کو داؤ پر نہ لگاؤ، جو رشتہ تمہیں عنایت کیا، اسے تار تار کر کے اپنا انجام خراب نہ کرو، مجھے واحد لاشریک یقین کرو، حتی المقدور میرے حکموں پر چلو، سرکش نہ بنو، غرور نہ کرو، تادمِ حیات میری فرمانبرداری کرو۔ پس اگر تجھے لازوال جنت الاٹ نہ کروں، اور آخرت کی بادشاہت کا تمہارے حق میں فیصلہ نہ کروں، تو گلہ کرو، اور تمہیں گلہ کا موقع ہی نہیں ملے گا۔

❁ ❁ ❁

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَ الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿٢١٥﴾

ترجمہ: آپ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، آپ کہہ دیجئے کہ تم جو کچھ بھی مال سے خرچ کرو بھلائی میں، پس والدین کے لئے، قرابت داروں کے لئے، یتیموں اور مسکینوں کے لئے، اور مسافروں کے لئے، اور تم جو بھی بھلائی کرو گے، بیشک اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا ہے ﴿٢١٥﴾

معارف ومنازل

یہاں سے پھر ابواب البرّ کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے، اور یہ بارہواں باب البرّ ہے، جو انفاق اور مصارف

سے متعلق ہے۔ پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان و مال لگانے پر زور دیا گیا تھا (بسلسلۂ ابواب البرّ کے) فرمایا تھا: ﴿وَاَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ﴾ [البقرۃ:۱۹۵] (اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں، اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو)۔ یہاں بارہویں حکم میں انفاق اور مدّات (مصارف) کی کچھ تفصیلات و جزئیات کا بیان ہے۔

شانِ نزول کے سلسلہ میں امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مال خرچ کرنے کے متعلق دریافت کیا، کہ کیا اور کتنا مال خرچ کریں؟ اور ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انفاق اور محلِ انفاق دونوں کے متعلق دریافت کیا تھا، کہ ہم کتنا مال اور کہاں خرچ کریں؟ تقریباً نفلی صدقات کے بارے میں یہ سوال کیا گیا، جس پر یہ آیت اتری، جس کے شروع میں والدین کا تذکرہ ہے۔

ایک تفسیری فائدہ:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت پہلے بھی ابواب البرّ کے احکام کے تحت گزر چکی ہے کہ پچھلے لوگ انبیاء کرام علیہم السلام سے بکثرت سوالات کیا کرتے تھے، مگر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ادب واحترام اتنا بڑھا ہوا تھا کہ انہوں نے بہت کم سوالات کئے۔ دراصل بات یہ ہے کہ انہیں قرآن حکیم نے ازراہِ شفقت وادب، کثرتِ سوالات کرنے سے منع کیا تھا۔ [بخاري]

﴿یَسۡـَٔلُوۡنَکَ﴾ قرآن حکیم میں تقریباً سترہ مقامات پر سوال وجواب کے انداز سے احکام ذکر فرمائے گئے ہیں، اور وہ مقامات یہ ہیں: (۱) ﴿یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡاَہِلَّۃِ ...﴾ [البقرۃ:۱۸۹] (۲) ﴿یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ.﴾ [البقرۃ:۲۱۵] (۳) ﴿یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الشَّہۡرِ الۡحَرَامِ ...﴾ [البقرۃ:۲۱۷] (۴) ﴿یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَالۡمَیۡسِرِ ...﴾ [البقرۃ:۲۱۹] (۵) ﴿وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا یُنۡفِقُوۡنَ قُلِ الۡعَفۡوَ ...﴾ [البقرۃ: ۲۱۹] (۶) ﴿وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡیَتٰمٰی ؕ قُلۡ اِصۡلَاحٌ لَّہُمۡ خَیۡرٌ ...﴾ [البقرۃ:۲۲۰] (۷) ﴿وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡمَحِیۡضِ ؕ قُلۡ ہُوَ اَذًی﴾ [البقرۃ:۲۲۲] یہ سات مقامات سب سورۂ بقرہ میں ہیں۔ (۸) ﴿یَسۡـَٔلُکَ اَہۡلُ الۡکِتٰبِ اَنۡ تُنَزِّلَ عَلَیۡہِمۡ کِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ [النساء:۱۵۳] (۹) ﴿یَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَہُمۡ﴾ [المائدۃ:۴] (۱۰) ﴿یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ السَّاعَۃِ اَیَّانَ مُرۡسٰہَا﴾ [الأعراف:۱۸۷] (۱۱) ﴿یَسۡـَٔلُوۡنَکَ کَاَنَّکَ

حَفِيٌّ عَنْهَا﴾[الأعراف:۱۸۷] (۱۲)﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ﴾[الأنفال:۱] (۱۳) ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ط قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾[الإسراء:۸۵] (۱۴)﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ﴾[الكهف:۸۳] (۱۵)﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا﴾[طه:۱۰۵] (۱۶)﴿يَسْئَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللهِ﴾ [الأحزاب:۶۳] (۱۷)﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسَاهَا﴾ [النازعات:۴۲]

یہ ہیں ترتیب واروہ سترہ مقامات جن میں سوال وجواب کے انداز سے احکام ذکرفرمائے گئے ہیں۔اب دیکھنا یہ ہے کہ سوال کرنے والے کون تھے؟ تو ظاہر ہے کہ سائلین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے،یامشرکینِ مکہ،اورتیسراطبقہ اہلِ کتاب کا تھا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے کُل نوسوالات ہیں۔سات سورۂ بقرہ کے،ایک سورۂ مائدہ کا،اورایک سورۂ أنفال کا۔اہلِ کتاب کی طرف سے تین سوالات ہیں: ایک سورۃ النساء،ایک سورۃ الإسراء،ایک سورۃ الکھف کا، اورمشرکین کی طرف سے پانچ سوالات ہوئے: دو أعراف کے،ایک طٰہٰ کا،ایک أحزاب اورایک النازعات کا۔

بعض روایات میں یہ ہے کہ سورۃ اسراء کے روح،اورسورۃ کہف کے ذوالقرنین کے سوالات کاتعلق مکہ کے مشرکین سے ہے۔یہ بھی غلط نہیں،کیونکہ انہیں یہود نے پٹی پڑھائی کہ تم یہ سوالات کرو۔ان جہال کوکیاپتہ اورمعلوم کہ روح کیاہے؟ اورذوالقرنین کون ہیں؟ انہیں یہود نے بتایا۔

غورطلب بات یہ ہے کہ امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں صرف انفاق کا سوال ہے کہ ہم کیااورکیسے خرچ کریں؟ سوال میں اختصار ہے۔مصرف کونظرانداز کیاگیاہے۔ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں یہ مذکور ہے کہ سوال مرکب ہے کہ ہم کیا،کہاں،اورکس مصرف میں خرچ کریں؟ اس آخری مرکب سوال کا جواب یہی آیت کریمہ ہے کہ جس میں مصارفِ خمسہ کاذکرہے،اوراسی رکوع میں جودوآیتوں کے بعد بعینہٖ یہی سوال ہے،جس کا جواب ہے ﴿قُلِ الْعَفْوَ﴾ تواس کاتعلق اس بسیط سوال کے ساتھ ہے،جسے امام جریر رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیاہے کہ سوال میں مصرف کاذکر نہیں ہے۔اسی طرح ﴿قُلِ الْعَفْوَ﴾ میں بھی مصرف کا تذکرہ نہیں ہے،لہٰذا تکرارکاسوال ہی پیدانہ ہوگا،نہ سوالات میں،اورنہ جوابات میں۔

یہ دونوں آیتیں عام صدقات کے متعلق ہیں۔فرض زکوٰۃ کے لئے تونصاب،فارغ عن الدین،اورحولانِ

حول وغیرہ کی شرائط ہیں۔ یہاں صدقات کی مقدار تک کا تذکرہ بھی نہیں، صرف دینے والے کی صوابدیدی حیثیت پر چھوڑا گیا، فرمایا: ﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ﴾ خیر وصدقہ اپنی مرضی اور حیثیت کے مطابق کرو۔ جتنا زیادہ دوگے، اتنا زیادہ ثواب ملے گا۔ اگر زیادہ دینے کی استطاعت نہیں، تو کم دینے سے مت شرماؤ۔ ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾[الزلزلة:۷] (پس جو شخص ذرّہ برابر خیر کا عمل کرے وہ اس کو دیکھے گا) اس کی واضح دلیل ہے۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ”اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ“۔ [بخاري] نصف کھجور کی کیا حیثیت ہے؟ اُس کی بھی ترغیب ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں ہے کہ نصف کھجور کی اللہ تعالیٰ پرورش کرکے پہاڑوں جتنا ثواب عطاء فرمائیں گے۔ [عمدة القاري، جلد:۷]

اس آیت کریمہ میں ربّ العزّت عزّ شانہ نے جو پانچ مصرف ذکر فرمائے ہیں، ان میں حصر مقصود نہیں ہے۔ خیرات وصدقاتِ نافلہ کے بہت سے دیگر مصارف بھی ہیں، جنہیں احادیث اور فقہ کی کتب میں تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔

نفلی صدقات میں اس بات کی رعایت ضروری ہے کہ جو مال اہل وعیال کی ضروریات سے زائد ہو، وہی خرچ کیا جائے۔ بعض خشک دماغ لوگ بیوی بچوں کو صحیح خرچہ نہیں دیتے ہیں، یا لوگوں کے قرض ادا نہیں کرتے۔ ثواب کی خاطر صدقات دیتے ہیں، انہیں ثواب تو کیا ملے، الٹا گناہگار ہوتے ہیں۔ اہل وعیال کا نفقہ اور قرض کی ادائیگی فرض ہے، جبکہ صدقہ نفل ہے۔ سب سے بڑا صدقہ یہ ہے کہ اپنے بیوی بچوں کی نگہداشت ہو، تاکہ وہ کسی پڑوسی کے محتاج نہ رہیں۔ یہ کتنی نادانی ہے کہ شوہر صدقہ کررہا ہے، اور اس کی بیوی پڑوسی کی مزدوری کررہی ہے؟ چاہئے کہ اہلِ علم سے ہر وقت مسائل معلوم کریں۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

ترجمہ: تم پر لڑائی (جہاد) فرض کی گئی ہے، اور وہ تمہیں ناگوار گزرتی ہے، اور شاید کہ تم کسی چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو، اور شاید تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لئے بُری ہو، اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے ﴿۲۱۶﴾

معارف ومنازل

☆......ابواب البرّ، کا تیرہواں عظیم المرتبت بنیادی حکم جہاد ہے۔ یہاں سے اس کی فرضیت واہمیت کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ اس آیت میں کلمہ کُتِبَ سے جہاد کی فرضیت کا حکم ہو رہا ہے، جیسے کہ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ سے روزہ کی فرضیت کا حکم ہوا، تو جس طرح روزہ کی فرضیت عام ہے، اور ہر مسلمان پر روزہ رکھنا فرض ہے، بظاہر اس آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جہاد ہر مسلمان پر ہر حالت میں فرض ہے، مگر بعض قرآنی آیات اور سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریضہ فرضِ عین کے طور پر ہر ہر مسلمان پر عائد نہیں ہے، بلکہ یہ نمازِ جنازہ کی طرح فرض کفایہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی ایک جماعت اس فرض کو ادا کرے، تو باقی مسلمان سبکدوش ہو جائیں گے۔ ہاں! اگر کسی زمانہ، کسی ملک میں کوئی جماعت بھی فریضہ جہاد کو ادا نہ کریں گے، تو ترکِ جہاد کی وجہ سے سارے مسلمان گناہگار ہو جائیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتحِ مکہ کے موقع پر ارشاد فرمایا: "لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ". [بخاري] (اب فتحِ مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں ہے، البتہ! جہاد اور حسنِ نیت کا حکم باقی رہے گا)۔ ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا، یہاں تک کہ اس امت کے لوگ مسیح دجال کے ساتھ جہاد کریں گے۔ قرآن حکیم میں جہاد کے متعلق (۴۸۴) آیات موجود ہیں۔

اسلام انقلاب لانے والا دینِ الٰہی ہے۔ قرآن حکیم انقلابی کتاب ہے، جبکہ اس عظیم انقلاب کے قائد سید المجاہدین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے۔ قرآن پاک نے (۴۸۴) آیتوں کے ذریعہ جس انقلاب کی دعوت دی ہے، وہ ایک عظیم انقلاب ہے، وہ یہ کہ پورے جہاں سے غیر اللہ کی عبادت کا قلع قمع ہو۔ پورے اطراف واکنافِ عالم میں توحید وایمان کا حقیقی راج قائم ہو، اور خلافت علیٰ منہاج النبوت ہو۔ تو فرمایا: ﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ [الأنفال:۳۹] (اور ان لوگوں سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ (یعنی کفر کا فساد) باقی نہ رہے، اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے، اور اگر باز آجائیں تو خدا ان کے کاموں کو دیکھ رہا ہے)۔

یہ جہاد کا آخری مقصد ہے کہ کفر کی شان وشوکت ختم ہو جائے، اور پورے عالم میں صرف ربّ العزت سبحانہ کا حکم چلے، اور دینِ حق سب ادیان پر غالب رہے، ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ [الفتح:۲۸] (تاکہ تمام ادیان

پر غالب کر دے)۔ خواہ دوسرے ادیان کی موجودگی میں ہو، جیسے خلفائے راشدین وغیرہم کے عہد میں ہوا، یا سب باطل مذاہب کو ختم کر کے، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ہوگا۔ بہر حال یہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جہاد فرضِ عین ہو، یا فرضِ کفایہ، اقدامی ہو یا دفاعی، ہر حال میں جاری رہے گا، جب تک کہ یہ دونوں مقصد حاصل نہ ہو جائیں۔

جہاد کے فرض کفایہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ سید المجاہدین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوائے غزوۂ تبوک کے کسی بھی غزوہ یا سریہ میں عام نفیر کا اعلان نہیں فرمایا، اور یہ حکم نہیں دیا کہ تم اس فرض کو پورا کرنے کے لئے گھروں سے نکلو۔ غزوۂ تبوک میں عام نفیر کا اعلان فرما کر واضح کیا کہ ایسے مواقع میں جہاد ہر شخص پر فرضِ عین ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ غزوہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری غزوہ تھا۔ اس کا معاملہ دوسرے تمام غزوات سے کچھ مختلف تھا۔ اس موقع پر ضروری ہوا کہ عام نفیر ہو، کیونکہ یہ معرکہ رومیوں کے ساتھ تھا۔ علاقہ میدانِ جنگ تقریباً ایک ہزار کلومیٹر دور تھا۔ دشمن کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی، اور وہ پہلی مرتبہ مسلمانوں کے مقابلے میں آئے تھے، تو ان کو شکست دینے کے ساتھ مرعوب کرنے اور آئندہ کے لئے خوفزدہ کرنا مقصود تھا، اس لئے اس غزوہ کا معاملہ دوسرے غزوات سے مختلف رہا۔

عام مؤرخین حضرات کہتے ہیں کہ غزوۂ تبوک میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد تیس ہزار تھی، مگر مشہور مؤرخ امام واقدی فرماتے ہیں کہ یہ لشکر ستر ہزار نفوس پر مشتمل تھا۔ واللہ اعلم

صحیح بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ ایک شخص نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جہاد میں شرکت کی درخواست کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں! میرے والدین زندہ ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پھر جاؤ، ان کی خدمت کر کے جہاد کا ثواب حاصل کرو۔ اس سے یہی معلوم ہوا کہ جہاد فرضِ کفایہ ہے۔ جب مسلمانوں کی ایک جماعت نے فریضۂ جہاد کو قائم کیا ہوا ہو، تو باقی مسلمان دوسرے خدمتوں اور کاموں میں لگ سکتے ہیں، یعنی تعلیم، زراعت، تجارت، صنعت و حرفت وغیرہ میں، اور مال و متاع و اسلحہ و سواری و دیگر چیزوں کے ذریعہ مجاہدین، اور ان کے اہل و عیال کی خوب خدمت کریں، تا کہ وہ دلجمعی کے ساتھ فریضۂ جہاد کو آگے بڑھائیں۔

البتہ! اگر کسی وقت ہنگامی صورت حال کے پیش نظر مسلمانوں کا امام، یا اس کا نائب ضرورت سمجھ کر نفیرِ عام کا حکم دے، اور سب مسلمانوں کو شرکتِ جہاد کی دعوت دے، تو ایسے وقت میں جہاد سب مسلمان مردوں پر فرضِ عین ہو

جاتا ہے، بشرطِ عقل وبلوغ، تندرستی وطاقت، جبکہ عورتیں، بیمار، بوڑھے، معذور نابالغ اور مجنون و پاگل مستثنیٰ رہیں گے۔

قرآن کریم نے اسی بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ ٱنفِرُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ ٱثَّاقَلْتُمْ إِلَى ٱلْأَرْضِ﴾ [التوبۃ:۳۸] (مومنو! تمہیں کیا ہوا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں (جہاد کے لیے) نکلو، توتم بوجھل بن جاتے ہو (یعنی گھروں سے نکلنا نہیں چاہتے) تمہیں چاہئے کہ ایسے وقت چستی کے ساتھ حرکت کر کے میدان میں آؤ، اور جہاد میں (مستعدی) یعنی پوری تیاری کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔

مسئلہ:

جب جہاد فرضِ کفایہ ہو، تو اولاد کو بغیر اجازتِ والدین جہاد میں جانا جائز نہیں، جیسے عام نمازوں کا حکم ہے۔

آیت کریمہ کا مفہوم ومطلب یہ ہے کہ جہاد تمہارے اوپر فرض کیا گیا ہے، فرمایا: جہاد اگرچہ طبعی طور پر تمہیں گراں اور ناگوار معلوم ہوتا ہے، لیکن جب حقائق مستقبل میں تمہارے سامنے آئیں گے، تو معلوم ہو جائے گا کہ تمہارا خیال ہرگز درست نہیں تھا، اور جو حکم ملا تھا وہ ہزاروں فوائد پر مشتمل تھا، کیونکہ انسان ہر چند عقلمند و دانا ہو وہ حال اور استقبال دونوں کے نفع ونقصان سے بے خبر رہتا ہے۔ کبھی وہ کسی چیز کو مفید سمجھتا ہے، یا مضر ونقصان دہ، مگر وقت گزرنے پر نتیجہ برعکس برآمد ہوتا ہے۔ پس تسلیم ورضا پر عمل کرتے ہوئے اپنے سارے امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے، جس کے انتخاب میں کبھی کسی غلطی یا نقصان کا شائبہ بھی نہیں ہوگا، اللہ والے ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ جہاد سے طبعی ناگواری کی بناء پر بھاگنے والوں پر جب عذاب آیا، اور دشمن نے انہیں خاک وخون میں تڑپادیا، تب انہیں احساس ہوا کہ ہم نے بڑی تاریخی غلطی کی، جو جہاد جیسے مبارک عمل کو چھوڑ بیٹھے، اگر ہم جہاد پر عمل پیرا ہوتے، تو آج کا روز بد دیکھنے کی نوبت نہ آتی۔

اندلس پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ جب جہاد سے منحرف ہوئے، تو جو کچھ ہوا وہ قابلِ ذکر نہیں ہے۔ سقوطِ بغداد کے بعد چنگیز خان نے شاہی خزانوں کے معائنہ کے بعد یہی کہا کہ اگر ان خزانوں کا دسواں حصہ سپاہیوں پر خرچ ہوتا، تو میں اتنی آسانی کے ساتھ یہاں تک نہیں پہنچ سکتا، وغیرہ۔

يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلشَّهْرِ ٱلْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ وَكُفْرٌۢ بِهِۦ وَٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِۦ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ ٱللَّهِ ۚ وَٱلْفِتْنَةُ

اَكۡبَرُ مِنَ الۡقَتۡلِ ؕ وَلَا يَزَالُوۡنَ يُقَاتِلُوۡنَكُمۡ حَتّٰى يَرُدُّوۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِكُمۡ اِنِ اسۡتَطَاعُوۡا ؕ
وَمَنۡ يَّرۡتَدِدۡ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِهٖ فَيَمُتۡ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓـئِكَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِى الدُّنۡيَا
وَالۡاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِيۡنَ
هَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓـئِكَ يَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۲۱۸﴾

ترجمہ: آپ سے حرمت والے مہینے میں لڑائی سے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے: حرمت کے مہینے میں لڑائی لڑنا بڑا گناہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنا، اور اس کے ساتھ کفر کرنا، اور مسجد حرام سے روکنا، اور اس کے اہل کو وہاں سے نکالنا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا گناہ ہے، اور فتنہ قتل سے بڑا گناہ ہے، یہ کافر لوگ ہمیشہ تمہارے ساتھ لڑتے رہیں گے حتی کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں، اگر ان کو طاقت ہو، اور تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا، اور پھر مر جائے گا اس حال میں کہ وہ کفر کرنے والا ہے، پس یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت میں ضائع ہو گئے، اور یہی لوگ دوزخ والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۲۱۷﴾ بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے، اور جنہوں نے ہجرت کی، اور جہاد کیا، اللہ تعالیٰ کے راستے میں، یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے ﴿۲۱۸﴾

معارف ومنازل

﴿الشَّهۡرِ الۡحَرَامِ﴾ یعنی وہ چار مہینے جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے قتال وجدال ممنوع تھا۔ مشرکینِ عرب بڑی پابندی کے ساتھ ان مہینوں کا احترام کرتے تھے، اور کوئی جنگ وقتال نہیں کرتے تھے، اسی طرح چوری، ڈاکے، لوٹ مار وغیرہ اعمال سے بھی الگ تھلگ رہتے تھے۔ جنگِ بدر سے دو ماہ پہلے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی سرپرستی میں آٹھ آدمیوں کا سریہ مکہ کے مشرکین کے قافلہ پر حملہ کرنے کے لئے روانہ فرمایا تھا۔ اس قافلہ میں کُل چار آدمی تھے: عمرو بن الحضرمی، حکم بن کیسان، نوفل بن عبداللہ اور عثمان بن عبداللہ۔ مسلمانوں کے لشکر کا ایک شخص واقد بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے تیر چلایا، جس سے عمرو بن الحضرمی قتل ہوا۔

یہ مقامِ نخلہ کا واقعہ ہے، جہاں جنات کے وفد نے اسلام قبول کیا تھا، اور یہ مکہ وطائف کے درمیان میں ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قافلہ کا سامان اور اونٹوں پر قبضہ کر کے مالِ غنیمت جمع کیا، اور باقی تینوں افراد کو قیدی بنا کر

مدینہ منورہ لے آئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کہنا تھا کہ یہ حملہ ماہِ جمادیٰ الثانیہ کی تیس تاریخ کو ہوا، جبکہ ابھی تک رجب کا چاند نہیں ہوا تھا۔ اُدھر سے مشرکینِ مکہ نے زور وشور سے واویلا شروع کیا کہ یہ واقعہ پہلی رجب کا ہے، اور مسلمانوں نے شہرالحرام کی بے احترامی کی ہے، اور یہ پیغام سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں روانہ کیا۔ اس سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی پریشان ہوئے، اور ان کے لائے ہوئے مالِ غنیمت کو قبول نہیں فرمایا۔ اسی بارے میں ان آیتوں کا نزول ہوا۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مالِ غنیمت قبول فرما کر اس سے خمس الگ کر دیا۔

بہرحال! آیت کریمہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اے کفارِ مکہ! تمہیں دوسروں کی آنکھوں کا تنکہ تو نظر آیا، مگر اپنے پہاڑوں جتنے جرائم نظر نہیں آئے۔ تم ذرا اپنے جرائم پر نظر ڈالو، جو یہ ہیں:

(۱) لوگوں کو دینِ حق سے روکنا۔ (۲) کفر وشرک میں مبتلا ہونا۔ (۳) لوگوں کو مسجد حرام سے روکنا، اور مسجد حرام کو شرک کا گڑھ بنانا۔ (۴) مسجد حرام کے حقیقی وارثوں سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وہاں سے نکالنا، اور ہجرت پر مجبور کرنا۔ (۵) دینِ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف فتنہ بازی کرنا، اور مسلمانوں کو زبردستی مشرک بنانا۔ یہ پانچوں تمہارے جرائم نہایت سخت ہیں۔ تمہارا ایک ہی فتنہ کفر وشرک ہزاروں قتل سے بھی زیادہ مذموم اور خطرناک ہے۔ پہلے اپنے جرائم کو دیکھو! پھر دوسروں پر کسی ایک آدمی کے قتل کا بار ڈال دو، اور وہ بھی تاریخ میں غلطی کی وجہ سے ہوا۔ وہ تمہارے آدمی کو ہرگز قتل نہ کرتے، اگر ان کو معلوم ہوتا کہ آج پہلی رجب ہے۔

اب مسلمانوں کو خطاب ہے کہ اے مسلمانو! اس بات کو یاد رکھو کہ یہ کافر تمہیں دینِ اسلام سے ہٹانے کے لئے ہمیشہ لڑتے رہیں گے، اور اگر ان میں استطاعت وطاقت ہو، تو یہ تمہیں فوراً کافر ومرتد بنائیں گے، مگر یہ ہدایت سنو کہ اب جو کوئی تم میں سے ان کی بات مانے گا، اور ان سے مرعوب ہو کر مرتد ہو جائے گا، اور پھر اسی کفر وارتداد کی حالت میں مر جائے گا، تو ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا، اور اس کے تمام اعمال وحسنات اکارت وضائع ہو جائیں گے۔ خسر الدنیا والآخرۃ۔

اَشہرِ حرم میں حرمتِ قتال کا منسوخ ہونا:

فَالجَمهُورُ عَلٰی نَسخِهَا وَاِنَّ قِتَالَ المُشرِكِينَ فِي الأَشهُرِ الحَرَامِ مَبَاحٌ۔ [قرطبي] یعنی جمہور کا قول یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، اور اشہر حرم میں جہاد کا آغاز کرنا جائز ہے۔ تفسیر بیان القرآن میں ہے کہ روح المعانی اور کبیر میں اس آیت کے ذیل میں، اور بیضاوی میں سورۃ براءت کے پہلے رکوع کی تفسیر میں اشہر حرم میں حرمتِ قتال

کے منسوخ ہونے پر اجماعِ امت نقل کیا ہے، یعنی امت کا اس بات پر اجماع ہو چکا ہے کہ اب ان مہینوں میں اقدامی جہاد کی حرمت باقی نہیں رہی، جبکہ دفاعی جہاد کے جائز ہونے میں تو کسی کا کوئی اختلاف ہی نہیں ہے۔

خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ کے موقع پر ذوالقعدہ کے حرمت والے مہینے میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے جہاد اور موت پر بیعت لی تھی، اور اس آیت کے لئے ناسخ یہ آیات کریمہ ہیں: (۱) ﴿وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوهُمْ﴾ [النساء: ۸۹] (اور جہاں پاؤ قتل کردو)۔ (۲) ﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ﴾ [الأنفال: ۳۹] (اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے، اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے)۔ (۳) ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً﴾ [التوبة: ۳۶] (اور تم سب کے سب مشرکوں سے لڑو)۔

خلاصہ یہی ہے، اور خیر القرون اور اس کے بعد کے تمام زمانوں میں بلا اختلاف تمام علماء و فقہاء امصار کا یہی فتویٰ ہے، اور مجاہدینِ اسلام کا ہر قرن میں بھی اسی پر عمل جاری رہا ہے کہ اب بارہ مہینوں میں سے کسی بھی مہینے میں اقدامی جہاد ممنوع نہیں ہے۔ امام تفسیر عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر بعض تابعی حضرات فرماتے ہیں کہ یہ آیت محکم ہے، اور اشہر حرم میں اقدامی جہاد اب بھی جائز نہیں ہے۔ صاحب مظہری نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ کے قول کو نقل کر کے فرمایا: وَالْأُمَّةُ عَلٰى خِلَافِهِ فِي سَائِرِ الْأَمْصَارِ، اھ۔

فائدہ:

جمہور علماء اور اجماع کے خلاف اگر کوئی قول ہو، تو اس پر اعتماد اور فتویٰ جائز نہیں ہوتا، جیسے معوذتین کے بارے میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول جو کہ اجماعِ امت کے خلاف ہے، مزید تفصیل وہاں دیکھیں۔

قَالَ الْإِمَامُ الرَّازِيُّ علیہ الرحمۃ فِي الْكَبِيرِ وَالَّذِي عِنْدِي إِنَّ قَوْلَهُ تَعَالٰى قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ هٰذِهِ نَكِرَةٌ فِي سِيَاقِ الْإِثْبَاتِ فَيَتَنَاوَلُ فَرْدًا وَاحِدًا وَلَا يَتَنَاوَلُ كُلَّ الْأَفْرَادِ فَهٰذِهِ الْآيَةُ لَا دَلَالَةَ فِيهَا عَلٰى تَحْرِيمِ الْقِتَالِ مُطْلَقًا فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ فَلَا حَاجَةَ إِلٰى تَقْدِيرِ النَّسْخِ فِيهِ۔ [کبیر] فرماتے ہیں کہ جہاد تمام مہینوں میں جائز ہے، اور کسی مہینے میں اس کی عام حرمت نازل ہی نہیں ہوئی، اس لئے آیت کو منسوخ قرار دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

جہاں تک اس آیت کا تعلق ہے، تو اس میں صرف ایک مخصوص واقعہ کا بیان ہے، چنانچہ قتال نکرہ ہے سیاقِ اثبات میں ہے، اس لئے وہ ایک فرد پر مشتمل ہو سکتا ہے، نہ کہ تمام افراد پر۔

﴿الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ کا عطف اگر ﴿سَبِيلِ اللّٰهِ﴾ پر ہو، تو معنی یہ ہوگا: ﴿صَدٌّ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾

اور اگر اس کا عطف "بِہٖ" کی ضمیر پر ہو، تو مطلب یہ ہوگا: ﴿وَ كُفْرٌۢ بِالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ دونوں صحیح ہیں۔ صاحب روح المعانی نے "سَبِیْلِ اللّٰہِ" کے معنی میں چار اقوال بیان فرمائے ہیں: (۱) اسلام، یہ امام مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ (۲) حج، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ (۳) ہجرت۔ (۴) ہر وہ اطاعت اور نیکی جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندوں کا جوڑ پیدا کرے۔ مشرکینِ مکہ مسلمانوں کو ان چاروں چیزوں سے منع کرتے، اور روکتے تھے۔ [روح المعاني]

ایک ضروری تنبیہ:

﴿وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ میں بتلا دیا کہ مخالفینِ اسلام کبھی تمہارے خیر خواہ نہیں رہیں گے، بلکہ ہمیشہ بغض وعداوت کا عنصر ان کے دلوں میں پیوست رہے گا۔ اگر کسی مصلحت کے تحت کبھی تمہارے ساتھ کسی خیر خواہی کا ہاتھ بڑھائیں، تو ہوشیار رہنا، کیونکہ یہ قوم چالبازی اور فریب دہی میں بڑی ماہر اور چالاک ہے۔ یہ لوگ کبھی تمہارے ساتھ صلح نہیں کریں گے۔ ہر حال میں یا تو سرد جنگ پر، یا حقیقی جنگ پر آمادہ رہیں گے۔ اسی وجہ سے رازدانِ وحی سید المجاہدین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمہیں آگاہ و بیدار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "اَلْجِهَادُ مَاضٍ (جَارٍ) اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ" کیونکہ جہاد کی علت کفر وعناد اور فتنہ وفساد ہے۔ جب یہ دونوں قیامت تک جاری رہیں گے، تو ان کے خلاف تمہارا جہاد بھی قیامت تک جاری رہے گا۔

بدنصیب مرتد کے سارے اعمال غارت ہوجائیں گے:

﴿فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ یعنی ان لوگوں کے اعمال دنیا وآخرت میں غارت ہوجائیں گے۔ دنیا میں اعمال کا ضائع ہونا تو یہ ہے کہ اس کی بیوی کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر اس کا کوئی مورث مر جائے، تو اس کو میراث کا حصہ نہیں ملتا۔ حالتِ اسلام میں نماز، روزہ، حج وغیرہ عبادات میں سے جو کچھ کیا تھا سب کالعدم ہوجائیں گے۔ مرنے کے بعد اس پر نمازِ جنازہ نہیں ہوگی۔ مسلمانوں کے مقابر میں دفن نہیں ہوتا، اور آخرت میں اعمال کے ضائع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اَبدالآباد دوزخی ہوگا۔ کسی خیر ونیکی کا اسے ثواب نہیں ملے گا، اور اصلی کافر سے اس کی سزا سخت ہوگی۔

اگر یہ شخص دوبارہ مسلمان ہوجائے تو آخرت میں دوزخ سے بچنے، اور دنیا میں آئندہ کے لئے احکامِ اسلام کا جاری ہونا تو یقینی ہے، لیکن دنیا میں اگر حج کر چکا ہو، تو بشرطِ وسعت دوبارہ اس پر حج کا فرض ہونا یا نہ ہونا، اور آخرت

میں گزشتہ نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کا ثواب ملنا یا نہ ملنا، یہ اختلافی مسئلہ ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ دوبارہ حج کو فرض کہتے ہیں، اور گزشتہ نماز، روزہ وغیرہ پر ثواب ملنے کے قائل نہیں ہیں۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ دونوں امر میں اختلاف کرتے ہیں۔ گویا کہ دوبارہ اسلام سے ضائع شدہ اعمال دوبارہ معتبر اور زندہ ہو گئے۔ حقیقت الامر حق سبحانہ کی مرضی پر موقوف ہے۔ واللہ اعلم۔

مگر اصلی کافر کا معاملہ جدا ہے، اگر وہ حالت کفر میں بہت کچھ کارِ خیر انجام دینے کے بعد اسلام قبول کر لے، تو اسے گزشتہ نیکیوں کا برابر ثواب ملے گا، لیکن اگر اس نے اسلام قبول نہ کیا، تو اس کے سارے اعمال ضائع وغارت ہو جائیں گے، کیونکہ نیکیوں کی قبولیت کے لئے اسلام شرط ہے۔ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے جب اپنی نیکیوں کا تذکرہ کیا کہ میں نے بحالتِ کفر اتنے اتنے غلام اور کنیز آزاد کئے، فلاں فلاں خیر کا کام انجام دیا، تو کیا مجھے ان اعمال کا ثواب ملے گا؟ تو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "أسلمتَ علی ماسلفتَ مِنَ الْخیر"۔ (آپ ان نیکیوں کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئے جو آپ نے پہلے کی تھیں)۔ [مسلم]

رہا ارتداد سو وہ بہت بڑا جرم ہے، اسی وجہ سے مرتد واجب القتل ہے۔ اصلی کافر جزیہ دے کر اپنی جان چھڑا سکتا ہے، جبکہ مرتد سے جزیہ نہیں لیا جائے گا، اس کو مہلت دی جائے گی، اگر توبہ کی تو ٹھیک، ورنہ قتل ہی اس کا علاج ہے۔ اگر عورت ہو، تو زندگی بھر قید میں رہے گی، اگر توبہ کی تو نکال دی جائے گی، ورنہ قید ہی میں رہے گی۔ اَلْعِیَاذُ بِاللهِ مِنْ زَوَالِ الْاِیْمَانِ وَمِنْ شَرِّ الشَّیْطَانِ وَمِنْ سَخَطِ الرَّحْمٰنِ اَللّٰھُمَّ اخْتِمْ لَنَا بِخَیْرٍ وَّاحْفَظْنَا مِنَ الزَّیْغِ۔ آمین

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا﴾ [الآیۃ] بیشک! جو لوگ ایمان لائے، اور جنہوں نے (اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اور اپنے ایمان کے تحفظ واثبات کے لئے) ہجرت کی، اور (اللہ تعالیٰ کی راہ میں) جہاد کیا)۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حقیقی اور اصلی مہاجر وہ نہیں ہے جو محض وطن کو خیر باد کر کے چھوڑ دے، بلکہ اس کے ساتھ تمام معاصی اور گناہوں کو چھوڑ دے۔ [مشکوٰۃ]

﴿اُولٰٓئِكَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللهِ﴾ یہی لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے امیدوار ہیں، اور صحیح معنوں میں مستحق اور حقدار بھی ہیں، کیونکہ ﴿اِنَّ رَحْمَتَ اللهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ [الأعراف: ۵۶] اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے، وہ نیکوکاروں کو پورا پورا اجر دے گا۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ
وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ۭ
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ

ترجمہ: لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں، آپ کہہ دیجئے: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے، اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں، اور ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آیات بیان کرتا ہے، تاکہ تم فکر کرو ﴿۲۱۹﴾ دنیا اور آخرت کے بارے میں۔

معارف ومنازل

شراب کی حرمت کے متعلق تدریجاً چار دور گزرے ہیں، اور یہ اس لئے کہ شریعتِ اسلام نے احکامِ شرع میں انسانی خیالات ومعاشرتی جذبات کی بسا اوقات بڑی رعایت کی ہے، جو چیز یا کوئی عمل اگر صدیوں سے معاشرہ کا لازمی حصہ رہا ہو، تو ظاہر ہے کہ بیک جنبشِ قلم اس پر پابندی لگانا، اور لوگوں کو اس سے دور رہنے، اور اسے ترک کرنے کا حکم دینا ذرا مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہوتا ہے۔

صحیح بخاری میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ قرآن حکیم کا جس طرح نزول تدریجی رہا، اسی طرح محرّمات ومنہیات کے متعلق احکام بھی آہستہ آہستہ ذہن سازی کے بعد نازل ہوتے رہے۔ اگر شروع شروع میں یہ حکم نازل ہوتا کہ شراب حرام ہے، اس کا پینا چھوڑ دو، تو لوگوں پر گراں گزرتا، اور وہ بآسانی اس پر عمل نہ کر سکتے تھے، اسی بنیاد پر ہم کہتے ہیں قانونِ شرعی کے نفاذ سے پہلے لوگوں کی ذہن سازی ضروری ہے، پہلے ان کی ذہنی تربیت کی جائے، پھر عبادت وزہادت اور فکرِ آخرت کے کیمیاوی نسخے سے ان کے مزاجوں میں ایک بڑا انقلاب لاکر ایسے افراد پیدا کریں، جو سید عالم ہادی برحق صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی آواز وفرمان پر بلا تأمل لبیک کہتے ہوئے اپنی جان ومال، اولاد وآبرو سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائیں، اور سخت سے سخت حکم کو محبت وجذبات کے تقاضوں پر لمحوں میں مکمل کر کے اطاعت وفرمانبرداری کے نقوش رقم کریں۔

مکی زندگی کے پورے دور میں یہی افراد سازی کا کام، اور ذہنی تربیت کا کام ریاضتوں کے ذریعہ ہوتا رہا، جب ہر پہلو وہر شعبہ میں جان نثاروں کی جماعت تیار ہو گئی، تو قانون جاری کرنے کا سلسلہ آہستہ آہستہ شروع ہوا۔

جب بھی کوئی حکم نافذ ہوتا، تو بخوشی بغیر کسی جھجک کے اس پر محض یہ نہیں کہ عمل ہوتا، بلکہ اس پر عمل کرنے کو فخر وسعادت سمجھ کر اخلاص کا ثبوت پیش کرتے، چنانچہ شراب کی حرمت بھی اسی تدریجی عمل اور تربیت وذہن سازی کا حصہ رہی۔
چنانچہ یہ مرحلہ چار ادوار کے بعد ایسا مرتب ہوا، اور ایسے خوش اسلوبی سے طے پایا کہ صدیوں کے شرابی اور خمار پرست، جو اٹھتے بیٹھتے، چلتے، پھرتے، سوتے، جاگتے شراب پینے میں مست اور مخمور رہتے تھے، پانی کی جگہ بھی شراب پیتے تھے (جیسے ہمارے زمانہ کی چائے، اور بوتل)۔

تقریباً دو پہر کے وقفہ کے ساتھ جب آسمانی وحی نے شراب پر پابندی لگادی، تو فوراً رحمتِ عالم محسنِ اعظم ﷺ نے سید المؤذنین بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: بلال! یہ اعلان کرو، اور بلند آواز سے کہو: "اَلَاإِنَّ الْخَمرَ قَدْ حُرِّمَتْ"۔ بس یہ اعلان سنتے ہی مدینہ میں شراب پر قیامت آگئی، ذہنی طور پر لوگ پہلے سے تیار ہو چکے تھے۔ ظہر کی اذان تک مدینہ کے راستوں، گلیوں اور میدانوں میں بارش کے پانی کی طرح شراب بہتی رہی۔ حنتم اور دیگر ہر قسم کے چھوٹے بڑے برتن، جن میں شراب بنتی یا رکھی جاتی یا پی جاتی تھی، ریزہ ریزہ ہو کر بکھرے پڑے رہے، اور پھینک دیئے گئے۔ باہر سے آنے والے مدینہ پہنچنے سے پہلے تجارت کی غرض سے جو شراب یہاں لا رہے تھے، وہاں میدانوں میں اپنے مالِ تجارت کو ضائع کر کے مدینہ پہنچے۔

حرمتِ شراب کے چار اَدوار:

(۱) ...... چار اَدوار میں سے پہلا دور مکی ہے، اور اس وقت شراب کو نعمت نہ سہی، ایک استعمال کی چیز ضرور بتایا گیا تھا، جو کہ سورۃ النحل کی آیت میں وارد ہے: ﴿تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا﴾ [النحل:٦٧] (تم پینے کی چیزیں تیار کرتے ہو کہ ان سے شراب بناتے ہو)۔

(۲) ...... دوسرا دور یہی ہے، جو فرمایا: ﴿قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ اس میں قدرے تنبیہ ہے کہ شراب کے کچھ فوائد بھی ہیں، اور کچھ نقصانات بھی، مگر نقصانات فوائد سے زیادہ ہیں، تو یہاں پر بھی حرمت کا حکم نہیں لگایا گیا۔

(۳) ...... تیسرا دور وہ ہے کہ کچھ لوگوں نے شراب پی کر فوراً نماز کا اہتمام کیا، مغرب کا وقت تھا، جو شخص امامت کرا رہا تھا، وہ بھی شراب کے نشہ میں تھا۔ نماز میں "سورۃ الکفرون" اس طرح پڑھی کہ کلمۂ "لا" کو ترک کر کے ﴿اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ﴾ پڑھ لی، اس پر سورۃ النساء کی آیت نازل ہوئی: ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ

سُكٰرٰى﴾[النساء:۴۳] (نماز کے قریب بھی مت جاؤ جب تم نشہ میں ہو)۔ یہ حکم پہلے حکم سے مؤکد ہے۔اس حکم سے چند سمجھدار لوگوں نے شراب پینا چھوڑ دی، مگر دوسرے لوگوں نے عذر پیش کیا کہ اس سے شراب حرام تو نہیں ہوئی، اگر نماز کے اوقات کے علاوہ پی جائے تو قباحت نہیں ہے۔

(۴)...... چوتھا دور یہ ہوا کہ ایک عام دعوتِ طعام میں مہاجرین وانصار نے حسبِ عادت شراب پی کر کچھ شعروشاعری کی مجلس شروع کی، ایک مہاجر نے چند اشعار پیش کیے، جن سے انصار ناراض ہوئے، اور ایک انصاری نوجوان نے مہاجرین پر حملہ کر کے اسے زخمی کیا، اس طرح ناراضگی کے ساتھ یہ مجلس برخاست ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور دیگر چند حضرات دربارِ رسالت پہنچے اور دعا کی درخواست کی، اس پر سورۃ مائدہ کی آیات: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ﴾[المائدۃ:۹۰] (اے ایمان والو! شراب، جوا، بتوں کے تھان اور جوے کے تیر، یہ سب ناپاک شیطانی کام ہیں، لہٰذا ان سے بچو، تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو) کا نزول ہوا، اور ہمیشہ کے لئے اس اُمُّ الْخَبَائِثِ اور اُمُّ الْفَوَاحِشِ پر پابندی لگ گئی۔ اس آیت کریمہ نے محض شراب نہیں، بلکہ قمار، جوا، انصاب اور ازلام سب کو ناپاک ونجس قرار دے کر اہلِ ایمان کو سختی سے منع فرمایا۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر اپنے مقام پر ان شاء اللہ بیان ہوگی۔

تدریجی احکام کا خلاصہ:

اللہ تعالیٰ کی رحمت وحکمت کا تقاضا تھا کہ اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں بڑی تدریج سے کام لیا۔ شراب کی تدریجی حرمت اور ممانعت کی قرآنی ہدایات کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں شراب کے متعلق جو چار آیتیں نازل ہوئیں، ان میں سے یہ موجودہ آیت کریمہ جس کی تفسیر ہو رہی ہے: ﴿وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ نے شراب کو حرام قرار نہیں دیا، بلکہ اختصار کے ساتھ اس کے فوائد وکثرتِ نقصانات ومفاسد پر تنبیہ کردی۔

شراب کے مظنونہ فوائد، اور واقعی مفاسد کا بیان:

واضح ہو کہ شراب ایک ایسی غذاء یا مشروب ہے، جو کہ فطرتِ انسانی سے متصادم اور فطری شرافت کی سراسر مخالف ہے۔ قدیم عرب میں جہاں ہر طرف کفر ومعاصی کا دور دورہ رہا، وہاں حلال وحرام کی بھی کوئی تمیز وشناخت نہ رہی۔ لوگ بڑے فخر ومباہات کے ساتھ شراب پی کر لوگوں پر اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کرتے، اور جتنی کثرت سے محفلوں میں شراب کا دور چلا کر اقوامِ عالم پر اپنی برتری، شجاعت، بہادری، غیرت، دلیری، سخاوت منوانے کی

کوشش کرتے، یہ عمل ان کی تاریخ کا حصہ اور نمایاں کردار رہا۔

ٹھیک اسی بھیانک معاشرے میں چند ایک سنجیدہ اور دور اندیش، عقلمند لوگ بھی تھے، جنہوں نے اس عمل کو عقل وفطرت اور انسانی شرافت کا دشمن سمجھ کر ہمیشہ کے لئے ترک کیا، اور اس معاشرے سے الگ تھلگ رہے۔ جناب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یارسول اللہ! میں نے نہ کسی بت کا سجدہ کیا، نہ جہالت کے زمانہ میں زنا کیا، اور نہ ہی شراب پی۔ اسی طرح کا اقرار جناب حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ اور دیگر چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کا واقعہ آخر میں آنے والا ہے۔

قبل از اسلام دوسرے لوگ اور عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اگر شراب پی ہے، تو وہ اس لئے قابلِ ملامت نہیں کہ ان کا معاشرہ ایک کافرانہ معاشرہ تھا، پھر جب وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے، تو اسلام نے یک لخت اس چیز سے انہیں منع نہیں کیا، کیونکہ آئے دن لوگ اسلام قبول کر رہے ہوتے تھے، ابھی تک ان کی تربیت مکمل نہیں ہوئی تھی، انتظار ہو رہا تھا، تربیت کی پختگی کے ساتھ اب تدریجی مراحل کے آخر میں جب حکم ملا کہ شراب حرام ہے، تو انہوں نے ایک ایسی تاریخی جرأت وہمت اور اتباعِ حق کا مظاہرہ کیا، جسے تاریخِ عالم نے سنہرے حروف کے ساتھ اپنے اوراق میں ضبط کیا۔

جس طرح تحریمِ خمر میں ابتداءً تدریج پر عمل ہوا، جو کہ حکمت کا تقاضا تھا، پھر جب شراب کی حرمت کا فیصلہ ہوا، تو بتقاضائے حکمت ومصلحت اسے اُم الخبائث واُم الفواحش قرار دے کر اس کے متعلق سخت وعیدیں اور سخت سزائیں مقرر ہوئیں، چنانچہ ہادی برحق محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک آدمی میں ایمان اور شراب جمع نہیں ہو سکتے۔ [نسائی] یہ کتنا بڑا بھاری نقصان ہے کہ شرابی مؤمن نہیں رہ سکتا؟ اور شرابی رفتہ رفتہ ایمان کی دولت سے محروم ہو جائے گا۔ اسی بنا پر علماء کرام نے فرمایا کہ اکثر شرابیوں کا ایمان پر خاتمہ نہیں ہوتا، اور وہ بے ایمان مرتے ہیں۔ نعوذ باللہ

آج کل مسلم ممالک اور مسلم معاشرے میں لوگ (مرد، عورت بچوں تک) شراب کو دودھ اور پانی کی طرح بلاخوف وخطر استعمال کرتے ہیں، اور گھروں میں سستی اور بے قیمت شراب بنانے اور تیار کرنے کا سلسلہ جاری ہوتا ہے۔ شراب کیا کوئی مشکل چیز ہے؟ بالکل آسانی کے ساتھ معمولی کم قیمت پر ردی چیزوں سے بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جن لوگوں پر قہر وغضب ہو، وہ اس ناپاک چیز کو بڑی بڑی قیمتیں دے کر خریدتے ہیں۔ ایک شرابی شخص

نے جس نے شراب سے توبہ کی تھی، بتایا کہ شراب اور انسانی پیشاب کا رنگ وذائقہ بعینہ ایک ہوتا ہے، اور ہم نے یہ تجربہ بھی کیا کہ شراب کی بوتل سے شراب بہا کر گرادیا، پھر بوتل کو انسانی پیشاب سے بھر کر وہیں رکھ دیا، بڑے صاحب نے جب شراب مانگی، تو یہی بوتل اس کی خدمت میں پیش کی، اُس نے خوب پی لی، اور سو گیا، اس کو پتہ ہی نہ چلا کہ اس نے شراب پی ہے یا پیشاب۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شراب کے بارے میں دس آدمیوں پر لعنت فرمائی: (۱) نچوڑنے والا۔ (۲) بنانے والا۔ (۳) پینے والا۔ (۴) پلانے والا۔ (۵) اس کو اٹھا کر لانے والا۔ (۶) اور جس کے لئے لائی جائے۔ (۷) اس کا بیچنے والا۔ (۸) خریدنے والا۔ (۹) اس کو ہبہ کرنے والا۔ (۱۰) اس کی آمدنی کھانے والا۔ [ترمذي]

اس حدیث کا مقصد کتنا واضح ہے؟ کہ جو بھی شراب کے معاملے میں کسی قسم کا معاون ہوگا، یا اس ناپاک چیز کے کسی شعبہ میں ملوث ہوگا، وہ اس لعنت اور پھٹکار کا مستحق ہوگا، اور یہی حکم شراب کے علاوہ دیگر مخدرات ومنشیات کا بھی ہے، مثلاً چرس، افیون، بھنگ، ہیروئن وغیرہ، یہ سارے ایک ناپاک درخت کی پیداوار ہیں، اور ان کا پینا، تجارت کرنا، بنانا اور فروخت کرنا، اسی علّت کے تحت مذموم وحرام ہیں، اور ایسے لوگ لعنت کے حقدار و مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس لعنت سے بچنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

اس کے علاوہ شراب ومنشیات کے مفاسد اور خرابیاں اتنی کثیر، وسیع اور گہری ہیں کہ شاید کسی دوسری چیز میں اتنے مفاسد ومضرات نہ ہوں۔

ایک دفعہ ایسا واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص نے بکثرت شراب پی لی، اور بے خودی کے عالم میں بیوی اور چاروں بچوں کو نشے کی حالت میں ذبح کیا، پھر کپڑے اتار کر ننگے ہوکر باہر سڑک پر نکلا، اور جس کو بھی دیکھا، اس کو مارنے کی دھمکی دی۔ پس پولیس نے اسے گرفتار کیا۔ یہ واقعہ قاہرہ مصر میں ۱۹۷۲ء میں پیش آیا تھا، جسے اس وقت کے اخبارات نے باقاعدہ شائع کیا تھا۔

اطباء، ڈاکٹروں اور ماہرینِ حیوانات ونفسیات نے متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ شراب کے فوائد اس کے نقصانات کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہیں، اور اس کے مفاسد ونقصانات تقریباً چالیس سے بھی زائد ہیں۔ واللہ اعلم

پس شراب کے فوائد کیا ہیں؟ لوگوں میں جو مشہور ہے کہ طبیعت میں نشاط پیدا کرتی ہے، عارضی اور وقتی طور

قوت وشہوت کو ابھارتی ہے، یہی وجہ ہے کہ عیاشی کے کلبوں، محفلوں میں جہاں مرد وزن کا اختلاط ہوتا ہے، یورپ کی تقلید کرتے ہوئے لوگ بکثرت شراب پیتے ہیں، پھر اپنا منہ سیاہ کر کے سب کچھ کر گزرتے ہیں۔ یہی خاصیت خنزیر کے گوشت اور اس کی چربی میں ہے۔ جو لوگ خداوند تعالیٰ سے نہیں شرماتے، اور اس کے ساتھ شرک کر کے ناپاک و نجس ہوتے ہیں، وہ شراب، زنا اور خنزیر کے گوشت کھانے سے کیا شرمائیں؟ "الخبیثت للخبیثین"... اور جو مسلمان ان کی تقلید پر فخر محسوس کرتے ہیں، وہ بھی انہیں میں شمار ہوتے ہیں۔ من أحب قوما فهو منهم صحیح اور حقیقی معنوں میں مسلمان وہ ہے، جو قرآن وحدیث کا مقلد ہو وہ ہرگز کسی بھی قیمت پر شرابی اور زانی نہیں ہوتا، اور جو یہود و نصاریٰ کا مقلد ہوگا، وہ ہرگز مسلمان شمار نہیں ہوگا۔ اسلام کسی گفتار اور ملکی شناختی کارڈ کا نام نہیں ہے، اسلام اتباعِ حق اور عمل وکردار کا نام ہے۔ اس دنیا میں اگر کوئی لوگوں کو دھوکہ دے، تو میدان وسیع ہے، دے دے، مگر کوئی اللہ تعالیٰ کو نہ دھوکہ دے سکتا ہے، اور نہ اس سے چھپ سکتا ہے۔

میسر، قمار اور جوا کا بیان:

☆......ابواب البِرّ کے پندرہویں حکم شراب کے بعد جوئے کی حرمت کا بیان ہے، جسے قرآن حکیم نے شراب کے ساتھ بیان کر کے اشارہ کیا کہ یہ گناہ بھی شراب کا ہم پلہ، اور اس کی طرح بھاری ہے۔

"مَیْسِرْ" مصدر ہے، اصل لغت میں اس کے معنی تقسیم کرنے کے ہیں، یاسر تقسیم کرنے والے کو کہتے ہیں۔ جاہلیت کے زمانے میں عرب میں مختلف قسم کے جوئے رائج تھے، جن میں ایک قسم یہ بھی تھی کہ اونٹ ذبح کر کے اس کے حصے تقسیم کرنے میں جوا کھیلا جاتا تھا۔ بعض کو ایک یا زیادہ حصے ملتے، بعض بالکل محروم رہتے تھے۔ محروم رہنے والے کو پورے اونٹ کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی، اور گوشت فقراء میں تقسیم کرتے۔ اس قسم کی سخاوت پر فخر کرتے تھے، اور جو شخص اس جوئے میں شریک ہوتا، وہ سخی کہلاتا، اور جو شریک نہ ہوتا، وہ کنجوس اور بخیل کہلاتا تھا۔ تقسیم کی مناسبت سے قمار کو میسر کہا جاتا ہے۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین حضرات اس بات پر متفق ہیں کہ میسر میں قمار، یعنی جوئے کی تمام صورتیں داخل ہیں، اور سب حرام ہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اور امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی اپنی تفسیروں میں نقل کیا ہے کہ مفسر قرآن حضرات عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم، امام قتادہ، معاویہ بن صالح، عطاء اور طاؤس رحمہم اللہ نے فرمایا: المیسر القمار حتی لعب الصبیان بالکعاب والجوز، یعنی ہر قسم کا قمار میسر ہے، یہاں تک کہ بچوں کا کھیل لکڑی کے گٹکوں

اوراخروٹ وغیرہ کے ساتھ۔اورحضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:"المخاطرۃ من القمار" یعنی مخاطرہ قمار میں سے ہے۔[جصاص] محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جس کام میں مخاطرہ ہو، وہ میسر میں داخل ہے۔[روح البیان]

"مخاطرۃ" کے معنی ہیں کہ ایسا معاملہ کیا جائے جونفع ونقصان کے درمیان دائر ہو، یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ بہت سا مال مل جائے، اور یہ بھی ہو کہ کچھ نہ ملے، (جیسے آج کل عرب ممالک میں اونٹوں، گاڑیوں، گھوڑوں اور کھلاڑیوں وغیرہ کی ریس ہے)۔اسی طرح ہمارے مسلمان ممالک وغیرہ میں لاٹری کے مختلف طریقے ایجاد ہوئے ہیں، اورنہایت جوش وخروش کے ساتھ چل رہے ہیں۔آج وہ زمانہ قربِ قیامت کا ہے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والے بیانوے فیصد غیرشرعی محرمات اوراعمال سیئہ کے ذریعہ مال جمع کر رہے ہیں۔انہیں صرف مال سے محبت ہے، بلکہ اسلام اوراسلامی اصولوں کواپنی دنیاوی ترقی میں حائل اوررکاوٹ سمجھتے ہیں۔اگرکوئی انہیں اس طرف متوجہ کرنا چاہے توکفرتک باتیں سناتے ہیں، اورصاف انکارکرکے دین کی توہین کے مرتکب ہوجاتے ہیں۔

میسراورقمار، یعنی غیرشرعی جوئے کی تعریف یہ ہے کہ جس معاملہ میں کسی مال کا مالک بنانے کوایسی شرط پر موقوف رکھاجائے، جس کے وجودوعدم کی دونوں جانبین مساوی ہوں، اوراسی بناء پرنفعِ خالص اورتاوانِ خالص برداشت کرنے کی دونوں جانبین بھی برابرہوں، میسراورقمار ہے۔[شامي جلد ۵ کتاب الحظر والإباحة] مثلاً یہ بھی احتمال ہے کہ زید پرتاوان پڑجائے، اوریہ بھی ہے کہ عمرو پر پڑھائے، اس کی جتنی قسمیں اورصورتیں پہلے زمانے میں رائج تھیں، یا آج کل رائج ہیں، یا آئندہ پیدا ہوں، وہ سب میسراورقماراورجوا کہلائیں گی۔معمّی حل کرنے کا چلتا ہوا کاروبار، اورتجارتی لاٹری کی عام صورتیں سب اس میں داخل ہیں۔

ہاں! اگرصرف ایک جانب سے انعام مقررکیاجائے کہ جوشخص فلاں کام کرے گا، اس کو یہ انعام ملے گا، اس میں مضائقہ نہیں ہے، بشرطیکہ اس شخص سے کوئی فیس یاچندہ وصول نہ کیاجائے، کیونکہ اس میں معاملہ نفع وضرر کے درمیان دائرنہیں ہوتا، بلکہ نفع اورعدمِ نفع کے درمیان دائر ہے۔[معارف القرآن]

اسی لئے احادیثِ صحیحہ میں شطرنج اورچوسروغیرہ کوحرام قراردیا گیا ہے، جن میں مال کی ہارجیت پائی جاتی ہے۔اگرتاش میں روپیہ کی ہارجیت ہو، تووہ بھی حرام میسر میں داخل ہے۔

صحیح مسلم میں بروایت بُریدہ رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ سیدکائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جوشخص نردشیر (چوسر) کھیلتا ہے، وہ گویا خنزیر کے گوشت اورخون میں اپنے ہاتھ رنگتا ہے۔اورحضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ شطرنج، میسر، یعنی

جوئے میں داخل ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ شطرنج نردشیر سے بھی زیادہ بُری ہے۔ [ابن کثیر]

ابتداءِ اسلام میں شراب کی طرح قمار بھی جائز تھا کہ مکہ شریف میں جب سورۃ روم کی آیات: ﴿غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ﴾ [الروم: ۲] نازل ہوئیں، اور قرآن حکیم نے خبر دی کہ اس وقت روم اگرچہ اپنے حریف کسریٰ فارس سے مغلوب ہو گیا، لیکن چند سال بعد پھر رومی غالب آجائیں گے، تو مشرکینِ مکہ (جو کہ کسریٰ کے حامی تھے) نے انکار کیا، اور قرآنی پیشینگوئی کا مذاق اڑایا، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے اسی طرح قمار کی شرط ٹھہرائی، اور سو اونٹ پر شرط لگائی کہ اتنے سال میں اگر رومی غالب آگئے تو تمہیں سو اونٹ دینا پڑیں گے۔

یہ شرط مان لی گئی، اور وہ واقعہ غزوۂ بدر کے ایّام میں قرآنی پیشینگوئی کے مطابق پیش آیا۔ رومی غالب آگئے، اور کسریٰ والے مغلوب ہو گئے، تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ مال وصول کیا، اور سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس واقعہ پر اظہارِ مسرت فرمایا، مگر مال کو صدقہ کرنے کا حکم دے دیا، کیونکہ جو چیز چند وقت بعد آئندہ حرام ہونے والی تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ طیب وطاہر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حلال ہونے کے زمانے میں بھی اس طرح کی چیزوں سے محفوظ فرما دیا تھا۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے شراب اور قمار سے باوجود حلال وجائز ہونے کے اجتناب فرمایا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی فطرت سارے جہاں کی فطرتوں سے اسی طرح افضل ہے جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات اقدس تمام مخلوقات سے افضل ہے۔ شراب جس زمانے میں حلال تھی، وہ حلت اپنی جگہ، مگر اس میں جونشہ اور بےخودی کی کیفیت ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ کیفیت بھی مذموم اور ناپسندیدہ ہے۔ نبوت کا مقام چونکہ بہت ہی اونچا ہے، وہاں تک تو یہ کیفیت پہنچ ہی نہیں سکتی، مگر جن بندگانِ خاص کو نبوت کے ساتھ کوئی مناسبت ہو یہ کیفیت ان تک بھی نہیں پہنچی، جیسے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عثمان غنی، حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہم اور دیگر بہت سے اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنہوں نے زمانۂ کفر میں بھی برائیوں سے اجتناب کیا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خبر دی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی چار خصلتیں زیادہ محبوب ہیں۔ آنحضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ میں وہ چار پسندیدہ خصلتیں کیا ہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اب تک کسی سے اس کا اظہار نہیں کیا تھا، مگر جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو خبر دے دی، تو عرض کرتا ہوں کہ وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ جب میں نے دیکھا کہ شراب عقل کو

زائل کردیتی ہے، اس لئے میں کبھی اس کے پاس نہیں گیا، اور میں نے بتوں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں نہ نفع ہے اور نہ نقصان، تو میں نے جاہلیت میں بھی کبھی بت پرستی نہیں کی، اور مجھے اپنی بیوی اورلڑکیوں کے معاملہ میں سخت غیرت ہے، اس لئے میں نے کبھی زنا نہیں کیا، اور میں نے دیکھا کہ جھوٹ بولنا دناءت اور رزالت کی بات ہے، اس لئے میں نے جہالت کے زمانہ میں بھی کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ [روح البیان]

شراب اور قمار کے سماجی اور اجتماعی نقصانات:

اللہ ربّ العزّت نے اس جہاں کو جس رنگ وکیفیت، اور جن خواص ومنافع اور مضرتوں کے ساتھ پیدافرمایا ہے، یہ صرف اس کی ذات پاک کی حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے۔ بے چارہ انسان ساری عمر اگران حکمتوں پر غور کرتا رہے، سوائے چندایک چیزوں کے باقی بے شمار چیزوں تک کبھی اس کی رسائی نہ ہو، اور وہ ہتھیار ڈال دے، اور اپنے عجز وناتوانی کا اعتراف کرے۔ آپ اگر یہ دیکھنا چاہیں کہ صرف چیزوں کے خواص تک میری رسائی ہو، تو یہ بھی ممکن نہیں، اس سلسلے میں عقلاء نے خاص کر یونانی حکماء نے زندگیاں صرف کیں، انہیں کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ البتہ! یہ ہوا کہ ایک حکیم نے جو کچھ معلوم کیا، دوسرے نے اس کی تردید اور انکار کیا۔ انسان کی حیثیت ایک کرنے والے کی ہے، اس کی رسائی حقائقِ اشیاء تک نہیں ہوسکتی۔

ہاں! اللہ تعالیٰ جو **خالق الأشياء وموجد الخواص والصفات في الأشياء** ہیں، اگروحی کے ذریعہ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو ان حقائق سے مطلع کریں، تو برحق ہے، اور اسی کا نام شریعت ہے، جس میں حلال وحرام، جائز وناجائز، نفع ونقصان اور منفعت ومضرت کا بیان ہے کہ ﴿اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰو﴾ [البقرۃ:۲۷۵] (اللہ نے خرید وفروخت کو حلال کردیا ہے، اور سود کو حرام کردیا ہے) یہ فرق شریعت نے واضح کیا۔ انسان یہ فرق ہرگز نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح شراب وجوا میں جو فوائد ونقصانات ہیں، انسان کی وہاں تک رسائی نہیں ہوسکتی، ورنہ کب سے انہیں ترک کیا ہوتا، اس کی نظر صرف ظاہری منفعتوں تک محدود ہے۔ **واللہ أعلم بالصواب**

اس تمہید کے ذہین نشین ہونے کے بعد معلوم ہونا چاہئے کہ جوئے کے متعلق قرآن حکیم کا وہی فیصلہ ہے، جو شراب کے متعلق معلوم ہوا، کہ ان چیزوں میں منفعت معدود، اور مضرات ونقصانات غیر معدود ہیں، اور یہ نقصانات ذاتی اور نفسی بھی ہیں، اور خاندانی وسماجی اور معاشرتی بھی۔ اگر کسی چیز کے نقصانات اتنی کثرت سے ہوں، عقلمند وسنجیدہ لوگوں کے نزدیک وہ واجب الترک ہوگی، تاکہ اس کے نقصانات سے سماج اور معاشرہ درہم برہم نہ ہو، اور انسانی

زندگی ایک غیر یقینی کشمکش میں تباہ وبرباد نہ ہو۔

پس یہ واضح ہے کہ جوئے میں یہ منفعت سب کو معلوم ہے کہ اگر جیت جائے، تو بیٹھے بیٹھے بغیر محنت کے ایک بدحال فقیر آدمی ایک ہی مجلس میں بڑا مالدار و سرمایہ دار بن جائے، مگر اس کی معاشی، سماجی، اجتماعی اور روحانی خرابیاں اور مفاسد بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اس کا اجمالی بیان یہ ہے کہ جوئے کا سارا کھیل اس پر دائر ہے کہ ایک شخص کا نفع دوسرے کی تباہی پر ضرور موقوف ہے۔ جیتنے والے کا فائدہ ہی فائدہ، ہارنے والے کا نقصان ہی نقصان (یہاں سے عداوت و دشمنی کی تخم ریزی ہوگئی) اور اس کاروبار سے کوئی دولت و سرمایہ بڑھتا نہیں، اور پیداوار میں کوئی اضافہ بھی نہیں ہوتا، جس سے ملکی ترقی ہو، بلکہ دولت اسی طرح منجمد حالت میں رہتی ہے۔

اس کھیل کے ذریعہ ایک کی دولت وخوشحالی سلب ہوکر دوسرے کے پاس پہنچ جاتی ہے، جس میں ایک خاندان کی تباہی، دوسرے خاندان کی خوشحالی ہے، اس لئے یہ قمار (جوا) مجموعی حیثیت سے قوم کی تباہی اور انسانی شرافت واخلاق کی موت ہے کہ جس انسان کو نفع رسانی اور ایثار و ہمدردی کا پیکر ہونا چاہئے تھا، وہ ایک خونخوار درندہ کی خاصیت وخصلت اختیار کرلے کہ دوسرے بھائی کی موت میں اپنی زندگی، اور اس کی مصیبت میں اپنی پوری قابلیت اس خودغرضی پر صرف کرے۔

بخلاف تجارت (بیع اور شرا) کے، اور اس کی تمام جائز صورتوں کے، کہ ان میں یہ بے رحمی اور یہ خودغرضی نہیں ہوتی، وہاں طرفین کا معقول فائدہ ہوتا ہے، ایک کا مال بکتا ہے، دوسرے کے پیسے صرف ہوتے ہیں، اور بذریعۂ تجارت اُموال کے تبادلہ سے ملکی دولت بڑھتی ہے، اور اُموال کے تبادلہ سے پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے، گرانی ختم ہوجاتی ہے، جس سے لوگوں کی ضروریاتِ زندگی بآسانی پوری ہوجاتی ہیں، پرانے مال کے نکلنے سے نئے مال کی آمد شروع ہوتی ہے، اور بائع ومشتری دونوں کا فائدہ ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جوئے کو قرآن حکیم نے مَیسِر کے نام سے یادفرمایا، مَیسِر کے معنی ہیں: ''آسانی'' تو جوئے میں بھی ایک شخص دوسرے کے مال پر بغیر محنت ومشقت کے آسانی سے قابض ہوجاتا ہے، تو یہ نہایت قبیح عمل ہے۔ اس کا نقصان نہایت واضح ہے کہ ایسے لوگ معاشرے پر بوجھ بن جاتے ہیں۔ کسب ومعاش، محنت ومزدوری جیسے بابرکت عمل کو چھوڑ کر بلا مشقت اور محنت کے رات دن اس ہوس میں صرف کرتے ہیں کہ کسی طرح لوگوں کا صفایا کریں۔

تیسری بات جو انتہائی مہلک ہے، وہ یہ ہے کہ اس کاروبار کا نشہ شراب کے نشے سے بھی بدتر ہے، بسا اوقات جواری کے پاس پیسہ نہیں ہوتا، تو دکان، سواری، رہائشی مکان کو شرط لگا کر پیش کرتا ہے، اور کئی مواقع پر ایسا بھی ہوا ہے کہ بیوی، ماں، بہن اور پاکدامن خاندانی عورتوں پر شرط لگا کر ہار جاتا ہے، پھر جو کچھ ہوتا ہے، وہ ناقابلِ بیان ہے، اسی طرح شراب میں بھی یہی برائی ہے، کہ بسا اوقات اجتماعی صورت میں شراب پی کر بیہوشی کے عالم میں محرمات (بہن، بیٹی) کے ساتھ منہ کالا کرتا ہے، اس طرح کے واقعات بہت زیادہ ہیں۔

چوتھی بات یہ بھی ہے کہ شرابی و جواری دونوں سے نورِ ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ ان کے قلوب پر شیطان کا تسلّط اور اس کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے، اور ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے دائرے سے خارج ہو جاتے ہیں۔ نعوذباللہ منہ

پانچواں نقصان یہ ہے کہ شراب کی طرح جوا بھی آپس میں لڑائی، جھگڑے اور عداوت و دشمنی کا سبب ہوتا ہے۔ ہارنے والے کو طبعی طور پر جیت جانے والے سے نفرت اور عداوت پیدا ہو جاتی ہے، جس سے اس کے اندر انتقام کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، پھر اس کا دائرۂ انتقام دوسروں تک وسیع ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ قتل و قتال کی نوبت آجاتی ہے۔

چھٹا نقصان یہ ہے کہ بغیر معقول معاوضہ کے، اور بغیر دوسرے رفیق کی رضامندی کے اس کے مال پر قبضہ کرنا، از روئے شرع و عرف عام میں حرام اور ناجائز ہے۔

ساتواں نقصان یہ ہے کہ ایک شخص کی پچاس ساٹھ سالہ محنت سے جمع شدہ مال پر لمحوں میں قبضہ کرنا، اور اس کی زندگی کو داؤ پر لگانا کہ وہ خودکشی پر مجبور ہو جائے، یہ کتنا بڑا جرم ہے؟

اس کے علاوہ شراب اور جوئے کے مفاسد اتنے بکثرت ہیں، جنہیں اگر شمار کیا جائے تو چالیس سے متجاوز ہوں گے، جبکہ فوائد تین چار سے زائد نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے مسلمان بندوں پر رحم فرمائے، اور انہیں ہدایت کا راستہ صراطِ مستقیم نصیب فرمائے۔ آمین [معارف، انوار البیان، انوار القرآن، مظہری وغیرہ]

﴿يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کس قدر خرچ کریں؟

☆...... یہ ابواب البرّ کا سولہواں حکم ہے۔ آپ جواب میں یہ فرمایئے: ﴿الْعَفْوَ﴾، یعنی جو اپنی ضرورت سے زائد ہو، وہ خرچ کر دیں۔ انسان کے ذمہ جو حقوق واجب ہیں، خواہ حقوق اللہ کے قبیل سے ہوں، یا حقوق العباد

میں سے ہوں، وہ ہر حال میں فرض وواجب کے زمرے میں شامل رہیں گے، چونکہ آیت کریمہ میں ضرورت سے زائد چیز خرچ کرنے کا حکم ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرض واجب کے متعلق نہیں ہے، کیونکہ زکوٰۃ وغیرہ کی مقدار مقرر ہے، مگر یہاں زائد چیز کے خرچ کرنے کا حکم ہے، تو اس سے مراد صدقہ، خیرات اور دیگر نفلی اخراجات ہیں، لہٰذا مطلب واضح ہے کہ نفلی صدقات میں اپنے اہل وعیال اور ذاتی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے زائد مال کو خرچ کرو، اگر زائد مال تمہارے پاس نہیں، صرف اتنا کچھ ہے، جو تمہاری ضرورت کو کفایت کرے، تو خرچ ہی نہ کرو۔

یہ اچھی بات نہیں کہ بیوی بچوں کی حق تلفی کرتے ہوئے محض ثواب کے پیش نظر دوسروں پر خرچ کرو، یا قرضداروں کے قرضے ادا نہ کرو، اور صدقات دے دو۔ یہ اس وجہ سے کہ زائد از ضرورت مال کے خرچ کرنے سے پریشانی اور بے صبری لاحق نہیں ہوتی، اگر اپنی ضروریات کو نظر انداز کر کے مال خرچ کیا جائے، اور بچت کچھ نہ ہو تو پھر اپنی ضروریات کی وجہ سے پریشانی بھی ہوتی ہے، اور بے صبری کے ساتھ پشیمانی بھی، اس لیے یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہوگا۔

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ﴾ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے فائدے میں احکام بیان کرتا ہے، تاکہ تم غور وفکر اور تدبر کرو دنیا وآخرت کے بارے میں، جہاں تمہیں چند آیت پہلے یہی سبق ملا تھا کہ: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً...﴾ [البقرۃ: ۲۰۱] مقصد یہ ہے کہ دنیوی ضروریات اور حقوق کو بھی ذہن میں رکھو، کسی کے حقوق میں کمی اور حق تلفی نہ کرو، اسی طرح اخروی نجات اور ثواب کو بھی ذہن میں رکھو، جو مال تمہاری ضروریات سے زائد ہو، اسے ذخیرہ بنا کر کنجوس نہ بنو، بلکہ اس میں سے کچھ اللہ تعالیٰ کی رضا میں والدین، اقرباء، مساکین، یتامیٰ، مجاہدین، وابن السبیل اور دیگر مستحقین پر خرچ کرو، تاکہ آخرت کا توشہ تمہارے لئے احسن طریقہ پر مہیا ہو۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

ترجمہ: اور تم سے یتیموں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، کہہ دو کہ ان کی (خالت کی) اصلاح بہت اچھا کام ہے اور اگر تم ان سے مل جل کر رہنا (یعنی خرچ اکٹھا رکھنا) چاہو تو وہ تمہارے بھائی ہیں، اور خدا تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ خرابی کرنے والا کون ہے؟ اور اصلاح کرنے والا کون؟ اور اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو تم کو تکلیف میں ڈال دیتا، بے شک! خدا تعالیٰ غالب (اور) حکمت والا ہے ﴿۲۲۰﴾

معارف ومنازل

☆......ابواب البرّ کے سلسلے میں سترہویں حکم کا بیان ہے کہ یتیموں کی سرپرستی کرو، اوران کے اموال کی اچھی طرح دیکھ بھال کرو، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾[الإسراء: ۳۴] سو (یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ، سوائے احسن طریقہ کے)۔ عرب میں یہ عام بے رحمانہ رواج تھا، کہ لوگ یتیم کے مال پر قبضہ کر کے اسے محروم رکھتے تھے، اوردھکا دے کر خالی ہاتھ گھروں سے نکالتے تھے۔ سورۃ الماعون میں ارشاد ہے: ﴿فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ﴾[الماعون: ۲] (یہ وہی (بدبخت) ہے، جو یتیم کو دھکے دیتا ہے)۔

اسلام نے اپنی پاکیزہ تعلیمات کی روشنی میں یتیموں کی سرپرستی کرتے ہوئے لوگوں کو خبردار کیا، ارشاد ہوا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا﴾[النساء: ۱۰] (جولوگ یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں، اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے)۔ اس پرلوگ ڈر گئے، اور جولوگ یتیموں کے نگران وسرپرست تھے، انہوں نے اپنے زیرِ کفالت یتیموں کی ہر چیز الگ کردی، ان کا آٹا، گھی، نمک لکڑیاں سب الگ رکھتے تھے، پھر اگر کوئی بچہ کم کھاتا اور کھانا بچ جاتا، تو اس کو ہاتھ نہ لگاتے، وہ خراب ہو کر سڑ جاتا، تو پھینک دیتے، اور پھینکنے پر بھی پریشان ہوتے، اور خوف کھاتے۔

غرض یہ کہ احتیاط تو ہوئی اور مال محفوظ بھی ہوا، لیکن اس میں روزمرہ کی تکلیف ہوتی، اور پھینکنے کی صورت میں یتیم کا مال ضائع بھی ہوجاتا تھا، اس پر لوگوں نے سوال کیا، اور پوچھا، تو اللہ تعالیٰ شانہ نے جواب دیا جو کہ بالکل واضح ہے کہ اصل مقصد تو یتیم کے حال، اوراس کے مال کی حفاظت ونگرانی، اوراس کی اصلاح ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے اگر مال کی علیحدگی میں یتیم کا فائدہ ہو، تو اس کو اختیار کرلو، اور اگر اپنے مال کے ساتھ ملانے میں فائدہ ہو، تو اس کو اختیار کرلو۔ ہم بدنیتی اور نیک نیتی دونوں سے باخبر ہیں، یعنی اصلاح اور افساد دونوں کو جانتے ہیں۔ اس اختلاط و اشتراک دونوں میں مضائقہ نہیں ہے، جس میں تم کو آسانی ہو، اور یتیم کو نقصان نہ ہو، اختیار کرلو۔

اگر نیک نیتی کے ساتھ اشتراک کرنے والے سے کچھ کمی بیشی ہوجائے گی، تو مؤاخذہ نہ ہوگا، اور بدنیتی سے اشتراک کے ساتھ نیت فساد کی ہوگی، تو اس کی ضرور گرفت ومؤاخذہ ہوجائے گا۔ جو چیز خراب ہونے والی ہے، اس کو ملالینا چاہئے، مثلاً گوشت، دال یہ ملا کر پکالو، ہاں! آٹا، لکڑیاں وغیرہ یہ علیحدہ رکھو۔ اشیاء کو ملانے کی صورت میں خرچ اندازے سے ہوگا، اگر یتیم کا کچھ حصہ تمہاری طرف آجائے گا، اور کبھی تمہارا کچھ حصہ اس کی طرف چلا جائے گا، تو یہ

موجبِ مؤاخذہ نہ ہوگا، کیونکہ ادھر کا نقصان اُدھر سے پورا ہو جائے گا۔

یاد رہے کہ یہ اس صورت میں ہے کہ یتیم کا نگران غریب ہو، یا اخراجات کے بارے میں سخت ہو، اور اگر یتیم کا نگران مالدار ہو، اور دریا دل سخی ہو، تو ایسے لوگ یتیموں کے مال کو ہاتھ تک نہیں لگاتے، اور اپنے مال سے لباس و دیگر ضروریات تک مفت ان کی کفالت کرتے ہیں۔ الحمدللہ اسلامی معاشرے میں ایسے جوانمردوں کی کوئی کمی نہیں، انہیں لوگوں کے حق میں یتیموں کے سرپرستِ اعلیٰ سید عالم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ''اَنَا وَ کَافِلُ الْیَتِیْمِ کَھَاتَیْنِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَاَشَارَ بِالسَّبَابَةِ وَالْوُسْطٰی''۔ [متفق علیه] (یتیم کی کفالت کرنے والا قیامت کے دن مجھ سے اتنا قریب ہوگا جیسے یہ دو انگلیاں، یعنی درمیانی اور شہادت کی انگلیاں) جو کہ متصل ہیں۔

فرمایا: بہر حال یہ تمہارے بھائی ہیں، اگر مسلمان کی اولاد ہیں، تو دینی بھائی ہیں، اور اگر کوئی کافر کا بچہ ہے، جو یتیم ہے، تب بھی بنی نوعِ انسان آپس میں تو بھائی شمار ہوں گے۔ پھر فرمایا کہ یہ حکم صرف تمہاری آسانی کی خاطر ہے کہ تمہیں مالِ یتیم کے ملانے اور نہ ملانے کا اختیار دیا گیا، اور تمہاری مرضی پر اس کو چھوڑا گیا:

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ﴾ (اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا) اور حکم دیتا کہ یتیموں کا خرچ لازماً علیحدہ رکھو، پھر تمہارے لئے ایسا کرنا نہایت دشوار اور پریشان کن ہو جاتا، لہٰذا تمہیں اختیار ملا کہ ہر وہ کام کرو، جس میں یتیم کے مال کی اصلاح اور نگہداشت ہو، اور تم پر بوجھ نہ ہو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ (بیشک! اللہ تعالیٰ کمال قوت والا اور حکمت والا ہے) اس کا ہر حکم حکمت اور مصلحت پر مبنی ہے، اور یہ حکم بھی ہزاروں حکمتوں پر مشتمل ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٢١﴾

ترجمہ: اور مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں، البتہ ایک ایماندار لونڈی مشرکہ عورت سے بہتر ہے، چاہے وہ تم کو اچھی معلوم ہو۔ اور مشرک مردوں کے ساتھ نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں، البتہ ایماندار غلام مشرک سے بہتر ہے، چاہے وہ تم کو اچھا معلوم ہو، یہ لوگ (مشرک) دوزخ کی

طرف بلاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ بلاتا ہے جنت اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے، اور بیان کرتا ہے اپنے احکام لوگوں کے لئے تا کہ وہ نصیحت قبول کرلیں ﴿۲۲۱﴾

معارف ومنازل

☆......ابواب البرّ کے سلسلے میں اٹھارہواں حکم مناکحتِ کفار کے بیان میں ہے۔اس حکم میں ایمان کی فضیلت وبرتری کا بیان ہے، اور مؤمنین کی طہارت اور ﴿خَيْرُ الْبَرِيَّةِ﴾ ہونے کی خوشخبری ہے۔اسی طرح مشرکین کی ناپاکی، اور ان کے لئے ﴿شَرُّ الْبَرِيَّةِ﴾ ہونے کا پیغام ہے۔جس طرح فرمایا: ﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ﴾ [التوبۃ:۲۸] (بیشک مشرک ناپاک ہیں، وہ مسجد حرام کے قریب نہ جائیں) آج یہ موازنہ ہورہا ہے کہ جس ناپاک شخص کو مسجد حرام میں داخلہ کی اجازت نہیں، اسی طرح اسے مسجد الحرام کی طرف رخ کرنے والی مسلمان عورت کے حریم میں بھی داخلہ کی اجازت نہیں، اسی طرح مسلمان مرد کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے پاکیزہ حریم میں کسی ناپاک مشرک عورت کو داخلہ کی اجازت دے، اور اس کو اپنے نکاح میں رکھے۔

شانِ نزولِ آیتِ مناکحت:

حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے پاس ایک کالی سیاہ فام لونڈی تھی، انہوں نے ایک روز غصہ میں آکر اسے ایک طمانچہ (تھپڑ) ماردیا، پھر گھبرائے ہوئے رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، سردار دو جہان صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس لونڈی کا کیا حال ہے؟ یعنی وہ مسلمان ہے یا کافرہ ہے؟ جس کو تم نے مارا، اور معافی کے لئے میرے پاس آئے۔عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول (اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) وہ روزہ رکھتی ہے، نماز پڑھتی ہے، اچھی طرح وضو کرتی ہے، اللہ تعالیٰ کی توحید اور آپ کی رسالت کی گواہی دیتی ہے۔سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر تو وہ مؤمنہ ہے۔عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: خدا کی قسم میں اس کو آزاد کرکے اس سے نکاح کرلوں گا، چنانچہ اسے آزاد کرکے جب انہوں نے اس سے نکاح کیا، تو لوگ منہ جوڑنے لگے، یعنی لوگوں نے طعنہ دینا شروع کیا، جس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ ایک مؤمنہ لونڈی مشرکہ عورت سے ہزار درجہ بہتر ہے۔[کشف الرحمن]

آیت کریمہ کا خلاصہ:

آیت کریمہ کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان مرد کسی غیر مسلم عورت سے شادی نہیں کرسکتا، خواہ وہ غیر مسلم عورت کوئی بھی ہو۔اسی طرح مسلمان عورت کسی غیر مسلم کے نکاح میں نہیں دی جاسکتی، وہ غیر مسلم کوئی بھی ہو۔اسی طرح کوئی

غیر مسلم مرد خواہ کتنا ہی باکمال، تعلیم یافتہ، خوبصورت اور مالدار ہو، ایک ادنیٰ مسلمان کے ساتھ برابر نہیں ہوسکتا، خواہ وہ مفلوک الحال غلام ہی کیوں نہ ہو۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ایک غیر مسلم عورت، جو حسن و جمال میں یکتا ہو، ایک معمولی مسلمان لونڈی کے ساتھ برابر نہیں ہوسکتی۔

ان چاروں چیزوں کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ ہے: ﴿لَا يَسْتَوِىٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ﴾[الحشر: ۲۰] (آگ والے اور جنت والے برابر نہیں ہوسکتے) جنتی لوگ اور جنتی اعمال کی طرف دعوت دینے اور بلانے والے لوگوں کے ساتھ وہ لوگ ہرگز برابر نہیں ہوسکتے، جو دوزخی ہوں، اور دوزخ کی طرف دعوت دینے والے ہوں، کیونکہ جنت و دوزخ جب برابر نہیں، تو ان کے اہل مسلم اور غیر مسلم کیونکر برابر ہوسکتے ہیں؟

الغرض! اس سلسلے میں چار صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱)......مرد مسلمان ہو، عورت غیر مسلم ہو۔

(۲)......مرد مسلمان ہو، عورت کتابیہ ہو۔

(۳)......عورت مسلمان ہو، مرد غیر مسلم ہو۔

(۴)......عورت مسلمان ہو مرد اہل کتاب ہو۔

ان چاروں صورتوں میں صرف دوسری صورت جائز ہے۔ باقی تینوں صورتیں ناجائز اور حرام ہیں۔ اور دوسری صورت جو جائز ہے، اس میں بھی اس امر کی پابندی ضروری ہے کہ وہ کتابیہ عورت صحیح معنی میں واقعی کتابیہ ہو۔ صحیح معنی میں کتابیہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات پر، یومِ آخرت اور نبوت و رسالت کے ساتھ ساتھ آسمانی کتابوں پر اس کا ایمان ہو۔ آج کل کے اہلِ کتاب کی طرح نہ ہو، کہ نہ تو اللہ تعالیٰ کے قائل ہیں، اور نہ ہی روزِ قیامت، اور حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام، تورات و انجیل اور زبور کو مانتے ہیں۔ اِلّا ماشاء اللہ "وقلیل مَاھم"۔

جیسے آج کل ہمارے تعلیم یافتہ لوگ، یا وہ لوگ جو عرصہ دراز سے یورپ مین رہتے بستے ہیں، اور وہاں مقیم ہیں۔ اپنے دینِ اسلام کے ساتھ وابستہ ہیں، اور وہاں اس بنیاد پر یورپی عورتوں کے ساتھ شادی کرتے ہیں کہ وہ لوگ اہلِ کتاب ہیں، حالانکہ وہ لوگ نہ عیسائی ہیں، نہ یہودی، انہیں کسی دین کا پتہ ہی نہیں، لامذہبیت والحاد وہاں اتنا عام ہے کہ لوگ اپنے کسی عقیدے سے واقف ہی نہیں، لہٰذا ایسے مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ تحقیق کریں، مذہب معلوم کیے بغیر وہاں کی عورتوں سے شادی نہ کریں۔

اسی طرح بعض مسلمان بھی آج کل نئے نئے عقائد اختیار کررہے ہیں، اور عقائد واعمال میں یورپین اقوام کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کہ خاندانی مسلمان ہیں۔ آگے اتنے روشن خیال ہوئے ہیں کہ انہیں اسلام کے ابجد تک کا نہ علم ہے، اور نہ ہی کچھ جانتے ہیں۔ اللہ رحم فرمائے! صرف نام کے مسلمان ہیں، باقی کچھ بھی نہیں معلوم، یہی لوگ ہیں جو کبھی بجائے "اللہ جل جلالہ" کے "اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کہتے ہیں، پس نکاح سے پہلے ان کے بھی خیالات وعقائد کی خوب تحقیق کر لینی چاہئے۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے لکھا ہے، اور احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلی امتوں میں مؤمن مرد اور مشرک عورت، یا مؤمنہ عورت اور مشرک مرد کے درمیان نکاح جائز تھا۔ نکاح کے معاملہ میں مسلم وغیر مسلم میں امتیاز نہیں ہوتا تھا، خود قرآن کریم نے بھی اس کی گواہی دی ہے: ﴿ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ ﴾ [التحریم: ۱۰] (نوح اور لوط کی بیویاں ہمارے دو صالح بندوں کے نکاح میں تھیں)۔ حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویاں کافرہ تھیں۔

اب شریعت محمدیہ (علے نبیہا الصلوٰۃ والسلام) میں جو کہ اُفضل الشرائع، اُکمل الشرائع اور اُکرم الشرائع ہے، مشرکہ، کافرہ عورت سے مطلقاً مسلمان مردوں کا نکاح حرام اور ناجائز وباطل ہے۔ خواہ مشرکہ عورت بنیادی مشرکہ ہو، جیسے کسی بت پرست ہندو کی ماں، بہن بیٹی، یا نام کے اعتبار سے مسلمان ہو، اور عقیدہ کے اعتبار سے کافرہ ہو، یعنی وہ عورت یا مرد، جو کہ اللہ تعالیٰ شانہ کے علم یا قدرت یا تصرف یا کسی دوسری مخصوص صفت میں کسی بڑی ہستی کو شریک یا حصہ دار یا مماثل تسلیم کرے، تو وہ مشرک ہی ہوگا، خواہ وہ اسلام کا مدّعی اور صوم وصلوٰۃ کا پابند کیوں نہ ہو۔

اگر کوئی شخص کسی بڑی ہستی کے متعلق یہ عقیدہ رکھے کہ وہ عزّت وذلّت، یا رزق وروزی، یا تندرستی وصحت، یا اولاد، یا مال، یا کوئی رتبہ ومرتبہ دینے پر قادر ہے، یا اس کو سجدہ کرے، یا اسے عالم الغیب یقین کرے، تو وہ مشرک ہی ہوگا۔ اگر یہ عورت ہو، تو موحد مرد پر اس کا نکاح حرام ہے، اور اگر یہ کوئی مرد ہو، تو مؤمنہ موحدہ عورت کا نکاح اس کے ساتھ حرام ہے۔ اسی طرح اہلسنت مرد وعورت کا نکاح بھی اہل تشیع کے ساتھ حرام ہے، اور ہرگز منعقد نہیں ہوتا۔ نکاح کا معاملہ چونکہ بڑا اہم ہے، اس لئے نکاح سے پہلے جس طرح مال ودولت، شرافت، تعلیم، نسب وغیرہ کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرنے کے بعد لوگ اقدام کرتے ہیں، چاہئے کہ دیگر تمام امور کی نسبت زیادہ تحقیق ومعلومات عقائد کے متعلق فراہم کی جائیں، جو کہ سب سے اصلی بنیادی اور ضروری چیز ہے۔

تو فرمایا کہ: ''مسلمان لونڈی، مشرکہ بیوی سے، اور مؤمن غلام آزاد مشرک مرد سے بہتر ہیں''۔ یہ ایک کھلی اور حقیقی وشرعی دستور العمل ہے، کہ شرافتِ اسلامی کفر کی تمام شرافتوں سے اعلیٰ اور برگزیدہ ہے۔ دنیا کے سارے کافر مل کر ربّ العزّت کے نزدیک ایک ادنیٰ اور کمتر درجہ کے ایک مسلمان کے ساتھ برابر وہم پلّہ نہیں ہوسکتے۔ یہ کفار خواہ کسی جہت سے بھی اچھے با کمال اور عمدہ کیوں نہ ہوں، لیکن وہ مسلمان سے کمتر اور اس کے مقابلہ میں حقیر و معمولی شمار ہوں گے، اور اس کی دلیل یہ دی کہ ''مشرک آگ کی طرف بلاتے اور دعوت دیتے ہیں''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نکاح کی وجہ سے جو مقارنت و مخالطت حاصل ہوگی، وہ محرّک اور سبب بنے گی کفر اور شرک کی، اور کفر و شرک موجبِ نار ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ میاں بیوی میں زیادہ مؤثر باطل عقیدہ ہی ہوگا، جہاں نفس و شیطان کی شرارت ساتھ ہوگی، تو مشرکانہ عقیدہ کا موحدانہ عقیدہ پر غلبہ زیادہ ہوگا، جیسے کہ عام برائیوں کا حال سب کو معلوم ہے، کیونکہ تعمیر میں وقت زیادہ لگتا ہے، جبکہ تخریب نہایت آسان بھی ہے، اور اس میں وقت کم صرف ہوتا ہے۔

البتہ! یہ احتمال کتابیہ عورت میں بھی ہے، مگر ذرا کم ہے، کیونکہ مرد کی عموماً عورت پر حکمرانی غالب ہی رہتی ہے۔ شاید وہ کتابیہ عورت سے متاثر نہ ہو، لیکن اگر وہاں بھی بعض قرائن سے نقصان کا گمان اور اگر ظن غالب ہو تو مسلمان مرد پر پابندی لگ سکتی ہے کہ کتابیہ عورت سے شادی نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ مسلمان عورتوں کو چھوڑ کر نصرانیہ یا یہودیہ عورتوں سے نکاح کو نہایت قبیح، اور ایک قسم کی ناشکری بتا کر سختی سے منع فرماتے تھے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے بہت سے آثار نقل کئے ہیں جن میں سے بعض کی سند اگرچہ ضعیف ہے، مگر بعض کی سند صحیح ہے کہ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے نصرانی عورتوں سے نکاح کیا تھا (شام و فارس کے جہاد کے دوران) حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ بڑے ناراض ہوئے، اور انہیں سخت جھڑک دیا، غصہ کیا، اور انہیں حکم بھیجا کہ نصرانیہ عورتوں کو چھوڑ دو۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے پیغام دیا کہ کیا امیر المؤمنین یہ نکاح ناجائز ہے؟ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اس کو حرام نہیں کہتا لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم اس طرح کہیں مسلمان عورتوں کو معطل نہ کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کی روایت نقل کی ہے کہ دیندار مؤمنات سے نکاح کیا کرو۔

ان تمام باتوں کا ماحصل یہ ہے کہ کتابیات سے نکاح اگرچہ مباح ہے، مگر بہتر نہیں ہے، کیونکہ کفر کا اثر کتنا ہی ضعیف اور کمزور کیوں نہ ہو، لیکن پھر بھی کتابیہ کے اختلاط سے جو خطرات ہیں ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خاص کر

ہمارے اس موجودہ زمانہ میں کہ اکثر و بیشتر مرد لوگ اپنے دین وشریعت کے اتباع میں کمزور ہیں۔صحیح عقائدِ حقّہ سے مکمل ناواقف ہیں، اور تجربہ شاہد ہے کہ وہ زمانہ گزر گیا جہاں حکمرانی مرد کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔آج مشرق سے لے کر مغرب تک عورت کی حکمرانی ہے، مرد بیچارہ برائے نام مرد ہے، پس حالات کا یہی تقاضا ہے کہ بدعقیدہ عورتوں سے مکمل اجتناب کیا جائے، کیونکہ ہمارے اپنے مشاہدے کی بات ہے کہ کئی مسلمان مردوں نے جنت کا استحقاق ضائع کیا، اور بیوی (کافرہ) کی طرح دوزخ کی نذر ہوگئے۔ **العیاذ باللہ**

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ کے راسخ العقیدہ مسلمانوں کے لئے عیسائی عورتوں کے نکاح میں خطرہ محسوس کیا تھا، اگر آج وہ ہماری صفوں میں ہوتے، تو عیسائی تو دور کی بات ہے، آج کی عام بدعقیدہ مسلمان عورتوں کے نکاح پر بھی پابندی لگادیتے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے اور مشورہ کو وہ مقام حاصل ہے، جو بقول محدّث ومؤرخ عالم اسلام کے مایہ ناز محقق علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ پچیس مسائل میں وحی الٰہی نے جناب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے اور مشورہ کی تائید کی ہے۔سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ گزشتہ امتوں میں بہت سے محدَّث (بفتح الدال) پیدا ہوئے، میری امت کا محدَّث عمر بن الخطاب ہے۔محدَّث اس کو کہتے ہیں جس کی رائے کو وحی کی تائید حاصل ہو۔

حضرت حذیفہ اور طلحہ عبید اللہ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جو مقام حاصل ہے، وہ نہایت اونچا ہے۔اول الذکر صاحب السر والامانۃ کے مقام پر فائز ہیں، دوم عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ان راسخ العقیدہ عظیم ہستیوں کے لئے عیسائی عورت کو پسند یا گوارا نہیں کرتے، تو ہمارے موجودہ مسلمانوں کے لئے کیا گنجائش رہتی ہے؟ بالخصوص ایک ایسے دور میں جہاں ''مسلمان'' عیسائی یورپی ملکوں کے زیر اقتدار ہوں، اور مسلمان اپنی نااہلی کی وجہ سے اسلامی اقتدار سے محروم ہوں۔مشرق وسطیٰ کے جوانوں کی اسلامی حمیت وغیرت پر اسرائیلی خوبصورت دوشیزاؤں نے شب خون مارا، اور بجلی کی کرنٹ کے ذریعہ اسلامی خون ان کے بدن سے اتار کر خشک کیا۔

یہ واضح ہو کہ جس کتابیہ عورت سے نکاح جائز ہے، یہ وہ عورت ہے جو مسلمان سے عیسائی نہ ہوئی ہو، یعنی پہلے مسلمان تھی، پھر عیسائی ہوگئی، بلکہ اس کتابیہ عورت سے نکاح جائز تھا، جو پہلے سے ہی، یعنی بنیاد سے عیسائی ہو۔مرتدہ عورت واجب القتل ہے، اس کے ساتھ نکاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: اس سے بڑھ کر اور شرک کیا ہوگا کہ بیوی کہے: ''میرا ربّ عیسیٰ ہے، اور شوہر کہے میرا ربّ اللہ تعالیٰ ہے''۔ [بخاري]

مطلب یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ عیسائی عورتوں کو مشرک شمار کرتے، اوران کے ساتھ نکاح کی اجازت نہ دیتے،

یہاں سے یہ مسئلہ بھی واضح ہوا کہ جس طرح ابتداءً مشرک عورتوں کے ساتھ مسلمان مردوں کو نکاح کی اجازت نہیں ہے، اسی طرح مشرک مردوں کو خواہ وہ کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں، مسلمان عورتوں کو ان کے نکاح میں دینا بھی حرام اور ناجائز ہے۔ اسی طرح موحد میاں بیوی میں سے اگر کسی نے شرک کا ارتکاب کیا، یا کسی ہستی کا سجدہ کیا، یا کسی ہستی کے لئے جانور نامزد کیا، یا مافوق الاسباب امور میں غیر اللہ کو اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک مانا، تو یہ بھی شرک ہے، جس کی وجہ سے اس کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ مگر عوام الناس بوجہ بے دینی اور جہالت کے ایسے خطرات سے غافل رہتے ہیں، کیونکہ وہ مشرک صرف ہندو اور بدھ مت یا سکھوں کو کہتے ہیں، خود ہزاروں شرک کرتے ہیں، اور اس کو اپنے گھر کی لونڈی سمجھتے ہیں۔ حضرت حالی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا۔

کرے غیر جب بت کا پوجا تو کافر ☆ جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر

مگر مؤمنوں پر کشادہ ہیں راہیں ☆ پرستش کرے شوق سے جس کا چاہیں

نہ ایمان بگڑے نہ اسلام جائے

نکاح میں کفو و برابری کی حیثیت:

عام خرید و فروخت کے معاملات میں لوگ بڑی سنجیدگی اور ہوشیاری سے کام لیتے ہیں، حالانکہ خرید و فروخت والا مال محض کاروبار اور پیسہ کمانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ آج کوئی مال خریدا، کل اسے بلا خوف و خطر بیچ دیا۔ نکاح کا معاملہ دنیوی نہیں، یہ سراسر مذہبی اور دینی معاملہ ہے، اس میں انسانی شرافت اور نسلِ انسانی کے بہترین اقدار و خوبیوں کا تحفظ ہے۔ صرف شوہر اور بیوی کی محبت و جنسی تعلقات تک یہ سلسلہ محدود نہیں ہے، بلکہ دونوں کے خاندانوں تک یہ سلسلہ پھیل کر بسا اوقات اس سے بھی آگے دو قبیلوں میں، اور اس کے افراد تک یہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں اسلامی شریعت نے یہ واضح کیا کہ یہ ہمہ گیر خوبیاں، اور وسیع تعلقات اور محبتیں اس وقت حاصل ہو سکتی ہیں اور بارآور بنتی ہیں، جب زوجین میں شرافت خاندانی، عمر، مال و سرمایہ اور خاص کر دین و تقویٰ میں برابری ہو۔ باقی ساری چیزیں ایک حد تک نظر انداز ہو سکتی ہیں، مگر دین و تقویٰ کا معاملہ سرفہرست رہے گا، اور کبھی بھی نظر انداز نہیں ہو سکتا۔ جب زوجین میں صفتِ ایمان موجود ہو، تو صرف اس پر جانبین قناعت نہیں کر سکتے، حتی کہ طہارت و تقویٰ جیسی صفت کی مسلسل تلاش بھی رہتی ہے، اور اسے لازمی شرط کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

ایک عورت صاف کہتی ہے کہ میں پابند صوم و صلوٰۃ ہوتے ہوئے کس طرح اس مرد سے شادی کروں جو کہ

نمازی نہیں؟ یہی بات اس کے دوسرے رشتہ دار بھی کہتے ہیں، اسی طرح ایک عالم وفاضل حافظ وقاری ایک ایسی عورت کے ساتھ رشتہ کرنے پر کبھی تیار نہیں کہ جس کے والدین اوران کی بچی بے دین ہو۔

یہاں سب کچھ اعمال کی بحث ہورہی ہے، اگر بات عقیدہ تک پہنچتی ہے، تو ہر صاحبِ عقل یہی سوچنے پر مجبور ہوگا کہ مشرک، کافر، قادیانی، ہندو، یہودی، نصرانی، شیعہ وغیرہ کی عورتوں کے ساتھ نکاح خودکشی سے شاید کم نہ ہو۔ اسی طرح ایک مسلمان عورت کا ان کے ساتھ رشتہ کرانے کا یہی مطلب ہوگا کہ لختِ جگر کی زندگی تباہ کریں، اور اسے روزمرہ موت سے بدتر کیفیت کے ساتھ مبتلا کیا جائے۔ ہر وضو ونماز پر اس کے ساتھ جھگڑا ہو، اس کے معبودِ برحق کی توہین ہو، اوراسے جنت اور جنتی استحقاق سے محروم کرکے دوزخ کا ایندھن بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ مسلمانوں کو دین وحمیت اور تقویٰ وطہارت نصیب فرمائے۔ (آمین)

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا
تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫
وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾

ترجمہ: اورلوگ آپ سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے: وہ گندی چیز ہے، لہٰذا تم حالتِ حیض میں عورتوں کی ہم بستری سے علیحدہ رہا کرو، اور جب تک وہ پاک نہ ہوجائیں ان سے ہم بستری نہ کیا کرو، پھر جب وہ اچھی طرح پاک ہوجائیں، توجہاں سے تم کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے وہاں سے ان کے پاس جاؤ، یقیناً اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے، اور پاک صاف رہنے والوں سے محبت رکھتا ہے ﴿۲۲۲﴾ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں، سو اپنی کھیتی میں جس روش سے چاہو آؤ، اوراپنے لئے آگے بھی کچھ بھیجو، اوراللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اوراس بات کو اچھی طرح جان لو کہ تم یقیناً اس کے حضور میں پیش ہونے والے ہو، اوراے پیغمبر! آپ ایمان والوں کو بشارت دے دیجئے ﴿۲۲۳﴾

☆ ☆ ☆

معارف ومنازل

☆......ابواب البرّ کا سلسلہ چل رہا ہے، یہ انیسواں حکم ہے۔''**المحیض**'' مصدر میمی ہے، جیسے **المجی** اور **المبیت**۔ مدینہ منورہ میں بڑی تعداد میں یہود آباد تھے۔ ان میں قدیم زمانہ سے یہ رواج تھا کہ حالتِ حیض میں عورت کو ناپاک سمجھتے تھے، اور اس سے اتنی نفرت کرتے تھے، کہ اسے گھر سے باہر نکال کر ایک جھونپڑی میں ایامِ حیض گزارنے پر مجبور کرتے تھے۔ اس سے بات چیت، نشست و برخاست تک سے پرہیز کرتے تھے۔ اگر اس کا ہاتھ کسی برتن یا کپڑے پر لگ جاتا، تو اس کو مردار اور ناپاک سمجھتے تھے، جبکہ دیگر اقوام (مشرکین، نصاریٰ، مجوس وغیرہ) ایامِ حیض میں سب کچھ کرتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس سلسلے میں سوالات کئے، تو یہ آیتیں نازل ہوئیں، جو کہ افراط و تفریط کو چھوڑ کر اعتدال کی رہنمائی کرتی ہیں، اور محض یہ نہیں، بلکہ اسلامی شرعی احکام کا ہر موقع پر یہی حکم ہوتا ہے کہ ہر چیز اعتدال پر ہو، فرمایا: ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ [البقرۃ:۱۴۳] (اور اسی طرح ہم نے تم کو امتِ معتدل بنایا ہے)۔ اَلْوَسَطُ الْاِعْتِدَالُ الدَّائِرُ بَیْنَ الْاِفْرَاطِ وَ التَّفْرِیْطِ۔ یہود کی افراط، نصاریٰ کی تفریط کے درمیان والا دین۔

کیا حیض عذاب ہے، یا کسی گناہ کا نتیجہ ہے؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل کی عورتوں نے جب حد سے زیادہ نافرمانی شروع کی، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب دے کر حیض کی بیماری میں مبتلا کیا۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ سب سے پہلے یہ عذاب حضرت حوّا پر اس وقت نازل ہوا جب انہوں نے شجرۂ ممنوعہ کھانے کی کوشش کی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ایسا نہیں ہے، بلکہ ''ھٰذَا شَیْءٌ کَتَبَہُ اللّٰہُ عَلٰی بَنَاتِ اٰدَمَ'' [بخاری] اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ دمِ حیض حکمتِ باری تعالیٰ کے تحت جنین کی خوراک وغذا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس عورت میں پیدائشی طور پر یہ حیض والا مرض نہ ہو، وہ بانجھ کہلاتی ہے، اور اس کی اولاد نہیں ہوتی، اور اس کی بچہ دانی بھی نہیں ہوتی، جو کہ محلِ حیض اور محلِ اولاد ہے۔ واللہ اعلم

حیض، نفاس اور استحاضہ کا حکم:

اَلدِّمَاءُ الْمُخْتَصَّۃُ بِالنِّسَاءِ ثَلَاثَۃٌ۔ عورتوں کے ساتھ مخصوص خون تین ہیں: ان میں پہلی قسم حیض کا خون ہے، سردی گرمی، ضعف و کمزوری، جفاکشی، محنت، تندرستی و بیماری، بھوک و فاقہ اور دیگر عوارض کی وجہ سے خونِ حیض

کے قوام، رنگت، کثرت وقلّت وغیرہ کے حساب سے بہت ہی مختلف ہوتا ہے۔ خوشحال گھرانے اور جفاکش عورتوں کے خون میں بہت ہی فرق ہوتا ہے۔ البتہ! مجموعی لحاظ سے حضرت امام اعظم، صاحبین، سُفیان ثوری رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ حیض کی مدّت کم از کم تین دن، اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔ اگر تین دن سے پہلے خون بند ہوا تو وہ حیض شمار نہیں ہوگا، اور اگر دس دن سے زیادہ خون جاری رہا تو وہ زیادتی بھی حیض شمار نہیں، بلکہ یہ استحاضہ ہی شمار ہوں گے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حیض کی مدّت ایک دن سے لے کر پندرہ روز تک ہے، اور ان ایام میں عورت حائضہ شمار ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتی۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پندرہ دن میں سے دس روز حیض شمار ہوگا، اور زائد پانچ روز استحاضہ کہلائیں گے۔ اسی طرح دورانِ حمل کا خون بھی استحاضہ ہوگا۔

عورتوں کے مخصوص خون کی دوسری قسم نفاس ہے۔ یہ خون زچگی کے دوران جاری ہوتا ہے، گویا ایامِ حمل میں جو خون بند رہا، اس کا ایک حصہ بچے کی خوراک ہوا، باقی حصہ بچہ دانی کے منہ بند ہونے کی وجہ سے رحمِ مادر میں جمع ہوتا رہا، جوں ہی بچے کی پیدائش کے ساتھ رحم کا منہ کھل گیا تو وہ جمع شدہ خون رسنا شروع ہوا، اسی کا نام نفاس ہے۔

اس کی کم مدّت عورت کی طبیعت پر موقوف ہے۔ بسا اوقات مختصر اوقات میں بند ہوتا ہے، اور کبھی کبھی لمبے عرصے تک جاری رہتا ہے، اس کی زیادہ سے زیادہ مدّت چالیس روز ہے، پھر چالیس کے بعد وہ نفاس شمار نہیں ہوگا، وہ استحاضہ ہی کہلائے گا۔

تیسری قسم کا نام استحاضہ ہے۔ دراصل اس کی بنیاد رحم نہیں، بلکہ یہ بیماری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے لئے اقل واکثر مدّت کا تعین شرعاً ثابت نہیں ہے۔ یہ خون سالہا سال، بلکہ بعض عورتوں میں زندگی بھر جاری رہتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے نکسیر یا بواسیر کا خون وغیرہ۔ یہ عورت کے رحم کے کسی حصہ سے کوئی رگ پھٹنے سے خون جاری ہو جاتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔

خونِ حیض ونفاس کے ایام میں عورت نماز نہیں پڑھ سکتی، روزہ نہیں رکھ سکتی، قرآن پاک کی تلاوت نہیں کر سکتی، کعبہ شریف کا طواف نہیں کر سکتی، مسجد میں داخل نہیں ہو سکتی۔ البتہ! ذکر وتسبیح اور درود پڑھ سکتی ہے۔ شوہر کے لئے ان ایام کے اندر صحبت اور ہم بستری حرام ہے۔ بعد میں روزہ کی قضاء ضروری ہے، نمازوں کی قضاء نہیں ہے۔

استحاضہ کا حکم حیض ونفاس جیسا نہیں ہے، اس میں کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے، یہاں تک کہ مستحاضہ عورت مسجد یا گھر میں اعتکاف بھی کر سکتی ہے، اور کعبہ شریف کا صبح وشام طواف بھی کر سکتی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہود ونصاریٰ کے افراط وتفریط کو دیکھ کر سوال کیا، تو فرمایا:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ﴾ (لوگ آپ سے حیض کے متعلق سوال کرتے ہیں)۔

﴿قُلْ هُوَ اَذًى﴾ آپ ان سے کہہ دیں کہ یہ ایک گندگی اور ناپاکی ہے۔ یہ عام گندگیوں سے بڑھ کر ہے، اس لئے ﴿فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ﴾ حیض کی حالت میں عورت کے قریب تک نہ جاؤ۔ کسی قسم کی مخصوص قربت کا نام تک مت لو، کیونکہ ان دنوں میں مباشرت قطعی حرام ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قریب جانے سے بے صبری ہو، اور حرام کا ارتکاب ہو۔

فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ عورتوں پر فرض ہے کہ ان ایام کے شروع ہونے پر شوہروں کو فوری اپنی معذوری کی اطلاع کرلیں، تاکہ وہ محتاط رہیں۔ فقہاء کرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ مردوں کو چاہئے کہ عورت کی اطلاع پر بھروسہ کریں، لیکن اگر کسی سے کوئی بے صبری یا غلط فہمی سے ایسا فعل سرزد ہوا اور جماع کیا تو توبہ اور استغفار ضرور کرے۔ کچھ صدقہ بھی دے، اور آئندہ ایسے کام نہ کرنے کا پختہ عزم اور وعدہ بھی کرے، ساتھ ساتھ ندامت اختیار کرے۔

﴿وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ یہاں مقاربت سے مراد مباشرت ہے، جو کہ حرام ہے، پاک ہونے تک، عام مقاربت پر شرعاً پابندی نہیں ہے۔ میاں بیوی اکٹھے بیٹھیں، کھائیں، پئیں، ایک بستر، ایک پلنگ پر سوجائیں، آرام کریں، ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ البتہ! عورت کے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کے حصے پر ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہے "فَاصْنَعُوْا كُلَّ شَيْئٍ اِلَّا النِّكَاحَ" [ترمذي] نکاح سے مراد مباشرت ہے، صرف اسی پر پابندی ہے، اور کسی چیز پر پابندی نہیں ہے، یہ حکم اس لئے دیا تاکہ یہود کی مکمل مخالفت ہو، اور مخالفت کے سارے تقاضے پورے ہوں۔

﴿فَاِذَا تَطَهَّرْنَ﴾ جب وہ اچھی طرح مکمل پاکیزگی حاصل کریں، یعنی مدتِ حیض بھی پوری ہو، خون بھی مکمل بند ہو، طہارت وغسل اچھی طرح ہو، پس جب ساری رکاوٹیں ختم ہوگئیں، تو فرمایا:

﴿فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ﴾ پس جاؤ ان کے پاس جہاں سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ یہ حکم استحبابی ہے، اباحت کے لئے ہے، وجوب کے لئے نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بندش ختم ہوگئی، اب مباشرت مباح ہے، اگر کوئی تیار ہو، تو یہ کام کرسکتا ہے، جیسے کہ فرمایا تھا: ﴿وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا﴾ [المائدة: ۲] (جب تم

احرام کھول چکے تو شکار کرو) یعنی ممانعتِ شکار ختم ہوکر اباحت آ گئی، اگر کوئی کرنا چاہے، تو کر لے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ﴾ جن لوگوں سے سہواً ہوا، یا بے صبری کی وجہ سے معصیت کا ارتکاب ہوا، یا لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے کوئی گڑبڑ ہوئی، پھر توبہ کی، استغفار پڑھی، کچھ صدقہ دے دیا، آئندہ کے لئے محتاط رہنے کی نیت و پختہ ارادہ کیا، تو بہت ہی بہتر ہوا، اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کو پسند فرماتے ہے، اوران کی مغفرت کا فیصلہ کرتا ہے، تو انہیں چاہئے کہ توبہ کر کے اپنے گناہوں کی مغفرت کے وعدہ پر ربّ العزّت سبحانہ کا شکر ادا کریں۔

﴿وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾ اور جن لوگوں نے ایامِ حیض میں ہر قسم کی احتیاط کر کے کسی غیر شرعی حرام اور گندگی میں ملوث ہی نہیں ہوئے، ہر قسم کی طہارت و پاکیزگی پر کاربند ہوئے، پس انہیں خوشخبری دی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، اور دوست رکھتا ہے۔

بعض علماء ومفسرین نے یہاں "توابین و متطهرین" کو احکامِ حیض کے ساتھ مقید نہیں کیا، بلکہ اپنے عموم پر رکھا کہ توبہ کرنے والے خواہ کسی گناہ سے تائب ہوں، یا کسی قسم کی طہارت و پاکیزگی حاصل کرنے والے ہوں، پس ظاہر ہے کہ یہ عمومی معنی بہت ہی بہتر ہے، جس میں خصوصی اور مقید معنی کے علاوہ دیگر بہت سے معانی بھی شامل رہیں گے، جس سے ربّ العزّت کے عمومی بہت سارے لطف وکرم کے معانی کا اظہار ہوگا۔

علماء کرام نے فرمایا: (حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تائید وتوصیف بھی بیان کی ہے) کہ چار چیزیں تمام آسمانی شریعتوں میں اُسی طرح پسندیدہ رہی ہیں، جس طرح خاتم الادیان ہمارے اسلام میں پسندیدہ ہیں، وہ چار چیزیں یہ ہیں:

(۱) طہارت، انابت، سماحت اور عدالت، یعنی پاکی، پاکیزگی ظاہری و باطنی۔

(۲) تواضع، انکساری، رجوع الی اللہ۔

(۳) سخاوت، دیانت، حسنِ اُخلاق، حسن کردار۔

(۴) انصاف، تقویٰ، پرہیزگاری اور صداقت۔ یہ تمام برحق ادیان کے مسلمہ و بنیادی اصول اور ضوابط ہیں۔

﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ﴾ تمہاری عورتیں تمہارے لئے بمنزلہ کھیتی کی ہیں۔ اگر تم نے انہیں ماہواری کے ناپاک خون میں لت پت پایا، اور بحکمِ شرع ان کی مقاربت سے پرہیز کیا، تو ہوسکتا ہے تمہارے دلوں میں کوئی شیطانی نفرت پیدا ہو، تو تمہیں کہا جارہا ہے کہ یہ وسوسہ نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ بیویاں تمہاری کھیتی ہیں، جس طرح

کھیتیوں پر موسمِ خزاں کا حملہ ہوسکتا ہے، اسی طرح ان عورتوں پر بھی خزاں کا حملہ لازماً ہوگا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی معاش پر موقوف ہے، اور معاش کی بنیاد زمین اور آسمانی بارش ہے، اسی طرح بیویاں بمنزلۂ زمین کے ہیں، اور تمہارا نطفہ بمنزلۂ بارش کے ہے، پس کھیتی (عورت) کو وہ درجہ حاصل ہے کہ جس سے تمہاری خوشیاں، معاشی مسائل، اولاد، نسل کی ترقی وغیرہ سب اس پر موقوف ہے، یا یہ کہ مردوں کا نطفہ بمنزلۂ تخم کے ہے، اولاد بمنزلۂ پیداوار کے ہے، عورت بمنزلۂ زمین کے ہے، جس طرح زمین میں تخم ڈالا جاتا ہے، اور اس سے فصل پیدا ہوتی ہے، اور فصل کا سارا دارمدار زمین پر ہے، زمین اچھی ہو، تو فصل بھی عمدہ ہوگی، زمین ناکارہ ہو، تو فصل بھی ناکارہ رہے گی۔

چند آیات پہلے تمہیں تعلیم دے کر ہدایت و رہنمائی ہوئی کہ بدعقیدہ، خبیث باطن، غیر مسلم عورتوں سے نکاح نہ کرو، وہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا، آج اس آیت میں تمہیں اس حکم کی علّت و دلیل بتائی جارہی ہے کہ بیوی تمہاری کھیتی ہے، اور عورت بمنزلۂ زمین کے ہے۔ اچھی زمین، یعنی مؤمنہ عورت ہو، تب اس کی فصل و پیداوار بہتر اولاد کی شکل میں دستیاب ہوگی۔ ﴿وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾ اس کی پہلی دلیل تھی، ﴿حَرْثٌ لَّكُمْ﴾ دوسری دلیل ہے۔ جس طرح اچھی زمین کی فصل اچھی ہوتی ہے، اسی طرح اچھی بیوی کی اولاد بھی اچھی و پاکیزہ ہوتی ہے۔ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما پاکیزہ ماں سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے بطن سے ہیں، جبکہ ان کے مخالفین اپنی عام ماؤں کے بطن سے پیدا ہوئے، جیسی ماں ویسی اولاد۔ علامہ اقبالؒ کا شعر: ؎

بتولے باش بیروں شو ازیں دہر ☆ کہ در آغوشِ شبیرے بگیری

﴿فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ﴾، یہاں اَنّٰى کیف کے معنی میں ہے، عند اہل السنۃ والجماعۃ، جو کیفیت کے عموم میں ہے، اور جو لوگ (شیعہ) اس کو عمومِ مکان کے معنی میں کرتے ہیں جس کی وجہ سے بیوی کے ساتھ لواطت کو جائز سمجھتے ہیں، بلکہ مستحب قرار دیتے ہیں، ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی لعنت کے حقدار ہوتے ہیں۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مَنْ اَتَى اِمْرَاَتَهُ فِيْ دُبُرِهَا فَقَدْ كَفَرَ بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"۔ یعنی جس شخص نے اپنی بیوی کے ساتھ غیر فطری عمل (لواطت) اختیار کیا، تو اس نے حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کا انکار کردیا، اور باغی و ملعون ٹھہرا۔ قَالَ الْأَئِمَّةُ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ بِالْإِجْمَاعِ اَنَّ كَلِمَةَ "اَنّٰى" فِيْ اَنّٰى شِئْتُمْ بِمَعْنٰى كَيْفَ وَهُوَ تَفْسِيْرٌ لِلْحَرْثِ الْمُتَقَدِّمِ وَلَا يَجُوْزُ اَنْ يُرَادَ بِهَا

هٰهُنَا بِمَعْنَى أَيْنَ أَوْ حَيْثُ لِعُمُوْمِ الْمَحَلِّ حَاشَاهُ أَنْ يَكُوْنَ هٰذَا بِمَعْنَى الْفَرْثِ وَهُوَ حَرَامٌ۔

''علماء سلف وخلف سب کا اجماع ہے کہ کلمہ ''اَنّٰى'' کیف کے معنی میں ہے، جس سے عمومِ کیفیتِ جماع مراد ہے، جو کہ جائز ہے، اور محل صرف فرج ہی ہے، اور محل میں عموم پیدا کرنا کفر ہے، جن لوگوں نے محلِ جماع میں عموم پیدا کر کے فرج و دُبر دونوں کو شامل کر دیا، (جیسے شیعہ لوگ ہیں) تو انہوں نے ﴿حَرْثٌ لَّكُمْ﴾ میں تحریف کی، جو کہ کفر اور حرام ہے، کیونکہ یہ محلِ حرث نہیں ہے، بلکہ محلِ فرث (پاخانہ) ہے۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے:

﴿وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ﴾ اپنے نفسوں کے لئے کچھ آگے بھی بھیجو۔ ''قَدِّمُوْا'' کے لئے خصوصی مفعول مذکور نہیں، پس باعتبارِ عموم ہر خیر کو شامل ہے۔ سب سے بڑا اور عمدہ خیر نیک اولاد ہے، جو حرث سے پیدا ہوتی ہے، نہ کہ فرث سے، جس طرح پیچھے والے راستے سے اولاد کی پیدائش محال ہے، اسی طرح وہ قابلِ مباشرت بھی نہیں ہے۔ شیعوں نے جھوٹ کی روایت گھڑ لی کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کی اجازت منقول ہے۔ یہ سراسر بہتان ہے۔

حضرت علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اُم التفاسیر میں اسے غلط ثابت کیا ہے، اور دیگر تمام مفسرین نے ہر اس قسم کی روایت کو موضوع و منگھڑت بتایا ہے، جس میں اس ناجائز اور حرام فعل کی اجازت منقول ہو۔ مظہری میں اس کی خاصی تفصیل مذکور ہے، فلیراجع۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ﴾ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس کے قوانین اور احکام کی خلاف ورزی نہ کرو، اور یقین کے ساتھ جان لو کہ قیامت برحق ہے، اور تم سارے اللہ تعالیٰ سے ضرور ملنے والے ہو۔ حساب و کتاب کی پیشی بالمشافہ ہوگی، ذرّہ ذرّہ کا حساب دینا ہوگا، اور کچھ بھی نہیں چھپے گا۔ البتہ! جن لوگوں نے اپنی زندگی میں اللہ تعالیٰ سے ڈر کر اس کی نافرمانی نہیں کی، صرف ایمان و تقویٰ کو شعار بنا کر کتاب و سنت پر عمل پیرا رہے، تو انہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر بھلائی اور کامیابی کی خوشخبری دیں گے ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مومنین کو بشارت سنائیں۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ

فَاِنۡ فَآءُوۡ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنۡ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۲۷﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کے پاک ناموں کو اپنی قسموں کا نشانہ، نہ بناؤ کہ تم نیکی نہیں کرو گے، پرہیز گاری اختیار نہیں کرو گے، اور یہ کہ تم لوگوں کے درمیان صلح نہیں کراؤ گے، بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۲۲۴﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری بیہودہ قسموں میں نہیں پکڑتا، لیکن ان قسموں پر پکڑتا ہے، جن پر تمہارے دل قصد کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا بردبار ہے ﴿۲۲۵﴾ ان لوگوں کے لئے جو اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں چار ماہ کی مہلت ہے، اگر وہ اس دوران میں لوٹ آئیں، تو بیشک! اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے ﴿۲۲۶﴾ اگر وہ طلاق کا پختہ ارادہ کرلیں، تو بیشک! اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے ﴿۲۲۷﴾

معارف ومنازل

☆ ......ابواب البِرّ کا جو سلسلہ چلا تھا، یہ اس کا بیسواں حکم ہے، اور ﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ﴾ میں اکیسویں، جبکہ ﴿لِلَّذِيۡنَ يُؤۡلُوۡنَ﴾ میں بائیسویں حکم کا بیان ہے۔ اس سے قبل حیض اور دورانِ حیض جو چیز حرام تھی، یعنی ہمبستری، اس کی حرمت کے بیان کے بعد ایک اور بری غیر شرعی بات کا بیان فرمارہے ہیں، یعنی نیکی کے کام نہ کرنے پر قسم کھانا۔ ویسے تو ہر بات پر قسم اٹھانا نہایت ہی قبیح ہے، خصوصاً نیک کاموں کے نہ کرنے پر قسم کھانا، تو اس سے بھی قبیح ہے۔ ایسی قسموں پر عمل کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ فوراً قسم توڑ کر کفارہ ادا کرنا ضروری ہوگا، تو ارشاد فرمایا کہ نیکی اور صلہ رحمی کے چھوڑنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے ناموں کو قسموں کا نشانہ، نہ بناؤ۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَلَا يَاۡتَلِ اُولُوا الۡفَضۡلِ مِنۡكُمۡ وَالسَّعَةِ اَنۡ يُّؤۡتُوۡۤا اُولِى الۡقُرۡبٰى وَالۡمَسٰكِيۡنَ﴾ [النور: ۲۲] یعنی وہ لوگ جو کشادہ حال، فارغ البال، صاحبِ مال ہیں، وہ قرابت داروں، مسکینوں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دینے پر قسمیں نہ کھا بیٹھیں، انہیں چاہئے کہ معاف کرنے اور درگزر کرنے کی عادت ڈالیں، کیا تمہاری اپنی خواہش نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے؟ ایسی قسم اگر کوئی کھا بیٹھے، تو اسے چاہئے کہ اپنی قسم توڑ دے، اور کفارہ ادا کردے۔

اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی قسم توڑ کر مسطح بن اثاثہ کا نان ونفقہ دوبارہ جاری کردیا تھا۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''نَحۡنُ الۡاٰخِرُوۡنَ السَّابِقُوۡنَ''۔ [الحدیث] ہم پیچھے آنے والے ہیں، لیکن قیامت کے دن سب سے پہلے جنت کی طرف سبقت کرنے

والے ہوں گے۔ پھر فرماتے ہیں کہ تم میں سے اگر کوئی ایسی قسم کھائے، اور کفارہ ادا نہ کرے، اور اس پر بضد اڑا رہے، تو وہ بڑا گنہگار ہے۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا: اللہ تعالیٰ کی قسم! ان شاء اللہ! میں اگر کوئی قسم کھا بیٹھوں گا، اور اس کے توڑنے میں مجھے کوئی خیر و بھلائی نظر آئے گی، تو میں اپنی قسم توڑ دوں گا، اور اس کا کفارہ ادا کروں گا۔ [بخاري]

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے عبدالرحمن! سرداری یا امارت، کوئی بھی عہدہ طلب نہ کرو، اگر بغیر مانگے تم کو عہدہ ملے، تو اللہ تعالیٰ آپ کی نصرت فرمائیں گے، اگر تو نے عہدہ مانگ کر حاصل کیا، تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد نہیں کریں گے، بلکہ تجھے اس کے حوالہ کیا جائے گا، اگر تو کوئی قسم کھالے، اور اس کے خلاف میں بھلائی دیکھے، تو اپنی قسم کا کفارہ دے دیں، اور قسم توڑ کر اس خیر کا کام کرلے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بھی اسی طرح کا حکم دے کر اپنے مبارک عمل کا اسی طرح اظہار فرمایا۔ [بخاري]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور جمہور علماء امت کا یہی فیصلہ ہے۔ صحیح مسلم، مسند احمد اور حدیث کی باقی کتابوں میں بھی یہی روایات، اور اسی قسم کی بہت سی دیگر روایات بھی مروی ہیں۔ تو خلاصہ یہ ہے کہ ہر موقع پر بغیر ضرورت کے قسم اٹھانا کوئی اچھی بات نہیں ہے، اگر کسی نے کوئی ایسی قسم کھالی، جسے پورا کرنے میں کوئی نقصان نہیں، تو پھر درست ہے۔ اگر قسم کے پورا کرنے میں کوئی دینی نقصان ہو، اور توڑنے میں خیر و بھلائی ہو، تو چاہئے کہ قسم توڑ کر اس کارِ خیر کو پورا کردے، اور قسم کا کفارہ ادا کرے، مثلاً کسی نے یہ قسم اٹھائی کہ میں ہرگز فقراء کو صدقہ نہیں دوں گا، تو ظاہر ہے کہ قسم پوری کرنے میں کوئی خیر نہیں، اور توڑ کر کفارہ دینے میں بہت ہی بھلائی اور خیر ہے، تو حکمِ شرعی یہ ہے کہ قسم پر اڑا نہ رہے، بلکہ اسے توڑ کر صدقہ اور خیر کا کام بجالائے۔

قسم کی اقسام:

فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ قسم کی تین قسمیں ہیں، اور ہر ایک کا حکم دوسرے سے مختلف ہے۔

☆ پہلی قسم یمین لغو ہے، جو قسم ارادے کے بغیر زبان سے نکل جائے۔ ایسی قسم پر کسی قسم کا مؤاخذہ نہیں، اور نہ ہی کوئی کفارہ واجب ہوگا، اسی طرح گناہ بھی نہیں۔ البتہ! خلافِ اولیٰ ضرور ہے۔

☆ دوسری قسم یمین غموس ہے، غمس کے معنی ہیں گناہ میں ڈوبنا، غوطہ زنی کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کسی گزشتہ واقعہ کے متعلق دیدہ دانستہ غلط قسم اٹھاتا ہے، کہتا ہے کہ فلاں شخص نے مجھ سے یہ کہا تھا، مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے، تو یہ یمین غموس کہلاتی ہے، اس میں اگرچہ کفارہ نہیں ہے، مگر گناہ ضرور ہے، اور مؤاخذہ بھی ہے، ایک تو

جھوٹ ہے، پھر وہ بھی قسم کے ساتھ۔

☆ تیسری قسم یمین منعقدہ ہے۔ مطلب یہ کہ کوئی شخص آئندہ زمانہ کے لئے قسم اٹھائے کہ میں فلاں کام ضروری کروں گا، یا نہ کروں گا، اگر یہ قسم کسی جائز کام سے متعلق ہے، اور اس نے وہ قسم پوری کی تو بری الذمہ ہوگا، اور کوئی مؤاخذہ بھی نہیں ہوگا۔ ہاں! اگر اس نے قسم پوری نہ کی، تو پھر کفارہ واجب ہوگا۔ البتہ! اگر وہ قسم کسی ناجائز کام کے ساتھ متعلق ہو، تو اسے توڑ کر کفارہ دیدے۔ اس کی تفصیل سورۃ الدہر کے فوائد میں دیکھی جائے، اور سورۃ مائدہ میں بھی قسم کے کفارہ کا بیان ساتویں پارہ کے اول رکوع میں مذکور ہے۔ یعنی ایک غلام کی آزادی، یا دس مسکینوں کو دو وقت متوسط درجہ کا کھانا کھلانا، یا انہیں لباس و پوشاک دینا، بصورتِ عدمِ استطاعت تین دن کا روزہ رکھنا، بس اتنا ہی کفارہ ضروری ہے۔

﴿وَلَا تَجۡعَلُوا اللّٰهَ عُرۡضَةً لِّاَيۡمَانِكُمۡ﴾ اللہ تعالیٰ کے پاک ناموں کو اپنی قسموں کا نشانہ، نہ بناؤ، یعنی ان امور میں: ﴿اَنۡ تَبَرُّوۡا وَتَتَّقُوۡا وَتُصۡلِحُوۡا بَيۡنَ النَّاسِ﴾ کہ تم نیکی نہیں کروگے، پرہیزگاری اختیار نہیں کروگے، اور لوگوں کے درمیان صلح نہیں کراؤگے۔ فرمایا یہ تمہاری بہت بری حرکت ہے کہ نیک کاموں کے نہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتے ہو، یہ ایسا گناہ ہے جیسے کوئی نماز نہ پڑھنے پر یا والدین کے ساتھ بھلائی نہ کرنے پر قسم کھائے۔

یاد رہے کہ یہاں تینوں جملوں سے پہلے "لا" نافیہ مقدر ہے، یعنی لَا تَبَرُّوۡا وَلَا تَتَّقُوۡا وَلَا تُصۡلِحُوۡا بَيۡنَ النَّاسِ۔ ﴿وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ﴾ اللہ تعالیٰ سننے والا، جاننے والا ہے۔ وہ تمہاری لغو باتوں کو خوب سنتا ہے، اور تمہارے دلوں کی باتوں کو جانتا ہے۔ اس کا علم کائنات کی تمام مخفی و ظاہر چیزوں پر محیط ہے۔

بر و علم یک ذرہ پوشیدہ نیست ☆ کہ پیدا و پنہان بہ نزدش یکیست

(سعدی)

لہٰذا تم لوگ اپنی زبان اور اپنے قلوب دونوں پر قابو رکھو، بیہودہ بلا مقصد قسمیں مت کھاؤ، غلط ارادوں سے باز رہو، اور برے خیالات سے مکمل اجتناب کرو۔

ایلاء کا مسئلہ:

ایلاء کے لغوی معنی قسم اٹھانے کے ہیں، اور مراد اس سے یہ ہے کہ ایک شخص اس بات کی قسم اٹھالے کہ میں اپنی بیوی کے پاس (قریب) نہیں جاؤں گا۔ اب اس کی چار صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) مطلقاً قسم اٹھائی کہ عورت کے پاس نہیں جاؤں گا۔

(۲) چار ماہ کی مدّت مقرر کر کے قریب نہ جانے کی قسم کھائی۔

(۳) چار ماہ سے زائد مدّت مقرر کر کے قریب نہ جانے کی قسم کھائی۔

(۴) چار ماہ سے کم تین یا دو یا ایک ماہ کی مدّت مقرر کر کے قریب نہ جانے کی قسم کھائی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ چوتھی صورت، یعنی چار ماہ سے کم مدّت کے اِیلاء کو شرعی اِیلاء نہیں کہا جاتا۔ اگر مقررہ وقت تک یہ شخص عورت کے قریب نہیں گیا، تو قسم سے بری ہو جائے گا، اور اگر اس دوران عورت سے مقاربت کر لی، تو صرف قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرے گا، اور بس۔

باقی تین صورتوں (اول، دوم، سوم) میں حکم یہ ہے کہ ایسے شخص کو قسم توڑ دینی چاہیے، اور اس کا کفارہ ادا کرنا چاہیے، تاکہ مزید پریشانیوں سے بآسانی اس کی جان چھوٹ جائے، اور اگر اس نے ایسا نہیں کیا، اور چار ماہ کا عرصہ گزر گیا، قسم کھانے والا شخص عورت کے پاس بھی نہیں گیا، تو اب اِیلاء پختہ ہو جائے گا، اور مؤثر رہے گا۔ اس سلسلے میں فقہاء کرام کے اقوال مختلف ہیں۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے ائمہ کا قول ہے کہ اس صورت میں ایک طلاق بائن واقع ہو جائے گی، اب اگر مرد دوبارہ رجوع کرنا چاہے، تو اس کو نئے حقِ مہر کے ساتھ دوبارہ جدید نکاح کرنا ہوگا، اگر رجوع کا ارادہ نہیں تو عورت آزاد ہوگی، اور عدّت گزارنے کے بعد حسبِ خواہش دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔

ائمہ ثلاثہ امام مالک امام شافعی، امام احمد رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ چار ماہ کی مدّت گزرنے کے بعد طلاق خود بخود واقع نہیں ہوگی، بلکہ حاکمِ وقت اس شخص کو عدالت میں طلب کر کے اسے مجبور کرے کہ یا تو رجوع کر لے، یا طلاق دیدے، پس جو بھی ہوگا اس پر عمل ہوگا۔

فائدہ:

چونکہ اِیلاء کے لغوی معنی ہی قسم کے ہیں، تو شرعی اِیلاء اس صورت میں قائم ہوگی، جب عورت کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی گئی ہو، اگر شوہر نے قسم نہیں کھائی، صرف اتنا کہا کہ میں عورت کے پاس نہیں جاؤں گا، تو یہ شرعی اِیلاء شمار نہیں ہوگی۔ یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے کہ بغیر قسم کے اگر ایک سال یا دو سال تک بیوی سے علیحدہ رہنے سے شرعی اِیلاء نہیں ہوگی، زیادہ سے زیادہ ظلم و زیادتی اور گناہ ہی ہوگا، اور عند اللہ تعالیٰ ایسا شخص مجرم قرار پائے گا۔ اس نے حقوق کی ادائیگی میں بڑی خیانت کی، اور یہ بری بات ہے، تو فرمایا:

﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ﴾ ان لوگوں کے لئے چار ماہ کی مہلت ہے، جو اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھالیتے ہیں۔ ﴿فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ پس اس دوران اگر وہ لوٹ آئیں، رجوع کریں، تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے، اس کی کوتاہی معاف فرمائے گا۔

﴿وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ﴾ اور اگر انہوں نے طلاق یا تفریق کا پورا عزم کیا ہے، تو اللہ تعالیٰ سننے اور جاننے والا ہے۔

.......❀.......❀.......❀.......

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ
يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ
وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ
عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

ع ۲۸ / ۷ / ۱۳

ترجمہ: اور مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں، اور ان کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اس چیز کو چھپائیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے رحموں میں پیدا کی ہے، اگر وہ اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتی ہیں، اور ان کے خاوند زیادہ حق رکھتے ہیں انہیں اس مدت میں لوٹانے کا، اگر وہ اصلاح کا ارادہ کریں، اور ان عورتوں کے لئے بھی اسی طرح حق ہے جس طرح عورتوں پر مردوں کا حق ہے، دستور کے مطابق، اور مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فضیلت ہے، اور اللہ تعالیٰ شانہ عزیز ہے، حکمت والا ہے ﴿۲۲۸﴾

معارف ومنازل

☆......ابواب البرّ کے سلسلے میں یہ تیئیسواں حکم ہے کہ عورتیں طلاق کے بعد ضروری عدّت گزاریں۔ عدّت گزارنا عورتوں پر فرض ہے، خواہ یہ عدّت طلاقِ رجعی کے بعد ہو، یا طلاقِ بائن کے بعد، اسی طرح شوہر کی موت کے بعد۔ البتہ! اگر طلاق دخول اور زفاف (خلوت) سے پہلے ہو، تو عدّت واجب نہیں ہے۔ یہ مسئلہ آئندہ آنے والا ہے، اور حاملہ کی عدّت وضعِ حمل ہے۔

نکاح اللہ تعالیٰ کا حکم بھی ہے، اور ایک نعمت بھی۔ ساتھ ساتھ یہ ایک اجتماعی معاہدہ بھی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام

سے لے کر قیامِ قیامت تک، یہ سلسلہ اس کی اولاد میں جاری رہے گا۔اس کے بغیر نہ سلسلۂ نسل جاری رہ سکتا ہے، اور نہ ہی انسانی مودّت ومحبتوں کا لطف وخوشی حاصل ہوسکتی ہے۔ جب نکاح کے فرائض ومراحل طے پا جاتے ہیں، تو مرد د عورت کی خواہشات کی تکمیل، ان کی مسرتوں اور لطف اندوز خوشیوں میں اضافہ کے ساتھ ساتھ دونوں فریق پر کچھ فرائض وحقوق اورواجبات لازم ہوجاتے ہیں، تاکہ زندگی کا یہ سفر، ان کا یہ عظیم رشتہ، محبت ودوستی اور قربانیوں کے ساتھ خوشحالی میں طے ہوجائے۔

چونکہ یہ مسئلہ اور لمبا سفر ہر قسم کے مصائب وآلام اور طرح طرح کے نشیب وفراز پر بھی مشتمل ہے اور انسان سارے ایک جیسے نہیں ہوتے، ہر قسم کے فطری اور طرح طرح کے طبعی تقاضے ان میں موجزن رہتے ہیں، جنہیں نبھانا، یا برداشت کرنا ذرا مشکل ہوجاتا ہے، پس ساری زندگی ناچاقی اور الجھنوں کو برداشت کرنا نہایت تلخ اور ناہموار ہوتا ہے، تو ایسی صورتوں میں ان کی سہولت اور آرام کی خاطر جدائی اور تفریق (خلع اور طلاق) کے مواقع پر شریعت نے جانبین کے لئے اسی طرح کے مسائل وضع کئے، جس طرح نکاح کے وقت انہیں کچھ حقوق حاصل تھے، جنہیں دونوں فریقوں نے یا فریقِ واحد نے برداشت نہیں کیا اور طلاق تک نوبت پہنچی، جس کے طے ہونے کے بعد صرف عورت پر عدّت کے فرائض لازم قرار پائے، جسے گزشتہ آیتوں میں ﴿حَرْثٌ لَّكُمْ﴾ قرار دیا گیا تھا، اور یہ حکم شرافتِ انسانی کے علاوہ نسلِ انسانی کی پاکیزگی اور طہارت پر مبنی ہے، اور صرف حرث وکھیتی کے ساتھ وابستہ ہے، یہی وجہ ہے کہ مرد پر کسی قسم کی عدّت نہیں ہے، کیونکہ وہ حارث تو ہے، مگر حرث نہیں ہے، کہ جس سے نسل کی طہارت متاثر ہو۔

مغربی معاشرہ پر ایک نظر

نکاح کے مسئلہ میں دینِ حنیف (اسلام) کے علاوہ دیگر مذاہب افراط وتفریط کا شکار ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے معاشرے ہزاروں قباحتوں پر مشتمل ہیں، جہاں نکاح برائے نام ہے، اور طلاق وتفریق کا اولاً وجود ہی نہیں، اگر بالفرض! اسے تسلیم کیا جائے، تو بری طرح کے خیالات اور نفسانی امنگوں پر مبنی ہے، جہاں ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ (البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے) کا تصور تک نہیں، جس طرح طلاق کی باگ ڈور مرد کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اس سے کئی درجہ زیادہ عورت کے ہاتھ میں ہے۔کبھی ایسا دیکھنے میں آتا ہے کہ مرد کو معلوم ہی نہیں کہ بیوی عدالت کے ذریعہ صبح طلاق لے کر دوپہر کو دوسری شادی انجام دے چکی ہوتی ہے، نہ عدّت نہ شرافت، نہ صفائی رحم اور نہ اثباتِ نسب۔

یہ سب کچھ انسانی شرافت کی پیشانی پر ایک نہ مٹنے والا بدنما سیاہ داغ ہے، اور آج یہود و نصاریٰ حقوقِ نسواں اور آزادی کے نام پر جو پروگرام بذریعہ این جی اوز چلا رہے ہیں، ان کا اصلی مقصد بھی یہی ہے کہ مسلمان قوم کے حلال زادے کم ہو کر حرامزادوں کی پیدائش میں اسی طرح اضافہ ہو، جس طرح یورپ میں ہو رہا ہے، جہاں سو فیصد حرام زادوں کا راج ہے۔ آج سے چالیس سال پہلے ایک یورپی محقق نے اپنے معاشرے سے تنگ و بیزار ہو کر لکھا ہے کہ یورپی آبادی پینتالیس کروڑ ہے، ان میں صرف پینتالیس حلال زادے بھی نہیں ہیں۔ [معالم العرفان] اور ہمارے انگریزی خواں طبقہ مسلسل اسلامی قانون سے بغاوت کا شکار ہے، اور اپنا قبلہ یورپ کو قرار دے رہا ہے۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی ☆ یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی (کوہستانی)

اقبالؒ

یہ کتنی حماقت اور نادانی ہے کہ جس طرح گدھے کتوں کو اپنے باپ کا پتہ نہیں، اسی طرح اشرف المخلوقات اس نہج پر ہو کہ اسے بھی اپنے باپ اور نسب و خانداں کا پتہ نہ ہو؟ ایک طرف سے مغرب نے انسانوں کے ساتھ یہ کھیل کھیلا، تو دوسری طرف کتوں کا مغرب کے معاشرہ میں وہ رتبہ اور شان و شوکت ہے، جو کسی بے چاری عورت کو حاصل نہیں۔

قدرِ انسانیت کیا جانے وہ جو کتوں سے پیار کرتے ہیں
کتا لختِ جگر ہے مسٹر کا اس سے بوس و کنار کرتے ہیں
کیا شرافت ہو ایسے گدھوں میں جو کہ کتوں کو یار مانتے ہیں
ان کے نام و نسب پہ ہیں قربان ان سے شوہر کا کام لیتے ہیں

(اکبرالہ آبادی)

زمانہ جاہلیت میں کتوں کی محبت میں لوگ اس طرح غرق ہو چکے تھے، جس طرح کہ شراب اور جُوے میں جوان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اوّل مرحلہ میں سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا استثناء ہر قسم کے کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دے دیا، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دل و جان سے اس حکم کی تعمیل کی۔ جب معلوم ہوا کہ کتوں سے محبت اب نفرت میں تبدیل ہو چکی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذرا نرمی کر کے فرمایا کہ حفاظتی اور شکاری کتوں کو رکھنے کی اجازت ہے۔ اس کے ساتھ عام کتوں کے متعلق ارشاد فرمایا کہ جس گھر میں تصویر یا کتا ہو، وہاں رحمت کا فرشتہ داخل نہیں ہوگا۔

الغرض! بلاضرورت کتے پالنے، اور گھر میں رکھنے پر پابندی عائد فرمائی، تاکہ لوگ اس رسمِ بد سے مکمل نجات حاصل کریں، اور فرمایا بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ: ''جس برتن میں کتا منہ لگا کر پانی پیے، وہ عام نجاستوں کی طرح تین مرتبہ دھونے پاک نہیں ہوتا، چاہئے کہ اسے سات مرتبہ پانی سے دھویا جائے، اور ایک مرتبہ صاف مٹی سے مانجھ کر اسے صاف کیا جائے''۔ اسی بنیاد پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کتے کو نجس العین قرار دیا۔

آج کے زمانے میں یورپ اور چائنا جیسے ملکوں میں کتے کو وہ شرف ومقام حاصل ہے کہ لوگ کتوں کی نسل اور شجرۂ نسب تک یاد کرتے ہیں۔ لاکھوں روپیہ اس کی قیمت لگا کر فروخت کرتے ہیں۔ بڑی بڑی کمپنیوں کا باقاعدہ یہی کاروبار ہے۔ آج عرب اور ایشیاء کے سرمایہ داروں کا عام رواج ہے کہ بڑے فخر ومباہات سے بڑے قیمتی کتوں کو پالتے ہیں، اور انہیں وہ مراعات اور قیمتی غذا مہیا کرتے ہیں، جو عام آدمی کے بس سے باہر ہے۔ بیوی کی موت پر اتنے پریشان نہیں ہوتے جتنا کتے کی بیماری پر غمگین ہوتے ہیں۔ باقاعدہ کتوں کو گود میں بٹھا کر اس کا لعاب چاٹتے اور منہ سے صاف کرتے ہیں، حالانکہ جرمنی کے ڈاکٹروں نے تحقیق کی ہے کہ کتے کے منہ میں جو جراثیم ہیں وہ نہایت خطرناک ہیں۔

بہرحال! یورپی تہذیب میں کتے کا بہت بڑا مقام ہے، اسی بنیاد پر اکبرالہ آبادی مرحوم نے شعر کہا، جس کو سابقہ سطور میں نقل کر دیا۔ فرمایا:

﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ﴾ ''قُرُوْء'' ''قَرْء'' کی جمع ہے، جس کے معانی میں ائمہ کرام نے اختلاف کیا ہے۔ اہلِ لغت بھی اس کے مختلف معانی بتاتے ہیں۔ دراصل یہ لفظ دو متضاد معانی میں مشترک ہے، یعنی ''حیض اور طہر'' دونوں میں مشترک ہے۔

قُرُوْٓء سے کیا مراد ہے؟

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ ''قُرُوْء'' کے معنی حیض بتاتے ہیں، اس لئے ان کے نزدیک بالغہ مطلقہ عورت کی عدّت تین حیض ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ ایک عورت نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استحاضہ کے متعلق مسئلہ دریافت کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تَدَعُ الصَّلٰوةَ اَيَّامَ اَقْرَائِهَا۔ یعنی حیض کے دنوں میں نماز نہ پڑھے۔ [ابوداؤد] البتہ! جب حیض کے عام ایام گزر جائیں، تو پھر غسل کر کے نماز ادا کرے، کیونکہ اب یہ حیض نہیں رہا، بلکہ استحاضہ کا خون شمار ہوگا، تو اس حدیث نے واضح کیا کہ ''اَقْرَاء'' کے معنی حیض کے ہیں، نہ کہ طہر کے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ قُرُوْءٌ سے طہر مراد لیتے ہیں، توان کا مسلک یہ ہے کہ عورت کی عدت تین طہر ہے، اور مطلقہ عورت طلاق کے بعد تین طہر گزرنے تک دوسرا نکاح نہ کرے۔

چونکہ طہر اور حیض کا تعلق عورتوں کے ساتھ ہے۔ اس سلسلے میں مرد ناواقف رہتے ہیں، اس لئے عورتوں کو تنبیہ ہے کہ وہ دیانت سے کام لے کر خیانت سے پرہیز کریں۔ فرمایا:

﴿وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ﴾ (عورتوں کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ چھپائیں اس چیز کو جو اللہ تعالیٰ نے ان کے رحموں میں پیدا کی ہے)۔ مطلب یہ ہے کہ طلاق یا بیوگی کے وقت اگر عورت حمل سے ہے، تو اسے وضعِ حمل تک انتظار کرنا چاہئے، اور نکاح ثانی کی خاطر اسے حمل کو چھپانا جائز نہیں ہے، اور یہ بڑی خیانت ہے کہ ایک زوج سے پیدا ہونے والے بچے کو دوسرے کے کھاتے میں ڈال دے، اور حقیقی باپ کو اس کے بچے سے محروم رکھے، جو کہ حرام ہے۔

﴿اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ دراصل طہارت و پاکیزگی کی بنیاد یہی چیز ہے کہ ایک انسان خواہ مرد ہو یا عورت، وہ حقوق کا تحفظ اور صدق و دیانت اور امانت کا تحفظ اسی شرط و بنیاد پر قائم رکھ سکے گا، جب اس میں ایمان باللہ والیوم الآخر کا عقیدہ موجزن ہوگا، یہی تمام صداقتوں اور تقویٰ کی بنیاد ہے۔ جن جن لوگوں میں اس اصلی جوہر کی کمی یا فقدان ہو، وہ جانوروں سے زیادہ کمتر اور کتوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ آج بھی اگر کوئی دیکھنا چاہے، تو اسے صاف صاف یہ حقیقت معلوم ہوسکتی ہے۔

پھر رجوع عن الطلاق کا مسئلہ بیان فرمایا کہ: ﴿وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا﴾ (اگر نیت اصلاح کی ہو، تو مطلقہ عورتوں کے خاوندوں کو زیادہ حق حاصل ہے کہ وہ رجوع کرلیں، اور عورتوں کو دوبارہ باقاعدگی کے ساتھ اپنے نکاح میں واپس لوٹائیں)۔

مسئلہ:

آیت مذکورہ میں طلاق رجعی کا حکم ہے، اس سے مغلظہ اور بائن مستثنیٰ ہیں، جن کا بیان آئندہ آنے والا ہے۔ رجعی طلاق میں اگرچہ عدت شروع ہوچکی ہو، تب بھی شوہر کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہے۔ نہ جدید مہر ضروری ہے، اور نہ ہی عورت کی رضامندی، کیونکہ رجعی طلاق میں نکاح ٹوٹتا نہیں۔ ہاں! اگر رجعی طلاق کی صورت میں رجعت کے بغیر عدت پوری گزر گئی، تب نکاح ختم ہوگا، اور آئندہ رجعت کا دروازہ بھی بند ہوجائے گا۔ رجعت کے لئے یہ ضروری

ہے کہ پختہ عزم ہو، اوراس کا زبانی اظہار ہو، یا مباشرت ہو، تا کہ ہر قسم کے تنازعہ کا سدِ باب ہوجائے۔ البتہ! یہ ضروری ہے کہ رجعی طلاق ایک ہو، یا دو، مگر رجعت عدّت کے اندر ہو۔

جب طلاقیں تین ہوں، پھر رجعت کا دروازہ بند ہوجائے گا، کیونکہ وہ طلاقِ مغلظ ہے، جس کا حکم عنقریب آنے والا ہے، جہاں رجعت نہیں ہوتی، اگرچہ طلاقیں تینوں رجعی ہیں۔ اسی طرح طلاقِ بائن میں بھی رجعت نہیں ہوسکتی، اگرچہ طلاق ایک ہو، اور عدّت باقی ہو، کیونکہ بائن کی صورت میں نکاح باقی نہیں رہتا۔ البتہ! یہ بات ہے کہ عدّت کے اندر اندر یا بعداز عدّت مہرِ جدید کے ساتھ عورت کی رضامندی سے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔ مزید تفصیلات کتبِ فقہ میں درج ہیں، وہاں رجوع کیا جائے۔

اصلاح کی قید لگا کر تنبیہ فرمائی کہ رجوع سے مقصد نیک نیتی اور رحم دلی ہو، کوئی بغض اور حسد نہ ہو۔ عورت کو تنگ کرنا، اور اسے ستانا مقصد نہ ہو، جیسے ظالم و بے انصاف لوگ کیا کرتے ہیں۔ بار بار طلاق دیتے ہیں، پھر رجوع کرتے ہیں۔ سالہا سال بے چاری عورتوں پر ظلم ہوتا رہتا ہے۔ نہ انہوں نے شوہر سے محبت وشفقت پائی، اور نہ ہی آزادی حاصل کی کہ جا کر دوسری جگہ شادی کرلے۔ زمانۂ جاہلیت میں اکثر ایسا ہی ہوتا تھا، جو کہ سخت گناہ اور حرام ہے، تو فرمایا:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ کہ جیسے ان عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں ویسے ہی ان عورتوں کے حقوق مردوں پر بھی ہیں، یہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ یہ حقوق دونوں طرف واجب اور لازمی ہیں، لہٰذا ہر دو طرف سے حقوق کی پاسداری لازمی ہے، تا کہ یہ لمبا سفر عشق ومحبت کے پیرایہ پر طے ہو، ﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً﴾ [الروم: ۲۱] (اور تمہارے درمیان محبت اور رحم دلی رکھی ہے) کا دور دورہ ہو۔ سبحان اللہ! کتنی اچھی دلکش اور عمدہ دوستی ہے؟ جس کی بقاء اور تابنا کی زیادہ تر جانبین سے حقوق کی پاسداری کی مرہونِ منت ہے۔ پھر زوجین کا گھر جنت کا منظر بن کر اس کا اثر اولادوں اور پوتوں تک وسیع ہوتا جائے گا۔ اگر حقوق کی پاسداری نہ ہو، تو گھر اور پورا ماحول دوزخ سے کہیں کم نہیں ہوگا۔

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے الوداعی خطبہ میں مشفق ومہربان نبی اُمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (فداہ أرواحنا) نے اس مسئلۂ حقوقِ زوجین پر بڑی بے مثال، مشفقانہ وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی، جانبین کے حقوق بیان فرمائے، اور عورتوں کے متعلق امت کو سنہری اور قیمتی ہدایات بتائیں۔ ساتھ ساتھ ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ کی

خوب وضاحت فرمائی، یعنی مردوں کی فضیلت جسمانی بھی ہے، اخلاقی حیثیت سے بھی، مال کمانے اور خرچ کرنے کی حیثیت سے بھی، دیکھ بال ونگرانی کی حیثیت سے بھی ہے۔ غرض ہر اعتبار سے دنیوی واخروی فضائل واعمال کی حیثیت سے مردوں کو فضیلت حاصل ہے۔ مزید تفصیل سورۃ النساء کی آیت ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ﴾[النساء:۳۴] کے تحت آنے والی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ
لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ
فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ
حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

ترجمہ: طلاق رجعی دو مرتبہ ہے، پھر اس کے بعد یا تو روک کے رکھنا ہے، اس کو دستور کے مطابق، یا اس کو آزاد کرنا ہے نیکی کے ساتھ، اور تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ تم ان عورتوں سے اس چیز میں سے کچھ لے لو، جو تم نے ان کو دی ہے، سوائے اس صورت کے کہ وہ دونوں (میاں بیوی) اس بات سے خوف کھاتے ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے، تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں اس چیز میں کہ وہ عورت اپنی جان چھڑائی کا فدیہ دے، یہ اللہ تعالیٰ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، پس ان حدود سے آگے نہ بڑھو، اور جو بھی اللہ تعالیٰ کی حدود سے آگے بڑھے گا پس وہی لوگ ظالم ہیں ﴿۲۲۹﴾

معارف ومنازل

☆......ابواب البرّ کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ چوبیسواں حکم ہے (یعنی عددِ طلاقِ رجعی) اس کے ساتھ ﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ﴾ سے پچیسواں حکم ''خلع'' کا بیان ہورہا ہے۔ چوبیسواں حکم یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں طلاق کا جو طریقہ تھا، وہ سراسر ظالمانہ تھا، اور ساتھ ساتھ بے شمار طلاقوں کا بھی رواج تھا۔ مزید یہ کہ سینکڑوں طلاقوں کے بعد رجعت کا دروازہ بدستور کھلا رہتا تھا، جب چاہتے، جتنا چاہتے طلاقیں دیتے، اور جب چاہتے، جس طرح چاہتے، رجوع کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں جاہلیت کے تمام طور طریقے منسوخ

فرما کر ارشاد فرمایا:

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ﴾ یعنی جس طلاق کے بعد رجعت جائز ہے وہ دو مرتبہ ہے، اور دو مرتبہ طلاق کے بعد شوہر کو دو اختیارات ہیں، یا تو دستور اور حسنِ اسلوب کے ساتھ رجعت ہو، یا حسنِ اسلوب کے ساتھ عورت کو چھوڑ دے، تاکہ عدّت گزار کر آزاد ہو، اور دوسری جگہ نکاح کرنے کی مجاز ہو۔

طلاق کی تین قسمیں ہیں:

طلاق کی تین اقسام ہیں: رجعی، بائن، مغلظ۔ اس کا بیان آئندہ آنے والا ہے۔ اسی طرح طلاق کے واقع کرنے کے تین طریقے ہیں: ایک اُحسن، دوم حسن وسنت، سوئم بدعت۔ سب سے بہتر طلاق کا طریقہ یہ ہے کہ عورت جب حیض سے فارغ ہو اور طہر شروع ہو، تو اس طہر میں ہمبستر نہ ہو، اور صرف ایک طلاق دی جائے، پھر اس کے قریب نہ آئے یہاں تک کہ عورت اپنی عدّت پوری کر لے، یہ طلاقِ اُحسن ہے۔

دوم طلاق حسن وہ یہ ہے کہ ہر طہر میں ایک ایک طلاق دی جائے، تین طہروں میں تین طلاقیں، مگر متفرق، یہاں تین طہروں کے ختم ہونے کے ساتھ تین حیضوں کی وجہ سے عدّت بھی ختم ہو جائے گی، کیونکہ اول طہر سے عدّت بہ سببِ طلاق شروع ہو چکی ہے۔

ان دونوں صورتوں کے علاوہ جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے، وہ بدعی طلاق شمار ہوگی، خواہ حیض کی حالت میں ہو، یا حمل کی حالت میں، یا طہر میں ہمبستری کے بعد ایک مجلس میں تین مرتبہ، یا ایک کلمہ کے ساتھ تین طلاقیں ہوں، مگر طلاقِ بدعی کا وقوع بھی پختہ اور یقینی ہے۔

خلع کا بیان اور تفصیلات:

بعض ظالم شوہر نہ بیوی کو رکھ کر اس کے حقوق ادا کرتے ہیں، اور نہ اسے طلاق دے کر فارغ کرتے ہیں۔ اس ناگفتہ بہ صورت حال سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مال طلب کرتے ہیں، اور مال کی خاطر طلاق دیتے ہیں۔ بعض دفعہ یہ بہانہ عورت کی طرف سے ہوتا ہے، کہ وہ کسی طرح شوہر کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی، اور مال کے عوض طلاق لینا چاہتی ہے۔ بہر حال! مجبوری کبھی شوہر کی طرف سے ہوتی ہے، اور کبھی عورت کی طرف سے، تو فرمایا:

﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا﴾ کہ شوہروں کے لئے حلال نہیں ہے کہ اپنی بیویوں کو چھوڑتے وقت کچھ

مال وصول کریں، یا دیے ہوئے حقِ مہر کی واپسی کا مطالبہ کریں، یا تحفے تحائف جو دیئے تھے، ان کی واپسی کی شرط لگائیں، وغیرہ۔ مگر ایک صورت ایسی ہے کہ جس میں یہ مطالبہ جائز ہے، وہ یہ کہ میاں بیوی دونوں کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ نکاح برقرار رکھنے میں ہم دونوں اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے، تو پھر دونوں پر گناہ نہیں ہے، یعنی لینے والے مرد پر بھی گناہ نہیں، اور جان خلاصی کے بدلے مال دینے والی عورت پر بھی گناہ نہیں کہ وہ خاوند کو کچھ مال دے کر اس سے جان چھڑا لے۔ اگر یہ معاملہ جانبین کی رضامندی سے طے پایا، تو اس کو خلع کہتے ہیں، اور ہمارے احنافؒ کے نزدیک اس سے ایک طلاقِ بائن واقع ہوجائے گی، جبکہ امام شافعیؒ کے نزدیک خلع فسخِ نکاح کا نام ہے۔

خلع کے متعلق چند ضروری باتیں:

(۱) جب عورت اپنے خاوند سے کہے کہ اس قدر مال پر تو مجھ سے خلع کرلے، اور خاوند منظور کرے، تو عورت پر طلاقِ بائن واقع ہوجائے گی، اور عورت کو مال ادا کرنا ہوگا۔

(۲) خلع اسی صورت میں ہوتا ہے جب میاں بیوی میں جھگڑا رہے، موافقت کی کوئی صورت نہ ہو، اور دونوں کو قوانینِ الٰہی کی پابندی کرنے کی ہمت اور امکان نہ ہو۔

(۳) ناموافقت کی صورت میں اگر زیادتی عورت کی طرف سے ہو، اور خلع کی درخواست بھی کرے تو گناہ عورت پر لازم ہوگا، اور مرد کو مال لینے پر گناہ نہیں ہے۔ البتہ! مہر سے زیادہ لینا مکروہ ہوگا۔

(۴) اور اگر ناموافقت میں قصور مرد کا ہو، تو پھر مہر اور زائد از مہر لینا دونوں مکروہ ہوں گے، مگر خلع بہر صورت ہوجائے گا۔ اس صورت میں عورت پر گناہ نہیں ہے، بلکہ گناہ تمام مرد پر ہوگا۔

(۵) البتہ! اگر مرد عورت کو نافرمان کہتا ہو، اور عورت مرد کو قصوروار سمجھتی ہو، ثبوت کوئی نہ ہو، تو اس صورت میں دونوں پر گناہ نہ ہوگا، اور خلع واقع ہوجائے گا۔ حقِ مہر سے زائد مال لینا بہرحال مکروہ ہوگا۔

(۶) عام کتبِ فقہ میں جو درج ہے ''طلاق بالمال'' وہ دراصل یہی خلع ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں خلع کا لفظ نہیں۔ البتہ! اگر اس طرح فرق سمجھا جائے تو ممکن ہے کہ خلع باقاعدہ حاکم یا قاضی کے ذریعہ ہوتا ہے، اور طلاق بالمال وہ ہے کہ میاں بیوی گھر میں خود طے کرلیں، تو اسے طلاق بالمال کہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ مگر یہ بات نہایت ضروری ہے کہ خلع یک طرفہ نہیں ہوتا، بلکہ اس میں جانبین کی رضامندی شرط ہے، اور جہاں جانبین کی رضامندی نہ ہو، وہ فسخِ نکاح ہی کہلائے گا، اس کے متعلق بہت سے مسائل اور شرائط کتبِ فقہ میں مذکور ہیں۔ ان کی رعایت ضروری ہے۔

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ﴾ میں جو دوطلاقوں کا تذکرہ ہے، وہ دونوں وہ ہیں جو بغیر مال کے ہیں۔ ﴿وَلَا یَحِلُّ لَكُمْ﴾ سے طلاق بالمال کا بیان ہے۔ یہ کوئی مستقل طلاق نہیں ہے۔ ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ﴾ سے تیسری طلاق کا بیان ہو رہا ہے، لہٰذا طلاقوں کو چار کہنا بالکل غلط ہوگا۔ خوب سمجھنا چاہئے۔ اور جب حنفیوں کے نزدیک خلع فسخِ نکاح کا نام نہیں ہے، اور خلع سے طلاقِ بائن واقع ہوجاتی ہے، تو عورت پر عدّت گزارنا واجب ہوگا، اور مرد کسی بھی صورت میں رجوع کا حقدار نہیں ہوگا۔ البتہ! اگر عورت کی رضامندی ہو، تو جدید نکاح، جدید حقِ مہر کے ساتھ جائز ہوگا۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ یُبَیِّنُهَا لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

ترجمہ: پھر اگر اس نے طلاق دے دی عورت کو (یعنی تیسری مرتبہ) پس اس کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہے یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی خاوند کے ساتھ نکاح کرے، پھر اگر اس نے بھی طلاق دے دی اس عورت کو، تو کوئی گناہ نہیں ہے ان دونوں پر کہ رجوع کرلیں، اگر گمان کریں وہ کہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو قائم رکھیں گے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے، اس قوم کے لئے جو علم رکھتے ہیں ﴿۲۳۰﴾

معارف ومنازل

☆......ابواب البرّ کا چھبیسواں حکم تین طلاق والی عورت کا سابقہ شوہر کے لیے حلال ہونے کے بیان میں ہے، اور دوطلاقوں کے حکم کے بعد تیسری طلاق کا حکم، اور اس کے بعد اسی شوہر کے لیے حلال ہونے کی صورت کا بیان فرمارہے ہیں کہ تیسری طلاق کے بعد کسی قسم کی رجعت جائز نہیں ہے، حلال ہونے کی شرعی صورت کے بغیر کے، جس کا بیان آنے والا ہے، اور یہ نکاح جیسی نعمت کی ناقدری کی سزا کے طور پر ہوا کہ کسی رجعت کا امکان نہ رہا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر دوطلاق دینے کے بعد تیسری طلاق بھی دے دی، تو اس عورت کا تعلق اس سے بالکل منقطع ہوگیا، اب نہ رجعت کا امکان ہے، اور نہ ہی مہرِ جدید کے ساتھ نکاحِ جدید کی گنجائش ہے۔

البتہ! اگر یہ عورت عدّت گزارنے کے بعد پہلے شوہر کے علاوہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح کرے، اور یہ دوسرے شوہر سے ہمبستری بھی کرے، پھر وہ اسے طلاق دے کر فارغ کرے، اور عدّت گزار کر آزادی حاصل

کرے، تو اب اس عورت کے ساتھ پہلے شوہر کی تجدیدِ نکاح کی گنجائش ہوگی، یعنی اب یہ عورت اوّل شوہر کے لئے حلال ہے، بشرطیکہ دونوں کو گمانِ غالب ہو کہ اس مرتبہ وہ حدود اللہ کی پاسداری کریں گے، اور گزشتہ کی طرح حقوقِ زوجیت کی خلاف ورزی نہیں کریں گے، اور بہتر تعلقات قائم رکھ سکیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دو طلاقوں کے بعد اگر شوہر نے تیسری طلاق بھی دے دی (جو کہ شرعاً پسندیدہ نہیں ہے) تو اب نکاح کا معاملہ بالکل ختم ہوگیا، اور رجعت کا اختیار بالکلیہ ختم ہو کر اجنبیت پیدا ہوگئی، چونکہ شوہر نے شرعی حدود سے تجاوز کیا۔ اس نعمتِ گرانمایہ کی بڑی ناقدری کی، اور پوری نسل کو پریشان کرنے کا باعث بنا، کہ بلاوجہ، بغیر ضرورت کے تیسری طلاق دے دی، تو اس کی سزا یہ ہے کہ اب اگر یہ دونوں راضی ہو کر پھر آپس میں جدید نکاح کرنا چاہیں، تو وہ بھی نہیں کرسکتے، اب ان کے آپس میں دوبارہ نکاح کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ عورت عدّتِ طلاق پوری کر کے کسی دوسرے شوہر سے نکاح کرے، اور حقوقِ زوجیت ادا کر کے دوسرے شوہر کے ساتھ رہے، پھر اگر اتفاق سے دوسرے شوہر نے بھی طلاق دے دی، یا مر گیا، تو اس کی عدّت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح جائز ہے، آیت کریمہ کے آخری حصہ: ﴿فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَن يَتَرَاجَعَا﴾ کا یہی مطلب ہے۔

تین طلاق اور اس کے احکام:

آیت قرآنیہ سے صاف ظاہر ہے کہ تین طلاقوں کے بعد رجعت کا حق باقی نہیں رہتا، خواہ وہ تین طلاقیں علیحدہ علیحدہ دی ہوں، یا اکٹھے دی ہوں۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین اور ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کا اس پر اجماع ہے کہ تین طلاقیں جس طرح بھی دی جائیں، خواہ مجتمعاً ہو یا متفرقاً، واقع اور لازم ہو جائیں گی، کیونکہ اسی پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے، جیسا کہ علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح موطا میں، اور امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم میں حافظ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ سے اجماع نقل کیا ہے، اور قاضی ابو الولید باجی رحمۃ اللہ علیہ نے منتقی میں، امام ابو بکر رازی جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے احکام القرآن میں، اور امام ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح معانی الآثار میں اس پر سلف کا اجماع نقل کیا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ یہی راجح ہے، اور علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے محلی میں، اور ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد، نیز "اغاثۃ اللھفان" میں اور سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان و حضرت علی رضی اللہ عنہ کا باسانیدِ صحیحہ یہ قول نقل کیا ہے کہ تین طلاق دینے سے عورت مغلظہ بائنہ ہو جاتی ہے، اور بدونِ حلالہ کے پہلے شوہر کا اس سے نکاح صحیح نہیں ہے۔

شیخ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ نے فتح القدیر میں لکھا ہے کہ خلفاء اور عبادلہ رضی اللہ عنہم سے صراحۃً یہ ثابت ہے کہ تین طلاق دینے سے تین ہی واقع ہوجاتی ہیں۔ اسی پر اجماع ہوچکا ہے، اسی طرح علامہ ابن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر مستقل رسالہ لکھا ہے، اور اجماع کی تائید میں نہایت زوردار دلائل سے ثابت کیا ہے کہ تینوں طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں، کتاب کا نام ہے: "بَیَانُ مُشْکِلِ الْأَحَادِیْثِ الْوَارِدَۃِ فِیْ أَنَّ الطَّلَاقَ الثَّلَاثَ وَاحِدَۃٌ"۔ اس کتاب میں مکمل رد ہے ایسے لوگوں پر جو کہ تین طلاقوں کے وقوع کے منکر ہیں۔ اسی طرح خاتم المحققین علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ میں اس پر مبسوط، مدلل اور مکمل کلام لکھا ہے، اور منکرین پر بے مثال جرح کی ہے، ان کے رسالہ کا نام ہے: "اَلْإِشْفَاقُ عَلٰی أَحْکَامِ الطَّلَاقِ لِلْإِمَامِ أَبِیْ زَاھِدِ الْکَوْثَرِیْ رَحْمَہُ اللہُ"۔

صرف بعض اہل ظاہر، اور بعض حنبلیوں کا قول ہے (ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ وتلامذہ کا) کہ تین طلاق دینے سے ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔ اسی طرح روافض شیعہ کہتے ہیں کہ تین طلاق دینے سے ایک طلاق بھی نہیں پڑتی۔ امام داود ظاہری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی قسم کی ایک روایت منقول ہے، جیسے کہ شیعوں کا مذہب ہے۔ پس یہ تینوں قول مردود اور ناقابلِ قبول ہیں، جو کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، چاروں ائمہ کرام، فقہاء، محدثین، علماء راسخین اور سلف صالحین رحمہم اللہ اور اجماعِ امت کے پسندیدہ اور متفقہ فتویٰ کے خلاف ہے۔ ہمارے زمانہ کے غیر مقلدین کا بھی یہی مذہب ہے، جو کہ علامہ ابن تیمیہؒ سے منقول ہے، کیونکہ یہ لوگ اگرچہ صحیح تقلید کے منکر ہیں، مگر اکثر و بیشتر مسائل میں علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیمؒ کے معتقد اور مقلد ہیں، وغیرہ۔

آج کل ضعیف العقیدہ مسلمان جب اس قسم کے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں، تو صرف بیوی کی خاطر حنفیت چھوڑ کر غیر مقلدین، اور شیعوں کی طرف فتویٰ کے لئے رجوع کرتے ہیں، اور وہاں سے انہیں حسبِ منشاء فتویٰ حاصل ہوجاتا ہے۔ پس خوش ہوجاتے ہیں، اور اس پر اطمینان بھی کرتے ہیں۔

ہم انہیں دینی مشورہ دے کر اپنا فرض ادا کرتے ہیں کہ کسی مولانا کے فتویٰ سے نہ حلال حرام ہوجاتا ہے، اور نہ ہی حرام حلال ہوجاتا ہے۔ اجماعِ امت کو چھوڑ کر چند لوگوں کے فتووں پر عمل کرنے والوں کو چاہئے کہ ایمان، عمل اور تقویٰ کا بیڑا غرق نہ کریں، اور اپنے نسب کو خراب کرکے اجماعِ امت کا تارک نہ بنیں، کیونکہ جو شخص اجماعِ صحابہ کا منکر ہوگا، وہ اہلسنت والجماعۃ کی مقدس جماعت سے خارج ہوجائے گا۔

غیر مقلد طبقہ بیس رکعت تراویح کے اجماع کا اگر منکر ہے، اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی سنت پر طعنہ زن ہے،

تو انہیں کوئی حق نہیں کہ وہ اہلسنت والجماعت ہونے کا دعویٰ کرے۔ جب کوئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اعمال، افعال اور ان کے متفقہ اجماع کا منکر ہوگا، تو اس کا رشتہ سلف سے منقطع ہوگا، اور صحابہ دشمن شیعوں کے ساتھ منسلک ہو جائے گا۔ بقولِ محقق ومؤرخِ اسلام علامہ سید مناظر احسن گیلانیؒ: ''غیر مقلد طبقہ شیعوں کی ایک ذیلی شاخ ہے''۔ واللہ اعلم

علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم اور علامہ شوکانی رحمہم اللہ کے تفردات پر پوری امت کے صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین، ائمہ مجتہدین اور تمام سلف وخلف رحمہم اللہ کے متفقہ عقائد ونظریات کو قربان کرنے والوں کو ہمارا دینی مشورہ ہے کہ اپنی آخرت کا خیال رکھیں، اور سلف کے سب وشتم سے اجتناب کریں۔ ''من عادى لي ولياً فقد أذنته بالحرب'' کی زد میں آنے سے خود کو بچائیں۔

بَابُ مَنْ اَجَازَ الطَّلَاقَ الثَّلٰثَ بِقَوْلِهٖ تَعَالٰی اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ الآیۃ قَالَ الْاِمَامُ الْقُرْطُبِیْ اِتَّفَقَ اَئِمَّۃُ الْفَتْوٰی عَلٰی لُزُوْمِ اِیْقَاعِ الطَّلَاقِ فِیْ کَلِمَۃٍ وَّاحِدَۃٍ وَھُوَ قَوْلُ جُمْھُوْرِ السَّلَفِ وَشَذَّ طَاؤُسٌ وَبَعْضُ اَھْلِ الظَّاھِرِ اِلٰی اَنَّ طَلَاقَ الثَّلٰثِ فِیْ کَلِمَۃٍ وَّاحِدَۃٍ یَقَعُ وَاحِدَۃً وَیُرْوٰی ھٰذَا عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِسْحٰقَ وَحَجَّاجِ بْنِ اَرْطَاۃَ وَقِیْلَ عَنْھُمَا لَا یَلْزَمُ مِنْہُ شَیْءٌ وَھُوَ قَوْلُ مُقَاتِلٍ وَیُحْکٰی عَنْ دَاؤُدَ اَنَّہٗ لَا یَقَعُ وَجُمْھُوْرُ السَّلَفِ وَالْاَئِمَّۃِ اَنَّہٗ لَازِمٌ وَاقِعٌ ثَلَاثًا وَلَا فَرْقَ بَیْنَ اَنْ یُّوْقِعَ ثَلَاثًا مُجْتَمِعَۃً فِیْ کَلِمَۃٍ اَوْ مُتَفَرِّقَۃً فِیْ کَلِمَۃٍ، وَتَرْجَمَ الْبُخَارِیُّ عَلٰی ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ بَابُ مَنْ اَجَازَ الطَّلَاقَ الثَّلٰثَ بِقَوْلِهٖ تَعَالٰی اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ وَھٰذَا اِشَارَۃٌ مِنْہُ اِلٰی اَنَّ ھٰذَا التَّعْدِیْدَ اِنَّمَا ھُوَ فُسْحَۃٌ لَھُمْ فَمَنْ ضَیَّقَ عَلٰی نَفْسِهٖ لَزِمَہٗ [القرطبی]

اہل سنت والجماعت کے دلائل:

(۱) تمام صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سے ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ...... اور ...... فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ کی تفسیر اسی طرح منقول ہے کہ دو طلاق کے بعد خواہ مجتمعاً ہوں یا متفرقاً، زوج کو رجعت کا حق رہتا ہے، اور تین طلاق کے بعد خواہ مجتمعاً ہوں یا متفرقاً، رجعت کا حق باقی نہیں رہتا۔ بے شمار روایتوں سے یہ ثابت ہے کہ شروع اسلام میں لوگوں کی یہ حالت تھی کہ بے حد وبے حساب طلاقیں دیتے تھے، حتی کہ سو سو اور ہزار ہزار طلاقیں دیتے تھے، اور جب عدت گزرنے کے قریب ہوتی، تو رجعت کرتے۔ یہ سلسلہ غیر متناہی سالوں تک چلتا۔ اس پر یہ حکم نازل ہوا، اور یہ ظالمانہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے طلاق کی حد مقرر کر دی، کہ طلاق کی آخری حد تین ہے، ایک اور دو طلاق کے بعد تو رجعت کا حق ہے، جبکہ تیسری طلاق کے بعد رجعت کا حق نہیں

رہتا۔ [ابن کثیر]

(۲) صحیحین بخاری ومسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں ہے کہ عویمر العجلانی رضی اللہ عنہ نے رحمت دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی کو لفظِ واحد میں تین طلاقیں دیں، اور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر کوئی انکار نہیں فرمایا۔

(۳) صحیحین اور سنن نسائی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، بعدازاں اس عورت نے دوسرے شخص سے نکاح کیا، اور دوسرے شوہر نے مباشرت سے پہلے اس کو طلاق دی، اس پر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ یہ عورت اپنے پہلے شوہر سے نکاح کرسکتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں! جب تک دوسرا شوہر پہلے شوہر کی طرح مباشرت وصحبت نہ کرلے۔ [ابن کثیر]

(۴) گزشتہ روایت کے قریب قریب رفاعہ قرظی رضی اللہ عنہ کی بیوی کا قصہ بروایت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا صحیح بخاری میں متعدد مقامات پر مذکور ہے، وہاں یہ الفاظ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رفاعہ قرظی رضی اللہ عنہ کی بیوی سے پوچھا: اَتُرِیْدِیْنَ اَنْ تَرْجِعِیْ اِلٰی رِفَاعَۃَ لَا حَتّٰی تَذُوْقِیْ عُسَیْلَتَہٗ وَیَذُوْقَ عُسَیْلَتَکِ۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے آیتِ مذکورہ کو اور ان تینوں حدیثوں کو ذکر فرمایا، اور ائمہ اربعہ کے مطابق طلاقِ ثلاث کے جواز کے لئے ایک ترجمۃ الباب قائم کیا فرمایا: "بَابُ مَنْ اَجَازَ الطَّلَاقَ الثَّلَاثَ"۔ بعدازاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور باب بھی منعقد کیا: "بَابُ اِذَا طَلَّقَھَا ثَلَاثًا ثُمَّ تَزَوَّجَتْ بَعْدَ الْعِدَّۃِ زَوْجًا غَیْرَہٗ فَلَمْ یَمَسَّھَا"۔ اور اس باب میں رفاعۃ القرظی رضی اللہ عنہ کی بیوی کی حدیث تخریج کی۔ [فتح الباری، جلد نہم]

(۵) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں ایک باب قصہ فاطمہ بنت قیس کے عنوان سے منعقد کیا۔ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو اس کے شوہر نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں تین طلاقیں دی تھیں، چونکہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے مزاج میں کچھ حدت (تیزی) تھی، اس لئے سید کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو کسی دوسرے گھر میں عدّت گزارنے کی اجازت دے دی تھی، تاکہ اس کو وحشت نہ ہو۔ [فتح الباري، ۹]

(۶) معجم طبرانی اور سنن بیہقی میں سوید بن غفلہ سے مروی ہے کہ عائشہ خثعمیہ حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی بیوی تھی۔ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ شہید ہوئے، تو عائشہ خثعمیہ نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو مبارکباد دی، اور یہ کہا: لِتَھْنِئْکَ الْخِلَافَۃُ آپ کو خلافت مبارک ہو۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو سخت ناگوار گزرا، اور کہا: کیا تجھے میرے والد ماجد کے قتل سے خوشی ہوئی؟ اِذْھَبِیْ فَاَنْتِ طَالِقٌ ثَلَاثًا جا تجھے تین طلاق۔ اور امام حسن رضی اللہ عنہ نے بقیہ مہر اس کا بھیج دیا۔

مزید برآں دس ہزار درہم اور بھیج دیے۔ عائشہ خشعمیہ کو بہت صدمہ ہوا، اس پر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا کہ اگر میں نے اپنے جدامجد رحمۃ کونین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول نہ سنا ہوا ہوتا، تو رجوع کر لیتا، وہ قول یہ ہے: "اَیُّمَا رَجُلٍ طَلَّقَ اِمْرَاَتَہٗ ثَلَاثًا عِنْدَ الْاِقْرَاءِ اَوْ ثَلٰثَۃً مُبْھَمَۃً لَمْ تَحِلَّ لَہٗ حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ"۔ یعنی جو شخص اپنی بیوی کو تین طلاق دے، حیض کے وقت، یا اور کسی طرح، تو وہ اس کے لئے حلال نہیں ہے، یہاں تک کہ دوسرے شوہر سے نکاح کرے۔

(۷) مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، پھر اس عورت نے دوسرے مرد سے شادی کر لی، اور اس نے اسے قبل از دخول طلاق دی، تو کیا یہ عورت اپنے پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! جب تک دوسرا شوہر پہلے شوہر کی طرح مباشرت وصحبت نہ کرے۔ [ابن کثیر] اسی طرح کی حدیث ابن جریر نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔

حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہما:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کے دو سال تک تین طلاقیں ایک شمار ہوتی تھیں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین طلاقوں کا حکم جاری فرمایا۔ بعض ظاہر پرست اس روایت کو دیکھ کر اس طرف چلے گئے کہ تین طلاق دینے سے ایک ہی طلاق واقع ہو جاتی ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی مصلحت سے تین طلاقوں کو تین قرار دیا تھا۔ علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم نے اجماعِ صحابہ اور ائمہ اربعہ وعلماء سلف کے خلاف، بلکہ تمام اہل سنت والجماعت کے خلاف شذوذ وتفرد میں مبتلا ہوئے، اور وہی راستہ اپنایا، جسے روافض شیعوں نے اپنایا تھا، کہ تین طلاقیں ایک شمار ہوتی ہیں، اور اجماع کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

سب سے پہلے شیخ الاسلام تقی الدین سبکی اور شیخ عز بن جماعہ اور دیگر علماء رحمہم اللہ نے شیخ ابن تیمیہ کے شذوذ و تفردات پر رد فرمایا۔ یہ حضرات ابن تیمیہ کے معاصر تھے، ان علماء کرام نے ابن تیمیہ کے جس طرح مسئلۂ طلاق کے تفرد پر رد فرمایا، اسی طرح ان کے دیگر کئی تفردات پر بھی ایک ایک کر کے رد فرمایا، جو کہ ان کے تمام تفردات اجماعی مسائل کے خلاف ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ مشرکین وکفار کے متعلق خلود فی النار کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کفار ایک مخصوص مدت تک جہنم میں رہنے کے بعد آزاد ہو جائیں گے، اور جنت میں داخل کئے جائیں گے، وہ

خلود کی تمام قرآنی آیتوں میں تاویل کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری جلد نہم میں جمہور علماء امت کی طرف سے حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کے آٹھ جوابات دیئے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کے جوابات:

(۱) پہلا جواب یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت جس کو طاؤس رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے شاذ ہے۔ آیت قرآنیہ اور احادیثِ صحیحہ ومشہورہ، اور اجماعِ صحابہ، اور خلفائے راشدین کے فیصلہ کے خلاف ہے۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سعید بن جبیر، مجاہد، عطاء، عمرو بن دینار، مالک بن حویرث، محمد بن ایاس اور نعمان بن ابی عیاش رحمہم اللہ، یہ تمام اکابر ثقات ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جو شخص اپنی عورت کو تین طلاق دیدے، تو اس کے بارے میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ یہ تھا کہ اس شخص نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی کہ یکدم تین طلاق دیں، اس کی بیوی اس سے بائنہ ہوگئی، دوسرا نکاح کئے اور طلاق حاصل کئے بغیر پہلے شوہر سے نکاح نہیں کرسکتی۔

ان ائمہ اکابر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو کچھ روایت کیا ہے، وہ جماعت صحابہ وتابعین کے مطابق ہے، اور اس امر کی دلیل ہے کہ طاؤس رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو روایت نقل کی ہے کہ تین طلاق ایک شمار ہوتی تھیں، وہ بالکل ضعیف اور کمزور ہے۔ یہ ہرگز ممکن نہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اجماعِ صحابہ کے خلاف کرے۔ حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ طاؤس رحمۃ اللہ علیہ کی روایت وہم اور غلط ہے۔ حجاز، شام، مصر اور مشرق ومغرب کے علماء میں سے کسی نے بھی تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار نہیں دیا ہے۔ [قرطبي]

امام ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں یہ گمان ہی غلط ہے کہ وہ محفوظ ومشہور حدیث کے خلاف کوئی بات کہیں۔ پس ہر حال میں جماعت کے قول کو ترجیح ہوگی۔ قاضی ابوبکر ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اس حدیث کی صحت میں اختلاف ہے، اجماع کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ [فتح الباری]

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے، کیونکہ راوی ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ اس کے خلاف ہے، اور جب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں فیصلہ واجماع منعقد کیا، تو انہیں اس کا پورا پورا علم حاصل تھا کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ اس اجماع پر نہ ابن عباس رضی اللہ عنہما معترض رہے، نہ کوئی اور، پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ کیسے برداشت کرتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں کسی محفوظ ومستند حدیث کے خلاف کوئی اجماعی فیصلہ صادر ہو؟ اور یہ امر بالکل واضح ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ہمیشہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس کا چشم وچراغ رہے۔ وہ کیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس

اجماع پر چھوڑ سکتے تھے، اور خاموشی اختیار کر سکتے ہیں؟ حاشاء وکلا۔

(۳) تیسرا جواب یہ ہے کہ قرآنی آیت اور بہت سی احادیثِ صحیحہ مشہورہ کا مطلب ظاہر ہے کہ تین طلاقیں تین ہی شمار ہیں۔ پس اگر بالفرض حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کو بھی صحیح تسلیم کیا جائے کہ تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوں گی، تو یہ مسئلہ مختلف فیہا ہوگا۔ جب یہ مختلف فیہا مسئلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوا، تو فاروق اعظمؓ نے بمشورۂ حضرت عثمان وحضرت علی ودیگر اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان روایتوں کی ترجیح کا فیصلہ فرمایا، جو تین طلاقوں کے تین ہونے پر دلالت کرتی ہیں، کیونکہ اسی پہلو میں احتیاط بھی ہے، اور قرآنی آیت کا مفہوم بھی یہی ہے، اور یہ مسلّم ہے کہ جس مسئلہ پر خلفاء راشدین اور جم غفیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق ہو، وہ پوری امت کے لئے واجب العمل ہو جائے گا۔ ائمہ اربعہ اور تمام محدثین وعلماء امت کا مسلک بھی یہی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اجماعِ صحابہ، نصِ قرآنی، احادیثِ صحیحہ، ائمہ اربعہ، محدثین، فقہاء کے خلاف کرنا، اوران تمام باتوں کونظرانداز کرنا سوائے گمراہی اور نزغہ شیطانی کے کچھ نہیں۔ پس اگر روافض اوران کا ہم مشرب کوئی ان مسلّمہ اقدار کے خلاف فتویٰ دے، تواسے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا:

قدتنکر العین ضوء الشمس من رمد ★ وتنکر الفم طعم الماء من سقم

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ☆ چشمہ آفتاب را چہ گناہ (سعدی)

پس مسلمانوں کو چاہئے کہ تین طلاقوں کے بارے میں کتاب وسنت، اجماعِ صحابہ، اجماعِ ائمہ اربعہ وجمہور علماء امت کا اتباع کریں۔ اس زمانہ کے منکرینِ اجماع اور مخالفینِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کہنے سے حرام اور زنا کے مرتکب نہ ہوں، اور اپنے دین اور نسب کو ہرگز خراب نہ کریں، جو اجماعِ صحابہ کا منکر ہو، وہ اہل سنت والجماعت میں سے نہیں ہے۔

بندہ سید عبدالستار شاہ غفرلہ

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ
بِمَعْرُوْفٍ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ
وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۚ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ
الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

ترجمہ: اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدّت تک پہنچیں، پھر ان کو دستور کے مطابق روک رکھو، یا ان کو چھوڑ دو دستور کے مطابق، اور ان کو ضرر پہنچانے کے لئے نہ روکو، تا کہ تم ان پر زیادتی کرو، اور جو شخص ایسا کرے گا، بیشک اس نے اپنی جان پر ظلم کیا، اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں (حکموں) کو ہنسی مذاق نہ ٹھہراؤ، اور اللہ تعالیٰ کی اُس نعمت کو یاد کرو جو اُس نے تم پر کی ہے، اور جو تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے، اللہ تعالیٰ ان باتوں کے ساتھ تمہیں نصیحت کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۲۳۱﴾

معارف ومنازل

☆......ابواب البرّ کے سلسلہ کا ستائیسواں حکم بیان ہو رہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، حسن، قتادہ، مسروق، ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم حضرات نے فرمایا کہ بعض لوگوں میں یہ دستور تھا کہ عورت کو بار بار طلاق دیتے، اور بار بار رجوع کرتے تھے۔ یہ سلسلہ کئی سالوں تک جاری رکھتے، اور بسا اوقات محض مذاق وہنسی کی خاطر سو سو، ہزار ہزار طلاقیں دیتے۔ اس کثرتِ طلاق پر فخر بھی کرتے، اور اس کو اپنے لئے نام آوری اور کمال سمجھتے۔ زمانۂ جاہلیت میں اس سے زیادہ بری حالت تھی، اس دور میں طلاق کا شمار ہی نہیں تھا، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ عورتوں کو تنگ نہ کیا کرو۔

اگر چہ یہ مسئلہ پہلے بھی ذکر ہوا، مگر ضمناً، اب مستقلاً یہ فرما رہے ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ ربّ العزّت سبحانہ جس طرح کفر وشرک کو پسند نہیں کرتا، اسی طرح وہ ظلم وزیادتی کو بھی پسند نہیں کرتا، اور یہ بار بار طلاق اور رجعت سراسر عورتوں پر ظلم وزیادتی ہے، اور احکامِ الٰہی کے ساتھ ہنسی ومذاق بھی ہے، جو کہ بہت بری بات ہے، اس لئے ارشاد ہے کہ اگر رجعت سے تمہارا مقصد اپنے گھر کی آبادی ہے، تو بہت ہی بہتر، دستور وانصاف کے مطابق رجعت کرو، اور اپنے گھریلو حقوقِ زوجین کی مکمل پاسداری کرو، اس میں تمہارے بہت سے فوائد حاصل ہو جائیں گے۔

اگر حالات اتنے کشیدہ ہیں کہ رجعت میں فائدہ کم، اور چھوڑنے میں فوائد زیادہ ہوں، تو اخلاقی پہلو اور

دستورِ شرعی کے مطابق عورتوں کو فارغ کر کے آزاد کرلو، تا کہ وہ اپنے لئے کسی اور جگہ کا انتخاب کر کے نکاح کرلیں لہٰذا انہیں ہر قسم کے ستانے اور ضرر رسانی سے فارغ کرو، اور اپنے نفسوں پر ظلم و زیادتی کا وبال مت ڈالو، اور شریعت و احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی چونکہ استہزاء بالدین کے زمرے میں آتی ہے، اس سے اپنا دامن بچا کر دنیا و آخرت خراب کرنے سے پرہیز کرو۔ جب جہالت کے اندھیروں سے ربّ العزّت نے تمہیں نکال کر اسلام کا نور روشن نظام عطاء فرمایا، اور سید کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل قرآن وسنت اور معارف وحکمت کی سعادتوں سے نوازا، تو اللہ پاک کی ان عظیم نعمتوں کو یاد کرو، اور شکر بجالاؤ۔ شکر یہ ہے کہ احکامِ الٰہی پر عمل پیرا رہو، بے عملی اور استہزاء بالدین سے اجتناب کرو۔

دیکھو! یہ بھی ایک نعمت ہے کہ طلاق رجعی ''مَرَّتٰنِ'' کے بعد تمہیں بیویوں کے رکھنے ﴿اِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ﴾ اور نہ رکھنے ﴿تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ﴾ دونوں کا اختیار دے دیا، اور انتخاب تمہارے ہاتھ میں دے دیا، یہ تمہارے لئے نصیحت ہے۔ ﴿يَعِظُكُمۡ بِهٖ﴾ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ ڈرنا یہ ہے کہ اس کے احکام پر چلو، ہر قسم کی نافرمانی سے اجتناب کرو۔ خلقِ خدا (مطلقہ عورتوں) پر ظلم و زیادتی نہ کرو، شرعی حدود کو پامال (استہزاء) کرنے سے بچتے رہو، اور بدنیتی و ہر قسم کی برائی سے پرہیز کرو، کیونکہ ربّ العزّت تمہارے ظاہر کی طرح باطنی ارادوں کو بھی جانتا ہے۔ کائنات کا کوئی ذرّہ اس کے علمِ محیطِ کلّی سے باہر نہیں ہے، اسی نکتہ کو خیال میں رکھو، اور قیامت کے حساب و کتاب کی فکر کرو۔

﴿اَلۡحِكۡمَةَ﴾ یہ کلمہ قرآن کریم میں بیس مرتبہ مذکور ہے۔ ہر مقام کے مناسب اس کے معنی ہوں گے۔ یہاں حکمت سے مراد سنت و حدیث ہے۔ اس کے معانی یہ ہیں: دانائی کی باتیں، دانشمندی، معارف و احکام، اسرارِ شریعت، معرفتِ حق، وغیرہ۔

وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ اَنۡ يَّنۡكِحۡنَ اَزۡوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوۡا بَيۡنَهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ ذٰلِكَ يُوۡعَظُ بِهٖ مَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمۡ اَزۡكٰى لَكُمۡ وَاَطۡهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۲﴾

ترجمہ: اور جب تم عورتوں کو طلاق دیدو، پھر جب وہ عدّت کو پہنچیں، تو تم ان عورتوں کو اس بات سے نہ روکو

کہ وہ اپنے خاوندوں سے (دوبارہ) نکاح کریں، جب کہ وہ آپس میں دستور کے موافق راضی ہوجائیں، یہ باتیں وہ ہیں کہ ان کے ساتھ نصیحت کی جاتی ہے، اس شخص کو جو تم میں سے اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر یقین رکھتا ہے، یہ بات تمہارے لئے زیادہ شائستہ ہے، اور زیادہ پاکیزہ ہے، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے ﴿۲۳۲﴾

معارف ومنازل

☆......ابواب البِرّ کے سلسلے کا اٹھائیسواں حکم ہے کہ مطلقہ عورت اگر سابق شوہر سے نکاح پر آمادہ ہو، تو اسے اختیار دیا جائے۔

شانِ نزول:

آیت کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی جمیلہ نامی ہمشیرہ عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھی، سوءِ اتفاق سے عاصم رضی اللہ عنہ نے جمیلہ کو طلاق دی، اور اس نے عدّت پوری کرلی۔ اس اثناء میں عاصم رضی اللہ عنہ نے اسے دوبارہ نکاح کا پیغام بھیجا۔ جمیلہ دوبارہ عاصم رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکاح پر راضی ہوگئی۔ اس بات پر جمیلہ کے بھائی معقل رضی اللہ عنہ بڑے غصے میں آئے، اور انہیں منع کیا، اور عاصم کو پیغام بھیجا کہ آئندہ ہرگز میری بہن کا تذکرہ نہ کرنا، اس پر حق تعالیٰ سبحانہ کی جانب سے ایک خاص ضابطہ اور قانون نافذ کیا گیا۔ نیز زمانۂ جاہلیت کا ایک بیہودہ دستور ہوتا تھا کہ جب عورت عدّت پوری کرنے کے بعد کسی شخص سے نکاح کرنا چاہتی، تو عورت کا پہلا شوہر محض عصبیت کی بنا پر مزاحمت کرتا، اور عورت کو نکاح نہ کرنے دیتا۔

کبھی ایسا ہوتا کہ طلاقِ بائن کے بعد اگر عورت اپنے پہلے خاوند سے نکاح کرنا چاہتی، تو عورت کے اولیاء مانع ہوتے کہ ہم پہلے شوہر سے نکاح نہیں کرنے دیں گے۔ یہ ہماری خاندانی بے عزّتی ہوگی، اسی بنیاد پر حضرت معقل رضی اللہ عنہ نے اپنی بہن جمیلہ کو عاصم رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکاح سے روکا۔ اسی طرح عورت کی آزادی، اور اس کے حقِ خود ارادیت میں مداخلت ہوتی تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس بے جا مداخلت سے منع فرمایا، اور عاقلہ بالغہ عورت کی حقِ خود ارادیت کو برقرار رکھا۔

اسی شانِ نزول کی روشنی میں آیت کریمہ کا مطلب سمجھئے!

(۱) شوہر نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، اور وہ اپنی عدّت بھی پوری کرچکی، تو اب اس کو اختیار ہے کہ وہ جس شوہر سے چاہے اپنا نکاح کرلے۔ اگر پہلے خاوند نے تین طلاقیں نہ دی ہوں، تو چاہے اسی سے ہی دوبارہ نکاح

کرلے، یا کسی اور سے کرلے، اور اگر پہلے شوہر نے تین طلاقیں دے دی ہوں، تو پہلے سے نہیں، بلکہ کسی دوسرے سے نکاح کرنا چاہے، تو کرلے، اور جس سے وہ نکاح کرنا چاہتی ہے، وہ عورت اور یہ ہونے والا شوہر باہم قاعدہ شرعیہ کے موافق رضامند بھی ہوں، یعنی عقدِ صحیح کرنا چاہتے ہوں، مہر بھی مناسب مقرر ہو، گواہوں کے سامنے نکاح ہو، حقوقِ زوجیت کے پورا کرنے کا التزام بھی ہو، اور باہم حسنِ سلوک کے ارادے سے نکاح کرتے ہوں، تو ایسی حالت میں نہ تو پہلے خاوند کو مزاحمت کا حق ہے کہ وہ یہ کہہ کر عورت کو روکے کہ میں کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کرنے دوں گا، اور نہ عورت کے اولیاء کو یہ حق ہے کہ وہ مزاحمت کریں، اور یہ کہہ کر روکیں کہ ہم تو پہلے خاوند سے نکاح نہیں کرنے دیں گے۔

(۲) ﴿فَلَا تَعۡضُلُوهُنَّ﴾ میں خطاب عام ہے، سابق شوہروں کو بھی شامل ہے، اور عورت کے اولیاء کو بھی، اور یہ منع کرنا اور عورت کو روکنا دونوں فریق کے لئے ناجائز ہے، جیسا کہ بعض مفسرین نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ ﴿فَلَا تَعۡضُلُوهُنَّ﴾ میں خطاب کو عام رکھنا چاہئے، تاکہ ہر مزاحمت کرنے والے کو شامل ہو سکے۔

(۳) البتہ اگر عورت غیر کفو میں نکاح کرے، یا عدت کے اندر کسی دوسرے مرد سے نکاح کرنا چاہے، یا تین طلاقوں کے بعد بھی پہلے خاوند سے نکاح کرے، یا مہرِ مثل سے کم پر نکاح کرنا چاہے، تو ان صورتوں میں اولیاء کو منع کرنے اور روکنے کا حق ہے۔ اگر عورت نے ولی سے پوچھے بغیر نکاح کرلیا، تو ولی شرعی عدالت کے ذریعہ نکاح فسخ کرنے کا مجاز ہوگا۔ واللہ اعلم

خلاصہ یہ ہے کہ اگر نکاح میں کوئی شرعی نقص (خاص کر عقیدہ کا نقص) نہ ہو، جانبین کی باہمی رغبت ہو، اور لڑکی اور لڑکا عشق و محبت کی زنجیروں میں جھکڑے ہوئے ہوں، تو اس میں مزاحمت کرنا، اور روکنا موجبِ فتنہ ہوگا، اور ہلاکت سے خالی نہیں ہوگا، خاص کر ہمارے آج کے مادر پدر آزاد معاشرے میں، جہاں ہم بے پردگی، بے حجابی اور مخلوط نظامِ تعلیم کی سزا بھگت رہے ہیں۔

آج کے معاشرے کا اگر بغور ملاحظہ کیا جائے، تو قبل از اسلام جاہلیت اولیٰ والے معاشرہ سے بھی چند وجوہات کی وجہ سے بدتر ہے۔ موبائل اور ٹیلیویژن وغیرہ نے ہمارے معاشرے کو اتنا آزاد اور تباہ کن سرحدوں پر پہنچایا ہے، جہاں سے واپسی انتہائی مشکل ہے۔ اسی نکتہ کے پیشِ نظر قرآن کریم نے ایک اہم اور بنیادی حقیقت، یعنی "اِیۡمَان بِاللّٰهِ وَبِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ" کا خصوصیت سے ذکر فرمایا، اور ﴿اَزۡکٰی وَاَطۡهَرُ﴾ کے ذکر کے ساتھ یہی تنبیہ فرمائی کہ بے جا مزاحمت کے نقصانات بہ نسبت فائدہ کے بہت زیادہ ہیں۔

عورت اگر ایک اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، تو دوسرے پہلو سے ایک فتنہ بھی ہے۔حدیث شریف میں اس کو شیطان کا جال کہا گیا ہے، اور ٹیڑھی پسلی کے ساتھ اس کو تشبیہ دی گئی ہے۔اسلام نے جس طرح عورت کا احترام اور دلجوئی کی ہے، اور اسے ایک اعلیٰ مسند عطا کیا ہوا ہے، دیگر اقوام کا اس کے ساتھ معاملہ بالکل برعکس ہے۔

ہنود، یہود، عیسائی، مجوس، صابی اور مشرک اقوام نے تو عورت کی اتنی تذلیل اور بے حرمتی کی ہے، جس کی مثال نہیں، مگر اسلام نے احترام وعزت کے باوجود اس کے شر اور حماقت سے خبردار بھی کیا ہے۔

یہ اپنی دماغی رطوبت اور ناقص عقل اور ضعف اعصاب کی وجہ سے ہر میدان میں مردوں سے پیچھے ہے، مگر اس کی رغبت اور شوق اسے ہر میدان میں مردوں کے ساتھ برابری، بلکہ مردوں سے آگے سبقت پر ابھارتا رہتا ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے، اور نادانی کی نشانی ہے۔سماجی، خاندانی، قومی اور معاشرتی برائیوں میں عورت کا بہت بڑا حصہ ہے۔اکثر وبیشتر فتنوں اور برائیوں میں عورت سب سے پیش پیش رہتی ہے۔اس کی کوشش ہوتی ہے کہ شوہر، بیٹے، بھائیوں پر اس کو سوچ وفکر کی برتری حاصل ہو، پورا خاندان اس کی رائے کا احترام کرے، اور وہ سب پر حاوی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ مرد بادشاہ ہو یا وزیر، صدر ہو یا سردار، پہلوان ہو یا صنعتکار، پروفیسر ہو یا کوئی بڑی ہستی، یہ لوگ اپنے لوگوں پر بڑے سخت گیر ہوتے ہیں، اور عام لوگ ان کے رعب سے مرعوب ہو کر لرزاں وترساں رہتے ہیں، تواضع ومدارات، عجز وانکساری سے یہ لوگ بے حد دور ہوتے ہیں، مگر یہ پہلوان لوگ جب گھر کی ملکہ کی دہلیز اور بارگاہ میں پہنچ جاتے ہیں، دلیری اور بہادری کے تمام ابجد بھول جاتے ہیں، اور بجائے گرج دار آواز کے سراسر یک لخت سننے والے کان بن جاتے ہیں، اور جی جی کہتے ہیں۔

تاریخی حوالہ سے عرض کر رہا ہوں کہ کئی اقوامِ عالم کی تباہی اور زوال عورتوں کی وجہ سے ہوا ہے، لہٰذا اسلام نے اگر ان کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے، تو ساتھ ساتھ ان کے مکروفریب اور بیجا مداخلت سے بھی آگاہ فرمایا، تاکہ مرد ہوشیار رہیں۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ ۢ بِوَلَدِهَا

وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا
وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۭ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ
اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

ترجمہ: اور مائیں یعنی بچے والی عورتیں اپنے بچوں کو کامل دوسال تک دودھ پلائیں، یہ اس شخص کے لئے ہے جو دودھ پلانے کی مدّت کو پورا کرنا چاہتا ہے، اور والد کے ذمہ ہے ان کا کھانا اور لباس دستور کے مطابق، نہیں حکم دیا جاتا کسی نفس کو، مگر اس کی استطاعت (طاقت) کے مطابق، نہیں نقصان پہنچایا جائے گا والدہ کو اس کے بچے کی وجہ سے، اور وارث پر بھی اسی طرح لازم ہے، پس اگر بچے کے والدین دودھ چھڑانے کا ارادہ کریں آپس کی رضامندی اور مشورہ سے تو ان پر کچھ گناہ نہیں ہے، اور اگر تم ارادہ کرتے ہو اپنی اولادوں کو دودھ پلانے کا دوسری عورتوں سے، تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے، جب کہ تم دیدو وہ چیز جو مقرر کی ہے دستور کے مطابق، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو ﴿۲۳۳﴾

معارف ومنازل

☆......ابواب البرّ کے سلسلہ کا انتیسواں حکم ہے رضاعت کے متعلق۔ چونکہ بچہ مرد (باپ) کا ہوتا ہے، اور دودھ عورت پلاتی ہے، تو سوال یہ پیدا ہوا کہ مرد وزن کی علیحدگی (طلاق) کی صورت میں بچے کی پرورش کس طرح اور کیسے ہوگی؟ جب کہ اصولی طور پر چاہئے کہ بچے کو مرد، یعنی باپ کی تحویل میں چلے جانا چاہئے، مگر باپ کے لئے ایسا کرنا کئی وجوہ سے غیر ممکن بھی ہے، اور بچے کے حق میں یہ نقصان سے بھی خالی نہیں۔ ساتھ ساتھ فطری طور پر ماں کے لئے باعثِ رنج اور موجبِ پریشانی بھی ہے۔ سبحان اللہ! خالقِ کائنات سبحانہ کے سارے اصول وضوابط مبنی بر حکمت بھی ہیں، اور موجبِ حیات ورحمت بھی۔ حق سبحانہ نے ایسا نظام جاری فرمایا کہ نہ سیخ بسوزد نہ کباب......

اس نظامِ تکوینی وتشریعی میں مرد، عورت، بچہ تینوں کی بقاء کی خاطر ایسا ضابطہ جاری فرمایا، جس میں تینوں کی اشک شوئی بھی ہے، اور حیات وراحت وخوشحالی وسکون بھی ہے، ارشاد ہوا:

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ اس آیت کریمہ میں دودھ پلانے کا حکم سب سے پہلے حقیقی ماؤں کو دیا گیا، خواہ وہ نکاح میں ہوں، یا مطلقہ ہوں۔ پھر دودھ پلانے کے اعتبار سے حقیقی ماں کی تین

صورتیں ہوسکتی ہیں۔

حقیقی ماں کی تین صورتیں:

(۱) پہلی صورت یہ کہ عورت اپنے خاوند کے نکاح میں ہو، دودھ بھی ٹھیک ٹھاک ہے، اس میں کوئی بیماری کا مادہ نہیں ہے، اور کوئی مرض بھی لاحق نہیں، تو ایسی حالت میں ماں پر دودھ پلانا دیانتاً واجب ہے، اور اس کے خرچہ کی تمام ذمہ داری (دودھ، علاج وغیرہ) باپ پر ہے۔ اگر ماں بلا عذر کسی ضد یا ناراضی کے سبب دودھ نہ پلائے، تو گنہگار ہوگی، اور اس صورت میں اگر دودھ پلانے پر اُجرت طلب کرے، تو حقدار نہیں ہے، کیونکہ وہ شوہر کے نکاح میں ہے، تو اُجرت و معاوضہ کی حقدار نہیں ہوگی۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ عورت کو طلاق ہوچکی ہے، مگر ابھی وہ عدّت میں ہے، تو اس حالت میں بھی دودھ پلانے کی ذمہ داری ماں پر ہے، اور اس کا خرچہ باپ پر ہی ہے، جب تک کہ عدّت باقی ہے۔ قیام، طعام، لباس ہر قسم کا خرچہ شوہر کے ذمہ ہوگا، اور اس صورت میں بھی عورت دودھ پلانے پر اُجرت و معاوضہ کی حقدار نہیں ہوگی۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ عورت کو طلاق ہو کر عدّت ختم ہوچکی ہے، پس اس صورت میں عورت کی ذمہ داری ختم ہوچکی ہے۔ بچے کی ہر قسم کی پرورش کا ذمہ دار باپ ہی ہوگا۔ پس والدہ اُجرت و معاضہ کی حقدار ہو کر اگر وہ بچے کو دودھ پلانے پر رضامند ہو، تو باپ کو چاہئے کہ اسے اوّلیت دے کر اس کا خرچہ معمول کے مطابق برداشت کرے۔ البتہ! عورت اگر معمول سے زیادہ خرچہ طلب کرے، اور مرد بھی راضی ہو، تو کوئی حرج نہیں، اور اگر مرد اُجرت کی زیادتی پر راضی نہ ہو تو اسے اختیار حاصل رہے گا کہ وہ بچے کی ماں کے علاوہ کسی دوسری عورت کو اُجرت دے کر بچے کو دودھ پلوائے، اسی طرح اگر حقیقی ماں کا دودھ کم ہو، جس سے بچے کا گزارہ مشکل ہو، یا ماں کا دودھ مضر صحت ہو، تو ایسی صورت میں بھی باپ کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ کسی کو اُجرت دے کر انتظام کرے۔

مدّتِ رضاعت:

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ پوری مدّتِ رضاعت دو سال ہے، جب تک کوئی خاص عذر مانع نہ ہو، تو بچے کا حق ہے کہ دودھ پلانے میں یہ مدّت پوری کی جائے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دودھ پلانے کے لئے پوری مدّت دو سال قرار پائی ہے۔ اس کے بعد دودھ نہ پلایا جائے۔ البتہ بعض آیات قرآنی اور احادیث کی بناء پر امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر ڈھائی سال، یعنی

تیس ماہ کے عرصہ میں بھی دودھ پلا دیا، تو رضاعت کے احکام ثابت ہو جائیں گے، یعنی "یَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَایَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ" والا ضابطہ لاگو رہے گا۔ البتہ ڈھائی سال پورے ہونے کے بعد بچہ کو ماں کا دودھ پلانا بالاتفاق حرام ہے، اور احکامِ رضاع بھی ثابت نہ ہوں گے۔

﴿وَعَلَى الْمَوْلُوْدِلَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا﴾ یعنی باپ کے ذمہ ہوگا ماؤں کا کھانا اور لباس قاعدہ کے موافق، خواہ عورت نکاح میں ہو، یا مطلقہ ہو، اور عدّت باقی ہو۔ البتہ اگر عدّت گزر چکی ہو، تو اُجرت کی اسی طرح حقدار ہوگی جس طرح کوئی اور عورت۔ پس کسی جان کو اس کی گنجائش سے زیادہ پابند نہیں کیا جائے گا۔ اگر عورت کو کوئی عارضہ درپیش ہے، یا بے انتہا کمزور معذور ہے، تو اسے دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر مرد فقیر ہے، تو اس کی حیثیت سے زیادہ اُجرت ومراعات پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

زوجہ کا نفقہ ہر حال میں مرؔد پر واجب ہے، یہ رضاع کے ساتھ وابستہ نہیں

نکاح ہونے کے ساتھ بیوی کا خرچہ شوہر پر فرض ہو جائے گا، خواہ بچہ ہو یا نہ ہو، جبکہ بیوی کی محنت مختصر اور کم ہے، اور جب بچہ کی پیدائش ہوگی، تو ماں کی خواری ومحنت اور دیکھ بال وغیرہ زیادہ ہوگی، تو نفقہ کا وجوب اور زیادہ پختہ مؤکد ہو جائے گا۔ اس پر اتفاق ہے کہ زوج وزوجہ اگر دونوں امیر ہوں، تو نفقہ امیرانہ واجب ہوگا، اور اگر دونوں غریب ہوں، تو پھر نفقہ بھی غریبانہ واجب ہوگا، اگر دونوں کے حالات مختلف ہوں، یعنی مرد مالدار ہو، جبکہ عورت غریب ہو، یا مرد غریب اور عورت مالدار ہو، تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے: صاحب ہدایہ نے امام خصاف رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول پر فتویٰ دیا ہے کہ اگر مرد مالدار اور عورت غریب ہو، تو عورت کا نفقہ درمیانہ درجہ کا واجب ہوگا، یعنی امیروں سے کم اور غریبوں سے زیادہ۔ اور امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اعتبار شوہر کے حال کا ہوگا۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے فتح القدیر میں بہت سے فقہاء کا فتویٰ اسی پر نقل کیا ہے۔

یہ اس صورت میں جب نفقہ کے متعلق کوئی کشمکش اور تنازعہ ہو، اگر کوئی تنازعہ نہیں، رواداری اور رضامندی ہو، کوئی مطالبہ بھی نہ ہو، تو وہی دستور جاری رہے گا، جو میاں بیوی بخوشی آپس میں طے کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

﴿لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا﴾ یعنی نہ تو کسی ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف میں ڈالنا جائز ہے، اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف میں مبتلا کیا جائے، یعنی اگر ماں دودھ پلانے سے معذور ہو، تو باپ کے لئے جائز نہیں ہے کہ اس پر زبردستی کرے۔ اسی طرح اگر باپ غریب ہو، اور ماں معذور نہیں، تو اس کے لئے جائز نہیں

ہے کہ اسے کسی دوسری عورت کی خدمت پر مجبور کرے، لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ دونوں اتفاق و ہمدردی پر عمل کریں، اور ضد کر کے ایک دوسرے کے لئے مشکلات پیدا نہ کریں۔

﴿وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ﴾ اگر بچے کا باپ زندہ نہ ہو، تو بچے کی ہر طرح پرورش اس کے وارث کے ذمہ ہوگی۔ بالفرض! اگر یہ بچہ مرجائے، تو جو لوگ اس کے وارث بنیں گے، وہی اس کے نان ونفقہ اور ہر طرح کی پرورش کے ذمہ دار ہوں گے، اور یہ سلسلہ صرف مدّتِ رضاع تک نہیں، بلکہ اس بچے کی مدّتِ بلوغ تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ مثال کے طور پر اگر اس بچہ کی ماں اور دادا زندہ ہوں، تو یہ دونوں وارث بھی ہیں، اور محرم بھی۔ بچے کی میراث میں ماں کا حصہ "ثلث" ہے، اور دادا کا "ثلثان" ہے، تو اسی مناسبت سے یہ دونوں وارث بچے کی کفالت کریں، اور اس کے نان ونفقہ کے اخراجات برداشت کریں۔ ایک تہائی ماں کے ذمہ، دو تہائی دادا کے ذمہ ہوگا۔ البتہ! اگر یہ بچہ مالدار ہو، تو پھر اس کے اپنے مال سے سب کچھ پورا کرنا ہوگا۔

﴿فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا﴾ یعنی اگر بچے کے ماں باپ دونوں آپس میں رضامندی اور باہمی مشورے سے یہ ارادہ کریں کہ شیر خوارگی کی مدّت، یعنی دو سال سے کم میں ہی دودھ چھڑا دیں، خواہ یہ ماں کی معذوری کے سبب ہو، یا بچے کی کسی معذوری کی وجہ سے ہو، یا کوئی اور عذر درپیش ہو، تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے، بشرطیکہ یہ عمل کسی ضد و نا اتفاقی پر مبنی نہ ہو، بلکہ مشورہ اور باہم رضامندی پر مبنی ہو، اس سے بچے کو کسی نقصان وغیرہ کا اندیشہ بھی نہ ہو۔

﴿وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْا اَوْلَادَكُمْ﴾ اگر تم کسی مصلحت کے تحت ماں کی بجائے اپنے بچوں کے لئے کوئی مرضعہ، یعنی دودھ پلانے والی عورت مقرر کرو، تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے، شرط یہ ہے کہ دودھ پلانے والی عورت کی جو اُجرت مقرر کی گئی ہو، وہ بطیبِ خاطر پوری کی پوری ادا کرو۔ عرب میں یہ رواج عام تھا کہ وہ لوگ اکثر و بیشتر پیدائش کے فوراً بعد اپنے بچوں کو اکثر دیہاتی عورتوں کے سپرد کرتے رہتے تھے، اور ان کے لئے اُجرت مقرر کرتے تھے۔

اسی رسم ورواج کی بنیاد پر پوری امت کے لئے قابلِ احترام حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کی قسمت جاگ اٹھی، جنہوں نے قبیلہ بنی بکر بنی سعد کی عورتوں کے ساتھ ایک لاغر و کمزور گدھی پر سواری کر کے مکہ مکرمہ تشریف لائی، اور سید کائنات، رحمت للعٰلمین، شفیع المذنبین ﷺ (فداہ آباءنا و أمھاتنا و أرواحنا) کو اپنی گود میں لے کر

روانہ ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ اس خوش قسمت خاتون کا جنت میں کیا مقام ہوگا؟ (جنت البقیع میں مدفون ہیں)۔

حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا جب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سواری پر بٹھا کر مکہ مکرمہ سے روانہ ہونے لگیں، تو گدھی نے کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے تین مرتبہ سجدہ کیا، اور کہا کہ تمہیں معلوم ہو کہ میری پیٹھ پر دونوں جہاں کے سردار سوار ہیں۔ [مظہری]

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ ربّ العزت سبحانہ اپنے بندوں پر بیحد مہربان ہے، وہ ہمیشہ ہر معاملہ اور شرعی احکام کے بیان کرنے کے اختتام پر انہیں بیدار فرما کر تقویٰ کا حکم دیتا ہے، تا کہ وہ لوگ حقوق اللہ، اور حقوق العباد میں غفلت ولا پرواہی کی وجہ سے گناہ کے مرتکب نہ ہوں، اور اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم اور عنایت سے محروم نہ ہوں۔

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ﴾ اور جان لو کہ تمہارے چھوٹے بڑے اعمال سارے لکھے ہوئے اعمال ناموں میں محفوظ ہیں، اور اللہ تعالیٰ کا علم ہر ذرّہ پر محیط ہے، اور وہ علیم وخبیر سمیع وبصیر ہے، سب کچھ جانتا، سنتا اور دیکھتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْمَا فَعَلْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۲۳۴

ترجمہ: اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں، اور بیویاں چھوڑ جائیں، تو یہ بیویاں اپنی جانوں کو روکے رکھیں چار ماہ اور دس دن، اور جب وہ اپنی مدّت کو پہنچ جائیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے جو کچھ وہ عورتیں اپنے بارے میں دستور کے مطابق کریں، اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس کی خبر رکھنے والا ہے ۲۳۴

معارف ومنازل

☆......ابواب البرّ کے تحت بیان ہونے والا تیسواں (۳۰) حکم ہے، یعنی وفات کی عدّتِ شرعی کا بیان۔

اس سے پہلے طلاق کی عدّت کا بیان ہوا۔ حائضہ کے لئے تین حیض، جبکہ صغیرہ اور آیسہ کبیرہ کے لئے تین ماہ، اور حاملہ

کے لئے وضعِ حمل وغیرہ۔ اب متوفیٰ عنہازوجہا، یعنی بیوہ کی عدّت کا بیان ہے، جومہینوں کے حساب سے ہے۔ اس میں طہر وحیض کا کوئی تعلق نہیں ہے، وہ ہے چار ماہ اور دس دن، یعنی ایک سوتیس (۱۳۰) دن کی مدّت، جومحض خاوند کے دم نکلنے کے ساتھ شروع ہوتی ہے، نہ کہ تجہیز وتکفین سے۔ چونکہ مطلقہ عورت کی عدّت کی اصل وجہ استبراءِ رحم ہے، تاکہ حمل کا معاملہ صاف ہوجائے، اورنسب میں کسی قسم کی غلطی اور اختلاط واقع نہ ہو، تو یہاں بھی یہی مقصود ہے۔ نیز یہ عدّت غم اور افسوس کو بھی شامل ہے، اور یہ بہ نسبتِ طلاق کے عام بھی ہے، اور کثیرالوقوع بھی ہے۔

خاوند کی وفات سے عورت کو جوغم وپریشانی لاحق ہوتی ہے، بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ محبوب شوہر کی موت سے بیوی بھی چل بسی، اور وفات پائی، کیونکہ یہ موت نکاح جیسی نعمت کے زوال کا سبب ہے، اسی بناء پر سیدِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو عورت اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتی ہے، اور روزِ قیامت پر یقین رکھتی ہے، اس کو یہ حلال نہیں ہے کہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے، مگر ہاں! خاوند پر چار ماہ اور دس دن سوگوار رہے۔ [متفق علیہ]

اگرچہ نکاح کی نعمت سے محرومی طلاق میں بھی ہوتی ہے، لیکن طلاق میں میاں بیوی کو کچھ نہ کچھ ربط وارتباط ہوجاتا ہے، کیونکہ رجعی میں رجوع ممکن ہے، اور بائن میں تجدیدِ نکاح بھی ہوسکتی ہے، بخلاف موت کے، کہ اس کی وجہ سے جونعمت سلب ہوتی ہے، اس کے تدارک وحصول کا ہمیشہ کے لئے دروازہ بند ہوجاتا ہے، اس لئے یہاں شاید عدّت کی میعاد، طلاق کی مدّت سے زائد رکھی ہو، اور چونکہ طلاق میں خاوند زندہ ہوتا ہے، اس لئے استبراءِ رحم کے معاملہ میں ایک واقف کار اور رازداں فریق ہوتا ہے، اس لئے عدّت کی میعاد کو زیادہ رکھا، اور چونکہ اس عدّت میں استبراءِ رحم کے ساتھ عورت کو سوگ کی بھی رعایت ہے، اس لئے سوائے حاملہ کے یہ مدّت ہر بیوہ کے لئے مقرر ہے، خواہ وہ صغیرہ ہو، یا آیسہ وغیرہ (غیر مدخول بہا) کیوں نہ ہو۔ واللہ اعلم

﴿يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ﴾ (اپنے نفس کو روکے رکھیں) روکے رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس مدّت میں نہ کسی سے تعلقات پیدا کریں، نہ کسی سے نکاح کریں، اور نہ کسی سے صاف کھلے الفاظ میں نکاح کی بات چیت کریں، نہ بناؤ سنگار کریں، نہ خوشبو لگائیں، نہ سرمہ لگائیں، نہ زیب وزینت ومہندی، اور نہ زیورات کا استعمال کریں۔ اسی طرح خوبصورت ورنگدار لباس پہننا، بلاضرورت گھر سے نکلنا، یہ سب باتیں عدت میں ناجائز ہیں۔

اگر نادار اور مجبور ہوں، بغیر مزدوری کے گزارہ مشکل ہو، تو احتیاط کے ساتھ مزدوری کریں، اور رات کو واپس اپنے گھر میں آجائیں، اپنے گھر میں سوجائیں۔ اور جس طرح عدّت میں یہ باتیں جو بیوہ کے لئے ممنوع ہیں، اسی

طرح اس عورت کے لئے بھی ممنوع ہیں جو طلاقِ بائن کی عدّت گزار رہی ہو، وہ بھی تین حیض تک ہر قسم کے بناؤ و نمائش، سنگار وغیرہ سے پرہیز کرے، اور گھر سے نہ نکلے۔ اگر شوہر اسے اپنے گھر سے نکال دے، تو اپنے رشتہ داروں کے گھر آباد ہو جائے، اور ان تمام امور کی اختتام عدّت تک پابندی کرے۔

چار مہینے دس دن کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی عورت کا خاوند چاندرات کے دن مرا ہو، تو پھر چاند کے حساب سے عدّت پوری کرے، خواہ چاند انتیس کا ہو یا تیس کا، لیکن اگر خاوند چاندرات کو نہیں مرا، بلکہ کسی اور تاریخ، مثلاً دس، یا پندرہ، یا پچیس، یا کسی اور تاریخ کو مرا، تو دِنوں کا حساب ہوگا، یعنی ایک سو تیس دن پورے کرنے ہوں گے۔

﴿فِيمَا فَعَلْنَ فِيٓ أَنفُسِهِنَّ بِٱلْمَعْرُوفِ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ عدّت کے بعد شرعی طریقہ سے نکاح کریں۔ نکاح صحیح ہو، مہر مثل کے ساتھ ہو، کفو میں ہو وغیرہ۔ پس عورت کی خود مختاری میں کسی رشتہ دار ولی اور مرے ہوئے شوہر کے ورثاء کو مداخلت اور مزاحمت کی اجازت نہیں ہے، بصورت دیگر اولیاء کو مزاحمت اور فسخِ نکاح دونوں کی اجازت ہے، اور یہ مسئلہ پہلے بیان ہوا ہے، وہاں دیکھ لیا جائے۔

واضح ہو کہ وفات کی عدّت، طلاق کی عدّت کی طرح ایک مستحسن اور پاکیزہ عمل ہے، جو کہ اسلام (دینِ حنیف) کے ساتھ مخصوص ہے، اور اسلامی شریعت کا طرۂ امتیاز ہے، اس طرح کے پاکیزہ اعمال سے اقوامِ عالم کا دامن خالی ہے، اور اس کی برکات سے تمام ادیانِ باطلہ محروم ہیں، نہ وہاں طہارت و صفائی ہے، نہ استبراءِ رحم، نہ حلال و حرام اور نہ ہی نسل و نسب کی پاکیزگی۔

ہندو قوم میں اتنی جہالت تھی کہ خاوند کے مرنے کے بعد اس کی زندہ بیوی کو بھی نذرِ آتش کرتے تھے۔ مسلمان حکمرانوں اور علماء کرام کی محنت اور جدو جہد سے یہ سلسلہ بند ہوا، اب وہاں یہ رسمِ بد جاری ہے کہ خاوند کی وفات کے بعد اس کی بیوی پر زندگی بھر یہ پابندی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ''ستی'' رہے گی، اور اس کے نکاح پر پابندی ہے۔ بدقسمتی سے جاہل اور بے دین مسلمانوں میں بھی یہی رسمِ بد ابھی بھی جاری ہے۔ (یہ صرف چند قبائل تک محدود ہے، الحمدللہ عام نہیں ہے)۔ حضرت مجاہد کبیر داعی حق و توحید شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ کی قربانیوں اور مساعی جمیلہ کے طفیل یہ سلسلہ کلّی طور پر ختم ہوا، مگر جزوی طور پر ابھی بھی باقی ہے۔ واللہ اعلم

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ؕ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾

ترجمہ: اور اس بات میں تم پر کچھ گناہ نہیں کہ زمانہ عدّت میں ان عورتوں کو پیغام نکاح دینے کے متعلق کوئی بات اشارتاً، کنایۃً ان سے کہہ دو، یا اپنے دل میں نکاح کی خواہش کو پوشیدہ رکھو، اللہ تعالیٰ کو یہ معلوم ہے کہ ضرور تم ان سے نکاح کا خیال کرو گے، لیکن تم ان سے مخفی طور پر نکاح کا وعدہ نہ کرو، مگر ہاں اتنی ہی بات کہو جتنی دستورِ شرعی کے مطابق ہو، اور جب تک مقررہ عدّت اپنی میعاد کو نہ پہنچ جائے اس وقت تک عقدِ نکاح کا ارادہ بھی نہ کرو، اور یقین جانو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے، پس اس سے ڈرتے رہو، اور یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا بڑے تحمل والا ہے ﴿۲۳۵﴾

معارف ومنازل

☆......ابواب البرّ کے سلسلہ کے اکتیسواں حکم کا بیان ہو رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس عورت کا شوہر فوت ہوا ہے، جس کی عدّت چار ماہ اور دس دن ہے، جب وہ عورتیں عدّت میں ہوں، تو ان کو صاف کھلے الفاظ میں نکاح کا پیغام نہ دو، نہ ہی نکاح کی بات چیت کرو، نہ کوئی وعدہ کرو، اور نہ ہی کوئی وعدہ لے لو، اور نہ صراحۃً اس قسم کی گفتگو کرو۔ البتہ! تعریض یعنی اشاروں میں اگر کچھ کہو، تو مضائقہ نہیں ہے۔ تعریض یعنی جن الفاظ کے مختلف معنی ہوں، اور ان الفاظ کے کئی مطلب ومقصد ہوں۔ ان ذو معنی وذو مطلب الفاظ کے ساتھ اپنے مطلب ومقصد بیان کرنے کو تعریض کہتے ہیں، مثلاً معتدہ عورت کے سامنے یہ کہنا کہ دیکھو، جس طرح تم شریف ہو اسی طرح ہم بھی شریف ہیں، یا یہ کہو کہ تم بہت اچھی ہو، اگر تم اچھے لوگوں میں ہو تو بہت ہی بہتر ہوگا، شکر ہے کہ ہم بھی بہت اچھے لوگ ہیں۔ اسی طرح اگر دل میں پوشیدہ رکھو کہ عدّت پوری ہونے کے بعد میں اس عورت سے نکاح کروں گا، یہ نیت کا درجہ ہے، اس پر بھی گناہ نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ علیم بذات الصدور ہے، اس کو معلوم ہے کہ تم ضرور ان عورتوں کا تذکرہ کرو گے۔

ذکر کا مطلب یہ ہے کہ باہم تذکرہ کرو گے کہ فلاں عورت بہت نیک ہے، جو قابل ہے اس کی کہ عدّت کے

بعد اس سے شادی کرلوں۔ یا میں شرعی عدت گزرنے کا انتظار کر رہا ہوں، ان شاء اللہ نکاح کا پیغام دیدوں گا، وغیرہ۔ البتہ! کھلم کھلا کہنا، وعدہ لینا، یا اس کو نکاح کی ترغیب دینا، یہ سب حرام ہیں۔ بعض علماء کرام نے تحفہ وتحائف کی پیشکش کو بھی پسند نہیں کیا۔ البتہ! اگر وہ عورت نہایت محتاج ہو، اسے کھانا روٹی لباس اور دیگر ضروریات دستیاب نہ ہوں، تو بہ نیتِ ثواب اسے کچھ دے دینا جائز اور مستحسن ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عدّت موت کی ہو یا طلاقِ بائن کی، اس کے دوران کسی مرد کو جائز نہیں ہے کہ صریح الفاظ میں خود، یا کسی عورت کے ذریعہ نکاح کا پیغام دے، یا اس کی بات چیت کرے، یا کوئی وعدہ لے لے۔ یہ مطلقاً حرام ہے۔ البتہ! قلبی ارادہ یا اشارۃً وکنایۃً تذکرہ جائز ہے۔ اگر کوئی عورت رجعی طلاق کی عدّت میں ہو، تو وہاں صراحتاً، اشارۃً، کنایۃً ہر قسم کی تعریض حرام ہے، کیونکہ اس کا نکاح باقی ہے، تب ہی تو اس کی رضاء کے بغیر شوہر کو رجعت کا حق حاصل ہے۔

اس حکم کے آخر میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ظاہر و باطن ہر چیز سے باخبر ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ اس کے حکموں کی خلاف ورزی سے اجتناب کرو۔ اگر وہ تمہیں فی الحال سزا نہیں دیتا، اور گناہوں پر گرفت نہیں کرتا، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ تمہیں نہیں جانتا، یا تمہارے ارادے اس پر عیاں نہیں، بلکہ وہ بردبار، حلیم اور درگزر کرنے والی ذات ہے، اس لئے تمہاری گرفت اور پکڑ نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ
وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى
الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣٦﴾ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً
فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ
تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٧﴾

ترجمہ: اگر تم عورتوں کو ایسی حالت میں طلاق دیدو کہ نہ تو تم نے ان کو ہاتھ لگایا ہو، اور نہ تم نے ان کا کوئی مہر مقرر کیا ہو، تو تم پر کوئی گناہ نہیں، ہاں طلاق دینے کے بعد ایسی عورتوں سے کچھ سلوک کردو، یہ سلوک صاحبِ وسعت

پر اس کی حیثیت کے موافق لازم ہے، اور تنگدست پر اس کی حیثیت کے موافق، یہ سلوک دستور کے مطابق، نیک اور خوش معاملہ لوگوں پر ایسا سلوک کرنا واجب ہے ﴿۲۳۶﴾ اور جن عورتوں کے لئے تم کچھ مہر مقرر کر چکے تھے، اگر ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو، تو جو مہر تم نے مقرر کیا تھا، اس کا نصف ادا کرنا ضروری ہے، مگر یہ کہ وہ عورتیں معاف کردیں، یا وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کا معاملہ ہے، وہ رعایت کردے، اور تمہارا اپنے اپنے حقوق کو معاف کردینا تقویٰ سے زیادہ قریب ہے، اور تم آپس میں ایک دوسرے پر احسان کرنے کو فراموش نہ کرو، بلاشبہ تم جو کچھ کرتے ہو، وہ سب اللہ تعالیٰ کے پیش نظر ہے ﴿۲۳۷﴾

معارف ومنازل

☆......ابواب البرّ کے سلسلہ کا بتیسواں اور تینتیسواں حکم بیان ہو رہا ہے، یعنی طلاق قبل از خلوتِ صحیحہ، اور نکاح بدونِ ذکرِ مہر۔ یعنی طلاق کا تعلق مطلق نکاح کے ساتھ ہے۔ خلوتِ صحیحہ پر طلاق موقوف نہیں ہے، اسی طرح حقِ مہر فرائضِ نکاح میں سے نہیں ہے۔ حق مہر کے ذکر وتقرر کے بغیر بھی نکاح صحیح ہوجاتا ہے، اسی طرح صراحۃً حقِ مہر کی نفی کے ساتھ بھی نکاح صحیح ہوجاتا ہے۔ البتہ! خلافِ سنت ضرور ہے، اور یہ ہرگز مسلمان کی شان نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح طلاق کی مختلف صورتیں ہیں، اسی طرح عورتوں کی بھی باعتبارِ مہر اور ہمبستری وغیرہ کے مختلف صورتیں ہیں، اور مختلف احکام، ان کی ظاہری صورتیں چار ہیں:

(۱) عورت سے نکاح کرتے وقت کچھ مہر مقرر نہیں کیا، اور مہر کا نام ہی نہیں لیا، اور ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دی، نہ خلوتِ صحیحہ، اور نہ مباشرت ہوئی۔

(۲) نکاح کرتے وقت مہر کی کوئی خاص رقم، یا کوئی چیز مقرر ہوئی، اور خلوت ومباشرت سے پہلے طلاق دے دی۔

(۳) نکاح کے وقت کوئی مہر مقرر نہیں ہوا، مگر خلوت ومباشرت کے بعد طلاق دے دی۔

(۴) نکاح کے وقت مہر مقرر ہوا، اور خلوت ومباشرت کے بعد طلاق دے دی۔ مذکورہ آیت کریمہ اور آئندہ آنے والی آیت میں صرف پہلی، اور دوسری صورت کا ذکر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس عورت کا کوئی حقِ مہر مقرر نہ تھا، اور طلاق بھی مباشرت وخلوت سے پہلے دے دی، تو ایسی عورت کے مہر نہ دینے کا تم پر کوئی مطالبہ یا مؤاخذہ نہیں ہے۔ البتہ! شرعی دستور کے مطابق لباس کا ایک جوڑا

ضرور دے دے، اسی لباس کو قرآن کریم نے مُتعَة کہا۔ یہ نیک لوگوں، یعنی مسلمانوں پر واجب ہے، اور اس جوڑے میں مرد کی حیثیت کا اعتبار ہے، مالدار ہو، تو عمدہ قیمتی لباس دے دے، محتاج غریب ہو، تو معمولی، مگر پانچ درہم سے کم قیمت کا نہ ہو۔

اور جس عورت سے خاوند نے ہمبستری نہ کی ہو، اسے غیر مدخول بھا کہتے ہیں، اور جس عورت سے شوہر نے مباشرت و ہمبستری کی ہو، اسے مدخول بہا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

دوسرا یہ کہ نکاح کے وقت مہر مقرر ہو چکا ہو، اور ہمبستری سے پہلے طلاق دے چکے ہو، تو یہ عورت مقررہ حقِ مہر کے نصف کی حقدار ہے۔ اگر وہ عورت معاف کردے، تو یہ آدھا، یعنی نصف بھی معاف ہوگا۔ ہاں! اگر شوہر جوان مردی کرکے بجائے نصف کے پورا حقِ مہر دے دے، تو یہ اور بھی بہتر ہوگا، اسی کا نام ہے: اِحسان، رواداری، حسنِ معاشرت، جس کو قرآن کریم نے ''اَلْفَضْل'' کہا۔ سبحان اللہ!

کیا پیار و محبت اور شفقت مرحمت ہے؟ عورت کو بھی ترغیب ہے کہ اِحسان کرنے میں پہل کرو، جو نصف تمہارا حق ہے، اس کو صدقہ کرکے معاف کرو، اور طلاق کی تلخی اور وحشت سے درگزر کرو، محسنات کی فہرست میں نام لکھواؤ۔

دوسری طرف شوہر سے بھی کہا جا رہا ہے کہ تم نے بننے والی رفیقۂ حیات کو طلاق دے کر وحشت میں ڈال دیا، اس کی تلافی کرو، جوان مردی کا ثبوت دے کر بجائے نصف کے پورا حقِ مہر دے دو، اور اپنا نام محسنین کی فہرست میں درج کراؤ، یہی مطلب ہے: ﴿وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی﴾ کا، کیونکہ ''تَعْفُوْٓا'' میں مردوں اور عورتوں دونوں کو ایک جیسا خطاب ہے۔ نیز یہ بات بھی واضح ہے کہ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ سے مراد عورت کے اولیاء نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد خاوند ہے، فَصَارَ الْعَفْوُ مِنَ الْجَانِبَیْنِ، عفو جس طرح اپنے حق سے دستبرداری کا نام ہے، اسی طرح بخشش و ذرّہ نوازی کا بھی نام ہے۔

فائدہ:

چار صورتوں میں سے دو کا بیان ہوگیا، یعنی اول و دوم۔ تیسری صورت یہ ہے کہ حقِ مہر مقرر ہو چکا تھا، اور ہمبستری کے بعد طلاق دے دی، تو اس کا حکم یہ ہے کہ پورا حقِ مہر ادا کرنا واجب ہے، اس کی تفصیل سورۃ النساء میں آنے والی ہے۔ اِن شاءاللہ تعالیٰ

چوتھی صورت یہ کہ حقِ مہر مقرر نہیں ہوا، اور ہمبستری کر کے طلاق دے دی۔ اس کا حکم یہ ہے کہ مہر مثل ادا کرنا ضروری ہے۔ [موضح القرآن] یہ سب کچھ طلاق کے متعلق بیان ہوا۔ موت کی حالت طلاق سے مختلف ہے، ان ہی چاروں صورتوں میں اگر طلاق دینے کی بجائے خاوند مرجائے تو مسئلہ کی صورتیں یہ ہوں گی:

(۱) اگر مہر مقرر نہ تھا، اور ہمبستری سے پہلے خاوند مرگیا، یا ہمبستری کے بعد مرگیا، توان دونوں صورتوں میں مہر مثل لازم ہوگا، اور پورا واجب ہوگا۔

(۲) اور اگر مہر مقرر ہوا تھا، اور خاوند ہمبستری سے پہلے مرگیا، یا ہمبستری کے بعد مرگیا، توان دونوں صورتوں میں اس کے ذمہ جو مقرر ہوا تھا لازم ہوگا، اور پورا لازم ہوگا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ خلوتِ صحیحہ ہمبستری کے قائم مقام، اور اس کا بدل ہے۔ واللہ اعلم

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾

ترجمہ: سب نمازوں کی حفاظت کرو، اور خاص کر درمیان والی نماز کی، اور اللہ تعالیٰ کے روبرو باادب کھڑے ہوا کرو ﴿۲۳۸﴾ پھر اگر تم کو خوف ہو تو پیادہ کھڑے کھڑے پڑھ لو، یا سواری پر پڑھ لو، پھر جب تم امن حاصل کرلو تو خداوند تعالیٰ کو اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو سکھا دیا ہے، جو تم پہلے نہیں جانتے تھے ﴿۲۳۹﴾

معارف ومنازل

☆......ابواب البرّ کے سلسلہ کا چونتیسواں (۳۴) حکم بیان ہورہا ہے، یعنی نمازوں کی محافظت، اور پابندی۔ سبحان اللہ! کیا پیارا کلام ہے؟ اور کیسے پیارے روح پرور احکام ہیں؟

اس سے پہلے روحانی بیماریوں کا بیان تھا، اب ان بیماریوں کے اکسیری تریاق اور دوائیوں کا بیان ہورہا ہے، اور ساتھ ساتھ طریقۂ علاج بڑے دلکش انداز میں ذکر فرمارہے ہیں۔ اس سے پہلے طلاق اور عدّت کا ذکر ہوا، اور اصل طلاق ایک بیماری ہے، اور اس کی بنیاد نفس کی خرابی اور خیالاتِ انسانی کی ناہمواری ہے، اور طلاق کے بعد جو پریشانی لاحق ہوتی ہے، اس سے امن وسکون تباہ ہوجاتا ہے۔ میاں بیوی دونوں میں خوف وحشت پیدا ہوجاتا ہے،

جسے دور کرنے کا علاج نماز ہے، اس لئے نماز اور اس کی محافظت و مداومت کا بیان شروع ہوا۔

حدیث شریف میں ہے کہ سید کائنات ﷺ جب بھی کوئی پریشانی یا غم محسوس کرتے، تو فوراً نماز شروع کرتے۔ ”اِذَا حَزَبَهٗ اَمْرٌ بَادَرَ اِلَى الصَّلٰوةِ“۔ [الحدیث] دراصل نماز پریشانیوں کا مکمل علاج ہے۔

﴿حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ﴾ یہاں محافظت سے مراد مداومت ہے۔ ”اَلْوُسْطٰى“ درمیانی نماز بعضوں کے نزدیک فجر، اسی طرح ظہر، عصر، مغرب، عشاء مراد ہیں، کیونکہ وسطیٰ کا اطلاق ہر نماز پر ہو سکتا ہے، اس میں اٹھارہ اقوال ہیں، سب سے راجح اور مختار قول صلوٰۃ العصر کا قول ہے۔

﴿اَلْقُنُوْتُ﴾ کے بہت سارے معانی ہیں۔ یہاں عام مفسرین کے نزدیک سکوت و خاموشی راجح ہے۔

اس سے قبل لوگ نمازوں میں بات کیا کرتے تھے، اس آیت کے ساتھ وہ حکم منسوخ ہوا، اور نمازوں میں ہر طرح خضوع و خشوع کے ساتھ سکوت لازم قرار پایا، اور سید کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اِنَّ فِي الصَّلٰوةِ لَشُغْلًا“۔ [مسلم] یعنی نماز میں ایک مخصوص شغل و مراقبہ ہے، اور کسی قسم کی بات چیت، اِدھر اُدھر دیکھنے، اور حرکت و اضطراب کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اور نماز صرف تسبیح و تکبیر و تہلیل، قرآن کی تلاوت و توجہ الی اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔

غزوۂ خندق کے موقع پر سید الانبیاء ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ان کافروں کی قبروں اور پیٹوں کو آگ سے بھر دے، جنہوں نے ہم کو (صلوٰۃ الوسطیٰ) نمازِ عصر سے مشغول کیا۔ اس روز نمازِ عصر خندق کھودنے کی وجہ سے قضا ہو چکی تھی۔ [بخاری]

اللہ تعالیٰ کے قرب و رضاء کے حصول کے لئے سب سے بڑا عمل اور اہم عبادت نماز ہی ہے، جو کہ صحیح معنوں میں مؤمنوں کی معراج ہے۔ نماز کے متعلق بڑی تفصیلی باتیں سورت کے شروع میں ملاحظہ فرمائیں۔ اس کے بعد مختصر صلوٰۃ الخوف کا بیان ہوا۔ صلوٰۃ الخوف کی پوری تفصیل اپنے مقام پر سورۃ النساء میں آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

﴿فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا﴾ پھر اگر تمہیں پوری رعایت و آداب کے ساتھ نماز پڑھنے میں دشمن وغیرہ کا خوف اور اندیشہ ہو، تو پھر جس طرح بن پڑے نماز ادا کرلو، خواہ کھڑے کھڑے، یا سواری پر چڑھے ہوئے، پھر جب تم مامون ہو جاؤ، تمہیں اطمینان میسر ہو جائے، اور خوف زائل ہو جائے، تو تم اللہ تعالیٰ کو اس طریقے سے یاد کرو، یعنی اس طرح نماز ادا کرو، جو اس نے تمہیں سکھایا، اور تعلیم دی ہے، جسے تم اس کے سکھانے سے پہلے نہیں جانتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ سنت کے طریقے پر نمازیں ادا کرو، آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى
الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ
مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ
حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ ع ۷ ۱۵

ترجمہ: اور جو لوگ تم میں سے مرنے لگیں، اور اپنے پیچھے اپنی بیویاں چھوڑیں تو وہ اپنی بیویوں کے حق میں ایک سال تک خرچ دینے، اور ان کو گھر سے نہ نکالنے کی وصیت کر جائیں، ہاں! اگر وہ خود نکل جائیں، تو تم پر اس دستور کی بات میں کوئی گناہ نہیں، جو وہ اپنی ذات کے لئے کریں، اور اللہ تعالیٰ کمال قوت اور کمال حکمت کا مالک ہے ﴿۲۴۰﴾ اور سب مطلقہ عورتوں کے ساتھ بہر حال دستور کے موافق سلوک کرنا ہے، ایسا کرنا متقیوں پر ایک حق ہے ﴿۲۴۱﴾ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام تمہارے لئے صاف صاف بیان فرماتا ہے، تاکہ تم سمجھو ﴿۲۴۲﴾

معارف ومنازل

☆......ابواب البرّ کے سلسلہ کے پینتیسویں (۳۵) حکم کا بیان ہے، کہ بیوہ کے لئے شوہر کی طرف سے ایک سال تک رہائش اور نان ونفقہ کی وصیت ہو، جو کہ آیتِ میراث کے نزول کے بعد منسوخ ہوگئی۔ زمانۂ جاہلیت میں وفاتِ زوج کی عدّت ایک سال تھی، پھر اسلام میں چار ماہ اور دس دن عدّت مقرر ہوئی، جیسا کہ گزشتہ آیت میں تفصیل گزر چکی۔

مطلب یہ ہے کہ جب تک عورتوں کی میراث کا حکم نہیں آیا تھا، اس وقت بیوہ عورتوں کی حوصلہ افزائی کی خاطر یہ حکم تھا کہ شوہر مرتے وقت عورت کے لئے ایک سال تک نان ونفقہ اور مکان میں رہنے کی وصیت کر جائے، متاعا اسی کو فرمایا۔ لیکن جب عورتوں کے لئے میراث کا حکم نازل ہوگیا، اور بیوہ کے لئے اولاد کی موجودگی میں آٹھواں حصہ پورے ترکہ کا، اور بغیر اولاد پورے ترکہ کا چوتھا حصہ مقرر ہوا، تو بیوہ کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اب وہ کسی وصیت کے بغیر اپنے حصے کے مال سے اچھی طرح گزارہ کرسکتی ہے، تو وصیت والا معاملہ منسوخ ہوا، اس کی ناسخ آیتِ میراث ہے، اور سال والا حکم: ﴿يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾ سے منسوخ ہوگیا۔

اب آئندہ حسب فرمان نبوی ﷺ "لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ"۔ [الحدیث] کسی بھی وارث کے لئے

وصیت جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی کسی وارث کے لئے وصیت کرے، تو شرعاً اس کا نفاذ اور اعتبار نہ ہوگا۔ البتہ! منسوخی وصیت سے پہلے ایک سال کا سکنیٰ اور نان ونفقہ بیوہ عورت کا حق ہوتا تھا، اور اس کو اسے وصول کرنے یا نہ کرنے کا پورا اختیار حاصل تھا، اس لئے وارثوں کو یہ ہرگز اختیار نہ تھا کہ بیوہ کو گھر سے نکال دیں، لیکن خود بیوہ کو یہ اختیار تھا کہ چار ماہ دس دن کی عدّت مکمل کرنے کے بعد اس گھر میں رہے یا نہ رہے، اور رہنے کا حق چھوڑ کر اپنے عزیزوں کے پاس جائے، یا کسی خاوند سے نکاح کرے، اس لئے فرمایا: ﴿فَاِنۡ خَرَجۡنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ﴾ (ہاں اگر وہ خود گھر سے نکل جائیں، اور اپنے حق میں پسندیدہ کام (یعنی نکاح) کرلیں، تو تم پر کچھ گناہ نہیں)۔

﴿وَلِلۡمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ﴾ (اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق نان ونفقہ دینا چاہئے)۔

مطلقہ عورتوں کے متعہ (لباس) کا حکم پہلی آیت میں بیان ہوا، مگر وہ حکم دو قسم کی مطلّقات کے لئے تھا: ایک وہ جس کا مہر مقرر نہ ہو، اور قبل از مباشرت طلاق ہو۔ دوم وہ کہ حق مہر مقرر ہو، اور قبل از مباشرت طلاق ہو، جیسے پہلے بیان ہوا، اب ان دو قسم کی مطلّقات کا بیان ہے کہ حق مہر مقرر ہو یا مقرر نہ ہو، اور طلاق بعد از مباشرت ہو، اول کو پورا مقرر شدہ حقِ میراث ادا کرنا واجب ہوگا، اور متعہ کا لباس دینا استحباب کے درجہ میں ہوگا، دوسرے کے لئے مہر مثل کے وجوب کے ساتھ متعہ کا لباس بصورتِ استحباب ادا کرنا چاہئے۔

اکثر علماء کرام فرماتے ہیں کہ یہ جوڑا لباس اوّل مطلقہ کے لئے واجب ہے، اور باقی تینوں کے لئے مستحب ہے۔ وَھُوَ الۡحَقُّ، کیونکہ پہلی مطلقہ کو حقِ مہر کچھ نہیں ملا، بخلاف دوسری مطلقہ کے، کہ اس کو نصف مہر ملا، اور تیسری مطلقہ کو پورا مقرر شدہ حق مہر مل گیا، چوتھی مطلقہ کو مکمل مہر مثل ملا۔

رہا یہ کہ متعہ کا لباس کتنے کپڑوں پر مشتمل ہو؟ اکثر علماء کرام اسے عرف پر چھوڑ دیتے ہیں، مگر صحیح یہ ہے کہ چار کپڑے ہوں، پاجامہ، قمیص، دوپٹہ، بڑی چادر، جسے آج کے عرف میں برقعہ یا سر بند کہتے ہیں۔ واللہ علم

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ خَرَجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ وَهُمۡ اُلُوۡفٌ حَذَرَ الۡمَوۡتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوۡتُوۡا ثُمَّ اَحۡيَاهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَشۡكُرُوۡنَ ﴿۲۴۳﴾

ترجمہ: کیا آپ نے ان لوگوں کے واقعہ کو ملاحظہ نہیں کیا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل گئے

تھے، حالانکہ وہ ہزاروں میں تھے، پس اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ مرجاؤ، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کردیا، بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا فضل فرماتا ہے، لیکن بہت سے لوگ شکرادا نہیں کرتے ﴿۲۴۳﴾

معارف ومنازل

اس آیت اور آنے والی آیتوں میں ایک عجیب وغریب بلیغ انداز میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان ومال کی قربانی پیش کرنے کی ہدایت ہے۔ ان آیات کے شروع میں ایک اہم تاریخی واقعہ کا بیان ہے، جس سے واضح ہوجاتا ہے کہ موت وحیات تقدیرِ الٰہی کی مکمل تابع ہیں۔ جنگ وجہاد میں جانا موت کا سبب نہیں ہے، اور بزدلی سے جان چھڑانا ہرگز موت سے بچنے کا ذریعہ نہیں ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں سلف صحابہ اور تابعین کے حوالہ سے اس واقعہ کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ بنی اسرائل کی ایک جماعت ایک شہر میں آباد تھی، اور وہاں کوئی سخت وباء اور طاعون پھیل گیا، یہ لوگ جو تقریباً دس ہزار کی تعداد میں تھے، گھبرا اٹھے، اور موت کے خوف سے اس شہر کو چھوڑ کر سب کے سب دو پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع میدان میں جاکر مقیم ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے (ان پر اور دنیا کی دوسری قوموں پر یہ واضح کرنے کے لئے کہ موت سے کوئی شخص بھاگ کر جان نہیں چھڑا سکتا) دو فرشتے بھیج دئے، جو میدان کے دونوں سروں پر آ کھڑے ہوئے، اور کوئی ایسی خطرناک آواز دی، جس سے سب کے سب بیک وقت مرگئے۔ کوئی ایک شخص بھی زندہ نہیں رہا، بغیر گور وکفن کے پڑے رہے۔ آس پاس کے لوگوں کے لئے نشانِ عبرت بن گئے، ان کے جسم گل سڑ گئے، اور مٹی میں مل گئے۔

یہ لوگ دس ہزار سے زائد تھے، قریبی لوگوں نے اتنا کیا کہ انہیں جمع کر کے ان پر ایک چاردیواری بنا کر ان کو اس میں محفوظ کیا۔ کچھ عرصہ بعد پیغمبر حضرت حزقیل علیہ السلام کا وہاں سے گزر ہوا، اور انہیں وحی کے ذریعہ اس قوم کی سرگزشت اور ماجرا معلوم ہوا۔

حضرت حزقیل علیہ السلام نے دعا کی: ''یا اللہ! یاربّ العٰلمین! ان لوگوں کو پھر زندہ فرمادے''۔ اللہ تعالیٰ عزّ شانہ نے ان کی دعا قبول فرمائی، اور انہیں حکم دیا گیا کہ آپ ان شکستہ بوسیدہ ہڈیوں کو اس طرح خطاب کریں: ''اے بوسیدہ ہڈیو! اے شکستہ اعضاء! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ سب کے سب اپنے اپنے بوسیدہ ذرّات کے ساتھ جمع ہوجاؤ، اور اپنے گوشت اور رگوں اور پوست کے ساتھ سابقہ انسانی شکل میں دوبارہ زندہ ہوجاؤ۔ بس خطاب کے ساتھ لمحوں میں سارے لوگ زندہ ہوکر محوِ حیرت رہے، اور یہی کہتے رہے: سبحٰنک لاالٰہ إلاأنت۔

فائدہ:

اکثر مفسرین حضرات کا یہی کہنا ہے جیسے کہ واقعہ کے شروع میں معلوم ہوا کہ یہ لوگ وباء اور طاعون کے خوف سے بھاگ گئے تھے۔ مگر محققین حضرات نے فرمایا کہ دراصل ان لوگوں کو قریبی کسی مشرک قوم کے ساتھ جہاد کا حکم ہوا تھا، اور وہ دشمن ان کی آبادی کے قریب ہی پہنچ چکا تھا، انہوں نے جہاد سے گھبرا کر یہ کہا تھا کہ جہاد کرنے سے ہم مارے جائیں گے، اور موت کی آغوش میں چلے جائیں گے، وہ اس خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے، اور اجتماعی عذاب کی موت کی نذر ہو گئے، کیونکہ متصل آئندہ آیات میں جہاد کی ترغیب، اور جہاد کا ذکر ہے، لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ اس واقعہ کو بجائے طاعون وباء کے جہاد کے ساتھ منسلک کیا جائے، یا تطبیق کے طور پر یہ کہا جائے کہ ہوسکتا ہے کہ اس قوم کے بھاگنے، اور موت کے ڈر کا سبب جہاد بھی ہو، اور طاعون بھی۔ واللہ اعلم

ان لوگوں کی تعداد کے بارے میں مختلف اقوال ہیں: چالیس ہزار کا قول بھی ہے۔ بہر حال! تعداد کوئی بھی ہو، اتنا تو یقینی ہے کہ یہ لوگ بڑی تعداد میں تھے۔ ہر چند انہوں نے موت سے بھاگ کر زندہ رہنے کی کوشش کی، مگر بچ نہ سکے، کیونکہ موت اور اس کے تمام اسباب اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، وہی اَلْمُحْيِ اَلْمُمِيت یعنی زندہ رکھنے والا، اور مارنے والا ہے، بغیر اس کے حکم کے نہ زندگی ہے، اور نہ ہی موت۔ اور یہ بھی علماء کرام نے فرمایا کہ یہ لوگ حیات بعد الموت کے منکر تھے، اور دوبارہ زندگی کے قائل نہ تھے، تب اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ زندگی سے نواز کر ان کو حیات بعد الموت کی حقیقت سمجھادی۔ واللہ اعلم

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ﴾ یہ واقعہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک زمانے سے ہزاروں برس پہلے کا ہے، تو ''اَلَمْ تَرَ'' میں رؤیتِ بصری مراد نہیں ہے، بلکہ یہاں اور قرآن کریم کے دیگر بہت سے مقامات میں جو ''اَلَمْ تَرَ'' مذکور ہے، مراد رؤیتِ قلبی، اور علم ہوگا، یعنی ''اَلَمْ تَرَ'' بمعنی اَلَمْ تَعْلَمْ کے ہے، کیونکہ جب کسی واقعہ کے وقوع پر علمِ یقینی حاصل ہوتا ہے، تو وہ پختہ ہونے میں رؤیت کے برابر ہوتا ہے، اسی بناء پر علماء کرام فرماتے ہیں کہ عالمِ آخرت نیک لوگوں کے سامنے ہوتا ہے، وہ اسے مشاہدہ کر رہے ہوتے ہیں۔

تو یہ لوگ اپنے شہر سے نکلے، تاکہ وہ موت سے کسی طرح بچ جائیں، مگر تکوینی موت سے دوچار ہو کر سارے مرگئے۔ ﴿فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا﴾ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ سب مرجاؤ، پس سب بیک دم مرگئے۔

﴿ثُمَّ اَحْيَاهُمْ﴾ پس عرصہ بعد حضرت حزقیل علیہ السلام کی دعاء سے اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ زندہ فرمایا۔

اس دوبارہ زندگی کی حکمت وہی ہے، تاکہ قیامت کی اجتماعی زندگی کا مشاہدہ اور یقین ہو۔ ان لوگوں اور اس زمانے کی دیگر اقوام کے لئے درسِ عبرت ہو، کہ یہ لوگ اور خاص کر ملتِ اسلام کے لوگ جہاد جیسے بابرکت عمل سے بجائے پہلوتہی کرنے اور بھاگنے کے مستعدی کے ساتھ تیار رہیں۔ اسی خاطر متصل آیت میں جہاد کی ترغیب وارد ہوئی، فرمایا: ﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ﴾ [الآیۃ] (اور اے مسلمانو! خدا کی راہ میں جہاد کرو)۔

چونکہ حیات بعد الموت اگرچہ کافر کے لئے نعمت نہیں ہے، مگر مسلمان کے لئے بڑی نعمت ہے، خواہ یہ موجودہ حیات بعد الموت ہو، جو کہ عارضی تھی، اور پیغمبر کی دعاء سے ہوئی، یا وہ اصلی اور ابدی ودائمی حیات بعد الموت ہو، جو کہ مسلمانوں کو قیامت کے ساتھ نصیب ہوگی، اور وہی ابدی زندگی رضاء الٰہی کے حصول کا ذریعہ بنے گی، اس لئے ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ اللهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ﴾ دیکھیں، یہ نہیں فرمایا: لَذُوْ فَضْلٍ عَلَيْهِمْ، بلکہ ﴿لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ﴾ فرما کر قیامت تک آنے والے سارے انسانوں، خاص کر مسلمانوں کو شامل فرمایا، اور اپنے فضل کا وعدہ دے دیا، اور شکر گزاری کا حکم جاری فرمایا۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللهَ قَرْضًا
حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَاللهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

ترجمہ: اور لڑو اللہ تعالیٰ کی راہ میں، اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ بیشک خوب سنتا جانتا ہے ﴿۲۴۴﴾ کون شخص ایسا ہے جو قرض دے اللہ تعالیٰ کو، اچھا قرض، پھر دوگنا کردے (بہت زیادہ کردے) اللہ تعالیٰ اس کو کئی گنا، اور اللہ ہی تنگی کرتا ہے، اور وہی کشادہ کردیتا ہے، اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۲۴۵﴾

معارف ومنازل

اس سے پہلے جہاد کے معاملے میں بھاگنے والوں کے انجام کا بیان ہوا کہ یہ بات ضروری نہیں ہے کہ جنگ و جہاد میں جانے سے موت آجائے، اور جو لوگ جہاد سے بھاگے وہ اجتماعی موت کا شکار ہوگئے، اب بھی یہی کہا جارہا ہے کہ جہاد سے بھاگنے والوں کا انجام نہایت ہی برا ہوتا ہے۔ علامہ ابوحیان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں امت

محمد یہ (علی صاحبہا التحیتہ و السلام) کو جہاد فی سبیل اللہ کا حکم دیا جا رہا ہے، اور پچھلے قصے میں اس امت کے لئے تنبیہ تھی کہ وہ بنی اسرائیل کے ان لوگوں کی طرح موت سے نہ بھاگیں، اور جہاد میں شجاعت وثابت قدمی کا ثبوت دیں۔[البحر المحیط]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس طرح جہاد سے بھاگنا تقدیر کو نہیں ٹال سکتا، اسی طرح جہاد سے بھاگنا اور اسے چھوڑنا بھی موت کو قریب یا دور نہیں کرسکتا، بلکہ موت کا مقرر وقت اور لکھی ہوئی روزی، یہ وہ مقدرات ہیں، جن میں کمی یا زیادتی نہیں ہوسکتی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾[آل عمران:۱۶۸]

کچھ لوگ خود جہاد میں شریک نہیں ہوئے، اور جہاد میں شریک ہوکر شہید ہوجانے والوں کے متعلق لوگوں سے کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے ہماری بات نہ سنی، اس لئے مارے گئے، اگر یہ ہماری بات مانتے، تو قتل نہ ہوتے۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوا کہ آپ ان سے فرمادیں کہ اگر موت سے بچنا تمہارے اختیار میں ہے، تو اوروں کی کیا فکر کرتے ہو؟ ذرا اپنے آپ کو موت سے بچالو، یعنی موت جہاد پر جانے نہ جانے پر موقوف نہیں ہے، تمہیں گھر بیٹھے ہوئے بھی آخر موت آئے گی۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿اَیْنَمَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ﴾[النساء:۷۷] (تم جہاں کہیں ہوگے موت تمہیں آ ہی پکڑے گی، اگر چہ تم مضبوط قلعوں میں ہی ہو)۔

کیا تم لوگوں نے یہ مشاہدہ نہیں کیا کہ بہت سے جہاد پر جانے والے زندہ گھروں کو لوٹے؟ اور بہت سے لوگ گھروں میں بیٹھے بیٹھے مر گئے؟ بہت سارے مریض زندہ رہے، اور تندرست لوگ اچانک مر گئے۔ بوڑھے زندہ گھوم رہے ہیں، جبکہ جوان ناگہانی موت کا لقمہ بن رہے ہیں۔ اسلامی لشکروں کے امیر، مایہ ناز سپہ سالار، اللہ تعالیٰ کی کھلی تلوار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بسترِ مرگ پر رو رو کر افسوس کررہے ہیں، آنسوؤں سے داڑھی تر ہو رہی ہے، اور فرمارہے ہیں: بہت سے محاذوں پر جنگ کی، دادِ شجاعت دی، اور دلیری کے ریکارڈ قائم کئے، عظیم جم گھٹوں میں گھس کر لڑائی لڑی، میرے بدن اور جسم کا کوئی عضو ایسا نہیں، جس پر نیزہ، تلوار اور خنجر کا زخم نہ ہو۔ ہائے افسوس! کہ میں اونٹ کی طرح بسترِ مرگ پر جان دے رہا ہوں۔ تین تین سو کے ہجوم میں گھس کر لڑتا رہا کہ شاید! شہادت نصیب ہو، مگر جو چیز مقدر میں نہ ہو، اسے کیسے اور کیونکر حاصل کرسکتے ہیں؟[ابن کثیر وغیرہ]

خلاصہ یہ ہے کہ جب موت وحیات کسی انسان کے قبضہ میں نہیں ہیں، اور جنگ میں بھی مرنا یقینی نہیں ہے، تو

اٹھ کھڑے ہوں، اللہ تعالیٰ کا قانون بلند و برتر کرنے کے لئے جہاد و قتال کرو، تاکہ اسلام کو غلبہ و اقتدار حاصل ہو۔ تمہارے مال و جان، بیوی بچے، عزّت و ناموس محفوظ ہوں۔ تم ہر طرح ہلاکت و تباہی سے بچو، اور بنی سرائیل والی اجتماعی موت سے محفوظ رہو، کیونکہ اگر تم جہاد نہیں کروگے، اور مال و جان کی قربانی نہیں دوگے، تو عیاشی و خود فراموشی کے دلدل میں پھنس جاؤگے۔ تمہارا رعب دشمن کے دل سے اتر جائے گا۔ وہ ہر سمت سے تم پر حملہ آور ہو جائے گا، اور اجتماعی طور پر تمہیں موت کے گھاٹ اتار کر تہ و بالا کر کے رکھ دے گا۔

فقیر عرض کرتا ہے کہ ہمارے ساتھ ایسا ہی ہوا، اور ہو رہا ہے۔ اندلس کے سقوط میں کیا ہوا؟ دو مرتبہ بغداد تاراج ہوا۔ سمرقند و بخارا اور خوارزم پر قیامت آئی۔ دہلی والوں پر عذاب آیا۔ کابل جل رہا ہے، اور دیگر مسلمان ملکوں پہ ہر طرف سے سیاسی، معاشی، اخلاقی اور فوجی حملے ہو رہے ہیں۔ ہم آزادی سے سانس لینے پر قدرت نہیں رکھتے۔ ہمارے سانس لینے پر بھی پابندی ہے۔ ؎

عجب درد یست اندر دل اگر گویم زبان سوزد ☆ وگر دم درکشم ترسم کہ مغز واستخوان سوزد

﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ اِلٰى وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ مطلب یہ ہے کہ جہاد میں، اور دیگر مصارفِ خیر میں مال خرچ کر کے اللہ تعالیٰ کو قرضِ حسنہ دو۔ وہ اسے کئی گنا بڑھا دے گا۔ رزق کی تنگی اور کشادگی سب اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، اور تم نے تو لوٹ کر اس کی طرف واپس جانا ہے۔ پس جو کچھ اخلاص کے ساتھ اس کے نام پر دوگے، اس کے پاس جا کر اس سے کئی گنا (پہاڑوں جتنا) زیادہ پاؤگے۔ قرض سے مراد صرف مال نہیں ہے، بلکہ ہر طرح کے نیک اعمال بھی اس میں آ جاتے ہیں۔ ایک شاعر نے کیا اچھا کہا ہے: ؎

قرض ست فعل ہائے بدت نزد کردگار ☆ بر ہر کدام وقت کہ خواہد ادا کند

قرض ست خیر و صدقہ بہ نزدیک ذوالجلال ☆ در روز حشر ذرہ بہ کوہان عطا کند

اس کو مجازاً قرض کہا گیا ہے، ورنہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے قرض کا عوض ضرور دیا جاتا ہے، اسی طرح تمہارے اعمال و انفاق کا عوض بھی ضرور تمہیں ملے گا، اور بڑھانے کا بیان حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے، کہ اگر ایک کھجور اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کی جائے، تو اللہ تعالیٰ اسے پہاڑوں جتنا بڑھاتے ہیں۔ [عمدة القاري، بخاري]

حدیثِ نزول میں ہے کہ وہ کون ہے جو ایسے اللہ تعالیٰ کو قرض دے جو نہ مفلس ہے، نہ ظالم؟ اس آیت کو

سن کر حضرت ابو دحداح انصاری رضی اللہ عنہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض مانگتے ہیں؟ حالانکہ وہ قرض سے مستغنی ہے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے تم کو جنت میں داخل کردیں۔ حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر کہا: یارسول اللہ! ہاتھ بڑھائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا مبارک ہاتھ بڑھادیا، تو ابوالدحداح رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ مبارک پکڑ کر کہنے لگے کہ میں کھجور کے دو باغوں کا مالک ہوں، اس کے علاوہ میری مِلک میں کچھ نہیں ہے، میں اپنے یہ دونوں باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہوں۔

سید کائنات رحمۃ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ایک باغ اللہ تعالیٰ کے راستے میں وقف کردو، اور دوسرا اپنے اہل وعیال کی معاشی ضرورت کے لئے اپنے پاس رکھو۔ ابوالدحداح رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! آپؐ گواہ رہئے ان دونوں میں سے بہترین باغ (جس میں کھجور کے چھ سو درخت ہیں) کو میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں وقف کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ شانہ تمہیں اس کے بدلے میں جنت عطا کریں گے۔ حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ اپنے گھر آئے، اور بیوی کو اس کی اطلاع دے دی، تو وہ خوش قسمت بھی اپنے شوہر کے اس بہترین سودے پر بہت خوش ہوئیں۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: كَمْ مِنْ عِذْقٍ رَدَاحٍ وَدَارٍ فَيَاحٍ لِاَبِى الدَّحْدَاحِ۔ [قرطبي] یعنی کھجوروں سے لبریز بے شمار درخت اور کشادہ محلات کس قدر ابوالدحداح کے لئے منتظر تیار ہیں۔

یہ تھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، یہ ان کی قربانیوں اور بخششوں کی ایک ادنیٰ جھلک ہے۔ کیا ایسے لوگوں کے ایمانی اقدار، اور ان کے جنتی ہونے میں کسی کو شک ہوسکتا ہے؟

ہرگز نہیں! کیونکہ یہ لوگ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی نمونہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج چودہ سو سال گزرنے پر جب ان کی قبروں کی کھدائی ہوتی ہے، تو وہ اپنے نورانی چہروں کے ساتھ تازہ بتازہ بالکل ایسے معطر کستوری کی مہک کے ساتھ معلوم ہوتے ہیں، جیسے انہیں آج ہی سپرد خاک کیا گیا ہو۔ جب لوگ ان کے چہروں پر ہاتھ پھیر دیتے ہیں، تو خالص سرخ خون دوڑتا نمایاں نظر آتا ہے۔

ان کے مناقب وفضائل کو اگر بیان کیا جائے، تو ساتوں آسمانوں کے ستاروں سے کہیں زیادہ ہیں، اسی لئے رحمۃ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ میری صحبت کے لئے اللہ تعالیٰ کے منتخب کردہ، اور منتخب شدہ لوگ ہیں۔ اگر کوئی دجالی فرقہ انہیں برا بھلا کہے، تو تم لوگ ایسے برے اور بدعقیدہ لوگوں پر لعنت بھیجو۔! "فَقُوْلُوْا لَعْنَةُ اللهِ عَلٰى

شَرِّکُمْ"۔[الحدیث]

مسند احمد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، کہتے ہیں: میں نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ ایک نیکی کا بدلہ دو لاکھ کے برابر ملتا ہے، ایک دوسری روایت میں بیس لاکھ کا بھی تذکرہ ہے۔[فضائل اعمال، درمنثور]

حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ میں نے ایک شخص سے یہ سنا ہے کہ جو شخص "سورۃ قُلْ هُوَ اللهُ اَحَدٌ" کو ایک مرتبہ پڑھے، اس کے لئے موتی اور یاقوت کے دس لاکھ محل جنت میں بنتے ہیں۔ کیا میں اسے سچ مان لوں؟ حضرت کعب نے فرمایا: اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ بلکہ بیس لاکھ محل جنت میں بنتے ہیں، تیس لاکھ اور بھی، اور اس قدر کہ ان کی گنتی اللہ تعالیٰ شانہ کے علاوہ کسی کو معلوم ہی نہ ہو۔ پھر آپ نے اس آیت: ﴿فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾ کی تلاوت کی، اور فرمایا: جس کو اللہ تعالیٰ کثیرۃ کہے، مخلوق اس کی گنتی نہیں کر سکتی۔[تفسیر ابن کثیر]

رازدانِ حقائقِ شریعت حضرت الشیخ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان باتوں کے متعلق لوگوں کے تین فرقے ہیں: پہلا فرقہ بدنصیب و بدعقیدہ لوگوں کا ہے۔ یہ لوگ ان چیزوں پر نہ عقیدہ رکھتے ہیں، نہ ایمان۔ تو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی عنایات و بخششوں سے سراسر محروم رہیں گے۔ دوسرے فرقہ میں وہ لوگ ہیں جو کہ ان باتوں پر عقیدہ اور ایمان تو رکھتے ہیں، مگر حُبِّ جاہ، حُبِّ مال وحُبِّ دنیا کی وجہ سے ان کے باطن تاریک ہیں، اور حد سے زیادہ بخیل ہیں، یہ بھی محروم رہیں گے۔ تیسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے کہ عقیدہ وایمان کے بھروسہ واعتماد پر سخاوت کرتے ہیں، اور ان کے اموال میں سائل ومحروم سب کا حصہ مقرر ہے، ان لوگوں کے سرخیل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔

آپ نے حضرت ابوالدحداح رضی اللہ عنہ کا واقعہ سنا، ان فرشتہ صفات صحابہ رضی اللہ عنہم میں وہ لوگ بھی ہیں، جنہیں نہ کوئی آج تک سمجھا ہے، نہ آئندہ انہیں کوئی پہچانے گا۔ ہاں! روزِ قیامت جب ان کے مقامات ظاہر ہوں گے، تو قدسی الاصل پیغمبروں کو بھی حیرت ہوگی۔ یہ ہیں ہماری آنکھوں کے چشم وچراغ، سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، جنہوں نے قرآن کریم کی ہر آیت پر محض یہ نہیں کہ عمل کیا، بلکہ اس کا صحیح معنوں میں نمونہ بنے، جیسے ارشاد ہے: ﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ﴾ [البقرۃ:۱۳۷] (تو اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لے آئے ہو (تو ہدایت یاب ہو جائیں)۔ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ [البقرۃ:۱۳] (اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح اور لوگ ایمان لے آئے، تم بھی ایمان لے آؤ)

بہر حال! اللہ تعالیٰ کی راہ میں نزولِ آیت کریمہ سے لے کر قیامت تک اربوں مسلمان اعلیٰ درجہ پر عمل

کرتے رہیں گے، مگر سرخیل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی شمار ہوں گے، جن کے نصف صاع دوسرے لوگوں کے پہاڑ جتنے سونے سے زیادہ قیمتی ہے۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کا سارا سامان سوئی اور نمک تک حاضر کیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اپنے گھر کے سامان کا نصف حصہ حاضر کیا۔ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے چھ سو اونٹ، تین سو گھوڑے بمع سامان نچھاور کیا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ایک لاکھ کے قریب درہم حاضر کئے۔

عام اعلان کے بعد جس جس کے پاس جو کچھ ہوتا، وہ بطیبِ خاطر بصد خوشی حاضر کرتا، یہاں تک کہ ایک محسنہ عابدہ، زاہدہ، عفیفہ خاتون کے گھر میں کچھ نہیں تھا، وہ روتی ہوئی ایک سالہ شیر خوار بچے کو گود میں لے کر حاضر ہوئی، اور شیر خوار بچے کو مہربان و مشفق رحمۃ للعلمین کے قدموں پر ڈال کر نچھاور کرنا چاہتی تھی۔ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے درمیان میں حائل ہو کر پوچھا: یہ بچہ کس لئے ہے؟ کہنے لگی: میرا یہی سرمایہ ہے۔ اچھا! یہ کسی کو کیا کام آئے گا؟ کہنے لگی: یہ کسی مجاہد کے لئے ڈھال کا کام آئے گا، جب دشمن وار کرے، تو وہ اس کو ہاتھ میں لے کر اپنا قیمتی بازو بچائے، اور اس کو ڈھال کے طور پر استعمال کرے۔ یہ ہیں صحابہ کرام۔ رضی اللہ عنہم

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآىِٕنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰى یَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَیْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ یُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَیْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْكَهٗ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اٰیَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ التَّابُوْتُ فِیْهِ سَكِیْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِیَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۴۸﴾

ترجمہ: کیا آپ نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کے اس قصے کو ملاحظہ نہیں کیا، جو موسیٰ کے بعد پیش آیا؟ جب ان لوگوں نے اپنے زمانہ کے پیغمبر سے یہ کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر فرمائیے، تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کریں، اس پیغمبر نے جواب دیا کیا تم سے اس کی یہی توقع ہے کہ اگر تم پر جہاد فرض کیا جائے تو تم جہاد نہ کرو، ان لوگوں نے کہا ہمارے لئے ایسی کونسی گنجائش باقی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد نہ کریں؟ حالانکہ ہم اپنے گھروں سے بے گھر کئے گئے، اور اپنے بچوں سے جدا کردیئے گئے، پھر جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو ان میں سے سوائے چند لوگوں کے سب پھر گئے، اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے خوب واقف ہے (۲۴۶) اور ان سے ان کے پیغمبر نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر فرمادیا، اس پر وہ بولے اس طالوت کو ہم پر حکومت کرنے کا حق کیسے حاصل ہوسکتا ہے؟ حالانکہ ہم حکومت کے اس سے زیادہ حقدار ہیں، اور اس کو تو مال کی وسعت بھی عطا نہیں کی گئی۔ نبی نے جواب دیا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلہ میں اسی کو پسند فرمایا ہے، اور اس کو علم کی وسعت، اور قد وقامت کے پھیلاؤ میں بڑھادیا ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنی سلطنت جس کو چاہتا ہے عطاء فرماتا ہے، اور اللہ تعالیٰ صاحبِ وسعت اور بڑا جاننے والا ہے (۲۴۷) اور ان لوگوں سے ان کے نبی نے کہا کہ طالوت کے بادشاہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمہارے ربّ کی جانب سے تسکینِ قلب کا سامان ہے، اور کچھ وہ بقیہ اشیاء بھی ہیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت ھارون چھوڑ گئے تھے، اس صندوق کو فرشتے اٹھا کر لائیں گے، یقیناً اس صندوق کے آنے میں تمہارے لئے بڑی نشانی ہے، اگر تم ایمان رکھتے ہو (۲۴۸)

معارف ومنازل

یہاں بنی اسرائیل کا دوسرا واقعہ بیان ہورہا ہے۔ دراصل یہ اول واقعہ کے لئے بمنزلہ اثبات ودلیل ہے، کہ وہاں جہاد سے بھاگ گئے تھے، اور ہلاک ہوگئے تھے، یہاں جہاد پر اقدام کرکے بچ گئے، اور اپنے سے سوگنا زیادہ طاقتور دشمن پر غالب آگئے۔ قریبی آیتوں میں اللہ تعالیٰ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ فرما کر اپنی عظیم قدرت کو ظاہر فرمایا تھا۔ یہ واقعہ اس کے لئے نمونہ، اور دلیل ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ایک مدت تک بنی اسرائیل کا حال درست رہا، اور حضرت یوشع بن نون علیہ السلام نے لوگوں کی اصلاح وتربیت کی۔ ان کی وفات کے بعد مسلسل انبیاء کرام علیہم السلام آتے رہے، اور اصلاحی کام ہوتا

رہا۔ حضرت الیاس، حضرت کالب، حضرت یسع اور متعدد دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی آمد کا سلسلہ جاری رہا، مگر نافرمان قوم مسلسل سرکشی اور گمراہی میں پیش پیش رہی۔ یہاں تک کہ دینی اقدار اور تورات کے احکام سے بغاوت کی، جبکہ سنۃ اللہ ہمیشہ یہی رہی ہے کہ جو بھی قوم آسمانی ہدایتوں سے منحرف ہو کر احکامِ الٰہی سے بغاوت کرتی ہے، تو جلد یا بدیر اس کی گوشمالی ہو جاتی ہے۔ کبھی آسمانی آفاقی عذاب سے ہلاک ہو جاتی ہے، جیسے کہ "یَوْمَ السَّبت" کی خلاف ورزی کرنے والوں پر عذاب آیا، اور کبھی کسی زمینی دشمن کے توسط سے عذاب کی گرفت میں آجاتی ہے، جیسے جالوت بادشاہ اور بخت نصر کے ہاتھوں ان کی تباہی آئی۔ تاریخ میں یہ تمام دل خراش واقعات موجود ہیں۔

غرض یہ کہ بنی اسرائیل میں پے در پے پیغمبر آتے رہے، مگر ان کی نافرمانی اور سرکشی میں کمی نہیں آئی، یہاں تک کہ تورات کو بھلا بیٹھے، اور فسق و فجور میں مبتلا ہوتے گئے، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب بھیجا، اور قومِ عمالقہ، جو مصر اور فلسطین کے ساحلی علاقے میں آباد تھی، ان پر حملہ آور ہوئی، ان کا قتل عام کیا، اور تیس ہزار لڑکیوں کو لونڈیاں بنا کر لے گئے۔ یہ عمالقہ کے لوگ بڑے قد و قامت والے اور مضبوط جنگجو تھے، ان کا باقاعدہ مسلح لشکر ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ اس معرکہ میں ہزاروں لوگ مارے گئے۔ ان کے اموال پر دشمن کا قبضہ ہوا، اور ان کے علاقوں پر دشمن نے قبضہ کیا، ہزاروں بچوں اور نوجوانوں کو قیدی بنا کر لے گئے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل اپنی بداعمالی کے باعث کافروں کے زیرِ نگین ہو گئے۔ جالوت کے رعایا و دست نگر بن گئے، اور طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا ہو گئے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے حضرت شمویل علیہ السلام کو ان میں مبعوث فرمایا، تو لوگوں نے ان سے مطالبہ کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے نبی ہو، تو ہمارے لئے ایک بادشاہ حاکم مقرر کرو! تاکہ اس کی قیادت میں ہم اپنے دشمنوں کے ساتھ جہاد کریں، اور اپنے ملک اور قیدیوں کو ظالم سے آزاد کرائیں۔ شاید ان میں یہ دستور ہوگا کہ نبی کے حکم کے تحت ضرور ایک بادشاہ ہو، جو جہاد کا علمبردار اور کمان کرنے والا ہو۔

مگر پیغمبر نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ مبادا اگر تم پر جہاد کا حکم جاری کیا گیا، اور بادشاہ بھی مقرر ہو گیا، تو تم منحرف ہو کر جہاد سے کہیں انکار نہ کر بیٹھو۔ مگر انہوں نے بڑے وثوق سے یقین دلایا، لیکن آخر کار وہی ہوا، جس کا اندیشہ تھا۔

طالوت ایک قدآور، خوبصورت، عقلمند چرواہا تھا، یا ماشکی تھا، جو لوگوں کو پانی پلاتا تھا۔ بعضوں نے کہا ہے کہ دباغت کا کاروبار کرتا تھا۔ وحی کے ذریعہ حضرت شمویل علیہ السلام کو حکم ہوا، تو انہوں نے طالوت کے نام کا اعلان کیا۔ اس پر بنی اسرائیلی اعتراض کرنے لگے، اور چہ میگوئیاں شروع کیں۔ پیغمبر نے چند علامات اور نشانیاں بتلائیں، جو سارے

اس میں پائے گئے۔ یہ طالوت حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ''بن یامین'' کی نسل سے تھے، چونکہ نبوت کا سلسلہ اکثر ''لاوی بن یعقوب'' کے خاندان میں رہا، جبکہ بادشاہت یہودا کے خاندان میں جاری رہی، اور بن یامین کی نسل میں نہ نبوت تھی، اور نہ بادشاہت، اس لئے بنی اسرائیلی طالوت کی بادشاہت پر معترض رہے۔ پس پیغمبر نے ان کے اعتراضات کے درجِ ذیل جوابات دیئے:

(۱) قبض و بسط اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہی مالک الملک ہے، جس کو چاہے حاکم بنادے، جس کو چاہے محکوم بنادے، لہٰذا یہ فیصلہ من جانب اللہ ہے، اس میں کسی ردوبدل کی نہ گنجائش ہے، نہ امکان۔ ایک شاعر نے اسی بات کی بہت خوبصورت ترجمانی کی ہے:

گاہ گدارا ملک بخشی کہہ شہاں راچوں گدا ☆ درقضائے تو کسی راطاقت گفتار نیست

(۲) میدان جہاد میں جس قابلیت ولیاقت اور سرپرستی کی ضرورت ہے، یہ سب اس شخص میں نمایاں ہیں۔

(۳) ظاہری رعب وجاہت، قدوقامت، جوہر بادشاہ کے لئے ضروری ہے، یہ شخص اس کا نمونہ ہے۔

(۴) فنونِ حرب کے لئے جس علم وہوشیاری کی ضرورت ہے، یہ شخص اس میں ماہر ہے۔

(۵) اللہ تعالیٰ اسے مالی وسائل دینے والا ہے، اور اسی کے متعلق وحی الٰہی کا فیصلہ ہوا ہے۔

(۶) اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ہے، اس کا انتخاب کبھی غلط یا ناقص نہیں ہوتا، وغیرہ۔

اگر طالوت کے متعلق قرآنِ حکیم کے سنہرے کلمات کا بغور مطالعہ کیا جائے، تو دل باغ باغ ہوکر یہی فیصلہ کرے گا کہ پوری قوم بنی اسرائیل میں یہ شخص ایسا نمایاں تھا، جیسے سورج ستاروں کے جھرمٹ میں، سنئے:

﴿قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ یہ وہ کلمہ ہے، جسے قرآن حکیم نے دوسرے مقام پر انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے استعمال کیا، فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ﴾ [آل عمران: ۳۳] (خدا نے آدم اور نوح اور خاندانِ ابراہیم اور خاندانِ عمران کو تمام جہان کے لوگوں میں منتخب فرمایا تھا)۔

دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ [الحج: ۷۵] (خدا فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے منتخب کرلیتا ہے، اور انسانوں میں سے بھی)۔

پھر فرمایا: ﴿وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ (اس نے اسے علم بھی بہت سا بخشا ہے، اور تن وتوش بھی (بڑا عطا کیا ہے)۔ آخری کلمہ بڑا قیمتی ہے، یعنی ﴿وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (اور خدا (کو اختیار ہے)

جسے چاہے بادشاہی بخشے)۔ بہر حال پیغمبر شموئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ طالوت کا تقرر من جانب اللہ ہے، اس کی واضح علامت یہ ہے کہ طالوت کے پاس تمہارے پیغمبر حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام کا یادگار صندوق فرشتوں کے ذریعہ بلا کسی سعی وکوشش کے آ جائے گا۔ (جو کہ اس وقت تمہارے دشمن کے پاس ہے)۔

یہ یادگار صندوق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ہوتا تھا، اور بڑا بابرکت سمجھا جاتا تھا۔ یہ قیمتی لکڑی کا ہوتا تھا۔ اس کی لمبائی چار ہاتھ اور چوڑائی دو ہاتھ کی تھی۔ اس میں تورات کے تختے رکھے ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام کے عمامے، اور کچھ دیگر ذاتی استعمال کی چیزیں ہوتی تھیں۔ بعض علماء کرام نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا بھی اس میں رکھا ہوا تھا۔ جب کسی جہاد میں جانا ہوتا تھا، تو لوگ اس تابوت کو ساتھ لے کر چلتے، اس کی برکت سے فتح حاصل ہو جاتی۔

جس زمانے میں عمالقہ قوم نے بنی اسرائیل پر حملہ کر کے انہیں تباہ و برباد کیا، تو وہ لوگ اس تابوت کو اٹھا کر لے گئے تھے، اور بت خانہ میں بتوں کے نیچے رکھ چکے تھے۔ یہ روزانہ بتوں کو روندڈالتا تھا۔ پھر لوگوں نے وہاں سے اٹھا کر کسی اور مقام میں رکھوایا، اس اثناء میں ان پر طرح طرح کے عذاب آئے۔ انہوں نے مجبور ہو کر دو گھوڑوں یا گایوں پر لاد کر انہیں صحراء کی طرف روانہ کیا۔ فرشتوں نے اسے اٹھا کر طالوت کے گھر پہنچایا۔ طالوت نے پیغمبر علیہ السلام کے پاس روانہ کیا۔ پیغمبر علیہ السلام نے طالوت کو تاکید فرمائی کہ تم جہاد کی تیاری کر کے اس کو گھوڑے پر رکھ کر لشکر کے مقدمۃ الجیش والوں کے ہاتھ میں دے دو، اور خود اس کی نگرانی کرتے جاؤ، جب دشمن سے نبرد آزما ہو، تو اس تابوت سے فتح ونصرت کی بشارت اور خوشخبری کا اعلان سنو، چنانچہ ایسا ہی ہوا، آگے آیتوں میں تفصیل آنے والی ہے۔ واللہ اعلم

﴿سَكِينَةٌ﴾ کے معنیٰ ہیں: رحمت، اطمینان، خوشی اور تسکین۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ﴾ [الفتح: ۱۸] (پس اللہ نے سکینہ نازل کیا ان پر)۔ یا ﴿فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ﴾ [الفتح: ۲۶] (پس اللہ نے سکینہ نازل کیا اپنے رسول پر)۔ یا ﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ [الفتح: ۴] (اللہ وہ ہے جس نے سکینہ نازل کیا مومنوں کے دل میں)۔ ان آیتوں میں بھی سکینہ بمعنی اطمینان کے ہے۔ یہ سکینہ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے متبعین پر ہر زمانہ، ہر ساعت و ہر مقام پر نازل ہوئی ہے، اور ہمیشہ نازل ہوتی رہے گی۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ
مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ
إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ
بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو اللّٰهِ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ
فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا
أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوهُمْ
بِإِذْنِ اللّٰهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ
وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ ذُو فَضْلٍ
عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ آيَاتُ اللّٰهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۲۵۲﴾

ترجمہ: پھر جب طالوت فوجیں ہمراہ لے کر باہر نکلا، تو اس نے کہا: یقیناً اللہ تعالیٰ تم کو ایک نہر سے
آزمائے گا۔ سو جو شخص اس نہر کا پانی پی لے گا، وہ میرا نہیں ہے، اور جس نے اس کے پانی کو نہ چکھا، تو یقیناً وہ میرا ہے،
مگر ہاں! جو اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے، تو اتنی رخصت ہے، پھر ان میں بجز معدود چند کے سب نے اس کا پانی پی
لیا، پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی ایمان والے اس نہر کو پار کر گئے، تو کچھ لوگ کہنے لگے: ہم میں یہ طاقت نہیں کہ
آج جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کر سکیں، اور جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جانا ہے، انہوں نے
کہا: بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ چھوٹی چھوٹی جماعتیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں، اور
اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۲۴۹﴾ اور جب وہ لوگ جالوت اور اس کی فوجوں کے سامنے آئے، تو انہوں نے
اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کی: اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں میں صبر ڈال دے، اور ہمیں ثابت قدم رکھ،
اور اس کافر قوم پر غالب کرنے میں ہماری نصرت فرما ﴿۲۵۰﴾ پس طالوت کے ساتھی مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے
جالوت کی فوجوں کو شکست دے دی، اور داؤد نے جالوت کو مار ڈالا، اور اللہ تعالیٰ نے داؤد کو سلطنت اور نبوت عطا
فرمائی، اور جو کچھ اور بھی چاہا، اس کو سکھا دیا، اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض لوگوں کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہے زمین
(دنیا) تباہ ہو جائے، لیکن اللہ تعالیٰ جہاں والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے ﴿۲۵۱﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں، جو ہم آپ کو

صحیح پڑھ کر سناتے ہیں، اور بیشک آپ پیغمبروں میں سے ہیں (۲۵۲)

معارف ومنازل

جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت شموئیل علیہ السلام نے طالوت کی بادشاہت کا اعلان فرمایا، تو اسے حکم ہوا کہ تابوت کو اٹھا کر اپنی فوجوں کو منظم کر کے جہاد کے لئے روانہ ہو جاؤ۔ طالوت نے اپنے لشکر کو منظم کرتے ہوئے روانگی کا فیصلہ کیا۔ غالباً یہ ایک لاکھ چار ہزار افراد کا لشکر تھا، جو ہر قسم کے لوگوں پر مشتمل تھا، مؤمنین مخلصین بڑی قلت میں تھے۔ یہ بات کسی پر مخفی نہیں کہ یہ لوگ وہ تھے جن کے آباء واجداد نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ [المائدۃ: ۲۴] (اگر لڑنا ہی ضرور ہے) تو تم اور تمہارا خدا جاؤ اور لڑو، ہم یہیں بیٹھے رہیں گے)۔ اس لئے بادشاہ (طالوت) کو مکمل اعتماد و بھروسہ نہ تھا، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان سے لڑنے والے قلیل تعداد میں ہوں گے۔

پس جب بیت المقدس سے روانہ ہو کر عمالقہ دشمنوں کی طرف کوچ کیا، تو طالوت نے پیغمبر شموئیل علیہ السلام کے فرمان کے مطابق (تا کہ اچھے اور برے کی تمیز ہو) اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ شانہ تم سب کی ایک نہر کے ذریعہ آزمائش کرنے والا ہے، لہٰذا جو شخص اس نہر کے پانی سے سیر ہو کر پیئے گا، وہ ہمارے ہمراہیوں میں سے نہ ہوگا، اور وہ مجھ سے نہ ہوگا، وہ ہمارے ساتھ چل نہیں سکے گا، اور جو شخص نہر کے پانی کو بالکل نہیں چکھے گا، تو بیشک وہ شخص ہمارے دین پر ہوگا، اور میرے ہمراہ رہے گا۔ مگر اتنا ہے کہ ہاتھ کے چلو بھر پانی پینے کی رخصت اور اجازت ہے۔ پھر جب نہر پر وارد ہوئے، تو نافرمانوں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا، اور اپنے بادشاہ کی حکم عدولی کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ البتہ! تین سو تیرہ کے قریب لوگوں نے عزیمت پر عمل کر کے یا تو سرے سے پانی ہی نہیں پیا، یا رخصت پر عمل کر کے چلو بھر پانی پیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ کامل الایمان و فرمانبردار یہی تین سو تیرہ رہے، اور آگے میدانِ جہاد میں مستعدی اور جذبہ کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ ناقص الایمان والے لوگ جنہوں نے حکم عدولی کر کے پانی پیا تھا، ان کی شناخت اس طرح ہوئی کہ ان کے پیٹ پھول کر اتنے بڑے ہوئے کہ جہاں کھڑے ہوتے، تو کھڑے ہی رہتے، بیٹھ نہیں سکتے۔ جو بیٹھے ہوئے تھے، وہ اٹھ نہیں سکتے تھے۔ وہ وہاں دھرے کے دھرے رہ گئے۔ انہیں اسی نہر پر چھوڑ کر طالوت مٹھی بھر لوگوں کے ساتھ آگے بڑھے، کیونکہ وہ پیغمبر شموئیل علیہ السلام کے حکم پر عمل کرنے کا عہد کر چکے تھے، اور پیغمبر نے

تابوت کی آمد کے ساتھ انہیں نصرتِ الٰہی اور فتح و کامیابی کی خوشخبری سنائی تھی۔

صحیح بخاری نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور براء بن عازب رضی اللہ عنہ وغیرہ حضرات سے نقل کی ہے کہ غزوۂ بدر میں ہماری تعداد اتنی ہی تھی، جتنی طالوت کے مخلص وفادار ہمراہیوں کی، یعنی تین سو تیرہ۔ غزوۂ بدر میں تین سو تیرہ غیر مسلح جان نثاروں نے کفار و مشرکین عرب کی شان و شوکت پر کاری ضرب لگا کر قیامت تک کے لئے جزیرۂ عرب میں اسلام کا علم لہرایا، اور شرک و بت پرستی کے غرور کو ہمیشہ کے لئے خاک میں ملا دیا۔

وہاں طالوتی لشکر نے بھی ایسا کارنامہ انجام دیا کہ عمالقہ قوم کے ڈیڑھ ہزار سالہ اقتدار کو ہمیشہ کے لئے ختم کیا، چنانچہ قرآن حکیم نے جنگ کا نقشہ کھینچ کر ارشاد فرمایا کہ دونوں لشکر جب آمنے سامنے مقابل ہوئے، تو جالوت اپنا فوجی لباس پہن کر تنہا آگے بڑھا، اور کہنے لگا: تم سب کو اکیلا میں ہی کافی ہوں، آؤ! پہلے مجھ سے مقابلہ کرو۔ اس وقت شموئیل علیہ السلام کے کہنے سے طالوت نے حضرت داؤد علیہ السلام کے والد ایشا (ایشی) کو طلب کیا، اور ان سے پوچھا کہ تمہارے کتنے لڑکے ہیں؟ تو انہوں نے عرض کیا: میرے چھ لڑکے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام عمر میں سب سے چھوٹے تھے، اس لئے ان کا ذکر کیا، اور وہ بکریوں کے چرواہے تھے۔ حضرت شموئیل علیہ السلام کے حکم سے انہیں حاضر کیا گیا تھا، جب وہ راستے میں آرہے تھے، تو یکے بعد دیگرے تین پتھروں نے انہیں آواز دے کر کہا تھا کہ ہم کو اٹھا لے، ہم تمہیں کام دیں گے! تو انہوں نے ان تینوں پتھروں کو اٹھا کر اپنے تھیلے میں رکھا۔

جب جالوت مبارزہ کے لئے میدان میں اترا، تو حضرت داؤد علیہ السلام اس کے مقابلہ میں آئے، اور اسے للکارا۔ جالوت نے کہا: بچہ کیا مقابلہ کرنے آئے ہو؟ تم پر مجھے رحم آتا ہے، میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے مقابلہ میں کوئی شہسوار پہلوان میدان میں آئے۔ میں تمہارے ساتھ مقابلہ کرنے میں اپنی توہین سمجھتا ہوں کہ کسی لڑکے سے مقابلہ کروں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا کہ نہیں، میں ہر حال میں تمہارے ساتھ نبرد آزما رہوں گا۔ جالوت مسلح تھا، اور لوہے کی زرہ میں ڈھکا ہوا تھا، صرف اس کی پیشانی اور آنکھیں نظر آتی تھیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام ان تینوں پتھروں سے جالوت پر حملہ آور ہوئے، اور اس کے ماتھے پر پتھروں سے ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس کے سر کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔

کہتے ہیں کہ یہ تینوں پتھر اس کی گدی سے باہر نکلے تھے۔ یہ حملہ اتنی جرأت و چابک دستی سے ہوا کہ اس مسلح دیو ہیکل سپہ سالار جالوت کو ہاتھ اٹھانے کا موقع تک نصیب نہیں ہوا، پھر آگے بڑھ کر اس کی تلوار سے اس کی گردن

کاٹ لی۔ جالوت کے قتل ہوتے ہی جنگ کا پانسہ پلٹ گیا، اور اس کی فوج کو طالوت کے لشکر نے گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کیا۔

﴿فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللهِ﴾ یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی بے مثال مدد سے جالوت اور اس کے جرار لشکر کو شکست دی۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اتنے قلیل نہتے لوگوں نے اپنے سے سوگنا زیادہ طاقتور لشکر کو کیسے ڈھیر کر دیا؟ کہتے ہیں داوٗد علیہ السلام چھوٹے قد کے لڑکے تھے، ہمیشہ بیمار رہتے تھے۔ ان کا رنگ بیماری کی وجہ سے پیلا (زرد) پڑ گیا تھا۔ جب انہیں جالوت نے دیکھا، تو وہ بڑا، قوی، قدآور، تنومند، تندخو، تیز مزاج اور دیو ہیکل آدمی تھا، وہ اکیلا ہی بہت سے لشکروں کو بھگا دیتا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں حضرت داوٗد علیہ السلام کا رعب ڈال دیا، انہیں دیکھ کر وہ کہنے لگا: کیا تم میرے پاس گوپھیا اور پتھر لے کے آئے ہو؟ جیسے کوئی کتے کو مارنے آیا کرتا ہے۔ حضرت داوٗد علیہ السلام نے فرمایا: ہاں! تم تو کتے سے بھی بدتر ہو، پھر آپ علیہ السلام نے ان تینوں پتھروں کو گوپھن میں رکھا، اور گوپھیا مارا، وغیرہ۔ [مظہری]

اسی طرح جنگ بدر میں مشرکینِ مکہ کے جالوت (ابوجہل) کو سیدہ عفراء رضی اللہ عنہا کے دونابالغ بچوں نے جہنم رسید کیا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جنگ یرموک کے موقع پر فرمایا: ''جنگیں تقویٰ وایمان اور دعاؤں کی بدولت لڑی جاتی ہیں''۔ اور یہی ایمانی جواہرات فتوحات کے اسباب ہوتے ہیں، یہاں بھی یہی جوہر نمایاں ہے۔ طالوت کی شب خیزی وتقویٰ، ان کے سپاہیوں کی اطاعت گزاری، پھر اعتماد وتوکل علیٰ اللہ، مناجات ودعوات، طلبِ استقامت اور اخلاص، وحسن نیت، یہ وہ اسباب ہیں جن کی بدولت فتح ونصرت دوڑ کر مجاہد کا استقبال کرتی ہے۔

ہمارے زمانے میں بھی یہ کامیابیاں کمزور سے کمزور تر طالبان کی دہلیز پر نمایاں نظر آتی ہیں۔ ﴿إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ [الغافر: ۵۱] (ہم اپنے پیغمبروں کی اور جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کی دنیا کی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں)۔

یہ ان کی فتوحات کی زندہ مثال ہے، پھر ایک طرف سے دنیا اور اسبابِ دنیا کی مادی کثرت، دوسری طرف ایمانی جواہر اور استغفار ودعوات، جب ان کا مقابلہ ہوتا ہے، تو تاریخ گواہ ہے کہ تمام مادیات بے معنی اور ناکارہ ہو کر شکست سے دوچار ہو جاتے ہیں، اور جیت ہمیشہ حق کو حاصل رہتی ہے۔

اس واقعہ (قتل جالوت) نے حضرت داوٗد علیہ السلام کی شجاعت کا دوست ودشمن دونوں کے قلوب پر سکہ بٹھا دیا،

اور وہ بنی اسرائیل میں بیحد مقبول اور ہر دلعزیز ہو گئے۔ ان کی شخصیت ممتاز ونمایاں ہوگئی، اور طالوت نے یہ اعلان کیا تھا کہ جو شخص جالوت کو قتل کرے گا، میں اس سے اپنی بیٹی کی شادی کراؤں گا، اور اس کو حکومت میں بھی حصہ دار بناؤں گا۔ چنانچہ جب حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا، تو طالوت نے وفاءِ عہد کے پیش نظر اس کے ساتھ اپنی لڑکی ''میکال'' کی شادی کر دی، اور حکومت میں بھی حصہ دار بنالیا۔ واللہ اعلم۔ [البدایۃ والنھایہ]

پس جب طالوت کو اللہ تعالیٰ نے فتح ونصرت سے نوازا، اور جالوت جہنم رسید ہو کر ہلاک ہوا، اور اس کی فوج بھی ایک حد تک تباہ ہوئی، بقایا شکست خوردہ ہو کر بھاگ گئے، تو طالوتی لشکر نے ان کے تعاقب میں پیش قدمی کرتے ہوئے ہزاروں بنی اسرائیلی قیدیوں کو آزاد کرا کران تمام علاقوں پر اپنا قبضہ استوار کیا، جن پر ایک عرصہ سے جالوت نے بنی اسرائیل کو بیدخل کر کے اپنا قبضہ جمایا تھا، اس طرح جالوت کا اقتدار ختم ہوا، اور اس کے علاقوں پر طالوت کا قبضہ ہوا۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام، طالوت کی وفات کے بعد خلیفہ اور بادشاہ مقرر ہوئے، اور نبوت سے نوازے گئے، تو انہوں نے اپنے ملک کو وسعت دے کر شام اور اُردن تک پورے علاقوں پر اپنے اقتدار کو مستحکم کیا۔ قرآن حکیم نے حضرت آدم علیہ السلام کے علاوہ کسی بھی شخصیت اور پیغمبر کو خلیفة کا خطاب نہیں دیا، سوائے حضرت داؤد علیہ السلام کے۔ ارشاد فرمایا: ﴿يَٰدَاوُۥدُ إِنَّا جَعَلْنَٰكَ خَلِيفَةً فِى ٱلْأَرْضِ﴾ [ص:۲۶] (اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے)۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا نام قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں سولہ مرتبہ مذکور ہے۔ آپ علیہ السلام پر آسمانی کتاب (زبور) اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی، اور آپ علیہ السلام کو خصوصیت کے ساتھ علم وحکمت سے اللہ تعالیٰ نے مشرف فرمایا۔ قرآن حکیم میں انہیں اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام کو بڑی عجیب وغریب منقبتوں کے ساتھ یاد فرما کر انہیں اللہ تعالیٰ کے مخصوص انعامات پر شکر گزاری کا حکم دیا۔

بنی اسرائیلی انبیاء میں حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام کے بعد ان دونوں باپ بیٹے برگزیدہ انبیاء کا مقام و رتبہ ہے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خصوصی مقام ومرتبہ ہے۔ واللہ اعلم

فائدہ:

روح المعانی میں لکھا ہے کہ طالوت کے لشکر میں تین قسم کے لوگ تھے:

(۱) ناقص الایمان، جو امتحان میں پورے نہ اترے، اور پانی پی کر نہر کو پار نہ کر سکے۔

(۲) کامل الایمان، جو امتحان میں پورے اترے، اور نہر پار کر گئے، مگر اپنی قلت کو دیکھ کر کہنے لگے: ﴿لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ﴾ اس طرح وہ سعادت سے محروم رہے۔

(۳) کامل الایمان، بلکہ اکمل الایمان والے، جن کو یہ فکر بھی نہیں ہوئی، اور دعاؤں میں مصروف ہو کر کہنے لگے: ﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [الآیۃ] جنگ بدر میں مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے یہی کہا تھا کہ یا رسول اللہ! ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح نہیں ہیں، جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾ [المائدۃ: ۲۴] (اگر لڑنا ہی ضرور ہے) تو تم اور تمہارا خدا جاؤ اور لڑو، ہم یہیں بیٹھے رہیں گے)۔ بلکہ ہم آپ کے دائیں بائیں، آگے پیچھے، ہر طرف سے لڑ کر شجاعت و بہادری کے جوہر دکھائیں گے۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنے خوش ہوئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ مبارک چودہویں کے چاند کی طرح چمک اٹھا، اور بہت خوش ہوئے۔

﴿وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ﴾ (اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو، یعنی کفار کو بعض سے، یعنی مؤمنین سے دفع نہ کرتا رہے، تو تمام زمین پر فساد پھیل جائے)۔ یعنی مشرک تمام زمین پر غالب آ کر عمومی فساد و بدامنی پھیلائیں، قتل و غارت عام ہو، ہر طرح کے عبادت گاہوں، عبادت کے مراکز، نماز و عبادات اور مساجد اور ذکر اللہ کے مراکز سارے تباہ و برباد ہوں، جس طرح سورۃ الحج آیت ۴۰ میں اس کی تفصیل ہے۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت کیا۔ اور بعض مفسرین نے یہ معنی کئے ہیں کہ اگر مؤمنین اور صالحین کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کفار اور مشرکین اور فجار سے عذاب کو دفع نہ کرتا، تو تمام روئے زمین میں مخلوق تباہ برباد ہو جاتی۔

بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے معالم میں حضرت عبدالرحمن بن احمد رحمۃ اللہ علیہ کے طریق سے، اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ يَدْفَعُ بِالْمُسْلِمِ الصَّالِحِ عَنْ مِائَةِ اَهْلِ بَيْتٍ مِنْ جِيْرَانِهِ الْبَلَاءَ"۔ یعنی ایک نیک مسلمان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے ہمسایوں میں سے سو گھر والوں کی مصیبت و بلا کو دفع کر دیتا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ اگر مخلوق میں نماز پڑھنے والے، اور شیر خوار بچے، اور بے گناہ جانور نہ ہوتے، تو تم پر بہت سخت عذاب مسلط ہو جاتا۔

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہی ہے، جس کی بدولت برے لوگوں پر جلد

عذاب نہیں آتا۔﴿تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ﴾ ماقبل واقعہ کے تمام امور پر اشارہ ہے۔شروع واقعہ سے اختتام تک ساری باتیں اس میں مندرج ہیں۔

﴿وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ بیشک آپ ﷺ پیغمبروں میں سے ہیں،اور یہ آیتیں،غیب کی باتیں، جنہیں اہل کتاب بھی مانتے ہیں،آپ ﷺ اُمّی وناخواندہ ہوتے ہوئے یہ سب کچھ ذرّہ برابر فرق کے بغیر بیان فرمارہے ہیں۔ یہ آپ ﷺ کی صداقت ونبوت پرواضح وروشن دلائل ہیں،اور یہ ساری باتیں آپ ﷺ کی نبوت پر گواہ اور شاہد ہیں۔فَصَلَّی اللّٰهُ وَسَلَّمَ عَلٰی سَیِّدِ الْخَلْقِ نَبِیِّ الرَّحْمَةِ وَسَیِّدِ الْاُمَّةِ بِالْفَضْلِ وَالْكَرَامَةِ۔

اَلْجُزْءُ الثَّالِثُ

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ
دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا
اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ
مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۗ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

ع ۵

ترجمہ: یہ جتنے رسول ہیں ہم نے ان میں سے بعض حضرات کو بعض پر فضیلت و برتری عطاء فرمائی ہے، بعض ان میں سے وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے شرف ہمکلامی بخشا، اور ان کے بعض کو مراتب و درجات میں بلند فرمایا، اور مریم کے بیٹے حضرت عیسیٰ کو ہم نے دلائلِ واضحہ عطا فرمائے، اور ہم نے روح قدس کے ذریعہ اس کی تائید فرمائی، اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا، تو وہ لوگ جو پیغمبروں کے بعد ہوئے، وہ ان صاف احکام کے بعد جو ان کو موصول ہو چکے تھے آپس میں نہ لڑتے، لیکن ان لوگوں نے آپس میں اختلاف کیا، پھر کوئی ان میں سے ایمان لایا، اور کوئی ان میں کافر ہوا، اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا، تو یہ لوگ آپس میں نہ لڑتے، لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے، وہ کرتا ہے ﴿۲۵۳﴾

معارف ومنازل

''تِلْكَ'' سے انبیاء و رُسل علیہم السلام کی جماعت کی جانب اشارہ ہے۔ سورۃ البقرہ آیت (۱۲۳) سے آیت (۲۵۲) تک صراحۃً، اشارۃً اور ضمناً بہت سارے انبیاء کے واقعات اور لطائف بیان ہوئے۔ اب تِلْكَ سے ان سب کی طرف اشارہ ہوا، اور فرمایا ہم نے مذکورہ پیغمبروں کی جماعت میں سے ایک کو دوسرے پر برتری عطا فرمائی۔

''فَضَّلْنَا'' لغت میں اُفضل کے معنی میں ہیں۔ کسی صفت میں زیادتی، یعنی وصفِ مشترک میں ایک چیز کا دوسری چیز سے بڑھ جانا۔ لیکن عرف اور اصطلاح میں فضل ایسے کمال کی زیادتی کو کہتے ہیں، جس پر دنیا میں ستائش اور آخرت میں خصوصیت کے ساتھ دوسرا کمال ہو، تو فی الجملہ ہر ایک کو دوسرے پر برتری حاصل ہو جاتی ہے، یعنی (جدا جدا) دنیوی ستائش، اور اخروی ثواب کا استحقاق دونوں کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن پوری پوری فضیلت اسی کو حاصل ہوتی ہے، جس کو ثواب اور قربِ الٰہی زیادہ حاصل ہو۔ تمام انبیاء صَلَوٰتُ اللّٰہِ وَسَلَامُہٗ عَلَیْہِمْ اگرچہ وصفِ نبوت و

رسالت میں شریک ہیں، اور سب کو اجر و ثواب کا استحقاق ہے، لیکن کثرتِ ثواب اور مراتبِ قرب میں ان کے آپس میں اتنا تفاوت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی اس سے واقف نہیں۔ ہاں! اللہ تعالیٰ کے بتانے سے ہی اس کا علم ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿مِنۡهُمۡ مَّنۡ كَلَّمَ اللّٰهُ﴾ ان میں سے کوئی تو وہ تھا جس سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا۔

اہل تفسیر کہتے ہیں اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہی کے متعلق فرمایا: ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰى تَكۡلِيۡمًا﴾ [النساء: ۱۶۴] (ور موسیٰ سے تو خدا نے باتیں بھی کیں)۔ اور فرمایا: ﴿وَلَمَّا جَآءَ مُوۡسٰى لِمِيۡقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ﴾ [الأعراف: ۱۴۳] (اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر (کوہِ طور) پر پہنچے، اور ان کے پروردگار نے ان سے کلام کیا)۔

لیکن اس آیت سے تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کو یہ فضیلت دی گئی تھی۔ ہاں! حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہمکلام ہونا اس سے ثابت ہوتا ہے، مگر اس سے تخصیص صرف ان کے لئے ثابت نہیں ہوتی، جیسا کہ روایت سے ثابت ہے کہ شبِ معراج رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ربّ العزّت نے کلام فرمایا: ﴿فَكَانَ قَابَ قَوۡسَيۡنِ اَوۡ اَدۡنٰى﴾ [النجم: ۹] (وہ دو کمان کے فاصلے پر، یا اس سے بھی کم)۔ یعنی دو کمانوں یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا تھا، اور یہ مسلم ہے کہ انبیاء سابقین کے جتنے مراتب و مقامات اور مخصوص کمالات ہیں، وہ سب کے سب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس میں ودیعت رکھے گئے ہیں۔

ع آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

قصیدۂ بردہ کے مؤلف نے کہا: ؎

وَكُلُّ آيٍ اَتَى الرُّسُلُ الْكِرَامُ بِهَا ★ فَاِنَّمَا اتَّصَلَتْ مِنْ نُوْرِهٖ بِهِمْ

﴿وَرَفَعَ بَعۡضَهُمۡ دَرَجٰتٍ﴾ اور کوئی وہ تھے، جس کو بلند مراتب عطاء فرمائے، یعنی بعض کو بعض پر، یا بعض کو باقی تمام پر بہت درجے اونچا کر دیا۔ بعض انبیاء کو بعض پر مراتب بلندی تو بہت سے انبیاء کو حاصل ہوئی تھی۔ رسولوں کو انبیاء پر فضیلت عطا کی گئی تھی، پھر اولوالعزم رسولوں کو دوسرے رسولوں پر بہت رفعت حاصل تھی، لیکن تمام نبیوں اور رسولوں پر برتری صرف مقصد کائنات سردار دو جہان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل ہوئی تھی۔ ؎

لَا يُمْكِنُ الثَّنَاءُ كَمَا كَانَ حَقُّهٗ ☆ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر (سعدی)

اس فضیلتِ کلّی اور عالمگیر رفعت و بلندی پر ہزاروں احادیث گواہ ہیں۔ پوری امت کا اجماع بھی ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ساری خلقت سے افضل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت تمام امتوں سے افضل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین سارے ادیان کا خلاصہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم الاولین وعلم الآخرین عطا ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب تمام کتب وصحائفِ آسمانی کی جامع ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب قیامِ قیامت تک بغیر تحریف اور بلا کمی ونقصان باقی رہنے والی ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ معراج کا سفر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صاحب مقامِ محمود ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے روز دس شفاعت کریں گے، دو شفاعت عمومی، اور آٹھ خصوصی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہے، معجزۂ شق القمر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا حصہ ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا نزول آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی اور طرۂ امتیاز ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چوبیس ہزار مرتبہ ان کا نزول ہوا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ المعراج تمام پیغمبروں کی امامت فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لئے اللہ تعالیٰ نے ساری دھرتی کو مسجد بنایا۔ وضوء کے قائم مقام تیمم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مشروع ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے ساتھ سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مالِ غنیمت حلال کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رعب ایک ماہ کی مسافت سے دشمنوں کے دلوں میں ڈالا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سارے انبیاء علیہم السلام کے امام اور سردار ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کلیم اللہ بھی ہیں، خلیل اللہ بھی، اور حبیب اللہ بھی ہیں۔

روزِ قیامت سب سے پہلے قیادت وشرافت کا لباس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنایا جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر وہ ساری تکالیف اور سختیاں معاف ہو گئیں، جو گزشتہ امتوں پر رکھی گئی تھیں۔ قیامت کے روز حضرت آدم علیہ السلام کی ساری اولاد، یعنی ساری خلقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پرچم کے نیچے مبعوث ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعٰلمین، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور بعثت ساری خلقت کے لئے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء والمرسلین کے مرتبہ عالیہ پر فائز ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم صاحب جَوَامِعُ الْکَلِمِ وَمَنَابِعُ الْحِکَمِ ہیں۔

اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل ومناقب اتنے بکثرت ہیں کہ اس مختصر کتاب میں ان کا احاطہ مشکل اور غیر ممکن ہے۔ علماء کرام نے اس موضوع پر بے شمار کتابیں تصنیف کی ہیں۔ حضرت حافظ سیوطی رحمہ اللہ نے خصائص کبریٰ کتاب میں تین ہزار کے قریب خصوصیات ذکر فرمائی ہیں، اور ایک حد تک حق ادا فرمایا۔

غالب ثناء خواجہ بہ یزدان گزاشتیم ☆ کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد ست

یہ چند مناقب وفضائل جو بیان ہوئے یہ سارے صحاح ستہ، اور دیگر کتب حدیث سے مأخوذ ہیں، اور ان کے علاوہ بے شمار کثیر تعداد میں خصوصیات کا ذخیرہ حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الخصائص الکبریٰ، اور قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الشفاء میں موجود ہے۔ اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ایک نبی کو دوسرے نبی پر کسی قسم کی ایسی فوقیت ہرگز نہ دو کہ دوسرے نبی کی شان میں کوئی نقص وکمی پیدا ہو۔ یہ قطعاً حرام وناجائز ہے۔

﴿وَاٰتَیۡنَا عِیۡسَی ابۡنَ مَرۡیَمَ الۡبَیِّنٰتِ﴾ اور عیسیٰ بن مریم کو کھلے ہوئے معجزات عطا کئے، ان معجزات کی تفصیل سورۃ آل عمران، اور سورۃ مائدہ آنے والی ہے۔ إن شاء اللہ تعالیٰ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ یہود ونصاریٰ نے ان کے متعلق انتہائی افراط وتفریط سے کام لیا ہے۔ یہود نے ان کی تحقیر میں کوئی کسر نہ چھوڑی، اور نصاریٰ نے ان کی ایسی تعظیم کی کہ اِبۡنُ اللہ کہا۔ لَا حَوۡلَ وَ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ الۡعَلِیِّ الۡعَظِیۡم۔ تفصیل سورۃ المائدہ میں آنے والی ہے۔ إن شاء اللہ تعالیٰ

﴿وَاَیَّدۡنٰہُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ﴾ (ہم نے اس کی مدد کی حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ سے)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتداء سے لے کر انتہاء تک حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ان کی امداد ونگرانی کی، نفخِ روح سے لے کر رفع الی السماء تک۔ اس کی تفصیل سورۃ مائدہ میں آنے والی ہے۔ إن شاء اللہ تعالیٰ

روح اور روح القدس پر مکمل کلام پہلے گزر چکا، وہاں دیکھا جائے۔ البتہ! یہ ایک قول قابلِ التفات ضرور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ کہا جاتا ہے۔ اگر یہاں القدس سے مراد ذات باری تعالیٰ ہو، تو روح اللہ اور روح القدس کے ایک معنی ہوں گے، اور یہ اضافت ونسبت تشریفی ہوگی، جیسے کتاب اللہ، کعبۃ اللہ، رسول اللہ وغیرہ میں۔ واللہ اعلم

اور بعض علماء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم اور قول کا مظہر حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ صفتِ حیات کا مظہر حضرت اسرافیل علیہ السلام ہیں، اور صفتِ ارادہ، جود وکرم کا مظہر حضرت میکائیل علیہ السلام ہیں، اور صفتِ قدرت کا مظہر حضرت عزرائیل علیہ السلام ہیں۔ لہٰذا حضرت جبرئیل علیہ السلام کو مظہرِ علم ہونے کے اعتبار سے روح القدس کہتے ہیں، اور مظہرِ قول کے اعتبار سے روح الامین کہتے ہیں۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام مظہرِ حیات کے اعتبار سے صاحبِ وحی کہلاتے ہیں، کیونکہ اوّل مرتبہ وحی اس کے پاس نزول کرتی ہے، پھر وہ اسے جبرئیل علیہ السلام کے سپرد کرتے ہیں، چونکہ وحی قلوب ودلوں کے لئے اسی طرح سبب حیات ہے، جیسے پانی مردہ زمین کے لئے سبب حیات ہے۔ واللہ اعلم

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ﴾ یعنی اگر اللہ تعالیٰ سب لوگوں کو ہدایت دینا چاہتا، تو پیغمبروں کے بعد لوگ آپس میں نہ لڑتے، ﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ کھلے معجزات آنے کے بعد۔ ﴿وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا﴾ لیکن وہ مختلف ہوگئے۔ ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ﴾ (پس کچھ لوگ تو ایمان لے آئے، اور کچھ لوگ وہ ہوئے جنہوں نے کفر کیا)۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے روایت کی کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا فرمایا، پھر ان پر اپنا نور ڈالا، پس جس نے وہ نور پالیا (حاصل کیا) وہ ہدایت پانے والا ہوگیا، اور جو اس نور کو نہ پاسکا، وہ گمراہ ہوگیا، اسی لئے میں کہتا ہوں کہ علمِ الٰہی کے مطابق قلم، تقدیر کو لکھ کر خشک ہوگیا۔ [ترمذي، أحمد]

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا﴾ یہ جملہ، سابقہ جملہ کے لئے تاکید ہے۔

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ﴾ لیکن اللہ تعالیٰ جو کچھ چاہتا ہے، وہی کرتا ہے۔ کوئی اس کی حکمت کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے دریافت کیا: امیر المؤمنین! مجھے تقدیر کی حقیقت بتاؤ؟ فرمایا: یہ تاریک راہ ہے، اس پر چلنے سے پرہیز کرو۔ اس نے دوبارہ سوال کیا۔ آپؓ نے فرمایا: یہ گہرا سمندر ہے، اس میں داخل نہ ہو۔ اس نے پھر سہ (٣) بارہ سوال کیا، تو فرمایا: یہ پوشیدہ راز ہے، اس کی جستجو نہ کر، یعنی حقیقتِ تقدیر ناقابلِ فہم ہے، انسانی عقل کی وہاں تک رسائی نہیں ہوسکتی، جس طرح تاریک راہ میں چلنا، اور گہرے سمندر میں داخل ہونا تباہی سے خالی نہیں، اور موجبِ ہلاکت ہے، اسی طرح اس سربستہ حقیقت کی جستجو ہلاکت آفریں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے کہ جس کسی نے تقدیر کے معاملہ میں کچھ گفتگو کی، اس سے قیامت کے دن باز پرس ہوگی، اور اگر کچھ نہ کہا، تو پھر اس سے سوال نہ ہوگا۔ [ابن ماجه]

تقدیر پر ایمان لانا فرض ہے، اور تقدیر ناقابلِ فہم ہے:

یہ بات ابھی گزر چکی کہ تقدیر ناقابلِ فہم ہے۔ حضرت اُبَی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ تمام آسمان وزمین کے رہنے والوں کو عذاب دے، تو یہ ظلم نہ ہوگا، اور اگر سب پر رحم فرمائے، اس کی رحمت ان کے اعمال سے بہتر ہوگی، (یعنی اعمال موجبِ سزا ہیں، اور مجرم کو سزا دینا ظلم نہیں ہے، اور رحم کرنا اس کی مہربانی ہے، اور مہربانی اعمال کے زیرِ اثر نہیں ہے، بلکہ اعمال سے بہتر ہوگی)۔ اگر تم کوہِ اُحد کے برابر سونا راہِ خدا میں خرچ کرو، تو اللہ تعالیٰ قبول نہیں

فرمائے گا، تاوقتیکہ تمہارا ایمان تقدیر پر نہ ہو، اور جب تک تم کو اس کا یقین نہ ہو کہ جو کچھ تم کو پہنچنے والا ہے، وہ پہنچ کر رہے گا، اور نہیں پہنچنے والا ہے، تو نہیں پہنچے گا، اگر اس عقیدہ کے خلاف کسی دوسرے عقیدہ پر مروگے، تو دوزخ میں جاؤ گے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، اور حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہما کے اقوال بھی اسی مضمون کے مروی ہیں۔ بلکہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے تو فرمانِ نبوی اسی مضمون کا بیان کیا ہے۔ [أبو داؤد، ابن ماجه، أحمد]

فائدہ مہمہ:

آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور مشیت کا اظہار فرمایا ہے، جس سے ایک تو سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے، کہ باوجود انبیاء کرام علیہم السلام کی تشریف آوری اور دلائل و معجزات اور نزولِ کتبِ سماویہ کے تمام بنی نوعِ انسان کا دینِ حق کو قبول نہ کرنا، باہم قتل وقتال اور اختلاف کرنا، کسی کا مسلمان ہونا، اور کسی کا کافر ہونا، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی سب لوگ ایمان نہیں لاتے، اور دینِ حق کا انکار اور تکذیب کرتے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر حُزن وملال نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ یہ چیزیں ہماری حکمت اور مشیت کے ماتحت ہوتی ہیں، اور جو چاہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔

البتہ! اگر ہم چاہتے، تو ایسا نہ ہوتا، لیکن ہماری مصلحت وحکمت کا مقتضا یہ نہ ہوا کہ ہم جبر واکراہ کے ساتھ کسی کو مسلمان بنائیں، لہٰذا کسی پیغمبر کی امت میں کبھی ایسا نہ ہوا کہ سب کے سب مسلمان ہوجاتے، یا مسلمان ہوگئے۔

رہا حکمت کا معاملہ! تو یہ ضروری نہیں ہے کہ بندوں کو اس کی پوری حقیقت معلوم ہوجائے۔ ہمارے لئے صرف اتنا عقیدہ ضروری ہے کہ ایسا کرنے میں حضرت حق عزّ وجل کی کوئی مصلحت وحکمت ضرور ہے۔

پھر یہ بات کہ یہاں اختلاف کو "اِقْتِتَال" فرمایا، یہ اس لئے کہ باہمی اختلاف بڑھتے بڑھتے قتل وقتال کا سبب بن جاتا ہے، اور چونکہ اس کا بھی احتمال ہے کہ اختلاف رہتا، اور قتل وقتال کی نوبت نہ آتی، اس لئے مکرر ارشاد ہوا: ﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا﴾ تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ بات بھی مشیت پر موقوف تھی، چونکہ مشیت کا تعلق ترکِ قتال سے نہ ہوا، لہٰذا قتال اور اختلاف دونوں واقع ہوئے، اور یہ بات بھی یہی ہے کہ اس کی مشیت اور اس کے ارادے پر کوئی قابو یافتہ نہیں ہے، اور نہ ہی کسی کی وہاں تک پہنچ ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت کا بیان:

فرمایا: کچھ لوگوں نے ایمان وہدایت قبول کیا، اور کچھ نے انکار وکفر کیا۔ اس میں بہت سارے رازِ مخفی

سربستہ ہیں۔ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی تمام صفات، اور اس کے تقاضے تمام کائنات میں جاری وساری رہتے ہیں، اور اس کی کوئی صفت نہ معدوم ہوسکتی ہے، اور نہ ہی مہمل وموقوف۔

درکارخانہ عشق ازکفرنا گزیرست ☆ دوزخ کرابسوزد گر بولہب نباشد

جلالی وجمالی صفات، اور اسماء حسنیٰ مثلاً، اَلْهَادِیْ، اَلْمُضِلُّ، اَلْغَفَّارُ، اَلْقَهَّارُ، اَلْجَبَّارُ، اَلْعَفُوُّ، اَلْمُنْتَقِمُ، کے مقتضیات کا اگر ظہور نہ ہو، تو اہمال اور توقف لازم آئے گا، جو کہ محال ہے، پس لازم ہے کہ ان کے تقاضے جاری ہوں، وہ ہے: فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ۔فتدبر۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے اس دن کے آنے سے پہلے کچھ خرچ کرو، جس دن نہ تو کسی قسم کی خرید وفروخت ہوگی، اور نہ دوستی یاری کام آئے گی، اور نہ کوئی سفارش چلے گی، اور جو لوگ منکر ہیں وہی ظالم ہیں ﴿۲۵۴﴾

معارف ومنازل

آیت کریمہ ماقبل کے بہت سے امور واحکام کا خلاصہ ہے۔﴿تِلْكَ الرُّسُلُ﴾ کہہ کر انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے درجات پر روشنی ڈالی، اب ان کی تعلیمات کا لب لباب اِقْبَالٌ عَلَى الْآخِرَة کا بیان ہے، اور اشارہ ہے کہ اگر قیامت میں اپنے درجات کی بلندی چاہتے ہو، تو زیادہ سے زیادہ انفاق فی سبیل اللہ پر گامزن رہو، یعنی دنیا دارالاسباب ودارالعمل ہے۔عمل کا وقت ابھی ہے اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ، خوب کھیتی کرو، کیونکہ تمہاری منزلِ اصلی آخرت ہے، وہاں نہ عمل بکتے ہیں، نہ کوئی آشنائی اور یاری سے کچھ دیتا ہے، اوروں کو چھوڑیئے! ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے، بھی کچھ دینے سے معذرت کرتے ہیں۔معذرت تو کیا دور بھاگتے ہیں، اور تعارف بھی نہیں کراتے ہیں، ساری دوستیاں، آشنائیاں منقطع ہوجائیں گی، اور نہ کسی کی سفارش کام آئے گی۔ نفسی نفسی کا عالم ہوگا، بڑے بڑے بہادر اور شیر دل گھٹنوں کے بل گرتے ہوئے چیخ رہے ہوں گے۔

البتہ! نیکیوں کی پذیرائی ہوگی، اور اعمالِ صالحہ کا راج ہوگا، نصف کھجور کا صدقہ پہاڑوں جتنا بن کر سامنے ہوگا، لہٰذا تمہیں رسولوں کے پاکیزہ نقش قدم پر چلنے کا حکم ہو رہا ہے، کہ لالچ، بخل، غفلت سے باز رہو۔ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق وروزی میں سے کچھ (فرضی زکوٰۃ، نفلی صدقات) ضرور خرچ کرو۔ آج فقراء ومساکین، مجاہدین و مسافروں کی دستگیری کرو، کل بروزِ قیامت تمہاری دستگیری ہوگی، اور مشک وعنبر کے ٹیلوں پر عرشِ الٰہی کے سایہ میں آرام سے بیٹھو، اور شادان وفرحان رہو، پھر پلِ صراط کو بجلی کی طرح عبور کرو۔

یاد رکھو! کافر وناشکر اور ظالم وبے انصاف نہ بنو۔ اپنے اوپر ظلم نہ کرو، اور اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے روزق و روزی کو اسی ذات پاک کی راہ میں خرچ کرو۔ یہی انفاق فی سبیل اللہ تمہارے درجات کی بلندی کا ضامن ہوگا۔ ہے کوئی سننے والا؟ دنیوی پریشانیوں اور آڑے مصیبتوں کے وقت انہی تینوں چیزوں پر اعتماد کر کے لوگ غموں اور پریشانیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یعنی لین دین، دوستی، یاری اور سفارش، مگر قیامت کے دن یہ تینوں میدان حساب وکتاب میں غیر مفید اور بے نتیجہ رہیں گے، اس لئے ان تینوں کی نفی فرمادی۔

البتہ! مؤمنین، مخلصین ومتقین لوگ آپس میں دست وگریبان نہیں ہوں گے، ﴿لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾ [النباء:۳۸] (تو کوئی بول نہ سکے گا، مگر جس کو (خدائے رحمٰن) اجازت بخشے اور اس نے بات بھی درست کہی ہو)۔

اسی طرح ﴿الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ﴾ [الزخرف:٦٧] (جو آپس میں) دوست (ہیں) اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے، مگر پرہیزگار (کہ باہم دوست ہی رہیں گے)۔ مگر بات یہ ہے کہ ایسے مقامات پر پہنچنا کارے دارد (کوئی آسان کام نہیں) اگر وہاں تک کسی کو رسائی کا شوق ہو، تو اسے چاہئے کہ: ﴿أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ﴾ خوب عمل کرے۔ واللہ اعلم

حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہر کافر کو ظالم فرمایا، اور ہر ظالم کو کافر نہیں کہا، نہیں تو ہم تباہ ہو جاتے، کیونکہ ظلم (گناہ) سے کوئی پاک نہیں۔ آگے ایک بہت بڑی عظیم الشان آیت آنے والی ہے۔ دراصل آخرت کی سعادت وکامیابی کی بنیاد صحیح مستند عقیدہ پر ہے، جس کا بیان آیت الکرسی شریف میں ہے، تو فرمایا:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۗ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ایسا ہے (وہ اللہ ہی ہے) کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں، وہ زندہ (جاوداں) ہے۔ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے۔ اس پر نہ کوئی اونگھ طاری ہوتی ہے، نہ نیند، جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اسی کی ملک ہے، ایسا کون ہے (کوئی نہیں) جو اس کی اجازت کے بغیر اس کی جناب میں کسی کی سفارش کرسکے؟ جو کچھ لوگوں کے روبرو ہو رہا ہے، اور جو کچھ ان کے بعد ہونے والا ہے، وہ سب کو جانتا ہے، اور وہ سب اس کے معلومات میں سے کسی شئی کا بھی احاطہ نہیں کرسکتے، مگر ہاں! جس قدر وہ خود چاہے، اس کا تختِ حکومت سب آسمانوں اور زمین پر چھایا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ پر زمین و آسمان کی حفاظت کچھ گراں نہیں گزرتی، اور وہی سب سے برتر اور بزرگ تر ہے ﴿۲۵۵﴾

معارف ومنازل

کھربوں صلوٰۃ وسلام ہوں اس عالی مرتبت، وعظیم المنقبت، وصاحبِ خلق عظیم، وپیغمبر اعظم رسول اکرم نبی اُمی صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ جس پر نازل ہونے والی کتاب کی یہ ایک آیت کریمہ (آیت الکرسی) ساری کائنات، بلکہ آٹھوں جنتوں سے زیادہ قیمتی اور برتر ہے۔ الحمد للہ رب العلمین

آیت الکرسی کے فضائل:

سید کائنات فخر موجودات صلی اللہ علیہ وآلہ وأزواجہ وأصحابہ وأمتہ وسلم نے سید القراء حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے امتحاناً دریافت فرمایا: (ابوالمنذر) بتاؤ! اللہ تعالیٰ کی کتاب کی سب سے زیادہ عظمت والی آیت کونسی ہے؟ میں نے عرض کیا: ﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا، اور فرمایا: لِيَهْنَكَ الْعِلْمُ اَبَا الْمُنْذِرِ ابوالمنذر تمہیں علم مبارک ہو۔ [مسلم، درمنثور، مظھري]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۃ البقرۃ میں ایک آیت ہے، جو تمام آیاتِ قرآن کی سردار ہے، وہ آیت الکرسی ہے، جس گھر میں وہ پڑھی جاتی ہے، شیطان اس گھر سے نکل

جاتا ہے۔[مستدرک حاکم]

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ جب زکوۃ فطر کے مال پر اس کو سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چوکیدار مقرر فرمایا، تو تین رات مسلسل شیطان وہاں آتا رہا، اور مال اٹھاتا رہا۔ آخر میں ہے کہ جب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اسے پکڑ لیا، تو شیطان نے کہا: مجھے چھوڑ دو، میں آپ کو ایک وظیفہ بتا دیتا ہوں، جس سے ہر قسم کی حفاظت ہو جائے گی۔ ''رات کو سوتے وقت جو شخص آیت الکرسی پڑھے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے ایک نگراں مقرر ہوگا''۔ جب حضرت اقدس سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: صَدَقَ وَهُوَ كَذُوبٌ۔ وہ شیطان بڑا جھوٹا ہے، مگر یہ بات اس نے سچ کہی۔[بخاري]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص آیۃ الکرسی اور ﴿حٰمٓ ۚ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ﴾ کی دو آیتیں صبح کو پڑھے گا، وہ شام تک محفوظ رہے گا، اور جو شام کو پڑھے گا، صبح تک محفوظ رہے گا۔[ترمذي، دارمي] ترمذی نے کہا: یہ حدیث غریب ہے۔ حدیث غریب ضعیف نہیں ہوتی ہے، لہٰذا کسی شک میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں غریب احادیث بکثرت موجود ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ آیۃ الکرسی ثواب میں چوتھائی قرآن کریم کی برابر ہے۔[مسند أحمد] اسی طرح حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے منقول ہے کہ قرآن حکیم کی تمام آیتوں کی سردار اور سب سے بڑی عظمت والی آیت آیۃ الکرسی ہے۔[درمنثور]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے روایت کی ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھے گا، اس کو موت کے علاوہ جنت کے داخلہ سے اور کوئی چیز روکنے والی نہ ہوگی، یعنی اس کے دخول سے مانع صرف موت ہے۔ اگر موت رکاوٹ نہ ہوتی، تو وہ جنت میں داخل ہوتا، اور جب اس پر موت آئے گی، تو رکاوٹ دور ہوتے ہی وہ شخص جنت میں داخل ہو جائے گا۔[بيهقي شعب الإيمان، نسائي، ابن حبان، دار قطني، مظهري]

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھے گا، اللہ تعالیٰ اگلی نماز تک اس کا محافظ رہے گا، اور اس کی پابندی صرف نبی کرتا ہے، یا صدیق یا شہید۔[رواه البيهقي في شعب الإيمان]

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رحمت عالم ﷺ سے سنا ہے کہ قرآن کریم میں سب سے بڑی عظمت والی آیت: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ ہے۔

اور سب سے بڑھ کر عدل والی آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ﴾ ہے۔

اور سب سے خوفناک ترین آیت: ﴿فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ﴾ ہے۔

اور سب سے زیادہ امید آفرین آیت: ﴿قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾ ہے۔ [مظهري]

حضرت امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں سب سے امید افزا آیت: ﴿وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ [الضحی:۵] (اور عنقریب آپ کا ربّ آپ کو (بہت کچھ) دے گا تاکہ آپ راضی ہوجائیں) ہے۔ جب یہ آیت اتری تو حضور پرنور ﷺ نے فرمایا: میری رضامندی اس بات پر موقوف ہے کہ میری ساری امت جنت میں داخل ہو، اگر ایک شخص بھی دوزخ میں ہو، تو میں ہرگز راضی نہیں ہوں گا، جب تک اسے جنت میں داخل نہ کراوں گا۔

صحیح بخاری شریف کی روایت میں سورۃالفاتحۃ کو شرف وبرکت اور ہمہ گیر جامع مضامین کے اعتبار سے أعْظَمُ سُوْرَةِ الْقُرْآنِ ،قرآن کریم کی سورتوں میں سب سے عظیم سورۃ کہا گیا ہے، جبکہ صحیح مسلم شریف میں آیت الکرسی کو برکت وفضیلت کے اعتبار سے سب سے بڑی عظیم آیت بتایا گیا ہے۔

آیت الکرسی میں پچاس کلمات ہیں۔کُل دس جملے ہیں، اور گیارہ دلائل پر مشتمل ہے۔خوب غور کریں۔

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ اسم اعظم ہے۔

سنیاسی بیچارے ہزاروں کی تعداد میں سپرد خاک ہوگئے، اور افسوس وارمانوں کے ساتھ زمین میں دفن ہوگئے، نہ شادی، نہ اولاد، نہ گھرانہ، نہ اچھا لباس، اور نہ کوئی قابلِ ذکر خوراک۔ جفاکشی کا یہ عالم کہ رات دن، سردی گرمی، نامساعد حالات میں جان ہزاروں خطرات میں ڈال کر پیدل سفر میں صحراؤں، میدانوں، جنگلوں، بلندوبالا پہاڑوں، اور پرازخطر علاقوں کی زندگی بھر گشت لگا کر نہ جنت کی امید، نہ دوزخ کا خوف، اور نہ ہی کچھ اور۔ صرف ایک تمنا میں زندگیاں، جوانی اور صحت برباد کر کے صحراؤں میں مرگئے، بے گوروکفن جنگلی جانوروں کی غذا بن گئے۔

یہ سب کچھ صرف ایک مطلب کے لئے کہ کیمیا کی بوٹی ہاتھ آئے۔ چند دیگر لوگ دھات، عقاقیر وزہریلی دواؤں کے ذریعہ اس مقصد میں کامیابی کے لئے بڑی جاگیروں سے، بڑے سرمایہ و بے شمار سونے چاندی کی دولت سے ہاتھ دھو بیٹھے، اور ہزاروں ارمانوں کے ساتھ مر گئے، مگر یہ مشکوک مطلب انہیں حاصل نہ ہوا، کیونکہ یہ کوئی آسمانی تحفہ نہ تھا، جس پر صداقت کی مہر لگ چکی ہوتی۔ ؎

کیمیا گر بغصہ مردو برنج ☆ ابلہ اندر خرابہ یافتہ گنج

(شیخ سعدیؒ)

اس کے برعکس اسم اعظم ایک آسمانی صداقت، اور واقعی نفس الامری، بابرکت، عظیم الشان حقیقت کا نام ہے، جس کا براہِ راست حضرت حق وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذاتی کمالات عالیہ کے ساتھ ہے۔ یہ اسم اتنا بابرکت ہے، جتنا کہ اس کا مسمیٰ جل شانہٗ۔ ایسا سمجھو کہ یہ ربّ العلمین عزّ شانہٗ کی طرف سے اپنے عباد وخواص کے لئے ایک تحفہ ہے، یا ایک سربستہ مخفی راز ہے، کہ اس کے ذریعہ عبادُ الرحمٰن کی رسائی حضرت حق سبحانہ تک ممکن اور واقع ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ جن اُخص الخواص کی اس تک رسائی ہے، وہ کسی پر اظہار کرنے سے معذور ہیں، اور ان پر پابندی ہے کہ ایسا نہ ہو کہیں نااہل لوگ اس سے کوئی غیر شرعی غلط مقصد حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اگر صلوٰۃ الوسطیٰ، ساعتِ اجابتِ جمعہ، اور لیلۃ القدر کی تعیین کی شریعت اجازت نہیں دیتی، تو اسم اعظم کی تعیین کے نقصانات ان سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ راہِ صواب یہ ہے کہ جس طرح اعلیٰ سے اعلیٰ درجاتِ قرب پر فائز حضرات اس جہاں میں رؤیتِ باری کی تاب نہیں لاسکتے، اسی طرح اسم اعظم جو کہ اسی ذاتِ اقدس عزّ شانہٗ کا مخصوص نام ہے، وہ بھی اِحاطۂ علم سے باہر رہے گا۔ فقط

اسی وجہ سے اوّل یہ کہ اس کی تعریف میں بھی اختلاف ہے، پھر آیا یہ مفرد ہے یا مرکب؟ یہ بھی اختلافی مسئلہ ہے۔ عربی، سریانی، عبرانی زبانوں میں بھی اختلاف۔ ہر پیغمبر کے لئے الگ ہے یا سب کے لئے ایک ہی ہے؟ یہ بھی مختلف فیہ ہے۔ کیا یہ صرف قرآن حکیم کا حصہ ہے، یا حدیث اور دعواتِ ماثورہ میں بھی ہے؟ پھر کیا اسے انبیاء کرام علیہم السلام ہر وقت پڑھنے پر قدرت رکھتے تھے، یا خصوصی اجازت کا انتظار ہوتا تھا؟ پھر کیا اسم اعظم ہر شخص وہستی کے لئے الگ ہے، یا سب کے لئے ایک؟ یا ہر شخص کے اصلی پیدائشی نام کے کلمات کے ساتھ وابستہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے میں تقریباً اسی (۸۰) اقوال ہیں۔ علماء امت میں اس قدر اختلاف کسی مسئلہ میں

نہیں ہوا، جتنا کہ اسم اعظم اور اس کی تعیین میں ہوا ہے۔ بڑے بڑے محققین حضرات نے اس بارے میں مستقل کتابیں لکھی ہیں، اور تحقیقات کی ہیں۔ ہزاروں دلائل اور بے شمار قرائن پیش کئے ہیں، مگر کسی پیاسے کی پیاس بجھانے میں ناکام رہے ہیں۔ دراصل لوگ اسم اعظم کی تلاش میں ہر وقت مستعد رہے ہیں، مگر انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس کا حاصل کرنے والا ہے کون؟ اس کی زندگی کا حال کیا ہے؟ وہ اسم اعظم کے لئے کیوں پریشان ہے؟ وہ اسم اعظم کو کیوں اور کس کے لئے، اور کس مقصد کے لئے تلاش کررہا ہے؟ تو آئیں! بسم اللہ کریں، اسم اعظم تک رسائی حاصل کریں، وہ یہ ہے:

﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ فقط، مگر یہ طے کریں کہ ہر شرعی عمل کے لئے لازمی شرائط و ضروری لوازمات ہیں۔ کوئی شرعی حکم بغیر شرائط کے نہیں۔ اسم اعظم پڑھنے اور اس کے ذریعہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے درج ذیل شرائط ہیں، غور سے پڑھیں:

(۱) کسی جائز مقصد کے لئے ہو، اگر کسی دوسرے آدمی کے لئے ہو، تو یہ شرط ہے، وہ اہل اور مستحق ہو۔

(۲) پڑھتے وقت پڑھنے والے کے دل پر غیر اللہ کا گزر نہ ہو، اور ارادہ متزلزل نہ ہو۔

(۳) پڑھنے والے کا عقیدہ صحیح ہو، اور اسے کامل و مکمل تزکیہ حاصل ہو، کامل متقی ہو۔

(۴) پڑھنے والے پر کسی کے ایسے حقوق نہ ہوں، جنہیں وہ ادا نہ کیا ہو۔

(۵) حقوق اللہ وحقوق العباد کی ادائیگی کا پابند ہو، اور کسی قسم کی بے عملی نہ ہو۔

(۶) حرام تو حرام ہے، مشکوک مال، ربع درہم تک کا اس کی خوراک لباس اہل وعیال کے پاس گزر نہ ہوا ہو۔

اسم اعظم آپ کے پاس ہے۔ یہ شرائط اپنے اندر پیدا کر کے سیر الیٰ اللہ تک رسائی حاصل کریں۔ اور اسم اعظم سے کسی مقبولیت واعزاز کی توقع نہ رکھیں۔ شہد اچھی غذاء ہے۔ اس میں کسی کو شک نہیں، مگر صفراء اور جگر کے مریض کے موافق نہیں ہے۔

ع چشمہ آفتاب را چہ گناہ......

﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ یعنی عبادت کے قابل اور لائق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، جس میں معبودیت کے تمام اوصاف وکمالات علی وجہ الاتم موجود ہیں۔ معبود وہ ہوتا ہے جسے اپنے عابد کی تمام ضروریات کا علم بھی ہو، اور اس کی ہر حاجت اور مراد برآری پر اسے مکمل قدرت بھی ہو۔ یہ ساری صفات صرف اسی ذات پاک میں موجزن اور موجود

ہیں۔اس کے سوا کائنات میں کوئی دوسرا کسی بھی ادنیٰ سے ادنیٰ عبادت کا مستحق نہیں ہے۔
پہلی بات تو یہ مسلم ہے کہ مخلوق عبادت کی ہرگز مستحق نہیں ہے۔
دوم یہ کہ مخلوق محتاج ہے،اور محتاج کسی کے احتیاج دور کرنے پر قادر نہیں ہے۔
تیسری بات یہ ہے کہ بے جان پتھر ہو یا کوئی جاندار ہو، وہ دوسروں کی حاجت برآری کیا کرے گا؟ وہ اپنی موت وحیات کا مالک نہیں ہوتا، اور اپنی حاجتوں کے لئے اللہ تعالیٰ کا دستِ نگر اور محتاج رہتا ہے۔اسی کی ذات ابدی ازلی ہے۔اس کی حیات ذاتی ہے، ﴿هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ [الحدید: ٣] (وہ (سب سے) پہلا اور (سب سے) پچھلا، اور (اپنی قدرتوں سے سب پر) ظاہر، اور (اپنی ذات سے) پوشیدہ ہے، اور وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے)۔
﴿اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ وہ موصوف بصفۃِ الحیات، ہمیشہ سے ہے، اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کی صفات اس کی ذات کی طرح ازلی اور ابدی ہیں۔ یہی حیات اس کی تمام صفات کا سرچشمہ ہے ﴿اَلْقَیُّوْمُ﴾ مخلوقات کو تھامنے والا، منتظم، نگہبان، نگران، سرپرست، غیرفانی، یہ سب قیوم کے معنی ہیں۔حضرت سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور معنی کا اضافہ کیا، فرمایا: اَلْقَیُّوْمُ اَلْمُدَبِّرُ۔ یعنی مخلوق کی تدبیر کرنے والا، اور ہمیشہ باقی رہنے والا، کیونکہ وہ ذات پاک لازوال ہے، بذات خود موجود ہے۔فارسی میں اسی کا ترجمہ ہے "خدا"۔تمام کائنات کا ذرّہ ذرّہ اس کی ذات اور قیومیت کی محتاج ہے۔اس کی نگہداشت کے بغیر کسی چیز کی بقاء اور ہستی کا تصور نہیں ہوسکتا۔
مطلب یہ ہے کہ ہر چیز اپنے وجود اور بقاء میں اس کی محتاج ہے، جس طرح سایہ اپنے اصل کا محتاج ہوتا ہے۔ ﴿وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ [الروم: ٢٧] (اور آسمانوں اور زمین میں اس کی شان بہت بلند ہے۔) اور ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [الشوری: ١١] (اس جیسی کوئی چیز نہیں)۔
﴿لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ﴾ جس طرح وہ صفاتِ ثبوتیہ سے موصوف بالذات ہے، اسی طرح صفاتِ سلبیہ جلالیہ سے بھی موصوف بالذات ہے، یعنی اس کو نہ اونگھ آتی ہے، نہ نیند۔ یہ اونگھ اور نیند ذوات الارواح اور ذوات الاجسام اور مخلوقات کے ساتھ مخصوص ہے، جبکہ ربّ العزّت جسم وجسامت، ہر چیز سے پاک ہے، نیز اونگھ اور نیند ایک غفلت اور تعطّل کا نام ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ ایسے تمام نقائص سے پاک ہے۔
پچھلے جملے ﴿اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ نے جب یہ واضح کیا کہ ساری کائنات بشمول جمیع علویات وسفلیات کا

انتظام کرنے والا اور تھامنے والا شاید تھکاوٹ محسوس کرے، اور اسے آرام کی ضرورت ہو، تو محدود علم و ذہنیت اور محدود بصیرت رکھنے والوں کو تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾، الغرض! جسم و جسمانیات اور تمام جسمانی عوارض و خواص سے حق تعالیٰ شانہ مُنزَّہ اور پاک ہے۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نیند موت کی بہن ہے، اور جس کسی کو اونگھ یا نیند آتی ہے، اس کا بیرونی نظام زندگی معطل ہوجاتا ہے، وہ نیند کے دوران اشیاء کی حفاظت اور نگہداشت سے قاصر رہتا ہے۔ اسی خاطر ﴿اَلْقَیُّوْمُ اور لَا تَأْخُذُهٗ﴾ کے درمیان حرفِ عطف نہیں لایا گیا، کیونکہ حرف عطف مغایرت پر دلالت کرتا ہے، اور یہاں اونگھ اور نیند کا فقدان قیومیت کی دلیل ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمارے مجمع میں کھڑے ہوکر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانچ باتیں ارشاد فرمائیں: فرمایا کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نہیں سوتا، اور سونا اس کے لئے زیبا نہیں ہے، اور وہ میزان کو اوپر نیچے کرتا ہے۔ اس کے سامنے رات کے اعمال دن کے اعمال سے پہلے لائے جاتے ہیں، اور دن کے اعمال کی پیشی رات کے اعمال (آنے) سے پہلے ہوجاتی ہے، اور اس کا حجاب نور ہے۔ اگر پردۂ نور الٹ جائے، تو اس کے انوار جمال حد نگاہ تک مخلوق کو جلا کر بھسم کردے۔ [مسلم]

﴿لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾، "لام" تملیک کے لئے ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [الشوریٰ: ۴۹] آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کی ملکیت ہے۔ یہ جملہ اللہ تعالیٰ کی قَیومِیَة کی تائید اور توحید الُوهِیَة کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان کی حقیقت کا جن اجزاء سے قوام و ترکیب ہے، یا وہ اجزاء جو قوامِ عالم کی قوامی اجزاء تو نہیں ہیں، مگر ان کے اندر موجود ہیں، سب کے سب اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں۔ اگر ﴿لَهُ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَافِیْهِنَّ﴾ کہا جاتا، تو مفہومِ مذکور اس سے پورا ادا نہیں ہوجاتا۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ (اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور میں کون سفارش کر سکتا ہے؟) یہ عظمتِ خداوندی کا اظہار ہے، کہ وہ مختارِ کُل اور پورے عالم کا حکمران و بادشاہ ہے، اور اس کا ہمسر و برابر کوئی نہیں ہے، کہ از خود کوئی سفارش کرکے عذاب دور کرے۔ مقابلہ کرکے عذاب کو روک دینے کا تو ذکر ہی کیا ہے؟

مشرکین اپنے معبودانِ باطلہ کو شفاعت کنندہ کہتے تھے: ﴿هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [یونس: ۱۸]

(یہ بت ہماری سفارش کرنے والے ہیں اللہ کے یہاں)۔ اسی طرح ہمارے زمانہ کے جاہل پیر پرست بھی اپنے پیروں کے متعلق عقیدہ رکھتے ہیں۔ دراصل یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی عظمت سے واقف نہیں، وہ اس کے جلال کے منکر ہیں، تب تو یہ کچھ کہتے رہتے ہیں۔

البتہ! اگر وہ محض اپنے فضل وکرم سے اپنے مخصوص مقرّب بندوں کو صرف شفاعت کی اجازت دیدے تو یہ ممکن ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: ﴿يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾ [النباء:۳۸] (جس دن روح (الامین) اور فرشتے صف باندھ کر کھڑے ہوں گے، تو کوئی بول نہ سکے گا، مگر جس کو (خدائے رحمٰن) اجازت بخشے، اور اس نے بات بھی درست کہی ہو)۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ محشر میں اللہ ربّ العزّت کی خدمت میں شفاعت کے لئے درخواست کروں گا، جب اجازت مل جائے گی، تب عرشِ الٰہی کے نیچے سجدہ ریز ہوکر شفاعت کروں گا۔ [متفق علیہ]

﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے آگے پیچھے کے تمام حالات و واقعات کو جانتا ہے۔ یہ جملہ اپنے عمومی معنی کے اعتبار سے نہایت جامع ہے، یعنی تمہاری پیدائش سے پہلے کے حالات، اور بعد کے واقعات، سب سے باخبر ہے، یا یہ کہ جو کچھ تمہارے ظاہری حالات ہیں، یا مخفی حالات، وہ سب اس کے علم میں ہیں، یا یہ کہ تم جو کچھ ماضی میں کر چکے، اور جو کچھ مستقبل میں کرنا چاہتے ہو، وہ علیم بذات الصدور سب سے باخبر ہے، اس کا علم محیط، کائنات کے تمام ذرّات پر، ساتوں سمندروں کے اندر کی اشیاء تک احاطہ کیا ہوا ہے۔

﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ﴾ (کائنات کے تمام افراد اور اہلِ علم، اللہ تعالیٰ کے علم کے کسی بھی حصہ کا احاطہ نہیں کر سکتے) جس طرح وہ ذات میں لاشریک ہے، اسی طرح اس کے علمِ کلّی میں بھی کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے، تمام کائنات کے علوم اس کے دیئے ہوئے ہیں، ﴿وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ [الإسراء: ۸۵] (اور تم کو نہیں دیا گیا ہے مگر تھوڑا سا علم) وہ سارے علوم مل کر اس کے علم کے ایک ادنیٰ حصہ کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے۔ یہ علمِ محیط اس کی خصوصیت ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار تھے۔ کشتی کے کنارہ پر ایک چڑیا آکر بیٹھ گئی، اور دریا میں چونچ لگا کر پانی کا قطرہ اٹھایا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تیرا اور میرا علم (بلکہ پورے عالم کا علم) اللہ تعالیٰ کے علم (سمندر جیسے) کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسے سمندر کے مقابلہ میں چڑیا کا وہ ایک قطرہ ہے۔

[بخاري]

صرف یہ تمثیل ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے علم کو سمندر کہنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ سمندر باوجود اپنی وسعت کے پھر بھی محدود ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ سبحانہ کا علم لامتناہی، اور غیر محدود ہے۔

﴿إِلَّا بِمَا شَاءَ﴾ ہاں! جس چیز کا علم اللہ تعالیٰ دینا چاہے، تو اس چیز پر مخلوق کا علم ایک حد تک محیط ہو سکتا ہے، اور یہ نہایت غریب ہے (نادر ہے)۔ بعض اشیاء مثلاً جمادات، نباتات، پھل، حیوانات، جن پر ہر زمانہ میں ماہرین نے تحقیقات کی ہیں، اور کرتے رہے ہیں۔ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ایک ایک چیز کے سینکڑوں خواص معلوم کر رہے ہیں، مگر احاطہ کسی چیز کے خواص کا پھر بھی طوقِ بشر سے خارج اور غیر ممکن ہے۔ واللہ اعلم

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ﴾ (اس کی کرسی آسمانوں اور زمینوں کو اپنے اندر سمائے ہوئے ہے)۔ مفسر بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ محض تمثیل ہے، اللہ تعالیٰ کی عظمت کی صرف تصویر کشی مقصود ہے، ورنہ واقع میں نہ اللہ تعالیٰ کے لئے کرسی ہے، اور نہ وہ کرسی پر جلوہ گر ہے۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کرسی سے مراد علم ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا۔ صحیفۂ علمی کو کراسہ اسی وجہ سے کہتے ہیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ کرسی سے مراد حکومت اور اقتدار ہے، اسی بناء پر موروثی حکومت کو عرب ''کرس'' کہتے ہیں۔

محدثین حضرات کا مشہور قول یہ ہے کہ کرسی ایک جسم ہے (آسمانوں کی طرح) جس میں لمبائی چوڑائی اور موٹائی ہے، جیسے سارے اجسام اور ان کے ابعاد ثلاثہ (طول عرض عمق)۔ مفسر محی السنۃ بغوی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ کرسی کے مصداق میں علماء کرام کا اختلاف ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ کرسی ہی عرش ہے۔

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ کرسی عرش کے سامنے قائم ہے، اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ کرسی کی وسعت آسمانوں اور زمین کی وسعت کے برابر ہے۔ حضرت ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی روایت سے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل کیا ہے کہ ساتوں آسمان، اور ساتوں زمینیں کرسی کے مقابلہ میں ایسی ہیں جیسے کسی بیابان میں (بڑے میدان میں) کوئی حلقہ انگشتری پڑا ہوا ہو۔ [ابن کثیر] اور کرسی سے عرش کی بڑائی بھی ایسی ہے جیسے انگشتری سے میدان کی بڑائی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ کرسی کے اندر ساتوں آسمان ایسے ہیں جیسے کسی ڈھال میں سات درہم ڈال دئے جائیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ کرسی کے ہر پایہ کا طول ساتوں آسمانوں

اور ساتوں زمینوں کے برابر ہے۔ کرسی عرش کے سامنے ہے، جس کو چار فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں۔ ہر فرشتے کے چار منہ ہیں۔ ان فرشتوں کے قدم ساتوں نچلی زمین کے نیچے پتھر پر ہیں۔ یہ مسافت پانچ سو برس کی راہ کے برابر ہے۔

پہلے فرشتہ کی شکل ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی طرح ہے، جو سال بھر آدمیوں کے لئے رزق کی دعاء کرتا رہتا ہے۔ دوسرے فرشتے کی شکل چوپایوں کے سردار، یعنی بیل کی طرح ہے، سال بھر چوپایوں کے لئے رزق کی دعا کرتا رہتا ہے۔ لیکن جب سے بنی اسرائیل نے گوسالہ کی عبادت شروع کی، اس وقت سے اس کے چہرے پر کچھ خراشیں پیدا ہوگئیں۔ تیسرے فرشتے کی صورت درندوں کے سردار شیر کی طرح ہے، جو سال بھر درندوں کے لئے رزق کا طالب رہتا ہے۔ چوتھے فرشتے کی صورت پرندوں کے سردار، یعنی گدھ کی طرح ہے، جو سال بھر پرندوں کے لئے رزق کا سوال کرتا رہتا ہے۔

بعض احادیث میں آیا ہے کہ حاملینِ عرش اور حاملینِ کرسی کے درمیان ستر حجاب تاریکی کے، اور ستر حجاب نور کے ہیں، اور ہر حجاب کی موٹائی پانچ سو برس کی مسافت کے برابر ہے۔ اگر یہ حجابات نہ ہوں تو کرسی کے اٹھانے والے، عرش کے اٹھانے والوں کے نور سے سوختہ (راکھ) ہوجائیں۔ اصل میں کرسی صرف اتنی ہی جگہ کو کہتے ہیں، جس پر بیٹھا جاتا ہے، نشست گاہ سے فاضل جگہ کو کرسی نہیں کہا جاتا، گویا لفظ کرسی ''کرس'' سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں: ''کسی چیز کے اجزاء کو باہم جوڑ دینا''۔ کرسی عرش اور بیت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیزیں ایک خاص قسم کے جلوۂ الٰہی کے لئے مخصوص ہیں۔

عرش کی شکل کا کروی ہونا، اور اس کا آسمانوں پر محیط ہونا حدیث سے مستنبط ہے۔ لیکن اس جگہ پر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایتِ مذکورہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ کرسی آسمانوں کو محیط ہے، اور عرش کرسی کو گھیرے ہوئے ہے، اور بعض آسمان بعض کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اس قول کا تقاضا ہے کہ ہر آسمان بھی کروی ہو، (اسی لئے بعض لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ آٹھواں آسمان کرسی ہے، اور نواں آسمان عرش ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے جو آسمانوں کی تعداد سات بتائی ہے، اور عرش و کرسی کا شمار آسمانوں میں نہیں کیا، اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ دوسرے آسمانوں سے عرش و کرسی کی ماہیت جدا ہے، اور خاص تجلیات کے لحاظ سے ان کو دوسرے آسمانوں سے امتیاز حاصل ہے)۔

یہ نہایت غیر صحیح رکیک قول ہے، اور ساقط الاعتبار ہے، **كما يجني**۔ اور ہیئتِ قدیم کے یونانی اور مصری علماء کہتے تھے، جیسا کہ سبع شداد اور شرح چغمینی وغیرہ کتب میں مذکور ہے کہ مجموعۂ عالم کی شکل کروی ہے، گویا یہ کائنات

ایک پیاز کی گانٹھ ہے، جس کے تیرہ پرت ہیں، اور ہر چھلکا اپنے اندونی چھلکوں کو محیط ہے۔ پھر سب کو محیط فلک الافلاک یافلکِ اُطلس ہے۔اس کے اندر فلکِ ثوابت ہے۔اس کے نیچے فلکِ زحل، پھر فلکِ مشتری، پھر فلکِ مریخ ، پھر فلکِ شمس، پھر فلکِ زہرہ، پھر فلکِ عطارد، پھر فلکِ قمر۔گویافلکِ قمر فلکِ دنیا ہے، اور ہمارے جانب سب سے اول یہی ہے، اور آخری انتہائی نواں آسمان فلک الافلاک ہے۔فلکِ قمر کے نیچے کرۂ نار ہے، اور کرۂ نار کے نیچے کرۂ ہوا ہے۔کرۂ ہوا کے نیچے پانی ہے، پانی کے نیچے زمین ہے، یہی زمین مرکزِ عالم ہے۔

قدیم علماءِ ہیئت، افلاک کوتہہ بہ تہہ محیط مانتے تھے۔قرآن مجید اور احادیثِ مقدسہ میں عرش، کرسی اور سبع سموات کے الفاظ آئے ہیں۔سبع سموات کے ساتھ طبقات کالفظ بھی مذکور ہے۔بعض علماءِ اسلام نے یونانی ہیئت و فلسفہ کی صداقت تسلیم کرنے میں اتناغلوکیا کہ قرآن کریم کی عبارت کوبھی اس کے مطابق بنانے کی مکروہ کوشش کی۔کچھ احادیث کے اشارات یاصراحتوں کواپنے مطلب کی تائید میں لے آئے۔فَضَلُّوْا وَ أَضَلُّوْا

انہوں نے عرش کونواں، اور کرسی کوآٹھواں آسمان بنادیا۔''طباقاً'' کاترجمہ تہہ بہ تہہ کردیا۔عرش وکرسی کو الگ ذکر کرنے کی وجہ ماہیات کے امتیاز، اور خصوصی تجلیات کی بارش کوقرار دیا۔لیکن فلسفۂ قدیم تو آسمانوں کوازلی، ابدی اور قدیم بالغیر کہتا ہے، اور عمر میں اللہ تعالیٰ کے برابر قرار دیتا ہے، اور ان کا پھٹنا اور جوڑا جانا (خرق والتیام) محال سمجھتا ہے(جوکہ کفر ہے)۔ بلکہ مادۂ عناصر کوبھی لازوال کہتا ہے، اور زمانہ کوبھی حادث نہیں مانتا۔فلسفہ کا وہ کونسا عقیدہ اور فکر ہے جوقرآنی صراحت یاحدیث کی عبارت سے جوڑ کھاسکتا ہے؟ پھر صرف ترتیبِ عالم کے سلسلہ میں قرآنی صراحت، اور وحی غیر منطوق کی عبارت کوہیئتِ قدیم کے مطابق بنانے کی کوشش مہلک نہیں تواور کیا ہے؟ کیا یہ تفسیر بالرائے نہیں ہے؟

اگر فلسفہ اور ہیئت کوقرآن کے مطابق بنانے کی کوشش کی جاتی، توپھر بھی یہ کاوش قابلِ برداشت ہوتی۔ سودمند تو نہ ہوتی، لیکن تباہ کن بھی نہیں ہوتی۔مگر قرآن کوتوڑنا مروڑنا، اور بے مزہ تاویلیں کرکے فلسفہ سے جوڑنا تو قرآن کوبازیچۂ حکماء بنادے گا۔کسی بھی فلسفہ کواٹل صداقت کا حامل قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ یہ عقل پر مبنی ہے، اور عقل کسی بھی چیز کے لئے حرفِ آخر نہیں ہے۔ہر شخص کی عقل الگ ہے۔دنیا میں جتنے انسان، اتنی عقول ہیں۔اگر عقل معرفت حقائق اشیاء کے لئے کافی اور کارگر ہوتی، تووحی الٰہی کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔عقل والوں نے دنیا میں اتنی ٹھوکریں کھائیں کہ ایک ہی حقیقت کی پہچان میں بیسیوں خیالات پیش کئے۔وہ وحی الٰہی ہے کہ ان کی پیش کردہ متضاد

خیالات کی گتھیوں کو سلجھایا، اور ان کی صحیح راہنمائی کی۔

یونانی حکماء دہریہ گزرے ہیں۔ فیثاغورث سرے سے آسمانوں کا منکر ہے۔ ارسطو اور دیگر آسمانوں کو نہیں مانتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک نے تیس آسمانوں کا قول کیا ہے۔ ان کے ہم مشرب نصیر الدین طوسی شیعی چوبیس آسمانوں کا قائل ہے۔ مزید تفصیل آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

قرآن حکیم جس طرح اپنے نظم وکلام منطوق کے اعتبار سے معجز ہے، اسی طرح کائنات کے تمام امور اور حقائق کے بیان کرنے، اور ان کی مدوجزر پر تنبیہ کرنے کے اندازِ بیان پر بھی معجز ہے۔ ﴿اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیفُ الۡخَبِیرُ﴾ [الملک: ۱۴] (کیا جس نے پیدا کیا وہ نہیں جانتا؟ حالانکہ وہ بہت باریک بین، مکمل باخبر ہے)۔ جس ذات عالی صفات عزّ مجدہٗ نے اپنی قدرت کاملہ سے کائنات کو پیدا فرمایا، وہی اس کے حقائق ورموز کے بیان کرنے میں صادق ہے۔ یہ بیچارہ انسان حقائق کی پہچان تو کیا، اپنی حقیقت، اور اپنے نفس کی پہچان سے بھی عاجز ہے۔

ایک فلسفی دوسرے کی تکذیب کرتا ہے، جبکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں نے جن کے زمانے مختلف، اقوام وامم مختلف، زبان ولغت مختلف، علاقے مختلف، اس کے باوجود ان کے فرمودات، خیالات، آراء، وبیانات میں ذرّہ بھر اختلاف نہیں ہے۔ انہوں نے کبھی اپنے سے پیشرو پیغمبر کی کسی قسم کی تکذیب نہیں کی، بلکہ ہر آنے والے نے اپنے سے پہلے پیغمبر کی تصدیق کی، کیونکہ منبع وسرچشمہ سب کا وہی ایک رہا، یعنی وحی الٰہی، اور تلقی من اللہ تعالیٰ بواسطۂ الہام، یا بواسطۂ مَلَک مُقرّب حضرت جبریل امین علیہ السلام۔

یہاں تو یہ حال ہے کہ ہر فلسفی دوسرے کی محض تکذیب نہیں، بلکہ اسے گمراہ قرار دیتا ہے، اور جدید، قدیم کو داستانِ پارینہ قرار دیتا ہے۔ موجودہ سائنس افلاک کو محیط مانتی ہی نہیں۔ سات آسمان نہیں دس کروڑ آسمان کہتی ہے۔ زمینوں کو تیس کروڑ بتاتی ہے۔ وہ کہتی ہے چالیس کروڑ گیندیں خلاء میں فطری ضابطۂ جذب کے زیر اثر معلق ہیں۔ کوئی اونچی، کوئی نیچی دکھائی دیتی ہے۔ واقع میں نہ کوئی اوپر ہے، نہ نیچے، کوئی منتہیٰ ہی نہیں۔ پھر تحت اور فوق کا حقیقۃً تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ ہر کرّہ کا دوسرے کرّہ سے فاصلہ لاکھوں کروڑوں میل، بلکہ بعض کا فاصلہ تو ناقابلِ احاطہ ہے۔ اس کا حساب کرنے سے علمِ حساب عاجز ہے۔ کوئی کرّہ اتنا چھوٹا ہے کہ ہمارے ایک دن رات میں اس کی دَوری حرکت پوری ہوجاتی ہے۔ کوئی اتنا بڑا ہے کہ اس کی دَوری حرکت ہمارے پچیس یا پچاس ہزار سال میں پوری ہوجاتی ہے۔

یہ ساری فضا مادۂ سیال یا چمکدار برقیات سے بھری ہوئی ہے۔ ہر کرّہ اپنے محور پر گھوم رہا ہے، زمین بھی گھوم رہی ہے۔ بڑے بڑے یہی سات سیارے ہیں: چاند، سورج، مریخ، زحل، مشتری، عطارد، زہرہ۔ باقی سیاروں کی کامل شناخت آلات اور مراصد پر موقوف ہے۔ چالیس کروڑ کرّوں میں بھی کائنات کا حصر نہیں ہے۔ یہ آخری گنتی نہیں ہے، جتنا معلوم ہوا ہے، وہ بہت قلیل حصہ ہے۔ خدا جانے نامعلوم کتنا حصہ ہے، اور کتنا باقی ہے؟

کیا سائنس کے یہ مسلّمات غلط ہیں؟ ممکن ہے کچھ وہم کی کارپردازی ہو، کچھ حقیقتِ ثابتہ ہو، جس زمانہ میں جس فلسفہ نے جو کچھ کہا، صحیح سمجھ کر ہی کہا۔ فلسفہ کا ردوبدل یونہی ہوتا رہے گا، اور ہوتا رہا ہے، لیکن حقیقتِ قرآنیہ اپنی جگہ ثابت ہے، اور ناقابلِ تغیر ہے۔ فلسفۂ قدیم یا تحقیقاتِ جدیدہ کے موافق بنانے کے لئے آیات واحادیث میں تاویل کرنا، یا انہیں رد کرنا مذہبی افلاس کا ثبوت، اور عقلی دہشت زدگی کی علامت ہے۔ قرآن حکیم میں ﴿سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ﴾ کلمہ حصر کے لئے نہیں ہے، کہ زیادتی کا انکار کیا جائے، نہ مزید کی کوئی خاص شمار بتائی ہے کہ تعداد کو محدود کیا جائے۔ ''طبقاً'' کا ترجمہ تہہ بہ تہہ محض احتمالی ہے، احتمال سے تعیین نہیں ہوتی۔

﴿طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ﴾ کا ترجمہ تہہ بہ تہہ نہیں، بلکہ درجہ بدرجہ ہے۔ ''طبقًا'' کا بھی ترجمہ درجہ بدرجہ ہوسکتا ہے، اور یہ ترتیبِ درجات بھی اضافی اور عرفی ہے۔ حقیقی فوق وتحت کو تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے۔ غیر مجازی اشیاء میں زیروزبر اور پست وبالا کا تصور، بلکہ وقوع ہوسکتا ہے، اور ہوتا ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ احاطہ کا قول غلط ہو، اور تاثیرِ جذب کے زیرِ اثر تمام کرّوی اجسام جدا جدا معلق ہوں۔ حدیثِ معراج میں ایک آسمان کا دوسرے آسمان سے فاصلہ پانچ سو برس کی راہ کے برابر بتایا گیا ہے۔ اگر یہ طبقاً کے لفظ کے منافی نہیں ہے، تو پھر تمام کرات کو جدا جدا اور درجہ بدرجہ قرار دینا کیوں طبقاً کے مفہوم کے خلاف قرار دیا جاسکتا ہے؟

حضرت ابوذر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کی روایت سے بھی احاطۂ کرسی صراحۃً ثابت ہوتا ہے، نہ استنباطاً، کیونکہ اس میں عظمتِ کرسی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ دوسرے آسمانوں کو کرسی کے مقابلہ میں اتنا چھوٹا دکھایا گیا ہے، جیسے ڈھال کے اندر سات درہم، یا صحراء میں ایک انگشتری۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کرسی سمٰوٰت کو محیط ہے، لیکن یہ احاطہ محتاجِ تاویل ہے۔ جسمانی احاطہ ہے یا اقتدار وحکم کا احاطہ؟ یا عظمت وبزرگی کا احاطہ؟ کوئی تعیین از خود نہیں کی جاسکتی، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو محیط ہے، کیا یہ احاطہ جسمانی ہے یا قدرت وحکمت اور علم کا احاطہ ہے، یا حکم اور اقتدار کا احاطہ ہے؟ اہل ایمان کے قلوب کا بَیۡنَ اِصۡبَعَیۡنِ مِنۡ اَصَابِعِ الرَّحۡمٰنِ میں ہونے کا کیا قلوب کے جسمانی

احاطہ پر دلالت کرتا ہے؟

پھر وسعتِ کرسی کو جسمانی جوف سے تعبیر کرنا، اور فلکِ ہشتم (کرسی) کو ہر طرف سے سمٰوات کو محیط ماننا، یہ فلسفۂ قدیم سے شکست خوردگی کی علامت نہیں تو اور کیا ہے؟ حالانکہ فلسفۂ قدیم کے تمام اصول ونظریات کو اندلس کے محقق علماء سائنسدانوں نے حرف بحرف غلط ثابت کر کے انہیں مکمل رد فرمایا، اور قدیم فلسفہ کو کلًا وجزءًا قرآنی اصول کے خلاف قرار دیا۔ اپنے اسلامی جدید فلسفۂ قرآنی پر اتنے اہم اور قیمتی تحقیقات کئے، جس کی نظیر نہیں ہے۔ آج یورپ جس فلسفہ پر نازاں ہے، اور اس کی سائنسی تحقیقات اور ایجادات کی چاردانگِ عالم میں شہرت ہے، یہ فلسفہ مسلمانانِ اندلس کی ایجاد ہے، جسے سقوطِ اندلس کے بعد مغرب نے اپنایا، اور حاصل کیا۔ میں نے سورۃ الملک کے تفسیری فوائد میں اس پر مختصر کلام کیا ہے، وہاں دیکھا جائے۔

پس صحیح مسلک اور بے گرد وغبار بات یہ ہے کہ قرآن حکیم اور احادیث مقدسہ کی صراحتوں میں کوئی ایسی تاویل اور تعیین، اور خواہ مخواہ ایسی کوئی استنباط نہ کی جائے، جس کا مقصود ہی فلسفہ سے تطبیق ہو۔ ہاں! اگر کوئی فلسفہ، قرآنی فلسفہ، اور صراحتوں کی تائید کر رہا ہو، تو اس کو قرآنی علوم وحقائق، اور فلسفہ کی گواہی میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے سینکڑوں مسائل ایسے ہیں کہ قرآن وحدیث نے جو کہا، اور بیان فرمایا، جدید فلسفہ نے مکمل اس کی تائید کی، جیسے ﴿نُطۡفَةٍ أَمۡشَاجٍ﴾ [الإنسان: ۲] یا بچوں کیذکورت وانوثت، یا سورِ کلب کے متعلق، یا جانور کی شرعی ذبح وغیرہ۔ (یہ مضمون سائنس اور فلسفہ وریاضی اور حکمت سب پر مبنی ہے)۔

﴿وَلَا يَـُٔودُهُۥ حِفۡظُهُمَا﴾ یعنی آسمان وزمین یا کرسی اور کرسی کے اندر سمائی ہوئی چیزوں کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ پر بار (گرانی) نہیں پڑتا، اور ان کے (بشمول پوری کائنات) کی نگہداشت اللہ تعالیٰ کو تھکا نہیں دیتی۔ یہ اور اس سے پہلے جملہ اللہ تعالیٰ کی علمی وسعت اور اس کی عمومی واقفیت کی ہمہ گیری کا بیان ہے، یا مرتبۂ خداوندی کی عظمت وجلال، اور اس کی قیومیتِ محیطہ کا اظہار ہے۔ یہاں ہر جملہ اپنے مفید معنی کے علاوہ تقریبًا سابق جملہ کی تاکید اور توضیح ہے۔

آیت الکرسی شریف ایک ہی آیت ہے، جو دس جملوں پر مشتمل ہے، اگر کوئی ہر جملہ پر وقف کرنا چاہے، تو بہتر ہے۔

﴿وَهُوَ ٱلۡعَلِيُّ ٱلۡعَظِيمُ﴾ اللہ تعالیٰ ہر مثل اور نظیر سے برتر وبالا ہے۔ کوئی کسی بھی طور پر اس کی طرح

نہیں ہے، نہ ذات کے لحاظ سے، اور نہ ہی اوصاف کے لحاظ سے۔ تعریف کرنے والے اس کی تعریف کرتے ہیں، اور بیان کرنے والے اس کے اوصاف بیان کرتے ہیں، لیکن وہ ہر تعریف اور بیان سے بلند و بالا ہے، اس کی شان وہی ہے جو اسی کے لئے زیبا ہے۔

﴿الْعَظِيْمُ﴾ وہ اتنی عظمت والا ہے کہ تمام کائنات اس کے مقابلہ میں بے مقدار و ہیچ ہے۔

آیت الکرسی کا مجرب عمل:

اگر کوئی آیت الکرسی کا عامل بننا چاہے، اور اس کی دعائیں قبول ہوں، ظاہری و باطنی اور غیبی فتوحات اس کی طرف متوجہ ہوں، تو چاہئے کہ نوچندی جمعرات کو روزہ رکھے، اور عمل شروع کرے۔ چالیس روز تک بلا ناغہ آیت الکرسی کی تلاوت جاری رکھے، مغرب کے بعد سے طلوعِ فجر تک عمل کرے۔ مکان صاف ہو، بدن، کپڑے اور فرش صاف ستھرے ہوں۔ سر پر پگڑی، ٹوپی، رومال وغیرہ کچھ بھی نہ ہو، ننگے سر تلاوت کرے۔ جس کمرے میں تلاوت کر رہا ہو، اس میں کوئی دوسرا نہ ہو، تنہائی میں کمرے کی روشنی تیز نہ ہو۔

پہلے دو رکعت نماز ادا کرے، پہلی رکعت میں آیت الکرسی اور سورۃ اخلاص تین تین مرتبہ پڑھے۔ دوسری رکعت میں سورۃ الحشر کی آخری چار آیت، اور سورۃ اخلاص تین تین مرتبہ پڑھے۔ سلام پھیرنے کے بعد کسی قسم کی کوئی بات نہ کرے، سات مرتبہ درود شریف پڑھ کر یَاحَلِیْمُ یَاعَلِیْمُ یَاعَلِیُّ یَاعَظِیْمُ چاروں اسماء حسنیٰ اکتالیس مرتبہ پڑھے، پھر استعاذہ و تسمیہ پڑھ کر آیت الکرسی شروع کرے، ہر مرتبہ ﴿وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا﴾ کا تین مرتبہ تکرار کرے۔ اسی طرح ایک سو ایک مرتبہ پڑھ کر ختم کرے، اور دوبارہ انہی چاروں اسماء حسنیٰ کو حسبِ سابق اکتالیس مرتبہ پڑھ کر آخر میں سات مرتبہ پہلے کی طرح درود شریف پڑھ کر فارغ ہو جائے۔ اس اثناء میں ہر فرض نماز کے بعد ایک مرتبہ آیت الکرسی کا ورد جاری رکھے۔ چالیس روز پورا ہونے پر عمل مکمل ہو جائے گا، اس کے بعد نمازوں کے بعد والا عمل زندگی بھر جاری رکھے، اور سوتے وقت تین مرتبہ تلاوت ہمیشہ جاری رکھے۔ بس عمل مکمل ہو گیا، پھر ہر مقصد کے لئے جیسے چاہے پڑھا کرے۔

ع داد یم ترا ز گنج مقصود نشان......

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ
فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾ اَللّٰهُ وَلِيُّ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ
يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾ ع

ترجمہ: دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں، یقیناً ہدایت کی راہ گمراہی سے نمایاں اور ممتاز ہو چکی ہے، پس جس شخص نے تمام معبودانِ باطلہ کا انکار کیا، اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا، تو اس نے ایک ایسا مضبوط حلقہ پکڑ لیا، جس کو کبھی ٹوٹنا نہیں، اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا، جاننے والا ہے ﴿۲۵۶﴾ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا ساتھی اور مددگار ہے، جو اہل ایمان ہیں، ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے، اور جو لوگ منکر ہیں، ان کے دوست شیاطین ہیں، جو ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں، یہ سب لوگ اہل جہنم ہیں وہ اس جہنم میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۲۵۷﴾

معارف ومنازل

قبل از اسلام انصارِ مدینہ کی عورتیں جب اولاد کی تمنا کرتیں تو منت مانتیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں بیٹا عطا کیا، تو وہ اسے یہودی بنائیں گی، چنانچہ پھر وہ ایسا ہی کرتیں، جس کی وجہ سے ان کے کئی بچے یہودیوں کی تحویل میں چلے گئے۔ جب اسلام آیا، تو ان کے بہت سے بچے بنونضیر کے پاس تھے، جب بنونضیر کو مدینہ بدر کیا گیا، تو وہ لڑکے بھی ان کے ساتھ جا رہے تھے، اس وقت انصارِ مدینہ کی خواہش ہوئی کہ اسلام میں زبردستی سے اپنے بچوں کو داخل کر کے یہودیوں کے ساتھ جانے سے روک لیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [ابن کثیر]

اسی طرح حضرت ابوحصین رضی اللہ عنہ کے چار بیٹے تھے، ان میں سے دو مسلمان تھے، اور دو عیسائی یا یہودی تھے۔ ایک روز انہیں خیال پیدا ہوا کہ وہ دونوں بخوشی اسلام قبول نہیں کرتے تو زبردستی انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کیوں نہ کروں۔ چنانچہ وہ اس بارے میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بغرضِ مشورہ حاضر ہوئے، اور یہ آیات نازل ہوئیں، کہ دین میں جبر و اکراہ نہیں چاہیے۔

اس سے قبل توحید کا بیان ہوا، آیت الکرسی میں صفات باری تعالیٰ کے بیان کے ساتھ استغناء کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کی عبادت سے مستغنی ہے۔ وہ کسی کو بزور مسلمان نہیں کرنا چاہتا، اور نہ کسی برگزیدہ پیغمبر کو اس کی اجازت

دیتا ہے۔ ربّ العزّت نے صاف لفظوں میں اعلان فرمایا ہے:﴿فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ﴾ [الکھف: ۲۹] (تو جو چاہے ایمان لائے، اور جو چاہے کافر رہے)۔ اگر زبردستی وہ بالجبر اپنے بندوں کو دائرہ اسلام میں داخل کرتا، تو ساری خلقت کے قلوب اس کے ہاتھوں میں محبوس تھے، اگر وہ انہیں اسلام لانے پر مجبور کرتا، یا آمادہ ہی کرتا، تو انبیاء و رُسل علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی فوت ہوجاتا، فرمایا:﴿وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ [ھود: ۱۱۸] (اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی جماعت کردیتا)۔

تو فرمایا:﴿لَآ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ ۙ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَىِّ﴾ (دین میں کوئی زبردستی اور جبر نہیں ہے، بیشک! ہدایت گمراہی سے ممتاز بالکل جدا ہوچکی ہے)۔ اسلام کا حسن و جمال اور خوبیاں، اور اسی طرح کفر و بت پرستی کی بدصورتی اور قبح ہر طرف سے خوب ظاہر اور نمایاں ہوچکی ہے، مزید داروگیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سارے انسان مکلف ذوی العقول ہیں، وہ اپنے نفع و نقصان کی پہچان پر قدرت رکھتے ہیں، اور وہ خود مختار بھی ہیں۔ اب انہیں انتخاب کا پورا پورا حق دیا جارہا ہے، کہ جو چاہے مسلمانی قبول کرے، اور ابدی سعادت خرید لے، جو چاہے شقاوت خرید کر کے جہنم کا مستحق بنے۔ اتمامِ حجت ہوچکا، قرآن پاک نازل ہوا، نبی پاک تشریف لائے، اور معجزات دکھائے۔ مزید کسی جبر و زبردستی کی حاجت نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی ہے کہ زبردستی اس امر پر ہوتی ہے جو ناپسندیدہ ہو، کرنے والے کا دل اسے نہ چاہتا ہو، اور اسے اطمینان حاصل نہ ہو، اسلام کا حسن و جمال ایسا بے مثال ہے کہ ہر عقلِ سلیم والا اس پر فریفتہ اور عاشق ہوجاتا ہے۔

البتہ! نفس پر اسلام کے احکام گراں گزرتے ہیں، عقلمند لوگ ایسے نفس کا اتباع نہیں کرتے، اور اس کی ناگواری کو عقلمند لوگ درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ نفس کتے کی مانند نجاست پسند ہے۔ کتا قے کرکے اسے چاٹتا ہے، اور گندی چیزوں پر خوش رہتا ہے، جبکہ سلیم الطبع لوگ اس قسم کی گندگیوں سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسلام میں اِکراہ و جبر اس لئے بھی نہیں کہ اسلام تصدیقِ قلبی کا نام ہے، اس کا تعلق قلب و باطن کے ساتھ ہے، اور قلب و باطن پر زبردستی نہیں چلتی۔

یہاں صیغۂ نفی نہی کے معنی میں بھی ہے۔ مطلب یہ کہ تم لوگوں پر زبردستی کرکے انہیں مسلمان بنانے کی کوشش اس لئے نہ کرو، کیونکہ دنیا دارالامتحان اور آزمائشوں کا گھر ہے، اور آزمائش کے لئے اختیار شرط ہے، جبکہ اِکراہ وزبردستی میں یہ مطلب مفقود ہے، اور سزا و جزاء کا دارومدار اختیاری افعال پر ہے۔

البتہ! یہ بات محقق ہے کہ دین اسلام قبول کرنے پر جبر و اکراہ نہیں ہے، لیکن احکامِ اسلام پر بالاتفاق جبر و اکراہ لازمی ہے۔ اگر کوئی برضا و رغبت اسلام قبول کر لے، تو اس پر اسلامی احکام کو بجالانے، اور منہیات سے دور رہنے کی ضروری پابندی لازمی ہوگی۔ اگر وہ تارکِ صلوٰۃ ہو، یا مانعِ زکوٰۃ ہو۔ بیوی بچوں کی نگہداشت سے منکر ہو۔ کسی قرضدار کی قرض ادائیگی سے پہلو تہی کرے۔ جہاد پر جانے سے منکر ہو وغیرہ، تو شرعی قواعد وضوابط کے مطابق اس پر پورا جبر و اکراہ ہوگا۔ چوری کی حد، زنا کی حد، قتل کا قصاص، شراب اور قذف کی حد وغیرہ میں اس کی مرضی کے بغیر جبر کے ساتھ اس پر حد شرعی جاری کر کے رہیں گے۔ علیٰ ہٰذا القیاس دیگر معاملات میں بھی۔

دوم یہ کہ جہاد بھی تو ایک جبری حربہ ہے، مگر یہ اس لئے کہ جہاد کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کفار کو زبردستی مسلمان بنایا جائے، بلکہ جہاد کا اصلی مقصد یہ ہے کہ کفر و معاصی سے جو فساد و بدامنی اور فتنہ پھیل جاتا ہے، جس سے پورا معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے، اس فتنہ وفساد کو ختم کرنے، اور اس کی جگہ امن وسلامتی اور خوشحالی قائم کرنے کا نام جہاد ہے۔ اس ضمن میں اگر کوئی اسلام قبول کرے گا، تو اسے جبر و اکراہ نہیں کہا جائے گا، بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ اس نے مزید فتنہ وفساد برپا کرنے سے توبہ کی۔ جہاد کی مثال ایسی ہے جیسے لوگ سانپ، بچھو اور دیگر موذی جانوروں کو قتل کرتے ہیں، تاکہ لوگ ان کے زہریلے نقصانات سے بچ جائیں، تو جہاد میں ایسا ہی اصلاحی مقصد ہوتا ہے، کہ کفر و شرک کے نقصانات سے خلقِ خدا کو بچایا جائے۔ اور فرق واضح ہے کہ جہاد لوگوں کی آزادی سلب کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ خلقِ خدا کو ہر قسم کے تحفظ دینے، اور فتنہ وفساد کو مکمل ختم کرنے، اور اس کی جگہ امن وسلامتی، اور احیاءِ حقوق کا عادلانہ نظام قائم کرنے کا نام ہے۔

ہم دیکھتے اور شب و روز مشاہدہ کرتے ہیں کہ دنیا کے سارے ممالک میں ایک بہت وسیع وعریض آئینی قوانین موجود ہوتے ہیں، جنہیں ہر ملک کے حکمران اور عوامی نمائندے مرتب کرتے ہیں، اور ان قوانین کے تحت اپنے ملک کے حقوق اور عوام الناس کے حقوق کو تحفظ دیتے ہیں۔ ان قوانین میں شخصی تحفظ سے لے کر ملکی اور عوامی حقوق کے تحفظ تک فوجی، معاشی، اقتصادی، ازدواجی، تجارتی، زرعی، دیوانی، فوجداری اور تعزیراتی بے شمار دفعات مقرر ہوتے ہیں، پھر انہی قوانین اور ضابطوں کی روشنی میں اپنے ملک اور عوام کی خدمت کرتے ہیں، جس کے ذریعہ اس ملک اور عوام میں خوشحالی پیدا ہوتی ہے۔ بدامنی، ظلم، بے انصافی اور ہر قسم کے فتنہ وفساد کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور وہاں کا معاشرہ ایک جنت نظیر خوشحال معاشرہ بن جاتا ہے۔

اس کے برعکس اگر کسی ملک میں سرے سے قانون ہی نہ ہو، یا قانون تو اچھا خاصا مرتب ہو، مگر اس پر عمل نہ ہو، یا امیر و غریب کے حقوق یکساں نہ ہوں، یا رشوت ستانی اور کرپشن کا دور دورہ ہو، یا تعصب، لسانیت و قومیت اور طنیت کا عنصر غالب ہو، یا اقرباء پروری کا عروج ہو، امیروں، سرمایہ داروں کا قانون میں تحفظ ہو، اور غریبوں کی نگہداشت نہ ہو، تو یہ معاشرہ جنگلوں، جانوروں، سانپوں، بچھوؤں کا ظالمانہ، دوزخ نظیر، بے مقصد معاشرہ کہلائے گا۔ یہ انسانوں کا معاشرہ نہیں ہوگا۔ ایسے ملک اور اس کے بے رحم، ظالمانہ معاشرہ پوری دنیا میں بدنام ہوگا۔

فتنہ و فساد سے تنگ آ کر وہاں کے امن پسند نہتے عوام اس ملک کے حکمرانوں، اور اربابِ حل و عقد کے ساتھ جہاد کرنے پر مجبور ہو جائیں گے، اور اپنے حقوق کے لئے جان و مال کی قربانی تک سے دریغ نہیں کریں گے۔ اسی کا نام ہے جہاد۔ اور جب وہ اپنے حقوق کے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، ہر قسم کی بے انصافیوں کا خاتمہ ہو جائے گا، لاقانونیت ختم ہو کر فتنہ و فساد اور تباہ کاریاں دب جائیں گی، اور پوری فضاء صاف ہو کر گرد و غبار چھٹ جائیں گے، تو یہی مجاہد اپنے ہتھیاروں کو کندھوں سے اتار کر آرام سے بیٹھ جائیں گے، مزید کچھ بھی نہیں کریں گے، اور پوری دنیا ان کی جد و جہد اور حقوق کی لڑائی پر انہیں خراج تحسین پیش کرے گی۔ مجال نہیں کہ کوئی انہیں باغی یا قانون شکن قرار دے۔

یہ ہے وہ چیز جسے شریعت اسلامی نے جہاد کا نام دیا، اور قرآن پاک نے اعلان فرمایا: ﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ﴾ [الأنفال: ۳۹] (اور ان سے فتنہ و ظلم کے خاتمہ تک لڑو)۔ جس طرح ایک ملک اپنے عوام کے لئے قانون بنانے کا مجاز ہے، تو کائنات کا خالق و مالک اور عرش و کرسی کے مالک اس سے کہیں زیادہ حقدار ہے کہ اپنی توحید اور اپنے دین کی خاطر اپنے بندوں کو تحفظ دینے، اور انہیں جہنم کی ابدی عذاب سے بچانے کی خاطر اسلامی قانون بنائے، اور اس کی مخالفت کرنے والوں، اور فساد برپا کرنے پر تعزیری حکم نافذ کرے، تاکہ فتنہ و بدامنی ختم ہو، اور امن و تحفظ کا حصول ہو، ظالمانہ، باغیانہ نظام ختم ہو، اس کی جگہ عدل و انصاف اور خلافۃ اللہ کا دور دورہ ہو، اسی کا نام جہاد ہے، جو کہ سراسر رحمت ہے۔

فتح مکہ کے روز جب مجاہدین کا لشکر مکہ پہنچا، تو مکہ کی عورتوں نے اجتماعی حیثیت سے مجاہدین کا استقبال کیا، اور ان کے گھوڑوں کی پیشانی پر بوسہ دیا، اور اپنے دوپٹوں سے ان کی پیشانی، ناک، منہ صاف کئے، اور خوشی میں روتی رہیں۔ [ابن ہشام]

پس دنیا نے دیکھا، اور تاریخ عالم نے اپنے سنہرے اوراق میں رقم کیا کہ اسلام کی آمد سے پہلے دنیا کا کیا حال تھا؟ اگر کوئی تاریخ کے اوراق میں دیکھنا چاہے تو شاید اس کا دماغ غم کے مارے پھٹ جائے، اور اس کے حواس ناکارہ ہو کر کام چھوڑ دیں۔ یہ اتنی لمبی دلخراش داستان ہے کہ جسے ان مختصر اوراق میں ہرگز ضبط کرنے کا نہ امکان ہے، اور نہ وقت ہے۔

تاریخ کا ایک ورق:

مؤرخین مختصر الفاظ میں دریا کو کوزے میں بند کر کے کہتے ہیں کہ اتنا ناگفتہ بہ ماحول تھا، جہاں آسمان و زمین کے سارے رشتے ٹوٹ چکے تھے، اور بس۔ پس کیا ہوا؟ اور کس طرح ہوا؟ کس کے ذریعہ ہوا؟ اور کیسا ہوا؟ تو یہ بھی بڑی مسرت افزاء اور حیرت انگیز داستان ہے، کہ سارے ٹوٹے ہوئے رشتے دوبارہ منظم ہو کر جڑ گئے، اور وہ عجیب و غریب مناظر دیکھنے میں آئے، جنہیں فرشتے لکھ لکھ کر تھک گئے۔ انسان تو کیا! جانوروں اور کیڑے مکوڑوں نے بھی عید منائی۔

کھربوں صلوٰۃ و سلام ہوں حضرت آمنہ کے لعل، سید کائنات، رحمۃ للعٰلمین سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحیح جانشینوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) پر، خصوصاً چاروں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم پر۔ دنیا میں بے شمار مصلحین آتے رہے، اور خلقِ خدا کو ہدایت کا سبق پڑھاتے رہے، ازلی رشتوں کو جوڑتے رہے، مگر ان کے جانے کے بعد پھر تاریکی چھا گئی، اور خالق و مخلوق کے رشتے ٹوٹتے گئے۔ آخر میں سارے مصلحین کے علوم و معارف اور برکتوں کے جامع، ساری کائنات کا سردار محسنِ اعظم نبی الانبیاء سید الرسل سب کے خاتم محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تشریف لائے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے ساتھ حضرت رضوان نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقش قدم پر چلنے والوں کے لئے جنتوں کو دلہن کی طرح سجایا، اور جنتی پاکیزہ معطر حوروں نے گیت گایا، جیسا کہ احادیث میں وارد ہے، جن کو ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ''حادی الارواح'' میں، اور قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے تذکرہ اور روح المعانی کے مؤلف رحمۃ اللہ علیہ اور ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیروں میں درج کیا ہے۔

اسی طرح حضرت مالک نے جہنم کی آگ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں، مشرکوں اور کافروں کے لئے تیز کر کے بھڑکایا، کیونکہ فترت کے زمانے کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات عالیہ کو ''حجۃ اللہ علی العٰلمین'' کے لقب سے نوازا گیا تھا، اور خلقِ خدا پر اتمامِ حجت ہو چکا تھا۔ اب ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ ہی کا دور شروع ہو چکا تھا۔

علماء سیرت نے لکھا ہے کہ ایک یہودی لڑکا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں ہوتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کرتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی اس کو اسلام قبول کرنے پر جبر نہیں فرمایا، صرف اسے ترغیب دیتے رہے۔ ایک دفعہ وہ مریض ہوگیا، اور مرنے کے قریب ہوگیا، ادھر سے اس کا یہودی باپ اس کی عیادت کے لئے آئے، اس وقت وہ قریب المرگ لڑکا ہوش میں تھا، اس کا یہودی والد سرہانے بیٹھا ہوا تھا، عین اس وقت رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے، اور حسب سابق اس لڑکے سے مخاطب ہوئے: بیٹا! میرا دین برحق ہے، کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوجاؤ۔ لڑکے نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، کہ یہ کیا کہتے ہیں؟ اس کے والد نے کہا: "اَطِعْ اَبَا الْقَاسِمِ"۔ بیٹا: اپنے محسن حضرت ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات مانو! پس لڑکے نے کلمہ پڑھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے انتہا مسرت کے ساتھ وہاں سے نکلے، اور اُم المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو بشارت سنائی، اور فرمایا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْقَذَہٗ مِنَ النَّارِ"۔ (الحمد للہ! ربّ تعالیٰ نے اس میرے خادم کو جہنم سے نجات دے دی)۔ [مشکوٰۃ]

اسی طرح حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ایک عیسائی غلام تھا، بڑا خدمتگار، ہوشیار، حساب وکتاب میں بڑا ماہر تھا۔ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ اسے روزانہ ترغیب دیتے رہتے تھے کہ اسلام قبول کرو، مگر کبھی جبر کے ساتھ اس کو مسلمان نہیں کیا۔ اس کی قسمت میں ایمان کی سعادت لکھی ہوئی نہ تھی، اس لئے وہ مسلمان نہیں ہوا، آخرکار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے آزاد کردیا۔ اس بدبخت کا نام وثیق تھا۔ یہ وہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہیں، جنہوں نے قیصر وکسریٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کران کی چار ہزار سالہ عظیم سلطنتوں کو پاش پاش کردیا، مگر غلام پر جبر کرنے کو پسند نہ کیا۔

ایران فتح کرنے بعد ایرانی عورتوں کے بچے جب رات کو نہیں سوتے تھے، توان کی مائیں انہیں سونے پر مجبور کرتیں، اور ڈراتی ہوئی یہ کہتیں: بچہ سوجاؤ! دیکھو! وہ عمر کا لشکر آرہا ہے۔ بچہ ڈر کے مارے سوجاتا۔ کیا ایران جیسے عظیم ملک کو فتح کرنا کوئی آسان کام تھا؟ یمن سے لے کر چینی ترکستان تک پھیلا ہوا عظیم خوشحال زرخیز ملک تھا۔ فاروقی فوج ایمان وتقویٰ سے مسلح بارہ ہزار کی نفری میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مدائن پر حملہ کرنے دریائے دجلہ پر پہنچ گئی۔ دعاؤں مناجاتوں کا سلسلہ شروع ہوا، پھر پورے لشکر کو حکم ہوا کہ گھوڑوں سمیت دریا میں گھس جاؤ۔ غوطہ لگا کر پار ہوجاؤ۔ سارے شتربانوں کا لشکر ہے، جنہوں نے دریا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ کیا جانتے ہیں غوطہ کیا ہوتا ہے؟

بہرحال! حکم کی تعمیل میں دریائے دجلہ کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں میں دوڑ پڑے، اور گھوڑے

دوڑائے۔ دریا کو بسلامتی پار کرنے کے بعد مستجاب الدعوات امیر نے پوچھا: کیا تم سب سلامت ہو؟ کسی کی کوئی چیز گم تو نہیں ہوئی؟ سب نے کہا: ہم سلامت ہیں۔ ایک مجاہد نے کہا: میرا ایک برتن (کٹورہ) گم ہے۔ امیر نے دریا پر لاٹھی مار کر اس سے فرمائش کی، تو دیکھتے ہیں کہ دریا الٹا بہہ کر کٹورہ اٹھا کر پہنچا رہا ہے، جو دریا میل دو میل کٹورہ کو اپنے بہاؤ کے ساتھ آگے لے گیا تھا، اسے الٹا بہہ کر واپس کر رہا ہے۔

دشت تو دشت تھے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑائے ہم نے
اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
آج تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا
(اقبالؒ)

لودھی، خلجی، غلامان، مغل خاندانوں نے آٹھ سو سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ یہ سارے سوائے دو تین حکمرانوں کے بڑے اچھے پاکباز، دیندار، متقی اور منصف مزاج حکمران گزرے ہیں۔ ان حکمرانوں میں کچھ ایسے پایہ کے لوگ گزرے ہیں، جن کو اعلیٰ درجہ ولایت کا مرتبہ و مقام حاصل تھا۔ مصر کے محقق علامہ طنطاوی جوہری رحمۃ اللہ علیہ نے تو جناب اورنگزیب عالمگیر کو چھٹا خلیفہ راشد شمار کیا ہے۔

عالمگیر نے پچاس سال ہندوستان پر حکومت کی۔ اگر یہ لوگ زبردستی لوگوں کو اسلام میں داخل کرتے، تو آج ہندوستان میں ہندو نہایت اقلیت میں ہوتے، مگر تاریخ شاہد ہے کہ ان نیک سیرت، باکردار حکمران قرآنی آیت لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ وغیرہ پر ایسے عامل رہے کہ کبھی کسی غیر مذہب کو جبراً مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا۔ اسی طرح عثمانی ترکی خلفاء نے تین براعظموں پر چار سو اسی سال حکومت کی، مگر بزورِ شمشیر کبھی انہوں نے اپنے رعایا میں یہود و نصاریٰ، اور دیگر غیر مسلم مجوسیوں اور صابی فرقے کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔

مسلمان حکمرانوں نے ہر خطے میں اپنے محکوم غیر مسلموں پر نہ ظلم و زیادتی کی ہے، اور نہ ہی انہوں نے کسی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہے۔ مسلمانوں کے پاس یہ بابرکت گرانقدر سرمایہ قرآن حکیم، اور سیرت مقدسہ کی موجودگی کی وجہ سے ہمیشہ عدل و انصاف کا دور دورہ، اور پاکیزہ ہدایات کا عروج رہا ہے۔ انہوں نے ہر قسم کی ظلم و زیادتیوں سے پرہیز کیا ہے۔ اس کے باوجود مغربی مستشرقین، اور انگریز مؤرخین نے محض عداوت و دشمنی اور اسلام

مخالف نظریات کے تحت ہمارے حکمرانوں کے خلاف اتنے ناروا پروپیگنڈے کئے کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اگر آپ عیسائی اور یہودیوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں گے، تو ایسا معلوم ہوگا کہ سارے جہاں میں ان جیسے بے رحم، سفاک درندہ شاید کوئی نہ ہوگا۔

لہٰذا یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ البتہ! کفار و مشرکین نے جبر و اکراہ جیسے مذموم کارنامے انجام دیئے، کہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے جبراً منع کرتے رہتے تھے، اور جو لوگ اسلام قبول کر چکے تھے، انہیں طرح طرح کے عذاب دے کر کفر میں واپس لوٹانا چاہتے تھے۔ اسلام دینِ الٰہی ہے، وہ سراسر رحمت و انصاف پر مبنی ہے، اس کا پاکیزہ دامن ہر ظلم و زیادتی سے پاک ہے۔ وہ اگر جبر و اکراہ پر عمل پیرا ہوتا، تو لوگوں کو جزیہ دینے پر ہرگز مہلت نہ دیتا۔ جزیہ خود ایک واضح دلیل ہے کہ کافر اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں ہے، وہ ایک معمولی جزیہ کی ادائیگی پر اپنی جان، عزّت و مال وغیرہ کی حفاظت کو آسان بنا سکتا ہے، اور اسلام ہر طرح اس کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔

﴿قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ﴾ ہدایت گمراہی سے بالکل واضح ہو چکی ہے۔ ''اَلرُّشْدُ'' بمعنی کامیابی، حق، انصاف وغیرہ۔ اَلْغَيّ، ناکامی باطل، کفر، گمراہی وغیرہ۔ لہٰذا جو شخص اپنی مرضی سے اگر اسلام میں داخل ہونا چاہے، تو بلا جھجک اسلام قبول کر لے، اور جس کا دل نہیں مانتا، اور اسلام قبول نہیں کرتا، تو ایمان نہ لائے، اسلام قبول نہ کرے، اس پر کوئی جبر نہیں ہے، اس کی تفسیر یہ ہے: ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ [الکھف: ۲۹] (تو جو چاہے ایمان لائے، اور جو چاہے کافر رہے)۔

چونکہ انسان اول تو اپنی فطرت کے اعتبار سے عاجز ہے، جیسے کہ فرمایا: ﴿وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا﴾۔

دوسرے درجے میں عجلت کا شکار ہے، جیسے کہ فرمایا: ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ [الأنبیاء: ۳۷] (انسان کو پیدا کیا گیا ہے جلد باز)

تیسرے درجے میں تنگدل ہے، فرمایا: ﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا﴾، [الإسراء: ۱۰۰] (اور انسان بخیل ہے)

چوتھے درجے میں بے صبر، بے حوصلہ اور غیر مستقل مزاج ہے، فرمایا: ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾﴾ [المعارج] (بیشک انسان بہت کم حوصلہ پیدا کیا گیا

ہے۔ جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جاتا ہے۔ اور جب اس کے پاس خوشحالی آتی ہے تو بہت بخیل بن جاتا ہے)۔

پانچویں درجے میں ناعاقبت اندیش ہے، خیروشر نفع ونقصان کی پہچان سے عاجز ونابلد ہے۔

چھٹے درجے میں نفسِ امارہ، شیطان، اور سوسائٹی کے ہر قسم کے لوگوں کے نرغہ اور قید میں محبوس ہے۔ اب یہ انسان بغیر کسی مضبوط ومحکم سہارے کے نہ زندہ رہ سکتا ہے، اور نہ کامیاب وخوشحال۔ یہ ایک بدیہی امر ہے، جس کا ہم صبح وشام ملاحظہ کررہے ہیں۔

تو اس متمدن انسان کے لئے جس سہارے کی ضرورت ہے، وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات، اور اس کا پسندیدہ دینِ اسلام ہی ہے، کہ یہ سہارا لازوال، ابدی بھی ہے، اور محکم ومضبوط اور یقینی بھی ہے۔ اسی کا نام ﴿اَلْعُرْوَةُ الْوُثْقٰى﴾ ہے، جس کا بیان اگلی آیت میں آنے والا ہے۔

اس محکم سہارے کے علاوہ ظاہر ہے کہ بے شمار سہارے موجود ہیں، مگر وہ سب کمزور، وقتی، ناکارہ، ناکافی، فانی اور چارروزہ ہیں۔ ان سارے سہاروں کا وجود وعدم دونوں برابر ہیں۔ ان سب میں سب سے بڑا سہارا بادشاہت ہے، جو کہ سب سے زیادہ بے کار وبے فائدہ اور عارضی ہے۔ ماضی کے بڑے بڑے عظیم بادشاہوں کی تاریخ ہمارے سامنے ہے، کہ ان کا آخری انجام کتنا برا، اور تباہ کن ہوا؟ اس لئے ارشاد فرمایا:

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا﴾ پس جس نے طاغوت (اللہ پاک کے علاوہ سارے سہارے طاغوت ہیں) کا انکار کیا، اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا، تو اس نے مضبوط کڑا پکڑ لیا، جو ٹوٹ نہیں سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ باقی سارے سہارے (کڑے) ناپائیدار، اور ہر طرح سے ٹوٹ پھوٹ کے شکار ہیں۔ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کا سہارا (قرآن پاک) محکم ومضبوط اور پائیدار ہے، جو ہر قسم کی ٹوٹ پھوٹ سے بے نیاز ہے۔ ؎

لُظ بالالٰه ولاتلظ بِسِوَاهُ ★ مَنْ لَاظَ بِالْمَلِكِ الْجَلِيْلِ كَفَاهُ

مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے اسلام کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھام لیا، اس کا ہاتھ گویا ایسی مضبوط جگہ پر پہنچ گیا، جہاں پر وہ محفوظ ہوگیا۔ اب اس کو کسی قسم کا خطرہ باقی نہیں رہا، اور یہ وہ محکم کڑی اور مضبوط رسی ہے، جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتی۔

﴿اَلطَّاغُوْت﴾ یہ کلمہ قرآن حکیم میں آٹھ مرتبہ مذکور ہے، ''طاغوت'' طغیان کے مادہ سے ہے، یہ کلمہ مذکر بھی آتا ہے، اور مؤنث بھی۔ نیز جمع، تذکیر، تانیث سب میں ایک ہی طرح پر مستعمل ہے، اور اس کے متعدد معانی ہیں، یعنی شیطان، بت، حق سے روکنے والا، معبودِ باطل، سرکشی کرنا، اور حد سے تجاوز کرنا، سب اس کے معانی ہیں۔ آخری معنیٰ عام بھی ہے، اور مقام کے ساتھ مناسب بھی۔

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے اس کی یہ تفسیر کی ہے: کُلُّ مَایَشْغَلُکَ عَنِ الْحَقِّ فَھُوَ طَاغُوْتُکَ۔ (جو کوئی چیز تمہیں حق سے مشغول کرنے والی ہو، وہ تمہارے لئے طاغوت ہے)۔ گویا حق سے ہٹانے والا شیطان ہو، بت ہو، یا انسان، یا مال، یا اولاد، سب طاغوت کی تعریف میں آئیں گے۔ باطل پر چلانے والے ماں باپ، پیر، استاذ، دوست واحباب سب اسی طاغوت کے زمرے میں آتے ہیں۔

قرآن کریم نے فرمایا: ﴿اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِی الْجَارِیَةِ﴾ [الحاقة: ۱۱] (جب پانی طغیانی پر آیا تو ہم نے تم (لوگوں) کو کشتی میں سوار کرلیا)۔ اسی طرح ﴿فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِیَةِ﴾ [الحاقة: ۵] (سو ثمود تو کڑک سے ہلاک کردیئے گئے)۔ اسی کے ساتھ ارشاد ہے کہ: ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ [النحل: ۳۶] (یہ کہ اللہ کی عبادت کرو، اور طاغوت سے بچو)۔ ان سب مقامات میں طاغوت اسی معنیٰ میں لئے جاسکتا ہے، یعنی حد سے تجاوز، شیطان، باطل وغیرہ۔

طاغوت کیا ہے؟......علماء کے اقوال:

حضرت علامہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے مفسرین کے اس بارے میں پانچ اقوال نقل کیے ہیں:

(۱) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے شیطان کے معنیٰ میں بیان کیا ہیں۔

(۲) سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کاہن کہا ہے۔

(۳) ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ساحر بتایا ہے۔

(۴) بعض مفسرین اَصنام (بت) بیان کرتے ہیں۔

(۵) پانچواں قول یہ ہے کہ اس سے سرکش جن اور انسان، نیز ہر وہ شخص جو حد سے تجاوز کرے مراد ہے۔ [کبیر] پھر حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تحقیق اس باب میں یہ ہے کہ چونکہ ان سب اشیاء سے اتصال کے وقت طغیان کا حصول ہوتا ہے، اس لئے یہ سب چیزیں اسبابِ طغیان قرار دے دی گئیں۔ [کبیر]

ہم کہتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے اس سلسلہ میں جو اقوال بھی بیان گیے گئے ہیں، وہ تعیین کے لئے نہیں ہیں، بلکہ تمثیل کے طور پر ہیں۔ طاغوت اپنے عموم کے اعتبار سے ہر معصیت میں حد سے گزر جانے والے، نیز ہر اس باطل معبود کے لئے کہ حق تعالیٰ کے سوا اس کی پرستش کی جائے، یا اس کی بات مانی جائے، کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ عمومی معنی وہ ہے، جسے امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا، اور یہی معنی اس مقام کے لئے مناسب بھی ہے۔ امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر مفسرین نے بھی یہی عمومی معنی مراد لئے ہیں۔

﴿الْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾ کڑا، حلقہ، کسی چیز کا قبضہ یا دستہ، وہ چیز جس کو پکڑا جائے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اسی مقام پر لکھتے ہیں کہ اس میں شئے معقول کے لئے شئے محسوس کا استعارہ ہے، کیونکہ جو شخص کسی چیز کو تھامنا چاہتا ہے، وہ اس کے دستہ اور حلقے کو پکڑ لیتا ہے۔ اسی طرح جو کوئی دینِ اسلام کو تھامنا (پکڑنا) چاہتا ہے، وہ ان اسلامی دلائل سے وابستہ ہو جاتا ہے جو اس پر رہنمائی کرتے ہیں۔ اب چونکہ اسلام کے دلائل سب سے زیادہ مضبوط اور واضح تر ہیں، اس لئے ان کو ''الْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى'' سے موصوف کیا گیا۔ [کبیر]

''عُرْوَة'' کے معنی ہیں: حلقہ، کڑا۔ اور ''وُثْقٰى'' کے معنی ہیں: مضبوط و پائیدار (بلندی بھی) و محکم۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تورات کے ماہر بڑے یہودی عالم تھے، بڑے خوش قسمت جنتی ثابت ہوئے۔ شروع ہجرت میں سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، اور تورات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لکھی ہوئی صفات پا کر بصد خوشی اسلام قبول کیا، اور دہرا ثواب حاصل کیا۔ انہوں نے ایک دن خواب دیکھا کہ وہ ایک اونچے ستون پر چڑھ گئے، اس کے آخری سرے پر ایک حلقہ (کڑا) لگا ہوا تھا، جسے وہ مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔ صبح اٹھے، تو سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر خواب بیان کیا، اور یہ بھی بتایا کہ خواب سے بیداری کے بعد بھی وہ میرے ہاتھ میں معلوم ہوتا رہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے خواب کی یہ تعبیر ہے: ''اَنْتَ تَمُوْتُ عَلَى الْاِسْلَامِ مُسْتَمْسِكًا بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى وَاَنْتَ اٰخِذٌبِهٖ''۔ [الحديث، أو كماقال]۔ تمہاری موت اسلام پر آئے گی، اس حال میں کہ آپ اس حلقے کو پکڑے ہوئے ہوں گے۔ [حدیث متفق علیہ ہے]۔

﴿لَا انْفِصَامَ لَهَا﴾ کا مطلب یہی ہے کہ یہ حلقہ بڑا مضبوط ہے۔ ہر قسم کی ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ ہے، اور اگر خدانخواستہ کوئی گمراہ ہو جائے، اور اسلام کا دامن چھوڑ دے، تو وہ الگ بات ہے، مگر یہ حلقہ خود بخود کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ اَللّٰهُمَّ اخْتِمْ لَنَا عَلَى الْاِسْلَامِ آمین۔

﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا، اور جانتا ہے، اس سے کوئی ذرہ پوشیدہ نہیں ہے۔

آسمانی فیصلہ کہ مسلمانوں کا دوست اللہ ہے، اور کافروں کا شیطان ہے:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا دوست، مددگار اور ولی ہے، جو ایمان لائیں۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ﴾ [محمد:۱۱] (یہ اس لئے کہ جو مؤمن ہیں ان کا خدا کارساز ہے، اور کافروں کا کوئی کارساز نہیں)۔ کلمۂ ''ولی'' کے بہت سارے پیارے اور پسندیدہ معانی ہیں، وہ سب مسلمانوں کے لئے ثابت ہیں۔ دوسرے مقام پر مزید اضافہ فرمایا: ﴿اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا﴾ [المائدۃ: ۵۵] (تمہارے دوست تو خدا اور اس کے پیغمبر اور مؤمن لوگ ہی ہیں)۔

﴿اَلْوَلِيُّ﴾ اپنی دیگر مشتقات کے ساتھ قرآن حکیم میں باسٹھ مرتبہ مذکور ہے۔ فرمایا: ﴿نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ﴾ [فصلت: ۳۱] (دنیا اور آخرت کی زندگی میں ہم ہی تمہارا کارساز ہیں)۔ بہرحال فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں کا مددگار ہے، کہ انہیں گمراہیوں سے ہدایت کی طرف، اور تاریکیوں سے نور کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

﴿يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ بندۂ مؤمن کو تاکید اور تنبیہ کیا جارہا ہے کہ تمہارا ایمان اور سعادت محض فضل وکرم ایزدی کا نتیجہ اور ثمرہ ہے، اس میں تمہاری جد وجہد اور محنت کا چنداں دخل نہیں ہے، فرمایا: ﴿بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ﴾ [الحجرات: ۱۷] (بلکہ خدا تم پر احسان رکھتا ہے کہ تمہیں ایمان کی طرف رہنمائی کی)۔

منت منہ بہ سلطان کہ خدمت ہمی کنی ☆ منت ازو شناس کہ بخدمت گذاشتت

یہاں پر ظلمت جمع، اور نور کو مفرد لایا گیا ہے، اشارہ ہے کہ ایمان وہدایت، یعنی حق ایک ہی حقیقت کا نام ہے، اس میں تعدد نہیں ہے، بخلاف ضلالت کے، کہ اس کی اقسام بہت زیادہ ہیں۔ بعضوں نے گمراہی کی اقسام ستر سے زائد شمار کی ہیں۔ کما ھو الظاھر

﴿ظُلُمٰتٌ﴾ (تاریکیاں) اندھیروں سے نور کی طرف نکالنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر اسلامی عمل میں نور ہے، اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء ورسل علیہم السلام اور آسمانی ہدایات پر عمل کی توفیق عطا فرمائی، اور نور وایمان کی سعادت سے

نوازا، تو مؤمن کا ہر نیک عمل ایمانی نور کے پرتَو سے منور ہو گیا، یہاں تک کہ اس کی پوری زندگی نورانی بن جائے گی، اور معاصی کے اندھیروں سے دور ہوتا جائے گا، جیسے تاریک رات میں اندھیرے مکان میں کوئی چراغ یا بلب روشن کرے، تو ساری ظلمتیں یک لخت ختم ہو جائیں گی، اور مکان روشن ہو جائے گا۔

یہ مکان مسلمان کے قلب وباطن کی مانند ہے، ارشاد ہے: ﴿أَفَمَن شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِ﴾ [الزمر: ۲۲] (آیا وہ شخص جس کا دل اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا ہے، تو وہ اپنے ربّ کی طرف سے ایک نور پر ہے)۔ پھر یہ نور حسبِ قوت وضعفِ ایمان اور قلّت وکثرتِ اخلاص اسی طرح مدارجِ اعمال کے لحاظ سے مختلف ہوگا، اور یہی نورانی عالم برزخ (قبر) میں، میدانِ محشر میں، پلِ صراط اور دیگر مقامات پر جگمگا کر ہزاروں مسرتوں اور خوشحالیوں اور کامیابیوں کا سبب بنے گا۔ الحمدللہ

جس طرح ہر گناہ سے انسانی قلب پر ایک سیاہ داغ ودھبہ لگ جاتا ہے، جو رفتہ رفتہ پورے قلب کو سیاہ کر کے رکھ دیتا ہے، یہاں تک کہ فطری استعداد سلب ہو جاتی ہے، فرمایا: ﴿بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ [المطففین: ۱۴] (دیکھو یہ جو (اعمالِ بد) کرتے ہیں، ان کا ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے)۔

اسی طرح اعمالِ صالحہ کا حال ہے کہ ہر نیک عمل سے قلب پر ایک نور کا کرشمہ پیدا ہوتا ہے، جو رفتہ رفتہ ترقی کناں رہتا ہے، یہاں تک سارا قلب سورج کی طرح منور ہو جاتا ہے، اور جگمگا اٹھتا ہے، اور اسی نورِ ایمان سے ساری کائنات کے حقائق معلوم ہو جاتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللهِ۔ [مشکوۃ] یہی مطلب ہے: ﴿يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ کا۔

ان کے برعکس کفار کے متعلق ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ﴾ (جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، ان کے ساتھی اور معاون طاغوت ہیں، وہ انہیں روشنی سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں)۔ طاغوت کا عمومی معنی پہلے بیان ہوا، سب سے بڑے طاغوت نفسِ امارہ اور شیطان ہیں، جو انہیں ﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ﴾ کے محاذ پر پہنچاتے ہیں، اور ساری ظلمتوں میں دھکیل کر ان کی فطری استعداد تک کو بھی ضائع کر لیتے ہیں۔ جب گناہ پر گناہ کا ارتکاب ہو جائے گا، تو انسان ایمان وہدایت کے انوار وبرکات سے ہزاروں میل دور ہوتا جائے گا، اور تاریکیوں کی نذر ہو جائے گا، پس ان کا انجام یہ ہوگا:

﴿أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ یہی لوگ اہلِ دوزخ ہیں، جو ہمیشہ ابدی جہنم میں رہیں گے، اور مختلف عذابوں میں جلتے رہیں گے۔ روز روز ان کے عذاب میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ نعوذ باللہ!

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۲۵۸

ترجمہ: کیا آپ نے اس شخص کی طرف نہیں دیکھا جس نے حضرت ابراہیم کے ساتھ جھگڑا کیا تھا، اس کے ربّ کے بارے میں، اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بادشاہی دی تھی، جب حضرت ابراہیم نے کہا: میرا ربّ وہ ہے، جو زندہ کرتا ہے، اور مارتا ہے، تو وہ شخص کہنے لگا: میں بھی زندہ کرتا ہوں، اور مارتا ہوں، ابراہیم نے کہا: بیشک! اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق کی طرف سے لاتا ہے، تم اس کو مغرب کی جانب سے لاؤ۔ پس وہ شخص حیران (لاجواب) ہو گیا جس نے کفر کیا تھا، اور اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والی قوم کو راہ نہیں دکھاتا ۲۵۸

معارف ومنازل

گزشتہ تقابلی مسئلہ کا نمونہ بیان ہو رہا ہے۔ ﴿اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ کی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا﴾ کی مثال نمرود بن کنعان ہے۔ گویا کہ پہلے عباد الرحمن اور عباد الشیطان کا عمومی بیان تھا، اب ان کا خصوصی اور شخصی بیان ہو رہا ہے۔

بطور تمثیل ارضِ بابل کی سرزمین۔ یہ بابل عراق کی سرزمین کا نام ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ شہر کا نام ہے۔ ممکن ہے کہ یہ علاقہ اور شہر دونوں کا نام ہو۔ حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان کے بعد اسی کی تعمیر کی ہے، اور اسی میں قیام فرمایا ہے۔ آپ کے بعد یہ شہر اتنا مشہور ہوا کہ یہاں کے تمدّن وتہذیب کا پورے خطے پر غلبہ ہوا، روز بروز ترقی کرتے ہوئے اس عروج پر پہنچ گیا کہ کلدانی تہذیب کا گہوارہ بن گیا، حتیٰ کہ کلدانی بادشاہ نمرود بن کنعان بن کوش بن حام بن نوح یہاں کا باشاہ بنا، اور آس پاس کے ملوک وسلاطین پر غلبہ پا کر سب پر خراج مقرر کیا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ چار بادشاہ ایسے گزرے ہیں، جن کی پوری دنیا پر حکمرانی تھی۔ ان میں سے دو

پیغمبر (میرے نزدیک یہ دونوں پیغمبر ہیں) تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت ذوالقرنین علیہ السلام۔ اور دو کافر تھے، یعنی نمرود اور بخت نصر۔ اس کا تذکرہ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔

فائدہ:

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے معالم میں اسی طرح لکھا ہے۔ بعد کے مفسرین بھی اسی سے نقل کرتے چلے آئے ہیں، انہوں نے چوتھا بادشاہ بخت نصر لکھا ہے، مگر میری تحقیق یہ ہے کہ وہ شداد بن عاد (ارم) ہے، بخت نصر نہیں ہے۔ شداد کا واقعہ سورۃ الفجر میں مذکور ہے، جس نے عدن کے ساتھ اپنے لئے جنت تعمیر کی تھی، جس کا تذکرہ کتبِ تاریخ میں نمایاں رہا ہے۔ بخت نصر بابل کا حکمران اگرچہ رہا ہے، مگر وہ مستقل بادشاہ نہیں تھا، بلکہ وہ ملوک فارس، لہراسپ اور گشتاسپ کا گورنر تھا، جس نے بیت المقدس پر چڑھائی کی، بنی اسرائیل کا قتل عام کیا، اور بیت المقدس کو کھنڈرات میں تبدیل کیا، جسے حضرت عزیر علیہ السلام نے دیکھ کر کہا تھا: ﴿اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ جس کا تذکرہ آئندہ چند آیتوں کے بعد آنے والا ہے۔

مؤرخ مسعودی نے مروج الذہب میں اگرچہ بابل کے بادشاہوں کی فہرست میں بخت نصر کا نام درج کیا ہے، مگر میری ناقص رائے میں اس کا شمار بادشاہوں میں نہیں ہوتا، بلکہ بڑے حکمرانوں (گورنروں) میں ہے۔ پوری تفصیل اِن شاء اللہ سورۂ اِسراء میں اپنے موقع پر آنے والی ہے۔ ایک مختصر عبارت بحوالۂ طبری دو ورق کے بعد آنے والی ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ تاریخ کی کتب میں اگر کسی مؤرخ نے کوئی واقعہ لکھا، تو بعد والے اکثر اسے نقل کرتے چلے جاتے ہیں۔ پوری تحقیق نہیں کرتے، مثال کے طور پر: دیکھئے! آج تک سیرت نگار اور مؤرخین متفقہ طور پر لکھتے چلے آرہے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حکومت کا رقبہ بائیس لاکھ مربع میل تھا، اور ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں کہ انہوں نے ایک ہزار شہر فتح کئے۔ ایران فتح ہوا، عراق فتح ہوا، سوڈان کا ایک حصہ فتح ہوا، مصر فتح ہوا، فلسطین، شام اور اردن فتح ہوئے۔ جنوبی اور شمالی یمن خلافت کے قلمرو میں رہے۔ موجودہ سعودی مملکت بشمولِ بحرین اور عمان و قطر اس کے ساتھ درمیان میں موجودہ کویت بھی، اور ایک حصہ لیبیا کا بھی خلافت کے زیرِ حکومت رہے۔

اب آپ ان علاقوں کے رقبوں کا حساب لگائیں، تو کیا یہ بائیس لاکھ بنتا ہے؟ ہرگز نہیں! چونکہ ایک مؤرخ نے اسے لکھا، تو دوسروں نے بلا تحقیق اسے قبول کیا، اور لکھتے رہے، اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ تاریخی واقعات حتمی فیصلہ

کن نہیں ہوتے، جو کچھ سنا، بلا تحقیق لکھ دیا، اور اس طرح کے واقعات بھی لکھے گئے، اور اوراق تاریخ کی زینت بنے جنہیں عقل سلیم تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مثلاً: ضحاک بادشاہ کے دو چہرے اور آٹھ آنکھیں تھیں۔ اندازہ لگائیں، یہ کیا بات ہے؟ ہر رطب و یابس کو بلا سند و بلا تحقیق نقل کرنا ہرگز صحیح نہیں ہوتا۔

البتہ! یہ شرف اور اونچا مقام حدیثِ نبوی کے خدّام حضرات محدثین کرام کو حاصل ہے کہ کسی واقعہ، حدیث اور روایت کو نقل کرنے سے پہلے رواۃِ حدیث کی جانچ پڑتال کر کے بالوں کی کھال اتارتے، پھر فیصلہ کرتے ہیں۔ ان کا علمِ درایت اتنا عمیق اور گہرا ہوتا ہے کہ مجال نہیں کہ کہیں کوئی تسامح یا فروگزاشت ہو۔ رَحِمَهُمُ اللّٰهُ وَاَكْرَمَهُمْ وَجَعَلْنَامِنْ خُدَّامِهِمْ آمین

مطلب یہ ہے کہ سارے مؤرخ حاطبِ لیل نہیں ہوتے، ان میں بھی بڑے محقق ہوتے ہیں، جیسے ابن خلدون، ابن خلکان، ابن کثیر اور مؤلف الکامل جزری وغیرہم۔

آیت کریمہ میں جس بادشاہ کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مناظرہ ہوا، وہ یہی نمرود بن کنعان بن کوش بن حام بن نوح (علیہ السلام) تھا۔ بابل کے بادشاہوں میں پہلا بادشاہ ہی نمرود ہے۔ بقول مؤرخ مسعودی بڑا جابر و ظالم تھا۔ غرور و گھمنڈ اور عظیم سلطنت کی وجہ سے خدائی (الوہیت) کا مدّعی تھا۔ سب سے پہلے بادشاہت کا تاج اسی نے اپنے سر پر رکھا۔ مذہب کے اعتبار سے اگرچہ خدائی کا مدّعی رہا، مگر قرآن حکیم کے سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اور اس کی پوری کلدانی قوم والے بت پرست بھی تھے، اور کواکب پرستی کی تفصیل سورۃ الانعام میں آنے والی ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

کہتے ہیں کہ الوہیت اور بادشاہت کی وجہ سے زبردستی لوگوں کو اپنے سامنے سجدہ کراتا تھا۔ دراصل سجدہ لغیر اللہ کا اس زمانہ میں بڑا عروج رہا۔ بڑے صدمے کی بات ہے کہ سلطنت کی گھمنڈ کی وجہ سے مغل بادشاہ جلال الدین اکبر اور اس کے جانشین بیٹے جہانگیر بھی اس غلط فہمی کا شکار رہے، مگر حضرت الامام شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر کروڑوں رحمتیں ہوں، جنہوں نے تکلیف و سزا اور قید و بند برداشت کرتے ہوئے باپ بیٹے کے غرور کو خاک میں ملا دیا، اور مجدد الف ثانی کے شرف و مقام پر فائز ہوئے۔ انہیں یہ مقام درس و تدریس، اذکار و نوافل، طاعات و عبادات کی وجہ سے نہیں ملا، بلکہ جہاد کی برکت سے ملا۔ انہوں نے یہ مقام حاصل کیا کہ اصحابِ باطن کے نزدیک حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا رتبہ شیخ عبد القادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اونچا ہے۔

حضرت جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو ملحد و زندیق بادشاہوں کی مخالفتوں کے ساتھ محاذ آرائی کا اتنا موقع نہیں ملا، نبوت کے منصب کی توریث و وراثت کا عالی مقام یہی ہے کہ "اَفْضَلُ الْجِهَادِ مَنْ قَالَ كَلِمَةُ الْحَقِّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ"۔ کیا ملحد بادشاہوں کے ساتھ ٹکر لینا آسان ہے؟ اور ہر مرد درویش کا کام ہے؟ ہرگز نہیں۔ ابھی بھی یہ بات واضح ہے کہ جو علماء کرام مذہب و شریعت کی تبلیغ و احیاء کی بناء پر معتوب ہیں، اور قید و بند و دیگر ہر طرح کے مصائب سے دوچار ہیں، ان کا مقام بہت ہی اونچا اور بلند ہے۔ بادشاہوں، حکمرانوں، امراء وغیرہ کے ہزاروں غیر شرعی امور اور مذہب کی تحقیر کو دیکھتے ہوئے خاموش رہنے والے علما، منصبِ نبوت کی اصلی وراثت کے حقدار نہیں ہیں، اور جو علماء ان کا ساتھ دیتے ہیں وہ نہایت خبیث ہیں۔

پس حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مساعی اور جہادی معرکے کارآمد بارآور ثابت ہوئے، وہی جہانگیر آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے، شرط لگائی کہ حضرت آپ مجھے ساتھ لے کر جنت میں جائیں گے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: جہانگیر سنو! میں آپ کے بغیر جنت میں نہیں جاؤں گا۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر ☆ گرچہ در نظاہر نوشتہ شیر و شیر

قرآن حکیم یا کسی حدیث سے یہ واضح نہیں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا نمرود کے ساتھ مناظرہ ان کے آگ میں ڈالے جانے سے پہلے ہوا، یا اس کے بعد؟ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ آگ میں ڈالنے سے پہلے کا ہے۔ اور یہی قرینِ قیاس ہے، کیونکہ آگ میں انہیں اس وقت ڈالا گیا، جب ان کی تبلیغ قوم کے ساتھ نمرود اور اپنے چچا آذر یا باپ کے ساتھ سارے مناظرے طے ہوئے تھے، جس طرح ابراہیم علیہ السلام ان کے ایمان لانے سے مایوس ہوگئے تھے، اسی طرح وہ لوگ بھی اس بات سے مایوس ہو گئے تھے کہ یہ نوجوان ہماری بات مانے گا، یا ہماری دھمکی کا اس پر کوئی اثر ہوگا۔ اور یہ بات طے شدہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نبوت کے ملتے ہی نمرود، قوم، اپنے باپ وغیرہ کو تبلیغ شروع کردی تھی، اور انہیں توحیدِ الٰہی کی دعوت دی تھی، اور یہ مناظرہ ان کی دعوت الی اللہ کے نتیجے میں پیش آیا تھا۔

چنانچہ اسی طریقے پر چل کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعوت کا افتتاح تبلیغ اور دعوت الی اللہ سے شروع کیا، تب تو فرعون نے کہا: ﴿وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [الشعراء: ۲۳] (کون ہے تمہارا ربّ العلمین؟) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: ﴿رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِیْنَ﴾ [الشعراء: ۲۶] (تمہارا ربّ اور تمہارے پہلے باپ دادوں

کا رب)۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے جانے کے مرحلے سے کامیابی کے ساتھ بچ گئے، تو نمرود اور اس کی قوم کو خفت ہوئی، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے ایمان لانے سے مکمل مایوس ہو گئے، چاہئے تھا کہ اس تاریخی واقعہ سے متاثر ہو کر وہ کلی یا جزوی طور پر ایمان لے آتے، مگر ایسا نہیں ہوا، تو مزید حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کو قائل کرنے کی خاطر لا حاصل مناظرہ کر کے کیا کچھ حاصل کر سکیں گے؟ پس وہ اسی مایوسی کے پیش نظر وہاں سے ہجرت کر کے حران اور شام و فلسطین کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اسی اثناء میں ان کے والد کا حران میں انتقال ہو گیا، جسے ہم نے اختلافی مسئلہ کے طور پر پہلے پارہ کے آخر میں بیان کیا ہے۔

بعض دوسرے مفسرین کی تحقیق یہ ہے کہ یہ مناظرہ آگ میں ڈالے جانے کے بعد ہوا، وہ اس طرح کہ آگ میں ڈالے جانے کے بعد ملک میں قحط پڑ گیا، اور لوگ بھوک سے مرنے لگے، اس وقت گندم کے سارے ذخیرے نمرود کے پاس ہوتے تھے۔ لوگ اس کے پاس غلہ لینے کے لئے جاتے تھے، اور دربار میں پہلے سجدہ کرتے تھے، پھر درخواست پیش کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی وہاں اسی مقصد کے لئے پہنچے، مگر سجدہ نہ کیا، نمرود نے سجدہ نہ کرنے کی وجہ دریافت کی، تو انہوں نے جواب دیا کہ میں اپنے ربّ کے سوا کسی اور کا سجدہ نہیں کرتا، تو نمرود نے کہا کہ ربّ تو میں ہوں۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا: تم تو محض حاکم ہو، ربّ ہرگز نہیں ہو۔ ربّ وہ ذات ہے جو زندہ کرتا ہے، اور مارتا ہے۔ اس پر نمرود نے کہا: میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ اس پر وہ دو قیدی واجب القتل منگوائے، ایک کو قتل کیا، دوسرے کو معاف کیا۔

تب ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ نا ہنجان بے عقل ہے، زندگی کے معنی روح ڈالنے کے، اور مارنے کے معنی روح قبض کرنے کے ہیں، اور بیوقوف اتنی بات سمجھنے سے بھی قاصر ہے، تو اس کو دوسری محسوس چیز کے ذریعہ لا جواب کیوں نہ کیا جائے۔ تو فرمایا کہ میرا ربّ وہ ہے، جو سورج کو مشرق سے مغرب کی جانب کھینچ لاتا ہے، تو تم اسے مغرب کی طرف سے مشرق کی جانب لاؤ۔ اس پر وہ ہکا بکا اور حیران ہوا کہ اب کیا تدبیر کروں؟

وہ بآسانی یہ کہہ سکتا تھا کہ یہ مشرق سے مغرب کی طرف سورج کا سفر میرے حکم سے ہے۔ آپ اپنے ربّ کو کہو کہ اسے مغرب سے مشرق کی طرف چلائے، مگر وہ جانتا تھا کہ اگر کہوں گا، تو اس کا ربّ ہر چیز پر قادر ہے، جس طرح اس تاریخی آگ سے اسے بچا کر آگ کو گلزار بنا دیا، اسی طرح سورج کو مغرب سے چلا کر میرے خلاف اور اس کے حق

میں ایک ایسا انقلاب برپا کرے گا کہ ساری خلقت اس کی طرف متوجہ ہوجائے گی، اور میرا وجود و اقتدار سب خاک میں مل جائیں گے، تب اس نے کچھ نہ کہا، اور ہکا بکا حیران وخاموش رہا۔

بہر حال! نمرود لاجواب ہوا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو غلّہ دینے سے انکار کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں سے خالی ہاتھ واپس روانہ ہوئے، اور خیال پیدا ہوا کہ اس طرح خالی ہاتھ واپسی سے گھر والے پریشان ہوجائیں گے۔ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ پڑھ کر تھیلیوں کو ریت سے بھر کر اونٹ پر رکھ دیا۔ گھر پہنچ کر انہیں اتار دیا، اور تھکاوٹ دور کرنے کے لیے سو گئے۔ آرام کرلیا، کچھ دیر بعد جب اٹھے، تو گھر والوں نے کھانا پیش کیا۔ بہت عمدہ کھانا سامنے دیکھ کر پوچھا: یہ کہاں سے آیا؟ جواب ملا: آپ کے لائے ہوئے آٹے کی روٹی ہے۔ سمجھ گئے ربّ العزّت حق سبحانہ کی دستگیری ہے، فَاعۡتَبِرُوۡا يَاۤ اُولِی الۡاَلۡبَاب۔ یہ آپ کا معجزہ ہے۔ علیہ اَلف اَلف الصلوٰۃ والسلام۔

حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام پر فرمایا کہ نمرود جیسے جابر کو لاجواب کرنا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلب ودماغ میں اتنی جرأت وقوت پیدا کرنا، اور ریت کو عمدہ آٹے میں تبدیل کرنا، یہ نہایت ہلکی اور مختصر چیزیں ہیں، ربّ العزّت کی قدرتیں اور انعامات اتنی بکثرت اور بڑی ہیں کہ انسانی عقول کی رسائی وہاں تک نہیں ہوسکتی۔

پھر کیا ہوا؟ اسی نمرود بن کنعان کو لاکھوں فوجیوں سمیت ضعیف ترین، حقیر ترین مخلوق مچھروں کے لشکر کے ذریعہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹا کر جہنم رسید کیا۔ بیشک! تیرا ربّ گھات میں ہے۔ عاد، ارم، ثمود، شداد، فرعون، نمرود، ملوک فارس اور ملوک بابل کہاں گئے؟ صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ اللہ تعالیٰ سے یہی التجاء ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں اور دیگر دشمنانِ اسلام کے ساتھ بھی ایسا ہولناک آسمانی زمینی عذاب کے ذریعہ سلوک ہو۔ آمین

اَوۡ كَالَّذِىۡ مَرَّ عَلٰى قَرۡيَةٍ وَّهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوۡشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحۡىٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمۡ لَبِثۡتَ ؕ قَالَ لَبِثۡتُ يَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ يَوۡمٍ ؕ قَالَ بَلۡ لَّبِثۡتَ مِائَةَ عَامٍ فَانۡظُرۡ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمۡ يَتَسَنَّهۡ ۚ وَانۡظُرۡ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجۡعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانۡظُرۡ اِلَى الۡعِظَامِ كَيۡفَ نُنۡشِزُهَا ثُمَّ نَكۡسُوۡهَا لَحۡمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعۡلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۲۵۹﴾

ترجمہ: (کیا نہیں دیکھا آپ نے اس شخص کو) جو ایک بستی پر گزرا، جو کہ اپنی چھتوں پر گری ہوئی تھی، اس شخص نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو کیسے زندہ کرے گا، اس کے ویران ہونے کے بعد، پس اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر موت طاری کردی سو سال تک، پھر اسے اٹھایا، اور کہا کہ تو یہاں کتنی دیر تک رہا ہے؟ اس نے کہا: میں یہاں ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم رہا ہوں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہیں، بلکہ تو سو سال ٹھہرا ہے، پس دیکھ اپنے کھانے اور مشروب کی طرف، وہ متغیر نہیں ہوا، اور دیکھ اپنے گدھے کی طرف، اور تا کہ ہم تجھے لوگوں کیلئے ایک نشانی بنا دیں، اور دیکھ ہڈیوں کی طرف، کس طرح ہم ان کو ابھارتے ہیں، پھر ان کو گوشت پہناتے ہیں، جب اس شخص پر بات واضح ہوگئی تو وہ کہنے لگا: میں جانتا ہوں بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۲۵۹﴾

معارف ومنازل

﴿کَالَّذِیۡ﴾ میں کاف تشبیہ زائد ہے، اور الَّذِیۡ کا عطف الَّذِیۡ حَآجَّ پر ہے۔ یا یہاں عطف معنوی ہے اور پورے قصے کا قصہ پر عطف ہے۔ سابق قصہ میں ایک منکرِ حیات بعد الموت کا بیان ہوا، اور اس قصہ میں اس کے اثبات کا بیان ہے۔ اس اعتبار سے کافِ تشبیہ زائد نہیں ہوگا۔

قرآن کریم اور احادیث نے اس شخص کا تعارف بیان نہیں کیا، جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ تاریخی واقعات اور کتبِ تفسیر میں اس شخص کے بارے میں مختلف اقوال ہیں: مثلاً یہ کہ یہ شخص کوئی عام آدمی تھا، جو حیات بعد الموت کا منکر تھا، جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔ صاحب مظہری نے اس کو رد فرما کر کہا کہ کوئی کافر اس عزّت افزائی کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ حضرت ارمیاء علیہ السلام ہیں، جو یروشلم بیت المقدس کی تباہی سے کچھ وقت پہلے وہاں جب بنی اسرائیل کی سرکشی از حد زیادہ ہوگئی، تو وہاں سے چلے گئے، پیچھے سے جب بخت نصر نے یروشلم کو تباہ کیا، تو وہ کسی وقت دوبارہ وہاں آئے۔ یہ سب کچھ تباہی کا منظر دیکھا، اور افسوس کرتے ہوئے فرمایا: ﴿اَنّٰی یُحۡیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعۡدَ مَوۡتِهَا﴾۔

تیسرا قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، اور یہی بکثرت مشہور بھی ہے، کہ یہ حضرت عزیر بن شرخیاء علیہ السلام تھے۔ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے، اور سلیمان علیہ السلام سے بعد کا ہے۔ جب بنی اسرائیل کی سرکشی حد سے تجاوز کرگئی، اور انہوں نے اپنے پیغمبروں کے ساتھ بھی زیادتیاں شروع کیں، اور کئی انبیاء کرام علیہم السلام کو شہید کیا، تو ان پر عذابِ الٰہی کا اس طرح نزول ہوا کہ بخت نصر نے ان کے بلاد پر زبردست چڑھائی کی۔ شام وفلسطین کو تباہ و

برباد کیا۔ یروشلم بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ بے شمار بنی اسرائیلیوں کو قتل کیا، عورتوں، بچوں اور ہزاروں جوانوں کو قیدی بنایا، اورانہیں غلام ولونڈی بنا کر بابل لے گیا۔ انہیں لوگوں میں حضرت عزیر علیہ السلام بھی شامل تھے۔ یہ زمانہ ملوکِ فارس کے بادشاہ لہراسپ کا تھا۔ دراصل بادشاہ یہی تھا، اور بخت نصر اس کا گورنر تھا۔

مؤرخ طبری نے کچھ اس طرح لکھا ہے: لہراسپ بن قنوج بن کیمس بن کیناسس بن کیناسہ بن کیقباذ وَهُوَالَّذِیْ غَضَبَ عَلٰی بَنِیْ اِسرائیل وَاَهْلَكَهُمْ وَشَتَّتَ شَمْلَهُمْ حَیْثُ عَیَّنَ بُخْتَ نَصَرِ مرزَبَانَ بَابُلَ وَ الْعِرَاقَ وَمَعْنیٰ مرزَبَان اَلنَّائِبُ وَالْحَاكِمُ عَلٰی حِصَّةٍ مِّنَ الْمُلْكِ (گورنر) وَكَانَ اِسْمُهٗ بِالْفَارِسِيَّةِ بَخْتَرشَه (بخت نصر کا نام) وَهٰذَاهُوَ الْاَصَحُّ۔ [اثمار التکمیل: ج ۲/ص ۳۴]

الغرض! یروشلم اور دوسرے بڑے بڑے شہر سب تباہ ہو گئے۔ بنی اسرائیل بکثرت مارے گئے، بقایا بحیثیت غلام ولونڈی قید ہو کر بابل عراق لے جائے گئے۔ حضرت عزیر علیہ السلام قید سے رہا ہو کر یروشلم آئے، اور حسرت و ارمان کے ساتھ کہنے لگے: پتہ نہیں یہ اجڑی ہوئی بستی اللہ کے حکم کے ساتھ دوبارہ کب اور کیسے آباد ہوگی؟ یہ استفسار شک کی بنا پر نہیں تھا، بلکہ ظاہری اسباب کی کمی اور فقدان کی بنا پر تھا، اور لوگوں کی کمی بھی پیش نظر تھی، کیونکہ سارے لوگ عراق میں مقید تھے، وہ یہ کہتے ہوئے سو گئے، اور سو سال تک سوتے رہے۔ پیچھے سے ارحم الراحمین کی فیضانِ رحمت ہوئی۔ لہراسپ بادشاہ مر گیا، اس کی جگہ اس کا بیٹا گشتاسپ بادشاہ بنا، یہ بڑا اچھا رحمدل منصف مزاج تھا۔ باپ کی طرح سخت گیر ظالم نہ تھا۔ اس نے تمام بنی اسرائیلیوں کی قید سے رہائی کا فرمان جاری کیا، اور ان کو واپس اپنے ملک میں جانے، اور اسے آباد کرنے کی اجازت دی (حوالۂ بالا)۔

جب وہ لوگ اپنے ملک واپس لوٹے، اور پہلا کام ملک کی تعمیر وترقی کا شروع کیا، تو صرف تیس یا ستر سال کے عرصہ میں یروشلم کو دوبارہ تعمیر کر لیا۔ پہلے سے عمدہ اور خوبصورت طرز پر بنایا۔ عین اسی وقت حضرت عزیر علیہ السلام سو سالہ خوابِ استراحت سے بیدار ہوئے، اور شہر کا خوبصورت ودلکش منظر دیکھ کر متعجب ہوئے۔

یہ بات کسی بھی روایت میں نہیں کہ انہوں نے شہر کے اندر واقع کھنڈرات میں آرام کیا تھا، بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تباہ شدہ شہر سے گزر کر میدان کے ساتھ کسی درخت کے نیچے آرام فرمایا تھا، اس طرح کہنے میں کسی بعید تاویل کی ضرورت نہیں ہوگی کہ شہر والوں نے انہیں کیوں نہیں دیکھا؟ البتہ! اگر اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت کے تحت انہیں لوگوں کی نظروں سے مخفی رکھا ہو، تو کوئی بعید نہیں ہے۔

بہر حال! جب وہ لمبی نیند سے بیدار ہوئے، تو یہ غروب سے قبل کا وقت تھا۔فرشتے نے پوچھا کہ آپ یہاں کتنا عرصہ سوئے؟ انہوں نے کہا: ایک دن، یا دن کا کچھ حصہ۔فرشتہ نے کہا: آپ کو سوتے ہوئے ایک سو سال گزر گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کو کرشمہ کے طور پر انہیں دکھایا کہ اس سو سال کے عرصہ میں ان کا کھانا بالکل تروتازہ تھا، خراب نہیں ہوا تھا۔اس میں کھجور، انگور کا شیرہ اور انجیر وغیرہ تھا۔البتہ! سواری کا گدھا مر چکا تھا، اور اس کی ہڈیاں بوسیدہ حالت میں بکھری ہوئی تھیں، پھر اللہ تعالیٰ نے باتوں باتوں میں منتشر ہڈیوں کو آپس میں ملا کے گدھے کو زندہ فرمایا۔ جب عزیر علیہ السلام سو سالہ نیند سے دوبارہ اٹھائے گئے، تو وہ شہروں کو آباد دیکھ کر حیران رہ گئے، کہ میلوں تک پھیلے ہوئے کھنڈرات ہنستے بستے شہروں میں تبدیل ہو چکے تھے، اور پہلے سے زیادہ بارونق نظر آ رہے تھے۔

دیکھیں! یہ شکست وریخت دنیا کی بے ثباتی کی علامت ہے۔نافرمانیوں کا نتیجہ ویرانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کی ویرانی اور آبادی پر قادر ہے۔ جب جانوروں (غیر مکلّف حیوانات) کے منتشر اجزاء کو اکٹھا کر کے انہیں دوبارہ زندہ کرتا ہے، تو اشرف المخلوقات انسانوں کو دوبارہ کیوں زندہ نہیں کر سکتا؟ اور جب وہ سو سال تک انگور و انجیر جیسے جلدی خراب ہونے والی چیزوں کی حفاظت ایک سو سال تک کر سکتا ہے، تو بندوں کے اعمال کی حفاظت بطریق اولیٰ کر سکتا ہے۔ جب وہ ایک مخلص بندہ کی سو سال تک بحالتِ خواب تحفظ پر قادر ہے، تو وہ اصحابِ کہف اور دیگر شہداء وصالحین کے اجسام، اور اجساد کی حفاظت بھی کر سکتا ہے، کیونکہ وہ ہر شئے پر قدرت رکھتا ہے۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا قول اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ وابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان، اور سدی رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ جب سو برس تک مردہ رکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے عزیر علیہ السلام کو زندہ کر دیا، تو وہ گدھے پر سوار ہو کر اپنے محلہ میں آئے، لیکن نہ وہ لوگوں کو پہچان سکے، نہ ان کے مکانوں کو، اور نہ لوگوں نے ان کو پہچانا۔صرف اندازے سے اپنے گھر پر پہنچے، تو ایک نابینا اپاہج زدہ بڑھیا سامنے آئی، جس کی عمر ایک سو بیس سال تھی، حقیقت میں وہ حضرت عزیر علیہ السلام کی باندی تھی، جب حضرت عزیر علیہ السلام گھر سے نکلے تھے، تو اس باندی کی عمر بیس سال تھی۔ آپ علیہ السلام نے اس بڑھیا سے پوچھا: کیا یہ عزیر کا مکان ہے؟ بڑھیا نے کہا: جی ہاں! لیکن میں عزیر کا تذکرہ اتنی مدت کے بعد آج آپ سے سن رہی ہوں، اور تم کون ہو، جو عزیر کو یاد کر رہے ہو؟ حضرت نے فرمایا: میں عزیر ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے سو سال تک مردہ رکھا، پھر زندہ کر دیا۔نابینا بڑھیا نے کہا کہ عزیر تو مستجاب الدعوات آدمی تھے۔ اگر تم عزیر ہو، تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ میری آنکھیں مجھے واپس روشنی کے ساتھ مل

جائیں۔

حضرتؑ نے دعا کی، تو اس کی آنکھیں ہاتھ پھیرنے کے ساتھ روشن ہو گئیں، پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: اللہ تعالیٰ کے حکم سے کھڑی ہو جاؤ۔ بڑھیا تندرست ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی، اور حضرت کو دیکھ کر پہچان لیا، اور بولی کہ میں شہادت دیتی ہوں کہ آپ بلاشبہ حضرت عزیر ہیں۔ اس وقت حضرت عزیر علیہ السلام کا بیٹا سو سال سے زائد عمر کا بوڑھا تھا، اور اس کے بال سفید تھے، جبکہ حضرت کے بال سیاہ تھے۔ آپؑ کے پوتے پوتیاں سب بوڑھے ہو چکے تھے۔ باندی آپ کے ساتھ چل کر بنی اسرائیل کے جلسوں میں پہنچی، اور باندی پکار پکار کر کہتی رہتی تھی: لوگو! تمہیں مبارک ہو! یہ عزیر ہیں۔ لوگوں کو کیا یقین ہوتا کہ عزیر سو سال کے بعد زندہ ہوں گے۔ اور پھر مزید یہ کہ جو ہمارے سامنے ہے جوان ہے، اس کی تو داڑھی اور سر کے بال سیاہ ہیں۔

باندی مسلسل چیختی رہی، اور اپنی آنکھوں اور پاؤں کی تندرستی کا حوالہ دیتی رہی، چونکہ بخت نصر نے تورات کے تمام نسخوں کو ایک ایک کر کے جلا دیا تھا، اب اس وقت تورات کا کوئی ایک نسخہ بھی دستیاب نہ تھا، تو لوگوں نے کہا کہ عزیر علیہ السلام کو تورات یاد تھی، اور کسی کو یاد نہیں رہی، اگر آپ واقعی عزیر ہیں، تو ہمیں تورات سنائیں۔ اس پر وہ شروع ہوئے، اور تورات کے مختلف مقامات سے فر فر سنانا شروع کیا۔ اس موقع پر حضرت عزیر علیہ السلام کے بیٹے نے کہا کہ میرے والد عزیر علیہ السلام کے دونوں شانوں کے درمیان ہلالی شکل کا ایک سیاہ مسہ تھا، جب کھول کر دیکھا گیا، تو وہ مسہ بعینہٖ موجود تھا۔ اب تمام لوگوں کو پختہ یقین ہو گیا کہ یہی حضرت عزیر علیہ السلام ہی ہیں۔ پھر انہوں نے لوگوں کو سارا ماجرا سنایا، جس سے ان کا عقیدہ مزید پختہ ہو گیا۔ پھر آپ نے مکمل تورات زبانی لکھی، اور لوگوں کو لکھوائی، اس طرح اس کے متعدد نسخے تیار ہوئے۔

اس معجزہ و کرامت سے جہاں ہزاروں لوگوں کے عقائد درست ہوئے، اور پوری ملت میں حیات بعد الموت کی حقانیت کا چرچا ہوا، وہاں ناشکرے و نافرمان لوگ اپنے پیش رووں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حضرت عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کا لقب و درجہ دے کر گمراہ ہوئے۔ ﴿فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ﴾ کے مستحق ٹھہرے۔

فائدہ:

حضرت عزیر علیہ السلام کی یہ سو سالہ موت ایک عارضی موت تھی، محض تنبیہ اور اثباتِ حیات بعد الموت کے وجود و تحقیق کے لئے، تاکہ علم الیقین کا درجہ عین الیقین و حق الیقین تک پہنچ جائے۔

اس کے بعد متصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ آنے والا ہے۔ یہ واقعہ اس کے لئے بطورِ مقدمہ وتمہید ہے، اور جب یہ سوسالہ موت عارضی موت قرار پائی، تو اس پر برزخی زندگی کے آثار مرتب نہیں ہوئے، اسی وجہ سے ان کو احساس نہیں ہوا، بلکہ وہ کہنے لگے: ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ سویا پڑا ہوں۔

مقصدِ اصلی اس واقعہ کا قدرتِ کاملہ باری تعالیٰ کا ظہور ہے، اور اس میں عقلمندوں کے لئے کئی وجوہات سے سامان عبرت ہے، فرمایا:

﴿أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا﴾ [الآیۃ] (کیا آپ کے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ شخص جو ایک بستی پر گزرا، اور اس بستی کی حالت زار یہ تھی کہ اس کی دیواریں اپنی چھتوں پر گری ہوئی تھیں)۔ نہایت خستہ حالت میں تباہ ہو چکی تھیں، اور پوری بستی ملبے کا ڈھیر بن چکی تھی۔ ﴿إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً ۖ وَكَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ﴾ [النمل: ۳۴] (بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو تباہ کر دیتے ہیں، اور وہاں کے عزّت والوں کو ذلیل کر دیا کرتے ہیں، اور اسی طرح یہ بھی کریں گے)۔

فرمایا: ﴿أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (اللہ تعالیٰ اس بستی کو اتنی تباہی کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟) بہر حال! یہ تعجب دوطرفہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو دوبارہ کیسے آباد کرے گا؟ یا اس کے رہنے والوں کو، جو مر چکے دوبارہ کیسے زندہ کرے گا؟ پیغمبر کا یہ کہنا کسی شک کا نتیجہ ہرگز نہیں، کیونکہ انبیاء علیہم السلام اس قسم کے شکوک وشبہات سے پاک ہیں، بلکہ یہ ایک صدمہ وافسوس کا اظہار ہے۔ پس جواب آگیا:

﴿فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ﴾ حکیمانہ اسلوب سے انہیں سمجھایا جا رہا ہے، کہ عالمِ اسباب میں یہی طریقہ موزون ومناسب معلوم ہوا، کہ ایک مدّت تک انہیں موت دے دی جائے، تا کہ اس عرصہ میں بستی کی بارونق تعمیر وزندگی ممکن ہو، پس ایسا ہی ہو گیا۔

﴿قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ فرمایا تم اس حالت میں کتنا عرصہ رہے؟ عرض کیا: ایک دن یا کچھ کم عرصہ رہا ہوں)۔

﴿قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بلکہ تم ایک سو سال تک ٹھہرے، ذرا دیکھ تو لو: ﴿إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾ ذرّا اپنے کھانے اور مشروب کی طرف دیکھو! وہ اتنے بڑے عرصے میں یہاں پڑا رہا، اور خراب نہیں ہوا، حالانکہ اتنے عرصے میں لوہے اور پیتل بھی زنگ آلود ہو کر گھس جاتے،

اور ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ برتن میں رکھا ہوا پانی بھی خشک ہو جاتا ہے، اور یہ تمہارا جسم اسی عرصہ میں بارشوں، ہواؤں، دھوپ، سردی و گرمی میں ایسا محفوظ تر و تازہ رہا کہ معلوم ہو رہا ہے بقولِ تمہارے ایک دن کا مختصر وقفہ تم پر گزرا ہے۔ تم سو سال تک درخت کے نیچے زمین کے اوپر رہے۔ چاروں طرف لوگوں کی آمد و رفت کے باوجود ان کی نظروں سے مخفی رہے۔ کوئی شخص ایک ماہ نہیں چھپ سکتا، اور تم سو سال تک ایک کھلے میدان میں چھپے رہے۔

اصحابِ کہف کا واقعہ اس سے تقریباً نو سو سال بعد کا ہے۔ وہ بھی تین سو نو سال تک مخفی رہے، حالانکہ وہ غار آبادی سے دس پندرہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ یورپ، امریکہ وغیرہ نے پوری زمین کا چپہ چپہ چھان کر دیکھا، اور دیکھ رہے ہیں۔ دنیا کی ادنیٰ اور چھوٹی چیزوں تک ان کی رسائی ہوئی ہے، مگر یاجوج و ماجوج اور سدّ ذوالقرنین اللہ تعالیٰ سبحانہ نے ایسے پردۂ خفا میں رکھا ہے کہ انہیں نظر نہیں آتا، فرمایا: ﴿وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ﴾ [الأعراف: ۱۹۸] (وہ تمہیں ایسے نظر آتے ہیں جیسے تمہیں دیکھ رہے ہوں، لیکن حقیقت میں انہیں کچھ بھائی نہیں دیتا)۔ اسی طرح یورپ اپنے باپ دجالِ اکبر کے دیکھنے کے لئے بے تاب ہے، اربوں ڈالر خرچ کئے، اور کر رہا ہے، مگر انہیں کامیابی نہیں ہوتی۔ یہ تکوینی نظام کا سربستہ راز ہے، جس تک انسانی رسائی ممکن نہیں۔

﴿وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ﴾ ذرا اپنے گدھے کی طرف دیکھو! کہ اس پر کیا گزرا ہے؟ اور اس کا حشر کیا ہے؟

﴿وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ﴾ یہ سارے حقائق اسی لئے پیش آئے، تاکہ ہم آپ کو لوگوں کے لئے ایک زندۂ جاوید نمونہ بنائیں، اور اقوامِ عالم کے منکرین کے لئے جیتی جاگتی حجت اور کارنامہ کے طور پر پیش کریں۔ اب ذرا اپنے گدھے کو دیکھو! ﴿كَيْفَ نُنْشِزُهَا﴾ ہم اس کا ڈھانچہ کیسے تیار کرتے ہیں؟ اگر اس کو "راء" کے ساتھ پڑھا جائے، جیسے دوسری قرأت ہے، بمعنی نشور کے، تو مزید حشر و نشر کی وضاحت ہو جائے گی۔ ہم ریزہ ریزہ اور بوسیدہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر ﴿ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا﴾ پھر لمحوں میں اس پر گوشت چڑھاتے ہیں، چنانچہ چشمِ زدن میں یہ مرحلہ طے ہوا، اور گدھے نے زندہ ہو کر آواز دینا شروع کیا۔ فتبارک اللہ رب العلیمن

﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد وہ کہنے لگے: بیشک! میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر، اور سب کچھ کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔

☆ ☆ ☆

فائدہ:

انبیاء کرام علیہم السلام کا مقام اتنا بلند و بالا ہے کہ وہاں تک عام لوگوں کی عقل کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ کے کمالات اور قدرت کے سارے مظاہران کے مشاہدہ سے باہر نہیں۔ شکوک وشبہات اور بے یقینی کی کیفیتوں کا ان کے دل و دماغ پر ہرگز گزر نہیں ہوتا۔ گزشتہ آیتوں میں حضرت عزیر علیہ السلام کا سوال ہو، یا آئندہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال ہو، وہ ہرگز کسی شک پر مبنی نہیں ہے، بلکہ ترقی مدارج، یعنی ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف سیر پر مبنی ہے۔ انہیں علم الیقین ہر لمحہ حاصل ہے، اور وہ اس درجہ سے بالا والے درجہ پر روحانی پرواز کے ذریعہ وصول چاہتے ہیں کہ انہیں عین الیقین اور حق الیقین حاصل ہو، تو اسی کے حصول کی خاطر سوال کر کے وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، تو ربّ العزّت انہیں روبرو براہِ راست مشاہدہ کرا کے حق الیقین تک پہنچا دیتا ہے۔

فائدہ:

حضرت عزیر علیہ السلام کی سواری گدھے کا تذکرہ قرآن حکیم میں کسی حکمت پر مبنی ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی سواری بیشتر یہی گدھا ہوتا رہا ہے۔ کبھی اونٹنی، کبھی گھوڑوں پر پیغمبروں نے سواری کی ہے، اور اس سواری میں انکساری اور تواضع ہے، یہی انبیاء کرام علیہم السلام کی مخصوص صفت ہے۔ ہمارے پیشوا سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سواری کے لئے اونٹنی اور گھوڑے کے علاوہ ایک گدھا بھی ہوتا تھا، جس کا نام ''یعفور'' تھا۔ یہ عام گدھوں کی طرح نہیں ہوتا تھا، بڑا صابر وشاکر اور اعلیٰ درجہ کا سمجھدار اور ہوشیار ہوتا تھا۔ گھر کے سامنے فاصلہ پر اس کا اصطبل ہوتا تھا۔ جب کبھی رات کو سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی صحابی کے ساتھ ضروری کام ہوتا، تو آپ ''یعفور'' کو حکم دیتے کہ جاؤ فلاں کو یہاں لے آؤ۔ یہ گدھا سیدھا اس کے گھر پر جا کر سر سے دروازہ مار مار کر اسے اطلاع دیتا، اور سونڈ ناک سے اشارہ کرتا تھا کہ دربارِ عالی پر حاضری دے دو، وہ شخص چلتا، تو یہ آگے چل کر رہنمائی کرتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مدینہ کے ایک غیر آباد کنویں میں صدمہ برداشت نہ کرتے ہوئے خود کو گرا کر ہلاک کر دیا۔ [الروض سهيلي]

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ
لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ

مِّنۡهُنَّ جُزۡءًا ثُمَّ ادۡعُهُنَّ يَأۡتِيۡنَكَ سَعۡيًا ؕ وَاعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ۲۶۰

ترجمہ: اور اس بات کو یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے پروردگار سے کہا کہ مجھے دکھا، تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تم یقین نہیں رکھتے؟ ابراہیم نے کہا: کیوں نہیں؟ میں یقین رکھتا ہوں، لیکن یہ اس لئے تا کہ میرا دل اطمینان پکڑے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: چار پرندے پکڑلو، اور پھر انہیں اپنے پاس مانوس کرلو، (یا اپنے پاس ٹکڑے ٹکرے کرلو) پھر ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک ایک جزء رکھ دو، پھر ان کو آواز دے کر بلاؤ، وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے، اور جان لو کہ بیشک! اللہ تبارک وتعالیٰ کمال قدرت کا مالک، حکمت والا ہے ۲۶۰

معارف منازل

اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اتنا مہربان ہے، جس کا کوئی اندازہ نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلّت کا مقام عطا کیا گیا، اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس سوال کو بھی پورا کردیا، جوانہوں نے اپنی خلّت کی بناء پر کیا تھا، اور عام طور یہ کسی اور کو نہیں دکھایا جاتا، خواہ وہ کتنی بڑی ہستی کیوں نہ ہو؟ فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ نُرِيۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ مَلَكُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلِيَكُوۡنَ مِنَ الۡمُوۡقِنِيۡنَ﴾ [الأنعام:۷۵] (اور ہم اس طرح ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات دکھانے لگے، تا کہ وہ خوب یقین کرنے والوں میں سے ہوجائیں)۔

اسی طرح علویات وسفلیات کے نہایت محکم اور عجیب وغریب نظامِ ترکیبی کی گہرائیوں تک سب حقائق و اسرار پر ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو مطلع کیا، تا کہ انہیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے وجود ووحدانیت، عظیم قدرتوں پر اور تمام مخلوقاتِ سماوی وارضی کے محکومانہ عجز وبیچارگی پر استدلال کریں، اور اپنی قوم کے عقیدۂ کواکب پرستی وہیکل پرستی کو اور ہیکل سازی کو علیٰ وجہ البصیرت رد کرسکیں، اور خود بھی حق الیقین کے اعلیٰ مرتبہ ودرجہ پر فائز ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام ومرتبہ:

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور کمالِ قدرت کے تین واقعات بیان ہوئے، اور ہر واقعہ دوسرے کے لئے بمنزلہ مقدمہ وتمہید کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ تیسرا واقعہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حقائقِ اشیاء کی جستجو اور طلب کا طبعی ذوق تھا، اور وہ ہر شئے کی حقیقت تک پہنچنے کی سعی کو اپنی زندگی کا خاص مقصد سمجھتے تھے، تا کہ ان کے ذریعہ ذات واحد (جل جلالہٗ) کی ہستی، اس کی وحدانیت، اور اس

کی قدرتِ کاملہ کے متعلق علم الیقین کے بعد عین الیقین، اور اس کے بعد حق الیقین حاصل کر سکیں۔ اسی جستجو اور طلب کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے آپؑ پر ملکوت السمٰوٰت والارض کے حقائق منکشف کئے، اور انہیں سیر کرائی، چنانچہ نمرود، آزر اور قوم کے ساتھ مناظروں میں ان کے اس طبعی ذوق کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حیات بعد الممات، یعنی موت کے بعد دوبارہ زندگی کے متعلق اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ وہ کس طرح مردوں کو زندہ کرے گا؟ تو اس کیفیت کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کی بنیاد پر سوال کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا: اے ابراہیم! کیا تم اس مسئلہ پر یقین واذعان اور ایمان نہیں رکھتے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فوراً جواب دیا، کیوں نہیں! میں بلاتوقف وبلاتردد اس پر ایمان رکھتا ہوں، لیکن میرا یہ سوال ایمان ویقین کے خلاف اس لئے نہیں کہ میں علم الیقین کے ساتھ حق الیقین اور عین الیقین کا خواستگار ہوں، یعنی جو حقیقت احیاء الاموات کا مجھے پختہ معلوم ہے، میں اس کی کیفیت کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔ میری تمنا ہے کہ آپ (جل جلالہٗ) مجھے آنکھوں سے مشاہدہ کرادے، کہ اس ''حیات بعد الممات'' کی شکل وصورت کیا ہوگی؟

تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا! اگر تم کو اس کے مشاہدہ کی طلب ہے، تو چار پرندے لے لو، اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے قیمہ بناؤ، پھر انہیں باہم مخلوط کرو، اور خوب ملالو، پھر چار پہاڑوں پر ان کے ذرّات منتشر و پراگندہ کر کے ڈال دو، پھر فاصلہ پر کھڑے ہو کر ہر ایک کو الگ الگ باری باری سے آواز دے کر پکارو (بلالو)۔ پس یہ پرندے باری باری منتشر اجزاء کی ترکیب کے بعد نئی زندگی پا کر دوڑتے ہوئے آپ کے پاس آئیں گے، (جیسے عزیر علیہ السلام کے گدھے پر مشاہدہ ہوا)۔

پس ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا، کہ جب اس نے پرندوں کو آواز دی تو ان سب کے اجزاء علیحدہ علیحدہ ہو کر فوراً اپنی اپنی شکل پر آگئے، اور زندہ ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس چلتے ہوئے (بعض علماء نے کہا: اڑتے ہوئے) چلے آئے۔

اب رہا یہ سوال کہ وہ چار پرندے کون کون سے تھے؟ قرآن پاک میں تو ان کی تفصیل نہیں ہے، کیونکہ ان کی تعیین کے ساتھ کوئی خاص دینی مسئلہ وابستہ نہیں ہے۔ البتہ! مفسرین حضرات فرماتے ہیں کہ یہ چار پرندے یہ ہیں: مرغ، کوّا، کبوتر، مور (طاؤس)۔ بعض علماء نے کوے کی جگہ گدھ کا ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم

☆ ☆ ☆

علم کی اقسام اور مراتب:

یقین: مضبوط اعتقاد اور اذعانِ محکم کو کہتے ہیں، جو کسی بھی حالت میں شک وشبہ کی راہ سے متزلزل نہ ہو سکے، اس لئے یہ (یقین) ایمان بالحق کے لئے اساس وبنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ البتہ! اعتقادِ جازم کے باوجود مراتب ودرجات کے لحاظ سے اس میں تفاوت بھی پایا جاتا ہے۔ جس کو علمی اصطلاح میں علم الیقین، عین الیقین، اور حق الیقین کہا جاتا ہے۔

علم الیقین:

اگر کسی مسئلہ میں جہل ونادانی کے خلاف دلیل وبرہان کے ذریعہ علم ودانش اس حد تک حاصل ہو جائے کہ تردد اور تذبذب کی راہیں مسدود ہو کر رہ جائیں، تو اس کا نام علم الیقین ہے۔

عین الیقین:

اور اگر یہ علم دلیل وبرہان سے آگے مشاہدہ اور محسوس کی حد میں داخل ہو جائے، اور دلیل کے ساتھ پوری پوری مطابقت نظر آ جائے، تو پھر اس حاصل شدہ یقین کو عین الیقین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حق الیقین:

علم الیقین اور عین الیقین تک رسائی کے باوجود فطرتِ انسانی ابھی مزید یقین کی طالب ہوتی ہے، اور وہ چاہتی ہے کہ جس شئی کو محکم دلیل کی روشنی میں سمجھا اور جانا جائے، نیز مشاہدہ وحس کے ذریعہ اس کو مزید تقویت بھی مل جائے، اچھا ہوگا کہ اس کا کیف وکم سب ہی سامنے آ جائے، اور حقیقتِ حال تک پہنچنے کی راہ نکل آئے، پس جب فطرتِ انسانی یقین اس درجہ پر قابو پالیتی ہے، تو اس کو حق الیقین کہا جاتا ہے۔

ایک مثال کے ذریعے وضاحت:

مثلاً سیب ایک عمدہ پھل ہے، اس کے جاننے اور معلوم کرنے کا پہلا درجہ یہ ہے کہ کوئی شخص عوام وخواص، ثقہ اور غیر ثقہ سے تواتر اور شہرت کی حد تک اس کے وجود اور اس کی تعریف کو سنے کہ جس کے انکار کے لئے کوئی شک وشبہ، تردد اور تذبذب باقی نہ رہے، تو سیب کے متعلق اس یقین کا نام ''علم الیقین'' ہے۔ اور حسنِ اتفاق سے سیب کے باغ میں جا کر اس کو دیکھ لے، تو یقین کا یہ درجہ ''عین الیقین'' ہی ہوگا۔ اور اگر آنکھوں سے رنگ وروپ کا مشاہدہ کر لیا،

ناک سے سونگھا، زبان سے اس کی لذّت ومزہ اور لطافت چکھ کر معلوم کرلی، یہ تمام اوصاف حاصل ہوئے، تو یہ ''حق الیقین'' کا درجہ کہلائے گا۔اور یقین کا یہ وہ آخری درجہ ہے، جو فطرتِ انسانی کے تقاضائے تشنگی کی سیرابی کے لئے کافی ووافی ہوتا ہے، اور انسان کی دسترس کی معراج سمجھا جاتا ہے۔اس کے بعد حق الیقین کے بھی مختلف مراتب ودرجات ہیں، انبیاء علیہم السلام، واولیاء، اُخص، وخواص اور عوام کے اعتبار سے۔واللہ اعلم

یقین اور طمانیت قلب دو الگ چیزیں ہیں، اسی لئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا: اے پروردگارِ عالم! تیری قدرت (احیاء اموات) پر مجھے پورا یقین ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔مگر میں قلبی اطمینان چاہتا ہوں، جو کہ اس سے اگلا درجہ ہے۔مجھے وہ چیز میری آنکھوں سے مشاہدہ کرادے، کہ مردے کس طرح زندہ ہوتے ہیں؟

عام اہلِ ایمان کے لئے تو ایمان بالغیب ہی کافی ہے، اور وہ علم الیقین کے مکلّف ہیں۔انہیں عین الیقین کا درجہ ضروری نہیں ہے، کہ خواہ مخواہ حاصل ہو، بخلاف انبیاء کرام علیہم السلام کے کہ انہیں جو خدمت سپرد کی گئی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ حقائق اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کریں، تب تو وہ دنیا کو اس کی دعوت دے سکتے ہیں۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جو فرمایا: ﴿وَ كَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [الأنعام: ۷۵] (اور ہم اس طرح ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات دکھانے لگے)۔اس کا بھی یہی مطلب ہے، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج، آسمانوں پر عروج اور پھر جنت، دوزخ، حوض کوثر اور دیگر بہت سی چیزوں کا معائنہ وملاحظہ اسی نکتہ کی بنیاد پر ہے، کہ وہ جن حقائق کی طرف خلقِ خدا کو دعوت دیتے ہیں، تو ضروری ہے کہ وہ چیزیں ان کو مشاہدہ کے ساتھ معلوم ہوں، تو عوام کا ایمان بالغیب رہا، اور انبیاء علیہم السلام کا ایمان بالشہادۃ لازمی ٹھہرا۔واللہ اعلم

﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى﴾ سے ﴿وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ تک۔اور اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اے پروردگار! مجھے یہ چیز مشاہدہ کرائیں کہ آپ بروزِ قیامت مردوں کو کس کیفیت سے زندہ کریں گے؟ اور مرنے کے بعد انسان کے منتشر بکھرے ہوئے اجزاء کو کیسے جمع کرکے ترکیب دیں گے؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اے ابراہیم! کیا تم مردوں کے زندہ ہونے پر ایمان اور یقین نہیں رکھتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: کیوں نہیں؟ میں مردوں کے زندہ ہونے پر پورا پورا یقین رکھتا ہوں، لیکن یہ درخواست اس لئے کر رہا ہوں تاکہ زندہ ہونے کی کیفیت مشاہدہ اور معائنہ کرکے میرے قلب کو سکون اور اطمینان حاصل ہوجائے، اور علم الیقین سے بڑھ کر عین الیقین کا مقام حاصل ہوجائے۔میرا مقصد یقین میں

اضافہ نہیں، بلکہ مشاہدہ کی صرف کیفیت ہے۔

فرمایا: یہ کرو تم چار پرندے لے لو، پھر ان کو مانوس کرو، پھر ذبح کر کے قیمہ تیار کرو، انہیں آپس میں یک جان کر کے ملالو، پھر ان کے اجزاء مختلف چار پہاڑوں پر رکھ دو، پھر انہیں آواز دے کر بلالو، تو وہ یکجان وزندہ ہوکر تمہارے پاس آجائیں گے، اور جب یہ سب کچھ کر چکے، اور مشاہدہ بھی ہوا، تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ عزیز اور حکیم ہے۔ چنانچہ یہ پورا منظر مشاہدہ کے مرحلہ سے گزر کر باعثِ اطمینان بنا۔ الحمد للہ ربّ العٰلمین۔

﴿فَصُرْهُنَّ﴾ بلانے کے معنی میں ہے، باب نَصَرَ اور ضَرَبَ دونوں سے پڑھا جاتا ہے، اور لفظِ مشترک ہے، بمعنی مائل کرنا، ہلانا، پارہ پارہ اور ٹکڑے ٹکڑے کرنا، یہ کلمہ صاد کے پیش اور کسرہ (زیر) دونوں کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کو بمعنی القطع بتایا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

یہاں یہ وہم پیدا ہوسکتا ہے کہ اس سوالِ ابراہیمی سے کم از کم اتنا تو معلوم ہوا کہ ان کو حیات بعد الموت پر اطمینان حاصل نہ تھا، حالانکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ آپؓ نے فرمایا: اگر عالم غیب کا پردہ اٹھا دیا جائے، تو میرے یقین واطمینان میں کوئی زیادتی نہ ہوگی، کیونکہ مجھے ایمان بالغیب ہی سے اطمینان کامل حاصل ہے، تو جب بعض امتیوں کو درجۂ اطمینان حاصل ہے، تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خلیل کو درجۂ اطمینان حاصل نہ ہو؟ لہٰذا جب اطمینان حاصل ہے تو پھر آپؑ نے یہ سوال کیوں کیا؟

اس کے متعلق یہ سمجھنا چاہئے کہ اطمینان کے بھی بہت سے درجات ہیں: ایک وہ اطمینان ہے جو اولیاء اللہ اور صدیقین کو حاصل ہوتا ہے، اور ایک اس سے بھی بلند ہے، جو کہ اَخصّ الخواص کو بصورتِ مشاہدہ عطا فرمایا جاتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جو درجہ اطمینان حاصل تھا، وہ بلاشبہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو حاصل تھا، لیکن اطمینان کا اس سے اعلیٰ ایک اور درجہ ہے، جو مقامِ نبوت کے ساتھ خاص ہے، جس میں حضرت خلیل اللہ علیہ السلام سب امتیوں سے فائق تھے، تو جس اطمینان کو وہ طلب فرما رہے ہیں، وہ یہی سب سے اعلیٰ مقامِ اطمینان ہے، جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے، اور خاص انبیاء علیہم السلام کو عطاء کیا جاتا ہے، جیسے سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شب معراج جنت ودوزخ کا مشاہدہ کرا کر بخشا گیا، اور خاص مشاہدۂ عالم ملکوت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نوازا گیا۔

الغرض! اس سوال کی وجہ سے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان حاصل نہ تھا۔ ہاں! وہ کامل

اطمینان جو مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے، وہ نہ تھا، اس لئے انہوں نے مطالبہ کیا۔

﴿اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ اللہ تعالیٰ غالب ہیں، اور حکمت والے ہیں۔ غالب ہونے میں قدرتِ کاملہ کا بیان فرمادیا، اور حکمت والا کہہ کر اس طرف اشارہ کیا کہ بمقتضائے حکمت ہر ایک کو حیات بعد الموت کا مشاہدہ نہیں کرایا جاتا، ورنہ حق جل شانہ کے لئے کوئی دشوار نہیں کہ ہر انسان کو مشاہدہ کرادیں، مگر پھر ایمان بالغیب کی جو فضیلت ہے، وہ قائم نہیں رہ سکتی۔ واللہ أعلم وعلمه أتم وأعظم

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ
فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦١﴾
اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا
وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٦٢﴾
قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿٢٦٣﴾

ترجمہ: ان لوگوں کی مثال جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اس دانے جیسے ہے جس نے سات بالیوں کو اگایا، ہر بالی میں سو دانے ہیں، اور اللہ تعالیٰ دگنا کرتا ہے (بڑھاتا ہے) جس کیلئے چاہے، اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿٢٦١﴾ جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، پھر جو کچھ انہوں نے خرچ کیا اس کے پیچھے احسان جتلانا، اور تکلیف دینا نہیں لگاتے، ایسے لوگوں کیلئے ان کے ربّ کے پاس اجر ہے، اور ان پر کوئی خوف نہیں ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿٢٦٢﴾ دستور کے مطابق بات اور درگزر کرنا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے تکلیف (ستانا) ہو، اور اللہ تعالیٰ بے نیاز اور بردبار ہے ﴿٢٦٣﴾

معارف ومنازل

ابواب البرّ کا جو سلسلہ پارہ سیقول کے ربع سے شروع ہوا تھا، وہ مسلسل چلتا رہا، پھر آیت نمبر (۲۴۴) و (۲۴۵) میں قتال (جہاد) کے سلسلہ میں انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب کے ساتھ ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾ [البقرة: ۲۴۵] جہاد کے راستے میں مال خرچ کرنے کا تذکرہ ہوا، جس

میں "اَضْعَافًا كَثِيْرَةً" کا مطلب مجمل تھا، مذکورہ آیت میں قدرے تفصیل ہے، گویا کہ یہ آیت کریمہ پچھلی آیات کا تتمہ ہے۔

غزوۂ تبوک جسے "غزوۃ العسرۃ" کہا جاتا ہے، آخری غزوہ ہے، اس غزوہ میں لشکر کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ عام روایات میں تیس ہزار نفری کا ذکر ہے۔ مؤرخ واقدی نے ستر ہزار لکھا ہے، جبکہ بعض دوسرے حضرات نے چالیس و پچاس ہزار کے درمیان مجاہدین کی تعداد بتائی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ غزوۂ تبوک سخت گرمی کے دنوں کھجور پکنے کے موسم میں پیش آیا۔ اتنے بڑے لشکر کے لئے زادِ راہ اور دیگر اخراجات، اسلحہ وسواری کی بھی بڑی قلت تھی۔ اس لشکر نے جو مسافت طے کی وہ تقریباً ہزار کلومیٹر کے فاصلہ کی تھی۔ مدینہ طیبہ سے ملکِ شام کی سرحد "مقامِ تبوک" تک سفر طے پایا، جہاں ہرقلِ روم کی ایک لاکھ سے زائد فوجیوں کے اجتماع کی خبر گشت کرتی رہی۔

اس موقع پر سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے عام صدقات، خیرات اور مالی امداد کا اعلان فرمایا، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا پورا مال حاضر کیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نصف مال کا اعلان کیا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے چار ہزار درہم، اور ایک ہزار دینار حاضر کئے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے چھ سو اونٹ، تین سو گھوڑے بمع ساز و سامان حاضر کیا۔ اس کے علاوہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حسبِ توفیق دل کھول کر عطیات پیش کئے۔ اس موقع پر ان کی حوصلہ افزائی کے پیشِ نظر اور عام مؤمنین کی تسلّی کی خاطر ان آیات کا نزول ہوا۔

آیت کریمہ کی تفسیر اور ترغیب:

اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا، اور اعلاء کلمۃ اللہ و اشاعتِ اسلام کی خاطر دل کھول کر انفاق فی سبیل اللہ پر عمل پیرا ہوں، اور مال کی محبت اور پرستش میں اتنے غرق نہ ہوں کہ مال کو کعبۂ مقصود بنا کر جہاد و دیگر مقامات، ومواقعِ خیر میں کمزوری دکھائیں۔ یہ ہرگز مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے کہ وہ مال کی محبت میں مقید اور اسیر بنے رہیں، اور ابواب البرّ وابواب الخیر کے بے شمار اجر وثواب سے محروم و بے بہرہ رہیں، اور جو لوگ پیسے کمانے کے لئے جیتے ہیں، پیسہ پر جان دیتے ہیں، اور پیسہ پر اولاد تک قربان کرتے ہیں، جن کی نگاہ ہر وقت حطامِ دنیا پر رہتی اور گھومتی ہے، وہ کبھی اس قابل نہیں ہوتے ہیں کہ دینی، مذہبی، اخلاقِ عالیہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے آگے بڑھیں، اور شجاعت ودریا دلی اور سخاوت وجوانمردی کا ثبوت پیش کریں۔

وہ اگر بظاہر نیک اور اخلاقی مقاصد کے لئے کچھ خرچ کرتے ہیں، تو پہلے اپنی ذات، برادری اور قوم کے منافع

کا حساب لگا لیتے ہیں، حالانکہ دنیوی نفع ونقصان سے لاپرواہو کر محض اللہ تعالیٰ کی رضاء اور کلمۃ اللہ کی بلندی کی خاطر اپنا پیسہ، وقت، قوت واستعداد اور توانائی صرف کرنا اس دینِ متین، شریعتِ الٰہی کا تقاضا، اور اس کا پورا پورا حق ہے۔

چنانچہ یہاں سے مسلسل تین رکوع تک اسی مزاج وذہنیت اور فکر کو پیدا کرنے کے لئے ہدایات دی جارہی ہیں۔ مال ودولت کے عشق اور پیسہ کی محبت ہی میں اگر آدمی ہر وقت ڈوبا ہوا اور منہمک رہے، تو پھر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد، اَکلِ حلال، نکاح، طلاق، علم وتبلیغ، بیوی بچوں کے ساتھ معاملہ فہمی وحسنِ سلوک، یتیموں کی خبر گیری، پڑوسیوں کے ساتھ مواسات ومدارات، والدین واقرباء کی خدمت ودلجوئی وغیرہ کے تمام احکام وحقوق برباد ہوجاتے ہیں، اور آدمی عبادُ الرحمن کے دائرہ سے نکل کر شیطانی فوج میں شمار ہوجاتا ہے۔ تو کیا محض ایمان کا دعویٰ نجات کے لئے کافی ہوتا ہے؟

البتہ! یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان تمام احکام، بلکہ پوری شریعت پر کماحقہ عمل پیرا ہونا تب ہی ہوسکتا ہے، جب اللہ تعالیٰ کی راہ میں پیسہ خرچ کرنا آسان ہوجائے۔ اپنی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل میں مال خرچ ہو، یا اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے، یا اپنے اقرباء اور اعزّہ کی خبر گیری میں، یا محتاجوں کی اعانت میں، یا مساجد اور مدارس کی امداد وتعمیر میں، یا عام مسلمانوں کے رفاہی کاموں میں، یا اشاعتِ اسلام اور جہاد میں، یہ سب اگر قانونِ الٰہی کے مطابق اور خالص رضائے الٰہی کے لئے ہو، تو اس کا شمار اللہ تعالیٰ ہی کی راہ میں ہوگا، اور جس کی برکات عام ہوجائیں گی۔

فائدہ:

کسی نیک کام میں پیسہ خرچ کرنے کی تین ہی صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) ادنیٰ درجہ کے اخلاص کے ساتھ اگر انفاق ہو تو "اَلْحَسَنَةُ بِعَشَرَةِ اَمْثَالِهَا" کی رو سے دس گنا ثواب عطا ہوگا۔

(۲) خلوصِ نیت درمیانی درجہ کی ہو، تو اس آیت کریمہ کی رو سے اس کے لئے سات سو گنا اجر وثواب کا وعدہ ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ بحوالہ مسند احمد روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جہاد وحج میں ایک درہم خرچ کرنے کا ثواب سات سو درہم کے برابر ہے۔

(۳) یہ درجہ انفاق کا اعلیٰ درجہ اخلاصِ والا ہے، جو کہ خواص کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس درجے تک عام آدمی کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ یہ ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ کی رو سے بے شمار اجر وثواب کا استحقاق ہے

۔جتنا خلوص زیادہ ہوگا، اتنا ہی اجر وثواب زیادہ ہوگا۔سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نصف صاع جَو کے ثواب کو دوسروں کے سونے کے پہاڑ کے صدقہ کے ثواب سے بھی زیادہ بتادیا۔[متفق عليه]

صدقات کی قبولیت کی شرائط:

واضح ہو کہ صدقات کی قبولیت کے لئے بھی دیگر عام عبادات وطاعات کی طرح لازمی شرائط ہیں:

(۱) پہلی شرط یہ ہے کہ نیت خالص للہ فی اللہ ہو، اس میں غیر اللہ کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ ریاء اور دیگر نفسانی خواہشات کا وہاں کوئی گزر نہ ہو۔ نہ نام ونمود، نہ شہرت، نہ کسی کی دل آزاری وغیرہ ہو۔

(۲) خالص مال حلال ہو، جس میں مشکوک وحرام کی بو تک نہ ہو۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: ''اِنَّ اللہَ طَیِّبٌ لَایَقْبَلُ اِلَّا الطَّیِّبَ''۔ [بخاري] (اللہ تعالیٰ پاک ہے، اور پاکیزہ وحلال کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں کرتا)۔ یہی طہارت وصفائی تمام اعمال کی قبولیت کے لئے لازمی شرط ہے، حتی کہ قبولیتِ دعاء کے لئے بھی یہی شرط ہے۔ جب آدمی ایک لقمۂ حرام کا تناول کرتا ہے، تو چالیس روز تک اس کے اعمال قبولیت کے شرف سے محروم رہیں گے۔ یہ کتنی جسارت وبیباکی ہوگی کہ ایک شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے حرام یا مشکوک مال کا صدقہ پیش کرے؟ جبکہ وہ اپنے جیسے کسی انسان کے سامنے حرام ناپاک کھانا یا مشروب پیش کرنے سے شرم محسوس کرتا ہے۔

آج ہمارے معاشرہ میں حلال کمائی اور حلال مال کا اگر سرے سے فقدان نہیں، تو نہایت قلّت ضرور ہے۔ آج مال کمانے کے جتنے ذرائع مروج ہیں، تقریباً سارے غیر شرعی اور اسلامی وشرعی روایات سے ہٹے ہوئے ہیں۔ یہی ہماری نمازوں، حج، زکوٰۃ، صوم، صدقات اور دیگر عباداتِ کا حال ہے۔ صفائی معاملات کا اس قدر فقدان ہے کہ اچھے بھلے دیندار لوگ بھی غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ بس چند رکعات نماز اور کچھ تسبیحات واذکار کی ادائیگی پر مغرور ہیں۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ یہ انفاق بطیب خاطر اور خوشی کے ساتھ ہو۔ کسی جبر اور مجبوری کی بنا پر نہ ہو۔

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ مستحقین تک اس کی رسائی ہو۔ اگر غیر مستحق لوگوں پر خرچ ہوگا، تو قبولیت نہیں ہوگی، جیسے زکوٰۃ کے مصارف پر خرچ کرنے سے زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے، مگر غیر مصارف پر ادا نہیں ہوگی۔ یہی حال عام صدقات کا بھی ہے۔

(۵) پانچویں شرط یہ ہے کہ صدقہ کسی حق یا خدمت کے عوض میں نہ ہو، ورنہ قبول نہ ہوگی۔

(۶) چھٹی شرط یہ ہے کہ جس کو صدقہ دیا جارہا ہو، اس پر احسان نہ جتلانا، کہ بار بار اپنے احسانوں کی اس کو

تنبیہ وخبر دار کرنا، کہ میں نے تمہارے ساتھ یہ کیا، وہ کیا، تم نے ہمارے احسانات فراموش کیے، وغیرہ، جیسے فرمایا: ﴿قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّمَغۡفِرَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ صَدَقَةٍ يَّتۡبَعُهَآ اَذًى﴾ اسی طرح فرمایا: ﴿لَا تُبۡطِلُوۡا صَدَقٰتِكُمۡ بِالۡمَنِّ وَ الۡاَذٰى﴾ جس کی تفصیل عنقریب آنے والی ہے۔

فائدہ:

اَلْمَنُّ وَالتَّذْكِيْرُ شَتَّانِ بَيْنَهُمَا۔ یعنی احسان جتلانے اور تذکیر ویاددہانی میں بڑا فرق ہے وہ یہ کہ: "اَلْمَنُّ" احسان جتلانا، یہ مکروہ ہے، اور احسان جتانے سے نیکیوں کا ثواب باطل ہوجاتا ہے، لہٰذا اس سے اجتناب ضروری ہے۔ دوسرا جو تذکیر ہے، یہ نعمت ہے، اور مستحسن ہے، اور اس سے ثواب باطل نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ احسان کنندہ اپنے ماتحت لوگوں کو یاددہانی کراتا ہے، تاکہ وہ شکر ادا کریں، کسی مخالفت پر کمربستہ نہ ہوں، اور کوئی غلط اقدام نہ کریں، تاکہ مزید محسن کے احسانات کے استحقاق حاصل کریں۔ "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَاتِ" [الحدیث] واللہ اعلم۔

﴿مَثَلُ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ﴾ تا ﴿فِىۡ كُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ﴾ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے والوں کی مثال اس دانے جیسی ہے، جو سات بال، یعنی خوشے اگاتا ہے، اور ہر خوشے میں سو دانے پیدا ہوتے ہیں، گویا کہ ایک دانہ گندم سے سات سو دانے پیدا ہوئے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ ہونے والے ایک درہم کا اجر وثواب، یا ایک عام چیز کا اجر وثواب سات سو درہم، یا سات سو عام چیز تک حاصل ہوگیا۔ قرآن حکیم نے ﴿مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا﴾ [الأنعام: ۱۶۰] (جو ایک نیکی کرے تو اس کے لئے دس گنا ثواب ہے) جو فرمایا، وہ کم از کم مقدار کے بارے میں ہے، اور یہاں سات سو گنا، یہ متوسط مقدار کے متعلق ہے، اور آنے والا حکم: ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ﴾ اعلیٰ درجہ کے متعلق ہے، جس کا ثواب بے شمار اور بہت زیادہ ہے، جیسے پہلے بیان ہوا کہ اس ثواب کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ کسی جہاد کے موقع پر ایک شخص نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں ایک اونٹنی پیش کی، جس کو مہار لگی ہوئی تھی، اور اس پر کجاوہ کسا ہوا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت خوش ہوئے، اور ارشاد فرمایا: تم نے بہت اچھا کیا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں قیامت کے دن ایسے کسے ہوئے کجاوے والی سات سو اونٹنیاں عطا کرے گا۔ [مسند احمد] گویا جہاد میں خرچ کیے جانے والے مال کا کم از کم اجر وثواب سات سو گنا سے شروع ہوتا ہے،

سات لاکھ تک۔[ابن کثیر] کیونکہ دین کی عزت وبقاء اور سر بلندی جہاد کی وجہ سے ہے، کما مر عن ابن عباس رضی اللہ عنہ۔

﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ اللہ تعالیٰ بڑھاتا ہے، جس کے لئے چاہے، اور اللہ تعالیٰ بہت وسعت دینے والا ہے، اور تمہارے اخلاص سے پورا پورا خبردار اور جاننے والا ہے۔ یہ اجر وثواب جو تیسرے اور اعلیٰ درجہ کا ہے، بے شمار ہے، جس کی کوئی حد نہیں ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ﴾ تا ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْھِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ یہاں سے صدقات کی قبولیت کا ایک ضابطہ اور معیار کا بیان ہو رہا ہے، فرمایا: وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، پھر اس خرچ کرنے کے پیچھے احسان نہیں جتلاتے، اور اذیت نہیں دیتے، دل آزاری سے اجتناب کرتے ہیں، یہ احسان جتلانا اور اذیت دینا، بہت بری بات ہے، اور اس کے مختلف ومتعدد درجات اور طبقے ہیں، جو کہ سب غیر محمود اور ناپسندیدہ ہیں، اور صدقات کے لئے نہایت مضر اور تباہ کن ہیں۔ جو لوگ صرف اور خالص رضائے الٰہی کی بنیاد پر کام کرتے ہیں، وہ لوگ اس قسم کی مہلکات سے ہر ممکن دور رہتے ہیں۔ البتہ! نفسانی خواہشات کے غلام اگر صدقہ دیتے ہیں، تو ان کا منظورِ نظر رضائے الٰہی نہیں ہوتی، بلکہ اور کوئی مقصد کارفرما ہوتا ہے، پس احسان جتلانا اور دل آزاری و اذیت دینا انہی کا کام ہوتا ہے، پس جیسا عمل ویسا ہی پھل ہوگا۔

پس وہ لوگ جو رضائے الٰہی کی بنیاد پر کام کرتے ہیں، وہ احسان جتلانے اور اذیت دینے سے گھبراتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے ان کے ربّ کے ہاں بڑا اجر ہے۔ جو کئی گنا بڑھا چڑھا کر دیا جائے گا، ایسے لوگوں کو نہ دنیا میں کوئی خوف ہوگا، اور نہ وہ اگلے جہاں میں غمگین ہوں گے، بلکہ ہر دو جہاں میں مامون ومطمئن رہیں گے۔

حدیث میں ہے کہ تین قسم کے لوگوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بات چیت نہیں کرے گا، نہ ان کی طرف نظرِ رحمت سے متوجہ ہوگا، نہ انہیں پاک کرے گا، بلکہ ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا: ایک وہ شخص جو کچھ دیتا اور احسان جتلاتا ہو۔ دوسرا وہ جو ٹخنوں سے نیچے تہبند و پاجامہ لٹکاتا ہو۔ تیسرا وہ جو جھوٹی قسم کھا کر مال بیچتا ہو۔[مسلم]

دوسری روایت میں یہ ہے ماں باپ کا نافرمان، اور شراب پینے والا اور احسان جتلانے والا۔[نسائی، ابن ماجہ] اللہ تعالیٰ رحم فرمائے! آج ہم لوگ ان جیسے گناہوں کو بال سے بھی باریک سمجھتے ہیں یا سرے سے انہیں گناہ ہی نہیں مانتے، مگر حقیقت میں یہ پہاڑوں سے وزنی اور خطرناک ہیں۔ اس نکتہ کو باریک کو سمجھا کر ارشاد فرمایا:

﴿قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ﴾ تا ﴿وَاللّٰهُ غَنِىٌّ حَلِيْمٌ﴾ دستور، شرافت، حسنِ اخلاق کے ساتھ پیار ومحبت کے

ساتھ نرم جواب دینا، اور درگزر کرنا، اور سائل کی لجاجت واصرار پر بدزبانی اور ترشی وتلخی سے پرہیز کرنا، یا اس کی غیر شریفانہ انداز کا جواب شرافت سے دینا، یہ ہزار درجہ بہتر ہے اس صدقہ سے جس کے پیچھے اذیت اور دل آزاری ہو۔

سبحان اللہ! قرآن حکیم کی حکیمانہ تعلیمات کی نہ کوئی حد، نہ انتہاء۔ دینے پر اصرار نہیں کہ خواہ مخواہ دیدو، بلکہ دینے کے ساتھ تلخ اور بدزبانی کے ترک پر اصرار ہے کہ: ﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ [الضحی:۱۰] خبردار! سائل کو مت ستاؤ، مت جھڑکو، مت ڈانٹو، کیونکہ یہ بہت برا اور نامناسب عمل ہے، جس سے قرآن والوں کو ضرور اجتناب کرنا چاہئے، اور اپنے ربّ کو غنی و بے نیاز سمجھو۔ وہ تمہارے صدقات سے مستغنی ہے، اور صدقات میں سراسر تمہارا فائدہ ہے۔ اگر تم سائلین پر سختی اور درشتی کرو، تو وہ ذات اقدس حلیم بردبار ہے، جلدی تمہیں سزا نہیں دیتا۔

❁ ❁ ❁

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے صدقات کو باطل نہ کرو احسان جتلا کر، اور تکلیف دے کر، اس شخص کی طرح جو لوگوں کو دکھانے کے لئے مال خرچ کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر یقین نہیں رکھتا، پس اس شخص کی مثال (یعنی اس کے خرچ کرنے کی مثال) صاف چٹان یا پتھر کی ہے، جس پر مٹی ہو، پس پہنچے اس کو موسلا دھار بارش، اور چھوڑ دے اس کو بالکل خالی اور صاف، یہ لوگ اس میں سے کسی چیز پر قادر نہیں ہوں گے، جو کچھ انہوں نے کمایا ہے، اور اللہ تعالیٰ کفر کرنے والی قوم کی رہنمائی نہیں کرتا ﴿۲۶۴﴾ اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل کرنے کے لئے، اور اپنے دلوں کی پختگی کے لئے، ان کی مثال اس باغ جیسی ہے، جو اونچی جگہ پر واقع ہو، اس کو موسلا دھار بارش پہنچے، پس وہ اپنا پھل دوگنا دے، پس اگر زوردار بارش نہ پہنچے، تو ہلکی بارش بھی اس کے لئے کارآمد اور کافی ہوگی، اور اللہ تعالیٰ نگاہ میں رکھتا ہے، جو کام تم کرتے ہو ﴿۲۶۵﴾

معارف ومنازل

ابطالِ صدقہ کا دوبارہ تذکرہ ہورہا ہے۔ دوبارہ ذکر کرنے کی دو وجوہات ہیں: ایک وجہ یہ ہے تاکہ یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہوجائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں ایک مثال کے ضمن میں ذکر کیا، تاکہ معلوم ہوجائے کہ ایسا عمل منافق کا ہوسکتا ہے، اور مؤمن کے شایان شان نہیں ہے۔

تو ارشاد ہے کہ اے ایمان والو! تم احسان جتا کر، یا سائل کو ایذاء پہنچا کر اپنے صدقات کے ثواب کو اس شخص کی طرح ضائع نہ کرو، جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے، اور وہ نہ تو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے، اور نہ روزِ آخرت پر اس کو یقین ہے، لہٰذا اس منافق کی حالت ایسی ہے، جیسے فرض کرو، ایک صاف چکنا پتھر کہ اس پر تھوڑی سی مٹی جمع ہوئی ہو، پھر اس پتھر پر زور کی بارش ہوجائے، اور وہ بارش پتھر کو بالکل صاف کر کے چھوڑ دے، یعنی اس پر لگی مٹی کو اڑا کر پتھر کو صاف کر دے، لہٰذا ایسے لوگوں کو اپنی کی ہوئی صدقات میں سے کچھ بھی فائدہ نہیں ملے گا، اور اپنے اعمال سے کوئی ثواب حاصل نہیں کر سکیں گے، اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔

یادرہے کہ ابطالِ ثواب کے لئے دونوں (احسان جتانا، ایذاء دینا) باتوں کا ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ صرف احسان جتانا، یا فقط ایذاء دینا بھی ابطالِ ثواب کے لئے کافی ہے۔ البتہ! بعض علماء کا قول ہے کہ ثواب باطل ہوجاتا ہے، اور گناہ بھی لازم ہوتا ہے، اور بعض یہ کہتے ہیں کہ نہ ثواب ہے، اور نہ گناہ۔

پہلا قول راجح ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہوا تھا۔ اس آیت کا مطلب پہلے بیان ہوچکا ہے۔ اب ایک شرط کا مزید اضافہ ہوا کہ قبولیتِ اعمال کے لئے جس طرح اخلاص ضروری ہے، اسی طرح ایمان باللہ والیوم الآخر بھی ضروری ہے، کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔ اس پر مکمل کلام ہوچکا ہے، وہاں دیکھا جائے۔

مفسرین کرام نے فرمایا کہ نرم زمین پر دانہ ڈالنے پر سات خوشے، اور سات سو گنا ثواب کا وعدہ تھا، جبکہ صاف پتھر کے اوپر والی مٹی میں اگر کوئی تخم ریزی کرے گا، تو وہ زائد دانوں سے محروم رہے گا، اور کاشت کیا ہوا تخم بھی بارش سے تباہ ہوگا۔

اوّل کی مثال مخلص مسلمان کی ہے۔ دوسری کی مثال منافق اور کافر کی ہے۔ یہی حال دونوں کے دیگر اعمال کا بھی ہے۔ اور یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ریاکاری، دکھلاوا، شرکِ اصغر ہے۔ مسلمان کے لئے اس سے اجتناب ضروری ہے۔

محمود بن لبید انصاری رضی اللہ عنہ نے روایت کی کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ریا کار کو فرمائے گا: جاؤ، تمہارے لئے میرے پاس کوئی اجر نہیں، تم اپنے عمل کا اجر ان لوگوں سے وصول کرو، جن کی خاطر، یا انہیں خوش کرنے کے لئے تم نے عمل کیا تھا۔ [مشکوۃ]

آیت کریمہ میں وَابِلٌ کا ذکر ہے۔ آئندہ ''طَلٌّ'' کا کلمہ بھی آنے والا ہے، چونکہ بارش کے مختلف حالات ہوتے ہیں، کبھی بوندا باندی، اور کبھی کچھ تیز ہوتی ہے، اس لئے عرب حضرات نے ترتیب کے ساتھ اس کے نام یہ ذکر کئے: رَشّ، طَلّ، نَضح، هَطَل، وَبَل، وَابِل وغیرہ۔

﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ﴾ سے ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ تک۔ ریا کاروں کے بیان کے بعد ﴿مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ لوگوں کا بیان، اور ان کی مثال کا تذکرہ ہے۔ فرمایا: اور ان لوگوں کی مثال جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنے اموال خرچ کرتے ہیں، اور ان کا دوسرا مقصد اپنے نفسوں کو ثابت رکھنا ہوتا ہے، یعنی استقامت اور اصلاحِ نفس بھی مقصود ہوتا ہے۔ پہلی چیز رضائے الٰہی ہے۔ یہ تو سارے اعمال، بلکہ تمام چیزوں سے افضل ہے، اگر یہ کسی کی قسمت میں ہو، تو سمجھو کہ اس کو سب کچھ نصیب ودستیاب ہوا، اور کوئی اگر اس سے دور ہوا، تو ہر خیر وبھلائی سے محروم ہوگیا۔ دوسرے نمبر پر اصلاحِ نفس اور تزکیہ ہے۔ یہ بھی ایک لازوال نعمت ہے۔

دراصل پہلی نعمت، یعنی رضائے الٰہی کے حصول کے لئے سبب بھی یہی ہے۔ علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ ودیگر حضرات نے یہاں تثبیت سے مراد تصدیق لی ہے۔ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس کے معنی ہیں: طلبِ ثواب، یعنی اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کی امید وتوقع رکھنا۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا﴾ [البقرۃ: ۱۲۵] یہاں یہی معنی مراد ہیں۔

ایسے نیکوں کاروں کی مثال اس باغ جیسی ہے، جو اونچی جگہ پر واقع ہو، جب اس باغ پر زوردار بارش ہو، تو وہ دوگنا پھل دے دے، اور اگر تیز بارش نہ ہو، تو اس کے لئے معمولی اور کمزور بارش بھی کافی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ احسان، ایذاء، ریاکاری اگر یہ تینوں نہ ہوں تو اجر ہی اجر کا سلسلہ ہوگا۔ تیز بارش سے اخلاص کی زیادتی اور فیاضی مراد ہے، جس کا ثواب زیادہ ہے، اور معمولی بارش سے مراد کم مقدار کا صدقہ ہے، جو کہ حصولِ ثواب کے لئے یہ بھی کافی ہوگا۔

یہاں ایمان اور حسنِ نیت کو اونچی زمین کے باغ سے تشبیہ دی گئی ہے، اور یہ تشبیہ بلیغ سے بڑھ کر ابلغ کا درجہ رکھتی ہے۔ بیشک! اللہ تعالیٰ تمہارے سارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ کوئی ذرّہ اس کے علم سے پوشیدہ نہیں ہے، اور پوری

کائنات اس کے سامنے ہے، جسے وہ دیکھ رہا ہے۔ اگر کسی عمل میں سرے سے اخلاص ہی نہ ہو، یہ بھی اسے معلوم ہے۔ اگر اخلاص موجود ہو، تو یہ بھی اس کے علم میں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبۃ اللہ شریف کی ایک ایسی غیر آباد وادی میں تعمیر کی، جہاں انسان کیا، کسی پرندے کا وجود اور گزر ممکن نہ تھا، مگر ان کے اخلاص کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیامت تک کھربوں انسان اس کا طواف کر رہے ہیں، اور روئے زمین کے انسانوں کا سب سے بڑا اجتماع سالانہ وہاں منعقد ہو رہا ہے۔ سارے جہاں کا وہی قبلہ و کعبہ ہے۔ روزانہ ایک سو بیس رحمتوں کا نزول ہو رہا ہے۔ یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اخلاص وللّٰہیت کا ثمرہ ہے۔ اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا: ؎

کعبہ را ہر دم تجلی می فزود ☆ این ز اخلاصات ابراہیم بود

(مثنوی)

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۚ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ
فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾

ترجمہ: کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا کھجور اور انگور کا باغ ہو، اس کے سامنے نہریں بہتی ہوں، اور اس شخص کے لئے اس باغ میں ہر قسم کے پھل ہوں، اور اس شخص کو بڑھاپا آ پہنچے، اور اس کی اولاد کمزور ہو، پس اس باغ کو آگ کا بگولہ پہنچے، جس کے اندر آگ ہو، اور وہ اس باغ کو جلا ڈالے، اسی طرح اللہ تعالیٰ واضح طور پر اپنی آیات بیان فرماتا ہے، تاکہ تم غور و فکر کرو ﴿۲۶۶﴾

معارف ومنازل

صدقہ وخیرات و دیگر اعمال کے باطل و مردود ہونے کا بیان بھی ایک مثال میں اس طرح واضح فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا کھجور اور انگور کا ایک باغ ہو۔ اس کے نیچے پانی کی نہریں بہتی ہوں، اور اس باغ میں ہر قسم کے میوے ہوں، اور اس شخص کا بڑھاپا آ گیا ہو، اور اس کے اہل و عیال ضعیف اور کمزور ہوں، ہر کمائی

سے عاجز ہوں، ان حالات میں کہ خود بھی عاجز، اور اہل وعیال بھی ضعیف وناتواں ہوں، اس باغ پر ایک بگولہ آئے، جس میں آگ ہو، پھر وہ باغ جل کر راکھ ہوجائے؟ تو اس شخص کا غم وصدمہ کتنا نا قابلِ برداشت ہوگا؟ اور وہ اپنی تمام خوشیوں اور سرمایہ سے یکسر محروم رہے گا، جس کی تلافی کا کوئی امکاں بھی نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر وامثال بیان فرماتے ہیں، تا کہ تم غور وفکر کرو۔

عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا کہ آپ لوگوں کی رائے میں یہ آیت ﴿اَیَوَدُّ اَحَدُکُمۡ﴾ کس بارے میں نازل ہوئی تھی؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: وَاللّٰہُ اَعۡلَمُ فرمایا: اللہ تعالیٰ تو جانتا ہی ہے، تم اپنا جواب دے دو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس آیت کا مجھے کچھ علم ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ایک مالدار شخص جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا کام کرتا ہے، پھر اس پر شیطان مسلط ہوجاتا ہے، تو وہ بیہودہ گناہوں میں مشغول ہوجاتا ہے، اور اپنے کئے ہوئے نیک اعمال کو ڈبو کر غرق کردیتا ہے۔

پس یہ روایت اس آیت کی تفسیر ہوئی، جب روزِ قیامت درماندگی وپریشانیوں کا دن ہوگا۔ اس بوڑھے اور ضعیف کو جن نیکیوں سے تھوڑا بہت فائدہ مل سکتا تھا، وہ تمنا پوری نہیں ہوئی، اور اعمال ضائع ہو کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئے۔

شروع آیت سے یہاں تک چار اسباب بیان ہوئے، جن سے نیکیاں باطل ہوجاتی ہے:

(۱) احسان جتانا۔ (۲) ایذاء وتکلیف دینا۔ (۳) ریاکاری سے خیرات کرنا۔ (۴) نیکیوں کے بعد گناہ، اور بداعمالیوں میں زندگی صرف کرنا۔ اللہ تعالیٰ ان چاروں مہلکات سے بچائے۔ آمین

يَاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ وَمِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَـكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الۡخَبِيۡثَ مِنۡهُ تُنۡفِقُوۡنَ وَلَسۡتُمۡ بِاٰخِذِيۡهِ اِلَّاۤ اَنۡ تُغۡمِضُوۡا فِيۡهِ ‌ؕ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيۡدٌ ﴿۲۶۷﴾ اَلشَّيۡطٰنُ يَعِدُكُمُ الۡفَقۡرَ وَيَاۡمُرُكُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ ‌ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمۡ مَّغۡفِرَةً مِّنۡهُ وَفَضۡلًا ‌ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ۖ ﴿۲۶۸﴾ يُّؤۡتِى الۡحِكۡمَةَ مَنۡ يَّشَآءُ ‌ۚ وَمَنۡ يُّؤۡتَ الۡحِكۡمَةَ فَقَدۡ اُوۡتِىَ خَيۡرًا كَثِيۡرًا ‌ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۲۶۹﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنی پاکیزہ کمائی اور زمین میں سے تمہارے لئے ہماری نکالی ہوئی چیزوں کو خرچ کرو، اور ان میں سے بری چیزوں کے خرچ کرنے کا قصد نہ کرنا، جسے تم خود لینے والے نہیں ہو، ہاں! اگر آنکھیں بند کرلو، تو۔ اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ بے پرواہ اور خوبیوں والا ہے ﴿۲۶۷﴾ شیطان تم کو فقیری سے دھمکاتا ہے، اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ وسعت والا اور علم والا ہے ﴿۲۶۸﴾ وہ جسے چاہے حکمت اور دانائی دیتا ہے، اور جس کو حکمت عطا کی گئی، بلاشبہ اس کو بہت بڑی خیر دے دی گئی، نصیحت صرف عقلمند ہی حاصل کرتے ہیں ﴿۲۶۹﴾

معارف ومنازل

آیت کریمہ میں طیب کو خبیث کے مقابلہ میں ذکر کیا گیا ہے، اسی مناسبت سے ہر ایک کے تین تین معنی ہوسکتے ہیں۔ طیب : دل پسند، مرغوب اور عمدہ کو کہا جاتا ہے۔ جبکہ خبیث : ناپسندیدہ، ناکارہ وغیرہ کے لئے استعمال ہوتا ہے، تو مطلب یہ ہوا کہ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کریں، تو حلال، پاکیزہ، طاہر، مرغوب وپسندیدہ اور عمدہ مال خرچ کیا کریں، اور حرام، ناپاک، گندہ، ناپسندیدہ اور ناکارہ چیز خیرات نہ کیا کریں۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انصار اپنے باغوں سے کھجور کے خوشے لاکر اصحاب صفہ کے لئے مسجد میں لٹکا دیا کرتے تھے۔ اصحابِ صفہ بھوک کے وقت ان خوشوں میں سے کھجوریں جھاڑ کر کھایا کرتے تھے، اور بعض خوشے اتنے ناکارہ ہوتے تھے، جو کھانے کے قابل نہیں ہوتے تھے، اس پر حضرت حق سبحانہ نے تنبیہ کرکے انہیں خبردار کیا کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر عمدہ اور پسندیدہ چیز صدقہ کرلیا کرو، ناکارہ، ردّی اور ناقص چیزوں کو صرف نہ کرو، اسی بات پر ان آیات کا نزول ہوا۔ اس شان نزول کے اعتبار سے طیب کے معنی عمدہ کے کئے گئے ہیں، کیونکہ بعض لوگ ناکارہ چیزیں لے آتے تھے، جس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

بعض علماء نے عمومِ لفظ سے طیب کی تفسیر حلال سے کی ہے، کیونکہ پوری عمدہ جب ہی ہوتی ہے، جب حلال بھی ہو۔ پس اس بناء پر آیت میں اس کی بھی تاکید ہوگی۔ اور پہلی تفسیر پر دوسرے دلائل سے اس تاکید کو ثابت کیا جائے گا۔

دوسرے مقام پر واضح طور پر عمدہ اور مرغوب کی تاکید ہے، فرمایا: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾[آل عمران: ۹۲] (مؤمنو!) جب تک تم ان چیزوں میں سے جو تمہیں عزیز ہیں (راہِ خدا میں) صرف نہ

کروگے کبھی نیکی حاصل نہ کرسکو گے)۔اس آیت کے نزول پر حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ،اورآیت کریمہ کا حوالہ دے کر اپنے پسندیدہ عمدہ باغ ''بیرحاء'' کوصدقہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں محبوب وپسندیدہ چیز کے صدقہ کا حکم دیا ہے،اور میرے تمام اموال میں یہ باغ اعلیٰ ،قیمتی اورعمدہ ہے۔[بخاري]

یہ بات یادرکھنی چاہئے کہ یہ حکم ان لوگوں کے لئے ہے،جن کواللہ تعالیٰ نے مالی استطاعت دی ہے،اورجن کے پاس اچھی چیز ہی نہ ہو،اوروہ خودفقیر ہوں ،وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہوں گے،ان کے پاس جومیسر ہو،خواہ ردّی ہی کیوں نہ ہو،وہ اسی میں سے دے دیں،جیسے ارشاد ہے:﴿لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ ۖ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۚ﴾ [الطلاق:۷] (وسعت والوں کواپنی وسعت کے مطابق خرچ کرنا چاہئے،اورجس کے رزق میں تنگی ہو،وہ جتنا خدانے اس کودیا ہےاس کے موافق خرچ کرے)۔

توخلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نام پرعمدہ اورپسندیدہ چیزوں کا صدقہ کرو۔ناکارہ،ردّی چیزوں کوخرچ کرنا تودرکنار! ایسی چیزوں کےخرچ کرنے کا قصدوارادہ بھی نہ کرو۔یہی مطلب ہے ''تَيَمَّمُوا'' کا،حالانکہ تم خود کبھی اس ناکارہ اورناقص چیز کولینے پرآمادہ نہیں ہوتے ،مگرہاں!اس کے لینے میں چشم پوشی اوررعایت سے کام لو،تویہ دوسری بات ہے۔اوریہ اچھی طرح جان لوکہ اللہ تعالیٰ تمہاری خیرات سے مستغنی ہے،اورتمام صفاتِ کمالیہ حاکمیہ سے متصف اورسزاوارِحمدوثناء ہے۔

﴿الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ﴾ شیطان تم کو یہ کہہ کرڈراتا ہے کہ دیکھو! اگرخیرات کروگے،اورعمدہ ونفیس مال خرچ کروگے،توفقیرومحتاج بن جاؤگے،اورساتھ اس کے تمہیں سخاوت سے روکتا ہے،اوربخل کی ترغیب دیتا ہے۔دوسری طرف اللہ تعالیٰ تمہیں خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے،اورتمہیں اپنے فضل وکرم اوربے پناہ مغفرت کا وعدہ بھی دیتا ہے،اوردنیا میں عوض اورآخرت میں بے شماراجروثواب پرتمہیں آمادہ کرتا ہے۔ارشادہے:﴿وَمَا أَنفَقْتُم مِّن شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ﴾[سبا:۳۹] (اورتم جوچیزخرچ کروگے وہ اس کا(تمہیں)عوض دے گا)۔

جوکچھ خرچ کرتے ہو،دنیا ہی میں اس کادس گناعوض تمہیں ضروردیا جائے گا،تواللہ تعالیٰ کی ولایت ودوستی کا تقاضا ہے کہ تمہیں صدقات پرترغیب دیں،اورشیطان کی عداوت کا تقاضا ہے کہ تمہیں ڈرائے،اورہرکارِخیر سے منع کرے۔اب انتخاب تمہارے اختیارمیں ہے۔بتاؤ!کس کا مانوگے،اورکس کامستردکروگے؟اگرآپ دینے پرآمادہ ہوئے،توسمجھوکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے،خوب دے دو،شکرگزاربنو،اوربدلہ کا انتظارکرو۔تم بہترانتخاب کرکے

ہر قسم کے اجر وثواب کے حقدار ہوئے ہو۔ اور اگر نہ دینے پر آمادہ ہوئے، تو سمجھو کہ یہ شیطان کی طرف سے ہے، اور تمہارا انتخاب غلط ہوا، تم ہر خیر وثواب، اور ہر عوض سے محروم ہو گئے۔

﴿اَلْفَحْشَآءِ﴾ یہ کلمہ جہاں جہاں قرآن مجید میں آیا ہے، اس کے معنی بے حیائی کے ہوئے ہیں، سوائے اس مقام کے، کہ یہاں بخل کے معنی میں ہے۔ صاحب کشاف فرماتے ہیں کہ بخیل کو عرب فاحش بھی کہتے ہیں، اور شرعی معنی کے اعتبار سے بخل کے ساتھ بے حیائی لازم ہے، کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے حیاء نہیں کرتا، تب ہی تو بخل کو اختیار کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے حیاء کرنے والا کبھی بخل اختیار نہیں کرتا۔

حکمت کے معنی اور تفسیر:

لفظِ حکمت قرآن کریم میں بیس مرتبہ مختلف مقامات میں آیا ہے۔ حدیث شریف میں آیا: ”رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللهِ“۔ اسی طرح ارشاد ہے: مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰهِ تَعَالٰى اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا جَرَتْ يَنَابِيْعُ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهٖ۔ [جامع الصغیر] اَلْاِيْمَانُ يَمَانٌ وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَةٌ۔ [بخاري] حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء میں ہے: ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾[آل عمران: ۱۶۴] (ان کو ایمان اور حکمت کی تعلیم دیں گے)۔ حضرت لقمان علیہ السلام کے بارے میں ہے: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ﴾[لقمان: ۱۲]۔ (اور ہم نے لقمان کو حکمت دی)۔

تفسیر بحر محیط میں حکمت کے معنی میں تیس سے زائد اقوال نقل کئے گئے ہیں، مثلاً:

(۱) حکمت نورِ قلب کا نام ہے۔ (۲) علمِ باطن کو حکمت کہتے ہیں۔ (۳) بصیرت وفہم حکمت ہے۔ (۴) مجموعۃ العلم والعمل حکمت ہے۔ (۵) سنت وحدیث حکمت ہے۔ (۶) معرفۃ الحق والباطل حکمت ہے۔ (۷) احکامِ شریعت کے رموز واسرار کا جاننا حکمت ہے۔ یہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ (۸) امر بالمعروف نہی عن المنکر حکمت ہے۔ (۹) الاعمال الصالحۃ والاخلاق الحسنۃ کا نام حکمت ہے۔ (۱۰) تکمیلِ انسانیت باتباع الاحکام۔ (۱۱) یقین واذعان جس میں شک وتردد نہ ہو۔ (۱۲) حکمت سے مراد قرآن کریم ہے۔ (۱۳) حکمت سے مراد عقلِ سلیم ہے۔ (۱۴) تفقہ فی الدین ہی حکمت ہے۔ (۱۵) خشیۃ اللہ حکمت ہے۔ (۱۶) اصابت رائے حکمت ہے۔ (۱۷) القول الصادق حکمت ہے۔

یہ سارے معانی حکمت کے مختلف محققین علماء کرام سے منقول ہیں۔ درحقیقت یہ سب اقوال متقارب ہیں۔ ان میں اختلاف کوئی نہیں ہے، صرف تعبیر کا فرق ہے۔ امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے مفردات القرآن میں حکمت کی

تعریف یہ بتائی ہے: "اَلْحِكْمَةُ إِصَابَةُ الْحَقِّ بِالْعِلْمِ وَالْعَقْلِ"۔ یعنی حق کو علم اور عقل کے ذریعہ پالینا حکمت ہے۔ یہی جامع معنی ہے، جنہیں علماء کرام نے پسند کیا، اور سراہا، اور یہ معنی تقریباً سب معانی مسطورہ کے لئے جامع ہیں، اور یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی منقول ہے۔

فائدہ:

جب حکمت کے معنی معلوم ہوئے، اور ربّ العزّت عزّ وجل نے حکمت کو سراہا، اور اس کی برتری اور عظمت کو واضح فرما کر اسے خیر کثیر قرار دیا، اور جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمت دی گئی، ان کی بھی تعریف وتوقیر کا اعلان فرمایا، اور یہ بات واضح ہے کہ جن لوگوں کو حکمت ملی ہے، وہ ازروئے قرآن وحدیث حکیم ہی کہلائیں گے۔ پس معلوم ہونا چاہئے کہ اس حکمت کے ساتھ موصوف حکیم لوگ کون ہوں گے؟ جنہیں خیرِ کثیر کی دولت سے نوازا گیا ہے۔ اوّل تو انبیاء علیہم السلام ہی اس کے مصداق ہیں، پھر وہ لوگ جو انبیاء کرام علیہم السلام کے جانشین اور وارث ہیں، یعنی علماء کرام جنہوں نے علم وعقل کے ذریعہ حق کو پالیا، اور جس طرح وہ علمی حیثیت سے وارث الانبیاء قرار پائے، اسی طرح وہ حکمتِ انبیاء کی رو سے بھی حکیم اور خیرِ کثیر کے مصداق اور جامع قرار پائے۔

پوری دنیا اور دنیوی ساز وسامان کو قرآن حکیم نے متاعِ قلیل کہہ کر حکمت کے مقابلے میں اسے نہایت حقیر قرار دیا، جس سے دنیاداروں کی حقارت ثابت ہوئی، اور علم وحکمت کو خیرِ کثیر کہہ کر دنیاداروں پر علماء ربانی کی برتری ثابت ہوئی، تو علماء کو چاہئے کہ اس ربانی فیصلہ کی رُو سے اپنے آپ کو قطعاً حقیر اور معمولی نہ سمجھیں، اور کسی صورت دنیاداروں کے سامنے تواضع وانکساری کا معاملہ نہ کریں۔ اسی بنیاد پر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بدترین عالم وہ ہے جو دنیاداروں کے دروازے پر حاضری دیتا ہے، اور ان کو اپنے سے اعلیٰ اور برتر تصور کرتا ہے۔ [مشکوٰۃ]

﴿وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ﴾ نصیحت قبول نہیں کرتے، مگر وہ جو عقل والے ہیں۔ عقل والوں سے مراد مسلمان ہیں۔ کفار ومنافقین کا شمار بے عقل جانوروں میں ہے، وہ ظاہری سمجھدار ضرور ہیں، مگر آخرت سے غافل ہیں، کیونکہ انہوں نے عقل کو صحیح طور پر استعمال نہیں کیا، فرمایا: ﴿أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾ [الأعراف: ۱۷۹] (وہ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی بدراہ ہیں)۔ ﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ﴾ [البقرۃ: ۱۷۱] (گونگے ہیں، بہرے ہیں، اندھے ہیں، پس نہیں سمجھتے)۔ ﴿وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ﴾ [الروم: ۷] (یہ لوگ آخرت سے غافل ہیں)۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ
مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ
فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾

ترجمہ: تم (خدا کی راہ میں) جس طرح کا خرچ کرو، یا کوئی نذر مانو، خدا اس کو جانتا ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ﴿۲۷۰﴾ اگر تم خیرات ظاہر اً دو تو وہ بھی خوب ہے، اور اگر پوشیدہ دو، اور دو بھی اہل حاجت کو تو وہ خوب تر ہے، اور (اس طرح کا دینا) تمہارے گناہوں کو بھی دور کردے گا، اور خدا کو تمہارے سب کاموں کی خبر ہے ﴿۲۷۱﴾

معارف ومنازل

''اور تم لوگ جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو، جس قدر خرچ کرتے ہو، اور جس طرح بھی خرچ کرتے ہو، یا تم کسی قسم کی منت اور نذر مانتے ہو، تو اللہ تعالیٰ ان سب کو جانتا ہے، اور بے جا کام کرنے والوں کا کوئی مددگار اور ساتھی اور حمایتی نہ ہوگا''۔

یہاں نذر صدقہ کے مقابلہ میں ہے۔ ''نذر'' کہتے ہیں: کسی غیر واجب چیز کو اپنے اوپر لازم کرنا، خواہ وہ اچھی ہو، یا بری ہو۔ اور شرعاً نذر کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایسی نیکی کو جس کی شریعتِ اسلامیہ میں نظیر موجود ہو، اپنے اوپر لازم کرنا، خواہ وہ عبادتِ مالیہ میں سے ہو، یا کوئی بدنی نیکی ہو۔ پھر عام ہے، خواہ مشروط ہو یا غیر مشروط۔ نذر کا حکم یہ ہے کہ نذر اور منت ماننے کے بعد اس کا پورا کرنا واجب ہوجاتا ہے۔ اگر مشروط اور معلّق ہو، تو شرط پوری ہونے کے بعد، اور اگر مشروط نہ ہو، تو جس طرح منت مانی ہو اُسی طرح اس کا پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔

حدیث شریف میں نذر پورا نہ کرنے والوں کے لئے وعید آئی ہے، اور نذر پورا کرنے والوں کے لئے ثواب کا وعدہ موجود ہے۔ نذر پورا کرنے والوں کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا﴾ [الدھر: ۷] (یہ لوگ نذریں پوری کرتے ہیں، اور اس دن سے جس کی سختی پھیل رہی ہوگی خوف رکھتے ہیں)۔

سابقہ شریعتوں میں بھی نذر ماننے کا ثبوت ملتا ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے جو منت مانی تھی، قرآن کریم میں اس کا ذکر ہے: ﴿اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ

﴿اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾[آل عمران:۳۵] (وہ وقت یاد کرنے کے لائق ہے) جب عمران کی بیوی نے کہا کہ اے پروردگار! جو (بچہ) میرے پیٹ میں ہے، میں اس کو تیری نذر کرتی ہوں، اسے دنیا کے کاموں سے آزاد رکھوں گی، تو (اسے) میری طرف سے قبول فرما، بیشک تو سننے والا (اور) جاننے والا ہے)۔

حق تعالیٰ شانہ نے جو تقدیر رقم کی ہے، نذر اسے ہرگز ٹال یا تبدیل نہیں کرسکتی۔ سید کائنات ﷺ نے نذر ماننے سے منع فرمایا، اور کہا: اَلنَّذْرُ لَایَرُدُّ مِنْ قَدْرِ اللّٰهِ شَيْئًا وَاِنَّمَا يَسْتَخْرِجُ مِنَ الْبَخِيْلِ [بخاري] کیونکہ یہ آدمی کو تقدیر سے نہیں بچاسکتی، جو کچھ تقدیر میں لکھا ہوا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ البتہ! نذر کے ذریعہ بخیل لوگوں سے کچھ مال وصول ہوتا ہے، کیونکہ نذر بخیل لوگ ہی مانتے ہیں۔ فیاض اور دریا دل لوگ شرط نہیں لگاتے ہیں، وہ تو غیر مشروط طور پر اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، گویا نذر ماننا مشروط عبادت ہے، کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں یہ صدقہ کروں گا۔ اتنی رکعت نماز پڑھوں گا، اتنے دن روزہ رکھوں گا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک قسم کی سودا بازی ہے، جو کہ بہتر نہیں ہے، اس لئے حدیث پاک نے مشروط منت ماننے سے منع فرمایا۔

سید عالم ﷺ کا فرمان ہے: گناہ کے کام میں نذر ماننا جائز نہیں ہے، اگر کسی نے ایسا غلط قدم اٹھایا، تو پھر اس کا پورا کرنا جائز نہیں ہے۔ پس نذر پورا نہ کرے، اور کفارہ دے۔ بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ کفارہ دینا وہاں ہوتا ہے، جہاں نذر صحیح ہو، جبکہ گناہ والی منت صحیح ہی نہیں، باطل ہے، تو کفارہ بھی نہیں۔ اور یہ بات مسلّم ہے کہ نذر عبادت ہے، اور غیر اللہ کی عبادت صریح شرک ہے۔ لہٰذا غیر اللہ کی نذر و منت حرام اور شرک ہے۔ مزید تفصیل سورۃ الدہر کی تفسیر میں دیکھ لی جائے۔

﴿اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ﴾ سے ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ تک۔ چونکہ صدقہ دینے والے لوگوں کے حالات مختلف ہیں، کوئی علانیہ دینے کو پسند کرتا ہے، اور اس میں دوسروں کی ترغیب مدِ نظر رکھتا ہے، اور کوئی چھپا کر دینے کو پسند کرتا ہے، تاکہ ہر قسم کی نام آوری اور ریا سے بچ جائے۔ بہر حال! ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾[البقرۃ:۱۴۸] (اور ہر ایک کی ایک سمت ہے، جس کا وہ رخ کرتا ہے، پس تم نیک کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو)۔ مقصد و ارادہ ہر دو فریق کا پسندیدہ ہے، اس لئے حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ نے دونوں طرح صدقہ دینے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ اگرچہ اخفاء کو ترجیح دی، کہ یہ طریقہ محمود بھی ہے، اور محفوظ بھی۔ آئندہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت اسی اخفاء کی تائید میں وارد ہے۔

بعض علماء کرام نے فرمایا ہے کہ صدقاتِ مفروضہ کا ظاہر کر کے دینا افضل ہے، اور صدقاتِ نافلہ کا چھپا کر دینا بہتر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول ہے کہ نفلی صدقات کا خفیہ دینا علانیہ دینے سے ستر درجہ زیادہ افضل ہے، اور صدقاتِ مفروضہ کا علانیہ دینا خفیہ دینے سے پچیس درجہ زیادہ افضل ہے، اور یہی حال دوسرے فرائض ونوافل کا ہے، کہ فرائض کو ظاہر کر کے ادا کرے، اور نوافل کو پوشیدہ رکھے۔

بعض حضرات نے صدقاتِ مفروضہ اور صدقاتِ نافلہ دونوں میں اخفاء کو افضل کہا ہے۔ بہر حال! ہر قسم کی گنجائش ہے، اور صحیح بات یہ ہے کہ ہر شخص کی حالت جدا ہے، اور مواقع بھی مختلف ہیں، اور ہر شخص اپنے ضمیر وخیال اور متعلقہ مواقع کا صحیح اندازہ لگا سکتا ہے۔ پھر حسنات وصدقات کا سیآت کے لئے کفارہ ہونا ظاہر ہے، خواہ علانیہ ہوں یا خفیہ۔ یہ مطلب ہر گز نہیں کہ خفیہ صدقات کفارہ ہوں، اور علانیہ نہ ہوں یا بر عکس۔ دوسرے نصوص علی الاطلاق اسی عمومی معنی پر دلالت کرنے والے ہیں، اور جملہ "وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن سَيِّـَٔاتِكُمْ" اپنے عموم پر ہر دو فریق (علانیہ و خفیہ) کو شامل ہے۔ واللہ اعلم

البتہ! جمہور علماء کا یہ فیصلہ ہے کہ: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾[ھود: ۱۱۴] کا مطلب یہ ہے کہ صغیرہ گناہ حسنات سے معاف ہو جاتے ہیں۔ کبیرہ گناہوں کے لئے توبہ ہی شرط ہے، اور کلمہ ''مِنْ'' اسی پر دال ہے۔

مگر امام اخفش رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ یہاں مِن تبعیض کے لئے نہیں، بلکہ زائدہ ہے۔ پھر تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ تمہارے سارے (چھوٹے بڑے) گناہ معاف فرمائیں گے، اور یہ معنی بھی عمدہ ہیں۔ جمہور کے مذہب کے خلاف نہیں ہے، یعنی صغیرہ گناہ صرف صدقات ہی سے معاف ہو جائیں گے، اور کبائر کے لئے انہیں صدقات کی برکت سے توبہ کی توفیق نصیب ہو جائے گی، اور اس طرح تمام گناہ معاف ہو جائیں گے، جہت کی تبدیلی سے۔ کیونکہ کبائر کی معافی کے دو ہی اسباب ہیں: ایک توبہ، دوم رحمت و کرمِ الٰہی عزّ شانہ۔ ہاں! یہ مسلّم ہے کہ عفو درگزر (کفارہ) کے لئے قبولیتِ صدقات شرط ہے، کیونکہ صدقاتِ غیر مقبولہ سے جب صغائر معاف نہیں ہو سکتے، تو کبائر بطریق اولیٰ معاف نہیں ہوں گے۔

آخر میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال اور قلبی ارادوں سے مکمل باخبر ہے، خواہ عمل سری ہو یا جہری۔ اس سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں، اسی کے مطابق وہ فیصلہ صادر فرماتے ہیں۔

برو علم یک ذرہ پوشیدہ نیست ☆ کہ پیدا و پنہان بہ نزدش یکیست

(سعدیؒ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (حدیث مرفوع ہے) کہ قیامت کے روز سات قسم کے لوگ عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہوں گے، ان سات میں سے وہ لوگ بھی ہوں گے جو سیدھے ہاتھ سے دیتے ہیں اور الٹے ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی۔ [متفق علیہ]

ایک اور حدیث میں ہے کہ پوشیدہ صدقہ اللہ تعالیٰ کے غضب کو بجھا دیتا ہے، اور بری موت سے حفاظت کرتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو پیدا فرمایا، تو فرشتوں نے عرض کیا: اے اللہ تعالیٰ! بھلا اس مخلوق سے بھی کوئی سخت مخلوق آپ نے پیدا کی ہے؟ ارشاد ہوا: ہاں! لوہا، اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ فرشتوں نے عرض کی: لوہے سے بھی کوئی سخت مخلوق ہے؟ ارشاد ہوا: آگ جو کہ لوہے سے بھی سخت ہے۔ پھر فرشتوں نے عرض کیا: یا اللہ! آگ سے بھی کوئی چیز زیادہ سخت ہے؟ ارشاد ہوا: ہاں! پانی۔ پھر فرشتوں نے عرض کیا: یا اللہ! پانی سے بھی کوئی چیز سخت ہے؟ ارشاد ہوا: ہم نے ہوا کو پیدا کیا ہے، وہ پانی سے بھی زیادہ سخت ہے۔ پھر فرشتوں نے عرض کیا: اے پروردگار! اس سے بھی کوئی چیز زیادہ سخت ہے؟ ارشاد ہوا: ہاں! ہمارا وہ بندہ جو سیدھے ہاتھ سے صدقہ دیتا ہے، اور الٹے ہاتھ کو خبر نہیں ہونے دیتا، یہ صدقہ سب سے طاقتور ہے۔ [مشکوۃ]

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر نیت دکھاوے (ریاء اور نام آوری) کی نہ ہو، تو خیرات کھلی بہتر ہے، تاکہ دوسرے لوگوں کو شوق آئے، اور چھپکے سے دینا بھی بہتر ہے کہ لینے والا نہ شرمائے۔ [موضح]

اس کے بعد ایک اور بات ارشاد ہوتی ہے: مدینہ منورہ کے انصار نے اپنے کافر رشتہ داروں کو خیرات دینا بند کیا، تاکہ وہ مسلمان ہو جائیں، اور خیرات کی رکاوٹ سے اسلام قبول کر لیں۔ گویا یہ ایک قسم کا اجبار ہوتا تھا کہ صدقات کی بندش کی وجہ سے وہ مسلمان ہونے پر مجبور ہوں۔ آئندہ آیات اسی کے متعلق ہیں کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہے ہدایت دے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا

تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يُّوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۲﴾

ترجمہ: ان لوگوں کو راہِ راست پر لانا آپ کے ذمہ نہیں ہے، مگر اللہ تعالیٰ راہِ راست پر لاتا ہے، جس کو چاہے، اور جو کچھ اپنے مال سے خرچ کرتے ہو، وہ تمہارے اپنے نفسوں کے لئے ہے، اور تم نہیں خرچ کرتے، مگر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے، اور جو کچھ بھی تم مال سے خرچ کروگے، تم کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۲۷۲﴾

معارف ومنازل

اسلام دینِ الٰہی ہے، اس کی تعلیمات ہمہ گیر شفقت ورحمت پر مبنی ہیں۔ شریعت مطہرہ کی تعلیمات مقدسہ میں کوئی تنگی اور تنگ نظری کا نام ونشان نہیں ہے۔ ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ دوست ودشمن، مسلمان وکافر کو یکساں بغیر تفریق کے پالتا، اور رزق وروزی دیتا ہے۔ ؎

اے کریمے کہ از خزانہ غیب ☆ گبر وترسا وظیفہ خور داری

دوستاں را کجا کنی محروم ☆ تو کہ با دشمنان نظر داری

(سعدی)

عالم اسلام کو پیغام دیا جارہا ہے کہ جب صدقہ دینے سے تمہارا منشاء رضائے الٰہی اور آخرت کا ثواب ہے، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ خیرات وصدقات کا فائدہ دنیا وآخرت میں صرف تم کو پہنچتا ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے صدقات وخیرات سے مستغنی ہے، پھر اس بحث میں کیوں پڑتے ہو کہ مسلمانوں کے ساتھ احسان کرو، اور انہیں صدقات دو، اور غیر مسلموں کو اپنی خیر سے محروم رکھو، اور انہیں (نفلی) صدقات مت دو؟

سورۃ الممتحنۃ میں مزید وضاحت کے ساتھ ارشاد ہے:

﴿لَا يَنۡهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَلَمۡ يُخۡرِجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ وَتُقۡسِطُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ ؕ﴾ [الممتحنۃ:۸] یعنی جو کافر (ذمی) تم سے لڑائی نہیں کرتے، اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالتے، ان کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں کرتے۔ تم بلا تردّد ایسے کافروں (غیر حربی) کے ساتھ اگر چاہو، تو احسان کرسکتے ہو۔

صحیح بخاری میں حضرت اسماء بنت الصدیق رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میری والدہ کافرہ (قتیلہ بنت عبدالعزیٰ) میرے گھر آئی، وہ مشرکہ تھی۔ میں سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں آکر مسئلہ معلوم کرنا چاہی کہ یارسول اللہ! میری مشرکہ والدہ میرے پاس آئی ہے، اور وہ محتاج ہے، کیا میں اس کو کچھ خیرات وصدقہ دے سکتی ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں! وہ تمہاری والدہ ہے، صلہ رحمی کی محتاج ہے، تمہیں اجازت ہے۔ [بخاری]

باقی رہا مسلمانوں کا یہ خیال کہ صدقہ نہ دینے سے کافر اسلام کی طرف راغب ہوجائیں گے، اور یہ سمجھیں گے کہ اگر ہم اسلام قبول کریں، تو مسلمانوں کے ہاتھوں ہم کو بھی مالی فائدہ حاصل ہوجائے گا، اور مسلمان ہمیں بھی خیرات وصدقات سے نوازیں گے، تو تم مسلمان اس خیال کو ترک کرو۔ یہ ہمارا کام ہے، ہم جس کو چاہیں اسلام کی توفیق عطا فرمائیں، جس کو چاہے یہ توفیق نہ دیں۔ تم نے جو کچھ دینا ہے، بنی نوعِ انسان کی ہمدردی کا خیال رکھ کر سب کو صدقہ دیا کرو، تمہارے صدقات کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا ہے، اور واقعۃً ایسا ہی ہونا چاہئے، اور تمہارا اجر ہر صورت تمہیں پورا پورا ملنے والا ہے، تمہارے کسی بھی ثواب میں ہرگز کوئی کمی نہ ہوگی۔

البتہ! یہ بات ضرور یاد رکھنا چاہئے کہ جو کچھ ذکر ہوا، یہ نفلی صدقات کا حکم تھا، زکوٰۃ وعشر اس سے مستثنیٰ رہیں گے۔ جس طرح کافروں کی حالت مختلف ہے، اسی طرح ان کے احکام بھی مختلف ہیں، مثلاً جو کافر حربی ہو، اسے کسی قسم کا صدقہ (خواہ زکوٰۃ وعشرِ مفروضہ ہو، یا نفلی صدقہ ہو) دینا جائز نہیں ہے۔ البتہ! ذمی کفار کو زکوٰۃ وعشر کے علاوہ دوسرے صدقاتِ نفلیہ دینا جائز ہیں، جیسے صدقہ فطر واجبہ، یا عام صدقاتِ نافلہ، جیسے بعض علماء نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص بدترین خلق پر صدقہ کرے، تو اس کا ثواب ضرور اسے ملے گا۔ یہ الگ مسئلہ ہے کہ ضیافت کے لئے اچھے لوگوں کا انتخاب مستحسن ہے، جیسے ارشاد ہوا: "لَا یَاْکُلْ طَعَامَکَ اِلَّا تَقِیٌّ"۔ [الحدیث]

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾

ترجمہ: صدقات وخیرات ان فقراء کے لئے ہیں، جنہیں روک دیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کے راستے میں وہ

زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، انہیں ناواقف آدمی مالدار گمان کرتا ہے، سوال سے بچنے کی وجہ سے، تم ان کو ان کی نشانیوں سے پہچانو گے، وہ لوگوں سے لجاجت کے ساتھ سوال نہیں کرتے، اور تم مال سے جو کچھ بھی خرچ کرو اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا ہے ﴿۲۷۳﴾

معارف ومسائل

اس آیت کریمہ میں مستحقین کا تعارف کیا جارہا ہے۔ سورۂ توبہ میں مصارفِ زکوٰۃ کا بیان آنے والا ہے، مگر یہاں ایک خاص انداز میں چند ایک کا تعارف ہورہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ہر حاجتمند اس امر کا مستحق ہے کہ جب اس کی حاجت معلوم ہو، تو اس کو پورا کرنا چاہئے، لیکن تمہارے صدقات ونفقات کے حقیقی مستحق وہ لوگ ہیں، جو اعتماد وتوکل علی اللہ کے زیور سے آراستہ ہوں، اور کسی مخلوق کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے شرم محسوس کرتے ہوں۔ فقہاء کرام عام طور پر فقیر کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ اس کے پاس کچھ نہ ہو، اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ ہو، مگر وہ اس کی جائز ضروریات کے لئے ناکافی ہو۔

اصحابِ صفہ کی بے پناہ استغناء:

اس آیت کریمہ میں زمانۂ رسالت کے چند مخصوص راست گو، پاکباز اور لوگوں سے بے نیاز اصحابِ صفہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اکثر وبیشتر مہاجرین تھے۔ نہ ان کا کوئی گھر ہوتا تھا، نہ اہل وعیال، نہ کوئی مقرر غذا و خوراک، نہ ستر چھپانے کے لئے کوئی لباس، صرف ایک چادر میں گزارہ کرکے تارک الدنیا لوگوں کے اعلیٰ اور اونچے درجات پر فائز رہتے تھے۔ مسجد نبوی کے ایک حصے میں ہمہ وقت طاعات وعبادات، ذکر واذکار اور تلاوت قرآن میں شب وروز مصروف رہتے تھے، دن کو روزہ رکھتے، اور جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر کندھوں پر اٹھاتے، بازار میں فروخت کرتے ساری رات تہجد کی نماز، اور تعلیم قرآن میں مشغول رہتے۔

چونکہ یہ حضرات عام لوگوں سے مستغنی رہتے ہوئے لاتعلق رہتے، اور کسی سے کچھ سوال نہ کرتے، بلکہ اشارۃً بھی اپنی حاجتمندی اور فقر وفاقہ کا اظہار نہ کرتے، لپٹ کر الحاح وزاری سے کچھ مانگنا تو درکنار۔ اپنی شکل وصورت کو محتاجانہ کیفیت میں ظاہر نہ کرتے۔ اس بے پناہ استغناء کی وجہ سے لوگ انہیں مالدار گمان کرتے، اور ان کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔ یہ سارے لوگ صدق اور دیانت اور تقویٰ کے شعار اور پیکر معلوم ہوتے تھے۔ سبحان اللہ! ان کی

امانت ودیانت اور توکل علی اللہ پر فرشتے بھی رشک کرتے تھے۔

آیت کریمہ میں انہی لوگوں کا تعارف ہو رہا ہے، کہ تمہارے صدقات ونفقات کے حقیقی مستحقین یہی لوگ ہیں۔﴿اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ﴾جنہوں نے جہاد، عبادت، تعلیمِ قرآن پر اپنے آپ کو محصور و پابند کر رکھا ہے۔ اس مشغلہ کریمہ صادقہ میں محبوس اور اس طرح بند ہیں کہ کہیں زمین میں، نہ کسی مزدوری اور نہ کسی تجارت وزراعت وغیرہ کے لئے وقت نکال سکتے ہیں، نہ سفر کر سکتے ہیں۔

دراصل تمہارے خیرات وصدقات کے مستحق یہی لوگ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت منقول ہے، جس کا خلاصہ بیان ہوا۔ حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں، جو جہاد میں زخمی ہونے کی وجہ سے بے کار اور معذور ہو گئے تھے۔ تطبیق آسان ہے، کہ کچھ لوگ وہ تھے جنہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے متعین فرمایا، اور کچھ وہ بھی تھے جن کی حضرت سعید رحمۃ اللہ علیہ نے نشاندہی کی۔

﴿تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ فقر وفاقہ، اور زہد وریاضت کے آثار ان کے چہروں میں نورانی کیفیت کے ساتھ واضح معلوم ہوتے تھے۔ یا یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ رنگ کی زردی، بدن کی لاغری اور ہونٹوں کی خشکی وغیرہ مراد ہو۔ یہ ساری علامات ان کی پیشانی میں نمایاں معلوم ہوتی تھیں۔ واللہ اعلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ (عبد الرحمن بن صخر رضی اللہ عنہ) انہی اصحابِ صفہ (چبوترہ) میں سے ہیں۔ ان کے متعلق روایت ہے کہ مسجد نبوی کے منبر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے درمیان غشی کھا کر پڑتے تھے (بیہوش ہو کر) فرماتے ہیں کہ لوگ میری گردن پر پاؤں رکھتے تھے، اور خیال کرتے تھے کہ میرے اوپر جنوں (مرگی) کا دورہ پڑ گیا ہے، حالانکہ "مَابِیْ اِلَّا الْجُوْعُ" یہ صرف بھوک کی وجہ سے ہوتا تھا۔ اس قدر زبوں حالی کے باوجود ان لوگوں نے کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ [ترمذی]

جب ان کی عزتِ نفس اور تقویٰ کا یہ عالم تھا، تو کوئی شخص انہیں محتاج تصور نہیں کیا کرتا، اور مالدار وخوشحال گمان کرتا، یہی مطلب ہے ﴿يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ﴾ کا۔ بلکہ انہوں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ مبارک پر بیعت کی ہوئی تھی کہ زندگی بھر کسی بھی حالت میں، کسی سے کسی بھی چیز کا سوال نہیں کریں گے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اونٹ پر سوار تھے، اونٹ کی مہار ہاتھ سے چھوٹ گئی، اونٹ سے اتر کر اسے اٹھا لیا، ساتھ چلنے والوں سے یہ سوال تک نہیں کیا کہ مہار ان کے ہاتھ میں پکڑ دائیں۔

آنے والی آیت کے متعلق روح المعانی نے بحوالہ ابن عساکر نقل کیا ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دس ہزار درہم رات کو، دس ہزار دن کو، دس ہزار خفیہ اور دس ہزار علانیہ صدقہ کیا، اس پر یہ آیت اتری۔

بعض مفسرین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، اور بعض نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور بعض نے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہی لکھا ہے۔ بہر حال شان نزول کوئی بھی ہو، اعتبار عمومی الفاظ ومعانی کا ہوگا۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ
اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

ترجمہ: وہ لوگ جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں، رات کے وقت اور دن کے وقت، پوشیدہ طور پر اور ظاہری طور پر، ان کے لئے ان کے ربّ کے پاس بدلہ ہے، اور نہ ان پر خوف ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۲۷۴﴾

معارف ومنازل

واضح ہو کہ آیت ۲۶۱ ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ﴾ سے لے کر آیت ۲۷۳ تک پے در پے لگاتار انفاق فی سبیل اللہ کے سلسلے میں سات بنیادی چیزوں کا بیان ہوا۔ اب آیت ۲۷۴ گویا ان بارہ آیتوں کا لبِ لباب اور خلاصہ ہے، جس کے بعد سود اور اس کی قباحت وحرمت کا بیان ہے۔ گزشتہ بارہ آیات کریمہ میں جن سات چیزوں کا بیان ہوا تھا، وہ یہ ہیں:

(۱)...... خیرات وصدقات دے کر احسان نہ جتلاؤ۔ (۲)...... جس کو صدقہ وخیرات دیا ہے اس کو ایذاء نہ پہنچاؤ۔ (۳)...... صدقہ وخیرات میں ریاکاری کا دخل نہ ہو۔ (۴)...... پاکیزہ اور اعلیٰ عمدہ چیز صدقہ میں دے دو، اور ناپاک، خبیث اور ردّی چیز دینے کا ارادہ تک نہ کرو۔ (۵)...... صدقہ کھلے طور پر بھی دیا جاسکتا ہے، اور پوشیدہ طور پر بھی، بشرطیکہ نیت درست ہو۔ یعنی انفاق محض رضائے الٰہی کے لئے ہو۔ (۶)...... نفلی صدقہ وخیرات غیر مسلم ذمی کو بھی دیا جاسکتا ہے، اور یہ نفلی صدقہ صرف مسلمانوں تک محدود نہیں۔ البتہ! زکوٰۃ وعشر غیر مسلم کو دینا جائز نہیں ہیں، وہ خالص مسلمانوں کا حق ہے۔ (۷)...... خیرات وصدقات کے سب سے زیادہ مستحق وہ فقراء ہیں، جنہوں نے جہاد یا تعلیمِ قرآن پر اپنے نفوس کو بند ومحصور کئے ہوئے ہیں، اور سوال سے تعفف کی بنیاد پر پرہیز کرتے ہیں۔ ناواقف لوگ انہیں مالدار گمان کرتے ہیں، جیسا کہ اصحابِ صفہ کے لوگ، یا مجاہدین، اور موجودہ وقت کے علماء وطلباء اور اہلِ مدارس

جو تعلیمِ دین میں شب و روز مصروف ہیں، اور دنیوی کاروبار سے کنارہ کش ہیں۔

مذکورہ آیت کریمہ ان امورِ سبعہ مذکورہ کا خلاصہ اور تتمہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ وخیرات کے لئے شرعاً کوئی وقت یا موسم مقرر نہیں ہے، بلکہ تعلق مع اللہ اور رضائے الٰہی کے حصول کے لئے رات دن، سردی وگرمی، ہر وقت صدقات کا اہتمام ہو۔ اگر اظہار کی صورت ہو، تب بھی مفید ہے، اور اگر اخفاء میں مصلحت ہو، تب بھی بہتر رہے گا۔

مستحقین کا استحقاق، یعنی فقر وفاقہ اور احتیاج، چونکہ سال بھر اور رات دن جاری رہتا ہے، لہٰذا صدقات کو ہر وقت جاری رکھنا عین حکمت مصلحت ہی ہوگا۔ اور جو لوگ اپنے صدقات ونفقات کو رات دن، ظاہر اور اخفاء کے طور پر جاری رکھتے ہیں، ان کے لئے یہ خوشخبری ہے کہ وہ ہر قسم کے خوف وملال اور حزن وزوال سے محفوظ و مامون رہیں گے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ [یونس: ٦٢] (سن رکھو کہ جو خدا کے دوست ہیں ان کو نہ کچھ خوف ہوگا، اور نہ وہ غمناک ہوں گے)۔

جو انعام اولیاء اللہ کے لئے مقرر ہے، یہاں صدقہ دینے والوں کے لئے اسی انعام کا اثبات ہو رہا ہے کہ ﴿لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ پس معلوم ہوا کہ صدقہ دینے والا امورِ سبعہ کے مطابق اگر صدقہ دے گا، تو اس کا شمار بھی انہی اولیاء اللہ میں ہوگا، کیونکہ سخی اور بخشش کرنے والے لوگ حبیب اللہ کہلاتے ہیں، اور سخاوت جنت کے درختوں میں سے ایک بابرکت اعلیٰ درخت بھی ہے۔ واللہ اعلم

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٧٥﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿٢٧٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٧٧﴾

ترجمہ: جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے، مگر جیسے وہ شخص اٹھتا ہے، جس کو شیطان نے چمٹ کر حواس باختہ کر دیا ہو۔ یہ سزا ان کو اس لئے ہوگی کہ انہوں نے کہا تھا کہ بیع بھی مثل سود کے ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا ہے، اور سود کو حرام کر دیا ہے۔ پھر جس شخص کے پاس اس کے ربّ کی جانب سے نصیحت پہنچ چکی، اور وہ آئندہ کے لئے باز آ گیا، تو جو گزر چکا اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے، اور جو کوئی دوبارہ پھر وہی کرے، تو ایسے ہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس آگ میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۲۷۵﴾ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے، اور صدقات کو بڑھاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کسی ناسپاس گناہگار کو پسند نہیں کرتا ﴿۲۷۶﴾ بیشک! جو لوگ ایمان لائے، اور نیک عمل کرتے رہے، اور نماز کی پابندی کی، اور زکوٰۃ ادا کی، تو ان کے لئے ان کے ربّ کے پاس اجر ہے، اور نہ ان کو کسی قسم کا خوف ہوگا، اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۲۷۷﴾

معارف ومنازل

''رِبا'' کے معنی ہیں: زیادتی، قرآن کریم میں ارشاد ہے ''اِهْتَزَّتْ وَرَبَتْ'' [فصلت: ۳۹] ای زَادَتْ۔ شرعاً ''رِبا'' کے معنی ہیں: وہ زیادتی جو بدون کسی عوض کے حاصل کی جائے، جو کہ بہت سخت حرام ہے۔

صدقہ وخیرات کے فوائد ومحاسن کے بعد سود کی برائیاں بیان کرنا، اور اس کو حرام قرار دینا گویا صدقہ وخیرات کے بیان کو پورا کر دینا ہے، اس لئے کہ جس طرح صدقہ وخیرات میں رحم دلی، ہمدردی اور مسکینوں، غریبوں کی ہمدردی ہے، اور محتاجوں کی دستگیری ہے، اسی طرح سود میں بے رحمی، سخت دلی اور حاجتمندوں پر سخت گیری ہے۔ یہ اس کی پوری ضد ہے۔ اسی تقابل کی وجہ سے صدقہ کرنے والوں کا ثواب پہاڑوں جتنا ہوگا، اور سود کھانے والوں کا وبال بھی پہاڑوں جتنا ظاہر ہوگا۔ صدقہ والے اولیاء اللہ کہلائیں گے، اور سود خور عَدُوُّ اللّٰہ کے نام سے یاد ہوں گے۔ صدقہ والے جنتی ہوں گے، اور سود خور جہنمی شمار ہوں گے، وغیرہ۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ سودی کاروبار کرتے ہیں، وہ قیامت کے روز اس فعلِ بد کی سزا میں عذابِ الٰہی کی دہشت سے مجنون و بدحواس ہوں گے، جیسا کہ کوئی آسیب سے بدحواس و پاگل ہو جاتا ہے، چونکہ دنیا میں محتاجوں کو ان کی سخت گیری سے دہشت اور حیرانی ہوئی تھی بمطابق: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ [الشوریٰ: ۴۰] (اور برائی کی سزا اس کی مثل برائی ہے) ان کا یہ فعلِ بد عالمِ آخرت میں آسیب بن کر ان پر سوار ہوگا، اور یہ اس لئے ہوگا کہ ان سود خوروں نے یہ بات بنائی ہے کہ سود اور بیع میں کیا فرق ہے؟ جس طرح ایک درہم کی چیز کو دس درہم

کے بدلے بیچنا درست ہے، اسی طرح بوقتِ حاجت کسی کو دس درہم دے کر پندرہ درہم لینا اپنے دراہم کا نفع حاصل کرنا ہے کہ جس سے اتنی مدّت میں ہم نفع حاصل کرتے ہیں۔

قرآن کریم اس کا جواب دیتا ہے کہ تمہارا یہ قیاس سراسر غلط ہے، کیونکہ بیع میں ایک چیز معاوضہ میں دی جاتی ہے، اور سود میں اصل دراہم لے کر اس پر زیادتی کونسی چیز کا معاوضہ ہے؟

رہی یہ بات کہ ہم اس سے فائدہ حاصل کرتے ہیں، تو یہ ہرگز یقینی بات نہیں ہے، اسی کو فرمایا: ﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے، اس نے اپنی حکمت اور اپنے بندوں کے وسیع تر مفاد میں بیع کو جائز، اور سود کو حرام قرار دیا۔ کیا کوئی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام پر انگلی اٹھانے اور اعتراض کرنے پر جرأت یا حرف گیری کرسکتا ہے؟ حرمت وحلت کے متعلق اس کا جو بھی فیصلہ ہوگا، وہ سب کے لئے واجب الاتباع ہی رہے گا۔ مقرّبانِ درگاہ کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی حلال کو حرام، یا کسی حرام کو حلال قرار دے سکیں، تو اور کسی کی کیا مجال؟ کہ وہ اس طرح کی دیدہ دلیری کرسکے، اور سود کو بیع پر قیاس کرسکے، یا اسے جائز قرار دے۔

سودخور کا عبرت ناک انجام:

شب معراج میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ لوگوں کو دیکھا جن کے پیٹ مثل بڑے بڑے گھروں (کوٹھریوں) کے تھے۔ حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ سودخور، بیاج لینے والے ہیں۔ اسی روایت میں ہے کہ ان کے پیٹوں میں سانپ بھرے ہوئے تھے، جو باہر سے نظر آتے تھے۔ اور صحیح بخاری کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ جب ہم ایک خونی سرخ نہر پر پہنچے، جس کا پانی خون جیسا تھا، اس میں کھڑے ہوئے لوگ جب نہر کے کنارہ پر پہنچتے، وہاں ایک فرشتہ ان کے منہ میں پتھر مار کر انہیں واپس خون کی نہر میں دھکیل کر گرا دیتا۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ بدبخت سودخور لوگ ہیں، اور قیامت تک اسی عذاب میں مبتلا رہیں گے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سود میں تہتر گناہ ہیں، جن میں سب سے کم اور ہلکا گناہ یہ ہے کہ انسان اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرے۔ [حاکم]

سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ سود عام ہو جائے گا، اور لوگ سود کھائیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: کیا سب کے سب؟ فرمایا: جو نہ کھائے گا، اسے سود کا غبار تو پہنچے گا۔ [مسند أحمد]

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ دونوں نے روایت کی کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سود کھانے

والے، کھلانے والے، لکھنے والے اور گواہی دینے والے، سب پر لعنت کی، اور فرمایا: یہ سب گناہ میں برابر ہیں۔
[مسلم، أبو داؤد، ترمذي]

حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ غسیل الملئکۃ نے روایت کیا کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص دانستہ طور پر ایک درہم سود کھاتا ہے، اس کا جرم چھتیس مرتبہ زنا سے بدتر ہے۔ [دار قطني، مسند أحمد]

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ اس جملے میں ان لوگوں کے اس قول کا ذکر ہے، جنہوں نے سود کو بیع پر قیاس کر کے کہا تھا کہ سود بیع کی طرح ہے۔ یہاں بظاہر مقتضائے مقام یہ تھا کہ وہ یہ کہتے کہ ﴿اِنَّمَا الرِّبٰوا مِثْلُ الْبَيْعِ﴾ کہ ربا بھی تو مثل بیع کے ہے۔ جب بیع حلال ہے، تو ربا بھی حلال ہونا چاہئے، مگر انہوں نے طرزِ بیان بدل کر حرام کہنے والوں پر ایک قسم کا استہزاء کیا، کہ تم نے ربا کو حلال کیا، اور کہا کہ سود اور بیع دونوں ایک جیسے ہیں، اور ان میں فرق نہیں ہے۔

جواب آیا کہ ﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ یہ حکیمانہ جواب ہے، کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق اور مالک الملک ہے، وہی ہر چیز کے نفع ونقصان اور بھلے برے کو پوری طرح جانتا ہے۔ جب اس نے اپنی حکمت وشفقت کے تحت ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام قرار دے دیا، تو سمجھ لو کہ جس چیز کو حرام کیا ہے، اس میں ضرور کوئی خباثت اور کوئی نقصان وضرر ہے، خواہ لوگ اسے محسوس کریں یا نہ کریں، کیونکہ مجموعۂ نظامِ عالم کی پوری حقیقت اور اس کے نفع وضرر کا پورا احاطہ صرف وہی علیم وخبیر کر سکتا ہے، جس کے علم سے کائنات کا کوئی ذرّہ پوشیدہ نہیں ہے۔ عالم کے افراد یا جماعتیں ایک محدود حد تک اپنے اپنے مصالح اور مضرتوں کو شاید پہچان سکتے ہیں، مگر پورے عالم کے منافع اور مضرتوں تک ان کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

﴿فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ [الآية] جس شخص کے پاس اس کے ربّ کی طرف سے نصیحت آ گئی، یعنی سود کی حرمت کا حکم پہنچ گیا، تو وہ سود سے تائب ہو گیا، تو جو کچھ ہو چکا وہ اس کے لئے ہو گیا، اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

مطلب یہ ہے کہ سود حرام ہونے سے پہلے جس شخص نے کوئی پیسہ جمع کیا تھا، لیکن جب سود کو حرام قرار دے دیا گیا، تو آئندہ کے لئے اس نے توبہ کر لی، اور باز آ گیا، تو اس سے پہلے جمع شدہ رقم ظاہر شرع کے حکم سے اسی کی ہو گئی، اور رہا باطنی معاملہ کہ وہ دل سے تائب ہو کر باز آیا، یا منافقانہ توبہ کر لی، اس کا یہ معاملہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے

حوالہ ہے۔ اگر دل سے توبہ کرلی ہے، تو عند اللہ نافع ہوگی، ورنہ کالعدم ہوگی۔ عام لوگوں کو بدگمانی کا حق نہیں ہے۔

﴿وَمَنْ عَادَ فَأُولٰئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ﴾ اور جو شخص حکمِ الٰہی اور نصیحت سن کر بھی اسی قول وفعل کی طرف پھر عود کرے، یعنی دوبارہ سودی کاروبار شروع کرے، تو ایسے لوگ دوزخ میں جائیں گے، اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، کیونکہ انہوں نے کفر کیا کہ حرامِ قطعی کو حلال سمجھا۔

اب سود کی حرمت کی حکمت کا بیان:

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ﴾ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے، اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ سود کو مٹانے اور صدقات کو بڑھانے کا مطلب کیا ہے؟ تو بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ مٹانا اور بڑھانا آخرت کے ساتھ وابستہ ہے، کہ سود خور کو اس کا مال آخرت میں کچھ کام نہ آئے گا، بلکہ الٹا اس پر وبال بن جائے گا، اور صدقہ کرنے والوں کا مال آخرت میں ان کے لئے ابدی نعمتوں اور راحتوں کا یقینی ذریعہ ثابت ہوگا۔ یہ بات نہایت واضح ہے، اور ہر قسم کے شکوک وشبہات سے بالاتر ہے۔

عام مفسرین نے فرمایا ہے کہ سود کا مٹانا، اور صدقات کا بڑھانا آخرت کے لئے تو ہے ہی، مگر اس کی کچھ علامت وآثار دنیا میں بھی مشاہدہ میں آجاتے ہیں، کیونکہ سود جس مال میں شامل ہوجاتا ہے، یا جن لوگوں کی خوراک بن جاتا ہے، یا جن متاع واسباب کے ساتھ مخلوط ہوجاتا ہے، تو وہاں کے اموال، نفوس اور مال ومتاع سے برکت اٹھ جاتی ہے، اور وہ تمام اموال اور خاندان غضبِ الٰہی کی زد میں آجاتے ہیں، اور پورے خاندانوں کا امن وسکون غارت ہوجاتا ہے۔ طرح طرح کے آلام ومصائب، اور صحت وسلامتی تباہ وبرباد ہوجاتی ہیں۔

بمصداق...... حرام کوہ باشد کوہ کا وباشد کا ورا باد برد...... یعنی شروع میں سودی مال ترقی کر کے پہاڑوں کے برابر ہوگا، پھر وہ پہاڑ خس وخاشاک بن کر ہواؤں میں اڑ جائیں گے، اور فنا ہوجائیں گے۔ لالچ وحرص میں اضافہ ہو جائے گا۔ اطمینان وسکون ناپید ہوجائیں گے۔ بخل، بزدلی، بے رحمی، جنم لیں گے، اور شرافت، حسنِ اخلاق، دیانت، تقویٰ، صداقت، تاراج اور غارت ہوجائیں گے۔ قیامت سے پہلے دنیوی زندگی میں ﴿يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ﴾ والی کیفیت ظاہر ہوجائے گی، اور سود خور پورے معاشرے سے کٹ کر کسمپرسی کے عالم میں بے یار ومددگار ہوجائے گا۔

یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ سود خور ہر جوانمردی، شجاعت، حکمت وعدالت سے خالی اور محروم رہے گا،

کیونکہ اس کی جنگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ زندگی بھر جاری رہتی ہے، اور جو کوئی مالک الملک والملکوت عزّ وجل کے ساتھ برسر پیکار ہوگا، وہ ہر خیر و نفع، اور ہر بھلائی سے محروم ہی ہوگا۔

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اِنَّ الرِّبٰوا وَاِنْ کَثُرَ فَاِنَّ عَاقِبَتَهٗ تَصِیْرُ اِلٰی قُلٍّ" [ابن ماجه، أحمد] سود اگرچہ کتنا ہی زیادہ ہو جائے، مگر انجام اس کی قلت ہی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ﴾ اللہ تعالیٰ ناشکرے، اور گناہگار لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ سود خور دراصل خونخوار ہے، مفلسوں، حاجتمندوں اور محتاجوں کا خون و پسینہ چوستا ہی رہتا ہے۔

یاد رہے: "اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ فَاَكْرَمُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰی عَيَالِهٖ"۔ لوگ اللہ تعالیٰ کے کنبے ہیں، پس اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھا انسان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے کنبے کے ساتھ بھلائی کرے، اور ناپسندیدہ انسان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے کنبے کے ساتھ برائی کرے، ان پر ظلم کرے، اور ان کا خون چوس کر ان پر زیادتی کرے، ان کی مجبوری سے ذاتی فائدہ حاصل کرے، وغیرہ۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ﴾ تا ﴿وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ پہلے سود کھانے اور خبیث اعمال وعقائد کا بیان تھا، اور سودی مال کی کثرت کے باوجود اس کی قلت کا بیان تھا۔ ﴿لَا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ﴾ [المائدة: ۱۰۰] (برابر نہیں ہیں ناپاک اور پاک، اگرچہ ناپاک کی کثرت آپ کو تعجب میں ڈال دے)۔ یہاں سے طیب اور پاکیزہ اعمال وعقائد کا بیان ہے۔ ایمان، عمل صالح، اقامۃ صلوٰۃ اور ادائیگی زکوٰۃ، اور ان کے ضمن میں اطاعتِ الٰہی اور التزامِ احکام، اور اس کے ساتھ ان کا ثمرہ ونتیجہ، جنتی نعمتوں اور راحتوں کا حصول، ابدی امن وسکون اور ہر قسم کے خوف وملال اور حزن وزوال سے بے غمی، اور خلاصی کا بیان ہے۔ یہ برکات مؤمنین صادقین کی قسمت میں لکھی جا چکی ہیں، اور انہیں حاصل رہیں گی۔ قرآن کریم کا داب و طریقہ یہی ہوتا ہے کہ ترغیب وترہیب کی خاطر مستحقین اور محرومین کا تذکرہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ

وَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۹﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور جو سود باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو، اگر تم حقیقی ایماندار ہو﴿۲۷۸﴾ پھر اگر تم ایسا نہیں کرتے، تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی جانب سے جنگ کا اعلان سن لو، اور اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے اصل مال تمہارے لئے ہیں، نہ تم کسی پر زیادتی کرو، اور نہ تم پر زیادتی کیا جائے﴿۲۷۹﴾

معارف ومنازل

کیسا پیارا اور شفیقانہ خطاب ہے؟ جس کی ابتداء کلمۂ ایمان اور تقویٰ سے ہے، یہی دوصفت اگر کسی میں ہوں، تو یقین کیجئے کہ سارا جہاں اس کے پاس گروی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کئی مرتبہ نقل ہوئی کہ حقوق اللہ وحقوق العباد کی پاسداری کا نام تقویٰ ہے۔

﴿اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا﴾ سے خود غرض، مفاد پرست، درندہ صفت انسانوں کا بیان ہوا، جو حق وخلق دونوں سے بے نیاز ہوکر دولت ومال کے پجاری بنے رہے، اور حق کی آواز سے اندھے بہرے رہ کر خلق کا خون چوستے رہے۔ درندہ جانور اپنے پیٹ بھرنے کے لئے اسی مقدار میں شکار کرتا ہے، جس سے اس کے پیٹ کی بھرائی ہو، پھر بس کرکے آرام کرتا ہے، مگر سود خور، حرام خور، مال ودولت کا پجاری زندگی بھر شکار کھیلتا ہے، اس کا پیٹ (جیسا کہ گزشتہ حدیث میں بیان ہوا) نہیں بھرتا۔ اگر سارے جہاں کے مال ومنال اس کے پیٹ میں ڈال دیں، تو اس کا پیٹ ہرگز نہیں بھرے گا، خالی ہی رہے گا، یہاں تک کہ قبر کی مٹی سے اس کے پیٹ کی بھرائی کا علاج ہوگا۔

اس کے برعکس خدا پرست، تارک الدنیا، مقبل الی الآخرۃ لوگ ہیں، جو حق وخلق دونوں کے حقوق کے پاسدار ہیں۔ شرعی اصولوں کے مطابق رزق وروزی حاصل کرتے ہیں۔ حسب ضرورت خود کھاتے ہیں، اور محتاجوں کو بھی کھلاتے ہیں۔ نیک کاموں میں بڑے شوق سے فیاضی کرتے ہیں۔ صدقات وخیرات کرتے ہیں، اور اصلاح معاشرہ میں بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔

حکایت:

دمشق، شام میں ایک بڑے تاجر ہوتے تھے ''علی بن عبداللہ''، ایک سال لوگوں کو حج کراتے تھے، ایک سال ہزار غازیوں کی کفالت کرتے تھے، ایک سال غلاموں، باندیوں کو آزاد کراتے تھے، ایک سال سینکڑوں

جوانوں کی شادی کراتے تھے، ایک سال علماء وطلباء کے اخراجات پورے کرتے تھے، ایک سال مساجد ومدارس تعمیر کرتے تھے، علیٰ ہٰذا القیاس۔ ساری زندگی خلقِ خدا کی خدمت میں مصروف رہے۔ اس کے باوجود رو رو کر کہتے تھے کہ پتہ نہیں میرا انجام کیا ہوگا؟ آخر الامر جہاد پر روانہ ہوئے، اور سارے مجاہدین کے اخراجات اپنے مال سے پورے کئے، اور سفرِ جہاد میں بڑھاپے اور ضعف کے باوجود مجاہدین کی خدمت کرتے رہے حتیٰ کہ شہید ہو گئے۔ پیچھے سے اولاد کو وصیت لکھ کردی کہ میری تجارت سے شرعی اصولوں پر حلال مال کمائیں، اور خدمتِ خلق پر صرف کریں۔ [تاریخ دمشق]

سودخوروں کے خلاف اعلانِ جنگ:

﴿فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ یہ ایسا سخت اعلان اور تنبیہ ہے کہ اس کے سامنے دنیا کے سارے ملوک وسلاطین ٹھہر سکتے ہیں اور نہ اس الٹی میٹم کو قبول کر سکتے ہیں۔ وہ کونسی مخلوق ہے جو اس تباہ کن چیلنج کو قبول کرے؟ مطلب یہ ہے کہ سودی کاروبار کرنے والوں کے خلاف یہ ایک اعلانِ جنگ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ قیامت کے روز سود خوروں سے فرشتے کہیں گے: آؤ! میدانِ جنگ میں، اور لے لو اپنے ہتھیار۔ [مظهري]

اہلِ حقیقت نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنگ کا مطلب دوزخ ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے جنگ تلوار ہے، یعنی جہاد۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ باغی کی طرح سود خور سے توبہ طلب کی جائے، اگر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر آئے اور توبہ کرلے تو درست ہے، ورنہ بصورتِ انکار اس کے ساتھ جہاد کیا جائے۔

ظاہر یہ ہے کہ اگر سود خور کے پاس اپنی حفاظت کی طاقت نہ ہو تو امام پر واجب ہے کہ اسے قید کردے، اور جب تک توبہ نہ کرے قید میں رکھے۔ اور اگر اس کے پاس حفاظتی طاقت ہو اور امام اسے گرفتار نہ کر سکے وہ باغی قرار دیا جائے گا، اور اس کے ساتھ اس وقت تک جنگ کی جائے جب تک وہ توبہ نہ کرلے۔

یہی حکم ہر تارکِ فرض کا ہے۔ نماز، زکوٰۃ، وغیرہ کا تارک، اور کبیرہ گناہ کا مرتکب، جب کہ وہ علی الاعلان دندناتے گناہ پر مصر ہو، سب کا یہی حکم ہے۔

رزین رحمۃ اللہ علیہ نے مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے، جب رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا تو بہت سے عرب اسلام سے پھر گئے، اور وہ زکوٰۃ دینے سے منکر ہو گئے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا

کہ یہ لوگ اگر اونٹ کے پاؤں باندھنے والی رسی (عقال) دینے سے انکار کریں گے، تو میں ان سے جہاد کروں گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے صدیق! اے خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ مسلمانوں کے ساتھ جہاد نہ کریں، ان کے ساتھ نرمی اختیار کریں۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم جاہلیت میں بڑے سخت گیر تھے، اور اسلام میں کمزور پڑ گئے۔ "اَجَبَّارٌ فِی الْجَاھِلِیَّةِ وَ خَوَّارٌ فِی الْاِسْلَامِ وَاللّٰہِ لَوْ مَنَعُوْنِیْ عِقَالًا کَانُوْا یُؤَدُّوْنَہٗ لَقَاتَلْتُھُمْ عَلٰی ذٰلِکَ وَاللّٰہِ لَاُقَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَیْنَ الصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ" [متفق علیہ] اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ بھی کہا تھا: "اَیَنْقُصُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ"۔ (کیا دین میں کمی ہو، اور میں زندہ رہوں؟) یہ کتنا وزن دار جملہ ہے؟ اگر کوئی حاکم، حکمران، عالم، مفتی، غازی اس جملہ کو اپنا شعار اور ذریعۂ شناخت بنائے، تو کیا ہی اچھا ہو۔ مگر کیا کیا جائے؟ اور کہاں سے لایا جائے؟

ھٰدَاہُ الدِّیْنَ قَدْ ضَلُّوْا فَقَدْ بَانَتْ خَسَارَتُھُمْ ★ فَبَاعُوا الدِّیْنَ بِالدُّنْیَا فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُھُمْ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصری، محمد بن سیرین، ربیع ابن انس رحمہم اللہ کے فتویٰ کے مطابق اگر کوئی دار اسلام میں سودی کاروبار کرے گا، تو اسے توبہ کے لئے مجبور کیا جائے گا۔ اگر پھر بھی باز نہ آیا، تو اس کو مرتد کی طرح قتل کیا جائے گا، اور یہ قید و بند والا سلسلہ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ کی رائے ہے، کہ جب تک یہ توبہ نہ کرے اسے موت تک قید میں رکھا جائے۔

اسلامی نظامِ معاش کی ہمہ گیر برکات:

خالقِ کائنات جل شانہ نے جس منظم و محکم حسن و خوبی اور دلکش مناظر کے ساتھ اس وسیع و عریض کائنات کو پیدا فرمایا، پھر اس کی خوشحالی، بقاء اور ترقی کے لئے اسی نہج و طرز پر بے مثال ابدی قوانین و ضابطے مرتب فرما کر انبیاء علیہم السلام کی معرفت عرش سے فرش پر نازل فرمائے۔ یہ قوانین اتنے ہمہ گیر، پختہ اور بے مثال ہیں، جس طرح کائنات کی تخلیق و تدبیر۔

دنیا میں آباد اقوامِ عالم اپنے تمام قوانین عدل و انصاف کے دفعات اور ضوابط اگر جمع کرلیں تو اسلامی قوانین میں سے کسی ایک ضابطے کے گرد و غبار تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ کہاں ناعاقبت اندیش انسانوں کے قوانین، اور کہاں محسن و حکیمِ انسانیت سید کائنات حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے قوانین و ضابطے؟ جو کہ خالقِ کائنات نے اپنی نگرانی اور منظوری کے ساتھ عرش سے فرش والوں کے لئے مرتب فرما کر اتارے۔

یہ قوانین اتنے پختہ، عالمگیر اور بے مثال ہیں، جن میں قدم قدم پر پوری انسانیت کی فلاح وصلاح کے اسرار مخفی ہیں، فرمایا: ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ [الملک: ۱۴] (بھلا جس نے پیدا کیا وہ بے خبر ہے؟ وہ تو پوشیدہ باتوں کا جاننے والا (اور ہر چیز سے) آگاہ ہے)۔ اسی طرح ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غَافِلِينَ﴾ [المؤمنون: ۱۷] (ہم نے تمہارے اوپر (کی جانب) سات آسمان پیدا کئے، اور ہم خلقت سے غافل نہیں ہیں)۔

انسانی قوانین کے مقابلے میں خدائی قوانین اتنے صحیح اور برحق ہیں کہ ان کے درمیان آسمان وزمین جیسا فرق وفاصلہ کہنا بھی بے انصافی ہوگی۔ خدائی قوانین کو اللہ تعالیٰ کی منظوری حاصل ہے۔ انسان کے قوانین کو یہ شرف حاصل نہیں ہے، اور وہ شکست وریخت پر مبنی ہیں۔ انسان (اقوامِ عالم) بڑے غور وفکر کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی صورت میں کافی بحث وتمحیص کے بعد ایک قانون مرتب کرتے ہیں، اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ اسے نافذ کرتے ہیں، چند روز بعد اس میں ہزاروں نقائص اور کمزوریاں محسوس کر کے اسے یا تو منسوخ کرتے ہیں، یا ترمیم کر کے اس کا حلیہ بگاڑ دیتے ہیں۔ یہی ان کے قوانین کے ناقص ہونے کی علامت ہے۔ بڑے بڑے قانون دان، ماہرین، دانشور اور فلاسفر نے قوانین مرتب کئے، مرورِ ایام کے ساتھ پھر وہی لوگ اس پر تیشہ چلا کر اسے کالعدم قرار دے رہے ہیں، یا دوسرے دانشوروں نے اس پر تیر چلا کر اسے ناقابلِ عمل قرار دیا۔

مگر اللہ ربّ العزّت نے جو قانون اتارا ہے، وہ اتنا منظم ومحکم اور جامع ہے، جو قیامت تک کے انسانوں کے لئے ہیں۔ وہ پوری انسانیت کے لئے، اور ہر زمانہ اور ہر خطہ کے لوگوں کے لئے قابلِ عمل اور مفید بھی ہے، اور وہ اتنا محکم وبے عیب ہے، کہ نہ اس میں کسی ترمیم کی ضرورت ہے، نہ کسی تبدیلی یا تنسیخ کی حاجت ہے۔ وہ ہر زمانہ کے لوگوں کے مزاج وطبائع پر منطبق ہے، کیونکہ جس ذات پاک نے طبائع ومزاج پیدا کئے، تو حکیم ومعالج بھی وہی ذات ہے، جبکہ کائنات کی جسمانی، مادّی اور روحانی ساری بیماریوں سے باخبر ہے۔

اقوامِ عالم کے کفار معاندین ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کارخانۂ قدرت میں آج تک کسی قسم کا نقص، عیب اور کمی کی نشاندہی سے عاجز رہے، اور ہتھیار ڈال دیئے، اسی طرح انہوں نے قوانینِ الٰہیہ اور قرآن کے خلاف مسلح ہو کر بڑے زور لگائے۔ نہ نظم قرآن کریم کی کوئی مثال لا سکے، اور نہ ہی قرآنی قوانین اور قرآنی نظامِ حیات کا کوئی متبادل نظام پیش کر سکے، اور نہ ہی اس نظام وقانونِ الٰہی میں کوئی کمی اور نقصان ثابت کر سکے۔ قیامت تک قرآن کا چیلنج برقرار

ہے، مگر نہ کسی میں حوصلہ ہے، اور نہ جرأت کہ اس میدان میں اتر سکے۔

چاروں فقہاء کرام رحمہم اللہ کے مسائل جو کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں مرتب ہوئے، آج صرف فقہ حنفی میں کلی بشمولِ جزئیات تیرہ لاکھ مسائل کا ذخیرہ موجود ہے۔ مجال نہیں کہ کوئی قانون دان، دانشور، وکیل، پروفیسر، سائنسدان ان میں سے کسی ایک مسئلہ کو چیلنج کر سکے، یا غلط ثابت کر سکے، یا قرآن وحدیث کے خلاف قرار دے سکے۔ معاشرتی، تجارتی، معاشی، زراعتی مسائل پر پورے جہاں کی عمارت کھڑی ہے۔ اسلام نے انہیں ایسی خوش اسلوبی سے مرتب فرمایا کہ کسی باریک اور ادنیٰ چیز کی فروگزاشت کا قطعاً امکان نہیں۔ آج سارا جہاں معاشی لحاظ سے ابتری کا شکار ہے۔ مغربی ممالک برلبِ گور حالتِ نزع میں جی رہے ہیں۔ کچھ لوگ زندہ در گور کی کیفیت میں ہیں۔

سرمایہ داروں، سود کمانے والوں کے پالتو کتے، ایئر کنڈیشنڈ بنگلوں میں عیش کرتے ہیں، اور وہ مہنگی اعلیٰ عمدہ خوراک کھا رہے ہیں، جو افریقہ اور ایشیاء کے غریب عوام کے لختِ جگر بیوی بچوں کو نصیب نہیں۔ گھوڑوں، کاروں، اونٹوں کی ریس پر اسی طرح بے مقصد کھیلوں پر اربوں روپیہ صرف ہو رہے ہیں۔ بے رحمی اور ظلم وستم کا کالا ریچھ ناچ رہا ہے، اور ستم رسیدہ عوام علاج ومعالجہ تو درکنار، نانِ شبیہ اور کفن کے محتاج ہیں۔

سیدنا عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کی سلطنت کا رقبہ ستر لاکھ مربع میل ہے، اور عوام اتنے خوشحال ہیں کہ کوئی زکوٰۃ قبول کرنے والا نہیں ملتا۔ خلیفۂ وقت کا لباس صرف ایک جوڑہ ہے، اور اس پر سترہ پیوند لگے ہوئے ہیں۔ بھیڑیے ریوڑ کے ساتھ ایک ہی چراگاہ میں گھاس کھاتے ہیں۔ اگر آج پورا جہاں نہ سہی صرف ہمارے بدنصیب مسلمان حکمران اپنے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پاکیزہ قانون پر عمل پیرا ہوتے، تو مسلمان دنیا ہی میں جنت کا نظارہ کرتے، اور دیگر اقوامِ عالم بشمولِ یورپ اپنے عوام کے سامنے جھک کر خلافتِ راشدہ کے نظامِ عدل وانصاف کو اپناتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو قوم کتاب وسنت سے کٹ جاتی ہے، وہ دنیا وآخرت دونوں کی راحتوں سے محروم ہو جاتی ہے۔

﴿وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا﴾ سود کی ممانعت پر مسلمانوں نے سودی لین دین چھوڑ دیا تھا، لیکن بعض لوگوں کی سودی رقمیں کچھ لوگوں کے ذمہ باقی تھیں۔ بنو ثقیف اور بنی مخزوم کے درمیان سودی معاملات تھے۔ بنی مخزوم مسلمان ہوئے، تو انہوں نے سودی رقم بنو ثقیف کو دینے سے انکار کر دیا، اور بنو ثقیف کے لوگ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، وہ اپنی سودی رقم کا مطالبہ کرتے رہے۔ یہ جھگڑا مکہ مکرمہ میں پیش آیا، اور مکہ اس وقت فتح ہو چکا تھا، وہاں کے

امیر حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ تھے، انہوں نے حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں یہ واقعہ لکھ کر بھیجا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس آیت کی رُو سے یہ جرم ایک فوجداری جرم شمار ہوا، اور تمام سابقہ سودی معاملات کالعدم کردئے گئے۔

سودی لین دین کی رقم، اور اس کی وصولی و مطالبہ سب ممنوع قرار پائے، صرف اصل قرض یا راٴس المال وصول کرنے کی اجازت رہ گئی۔ جو لوگ سود کھاتے تھے، انہیں وہاں کے عمال کے ذریعہ آگاہ کیا گیا، کہ وہ سودی عمل سے باز آجائیں، ورنہ ان کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ نجران کے عیسائیوں کو جب اندرونی خودمختاری دی گئی، تو ان کے معاہدے میں وضاحت کردی گئی تھی، کہ اگر تم لوگوں نے سودی کاروبار کیا، تو معاہدہ کالعدم ہوجائے گا، اور جنگ چھڑ جائے گی۔ چنانچہ مسلمان تو اس قانون کے پابند ہو ہی گئے تھے، غیر مسلم معاہد بھی پابند بن گئے۔ اس کے باوجود حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلانِ عام بھی فرمایا تھا کہ یہ قانون پوری انسانیت کی صلاح وفلاح اور تعمیر کے لئے جاری کیا جارہا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ مقدس فرمان یہ ہے: "اَلَا اِنَّ کُلَّ رِباً کَانَ فِی الْجَاهِلِیَّةِ مَوْضُوْعٌ عَنْکُمْ کُلُّهٗ وَلَکُمْ رُؤُوْسُ اَمْوَالِکُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ وَاَوَّلُ رِبَا الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ مَوْضُوْعٌ کُلُّهٗ"۔ یعنی جہالت کے تمام سودی معاملات کالعدم قرار دیئے گئے ہیں۔ اب اصل رقم ملے گی، سود نہیں ملے گا، نہ تم ظلم کرسکو گے، اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔ سب سے پہلے عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا سود چھوڑ دیا گیا ہے۔

اس پر مسلمانانِ بنی مغیرہ و بنی عمرو نے کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں، ہم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے لڑنے کی طاقت کہاں؟ چنانچہ لوگوں نے راٴس المال لینے پر فیصلہ کیا، اور سود سے ایسے تائب ہوئے، جس طرح حرمتِ شراب کے نزول کے بعد وہ شراب سے تائب ہوئے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہیں ربّ العزّت سبحانہ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت کے لئے انتخاب فرمایا تھا، اتنے بے مثال جاں نثار تھے کہ عملی میدان میں ہر قسم کی منت وسماجت سے مستغنی ہوتے تھے۔ وہ محض حکمِ الٰہی کی سماعت کے ساتھ عملی میدان میں جلوہ افروز ہو کر ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

﴿لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴾ کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ تمہاری اصل رقم کے لوٹانے میں کوئی تاخیر نہیں ہونی چاہیے، اور تمہارے مطالبے پر فوراً تمہاری رقم ادا کردی جائے۔ سبحان اللہ! کیا مبنی برانصاف معتدل قانون

ہے؟ ایک طرف مقروض سے سود لینے کو منع فرمایا، تو دوسری طرف مقروض کو تاکید فرمائی کہ اگر قرض کی ادائیگی میں تاخیر کروگے، اور قرض خواہ کے ساتھ ٹال مٹول کروگے، تو ظالم قرار دیئے جاؤگے۔

وَاِنۡ كَانَ ذُوۡ عُسۡرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيۡسَرَةٍ ‌ؕ وَاَنۡ تَصَدَّقُوۡا خَيۡرٌ لَّـكُمۡ‌ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۰﴾
وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِيۡهِ اِلَى اللّٰهِ ‌ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۱﴾

ترجمہ: اور اگر مدیون تنگدست ہو تو اس کو اس کے خوش حال ہونے تک مہلت دینی چاہئے، اور رہی یہ بات کہ تم اس تنگ دست کو معاف ہی کردو تو یہ تمہارے لئے اور بھی بہتر ہے، بشرطیکہ تم سمجھو ﴿۲۸۰﴾ اور ڈرو اس دن سے جس دن تم سب اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤگے، پھر ہر شخص نے جو کچھ کمایا ہے وہ اس کو پورا پورا دیا جائے گا، اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۲۸۱﴾

معارف ومنازل

یہ آیت کریمہ رحمت وشفقت اور انسانی ہمدردی پر مشتمل ایک جامع آیت ہے۔ کتنا خوش قسمت ہوگا وہ انسان جس کے دل میں رحمٰن ورحیم عزّ شانہ کے مقدس اسمائے حسنیٰ کا جلوہ، یعنی رحمت موجود ہوگی؟ اور یہ امر واضح ہے کہ جتنا کسی کے قلب میں رحمت کا مادّہ ہوگا، اتنا ہی وہ حضرت حق سبحانہ سے قریب تر ہوگا، فرمایا: اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ۔ یعنی جن لوگوں کے قلوب میں رحمت ہو، تو ان پر اللہ تعالیٰ رحم اور رحمت ہی فرمائیں گے۔ پس تباہ ہوئے وہ لوگ جن کے قلوب رحمت سے خالی ہوں۔

اسی سلسلہ میں رہنمائی فرمارہے ہیں کہ سختی نہ کرو، بلکہ رحمت وشفقت سے کام لو۔ اگر تمہارا مدیون تنگ دست ومحتاج ہے، تو اس پر گرفت نہ کرو، بلکہ اسے مہلت دو، بار بار مہلت دیتے جاؤ۔ سودی کاروبار والے ہر مہلت پر سود بڑھاتے رہتے تھے۔ وہ ایک غیر شرعی، بے رحمانہ ظلم وستم پر مبنی عمل تھا، اور تم انصاف پسند متقی مؤمن ہو۔ ہر مسکین تمہارے احسان کا امیدوار وخواہشمند ہے۔ تم اسے ایک ایسے وقت تک کے لئے مہلت دو، جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوسکے۔

سبحان اللہ! اگر تم اپنے کریم پروردگار کی صفات پر عامل رہو، اور اس کی صفتِ عفو وکرم کو اپنے اندر پیدا کرو،

اور بجائے مہلت دینے کے اسے ہمیشہ کے لئے معاف ہی کر دو، تو یہ بہت ہی بہتر ہوگا، اور تمہاری شان سے مناسب بھی یہی ہوگا، کیونکہ تمہارا پروردگار منکسر المزاج، شکستہ دل لوگوں کے قرب و جوار میں موجود ہوتا ہے۔

حدیث قدسی میں ارشاد ہے کہ اے میرے بندے! اگر مجھے تلاش کرو، تو مجھے شکستہ دل محتاج لوگوں کے پاس پاؤگے۔ میرا حریم تنگدست شکستہ دل لوگوں کا قرب وجوار ہے۔ مجھے آسمانوں کی وسعتوں میں تلاش نہ کرو۔

جلوۂ حسنت نگنجد در زمین و آسمان ☆ در حریم سینہ حیرانم کہ چون جا کردہٖ

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً منقول ہے، فرمایا سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے: کوئی مسلمان جو اپنے مدیون کی مدتِ دین پوری ہونے کے بعد اس کو مہلت دیتا ہے، تو مہلت کے ہر دن میں اس کو صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔ [مسند احمد]

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ قیامت کے روز عرشِ الٰہی کے سایہ میں سب سے پہلے اس شخص کو جگہ دی جائے گی، جو تنگدست مدیون کو مہلت دیتا ہے، یا اس کو معاف کر دیتا ہے، اور اپنا مطالبہ یہ کہہ کر چھوڑ دیتا ہے کہ میرا جو کچھ تیرے ذمہ ہے، وہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور خوشنودی کی غرض سے تجھ پر صدقہ کر دیتا ہوں، اور یہ کہہ کر قرضہ کی دستاویز کو جلا دیتا ہے۔ [رواہ الطبرانی]

اسی طرح حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص مقروض کو مہلت دے، یا اپنے قرض سے دستبردار ہو جائے، قیامت کے روز عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہوگا، یہی روایت ابو قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابو الیسر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے بھی مروی ہے۔

ایک بنی اسرائیلی شخص کی جان نکالنے کے لئے فرشتے آئے، تو اس سے دریافت کیا کہ تو نے کبھی کوئی نیک کام کیا ہے؟ اس نے کہا: میں نے کبھی کوئی نیک کام نہیں کیا۔ فرشتوں نے کہا تم یاد کرو، شاید تمہیں کوئی نیکی یاد آجائے۔ اس نے کہا: میں کاروباری آدمی ہوں، لوگوں کو قرض بھی دیا کرتا تھا، لیکن جب میں اپنے کارندوں کو تقاضے کے لئے بھیج دیتا تھا، تو یہی حکم دیتا تھا کہ خوشحال لوگوں کو مہلت دے دینا، اور تنگدست و مقروض سے درگزر کرنا۔ شاید اللہ تعالیٰ مجھ سے درگزر فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ ہمارے اس بندے سے درگزر کر دو، اور اس کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرو۔ [مسلم]

البتہ! یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ جس طرح قرض خواہ کو رعایت کرنے کا حکم ہے، اسی طرح مقروض کو

بھی تاکید ہے کہ قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول نہ کرے، کیونکہ یہ بہت بڑا کبیرہ گناہ ہے کہ آدمی اس حال میں مرے کہ وہ مقروض ہو، اور پیچھے کچھ بھی نہ چھوڑا ہو، کہ جس سے قرض کی ادائیگی ہو سکے۔

سرورعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید کیا جائے، پھر زندہ کیا جائے، پھر شہید کیا جائے، اور اس کے ذمہ کسی کا دین ہو، تو وہ جب تک قرض ادا نہیں کرے گا، جنت میں نہ جاسکے گا۔[مشکوٰۃ]

اگر اللہ تعالیٰ اپنے سارے حقوق معاف فرمائے، یہی اس کی بے پناہ رحمتوں کا تقاضا اور شایان شان ہے، مگر کسی بندے کا اگر کسی بندے کے ذمہ ایک کھجور جتنا حق ہوگا، وہ اسے معاف نہیں فرمائے گا، جب تک بندہ خود معاف نہ کرے۔ قیامت کے روز کچھ لوگ پہاڑوں کے برابر نیکیاں میدانِ محشر میں لائیں گے، مگر حساب و کتاب کے بعد ان کے لئے کچھ نہیں بچے گا۔ یہ ساری نیکیاں حقداروں پر تقسیم ہو جائیں گی۔ اگر ان کے حقوق پورے نہیں ہوئے، تو ان کے گناہ اس شخص پر رکھ دئے جائیں گے۔ یہ کتنی بڑی بدبختی ہوگی کہ اپنا پورا سرمایہ دوسروں کے پاس گیا، اور ان کے سارے گناہ اس پر ڈال دئے گئے؟ اور وہ سیدھا جہنم جا پہنچا۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری امت کا اصلی بدبخت غریب یہی شخص ہے۔ ایک ایک روپیہ کے عوض کئی سو نمازیں، اور دس دس روپیہ کے عوض پورا حج قرض کے مالکوں کو دینا پڑا۔ نعوذ باللہ

﴿وَاتَّقُوا يَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِيۡهِ اِلَى اللّٰهِ﴾ تا ﴿وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ﴾ تم اس دن سے ڈرو جس دن تم سب اللہ تعالیٰ کے پاس لوٹائے جاؤ گے، پھر اس روز ہر شخص کو اس کے عمل و کردار کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور کسی کی حق تلفی اور کسی پر زیادتی نہیں ہوگی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نزول کے اعتبار سے یہ آخری آیت ہے۔ نزول کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا: یارسول اللہ! اس آیت کو سورۂ بقرہ کی دوسو اسی آیت کے بعد رکھئے، یعنی سورۂ بقرہ میں اس آیت کا نمبر دوسو اکیاسی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اس آیت کے نزول کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں صرف اکیس دن رہے۔ بعضوں نے کچھ اور طرح کہا ہے۔ سورۃ العلق سے جو وحی شروع ہوئی، اس آیت تہدید پر وحی الٰہی کا اختتام ہوا۔ واللہ اعلم

﴿وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا﴾ [الآیۃ] قرآن حکیم اپنے ماننے والوں پر اتنا شفیق و مہربان ہے کہ انہیں بار بار تقویٰ،

پرہیزگاری اور اللہ تعالیٰ سبحانہ سے ڈرنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔

بہ نزد من آنکس نکوخواہ تست ☆ کہ گوید فلاں خار درراہ تست

(سعدیؒ)

وہ ہمیں بار بار خطرات ومہلکات سے بچانے کی خاطر اس کی نشاندہی کرتا ہے، فرمایا: نیک بنو، عملِ صالح اختیار کرو، سود جیسی لعنت سے بچو، رحم دلی اور مہربانی اختیار کرو، ظلم وزیادتی سے بچو، اور یہ تب ممکن اور سہل ہوگا، جب تمہارے قلوب خوفِ خدا سے سرشار ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کی عظمت تمہارے قلوب میں موجزن ہوگی۔

یاد رکھو! تمہیں ایک روز اس کے حضور میں حاضر ہونا ہوگا، اور پوری زندگی کے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ اگر تمہارے پاس اعمالِ حسنہ ہوں گے، تو تمہاری پیشی سرخروئی کی ہوگی۔ ورنہ وہ پیشی ندامت اور شرمساری پر مبنی ہوگی۔ اگر تمہارے اعمال سیۂ اور قبیح ہوں گے، اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کروگے، اور دوست کبھی نافرمان نہیں ہوتا، تو وہاں سے محبوبانہ سلوک ہوگا۔

بنی اسرائیل کے ایک شخص نے اپنے کام پر ایک مزدور لگایا، اور مزدوری ایک صاع چاول مقرر ہوئی، شام کو مزدور ناراض ہوکر چلا گیا، پیچھے سے یہ متقی مسلمان پریشان ہوا، اور اسے خوفِ خداوند تعالیٰ دامن گیر ہوا، نہ مزدور کو جانتا ہے، نہ اس کے مکان کا پتہ ہے۔ موسم آیا اسی چاول کو مزدور کی نیت سے کاشت کیا، آمدن دس پندرہ بوری ہوئی، اسے اپنی زمین میں دوبارہ کاشت کیا، اس دفعہ سو بوری پیداوار ہوئی۔ اسے فروخت کرکے ایک قابلِ کاشت زمین خریدی، پھر پیداوار بکثرت ہوئی۔ ایک غلام خریدا، پھر کاشت کرکے پیداوار جمع کی، اور چند گائیں خریدیں۔ دیکھتا ہے کئی سالوں کے بعد وہ شخص آیا۔ کہنے لگا: فلاں سال میں نے تمہاری مزدوری کی تھی، میرا وہ چاول دے دو۔ کہنے لگے: یہ غلام، یہ گائیں، یہ مکان، یہ زمین سب تمہارے ہیں۔ یہ وصول کرو، اور مجھے معاف کرو۔ اس شخص نے کہا: آپ مجھ پر مذاق اور استہزا نہ کرو، مجھے میرے چاول دے دو۔ تب اس نے پورا واقعہ سنایا، اور وہ شخص بڑا خوش ہوا، اور مال سارا وصول کیا۔ [بخاري]

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ایسے لوگ ہوتے ہیں، پھر روزِ قیامت جنت اُن کا استقبال کرتی ہے۔ یہ واقعہ سودی کاروبار کرنے والوں کے منہ پر طمانچہ اور تھپڑ ہے۔ واللہ اعلم

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا تَدَايَنۡتُمۡ بِدَيۡنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكۡتُبُوۡهُ ؕ وَلۡيَكۡتُبْ بَّيۡنَكُمۡ
كَاتِبٌۢ بِالۡعَدۡلِ ۖ وَلَا يَاۡبَ كَاتِبٌ اَنۡ يَّكۡتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلۡيَكۡتُبۡ ۚ وَلۡيُمۡلِلِ الَّذِىۡ عَلَيۡهِ
الۡحَقُّ وَلۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبۡخَسۡ مِنۡهُ شَيۡـًٔا ؕ فَاِنۡ كَانَ الَّذِىۡ عَلَيۡهِ الۡحَقُّ سَفِيۡهًا اَوۡ ضَعِيۡفًا
اَوۡ لَا يَسۡتَطِيۡعُ اَنۡ يُّمِلَّ هُوَ فَلۡيُمۡلِلۡ وَلِيُّهٗ بِالۡعَدۡلِ ؕ وَاسۡتَشۡهِدُوۡا شَهِيۡدَيۡنِ مِنۡ رِّجَالِكُمۡ ۚ
فَاِنۡ لَّمۡ يَكُوۡنَا رَجُلَيۡنِ فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰٮهُمَا
فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰٮهُمَا الۡاُخۡرٰى ؕ وَلَا يَاۡبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوۡا ؕ وَلَا تَسۡـَٔمُوۡۤا اَنۡ تَكۡتُبُوۡهُ صَغِيۡرًا
اَوۡ كَبِيۡرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمۡ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ وَاَقۡوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدۡنٰۤى اَلَّا تَرۡتَابُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ
تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيۡرُوۡنَهَا بَيۡنَكُمۡ فَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَلَّا تَكۡتُبُوۡهَا ؕ وَاَشۡهِدُوۡۤا
اِذَا تَبَايَعۡتُمۡ ۖ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيۡدٌ ؕ وَاِنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاِنَّهٗ فُسُوۡقٌۢ بِكُمۡ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ
وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿٢٨٢﴾ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمۡ تَجِدُوۡا كَاتِبًا
فَرِهٰنٌ مَّقۡبُوۡضَةٌ ؕ فَاِنۡ اَمِنَ بَعۡضُكُمۡ بَعۡضًا فَلۡيُؤَدِّ الَّذِى اؤۡتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ
وَلَا تَكۡتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنۡ يَّكۡتُمۡهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلۡبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ ﴿٢٨٣﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم آپس میں ادھار کا معاملہ کرو، وقتِ مقررہ تک، تو اس کو لکھ لیا کرو، اور چاہئے کہ تمہارے درمیان لکھے کوئی لکھنے والا، انصاف کے ساتھ، اور نہ انکار کرے کوئی کاتب (لکھنے والا) اس بات سے کہ وہ لکھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سکھایا ہے، اور اس کو چاہئے کہ وہ لکھ دے، اور چاہئے کہ لکھوائے وہ شخص جس کے اوپر حق ہے، اور اس کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے، جو اس کا پروردگار ہے، اور اس میں سے کسی چیز کو کم نہ کرے، اور اگر وہ شخص جس کے اوپر حق ہے بے عقل ہے، یا کمزور ہے، یا لکھوانے کی طاقت نہیں رکھتا، پس چاہئے کہ لکھوادے اس کا سرپرست، انصاف کے ساتھ، اور گواہ بنالو دو گواہ، اپنے مردوں میں سے، پس اگر نہ ہوں مرد، تو ایک مرد اور دو عورتوں کو، ان میں سے جن کو تم گواہوں میں سے پسند کرتے ہو۔ اس وجہ سے کہ اگر ان دو عورتوں میں سے ایک بھول جائے، تو دوسری عورت اس کو یاد دلادے، اور گواہ انکار نہ کریں، جس وقت ان کو بلایا جائے، گواہی کے لئے، اور نہ دلگیر ہو اس بات سے کہ لکھو تم معاملے کو چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی مدت تک، یہ بات زیادہ انصاف والی ہے

اللہ تعالیٰ کے نزدیک، اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والی ہے، اور یہ زیادہ قریب ہے کہ تم شک نہ کرو، مگر یہ کہ دست بدست تجارت ہو، جس کو تم اپنے درمیان گردش دیتے ہو، اور تم پر گناہ نہیں ہے اس بات میں کہ اسے نہ لکھو، اور گواہ بنالو جس وقت تم سودا کرتے ہو، اور نہ نقصان پہنچایا جائے لکھنے والے کو، اور نہ گواہ کو، اگر تم ایسا کروگے تو یہ تمہارے اندر فسق اور نافرمانی والی بات ہوگی، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور اللہ تعالیٰ تم کو سکھاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۲۸۲﴾ اور اگر تم سفر میں ہو، اور کاتب (لکھنے والے) کو نہ پاؤ، پس رہن ہے قبضہ کیا ہوا۔ پس اگر تمہیں بعض کو بعض پر اعتبار ہو، پس چاہئے کہ وہ شخص ادا کردے اس چیز کو جس میں اس پر اعتبار کیا گیا ہے، اور جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ اپنی امانت کو ادا کردے، اور ڈرتا رہے اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے، اور مت چھپاؤ گواہی کو، اور جو شخص اس گواہی کو چھپانے کا، بیشک! اس کا دل گنہگار ہوگا، اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کام کرتے ہو اس کو خوب جانتا ہے ﴿۲۸۳﴾

معارف ومنازل

یہ آیت کریمہ قرآن حکیم کی سب سے بڑی آیت ہے، جو کہ سب سے بڑی سورت کا جزء ہے۔ یہ آیت کریمہ اجمالی طور پر پانچ اصولی دفعات پر مشتمل ہے:

(۱)﴿اِذَا تَدَایَنۡتُمۡ﴾ میں بیع وشرا وغیرہ کے متعلق دستاویز لکھنے کا مشورہ ہے، تاکہ ہر قسم کے نزاع کا دروازہ بند ہو۔ (۲)﴿وَلَا یَاۡبَ کَاتِبٌ﴾ یعنی لکھنے والے کو انکار نہ کرنے کا مشورہ ہے، اسی کے ساتھ عدل وانصاف سے کتابت کا حکم بھی ہے۔ (۳)﴿وَلۡیُمۡلِلِ الَّذِیۡ عَلَیۡهِ الۡحَقُّ﴾ سے دستاویز کا مقروض کی جانب سے ہونے کا مشورہ ہے۔ یہ استحبابی حکم ہے۔ ہمارے زمانے میں اکثر وبیشتر جانبین کی طرف سے دستاویز لکھی جاتی ہے۔ یہ بھی درست ہے۔ (۴)﴿وَاسۡتَشۡهِدُوۡا﴾ یہ بات نہایت اہم اور ضروری ہے، اگرچہ ہر معاملہ میں گواہ بنانا فرض نہیں، مگر اس کی افادیت سے انکار بھی نہیں ہے، اور یہاں استحباب ومشورہ کے تحت ہے۔ (۵)﴿وَلَا یَاۡبَ الشُّهَدَآءُ﴾ میں گواہی سے انکار نہ کرنے کا مشورہ ہے، اور "وَلَا تَسۡـَٔمُوۡۤا" جزاول کا تتمہ ہے، کہ لکھنے میں غفلت اور کاہلی مت کرو، اور "وَاَشۡهِدُوۡۤا" چوتھے جز کا تتمہ ہے۔ "وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ" دوسرے، اور پانچویں جز کا تتمہ ہے۔

ضابطۂ شہادت:

(۱)۔ م معاملات میں دومرد، یا ایک مرد اور دوعورتوں کا گواہ ہونا ضروری ہے۔ صرف ایک مرد، یا صرف دو

عورتوں کی گواہی معاملات میں کافی نہیں ہے۔ (۲) سارے گواہوں کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ غیر مسلم کی گواہی معتبر نہیں ہے۔ البتہ! غیر مسلم کے لئے غیر مسلم گواہ بن سکتا ہے، کوئی اور نہیں۔ (۳) اگر گواہوں میں کوئی مرد نہ ہو، صرف عورتیں ہوں، اگرچہ بکثرت ہوں، صرف عورتوں کی گواہی کافی نہیں ہے۔ (۴) حدود وقصاص، زنا وغیرہ میں مطلقاً عورت کی گواہی غیر مقبول ہے۔ (۵) گواہوں کا عاقل بالغ، عادل اور حر ہونا لازمی ہے، چنانچہ نابالغ اور مجنون اور فاسق وعبد کی گواہی مردود ہے۔ (۶) باپ بیٹے کی ایک دوسرے کے لئے، اسی طرح عبد کی گواہی مالک کے لئے قابلِ قبول نہیں ہے۔ دیگر تفصیلات کتبِ فقہ میں دیکھیں۔

یہ ہمارا زمانہ لکھنے لکھانے کا ہے، جس میں ہر چیز کی دستاویز، کیش میمو، رسید وغیرہ کا عام رواج ہے۔ مگر اسلام سے پہلے اس کا رواج نہ تھا، وہاں سارا کاروبار زبانی ہوتا تھا۔ سب سے پہلے دستاویز اور گواہوں کا سلسلہ قرآن حکیم ہی نے متعارف کرایا۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ﴾ یعنی جب تم آپس میں ادھار کا معاملہ کیا کرو، کسی معین مدت کے لئے، تو آئندہ نزاع ختم کرنے کی خاطر دستاویز لکھ لیا کرو۔ آئندہ اسی آیت کے اندر گواہ کا تذکرہ بھی ہے۔ یہ بات تب مکمل ہوگی جب اس کے ساتھ گواہ بھی ہو، کیونکہ دستاویز جعلی بھی ہوسکتی ہے، اور آئندہ کا فیصلہ بصورتِ نزاع گواہوں پر موقوف ہوگا، نہ کہ خالی دستاویز پر ﴿اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ کا ہونا صحتِ بیعِ سلم کے لئے شرط ہے۔ مطلق وقت مقرر کرنے سے بیع صحیح نہیں ہوگی۔

اس کے ساتھ ارشاد ہے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا پسندیدہ اور امانت دار ہونا چاہئے۔ وہ فریقین میں سے کسی کی طرفداری، یا بے انصافی کرنے والا نہ ہو، اور لکھنے والے کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے جو علم عطا کیا ہوا ہے، چاہئے کہ وہ اس نعمت کا شکر بجالائے، اور لکھنے پر آمادہ ہو، اور انکار کرنے سے پرہیز کرے۔ ہمارے زمانے میں لوگ باقاعدہ فیس واُجرت لے کر دستاویز لکھتے ہیں۔ فقہاء کرام نے اس اُجرت کو صحیح اور جائز قرار دے کر اجازت دی ہے۔ جب تعلیم قرآن پر اُجرت کا جواز ہے، تو دستاویز پر بطریقِ اولیٰ۔

﴿وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ﴾ یعنی جس کے ذمہ حق ہے، وہ املاء کرے، یعنی لکھوا دے، اور اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا رہے، اور کسی قسم کی خیانت، دھوکہ، فریب، کمی بیشی نہ کرے۔ اگر یہ شخص لکھوانے سے معذور ہو، یعنی قدرت نہ رکھتا ہو، مثلاً نابالغ ہو، زبان نہ جانتا ہو، خفیف العقل ہو، مریض ہو، وغیرہ، تو اس کا ولی، وارث،

سرپرست، وکیل وغیرہ کو چاہیے کہ نیابتاً یہ رسم لکھنے کا ادا کرے۔

☆اس کے بعد ارشاد ہے کہ صرف دستاویز پر اکتفاء نہ ہو، بلکہ باقاعدہ گواہوں کا انتظام بھی ہو۔دومرد مسلمان عاقل بالغ، عادل یا اسی طرح ایک مرد دوعورتیں انہی شرائط کے تحت مقرر کیے جائیں، اور نام، ولدیت، سکونت، وغیرہ سب معلوم کر کے لکھوائے، تاکہ بوقتِ حاجت کوئی پریشانی نہ ہو۔عورت چونکہ ناقص العقل والدین ہے، اعصاب اس کے کمزور ہیں، اس لئے دوعورتوں کا ایک مرد کے قائم مقام ہونا ضروری ہے۔اگر ایک سے نسیان صادر ہو، تو دوسری اسے یاد کرائے۔یہ اکثری حکم مطلق ہے، ورنہ بعض عورتیں مردوں سے بھی ذہین ہوتی ہیں، مگر شاذ و نادر۔اس کا اعتبار نہیں ہوتا۔

☆اس کے ساتھ فرمان ہے کہ گواہوں پر لازم ہے کہ گواہی پر بلانے کے ساتھ حاضر ہوں۔یہ گواہی ان کے ذمہ امانت ہے، اس کی ادائیگی سے منکر بھی نہ ہوں، اور گواہی میں کمی، بیشی، طرفداری اور ہر قسم کی خیانت سے بھی پرہیز کریں۔یہ لکھ پڑھ ایک بہت تسلی بخش عمل ہے، جس سے ہر قسم کا نزاع ختم ہوسکتا ہے، اس پر عامل وکار بندرہو، اگرچہ معمولی قسم کا لین دین ہو، تو چھوٹے بڑے معاملات کا فرق نہ کرو۔البتہ! اگر بیع وشراء تعاطی ہو، یا دست بدست ہو، کوئی قرض وادھار سلم نہ ہو، تو پھر لکھنے لکھوانے کی پابندی نہیں ہے، اور نہ لکھنے پر گناہ بھی نہیں۔علماء کرام نے کہا کہ گناہ کی نفی ہوگئی، مگر لکھنے کی نفی نہیں ہوئی، لہٰذا بڑے بڑے کاروبار اگرچہ نقد کے ساتھ دست دست ہوں، تو لکھنے میں حرج نہیں ہے، اور لکھنا فائدہ سے خالی بھی نہیں۔

☆پھر تاکیداً ارشاد ہے کہ بیع وشرا، اور دیگر معاملات میں گواہ ضرور مقرر کرو، اور گواہوں، نیز لکھنے والوں پر کسی قسم کی زیادتی نہ کرو۔انہیں ضرر پہنچانے سے پرہیز کرو۔پہلے کاتب وشاہد کو ہدایت تھی کہ وہ دستاویز لکھنے یا گواہی دینے سے انکار نہ کریں۔اس پر ممکن تھا کہ لوگ پھر بھی کبھی نہ کبھی ان کو پریشان کرنے لگیں۔دستاویز لکھنے یا گواہ بننے پر انہیں مجبور کرنے لگیں، یا اپنے مفاد کے لئے کوئی حربہ استعمال کریں، اس لئے قرآن کریم نے تنبیہ کردی، اس کو واضح کر کے فرمایا:

﴿وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ﴾ اس حکمِ قرآنی سے معلوم ہوا کہ کاتب اور گواہ کو تکلیف وایذاء دینا حرام ہے۔اگر لکھنے والے کی اُجرت روکی جائے، تو یہ بھی فسوق میں داخل ہے، اسی طرح گواہ کو آمدورفت کا خرچہ نہ دینا بھی فسوق میں شامل ہے۔

اسلامی نظامِ عدل سے جب دنیا اور نااہل مسلمان محروم ہوئے، اور خنزیر خوروں کے نظامِ ظلم وبربریت میں پھنس گئے، تو وہ اس زرین تاریخی عدل وانصاف سے محروم ہو گئے، جس میں حکمران، امراء، وزراء عام چرواہے کے ساتھ عدالت میں پیش ہوتے تھے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے لائے ہوئے نظام سے محرومی مسلمان قوم کے لئے سیاسی موت سے کم نہیں ہے، اور یہی موت تمام ممالکِ اسلامیہ کے لئے تباہی کا پیغام ہے۔

من از بیگانگان ہرگز ننالم ☆ کہ بامن ہرچہ کرد آن آشنا کرد

قیامت کے روز جب ربّ العزّت کی عدالت قائم ہوجائے گی، تب اسلامی نظامِ عدل وانصاف کے منحرفین کا ان شاء اللہ محاسبہ شروع ہوجائے گا، تو بے شمار مدّعیانِ اسلام کے چہرے سیاہ ہوں گے، جنہوں نے اسلامی نظام کا مذاق اڑایا تھا، اور اسے فرسودہ اور ناقابلِ عمل قرار دیا تھا، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَمَن لَّمۡ يَحۡكُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡكَٰفِرُونَ﴾ [المائدۃ: ۴۴] ﴿فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ﴾ [المائدۃ: ۴۵] ﴿فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡفَٰسِقُونَ﴾ [المائدۃ: ۴۷]

دنیا کے بڑے بڑے ممالک میں ان کے اپنے اپنے نظام اور قانونِ عدل وانصاف رائج ہے، کسی ملک پر کسی دوسرے ملک کا قانون مسلط نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ وہ ہر اعتبار سے آزاد اور خودمختار ہیں۔ البتہ! وہ بدقسمت ہم ہی ہیں، جو آزادی کی نعمت سے محروم ہیں۔ نصف صدی سے زائد عرصہ ہوا کہ ہم نے جغرافیائی آزادی تو حاصل کر لی، مگر سیاسی، معاشرتی، معاشی اور دیگر تمام شعبوں میں بدستور کاسہ لیس غلام ہیں۔ اپنا اسلامی قانون موجود ہے، مگر اس کی تنفیذ کی جرأت تو درکنار، نام لینے تک کی اجازت نہیں ہے۔ شاید! ظہورِ مہدی آخرزماں تک ہم برطانیہ اور اس کے ہمنوا یورپی ملکوں کے رحم وکرم پر رہیں گے، اور ان کی بولی اور کالے قانون پر فخر کریں گے۔ روزِ قیامت ہمارے اربابِ حل وعقد اپنے نبی برحق ہادی اعظم کو کیا منہ دکھائیں گے؟ ہوسکتا ہے کہ انہیں بعث بعد الموت اور قیامت پر یقین وایمان ہی نہ ہو، بقول کسے...... بابر بعیش کوش کہ دنیا دوبارہ نیست......

جب عقبیٰ کا عقیدہ ہی نہ ہو، تو اس کے لئے تیاری کیونکر ہو؟ تمام عالمِ اسلام صحیح اور حقیقی قیادت سے محروم ہے۔

شبے بگریستم پیش خدا زار ☆ مسلمانان چرا خوار اند و زار اند

ندا آمد نمیدانی کہ این قوم ☆ دلے دارند و دلدارے ندارند

﴿وَاِنۡ كُنۡتُمۡ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمۡ تَجِدُوۡا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقۡبُوۡضَةٌ﴾ رہن کے معنی ہیں: ''کسی چیز کو روک لینا''۔ شریعت میں اس چیز کا نام ہے جو کسی ایسے حق کے بدلے میں روکی جائے جس حق کا اس سے پورا وصول کرنا مقصود ہو۔ اس لئے فقہاء کرام نے کہا ہے کہ رہن ایک ایسا عقدِ لازم ہے، جس کا واپس لینا راہن کو مرتہن سے اس وقت تک جائز نہیں ہے، جب تک مرتہن کا ایک درہم بھی باقی ہو۔

راہن کا معنی ہے: ''رہن رکھنے والا''۔ مرتہن: ''رہن لینے والا''۔ مرہون: وہ مال جو مرتہن کے پاس رہن رکھا گیا ہو۔ رہن کے عقد میں بھی ایجاب وقبول ضروری ہے۔ اور عقد کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے، جب مرتہن شئے مرہون پر قبضہ کرلے۔ جب تک مرتہن کا مرہون پر قبضہ نہ ہو جائے، رہن کا عقد کامل نہ ہوگا۔

چونکہ عام طور پر سفر میں لکھنے پڑھنے، اور گواہوں کے ملنے میں دشواری ہوتی ہے، اس لئے رہن کے معاملہ کو سفر کے ساتھ مقید فرمایا۔ ورنہ یہاں حقیقی شرط مراد نہیں ہے، لہٰذا جس طرح سفر میں رہن جائز ہے، اسی طرح حضر میں بھی رہن کا معاملہ جائز ہے۔ اسی طرح کاتب اور گواہوں کی موجودگی میں بھی رہن جائز ہے، بلکہ یہ لکھ پڑھ دستاویز سے کئی اعتبار سے پختہ اور مؤکد ہے۔ مرتہن یہی سمجھتا ہے کہ میرے دَین کا عوض میرے پاس ہی ہے، جیسا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مرہون ذرہ کا واقعہ صحیحین ودیگر کتب حدیث میں مشہور ہے۔

مدینہ منورہ میں ابوالشحم نامی ایک مالدار یہودی تھا۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیس صاع جَو کے بدلے میں اپنی ذرہ اس کے پاس رہن رکھی تھی، اور اپنے اہل وعیال کے لئے اس سے تیس صاع جَو حاصل کئے تھے، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا، تو اس وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذرہ مرہون تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہودی کو تیس صاع جَو دے کر ذرہ وصول کی۔ رضی اللہ عنہ

فائدہ:

نبوت نہایت اونچا مقام ہے۔ اس کی حقیقت ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فقر اختیاری ہے۔ اگر ایک اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبوت کے عالی مقام پر فائز رہے، تو دوسرے اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امامتِ کبریٰ کے منصب پر بادشاہ وقت رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بیت المال کے ساتھ کیا واسطہ اور ضرورت؟ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ذرہ کو بیت المال کے پیسوں سے چھڑالیں، یا سرے سے کسی یہودی سے قرض ہی نہ لیں۔ نبوت کا منصب اتنا پاک اور اونچا ہوتا ہے کہ بادشاہت کے بعد بھی پرانا فقر بدستور قائم رہتا ہے۔ سابقہ حالت میں بعد از سلطنت تبدیلی نظر

نہیں آتی۔

آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے وہ وہ مراحل ہمارے سامنے ہیں، جن کے مطالعہ سے دل شق ہو جاتا ہے، مگر وہ سب کچھ آپ ﷺ نے بطیبِ خاطر برداشت کیا، اور حرفِ شکایت زبان مبارک پر نہیں لائے۔ مثلاً یہ واقعہ کہ ایک روز سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ﷺ کے پاس اوڑھنے کے لئے کپڑا نہیں ہے، فلاں تاجر یہودی کے پاس کپڑے موجود ہیں، اگر آپ ﷺ کسی کو اس کے پاس بھیج کر ادھار پر کپڑا لے لیں بہتر ہوگا، اور مدتِ مقررہ پر رقم ادا کر لیں۔ آپ ﷺ نے یہودی کے پاس پیغام بھیجا، اور ادھار پر کپڑا طلب فرمایا۔ یہودی نے ادھار پر دینے سے انکار کیا، اور نہیں دیا۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَلْبَابِ۔

﴿فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ مطلب یہ ہے کہ دستاویز اور رہن کا معاملہ صرف اطمینان اور تسلی کی خاطر ہے۔ یہ کوئی لازمی فرض نہیں ہے۔ ورنہ اگر ایک دوسرے پر بلا دستاویز، بغیر گواہ اور بغیر کسی رہن کے اعتبار کر لیں، تو پھر نہ دستاویز اور گواہ کی ضروت ہے، اور نہ کسی چیز کو گروی رکھنے کی ضرورت ہے۔ البتہ! ایسی صورت میں اس امر کا خیال رکھنا چاہئے کہ صاحبِ حق، جس نے مدیون پر اعتبار کیا ہے، اس کا حق ٹھیک اسی طرح ادا کیا جائے، جس طرح کسی امانت کو پابندی سے ادا کی جاتی ہے۔ یعنی دین کی ادائیگی امانت کی طرح لازمی ہونی چاہئے، اگرچہ دین اور امانت میں بہت بڑا فرق ہے، مگر التزامِ ادائیگی دونوں میں یکساں ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور حقوق کی ادائیگی کا تکرار کیا گیا۔ آگے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ﴾ [الآیۃ] ہاں! یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے، کہ اگر کسی صاحبِ حق کو معلوم نہ ہو کہ فلاں شخص کو میرا معاملہ معلوم ہے، تو وہ شخص جس کو معاملہ معلوم ہے، اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر میں شہادت نہ دوں گا، تو صاحبِ حق کا حق تلف ہو جائے گا، تو دیانت وتقویٰ اسی میں ہے کہ وہ خود جا کر صاحبِ حق کو بتادے کہ مجھے آپ کے حق کا علم ہے۔ اگر آپ چاہیں، تو مجھے شہادت کے لئے طلب کر سکتے ہیں، اس کہنے کے باوجود اگر صاحبِ حق اسے گواہی کے لئے طلب نہ کرے، تو یہ بری الذمہ ہوگا، اور اس پر واجب نہیں ہے کہ بغیر بلائے عدالت میں حاضری دے، اور گواہی درج کرنے کی پیشکش کرے۔

قرآن کریم نے صاف واضح فرمایا: ﴿وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا﴾ جب اس کو بلاوا نہیں ہوا تو جان خلاص ہوئی۔ اداء شہادت کا وجوب بلانے کے ساتھ عند المطالبہ مشروط ہے۔

یاد رہے کہ گواہوں کے اخراجات، کرایہ آمد و رفت سب صاحب حق کے ذمہ واجب ہیں، پس اس معاملہ میں صاحب حق اپنے عظیم تر مفاد کی خاطر گواہوں کے اخراجات پورے کرے۔

﴿وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ قلب کی حیثیت پورے جسم کے لئے بمنزلۂ حکمران کی ہے، کیونکہ قلب سلطان البدن ہے۔ بدن کے سارے اعضاء اس کے تابع ہیں، اور تمام حسنات وسیئات اسی کے حکم سے سرزد ہوتے ہیں۔ دراصل یہ تجلیاتِ رحمانی کا مرکز اور محور بھی ہے، اسی لئے اٰثِمٌ کی نسبت اسی کی طرف ہوئی۔

یہ مضغہ (گوشت کا لوتھڑا) صوفیاء کے نزدیک عرشِ الٰہی کا بدل ہے۔ حدیث پاک میں وارد ہے: اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ وَاِذَافَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ اَلَاوَهِيَ الْقَلْبُ [رواہ البخاری عن النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ]

جلوہ حسنت نہ گنجد در زمین و آسمان ☆ در حریم سینہ حیرانم کہ چون جا کردہ

(امیر خسروؒ)

حکایت:

صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص نے دوسرے آدمی سے زمین خریدی، اور فصل و زراعت کی خاطر اس پر ہل چلایا، تا کہ زمین ہموار اور قابلِ کاشت ہو، اسی دوران اس کا ہل ایک بڑے پتھر کے ساتھ پھنس گیا، جب اس نے پتھر کو دور کیا، تو اس کے نیچے سے سونے سے بھرا ہوا مٹکا برآمد ہوا، وہ یہ دیکھ کر بجائے خوش ہونے کے گھبرایا، اور کام بند کر کے مٹکے کو سونے سمیت چادر میں رکھ کر اس شخص کے گھر پہنچا۔ سلام علیک کے بعد کہا: بھائی لو، یہ تمہارا مال ہے، میں نے تم سے زمین خریدی ہے، نہ کہ سونا، لہٰذا میرے گلوخلاصی کر کے براہِ کرم اپنا سونا قبول کرو۔

وہ شخص بھی متقی، پرہیزگار تھا۔ کہنے لگا: بھائی میری آخرت کو خراب نہ کرو، یہ سونا تمہارا ہی ہے۔ جب میں نے تم پر زمین فروخت کی، تو جو کچھ زمین کے اندر تھا، زمین کے ساتھ وہ سارا تمہارا ہو گیا، اب کیا ہوا؟ پندرہ بیس کلو سونا سامنے رکھا ہوا ہے۔ یہ کہتا ہے تم لے لو۔ وہ کہتا ہے تم لو۔ کوئی جرأت نہیں کرتا کہ لے کر اپنے پاس رکھے۔

بالآخر فیصلہ ہوا کہ قاضی صاحب کے پاس پہنچے۔ قاضی صاحب بھی تو قاضی تھے۔ فریقین کے بیان سن کر اندازہ لگایا کہ اس کے قبول کرنے پر کوئی تیار نہیں ہے۔ اگر کسی کو دے دوں، تو اس کی دل آزاری ہو گی۔ قاضی نے

مشتری سے پوچھا: بتاؤ! تمہاری کوئی لڑکی ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں! پھر بائع سے پوچھا: کیا تمہارا کوئی لڑکا ہے؟ کہنے لگا: ہاں! قاضی نے کہا: الحمد للہ! فیصلہ آسان ہوا۔ جاؤ! ان دونوں کا نکاح کراؤ، اور یہ سونا ان میاں بیوی کو دے دو۔ دونوں خوش اور راضی ہوئے، اور ایسا ہی کیا۔ [رواه البخاري]

یہ تھے مسلمان، اور ان کا زرین عمل و کردار، اور یہ ہے نبوّت اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانے والے، اور اپنے پروردگار کے حکموں پر چلنے والے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ
بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؁۲۸۴

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ہی کا ملک ہے، جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اگر تم ظاہر کرو اس چیز کو جو تمہارے دلوں میں ہے، یا اسے چھپاؤ، تو اللہ تعالیٰ تم سے اس کا محاسبہ کرے گا۔ پس جس کو چاہے بخش دے گا، اور جس کو چاہے سزا دے گا، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ؁۲۸۴

معارف ومنازل

شروع سورت میں قرآن کریم کی حقانیت کا بیان ہوا، اور متقین کے اعتقادی و عملی اوصاف کا بھی ذکر ہوا۔ ابھی آخری رکوع میں ان ایمانیات کی تفصیل کا تذکرہ ہے، اور اللہ تعالیٰ سبحانہ کی خالقیت وحاکمیت کے بیان کے ساتھ دعا و اِنابت الی اللہ کا بیان ہے، کہ علمی، عملی اور اعتقادی کامیابی کا واحد راستہ اور بنیادی سبب انکساری، عجز ونیاز اور رجوع الی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ گویا شروع سورت سے لے کر یہاں تک جتنے اعمال و ایمانیات کا بیان تھا، یہ آخری رکوع ان سب پر حاوی ہے، اور تمام تفصیلات کا خلاصہ ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے: ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ [الآیۃ] جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں۔ اس تخصیص کی بنیادی وجوہات تین چیزیں ہیں، جو کہ صرف ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں:

(۱) پہلی وجہ خالقیت کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ مخلوق اور حادث ہے، اور ان سب کا خالق پیدا کرنے والا صرف

حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ ہے، بلاشرکت غیر، اور یہ بات تمام مذاہب کا متفق علیہ امر ہے۔

(۲) خصوصیت کی دوسری وجہ ملکیت ہے، کہ تمام کائنات کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور یہ بات بھی ایک حقیقتِ حقہ ہے، کہ سارے ادیان والوں نے برملا اعتراف کیا ہوا ہے کہ جس طرح کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے، اسی طرح سب کچھ کا مالک بھی وہی ہے۔

(۳) تیسری وجہ تصرّف ہے، کہ تمام کائنات اور اس میں رونما ہونے والے حوادث وحالات صرف اللہ تعالیٰ کے تصرف وحکم کے ساتھ مربوط ہیں۔

اس تیسری بات میں تمام اہل ادیانِ باطلہ مسلمانوں سے الگ ہوجاتے ہیں، مثلاً یہود ونصاریٰ مجوس، صائبین، ہندو، بدھ مت، سکھ مت، اور وہ نام نہاد مسلمان مشرک، پیر پرست اور قبر پرست، اور وہ روافض، جنہوں نے ائمہ اہلِ بیت کے متعلق برے برے عقائد گڑھ لئے ہیں۔

بعض مفسرین حضرات نے ﴿مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ﴾ سے مراد کتمانِ شہادت مراد لیا ہے، جو کہ گزشتہ آیات میں اس کی تاکید تھی کہ: ﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ [الآیۃ] اس معنی کے اعتبار سے یہ آیت محکمہ ہے، منسوخ نہیں ہے۔

بہت سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وتابعین وائمہ تفسیر کی رائے یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ منسوخ ہے، اس کے لئے ناسخ آنے والی آیت: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ ہے، جیسا کہ آئندہ اس کی وضاحت آنے والی ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اس کی تائید میں ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِیْ عَمَّا حَدَّثَتْ بِهٖ اَنْفُسُهَا مَالَمْ تَتَكَلَّمْ اَوْ تَعْمَلْ بِهٖ'' اَوْ كَمَا قَالَ۔ [متفق علیہ]

جمہور علماء کرام آیت کریمہ کو اس کے عموم پر رکھ کر کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری، تو اس کے ظاہری عموم سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سخت پریشان ہوئے، تب انہوں نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ! اب تک تو ہم یہی سمجھتے تھے کہ صرف افعالِ اختیاریہ پر محاسبہ اور مؤاخذہ ہوگا، اب اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ افعالِ قلبیہ غیر اختیاریہ پر بھی مؤاخذہ ہوگا، اور یہ افعالِ قلبیہ (خواطر وساوس) ہمارے اختیار سے باہر ہیں، جن سے بچنے پر ہماری نہ قدرت ہے، نہ دسترس، یہ ہمارے لئے بڑی مشکل ہے۔ اس پر سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازراہِ شفقت ومحبت آیت کے ظاہری مفہوم کے پیشِ نظر ان حضرات سے ارشاد فرمایا کہ تم اہل کتاب کی طرح ''سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا'' کہنے سے پرہیز

کرو، بلکہ تمہاری شان یہ ہونی چاہئے کہ: ''سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا'' کہتے جاؤ۔

چنانچہ انہوں نے یہی کہنا شروع کیا، اور سمع وطاعت کا پرزور اعلان کیا۔ اس پر آنے والی آیات کا نزول ہوا۔ یہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آیت کا مفہوم عام سمجھا، اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمومی معنی پر ان کی تائید کی۔ اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آیت کا صحیح مطلب ومقصد معلوم تھا کہ آیت کا اگرچہ ظاہری مفہوم عام ہے، مگر غیر اختیاری اعمال پر مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دلجوئی کی خاطر آیت کو ظاہری معنی پر حمل کیا، اور انہیں تسلی دے کر ارشاد فرمایا کہ تم اہل کتاب کی طرح مت بنو، اور اللہ تعالیٰ کے حضور التجاء، زاری ومنت کرو، تا کہ وہ اپنی شفقت کی بناء پر آسانی فرمائے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور آسانی کا پیغام آپہنچا، اور یہ حکم منسوخ ہو گیا کہ غیر اختیاری افعالِ قلوب پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی بھی مخلوق کو اس کی طاقت وگنجائش سے زائد چیزوں پر تکلیف نہیں دیتا، اور تکلیف مالایطاق عقلاً وشرعاً محال سمجھا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح ظاہری اعضاء، یعنی ہاتھ، پاؤں، کان، ناک، زبان وغیرہ کے افعال دو قسم کے ہوتے ہیں: اختیاری، غیر اختیاری۔ اسی طرح اعمالِ قلبیہ کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک اختیاری، اور ایک غیر اختیاری۔ مثلاً اپنے ارادے سے کسی کو مارنا، ایذاء دینا، گالی دینا، جھوٹ بولنا، شراب پینا، غیبت کرنا وغیرہ۔ یہ سارے افعالِ اختیاریہ ہیں۔ ان پر محاسبہ اور مؤاخذہ شرعاً وعقلاً اور عرفاً ثابت ہے۔

البتہ! بلا ارادہ اگر منہ سے کوئی بات نکلے، یا بغیر ارادہ کسی کو تکلیف دے دے، یا بغیر ارادہ کسی غلط حرکت کا صدور ہو جائے، یا کہنا کچھ چاہتا ہو بغیر ارادہ منہ سے کچھ اور نکل جائے۔ یہ غیر ارادی افعال ہیں، ان پر مؤاخذہ نہیں۔ یہی حالت انسانی قلوب کی بھی ہے، مثلاً ریا، حسد، بغض، کینہ، عداوت، کبر وغرور وغیرہ۔ یہ اعمالِ قلب کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ اسی میں کفر ونفاق اور بد عقائد، اور تکذیبِ حق بھی شامل ہے، اور چونکہ دل صدہا خطرات و وساوس کی گزرگاہ بھی ہے، اس لئے بہت سے فاسد خیالات اس میں بار بار آتے اور فوراً نکل بھی جاتے ہیں، اور کبھی تھوڑی دیر کے لئے جم بھی جاتے ہیں، اور آہستہ آہستہ قوی ہو کر پختہ عزم وارادہ بن جاتے ہیں۔

قلبِ انسانی کے یہ تمام اعمال، خواہ وہ خیالات ووساوس ہوں، یا وہ ریا، کبر اور نفاق وحسد وغیرہ ہوں، یا وہ کسی گناہ کے عزائم ہوں، یہ سب ''مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ'' میں داخل ہیں، اور ان سب پر محاسبہ کا اعلان ہے۔

البتہ! وہ خیالات ووساوس جو آئے، اور نکل گئے، اور دل ان پر جما نہیں، وہ قابلِ عفو ہیں، جیسا کہ آئندہ آیت میں اس کی وضاحت آنے والی ہے۔ وہ خیالات جو بار بار آتے جاتے رہتے ہیں، اور جو دل میں جگہ پکڑنے کے بعد عزم بن جاتے ہیں، ان کی پانچ قسمیں ہیں، اور یہ سب قصدواراد ے کے یکے بعد دیگرے مراتب ہیں، جن کے نام درجہ بدرجہ رکھے گئے ہیں:

قصد کا پہلا درجہ: ''ھاجس'' ہے، یعنی دل میں خیال آیا، اور چلا گیا۔

دوسرا درجہ: ''خاطر'' ہے، یعنی بار بار خیال آیا، اور چلا گیا۔

تیسرا درجہ: ''حدیث النفس'' ہے، یعنی خیال آیا، اور کچھ دیر تک رہا، پھر چلا گیا۔

چوتھا درجہ: ''ھم'' ہے، یعنی خیال آیا، اور جما ہونے نہ ہونے تک رہا، پھر ختم ہو گیا۔

پانچواں درجہ: ''عزم'' ہے، یعنی خیال آیا، اور جم گیا، اس پر عمل کا پختہ ارادہ بھی ہو۔

علماء کرام فرماتے ہیں کہ جس طرح وسوسہ پر مؤاخذہ نہیں، اسی طرح ان اول چاروں پر بھی مؤاخذہ نہیں، کیونکہ یہ غیر اختیاری ہیں۔ یہ بالاتفاق معاف ہیں۔

رہا عزم! اس میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک اس پر مؤاخذہ ہے، بعض کے نزدیک اس پر بھی مؤاخذہ نہیں، اور یہی راجح ہے۔ البتہ! اگر عزم پر عمل یا اقدام ہو، تو پھر یہ عزم سے اوپر کا درجہ ہے، اور اس پر مؤاخذہ ضروری ہوگا۔ واللہ اعلم

مَرَاتِبُ الْقَصْدِ خَمْسٌ هَاجِسٌ ذُكِرُوْا ★ فَخَاطِرٌ فَحَدِيْثُ النَّفْسِ فَاسْتَمِعَا

يَلِيْهِ هَمٌّ فَعَزْمٌ كُلُّهَا رُفِعَتْ ★ سِوَى الْأَخِيْرِ فَفِيْهِ الْأَخْذُ قَدْ وَقَعَا

تو واضح ہو کہ ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا﴾ کا مطلب یہ ہے کہ کبھی دل کی بات زبان اور ہاتھ پاؤں سے ظاہر ہو جاتی ہے، مثلاً دل میں کفر کا عزم کیا، پھر کفر کا اظہار بھی کر دیا، یا اور کسی گناہ کا دل میں عزم کرنے کے بعد اس کا اظہار کر دیا۔ یہ سب ﴿مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ﴾ کے ظاہر کرنے کے ہیں، اور قابلِ مؤاخذہ ہیں۔

﴿اَوْ تُخْفُوْهُ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ یہ باتیں دل ہی میں رہیں، اور ان کا ظہور نہیں ہوا، مگر ارادہ اپنی جگہ مضبوط رہا۔ صرف اظہار نہیں ہوا، تو یہ بھی اکثر کے نزدیک قابلِ مؤاخذہ ہے۔ ان تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) اعضاء ظاہری سے بعض اعمال کا صدور اختیاری ہے۔ بعض کا غیر اختیاری۔

(۲) افعالِ قلوب کی بھی دو قسمیں ہیں: اختیاری اور غیر اختیاری۔

(۳) افعالِ اختیاریہ پر محاسبہ و مؤاخذہ ہوگا۔

(۴) افعالِ غیر اختیاریہ، خواہ وہ جوارح سے صادر ہوں، یا قلب ان کی گزرگاہ ہو، وہ قابلِ عفو و درگزر ہیں۔

(۵) آیت کے ظاہری عموم سے یہ آیت بعض طبائع پر شاق ہوئی، جس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرا گئے، اور دربارِ معصوم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں باادب ہو کر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

(۶) سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی آیت کریمہ کو اس کے ظاہر پر حمل فرمایا۔

(۷) آیت کا ظاہر پر حمل فرمانا یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غایت شفقت اور بے انتہا محبت پر مبنی تھا، اور ایسا ہوتا ہی ہے، چنانچہ بعض دیگر مواقع پر بھی ایسا ہوا ہے: '﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ [التوبۃ: ۸۰] (ان کے لئے مغفرت مانگیں یا نہ مانگیں) میں یہی نکتہ کارفرما ہے، وہاں بھی شوقِ استغفار کرنے کا اظہار فرمایا۔

(۸) جن لوگوں کی طبعیت پر شاق گزرا تھا، ان کو تسلی دے کر سمع و طاعت کی تاکید فرمائی، جو کہ اس امت کے مسلمانوں کی ایک امتیازی شان ہے۔

(۹) آگے آیت میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کی تعریف ہے، اور ان کی وفاداری کو سراہا گیا ہے۔

(۱۰) آخری آیت میں اس آیت کی توضیح اور مضمون کی وضاحت فرما کر اس غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے، جس کے باعث عام طبائع گرانی محسوس کر رہے تھے۔

(۱۱) اس وضاحت کو بعض مفسرین نے نسخ قرار دیا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہی مروی ہے۔ اور یہی رائے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ہے۔ اور اس آخری آیت کو اس زیرِ بحث آیت کے لئے ناسخ قرار دی ہے (جیسے پہلے بیان ہوا)۔ اس کے برعکس بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں کوئی نسخ نہیں ہے، بلکہ جو معانی مخفی اور راز میں تھے، ان کو اس آخری آیت نے واضح کر دیا ہے۔ بہرحال! دونوں قسم کے اقوال صحیح ہیں۔ واللہ اعلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پہلے بیان ہوئی، جس میں بڑی بشارت تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کے لئے مژدہ سنایا تھا کہ ان کے غیر اختیاری خطرات و وساوس معاف ہیں، اور ان پر مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ ایک حدیث میں یہ بھی ارشاد ہے کہ لوگوں کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وساوس کو صریح ایمان[۱] علامت قرار دیا، کیونکہ جس طرح ایمان گناہوں سے روکتا رہتا ہے، اسی طرح وساوس پر راضی ہونے سے بھی روکتا ہے، کیونکہ وساوس پر پریشان

ہونا صحیح ایمان کی علامت ہے۔

فائدہ:

قرآن کریم نے مصائب وآلام، اور طرح طرح کی پریشانیوں کو انسانوں کے برے اور قبیح اعمال کا نتیجہ قرار دے کر فرمایا: ﴿وَمَآ أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَن كَثِيرٍ﴾ [الشوریٰ: ۳۰] (اور جو مصیبت تم پر واقع ہوتی ہے، سو تمہارے اپنے فعلوں سے، اور وہ بہت سے گناہ تو معاف ہی کر دیتا ہے)۔ تو ظاہر ہے کہ دنیوی مؤاخذہ بیماریوں، فقروفاقہ، تنگی معاش اور دیگر طریقوں سے ہر وقت ہوتا رہے گا، اور یہ مؤمن کے لئے باعث رحمت اور مکفر سیئات ہی رہیں گے۔ پس دنیوی مصائب بشکلِ مؤاخذہ کی نفی کی گئی ہے، وہ آخرت کے متعلق ہوگا۔ واللہ اعلم

خلاصہ:

اس آیت کے بارے میں مفسرین سلف سے مختلف اقوال منقول ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ آیت منسوخ ہے، اور آئندہ کی آیات اس کی ناسخ ہیں۔ بعض نے کہا کہ منسوخ نہیں ہے، کیونکہ اخبار میں نسخ نہیں ہوتا۔ نسخ احکام کے ساتھ مخصوص ہے، اور یہ حضرات یہی کہتے ہیں کہ یہ آیت محکم ہے، اور ﴿مَا فِيٓ أَنفُسِكُمْ﴾ اپنے ظاہری معنی پر ہے، کہ اس پر محاسبہ ہوگا۔ کچھ لوگوں نے یہ تاویل کی کہ آیت میں محاسبہ کا ذکر ہے، مؤاخذہ کا نہیں، اس لئے کہ محاسبہ مؤاخذہ سے جدا ومغایر ہوتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں محاسبہ سے مراد حسابِ یسیر ہے، مناقشہ مراد نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ بندوں سے فرمائے گا کہ جو تم اپنے دلوں میں پوشیدہ رکھتے تھے، میں آج تم سے اسی کا حساب لوں گا، اور جس کو چاہوں گا بخشوں گا، اور جس کو چاہوں گا، عذاب دوں گا۔ [مظہری]

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ
بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ
وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝

ترجمہ: ایمان لایا ہے رسول نے اس چیز پر جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر اتاری گئی ہے، اور مؤمن بھی ایمان لائے ہیں، سب ایمان لائے ہیں اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر، (اور وہ یہ کہتے ہیں) ہم نہیں تفریق کرتے کسی میں اس کے رسولوں میں سے، اور انہوں نے کہا کہ ہم نے سن لیا، اور ہم اطاعت کرتے ہیں، ہم تیری بخشش چاہتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! اور تیری طرف ہی لوٹ کر جانا ہے ﴿۲۸۵﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں محاسبہ کا تذکرہ تھا، کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، چاہے تم اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تعالیٰ تم سے حساب لے گا۔ نزولِ آیت پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سخت تشویش ہوئی، کہ اگر غیر اختیاری خیالات پر بھی ہماری گرفت ہوگئی، تو نجات بالکل مشکل ہو جائے گی۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دربارِ عالیہ میں مؤدبانہ عرض گزار ہوئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکیمانہ انداز میں ارشاد فرمایا کہ تم اہل کتاب کی طرح یہ نہ کہو: ''سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا'' بلکہ یوں کہو: ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ''۔ اور اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرو۔ چنانچہ انہوں نے جذبہ ومحبت سے یہی کہا، اس پر یہ آیت اتری۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان اور جذبات کو سراہا، اور ان کی مدح فرمائی۔ اس کے ساتھ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی ذکر مبارک جلوہ افروز رہا۔

حکیم الامۃ حضرت قطب شاہ محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر بابرکت کر کے یہ بات واضح فرمائی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح ایماندار تھے، اور ان کا ایمان حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایمان کے ساتھ ملا ہوا ہے، اگرچہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایمان اکمل درجے کا ہوتا ہے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان کامل درجے کا، مگر دونوں طرح کے ایمانوں کو باہم ملانے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درجات کی بلندی کی نشاندہی ہوتی ہے۔

سورۃ بقرۃ کی آخری دو آیتوں کے فضائل:

یہ سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں ہیں۔ احادیث صحیحہ معتبرہ میں ان دو آیتوں کے بڑے بڑے فضائل مذکور ہیں۔ صحیح مسلم اور نسائی میں حدیث ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام بیٹھے

ہوئے تھے، کہ اوپر سے ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی۔ جبرئیل علیہ السلام نے اوپر دیکھ کر فرمایا: آج آسمان کا وہ دروازہ کھلا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں کھلا تھا، پھر وہاں سے ایک فرشتہ رحمت عالم ﷺ کے پاس آتا ہے، اور کہتا ہے کہ آپ خوش ہو جایئے۔ دو نور آپ کو ایسے دیئے گئے ہیں کہ آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے۔ سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کی آخری دو آیات، ایک ایک حرف ان میں سے نور ہے۔[مسلم، نسائی] سرور عالم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے رات کو یہ دو آیتیں پڑھ لیں، تو یہ اس کے لئے کافی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ سید کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دو آیتیں جنت کے خزائن میں سے نازل فرمائی ہیں، جس کو تمام مخلوقات کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے خود رحمن جل شانہٗ نے اپنے ہاتھ سے لکھ لیا تھا، جو شخص ان کو عشاء کی نماز کے بعد پڑھ لے، تو وہ اس کے لئے قیام اللیل، یعنی تہجد کے قائم مقام ہو جاتی ہیں۔ اور مستدرک حاکم اور بیہقی کی روایت میں ہے کہ سید الانبیاء ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرۃ کو ان دو آیتوں پر ختم فرمایا ہے، جو مجھے اس خزانۂ خاص سے عطا فرمائی ہیں، جو کہ عرش کے نیچے ہے، اس لئے تم خاص طور پر ان آیتوں کو سیکھو، اور اپنی عورتوں اور بچوں کو سکھاؤ۔ اسی لئے حضرت فاروق اعظم اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ہمارا خیال یہ ہے کہ کوئی آدمی جس کو کچھ بھی عقل ہو، وہ سورۃ بقرہ کی ان دونوں آیتوں کو پڑھے بغیر نہیں سوئے گا۔

تفصیل:

اب ماقبل کے اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ان دو آیتوں، یعنی زیر بحث آیت، اور آنے والی آخری آیت، ان دو آیتوں کی معنوی خصوصیات تو بہت زیادہ ہیں، لیکن ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سورۃ بقرہ میں اکثر احکامِ شرعیہ اجمالاً و تفصیلاً ذکر کر دیئے گئے ہیں، یعنی اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت وغیرہ۔ آخری دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں اطاعت شعار مؤمنین کی مدح کی گئی ہے، جنہوں نے اللہ تعالیٰ جل شانہ کے تمام احکام پر لبیک کہا، اور تعمیلِ احکام کے لئے تیار ہو گئے۔

دوسری آیت میں ایک شبہ کا جواب دیا گیا، جو ان دو آیتوں سے پہلی آیت میں صحابہ کرام کو پیدا ہو گیا تھا اور ساتھ ہی اپنے بے حساب فضل و رحمت کا ذکر فرمایا تھا، جس کی تفصیل عنقریب گزر چکی کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سید کائنات ﷺ کے حکم کے مطابق معافی مانگی، اور سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہتے رہے۔ اگرچہ ابھی بھی انہیں وہ پریشانی

بدستور لاحق رہی، کہ بے اختیار دل میں آنے والے خیالات اور وساوس سے بچنا تو دشوار ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ بقرۃ کی آخری دو آیتیں نازل فرمائیں، جن میں سے پہلی آیت میں مسلمانوں کی مدح، اور دوسری میں اس آیت کی اصلی حقیقی تفسیر بتلائی گئی، جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اشتباہ پیش آیا تھا۔

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ یعنی (ایمان رکھتے ہیں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس چیز پر جو ان کے پاس نازل ہوئی، ان کے ربّ کی طرف سے، اور مؤمن بھی ایمان رکھتے ہیں)۔ اس میں سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح ہوئی، اور بجائے آپ کے نام مبارک ذکر کرنے کے لفظ ''رسول'' فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم و تشریف کو واضح فرمایا۔

اس کے بعد فرمایا: ﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ یعنی جس طرح سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی وحی پر ایمان و اعتقاد ہے، اسی طرح عامِ مؤمنین کا بھی اعتقاد و ایمان ہے۔ جو طرزِ بیان اس جملہ میں اختیار فرمایا کہ پہلے پورا جملہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایمان اور یقین کے ذکر میں لایا گیا، اس کے بعد مؤمنین کے ایمان کا علیحدہ ذکر کیا گیا، اس میں اشارہ ہے کہ اگرچہ نفس ایمان میں سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سب مسلمان شریک ہیں، لیکن درجات اور صفاتِ ایمان کے اعتبار سے ان دونوں میں فرق ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایمان مشاہدہ اور سماع کی بناء پر ہے، اور دوسرے مسلمانوں کا علم ایمان بالغیب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رؤیت کی بناء پر ہے۔

اس کے بعد اس ایمانِ مجمل کی تفصیل بتلائی، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عام مؤمنین میں مشترک تھا، کہ وہ ہے اللہ تعالیٰ کے موجود اور ایک (اکیلا) ہونے پر، اور تمام صفاتِ کاملہ کے ساتھ متصف ہونے پر، اور فرشتوں کے موجود ہونے پر، اور اللہ تعالیٰ کی کتابوں، اور سب رسولوں کے برحق اور سچے ہونے پر ایمان لانا۔

اس کے بعد اس امت کی امتیازی شان بیان فرمائی کہ اس امت کے مؤمنین پچھلی امتوں کی طرح ایسا نہیں کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں باہمی تفرقہ ڈالیں، کہ بعض کو برحق نبی تسلیم کریں، اور بعض کا انکار کریں، جیسے یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، اور نصاریٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبی نہیں مانا، اور دونوں گمراہوں نے خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت کا بھی انکار کیا۔

یہ امت خیر الامم و افضل الامم کے لقب سے موصوف ہے، اس کی خیریت و عدالت سب پر واضح و عیاں ہے، کہ انہوں نے کسی ایک نبی کا انکار نہیں کیا، اور سارے انبیاء علیہم السلام کی تعظیم و توقیر و احترام اس امت کا خصوصی طرۂ امتیاز

رہا ہے، اور ان شاء اللہ قیامت تک رہے گا۔ تفصیل سورۃ آل عمران میں آنے والی ہے۔ ان شاء اللہ تعالی

﴿كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ سب کے سب مسلمان (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) اللہ تعالی پر ایمان لائے۔

بنیادی طور پر ایمان کے سات ارکان ہیں، جو یہاں آیت کریمہ میں بیان ہوئے۔ اجمالی طور پر وہ یہ ہیں:

(۱) ایمان باللہ تعالی و بصفاتہ۔ چونکہ تقدیر کا شمار اللہ تعالی کی صفات میں سے ہے، تو ایمان باللہ میں ایمان بالتقدیر بھی آ گیا۔ (۳) ایمان بالملئکۃ (۴) ایمان بالکتب (۵) ایمان بالرسل۔

﴿وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ میں باقی دو، یعنی قیامت و معاد اور حیات بعد الموت بھی آ گئے۔ ان امور سبعہ پر ایمان لانا، یعنی دل سے تصدیق کرنا ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک کا انکار ہو، تو ایمان کا اثبات نہ ہوگا۔

ایمانیات و اصول ایمان کی تفصیل:

سب سے پہلے ایمان باللہ کا درجہ ہے، یعنی اللہ تعالی کے وجود کی تصدیق کرنا مع الاقرار۔ یہ سب سے بنیادی چیز ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ موجود ہے، بلکہ وہ واجب الوجود ہے، یعنی اس کا وجود خود بخود ہے، اس میں کسی مخلوق کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، اور نہ کسی دوسرے کا بنایا ہوا ہے۔ اللہ تعالی کے علاوہ سارا عالم، تمام موجودات کا وجود بالغیر اور عارضی ہے، یعنی سارے موجودات کو اللہ تعالی نے پیدا کیا، اور وجود عطا کیا ہوا ہے۔

مخلوق کے معنی بھی یہی ہیں کہ اللہ تعالی نے انھیں پیدا فرمایا، تو اللہ تعالی خالق ہوئے، اور سارے موجودات مخلوق قرار پائے۔ کلمہ "اللہ" حضرت حق سبحانہ کا ذاتی نام ہے، اور اس کا مطلب ہے: "اَلْمُسْتَجْمِعُ لِجَمِيْعِ صِفَاتِ الْكَمَالِ الْمُنَزَّهِ عَنِ الشَّرِيْكِ وَالنُّقْصَانِ وَالزَّوَالِ"۔ واجب الوجود وہ ذات پاک ہے، جس میں تمام صفات، کمال کی حد تک پائی جاتی ہوں، اور اس ذات میں نہ کوئی عیب و کمی ہے، نہ کوئی نقصان، اور نہ اس جیسا کوئی ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے، اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ علی الدوام قائم و دائم رہے گا۔ اس پر کبھی زوال نہیں آئے گا۔ جس طرح اس کی ذات دائمی ازلی ابدی ہے، یہی حقیقت اس کی صفات کی بھی ہے۔ اس کی صفات جمالی (مثبت) اور جلالی (سلبی) یعنی بقول مفسرین و اصحاب تحقیق اس کی ایجابی اور سلبی صفات چار ہزار سے زائد ہیں، یہ سب ازلی بھی ہیں اور ابدی بھی۔

جب بندہ اس کے ذاتی نام کا تصور کرتا ہے، یا وہ زبان سے "اللہ" کہتا ہے، تو اس میں ساری صفات خود بخود آ جاتی ہیں۔ اگر کسی نے صرف "یا اللہ" کہا، تو سمجھو کہ اس نے ذات اقدس کو جمیع صفات کے ساتھ پکارا۔

قرآن حکیم میں اسم ذات دو ہزار چھ سو اٹھانوے مرتبہ مذکور ہے۔ اگر کسی کو حق تعالیٰ توفیق دے، تو روزانہ چار ہزار مرتبہ اسم ذات کاوِرد جاری رکھے، اس پر انوار و برکات کا نزول ہوتا رہے گا، اور قلب روشن و منور ہوگا۔ ہوسکتا ہے اس کی روح کو خود اللہ تعالیٰ ہی قبض فرمائے۔ زہے سعادت! ہمارے مشائخ میں حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں اور حضرت شیخ غلام علی قدس اللہ سرہما کا روزانہ اسم ذات کو ایک لاکھ مرتبہ پڑھنے کا معمول رہا ہے، مگر توفیق و مراقبہ یکسوئی شرط ہے۔

فارسی زبان میں اسم ذات کا ترجمہ جو ''خدا'' ہے، تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ وہ ہستی خود بخود ہے، یعنی واجب الوجود، جو کسی بھی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ یہ جامع لفظ ہے، اور ان تمام معانی پر مشتمل ہے۔ اسی طرح دوسری زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ موجود ہے۔

اگر غور کیا جائے، تو اسمائے حسنیٰ کا رنگ کائنات کی ہر چیز میں نمایاں ہے۔ دنیا میں کوئی چیز کوئی مخلوق، کوئی ایسی گفتگو اور بات نہیں، جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت کا رنگ جلوہ گر نہ ہو۔ یہ شرطیہ بات پکی ہے، اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ واللہ اعلم۔ (صفات باری تعالیٰ پر مختصر کلام سورۃ آل عمران میں ان شاء اللہ آنے والا ہے)۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح اس کی تمام صفات پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ البتہ! یہ بندوں کے لیے سعادت ہے کہ ان تمام صفات پر اجمالی ایمان کافی ہے۔ تفصیلی ایمان لازمی نہیں ہے، کیونکہ تمام صفات تک فرداً فرداً رسائی ممکن نہیں ہے، کیونکہ تفصیلی ایمان کے لیے مؤمن پہ کی تمام تفصیلات کا علم ضروری ہے، اور یہ بہت مشکل ہے۔

پس ایمان کے ساتوں بنیادی اصولوں پر خواص و عوام سب کے لیے اجمالی ایمان کافی ہے، اور تفصیلات کا احاطہ کسی کے بس میں نہیں۔

دراصل ایمان بالغیب قریب قریب اسی ایمان اجمالی کا نام ہے، کیونکہ غیب کے معنی ہیں: ''کسی چیز کا حواسِ ظاہرہ و باطنہ سے مخفی اور وراء الوریٰ ہونا''، جہاں تک سوائے وحی کے کسی دوسرے ذریعہ سے پہنچنا ممکن نہ ہو۔ پس اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کا جاننا، اور ان پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔ لاکھوں مسلمانوں کو تمام صفات کیا، ننانوے اسمائے حسنیٰ تک بھی رسائی حاصل نہیں۔ یہی حال فرشتوں اور آسمانی صحیفوں اور ان میں لکھے ہوئے احکام کا

بھی ہے۔ اور انبیاء ورُسل علیہم السلام پر بھی اجمالی ایمان کافی ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس دیگر مغیبات کا بھی یہی حال ہے۔

﴿وَمَلٰٓئِكَتِهٖ﴾ ایمان کا دوسرا رکن فرشتوں پر ایمان لانا ہے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی وہ پاکیزہ مخلوق ہیں جو نُور سے پیدا ہوئے ہیں۔ نفسانی خواہشات: اُکل وشرب، ذکورت وانوثت، موت وحیات، ظلم وزیادتی، نافرمانی وبے راہ روی، اور ہر قسم کے شر وفساد سے پاک ہیں۔ کائنات کی تدبیر وامور پر مختلف حیثیتوں پر مامور ہیں۔ پورے جہاں میں پھیلے ہوئے ہیں، گویا ایک لامتناہی طاقتور ایزدی فوج ہے۔ ساری کائنات پر اللہ تعالیٰ نے انہیں مقرر کیا ہوا ہے۔ ان کے متعلق سورۃ البقرۃ کے چوتھے رکوع میں مکمل تفصیلی حقائق معلوم ہوئے، وہاں دیکھا جائے۔

﴿وَكُتُبِهٖ﴾ آسمانی صحیفے اور تمام انبیاء علیہم السلام پر نازل شدہ کتب پر ایمان لانا، اور انہیں برحق تسلیم کرنا ایمان کا تیسرا رکن ہے۔ سورۃ البقرہ کے پہلے رکوع میں اس پر مفصل کلام گزر چکا ہے۔

﴿وَرُسُلِهٖ﴾ ایمان کا چوتھا رکن یہ ہے کہ سارے انبیاء ورُسل علیہم السلام پر ایمان لانا، اور بغیر تفریق سب کو برحق سمجھنا ضروری ہے۔ نبی ورسول میں فرق، اسی طرح ان کی تعداد، اور مقصدِ بعثت پر بار بار کلام ہوا ہے، وہاں دیکھا جائے۔ اور یہ بھی واضح ہوا کہ تفریق بین الرُّسل کفر ہے، جس طرح آسمانی کتابوں کی ایک آیت کا انکار کفر ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام میں سے کسی ایک نبی کا انکار بھی کفر ہے۔

﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ﴾ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تسلیم وانقیاد اور عجز ونیاز، دعاء ومناجات، طلبِ مغفرت اور اطاعت وبندگی کے التزام پر ان کی مدح وتعریف ہے۔

﴿وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾ میں ایمان کے رکن معاد وقیامت اور بعث بعد الموت کا اقرار بھی ہے، انہی ارکانِ اسلام پر شروع سورت میں مفصل کلام گزر چکا ہے، اور تمام امورِ ایمان کا تفصیلی بیان آچکا ہے۔

...... ❁ ...... ❁ ...... ❁ ......

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ
رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا
حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ
عَنَّا ٚ وَاغْفِرْ لَنَا ٚ وَارْحَمْنَا ٚ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا، مگر اس کی طاقت کے مطابق، اس نفس کے لئے وہی ہے، جو اس نے کمایا، اور اس کے اوپر وبال بھی اس چیز کا ہے جو اس نے کمایا، اے ہمارے ربّ! ہم سے مؤاخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر جائیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہم پر ایسا بوجھ نہ رکھ جیسا تو نے ان لوگوں پر رکھا جو ہم سے پہلے گزرے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! اور نہ اٹھوا ہم سے وہ چیز جس کی ہم طاقت نہیں رکھتے، اور درگزر کر دے ہم سے، اور بخش دے ہم کو، اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہی ہمارا آقا ہے، پس کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما ﴿۲۸۶﴾

معارف ومنازل

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ غیر اختیاری افعال پر مؤاخذہ نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لئے ایک عام قانون نافذ فرمایا کہ:

﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ اللہ تعالیٰ کسی کو مکلّف نہیں کرتا، یعنی کسی شرعی تکلیف میں نہیں ڈالتا، مگر اس کی قدرت وطاقت کے موافق۔ یہی وجہ ہے کہ نابالغ بچوں اور مجنون پر احکامِ شرعیہ کا التزام نہیں ہے، اور وہ مرفوع القلم شمار ہوتے ہیں۔ جب یہ بات مسلّم ہے کہ ربّ العزّت رحمن، رحیم اور کریم ہے، اور اس کی رحمت اس کے غضب وگرفت سے کئی درجہ مقدّم اور سبقت کرنے والی ہے۔ وہ اگر کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ طاعت کا التزام کرے، وہ خالق ومالک فاعلِ مختار ہے، اس سے پوچھنے والا کوئی نہیں، مگر اس کا کرم اور اس کی شفقت ہرگز نہیں چاہتی کہ اپنے بندوں کو تکلیف مالا یطاق کی مشکلات سے دوچار کردے۔

نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد جیسے اہم اعمال میں بھی اگر دیکھا جائے تو سوائے سہولتوں اور شفقتوں کے اور کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ کہیں دیکھو تو بیماریوں اور کمزوریوں پر برابر سہولتیں ہیں، کہیں بخششوں کا دور دورہ ہے۔

ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ [الحج:۷۸] (اور تم پر دین کی (کسی بات) میں تنگی نہیں کی)۔ کہیں ارشاد ہوتا ہے: ﴿یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ﴾ [البقرة:۱۸۵] (خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے، اور سختی نہیں چاہتا)۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "عَلَیْکُمْ مِنَ الْاَعْمَالِ بِمَا تُطِیْقُوْنَ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَمِلُّ حَتّٰی تَمَلُّوْا"۔ [بخاري] اسی طرح فرمایا: "اَلدِّیْنُ یُسْرٌ"۔ پھر فرمایا: "یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا، بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا"۔ [بخاري] فرمایا: اگر کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکو، تو بیٹھ کر پڑھو۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو،

تو لیٹ کر پہلو کے بل پڑھ لو۔ رمضان کے روزوں کے متعلق ارشاد خداوندی ہے: ﴿فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَّرِيۡضًا اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ [البقرۃ:۱۸۵] (پس تم میں سے جو بیمار ہو، یا سفر میں ہو، تو گنتی ہوگی اور دنوں سے)۔

یہ تمام تیسیرات اور دیگر بے شمار سہولتیں یہی غمازی کرتی ہیں کہ دین وشریعت میں کسی قسم کی سختی نہیں ہے۔ قدم قدم پر سہولتوں کا راج ہے۔ یہ سب اسی ہمہ گیر قانون: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا﴾ کے فیوض و برکات ہیں۔ چونکہ قلبی اور ظاہری وہ امور جو کہ غیر اختیاری ہیں، اور ان سے بچنا ہمارے اختیار وطاقت سے بالاتر ہے، تو اپنے فضل وکرم سے یہ سارے غیر اختیاری چیزوں پر قلم عفو وبخشش پھیر کر بے انتہا آسانی فرمائی۔

﴿لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَعَلَيۡهَا مَا اكۡتَسَبَتۡ﴾ ہر نفسِ انسانی کے لئے ہے جو اس نے کمایا، اور اپنے ارادہ سے جو غلط کمایا، اسی کا وبال بھی اسی پر ہوگا، جیسے: ﴿فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ۞ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ جیسا کسی کا عمل ہوگا، ویسا پھل ہوگا۔

کسب اور اکتساب میں یہ فرق ہے کہ کسب کے معنی ہیں: صرف کمانا۔ اور اکتساب کے معنی ہیں: اپنے لئے کوئی کام کرنا۔ شر وگناہ کی طرف نفسِ انسانی کو اکثر رغبت ہوتی ہے، اس لئے تحصیل شر کے لئے زیادہ کوشش کرتا ہے، اور خیر کی حالت اس کے خلاف ہے، تو نفس کی کوشش چنداں نہیں ہوتی، اس لئے خیر کے لئے لفظ کَسَبَتۡ اور شر کے لئے مَا اكۡتَسَبَتۡ استعمال فرمایا۔

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَاۤ اِنۡ نَّسِيۡنَاۤ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا﴾ اے ہمارے پروردگار! اگر ہم بھول جائیں، یا ہم سے خطا سرزد ہو جائے، تو ہمیں معاف فرما، اور مؤاخذہ نہ فرما۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ رَفَعَ عَنۡ اُمَّتِي الۡخَطَاَ وَالنِّسۡيَانَ وَمَا اسۡتُكۡرِهُوۡا عَلَيۡهِ۔ [روح المعانی] اللہ تعالیٰ نے میری امت سے ایسے گناہ کو اٹھا دیا ہے، جو بھول، یا خطا، یا جبر کی وجہ سے سرزد ہو۔

البتہ! یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بھول وخطا، اور جبر کا مؤاخذہ جو نہیں ہوگا، یہ آخرت کے بارے میں ہے۔ دنیاوی معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً نماز میں بھول کر، یا خطأ بات کر دی، تو نماز باطل ہو جاتی ہے۔ جبر کے ساتھ احناف کے نزدیک طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے۔ قتل خطا میں دیت بھی واجب، اور دو ماہ کا روزہ بھی واجب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح خطأ کھانے سے روزہ ضائع ہو جاتا ہے، اور نسیان کے ساتھ حدیث کی وجہ سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

وغیرہ۔ تو صرف مؤاخذہ اخروی نہیں ہوتا۔ یہی حدیث کا مطلب ہے، کیونکہ خطا و نسیان اور جبر و اکراہ دائرہ اختیار سے باہر ہیں۔

﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ اے ہمارے پروردگار! نہ رکھ ہمارے اوپر بھاری بوجھ، جیسا کہ تو نے ہم سے پہلے لوگوں (یہودیوں) پر رکھا تھا۔ یہودیوں پر پچاس نمازیں فرض تھیں۔ زکوٰۃ میں چوتھائی مال دینے کا حکم تھا۔ چالیس روزوں کا حکم تھا۔ کپڑوں پر نجاست لگ جاتی تو پانی سے صاف کرنے کے بجائے کپڑے کے اس حصے کو کاٹنا فرض تھا۔ اگر وہ کوئی گناہ کرتے تو صبح دیواروں پر لکھا ہوا ہوتا تھا۔ زبانی توبہ کی بجائے ایک دوسرے کو قتل کرنے کا حکم تھا۔ مسجد کے بغیر ان کی نماز نہیں ہوتی تھی۔ تیمم پر اجر و ثواب کی سہولت سے محروم تھے۔ مال غنیمت ان پر حرام تھا۔ اور بہت سے اعمال و احکامِ شاقہ میں مقید رہتے تھے۔

علماء کرام نے فرمایا کہ ان اعمال و احکامِ شاقہ کی اصلی وجہ ان کی مسلسل نافرمانی تھی، جن کی تفصیل سورۃ بقرۃ آیت ۴۰ سے آیت ۱۲۳ تک مکمل گزر چکی ہے۔

اس نافرمان قوم نے اخلاص و صدق دل سے نہ انبیاء علیہم السلام کا احترام کیا، اور نہ ہی شرعی احکام کو بخوشی قبول کیا۔ روز روز بہانے اور طعن و تشنیع کے سوا کچھ بھی نہیں کیا کرتے، تب اللہ تعالیٰ نے سخت سے سخت عذابوں میں انہیں آزمایا اور خوار کیا۔

ان کی شکل و صورت مسخ ہوگئی۔ بندر اور سوروں کی شکل و صورت میں تباہ کردیئے گئے۔ زندہ زمین میں دھنسائے گئے۔ جناب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حد سے زیادہ ستایا۔ گوسالہ پرستی جیسے شرک میں ارادۃً و قصداً مبتلا ہوگئے۔ تفصیلات گزر چکیں۔

﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ اے ہمارے پروردگار!! ہم پر نہ رکھ ایسا بارِ گراں جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو۔ ناقابلِ برداشت بارِ گراں سے مراد مصائب اور آلام، عذاب یا سخت احکام ہیں۔ سبحان اللہ! کتنی کرم نوازی ہے؟ ایک طرف سے خود اعلان فرمارہے ہیں: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ دوسری طرف سے القاء فرمارہے ہیں کہ تم بھی اللہ تعالیٰ سے عبادات و احکام میں سہولت و آسانی کی درخواست کیا کرو۔

﴿وَاعْفُ عَنَّا﴾ ہم سے درگزر فرما۔ ہمارے ساتھ عفو و کرم کا معاملہ فرما۔

﴿وَاغْفِرْ لَنَا﴾ ہماری مغفرت کا فیصلہ فرما۔ ہمارے گناہوں کو مٹادے۔ ہمارے گناہوں پر پردہ ڈال

دے۔ کیوں نہیں؟ یہ تو تیری کرم نوازی اور بندہ پروری ہے کہ تو نے ارشاد فرمایا، اور بے پناہ مغفرتوں کا اعلان کیا ﴿قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا﴾ (اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہونا)۔ [الزمر: ۵۳]

مغفرت داریم امید از لطفِ تو ☆ زانکہ خود فرمودہ لَا تَقْنَطُوْا

﴿وَارْحَمْنَا﴾ ہم پر رحم فرما۔ ہم اگر نیک اعمال انجام دیتے ہیں، یا برائیوں سے بچتے ہیں، یہ ہم خود نہیں کرسکتے۔ یہ اقبال علی الخیرات وَالْکَفُّ عَنِ السَّیِّئَاتِ صرف اور صرف تیری رحمت کا نتیجہ ہے۔

﴿اَنْتَ مَوْلٰىنَا﴾ تو ہی ہمارا مالک، کارساز، آقا، مددگار، حفاظت ونگہبانی کرنے والا ہے۔

﴿فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ﴾ لہٰذا ہم کو فتحیاب کر، ہمیں فتح ونصرت عطا فرما کافروں پر، بلکہ پورے جہاں کی کافر اقوام پر، سارے شیاطین الجن والانس پر، اور نفسِ امّارہ کافر پر بھی۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اس مقام پر "آمین" کہتے تھے۔ ہم بھی کہتے ہیں آمین [مدارک] بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ربّ العزّت سبحانہ نے فرمایا: "نَعَمْ" (اچھا) یعنی سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جب آیت: ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ پڑھ چکے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اچھا اسی طرح دوسرے جملے کو: ﴿مِنْ قَبْلِنَا﴾ تک، اور تیسرے جملے کو: ﴿مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ تک، اور چوتھے جملے کو آخر سورۃ تک پڑھ چکے، تو اللہ تعالیٰ نے ہر جملے کے بعد فرمایا: اچھا۔

صحیح مسلم و ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں بجائے اچھا کے قَدْ فَعَلْتُ کا لفظ آیا ہے، یعنی میں نے ایسا کردیا (جو مانگا اسے منظور فرمایا)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی دوسری روایت میں آیا ہے کہ لفظِ "غُفْرَانَکَ" پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "قَدْ غَفَرْتُ لَکُمْ"۔ میں نے تمہیں بخش دیا، اور جملہ "اَخْطَاْنَا" کے بعد فرمایا: "لَا اُؤَاخِذُکُمْ" میں تم سے مؤاخذہ نہیں کروں گا، اور جملہ "لَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا" کے بعد فرمایا: "لَا اَحْمِلُ عَلَیْکُمْ" میں تمہارے اوپر بوجھ نہیں ڈالوں گا۔ اور "وَلَا تُحَمِّلْنَا" کے بعد فرمایا: "لَا اُحَمِّلُکُمْ"۔ اور "وَاعْفُ عَنَّا" الخ کے بعد فرمایا: "قَدْ عَفَوْتُ عَنْکُمْ وَغَفَرْتُ لَکُمْ وَرَحِمْتُکُمْ وَنَصَرْتُکُمْ عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ"، میں نے تمہارے گناہ معاف کردیئے، بخش دیئے، اور تم پر رحمت نازل فرمائی، اور تم کو کافروں پر فتحیاب کردیا۔

یہ حدیث اسی خوشخبری پر دال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعاء قبول کرلی گئی۔ بھول چوک کا مؤاخذہ نہ ہونے کا حکم اجماعاً تمام امت کے لئے ثابت ہے، اسی طرح اِصر کا بارِگراں نہ ڈالنا، اور مالا یطاق پر مکلف نہ کرنا بھی تمام امت کے لئے عام ہے۔

دوسری آیت سے اس کی تائید ہورہی ہے، یعنی: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ کیونکہ قانونِ شریعت ایک ہے، اوروہ دوامی ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ جو حکم اگلوں کے لئے ساقط ہو، اور پچھلوں کے لئے ساقط نہ ہو۔ اگر معافی کا حکم ہے، توسب کے لئے ہے، اور سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہ کوئی حکم منسوخ ہوسکتا ہے، نہ تبدیل ہوسکتا ہے۔

البتہ! تمام گناہوں کی معافی کا حکم اور عمومی رحمت، اور کافروں پر نصرت وفتحیابی کی صراحت، یہ چیزیں بظاہر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کے لئے مخصوص تھیں، کیونکہ عفو ومغفرت اور رحمت ونصرت کے ماضی کے صیغے اسی پر دلالت کررہے ہیں، اور یہی سلسلہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ تک جاری رہا، کیونکہ خلافت کا رشتہ قرآن کریم کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ جب یہ رشتۂ خلافت قرآن کریم سے منقطع ہوا، توفتحیابی اور نصرت رک گئی۔

؎ چوں خلافت رشتہ از قرآن پاک گیسخت ☆ حریت را از ہر اندر کام وریخت

ابھی بھی اگر دوبارہ یہ رشتہ قرآن پاک کے ساتھ جڑ جائے تو ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران: ۱۳۹] (تم نہ کمزور پڑو، اور نہ غمگین رہو، تم ہی سربلند ہو، بشرطیکہ تم واقعی مؤمن رہو) والا وعدہ دوبارہ عود کرآجائے گا، جیسا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مہدی علیہ السلام کے وقت ہوگا، کیونکہ نصرت اور فتحیابی کا مدار تو ولایتِ الٰہیہ پر ہے، اور ارتکابِ معاصی وعمومِ فساد اور فسق وفجورِ عمومی کی صورت میں ولایتِ الٰہیہ باقی کہاں رہتی ہے؟ اور جو معاشرہ قرآنی تعلیمات پر مبنی نہ ہو، ان کی نصرت کا کیا جواز ہوگا؟

﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ اکثر مفسرین نے اَلْكٰفِرِيْنَ سے عام کافر مراد لیا ہے، مگر بعض حضرات نے کہا ہے کہ سورۃ فاتحۃ کے آخر میں اَلْمَغْضُوْبِ اور الضَّآلِّيْنَ سے مراد یہود ونصاری ہیں۔ پس سورۃ البقرہ کے آخر ﴿مِنَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ سے مراد بھی یہی دونوں اہل کتاب مراد ہیں، اور دوسرے کفار انہی کے تابع شمار ہوں گے۔ یہ سورۃ فاتحہ کا سورت بقرہ کے ساتھ ارتباط کی دلیل ہوگی۔ چنانچہ ''آمین'' کہنے کا حکم بھی دونوں سورتوں کے آخر میں مشترک ہے، جیسا کہ بیان ہوا۔

سُورَةُ آلِ عِمْرَان

مدنیۃٌ آیاتھا ۲۰۰ رکوعاتھا ۲۰

سورۂ آل عمران مدنی ہے، اس میں دوسو (۲۰۰) آیتیں، اور بیس (۲۰) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

سورت کا نام آل عمران ہے، چونکہ اس سورت میں عمران کی اولاد کا ذکر ہے، اسی پر سورت کا نام رکھا گیا۔ عمران حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام بھی ہے، اور حضرت مریم بتول علیہا السلام کے والد کا بھی نام ہے، یہاں یہی مراد ہیں۔ آئندہ آیت میں اسی کا تذکرہ ہے۔ ﴿اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا﴾۔ [آل عمران:۳۵]

نزول:

یہ سورت مدنیہ ہے، البتہ اس میں چند مکی آیتیں بھی ہیں۔ اس کا نزول سورۃ الانفال کے بعد ہے۔ اس سورت میں دوسو آیات، بیس رکوع، تین ہزار پانچ سو بیالیس (۳۵۴۲) الفاظ، اور پندرہ ہزار تین سو چھتیس (۱۵۳۳۶) حروف ہیں۔

شان نزول:

امام بغوی، ابن ابی حاتم، محمد بن اسحق و دیگر مفسرین رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ ان آیات کا (شروع کی اسی ۸۰ آیات کا) فتح مکہ کے بعد ۹ سنہ ھ میں نجران کی عیسائیوں کی آمد کے موقع پر نزول ہوا۔ یہ عیسائیوں کا وفد ساٹھ افراد پر مشتمل تھا۔ وہ اونٹوں پر سوار ہوکر قافلہ کی شکل میں آئے تھے، پورے وفد کے سردار ۱۴ اشخاص تھے، اور ان

میں بھی تین لیڈر تھے۔ سب کے امیر عاقب تھے، جس کے مشورہ کے بغیر وفد والے کچھ کام نہیں کرتے تھے۔ عاقب کا نام عبدالمسیح تھا، یہ سب عرب کے قبیلہ بکر بن وائل کے لوگ تھے، جو عیسائیت قبول کر چکے تھے۔ دراصل یہ لوگ ان عیسائی مسلمانوں کی اولاد تھے جنہیں نجران کے بت پرست بادشاہ ذونواس نے خندقوں میں آگ کا عذاب دیا تھا، جن کا تذکرہ سورۃ البروج میں ہے۔ ذونواس کی تباہی کے بعد یمن کے اکثر علاقوں میں عیسائیت پھیل گئی تھی۔ ابرہہ اشرم انہی عیسائیوں کا بادشاہ یا گورنر تھا، جس نے ستر ہزار (تفسیر مظہری) لشکر کی جمعیت کے ساتھ کعبۃ اللہ کے خلاف فوج کشی کی تھی، اور ابابیل پرندوں کے ذریعہ پورے لشکر کے ساتھ عرفات کے قریب مقام مغمس میں تباہ ہوا تھا، جس کا مکمل تذکرہ سورۃ الفیل میں ہے۔

بہر حال! اس وفد میں امیر سفر سید تھا، جس کا نام أیھم تھا، اور ابو حارثہ بن علقمہ بڑا پادری اور صاحب علم تھا۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز پڑھ چکے تھے، کہ یہ وفد مسجد نبوی میں داخل ہوا۔ یمنی منقش کپڑے کے چغے پہنے ہوئے، اور خوبصورت مردانہ چادریں اوڑھے ہوئے، ایسے بھلے معلوم ہوتے تھے کہ دیکھنے والے کہہ رہے تھے کہ ہم نے اس شان کا کوئی ڈیپوٹیشن (فیشن) نہیں دیکھا ہے۔ ان لوگوں کی نماز کا بھی وقت ہو چکا تھا، اس لئے وہیں مسجد میں ہی نماز کیلئے کھڑے ہو گئے۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اجازت دیدی، مشرق کی طرف منہ کر کے انہوں نے نماز پڑھی۔ پھر سید اور عاقب سے گفتگو ہوئی۔ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، انھوں نے جواب دیا: ''ہم تو آپ سے پہلے ہی اسلام لا چکے ہیں''۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے باطل عقائد پر انہیں تہدید فرمائی، کہ تم لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عقیدہ رکھتے ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، یا تین خداؤں میں سے تیسرے ہیں، یا وہ خود خدا ہے، یہ سارے کفریہ عقائد ہیں، جو ایسا عقیدہ رکھے وہ انجیل اور قرآن دونوں کی رُو سے کافر اور مشرک ہے۔ چونکہ عیسائیوں کا مرکزی عقیدہ یہی تھا کہ عیسیٰ ابن اللہ ہے، وغیرہ، اس لئے موضوع بحث و مباحثہ یہی قرار پایا۔ چنانچہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے الوہیت کی پانچ صفات بیان کر کے دریافت فرمایا کہ کیا یہ صفات حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں پائی جاتی ہیں؟

(۱) عیسیٰ علیہ السلام ازلی اور ابدی ہیں، جن کو کبھی فنا نہیں؟ تو عیسائیوں نے اقرار کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حیات سرمدی حاصل نہیں ہے۔

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا علم ہر چیز پر محیط ہے؟ یعنی وہ کلی علم کے مالک

ہیں؟ عیسائیوں نے اقرار کیا کہ انہیں ایسا علم حاصل نہیں تھا۔

(۳) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا عیسیٰ علیہ السلام عام انسانوں کی طرح ماں (حضرت مریم) کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوئے؟ اور کیا وہ مخلوق نہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ بیشک وہ اپنی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کے پیٹ سے پیدا ہوئے، اور وہ مخلوق ہیں۔

(۴) پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوال کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قادر مطلق ہیں؟ انہیں ہر چیز پر تصرف حاصل ہے؟ تو عیسائیوں نے جواب دیا کہ نہیں، وہ قادر مطلق نہیں ہیں۔

(۵) پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوال کیا کہ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کھانے پینے سے در کنار اور پاک تھے؟ اور بغیر خوراک کے زندہ رہتے تھے؟ تو عیسائیوں نے اقرار کیا کہ وہ کھانا بھی کھاتے تھے، اور پانی بھی پیتے تھے۔ پس سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ پانچوں صفات الوہیت کی صفات ہیں، اگر بقول تمہارے ان میں سے ایک بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں نہیں پائی جاتی، تو پھر ان کو معبود و اِلٰہ کیسے تسلیم کرتے ہو؟ پھر ارشاد فرمایا: تمہیں شرم آنی چاہئے، اور ایسے باطل عقائد سے توبہ کرنی چاہئے۔ جب عیسیٰ علیہ السلام ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے، کھانا کھاتے رہے، پانی پیتے رہے، تو ایسی مخلوق اِلٰہ کیونکر ہو سکتی ہے؟ اِلٰہ تو وہ ذات پاک ہے جو ازلی اور ابدی ہے، جس کو فنا نہیں، جس کا علم پورے عالم پر محیط ہے، اس سے کوئی چیز مخفی نہیں، وہ قادر مطلق ہے، نہ کسی کا بیٹا ہے نہ کسی کا باپ ہے، نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے، اور نہ سوتا ہے، وغیرہ۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے کسی صفت کے ساتھ متصف نہیں ہیں، لہٰذا ان کو اِلٰہ تسلیم کرنا سوائے جہالت و گمراہی کے کچھ بھی نہیں ہے، اور یہ عقیدہ تمہارا سراسر کفر و جہالت ہے۔

بہر حال! وہ اپنی ضد و عناد پر ڈٹے رہے، اور حق کو تسلیم کرنے سے منکر رہے، اور خاموش و لاجواب رہے۔

(بعض روایات میں ہے کہ اس وفد کے ارکان میں سے کرز بن علقمہ بعد میں مسلمان ہوئے، اور صحابیت کا شرف اسے حاصل ہوا)۔ اسی بارے میں سورۂ آل عمران کی تفصیلی اسی ۸۰ آیتوں کا نزول ہوا۔ آخر میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں مباہلہ کی دعوت دی، مگر وہ گھبرا گئے، اور قبول کرنے میں اپنی تباہی کا یقین کرتے ہوئے مباہلہ سے بھاگ گئے۔

ربط و مناسبت:

سورۂ بقرہ کے آخر میں ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ﴾ کی آیت میں توحید کا بیان ہوا، سورتِ ہٰذا کے شروع میں بھی توحید کا بیان ہے، سورۂ بقرہ کے شروع میں ﴿بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ کا اجمالی بیان ہے، اس سورت

کے شروع میں اس کی تفصیل ہے۔اسی طرح سورۂ بقرہ میں مغضوب قوم یہود کے عقائد کی تردید ہے،اس سورت میں ضالّین قومِ نصاریٰ کے عقائد کی تردید ہے۔اس کے علاوہ سورۂ بقرہ مین شہداء کا ذکر اجمالی تھا،اسی طرح حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت عیسیٰ علیہم السلام کا ذکر بھی اجمالی تھا، جبکہ اس سورۃ میں ان کا تفصیلی بیان ہے۔الغرض دونوں سورتوں کے مضامین قریب قریب ایک جیسے ہیں۔

مختصر موضوع:

اس سورت میں بڑے عجیب وغریب واضح انداز سے اس بات کی نہایت واضح طور وطریقہ پر تصریح کی گئی ہے کہ انسانی ہدایت کے لئے ربّ العزّت سبحانہ نے جو قانون وضابطہ وضع فرمایا وہ ایک ہی ہے،اور پورے جہاں اور سارے عالم کے لئے ہے،اور اس کا نام ہے دینِ اسلام۔ پوری کائنات کی مادّی روشنی کے لئے جس طرح ایک ہی آفتاب عالمتاب سورج ہے، اسی طرح پورے عالم کے لئے روحانی روشنیوں کا منبع ومرکز اسلام ہی ہے۔اس دین کے اساسی عقائد اور بنیادی اصول زمان ومکان کے اختلاف وتعدد کے باوجود ازلی وابدی بھی ہیں،اور یکسان بھی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دینِ برحق انسانی عقل وخرد کی پرواز سے نہایت بلند وبالا ہے،اور کسی ذہنی اختراع کا ثمرہ و نتیجہ ہرگز نہیں ہے، بلکہ مالک الملک والملکوت کا پسندیدہ دینِ برحق ہے۔

دنیا میں حق ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنے خالق واحد عزّ شانہ کی صفت ہے،جس طرح موصوف میں کسی تعدد کا امکان نہیں، اسی طرح اس کی صفت بھی ہر قسم کے تعدد سے منزہ و پاک ہوتی ہے،جبکہ اس کے مقابل باطل بے شمار انواع واقسام میں بٹا ہوا ہوتا ہے۔سیدِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ’’بنی اسرائیل قوم بہتر (۷۲) فرقوں میں تقسیم ہوگئی، اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی، وہ سارے فرقے جہنمی ہوں گے، سوائے ایک فرقے کے، کہ وہ ناجیہ ہوگا، یعنی جہنم سے نجات پائے گا‘‘۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس ایک واحد نجات یافتہ فرقے کے متعلق پوچھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَاأَنَاعَلَيْهِ وَ أَصْحَابِيْ۔[ترمذی] وہ فرقہ وہی ہوگا جس کا طور وطریقہ، جس کے عقائد واعمال میرے، اور میرے اصحاب کے مطابق ہوں گے۔

ویسے تو تہتر فرقوں میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہی ہوگا کہ وہ فرقہ ناجیہ ہم ہیں، مگر آپ کسی کے گفتار اور دعویٰ پر فیصلہ نہ کریں، آپ اعمال وکردار کو کسوٹی بنا کر اس کی روشنی میں فیصلہ کریں۔میری سنّت اور میرے اصحاب کے اعمال و کردار ساری امت کے اعمال کیلئے کسوٹی کی مانند ہیں، جس سے کھرے کھوٹے، اصلی ونقلی کی خود بخود بآسانی شناخت

ہو سکے گی۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: قرآن کریم ذو وجوہ کتاب ہے، ہر باطل فرقہ اس سے اپنی تائید میں دلیل پیش کرسکتا ہے، جبکہ سنت مطہرہ اور حیات طیبہ اور اعمالِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کوئی باطل فرقہ من مانی کر کے اپنے باطل عقائد واعمال پر استدلال نہیں کرسکتا۔ یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔

تو اسی ضابطہ کے پیش نظر قرآن کریم نے انسانی اور مذہبی وحدت کے لئے ایک ایسی جامع محکم، ابدی اساس مہیا فرمائی کہ سارے عالم کو ایک ہی پلیٹ فارم، اور عادلانہ نظام پر جمع فرمایا، کہ جب بھی انسان اپنی ذاتی، وطنی اور لسانی وقومی خودغرضیوں سے رہائی حاصل کرنے میں کامیاب اگر ہوگیا تو وہ بلا تاخیر فوراً اتحاد ومحبت کے رشتہ میں منسلک ہو جائے گا۔ اور ایسے عدل وانصاف کے رشتہ اور دائرہ میں شامل ہو جائے گا جہاں غریب وامیر، بادشاہ ورعایا سب برابر ہوں گے، کیونکہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام ایک ہی دین کے داعی اور مبلغ تھے۔ اس لئے ہر نبی نے اپنے پہلے گزرے ہوئے انبیاء کرام ورُسل عظام علیہم السلام کی تصدیق کی، اور اپنی اپنی امتوں کو بعد میں آنے والے انبیاء ورُسل علیہم السلام پر ایمان لانے کی ہدایت کی۔ اسی سنت پر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل فرمایا، اور تمام انبیاء ورُسلِ سابقین کی تصدیق کی، جس کا واضح ثبوت آج تک، بلکہ قیامت تک یہی موجود رہے گا، کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت نے محض انبیاء علیہم السلام کی تصدیق پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اعلیٰ عقیدت ومحبت کے وہ بے مثال رشتے قائم کئے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

آج لاکھوں سے بڑھ کر مسلمان اور ان کے بچوں کے وہی نام ہیں، جو انبیاء علیہم السلام کے ہیں، اور ان مقدس ہستیوں کے ناموں پر فخر اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ جس طرح اپنے قرۃ العین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ادب و احترام بجالاتے ہیں، اسی طرح سارے انبیاء کرام علیہم السلام کی عزّت واحترام بھی کرتے رہتے ہیں۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ نبوت ختم فرمایا، اور ختم نبوت کا مقدس تاج آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر مبارک پر رکھ کر سارے انبیاء ورُسل علیہم السلام کے کمالات ومناقب اور معجزات کا لباس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنا کر علم الاولین و الآخرین کے منصب عالی مقام پر فائز وجلوہ افروز فرمایا۔

چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی پیغمبر کی آمد کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی نبی کے متعلق امت کو ہدایت نہیں دی، بلکہ یہ فرمایا کہ میرے بعد تیس کے قریب دجّال وشیاطین آئیں گے، اور نبوت کا دعویٰ کریں گے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اور فرشتوں اور ساری خلقت کی ان پر لعنت ہوتی ہے، تم بھی ان پر لعنت بھیجا کرو، اور ان

کے خلاف جہاد کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار دو۔

سورت آل عمران انہی حقائق و معارف پر مشتمل ہے، اور اسی کے ساتھ یہود و نصاریٰ اور دیگر ادیانِ باطلہ کے عقائد کی تردید کے ساتھ کعبۃ اللہ شریف کی عظمت اور تقویٰ، اور صدقات کے فضائل کا بھی بدستور تذکرہ ہے۔ سب سے اہم اور ضروری مسائل اس میں جہاد کے ہیں۔ غزوات اور مجاہدین نیز جہاد کے فضائل اور جنگوں کے واقعات کا اس میں ایک معتد بہ واقعات کا بیان ہے، خاص کر غزوۂ بدر و غزوۂ اُحد کا بیان۔ واللہ اعلم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓمّٓ ۝۱ اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ۝۲

ترجمہ: الٓمّٓ ۝۱ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں (کوئی عبادت کے لائق نہیں) وہی زندہ، تھامنے والا ہے ۝۲

معارف و منازل

حروف المقطعات پر سورۂ بقرہ کے شروع میں مفصل کلام ہو چکا ہے، وہاں دیکھا جائے۔

﴿اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ﴾ پر آیت الکرسی کے ضمن میں تفصیلاً بیان ہوا۔ البتہ یہاں وفدِ نجران کی مناسبت کے تحت یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ معبودِ حقیقی کے سوا نہ کوئی عبادت کا لائق ہے، اور نہ ہی کسی کو ازلی و ابدی دائمی حیات و زندگی حاصل ہے۔ اور نہ ہی اس کارخانۂ موجودات کے کسی ادنیٰ ذرّے کا سوائے باری تعالیٰ کے کوئی دوسرا خالق ہے۔ جس طرح وہ ذات پاک الوہیت میں یکتا و لاشریک ہے، اسی طرح صفتِ خالقیت، تصرف، حیات، قیومیت اور دیگر صفات میں بھی تنہا اور اکیلا وحدہٗ لاشریک ہے۔

﴿اَلۡقَیُّوۡمُ﴾ یعنی خود قائم ہے، اور کائنات کی تمام چیزوں کو تھامنے والا اور قائم رکھنے والا ہے۔ وہ عالمِ بالا سے لے کر ذرّہ ذرّہ تک کا محافظ و نگراں ہے، اور سب کو ضروریاتِ ہستی و درستی عطاء کرنے والا ہے، وہی جتنا عرصہ چاہے قائم رکھنے والا ہے، اور پھر وہی فنا کرنے والا ہے۔ اس میں عیسائیوں کے عقیدے کا مکمل ردّ ہے، انہوں نے تثلیث کا عقیدہ بنایا ہوا ہے، کہ باپ، بیٹا اور روح القدس تین خدا ہیں۔ اور ہندوؤں کے باطل عقیدے کا بھی ردّ ہے، وہ کہتے ہیں کہ پیدا کرنے والا ''برہما'' ہے، تھامنے والا، وشنو، ہے، اور فنا کرنے والا ''شیوا جی مہاراج'' ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا: ﴿اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ﴾ پیدا بھی وہی کرتا ہے، پرورش بھی وہی کرتا ہے، قائم بھی وہی رکھتا

ہے، اور فنا بھی کرتا ہے۔ تمہارے معبودانِ باطلہ سب کے سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ کوئی بڑا کارنامہ انجام دیں۔ اور خود اپنے وجود کو بھی برقرار و باقی نہیں رکھ سکتے ہیں، سب آتے گئے، اور حسرتوں کے ساتھ چلتے گئے، فنا ہوتے گئے، اس میں دہریوں، صابیوں، مجوسیوں، اور دیگر سارے ادیانِ باطلہ کا بھی ردّ ہے۔

سورۂ آل عمران کی ابتدائی پانچ آیتوں میں اس مقصدِ عظیم کا ذکر ہے، جس کی وجہ سے کفر و اسلام اور کافر و مؤمن کی تقسیم اور باہمی تقابل شروع ہوتا ہے، اور وہ اللہ جل شانہ کی توحید ہے، اس کے ماننے والے مؤمن، اور نہ ماننے والے کافر و غیر مسلم کہلاتے ہیں۔ اس رکوع کی پہلی آیت میں توحید کی عقلی دلیل مذکور ہے، اور دوسری آیت میں نقلی دلیل بیان فرمائی گئی ہے۔ اس کے بعد کی آیت میں کفار و مشرکین کے کچھ شبہات کا جواب ہے، چنانچہ پہلی آیت میں ارشاد ہے:

﴿الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝﴾ مضمونِ توحید کو ایک دعویٰ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی معبود بنانے کا قابل نہیں ہے، اس کے بعد لفظ ﴿اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ سے توحید کی عقلی دلیل بیان کی گئی، جس کی تشریح یہ ہے کہ عبادت نام ہے: اپنے آپ کو کسی کے سامنے انتہائی عاجز و ذلیل کر کے پیش کرنے کا۔ اور اس کا مقتضی یہ ہے کہ جس کی عبادت کی جائے وہ عزّت و جبروت کے انتہائی مقام کا مالک، اور ہر اعتبار سے کامل و مختار ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ جو چیز خود اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے، اور اپنے وجود اور اس کی بقاء میں دوسرے کی محتاج ہو، اس کا عزّت و جبروت میں کیا مقام ہو سکتا ہے؟ اس لئے بالکل واضح ہو گیا کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں، نہ خود اپنے وجود کی مالک ہیں، اور نہ ہی اپنے وجود کو قائم رکھ سکتی ہیں۔ وہ خواہ پتھر کے تراشیدہ بت ہوں، یا پانی اور درخت ہوں، یا فرشتے اور پیغمبر ہوں۔ ان میں کوئی بھی لائقِ عبادت نہیں ہے، لائقِ عبادت وہی ذات ہو سکتی ہے جو ہمیشہ سے زندہ و موجود ہے، اور ہمیشہ زندہ و قائم رہے گی۔ اور وہ صرف حق تعالیٰ جل شانہ کی ذات پاک ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کا لائق نہیں ہے۔

''لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ'' اسمِ اعظم ہے:

ابن ابی شیبہؒ، طبرانیؒ، ابن مردویہؒ نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اسمِ اعظم تین سورتوں میں ہے: البقرہ، آل عمران اور طٰہٰ۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد قاسم نے کہا کہ میں نے تینوں سورتوں میں تلاش کیا تو الحی القیوم کو تینوں سورتوں میں مشترک پایا۔ ایک سورت بقرہ کی آیت آیۃ الکرسی میں،

دوسرا آل عمران کی اسی آیت میں، اور تیسرا سورت طٰہٰ کی آیت: ﴿وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ﴾ [طٰه: ۱۱۱] میں۔ مؤلف حصن حصین علامہ جزری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ میرے نزدیک اسم اعظم ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ ہے، جو انہی تینوں سورتوں میں مذکور ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اسم اعظم ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ ہے۔ حدیثوں میں مطابقت اس طرح ہو جائے گی۔ ایک حدیث حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ جو ابھی بیان کردی گئی۔ دوسری حدیث حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کی روایت کردہ کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میں نے خود سنا فرمارہے تھے، اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ان دو آیات میں ہے: ﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ [البقرة: ۱۶۳] اور ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ [البقرة: ۲۵۵] [رواه الترمذي وأبو داؤد وابن ماجه والدارمي]

تیسری حدیث حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ہے، کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ذوالنون حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ کے اندر اپنے ربّ سے جو دعا کی تھی، وہ یہ تھی: ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [الأنبياء: ۸۷] جو مسلمان کسی چیز کے متعلق ان الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ مجیب الدعوات سے دعا کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا ضرور قبول فرمائے گا۔ [رواه أحمد والترمذي]

مستدرک میں حاکم نے لکھا ہے: ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [الأنبياء: ۸۷] اللہ تعالیٰ کا وہ اسم اعظم ہے کہ اگر اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے تو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے، اور اگر اس سے کچھ مانگا جائے تو عطاء فرماتا ہے، إذا دعي به أجاب وإذا سئل به أعطى۔

چوتھی روایت حضرت یزید رضی اللہ عنہ کی ہے، کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا: اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ بِاَنِّی اَشْهَدُ أن لَا اِلٰهَ اِلَّا أَنْتَ الْأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِی لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا أَحَدٌ۔ فرمایا: اس شخص نے اللہ تعالیٰ سے ایسا اسم اعظم پڑھ کر دعا مانگی ہے کہ جب اس سے اس اسم کے ذریعہ کچھ مانگا جائے تو وہ عطاء فرماتا ہے؛ اور اگر دعا کی جائے تو قبول فرماتا ہے۔ [رواه أحمد وأبو داؤد والنسائي والترمذي وابن ماجه والحاكم ابن حبان]

ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو حسن غریب کہا ہے، اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ شرط شیخین کے مطابق صحیح ہے۔

پانچویں حدیث اس پوری جماعت نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ

نے فرمایا: میں مسجد میں بیٹھا ہوا تھا، اور ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا، اس نے نماز میں کہا: "اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ بِأَنَّ لَکَ الْحَمْدُ لَا اِلٰہَ اِلَّا أَنْتَ الْحَنَّانُ الْمَنَّانُ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ یَاذَا الْجَلَالِ وَالْإِکْرَامِ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ"۔ سرور عالم ﷺ نے فرمایا: اس نے اللہ تعالیٰ کا ایسا اسم اعظم لے کر دعا کی ہے کہ اگر اس سے یہ نام لے کر دعا کی جائے تو وہ قبول فرماتا ہے، اور کچھ مانگا جائے تو عطا فرماتا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ کے الفاظ کا ذکر نہیں کیا۔

ان تمام احادیث کا تقاضا ہے کہ ان سب میں اور تینوں سورتوں میں اسم اعظم موجود ہے۔ اور وہ صرف نفی و اثبات، یعنی لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ہے۔ سورۃ البقرہ میں آیۃ الکرسی کے اندر، اور آل عمران میں اسی آیت کے اندر، اور سورۃ طٰہٰ میں آیت: ﴿اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ لَہُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی﴾ موجود ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے فرمایا: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ ہی افضل الذکر ہے۔ [رواہ الترمذی] حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ جنت کی کنجی ہے۔ اس مفہوم کی احادیث متواتر المعنی ہی آئی ہیں۔ [مظہری]

ایک ضروری وضاحت:

احادیث مبارکہ میں اسم اعظم لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنت کو کہا گیا ہے، اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ بھی اگرچہ اسم اعظم ہے۔ مطلب سب کا ایک ہی ہے۔ ھُوَ اور أنتَ سے مراد بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ لیکن مذکورہ بالا دونوں جملوں (ضمیر والے ھو اور أنتَ) کی عظمت اور اہمیت زیادہ ہے، کیونکہ ضمیریں خواہ غائب کی ہوں یا مخاطب کی، محض ذات کے لئے موضوع ہیں، وصفی معنی کا ان کی وضع میں کوئی لحاظ نہیں ہے۔ ضمیروں سے ذہنی انتقال خالص ذات کی طرف ہوتا ہے، کسی نام یا صفت یا حالت کا تصور تک نہیں ہوتا۔ اور لفظِ اللہ کی وضع اگرچہ ذات کے لئے ہے، کیونکہ یہ ذات خداوندی کا عَلَم اور خصوصی نام ہے، لیکن یہ لفظ بولنے سے اوّل اسم کا تصور ہوتا ہے، پھر ذات کی جانب ذہنی انتقال ہوتا ہے۔

اور اگر اللہ کو اسمِ وصفی قرار دیا جائے، تو اشتقاقی معنی، یعنی الوہیت کا مفہوم ذہن میں آتا ہے، اور نفس وضع کے لحاظ سے وصفی معنی، یعنی الوہیت کی خصوصی وضع ذات خداوندی کے لئے نہیں قرار پاتی، لیکن وصفِ الوہیت کا تقاضا ہے کہ اِلٰہ کے اندر تمام صفات کمالیہ موجود ہوں، اور عیوب و نقائص اس میں بالکل نہ ہوں، اس لئے دوسرے وصفی ناموں کے مقابلہ میں لفظِ اللہ زیادہ جامع ہوگا، لیکن کوئی وصفی نام محض ذات پر دلالت نہیں کرتا، اس لئے لفظِ اللہ گو کتنا ہی جامع الصفات ہو، مگر اسمِ وصفی ہونے کی وجہ سے ذات۔ خالص پر دلالت نہیں کرے گا۔

صوفیاء نے مبتدی کے لئے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا وِرد ہی منتخب کیا ہے، کیونکہ مبتدی کے لئے بغیر کسی اسم وصفی یا صفت کی وساطت کے ذات خالص تک رسائی ممکن نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس نفی واثبات کے اسمِ اعظم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اثباتِ الوہیت کا تقاضا ہے کہ تمام صفاتِ کمالیہ اس کی ذات میں بالذات موجود ہوں، اور کوئی عیب ونقص اس میں نہ ہو، کیونکہ جو ذات ایسی جامع الصفات اور منزہ از نقائص نہ ہو، اس کو استحقاق معبودیت نہیں ہوسکتا۔ ایسی حالت میں غیر اللہ کی الوہیت کی نفی، اور ذاتِ الٰہی میں تمام صفاتِ ثبوتیہ وسلبیہ کے حصر پر جو کلمہ دلالت کرے گا وہی اسمِ اعظم ہوگا، اس لئے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہی اسمِ اعظم ہے۔ [مظہری]

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ
وَالْاِنْجِيْلَ ۝۳ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۬ اِنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۴

ترجمہ: اس نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری ہے، تصدیق کرنے والی ہے، ان کی جو اس سے پہلے ہیں، اور اس نے اتاری ہے تورات اور انجیل ۝۳ اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے، اور نازل کیا اس نے فرقان (فیصلہ کرنے والا) بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ، ان کے لئے سخت عذاب ہے، اور اللہ تعالیٰ غلبہ والا انتقام لینے والا ہے ۝۴

معارف ومنازل

یہ توحیدِ باری تعالیٰ کی دلیلِ عقلی کا بیان ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی توحید کا مضمون جو قرآن کریم نے بیان کیا ہے، یہ سب کچھ قرآن کریم کی، یا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ اس سے پہلے بھی تورات وانجیل وغیرہ کتابیں، اور انبیاء علیہم السلام نے جو اللہ تعالیٰ نے بھیجے ہیں، ان سب کا یہی دعویٰ اور یہی کلمہ تھا۔ قرآن کریم نے آکر ان سب کی تصدیق کی ہے، کوئی نئی بات، یا نیا دعویٰ پیش نہیں کیا، جس کے سمجھنے یا ماننے میں لوگوں کو کوئی پریشانی یا الجھن ہو، جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ﴾ [الأحقاف: ۹] یعنی میری باتوں سے اس قدر بدکتے کیوں ہو؟ میں کوئی انوکھی چیز لے کر تو نہیں آیا، مجھ سے پہلے بھی دنیا میں سلسلۂ نبوت ورسالت جاری رہا ہے، میں وہی کچھ کہتا ہوں جو مجھ سے پہلے نبیوں نے کہا تھا، بلکہ میرا پیغام وہی پرانا پیغام ہے، جو انبیاء کرام علیہم السلام نے پیش کیا تھا۔

توحید کا وظیفہ سارے انبیاء علیہم السلام میں مشترک ہے:

اس دوسری آیت میں توحید کی نقلی دلیل جو پیش کی گئی ہے، اس کی تشریح یہ ہے کہ جس ایک بات پر بہت سے لوگ متفق ہوں، خصوصاً جبکہ وہ مختلف ملکوں کے باشندے ہوں، اور مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے ہوں، اور درمیان میں صدیوں ہزاروں سال کا فاصلہ ہو، اور ایک کی بات دوسرے تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ بھی نہ ہو، اور خط و کتابت و کتابوں کی طباعت وغیرہ کا کوئی رسم ورواج بھی نہ ہو، اس کے باوجود جو نبی اٹھتے ہیں وہی ایک بات کہتے ہیں جو دور دراز ملکوں میں پہلے والوں نے کہی تھی، اور سب کے سب ایک ہی بات، اور ایک ہی عقیدہ کے پابند ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی باتوں میں ایک ذرّہ جتنا تضاد نہیں ہوتا، تو فطرت ایسی باتوں کے قبول کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ کا وجود، اور اس کی توحید کا مضمون انسانوں میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام لے کر آئے، اور ان کے بعد ان کی اولاد میں تو مسلسل اس بات کا چلنا کچھ بعید نہ تھا، لیکن زمانۂ دراز گزر جانے، اور اولادِ آدم علیہ السلام کے وہ تمام طریقے بدل جانے کے بعد پھر حضرت نوح علیہ السلام آتے ہیں، وہ بھی اس چیز کی دعوت دیتے ہیں جس کی طرف حضرت آدم علیہ السلام نے لوگوں کو دعوت دی تھی۔ ان کا زمانہ گزرنے کے بعد حضرت ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق علیہم السلام۔ اور ان کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام ملک شام وعراق میں پیدا ہوتے ہیں، اور ٹھیک وہی دعوت لے کر اٹھتے ہیں۔ ان کے زمانۂ دراز گزرنے کے بعد حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام، اور ان کے سلسلہ کے بہت سے دیگر انبیاء علیہم السلام آتے ہیں، اور سب کے سب وہی ایک کلمۂ توحید کا اعلان کرتے ہیں، اور ساری خلقت کو توحیدِ الٰہی کی دعوت دیتے ہیں۔ ان پر زمانۂ دراز گزر جانے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہی دعوت لے کر اٹھتے ہیں، اور آخر میں سید الانبیاء تاجدارِ ختم نبوت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہی دعوت لے کر سارے جہاں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

اب اگر ایک خالی الذہن انسان، جس کو اسلام اور توحید کی دعوت سے کوئی بغض اور نفرت نہ ہو، سادگی کے ساتھ ذرا اس سلسلۂ انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام پر نظر ڈالے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ تک، ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام مختلف زمانوں میں، مختلف ملکوں میں، مختلف زبانوں

میں پیدا ہوئے، اور سب کے سب یہی کہتے اور بتاتے چلے آئے، اکثر ایک کو دوسرے کے ساتھ ملنے کا اتفاق بھی نہیں ہوا، وہ زمانہ تألیف اور تصنیف وطباعتِ کتب سے بالکل ناواقف تھا، بلکہ ہر قسم کے رُسل ورسائل، خط وکتابت کا وجود تک نہیں تھا۔ البتہ چونکہ ان کا سلسلہ ایک رہا، اور وحی الٰہی ایک ہی مرکز سے انہیں ہدایات دیتی رہی، تو دعوتِ توحید ہر زمانہ میں بلاکم وکاست جاری رہی، اور سلسلۂ نبوت برابر جاری رہا۔ پس اتنی عظیم الشان جماعت کی ایک ہی بات توحیدِ الٰہی پر متفق ہونا، ایک انسان کے لئے، اور اس کی تصدیق کے واسطے کافی ہوجاتا ہے۔

اور جب انبیاء علیہم السلام کی ذاتی خصوصیات اور ان کے صدق ودیانت اور عدل وانصاف کے انتہائی بلند معیار پر نظر ڈالی جائے، تو ایک انسان یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کا کلمہ صحیح، اور ان کی دعوت حق اور فلاحِ دارین ہے۔

﴿نَزَّلَ عَلَيۡكَ ٱلۡكِتَٰبَ بِٱلۡحَقِّ مُصَدِّقٗا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ﴾ ہم نے یہ کتاب آپ پر نازل کی، حق وصداقت کے ساتھ، جس کی شان یہ ہے کہ جس طرح وہ خود برحق اور مبنی برصداقت ہے، اسی طرح وہ گزشتہ برحق آسمانی کتابوں کی بھی تصدیق کرنے والی ہے، اور ان کو برحق ومبنی برصداقت کہنے والی ہے۔

﴿ٱلۡحَقِّ﴾ کا کلمہ اپنے مشتقات کے ساتھ قرآن حکیم میں تین سودو (۳۰۲) مقامات پر اسی تعداد میں مذکور ہوا ہے۔ اس کے بہت سے معانی ہیں، حسبِ ترکیب ومقام اس کا کوئی ایک معنی مراد ہوگا۔ مثلاً حقیقت، وجوب، وثبات، قطعیت، موافقت، مطابقت، استحقاق، عدل وانصاف، صداقت، قولِ فیصل، وغیرہ۔ سب اس ''اَلْحَقّ'' کے معانی ہیں۔ عقائدِ قطعیہ جتنے بھی ہیں کلمہ ''اَلْحَقّ'' ان سب کو شامل ہے۔ اس کی بڑی فہرست ہے، غور کرنے سے ایک حد تک سب کا احاطہ ہوسکتا ہے۔

فرمایا: اسی طرح قرآن کریم سے پہلے تورات وانجیل کو لوگوں کی ہدایت کے لئے اتارا، جب یہ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر نازل شدہ قرآن کریم گزشتہ پیغمبروں علیہم السلام اور ان پر نازل شدہ آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والے ہیں، تو یہی چیز ان کی نبوت اور صداقت وبرحق ہونے کی دلیل ہے۔

جب تم اہل کتاب اپنے نبیوں اور ان کی کتابوں کو برحق سمجھتے ہو، اور ان پر ایمان لاتے ہو، تو تم پر لازم ہے کہ اس پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی کتاب پر ایمان لاؤ، کیونکہ مبدأ فیض اور مرکزِ وحی سب کا ایک ہی تو ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے ملک کے باشندے ہیں کہ جس میں علوم وفنون کا مطلق چرچا نہیں تھا، وہ پوری قوم اپنے زمانے میں ناخواندہ اُمّی کہلاتی ہے، اور یہی صفتِ مخصصہ اس قوم کے نبی کی بھی ہے، جو کبھی نہ لکھا، نہ

پڑھا، اور نہ کسی معلّم سے استفادہ کیا، نہ شعروشاعری اور علمی وادبی محفلوں کا قصد کیا، اور نہ ہی چالیس سال کی مدّتِ عمر میں اپنے شہر ومسکن سے باہر نکل کر دنیا کو دیکھا، اور نہ عام لوگوں کی طرح محفلوں اور مجلسوں میں شرکت کی، بلکہ اس پوری مدّتِ عمر میں خاموشی، استغراق، مراقبہ میں منہمک ومصروف رہے۔

مزید برآں اس پورے عرصے کو تنگدستی، فقروفاقہ میں گزارا۔ ساتھ ساتھ قوم وقبیلہ کے روزمرہ ظلم وستم کی چکی میں پستے رہے، اور برداشت وصبر کا دامن اپنے ہاتھ سے مضبوط پکڑ کر نہیں چھوٹنے دیا۔ پھر ان سے ایک ایسی کتاب کا ظاہر ہونا کہ اس میں پوری کائنات کے علوم ومعارف، ماضی، حال واستقبال، مبدأ ومعاد، دنیا، برزخ اور آخرت کے تمام حقائق کی ترجمانی اور نشاندہی ہو، اس امر کی مضبوط ومحکم اور ناقابلِ تردید دلیل ہے کہ واقعی آپ ﷺ ربّ العزّت کے فرستادہ آخری نبی ہیں، اور آپ ﷺ پر نازل شدہ کتاب آخری برحق کتاب ہے، جس کے معارضہ سے عرب وعجم کے دانشور، فصحاء وبلغاء عاجز ودرماندہ ہیں، اور اس کے مطالبِ عالیہ اور مضامینِ راسخہ اتنے اونچے اور بلند ہیں جو کہ طوقِ بشر سے ماوراء ہیں۔

مثلاً توحیدِ ذات وصفات، مبدأ ومعاد، سعادت وشقاوت، قصص واخبار، امثال ومواعظ، سیاست وقوانین، آدابِ معاشرت، دستورالعمل، میراث، معاملات، حقوق، حلت وحرمت، نکاح وطلاق، تحفظِ نسل وشرافت، بیع وشراء، طہارت وپاکیزگی، رحم وعفو، کرم وسخاوت، عدالت وشجاعت، عدل وانصاف، علم، اخلاق راستبازی، علم وہنر، صنعت وحرفت، حکمت ومعرفت، صداقت ومروّت، بردباری، خداترسی، غریب پروری، مہمان نوازی، اقرباپروری، صلہ رحمی، وغیرہ ہزاروں بے شمار مزایا وفضائل کہ اسلامی تعلیمات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو عقلِ سلیم کے ساتھ متصادم ہو۔

ان سارے زرین اصول اور فیوض وبرکات کا سرچشمہ آپ ﷺ کا وہ سینۂ مُبارک ہے جس پر مقدس وحی الٰہی کا نزول ہوتا رہا، اور عالم غیب وشہادہ کے سارے اسرار ورموز آپ ﷺ پر کھلتے رہے، اور اُمی وناخواندہ ہوتے ہوئے ساری خدائی کے حقائق سے پردہ اٹھا کر آپ ﷺ نے سارے حجابات واخفاء کو کائنات کے سامنے رکھ کر پردہ کشائی فرمائی۔ کائنات کا ایسا کوئی گوشہ نہیں جس سے آپ ﷺ نے پردہ نہ اٹھایا ہو، اور شرافت کا ایسا کوئی پہلو نہیں جس کی آپ ﷺ نے نشاندہی نہ کی ہو۔ آپ ﷺ کی بعثت اتنی عام عالمگیر ہے کہ دریائی مچھلیوں اور خشکی وصحرائی کیڑے مکوڑوں، چیونٹیوں کے حقوق تک آپ ﷺ کی راہنمائی موجزن ہے۔ آپ ﷺ پر کھربوں پدموں صلوٰت وسلام ہوں، روزِ ازل سے ابد تک۔

تیرے آنے سے رونق آ گئی گلزار ہستی میں ☆ شریک حال قسمت ہو گیا پھر فضل ربانی

تیرا در ہو ہمارا سر ہو ہمارا دل ہو تیرا گھر ہو ☆ تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی (حفیظ)

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایان ☆ بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچنان باقی

محمد عربی کابروئے ہر دو سرا است ☆ کسیکہ خاک درش نیست خاک بر سر او

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ جس طرح ہر آنے والے نبی پچھلے نبی کی تصدیق کرنے والے ہوتے ہیں، اسی طرح ہر آسمانی کتاب سابقہ کتاب کی تصدیق کرتی ہے۔ اور ساتھ ساتھ اس میں شامل شدہ انسانی تحریفات کی مکمل نشاندہی بھی کرتی ہے، چنانچہ قرآن کریم جو کہ ہر قسم کی تحریفات سے قیامت تک محفوظ ہے، اس نے یہود و نصاریٰ کی ہر قسم کی تحریفات کی نشاندہی کی، جو کہ انہوں نے تورات اور انجیل میں کی تھیں۔ اس وقت پورے عالم میں تورات و انجیل کا اصلی غیر محرّف کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہے۔ اور جو محرّف نسخے چار دانگ عالم میں موجود ہیں، وہ اتنے تبدیل شدہ ہیں جنہیں دیکھ کر ہرگز یقین نہیں آتا کہ یہ آسمانی کتابیں ہیں۔ ان میں ایسے ناروا اور غلط عقائد و خیالات کی بھرمار ہے کہ عقلِ سلیم دنگ رہ جاتی ہے۔

فائدہ:

نبوت اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے، اور اس کے حاملین بڑے عظیم عالی مقام انبیاء علیہم السلام ہیں، جو براہِ راست اللہ تعالیٰ سے اکتسابِ فیض کرتے ہیں۔ ان کا زمینی کوئی استاذ و مربی نہیں ہوتا۔ وہ پاکیزہ اور معصوم ہوتے ہیں، اور ہر قسم کے گناہوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ ان کے نفوس اس قدر صاف و شفاف ہوتے ہیں جہاں گناہ کا گزر نہیں ہوتا۔ ان کا انتخاب خود ربّ العزّت کے حکم سے ہوتا ہے۔ وہ بچپن سے قدرت کی نگہداشت اور نگرانی میں ہوتے ہیں۔ وہ کبھی نفسانی خواہشات کے دلدادہ نہیں ہوتے۔ وہ نفسانی خواہشات کے قید و بند سے مکمل آزاد ہوتے ہیں۔ ان کی عبادت کا قبلہ زمین پر ہوتا ہے، جہاں وہ نمازوں میں اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں، مگر ان کی زندگی اور زندگی کے اعمال، نشیب و فراز کا قبلہ آسمان میں ہوتا ہے، جدھر وہ رخ کر کے اپنی زندگی گزارتے ہیں۔

وہ ایک دوسرے کا احترام بھی از حد زیادہ کرتے ہیں، اور تصدیق بھی کرتے ہیں۔ کبھی دیکھنے اور سننے میں نہیں آیا کہ ایک نبی نے کسی دوسرے نبی کی تصدیق و تزکیہ نہ کیا ہو، تکذیب تو دور کی غیر ممکن بات ہے۔ دنیا میں یہی ایک برگزیدہ جماعت ہے کہ جس میں گروہ بندی، اختلاف، حسد وغیرہ امراض کا تصور تک نہیں ہے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری برتری اور فضیلت اس طرح بیان ہرگز نہ کرو جس سے کسی پیغمبر کی تنقیص لازم آتی ہو۔ یہی وہ جماعت حقہ ہے کہ جن کی تعلیمات سے جہاں آب و گل خوب منوّر اور روشن ہے۔ یہی وہ برحق طبقہ ہے کہ جن کا حریم ہر قسم کے گناہوں سے پاک ہے۔ اَللّٰھُمَّ فَصَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ عَلٰی أَنْبِیَاءِکَ وَرُسُلِکَ اَجْمَعِیْنَ۔

﴿وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ اور نازل فرمایا اللہ تعالیٰ نے تورات اور انجیل کو اس سے پہلے۔ یہ تورات و انجیل پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجی گئیں۔ اور قرآن کریم سارے جہاں کے لئے قیامت تک رشد و ہدایت کا عالمی پیغامِ الٰہی ہے۔ اس کی آمد کے ساتھ ساری آسمانی کتابیں اور ان کے احکام منسوخ ہو گئے۔

﴿وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ﴾ فرقان سے مراد قرآن کریم ہے، تفخیمِ شان کی خاطر دوبارہ ذکر ہوا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے زبور مراد ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک معجزات مراد لینا بہتر ہے۔ بہر حال تینوں معنی محتمل ہیں۔ واللہ اعلم

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کیا۔ اگر اس کو اپنے عموم پر رکھا جائے تو ہر منکرِ کتاب اس میں شامل ہوگا۔ لیکن اگر سیاق و سباق کی تخصیص ہو، کیونکہ متصل تورات و انجیل کا بیان ہے، تو اس سے اہل کتاب یہود و نصاریٰ مراد ہوں گے، جنہوں نے اپنی اپنی کتابوں میں تحریف کے ذریعہ ردو بدل کیا، اور اس طرح کے عمل سے وہ کافر و منکر قرار پائے۔ بہر حال آسمانی کتابوں میں تحریف کرنا صریح کفر ہے، خواہ تحریف لفظی ہو یا معنوی، دونوں کفر ہیں۔

۔قرآن کریم میں چند سال پہلے لفظی تحریف کر کے امریکہ و برطانیہ نے اسرائیل کے تعاون سے کویت سے شائع کیا، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے فوراً پکڑے گئے۔ جس کتاب کے کروڑں حافظ دنیا میں موجود ہوں کس کی مجال ہے کہ اس میں کسی حرف تو کیا ایک زیر وزبر، یا جزم وشد کی تبدیلی کر سکے؟ البتہ بدنصیب لوگ مشرک بدعقیدہ مارِ آستین اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے معنوی تحریف جو کرتے رہے ہیں، یا کر رہے ہیں، وہ سب اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا کی وعید میں شامل رہیں گے۔ اور ﴿لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ﴾ کے مصداق ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نہیں بچ سکیں گے، کیونکہ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ اللہ تعالیٰ قدرت و غلبہ والا ہے۔ آج تک کوئی مثال موجود نہیں کہ کسی کو پکڑنے کا

ارادہ کیا ہو، اور وہ بچ نکلا ہو۔

﴿ذُوانْتِقَامٍ﴾ وہ انتقام لینے والا ہے۔ وہ ظالم کو ڈھیل ضرور دے گا، جب اپنی گرفت کا پنجہ اٹھائے گا تو ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ﴾ طاقتور سے طاقتور دشمن اس کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا۔

؎ تو مشو مغرور بر حلم خدا ☆ دیر گیرد سخت گیرد مر ترا

(مثنوی)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝۵ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں، زمین میں اور نہ آسمان میں ۝۵ وہ وہی ہے جو تمہاری تصویر بناتا ہے (شکل وصورت نقشہ) رحموں (بچہ دانی) کے اندر، جس طرح چاہے، کوئی عبادت کے لائق نہیں اس کے سوا، وہی ہے کمال قدرت کا مالک، حکمت والا ۝۶

معارف ومنازل

اس تیسری آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے علمِ محیط کا بیان ہے، کہ جس پاک ذات سے کسی جہاں کا کوئی ذرّہ چھپا ہوا نہیں ہے، پس کائنات کا خالق و مالک، اور ہر قسم کی عبادتوں کا صرف وہی سزاوار وحقدار ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہو، یا اور کوئی مخلوق، کسی بھی عبادت کا حقدار نہیں ہے۔ چوتھی آیت میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور قادرِ مطلق ہونے کا بیان ہے، کہ اس کی کاریگری کیسی محکم اور بیمثال ہے؟ ایک حقیر بے جان نطفہ سے محض انسان نہیں، کھربوں حیوانات کی تخلیق اور پیدائش کس عجیب وغریب طریقے پر مرتب فرمائی؟

انسان کا بچہ ہو یا حیوانات کا، رحمِ مادر، یعنی بچہ دانی کے تنگ وتاریک ﴿فِي ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ﴾ [الزمر: ۶] تین اندھیریوں میں کیسی عجیب حکمتِ بالغہ کے ساتھ پیدائش کا سلسلہ جاری رکھا، اور ان کی شکل وصورتوں اور رنگوں، قدوقامت، سرخ، سفید، سیاہ، گندم گوں، ڈیل ڈال میں وہ صنعت کاری فرمائی، کہ اربوں کھربوں انسانوں میں ایک کی صورت دوسرے سے ایسی نہیں ملتی کہ امتیاز نہ رہے۔ یہی حال جانوروں کا بھی ہے، کہ پوری شکل وصورت بہت

بڑی بات ہے، آنکھوں اور ہاتھوں کی لکیریں بھی اس طرح مختلف ہیں کہ آپس میں نہیں ملتیں۔ پس اس علمِ محیط اور قدرتِ کاملہ کا تقاضا ہے کہ صرف اسی کی عبادت کی جائے، جو اس طرح کا علم وقدرت نہ رکھے وہ ہرگز عبادت کا لائق نہیں ہے۔

مزید برآں یہ بات اور بھی قابلِ ذکر ہے کہ تمہارے معبود دوسروں کو کیا دیں گے؟ جب وہ اپنی شکل و صورت کو اپنے مزاج وخواہش کے مطابق بنانے پر قادر نہیں ہیں، پس اس قسم کی ضعیف وناتواں مخلوق کس طرح معبود بن سکتی ہے جو اپنی تصویر بنانے پر قادر نہ ہو؟ اس طرح چاروں آیات اثباتِ توحید کے لئے کافی وشافی ہیں۔ اوّل آیات میں صفتِ حیات وقیومیت، دوم میں انزالِ کتب، سوئم میں علمِ محیط، چہارم میں قدرتِ کاملہ کا بیان۔

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

ترجمہ: وہی ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری، اس میں بعض آیتیں محکم ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں، اور دوسری متشابہ ہیں، پس جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھا پن ہے (کجی ہے) پس وہ پیچھے لگتے ہیں متشابہات کے، اور اس میں تلاش کرتے ہیں گمراہی، اور تلاش کرتے ہیں ان کی تاویلیں، حالانکہ نہیں جانتا ان کی تاویل مگر اللہ تعالیٰ، اور جو پختہ ہیں علم میں وہ کہتے ہیں: ا ہم ایمان لاتے ہیں ان سب پر، یہ سب ہمارے ربّ کی طرف سے ہیں، اور نہیں نصیحت پکڑتے مگر عقلمند لوگ ۝

معارف ومنازل

پچھلی چار آیتوں میں توحیدِ باری تعالیٰ کا اثبات تھا، اس آیت میں توحید کے خلاف بعض شبہات کا جنہیں نصاریٰ کے وفد نے پیش کیا تھا ان کا جواب ہے۔ گزشتہ چاروں آیات سے جب توحید کا اثبات ہوا، تو عقیدۂ تثلیث باطل ٹھہرا، تو نصاریٰ کے وفد نے قرآن کریم کے ان الفاظ پر اپنے کچھ شبہات پیش کئے جن میں عیسیٰ علیہ السلام کا ''روح

اللہ'' یا ''کلمۃ اللہ'' ہونا مذکور ہے، کہ ان الفاظِ قرآنیہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شرکتِ الوہیت ثابت ہوتی ہے۔ نعوذ باللہ

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان شبہات کو ختم کر دیا کہ یہ کلمات متشابہات ہیں، ان کے ظاہری معنی مراد نہیں ہوتے، اور اس قسم کے متشابہات قرآن کریم میں بکثرت موجود ہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان ایک مخفی راز ہیں، جن کی حقیقت پر عوام الناس مطلع نہیں ہو سکتے، عوام کے لئے ان الفاظ کی تحقیق میں پڑنا، اور کوئی مطلب تلاش کرنا روا نہیں ہے۔ ان پر اس طرح ایمان لانا ضروری ہے کہ جو کچھ ان سے اللہ تعالیٰ کی مراد ہے وہ حق ہے، مزید تلاش و تفتیش اور کھود کرید کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ تمام متشابہات کا یہی حکم ہے۔

متشابہات کے متعلق اصولی بات:

قرآن کریم میں تین قسم کی آیتیں ہیں:

(۱) مُحکَمات: یعنی وہ آیات جن کے معانی و مطالب، اور اللہ تعالیٰ کی مراد واضح ہو، جیسے: ﴿اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَآتُوا الزَّکٰوۃَ﴾ وغیرہ۔

(۲) مُتَشَابِھَات: یعنی وہ آیات جن کے معنی معلوم ہوں، مگر مرادِ ایزدی معلوم نہ ہو، جیسے: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی﴾ وغیرہ۔

(۳) مُقَطَّعَات: یعنی وہ آیات جن کے معانی اور مراد دونوں معلوم نہ ہوں، جیسے: الٓمّٓ۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے آیات محکمات اور متشابہات کا ذکر فرما کر ایک عام اصول اور ضابطے کی طرف اشارہ فرمایا ہے، جن کے سمجھ لینے کے بعد بہت سے شبہات اور نزاعات ختم ہو سکتے ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن حکیم میں مُقَطَّعَات کے علاوہ دو قسم کی آیات پائی جاتی ہیں: ایک قسم کو آیاتِ محکمات کہتے ہیں، اور دوسری کو متشابہات۔ محکمات ان آیات کو کہتے ہیں جن کی مراد ایسے شخص پر بالکل ظاہر اور بیّن ہو جو قواعدِ عربیہ کو اچھی طرح جاننے والا ہو، اور جن آیات کی تفسیر اور معانی ایسے شخص پر ظاہر نہ ہوں تو ان کو متشابہات کہتے ہیں۔ [مظہری]

پہلی قسم کی آیات کو اللہ تعالیٰ نے اُمُّ الْکِتٰب کا لقب دیا، جن کا مطلب یہ ہے کہ تمام تعلیمات کا اصل الاصول یہی آیات ہوتی ہیں، جن کے معانی اور مفاہیم اشتباہ والتباس سے بالکل پاک ہوتے ہیں، اور ان کی مراد و مطلب سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

اور دوسری قسم کی آیات میں چونکہ متکلم کی مراد مبہم اور غیر متعین ہوتی ہے، اس لئے ان آیات کے بارے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان کو پہلی قسم کی طرف راجع کر کے دیکھنا چاہئے، کہ جو معنی اس کے خلاف پڑیں ان کی قطعاً نفی کی جائے، اور متکلم کی مراد وہ سمجھی جائے جو آیات محکمات کی مخالف نہ ہو، اور کوئی ایسی تاویل اور توجیہ صحیح نہ سمجھی جائے گی جو اصولِ مسلّمہ اور آیاتِ محکمات کے خلاف ہو۔ مثلاً قرآن حکیم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت تصریح کردی: ﴿إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ﴾ [الزخرف: ۵۹] (وہ نہیں ہیں مگر بندہ، جن پر ہم نے انعام کیا)۔ ایسے ہی دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ﴾ [آل عمران: ۵۹] (بیشک اللہ کے ہاں عیسیٰ کی مثال جیسے آدم کی مثال، جس کو مٹی سے پیدا فرمایا)۔

ان آیات اور انہی کی مثل دوسری بہت سی آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے، اور اس کی مخلوق ہیں، لہٰذا نصاریٰ کا ان کے بارے میں الوہیت اور ابنیت کا دعویٰ خلافِ واقع اور غلط ہے۔ اب اگر کوئی ناداں ان سب محکمات سے آنکھیں بند کر کے کَلِمَۃُ اللہ اور رُوْحٌ مِّنْہُ وغیرہ متشابہات کو لے دوڑے، اور اس کے وہ معنی لینے لگے جو محکماتِ قرآنیہ اور متواتر بیانات کے منافی ہو، تو یہ اس کی کجروی اور گمراہی وہٹ دھرمی ہوجائے گی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قرآن کریم میں جو آیتیں عمل کے لئے نازل ہوئی ہیں، وہ محکمات ہیں۔ اور جن آیات سے عمل متعلق نہیں ہے، محض ان پر ایمان لانا مقصود ہے، جیسے حروفِ مقطعات، یا اللہ تعالیٰ کی صفات، قیامت کے احوال، دجّال وغیرہ، تو ان پر صرف ایمان لانا مقصود ہے۔ (ابن ابی حاتم) کیونکہ متشابہات کی صحیح مراد صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، وہی اپنے فضل وکرم سے جس کو جس قدر حصہ پر مطلع فرمائے وہ خارج از بحث ہے، لہٰذا متشابہات میں تفتیش وجستجو خطرہ سے خالی نہیں ہے۔

بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ روزِ قیامت تمام متشابہات کو محکمات کا لباس پہنایا جائے گا، کیونکہ قیامت کے روز سارے مغیبات مشاہدات بن جاتے ہیں، حتیٰ کہ ذات اقدس حق تعالیٰ شانہ کی رؤیت جنتیوں کو بار بار نصیب ہوجائے گی۔ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا وَ لَاتُحْرِمْنَا یَاحَنَّانُ یَامَنَّانُ. آمین

﴿هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ﴾ آیات محکمات کی وہی حیثیت ہے جو ماں کی ہے۔ یہی آیات اصولِ احکام بھی ہیں، اور اصولِ فرائض بھی۔ اسی معنی کے لحاظ سے سورۃ الفاتحہ کا نام اُمُّ الْقُرْآن اور مکہ معظمہ کا نام اُمُّ الْقُرٰی ہے، اور

شراب کو أم الخبائث کا نام دیا گیا ہے۔

﴿وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ﴾ یعنی دوسری قسم کی آیتوں کا نام متشابہات ہے، جن کے مطلب و مراد تک سوائے اللہ جل شانہ کے کسی کی رسائی نہیں ہوسکتی۔

﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ﴾ پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ اپنی خواہشات کی خاطر متشابہات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، جس طرح ان کے دل ٹیڑھے اور کج ہیں، اسی طرح کے غلط معانی کا جامہ پہنا کر خود بھی گمراہ ہوجاتے ہیں، اور لوگوں میں فتنہ وفساد برپا کر کے انہیں بھی گمراہ کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب ٹیڑھے اور برگشتہ ہیں، خواہ قدریہ، خوارج ومعتزلہ ہوں، خواہ اہلِ بدعت وضلالت ہوں۔ یہ عام معنی سب کو شامل ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب آپ ایسے لوگوں کو دیکھیں جو متشابہات کی تفتیش میں لگے ہوئے ہیں، تو آپ ان سے دور بھاگیں، کیونکہ یہ وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ نے کیا ہے کہ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ [بخاری]

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ مجھے اپنی اُمت پر تین باتوں کا خوف ہے: (۱) اوّل یہ کہ مالدار ہوجائیں، تو فتنہ وجدال وقتال میں مبتلا ہوجائیں۔ (۲) دوم یہ کہ کتاب اللہ کے متشابہات میں غیر ضروری بیجا تاویل کریں گے۔ ہر بے علم تاویل شروع کرے گا۔ (۳) تیسری یہ کہ علم کو ضائع کریں گے، اور علم کو بڑھانے کی طلب وجستجو ترک کریں گے۔ [ابن کثیر]

﴿وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ﴾ حالانکہ متشابہات کی اصلی مراد سے واقف سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں۔ محض عربی لغت اور چند مسائل کو جاننا متشابہات کی مراد جاننے کے لئے ہرگز کافی نہیں۔ بغیر اطلاعِ ربانی کے کوئی کسی جزوی معنی پر بھی قادر نہیں ہوسکتا، اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنے بندگانِ خاص، مقربانِ درگاہ کو معلوم کرے تو کوئی اشکال نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں راسخین فی العلم میں سے ہوں۔ یعنی متشابہات کی تفسیر سے واقف ہوں۔ اور یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں بھی متشابہات کے مرادی معنی جانتا ہوں۔ یعنی جاننے والوں میں سے ہوں۔ [مظہری]

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں بھی ان راسخین میں سے ہوں۔ یعنی متشابہات کا مطلب مجھے معلوم ہے۔ اکثر علماء کرام کا کہنا ہے کہ یہاں وقف اِلَّا اللّٰه پر تام ہے۔ وَالرّٰسِخُوْنَ جملہ مستانفہ ہے، اور واو

ابتدائیہ ہے، عطف کے لئے نہیں ہے۔ پس معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور راسخون فی العلم کا وظیفہ جاننا نہیں ہے، بلکہ آمَنَّا ہی ان کا وظیفہ ہے۔

اور جو حضرات واو کو عاطفہ قرار دیتے ہیں، اور اَلرّٰاسِخُوْنَ کو اِلَّااللہ پر عطف کرتے ہیں، اور کلمہ جلالہ "اللہ" پر وقف نہیں کرتے ہیں، تو معنی یہ ہوں گے کہ متشابہات کی مراد کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ تعالیٰ اور راسخون فی العلم کے۔ تو اس صورت میں راسخون کیلئے جاننے کا اثبات ہو جائے گا، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ پہلا قول حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابی بن کعب اور حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کا ہے کہ وقف اللہِ پر ہوگا۔ حضرت حسن بصری اور اکثر تابعین، امام کسائی، فراء، اور اخفش رحمہم اللہ کا پسندیدہ قول بھی یہی پہلا قول ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ تفسیر قرآن کے علم میں رسوخ رکھنے والوں کے علم کی یہ آخری حد آگئی کہ انہوں نے آمَنَّا بِہٖ کہہ دیا۔ یعنی ان کا وظیفہ جاننا نہیں، بلکہ صرف آمَنَّا ہے۔

رہا یہ کہ اَلرّٰاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کون لوگ ہیں؟ اس میں مختلف متعدد اقوال ہیں۔ مشہور قول دو ہیں: اوّل یہ کہ اس سے مراد وہ علماء ہیں جن کو فقاہت اور حکمت کا درجہ حاصل ہے۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ: اِتِّقَانُ الْعِلْمِ بِالْعَمَلِ وَالْعَقْلِ۔ جنہوں نے علم وعقل کی روشنی میں عمل بالعلم کا منصب حاصل کیا، جنہیں عام عرف میں علماء ربانی کہتے ہیں۔ اور یہ بہت اونچا مقام ہے، جسے ہر شخص حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ لوگ ظاہری وباطنی دونوں علموں سے مسلح ہوتے ہیں۔ ان کا علم گہرا اور عمیق ہوتا ہے، وہ رازدانِ نبوت کے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اَلرّٰاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ سے مراد علماء اہلسنت والجماعۃ ہیں، جو قرآن وسنت کی اسی تعبیر وتشریح کو صحیح سمجھتے ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہ اور اجماع امت سے منقول ہو، اور قرآنی تعلیمات کا محور اور مرکز آیات محکمات کو مانتے ہیں، اور متشابہات کے جو معانی ان کے فہم وادراک سے باہر ہیں، اپنی کوتاہ نظری اور قصورِ علمی کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔ وہ اپنے کمالِ علمی اور قوتِ ایمانی پر مغرور نہیں ہوتے، بلکہ ہمیشہ حق تعالیٰ سے استقامت اور مزید فضل وعنایت کے طلبگار رہتے ہیں۔ ان کی طبیعتیں فتنہ پسند نہیں ہوتیں کہ متشابہات کے پیچھے لگی رہیں۔

وہ محکمات اور متشابہات سب کو حق سمجھتے ہیں، کیونکہ انہیں یقین ہے کہ دونوں کا ایک چشمہ صافی ہے۔ البتہ

محکمات کے معانی ہمارے لئے معلوم کرنا مفید اور ضروری تھا، تو اللہ تعالیٰ نے وہ پوشیدہ نہیں رکھے، بلکہ پوری وضاحت سے بیان فرمائے۔ اور متشابہات کے معانی اللہ تعالیٰ نے اپنی مصلحت سے بیان نہیں فرمائے، کیونکہ ان کا تعلق کسی عمل کے ساتھ نہیں ہے، لہٰذا ان کو معلوم کرنا ہمارے لئے ضروری نہیں ہے۔ ایسی آیات پر اجمالاً ایمان لانا کافی ہے۔ [مظہری]

﴿كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ سب محکم و متشابہ آیات، ناسخ و منسوخ وغیرہ ہمارے ربّ کی طرف سے آئی ہیں۔

﴿وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾ قرآن حکیم سے وہ لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں جو عقلِ سلیم والے ہیں۔ قرآن حکیم اپنے انوار میں سورج کی طرح ہے، سورج سے وہ لوگ فائدہ حاصل کرتے ہیں جن کی آنکھیں سلامت ہوں۔ نابینا شخص سورج کی روشنی سے محروم ہی رہتا ہے۔ اسی طرح قرآنی انوار سے وہ لوگ استفادہ کرتے ہیں جن کو عقلِ سلیم کی نعمت حاصل ہو، جو اس نعمت سے بے بہرہ ہوگا وہ ہرگز قرآنی انوار سے نصیحت اندوز نہیں ہوگا، وہ ابدی جہلِ مرکب کے دلدل میں غرق رہے گا۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ⑧
رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ⑨

ترجمہ: اے ہمارے ربّ! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر، جب کہ تو نے ہدایت بخشی ہے، اور بخش ہمارے لئے اپنی طرف سے مہربانی، بیشک تو ہی بخشش کرنے والا ہے ⑧ اے ہمارے ربّ! تو جمع کرنے والا ہے لوگوں کو اس دن میں جس میں کوئی شک نہیں، بیشک اللہ تعالیٰ جو وعدہ کرتا ہے اس کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرتا ⑨

معارف و منازل

اللہ تعالیٰ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ ہر لمحہ، ہر گھڑی اللہ تعالیٰ کو یاد کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے غفلت حرام ہے۔ ذکرِ کثیر جس کی تاکید قرآن مجید میں ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر لمحہ دل میں یا زبان پر اس کا تصور اور یاد جاری ہو، جب بندہ اپنے پروردگار کو یاد کرتا ہے تو یہی یاد اتنی بابرکت ہے جس سے غفلت دور ہو جاتی ہے، اور توجہ الی اللہ جو عبادتوں کا مغز اور خلاصہ ہے، وہ حاصل ہو جاتی ہے۔

اسی بنیاد پر دعا کو عبادت اور عبادت کا مغز قرار دیا گیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ سے ہر مطلب کی درخواست ہونی چاہیے، حقیر سے حقیر چیز تک کا مطالبہ ہو، لیکن اعلیٰ سے اعلیٰ چیزوں کی اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اس کی رضا سب سے بڑی دولت ہے، اس کا ہر لحہ مطالبہ ہو۔

کیسا کرم ہے کہ دعا کی قبولیت کا بھی وعدہ ہے، اور دعاء کے الفاظ وکلمات کی تلقین اور رہنمائی بھی ہے؟ کہ مجھ سے یہ مانگو، اور ان کلمات کے ساتھ مانگو۔ تو مانگنا تمہارا کام، اور دینا و بخشش میرا کام۔ اور یہ کتنا اچھا ہوگا کہ تم سب سے پہلے مجھ سے بنیادی چیز، یعنی ہدایت وایمان کی درخواست کیا کرو، اور ضلالت وگمراہی سے میری پناہ مانگو، کیونکہ استعاذہ بھی دعاء کا رکن ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے لوگوں نے سوال کیا کہ ہم اللہ تعالیٰ سے کیا مانگیں؟ فرمایا یہ مانگو: اَللّٰهُمَّ اِنِّی أَسأَلُکَ رِضَاکَ وَالْجَنَّةَ وَمَاقَرَّبَ اِلَيهَا مِنْ قَوْلٍ وَّعَمَلٍ وَأَعوذُبِکَ مِنْ سَخطِکَ وَالنَّارِ وَمَا قَرَّبَ اِلَيهَا مِنْ قَوْلٍ وَّعَمَلٍ۔ پس چاہیے کہ اس جامع دعاء کا التزام ہو۔ اس آیت کریمہ میں جس دعاء کی تلقین ہے، یہ بھی جامع اور پرمغز دعاء ہے۔

تو فرمایا کہ رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ اس طرح دعا کرتے ہیں: ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا﴾ اے ہمارے ربّ! آپ ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت سے نوازا ہے، ہمیں استقامت عطا فرما، اور ہر قسم کی کجیوں سے محفوظ رکھ۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کثرت سے یہ دعا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ يَا مُصَرِّفَ الْقُلُوبِ، وفی روایة یَامُقَلِّبَ الْقُلُوبِ صَرِّفْ قُلُوبَنَا وفی روایة ثَبِّتْ قُلُوبَنَا عَلٰی طَاعَتِکَ وفی روایة عَلٰی دِيْنِکَ۔

﴿وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً﴾ الخ: اور اپنی طرف سے ہمیں رحمت بخش، کیونکہ تو ہی سب کچھ بخشنے والا ہے، تیرے سوا کوئی دینے والا نہیں ہے، ساری کائنات تیری محتاج ہے، تیرے بغیر کوئی حاجت روا مشکل کشا، بلکہ سننے والا بھی کوئی نہیں ہے، تو ہی وہ ذات پاک ہے کہ کھربوں مانگنے والوں کا بیک وقت سننے والا ہے، اور آپ کے حضور آوازیں نہیں ٹکراتیں، ہر ایک کا استغاثہ الگ الگ سنتا ہے۔

اور راسخین فی العلم یہ بھی دعا کرتے ہیں: ﴿رَبَّنَا اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ﴾ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک ساری انسانیت کا ایک میدانِ محشر میں بلا کمی بیشی جمع کرنے والا تو ہی قادر مطلق ہے، اور وہ دن پختہ یقینی ہے، جس میں ذرّہ برابر شک وشبہ نہیں ہے، اور حساب ومحاسبہ بھی یقینی ہے۔ آپ نے

سیکڑوں مقامات میں اس کی آمدو قوع کی اطلاع دی ہوئی ہے، فرمایا: ﴿وَعۡدًا عَلَيۡنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِيۡنَ﴾ [الأنبياء:۱۰۴] (یہ ایک وعدہ ہے، جسے پورا کرنے کا ہم نے ذمہ لیا ہے، ہمیں یقیناً یہ کام کرنا ہے) تیرا وعدہ اتنا پختہ وراسخ اور یقینی ہے کہ ﴿إِنَّكَ لَا تُخۡلِفُ الۡمِيۡعَادَ﴾ بیشک تو جو وعدہ کرتا ہے اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا، جس طرح تیری ذات ہر عیب سے پاک ہے، اسی طرح وعدہ خلافی کے عیب سے بھی پاک ومنزہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِىَ عَنۡهُمۡ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ
شَيۡـًٔا ؕ وَاُولٰٓـئِكَ هُمۡ وَقُوۡدُ النَّارِ ۙ﴿۱۰﴾ كَدَاۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ۙ وَالَّذِيۡنَ مِنۡ
قَبۡلِهِمۡ ؕ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوۡبِهِمۡ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۱۱﴾
قُلۡ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا سَتُغۡلَبُوۡنَ وَتُحۡشَرُوۡنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئۡسَ الۡمِهَادُ ﴿۱۲﴾

ترجمہ: بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا ہرگز کام نہ آئیں گے ان کیلئے ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے حضور، اور یہی لوگ ہیں دوزخ کے ایندھن۔﴿۱۰﴾ (ان کا حال ایسا ہی ہے) مثل عادت آل فرعون کی، اور ان لوگوں کی جو ان سے پہلے گزرے ہیں، انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، پس پکڑا اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے گناہوں کے بدلے، اور اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔﴿۱۱﴾۔ آپ کہہ دیجئے ان لوگوں سے جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا کہ تم مغلوب ہوں گے، اور اکٹھے کئے جاؤ گے جہنم کی طرف، اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے ﴿۱۲﴾

معارف ومنازل

﴿إِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا﴾ میں خطاب عام ہے، قیامت تک آنے والے کافروں، مشرکوں، یہود ونصاریٰ سب کو شامل ہے۔ البتہ بعد میں آنے والا حکم ﴿قُلۡ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا سَتُغۡلَبُوۡنَ﴾ یہ خاص ہے، اور اس سے مراد صرف زمانۂ رسالت کے کفار ہیں، جن کی مغلوبیت کی پیشینگوئی ہوئی، اور وہ پوری ہوگئی۔ اس میں ہمارے زمانے تک کے کفار شامل نہیں ہیں، کیونکہ آج کے کافر مسلمانوں پر ہر محاذ وہر معاملہ میں غالب نظر آتے ہیں، جبکہ مسلمان اپنی بے عملی اور فسق کی وجہ سے مغلوب ہیں، کیونکہ ان کے غالب ہونے کی جو شرط مقرر ہوئی تھی وہ اسے چھوڑ گئے، اور ترک کردی، وہ تھا: غیر متزلزل ایمان، اور معیاری تقویٰ، اور حق پرستی، جو کہ آج ہمارے اندر نہیں رہے۔

تو ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ﴾ [الآیہ] بیشک جن لوگوں نے کفر کیا (یا آئندہ کفر کریں گے) ان کے مال اور اولاد ہرگز انہیں کام نہیں آئیں گے، اور اللہ تعالیٰ کی گرفت وعذاب سے ہرگز انہیں نہیں بچا سکیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچانے والا صرف ایمان ہے، جس سے یہ لوگ محروم ہیں۔ دوسرے مقام پر ارشاد: ﴿یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ﴿۸۹﴾﴾ [الشعراء]

بہر حال! دنیا کا عذاب ہو یا آخرت کا، کفار کے لئے نہ مال کام آئے گا، اور نہ ہی اولاد، اور نہ ہی عملِ صالح۔ بالفرض اگر کسی کافر نے عمل کیا ہو، کیونکہ کفار میں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں جو بہت سارے رفاہی کام کرتے ہیں، مگر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے وہ سارے اکارت ہو جاتے ہیں۔ بخلاف مسلمانوں کے کہ ان کا ادنیٰ عمل اگرچہ ایک کھجور کا صدقہ کیوں نہ ہو، وہ روزِ قیامت پہاڑوں جتنا ثواب کی صورت میں ہوگا۔ پس قلبِ سلیم والے لوگوں کیلئے بڑی خوشخبری ہے۔

اسی طرح اگر کسی مسلمان نے قلبِ سقیم کے ساتھ حرام مال کمایا، یا رشوت یا سود کا، یا غریب لوگوں کا مشترکہ مال، یا حکومت کا، جیسے آج کل ہمارے زمانے میں چاروں طرف کرپشن کا دور دورہ ہے۔ ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کا مستقبل خواہ قبر ہو یا میدانِ محشر نہایت تاریک اور تباہ کن رہے گا۔ احادیث صحاح میں ایسے لوگوں کیلئے بڑی سخت وعید آئی ہوئی ہے، اور قیامت کے روز ایسے لوگوں کو ستر گز کی زنجیروں میں جکڑ کر جہنم کے حوالہ کیا جائے گا۔ نعوذ باللہ۔

﴿اُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ﴾ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ [التحریم: ۶] انسان اور پتھر دوزخ کے ایندھن ہوں گے۔

﴿کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ان کفار کی عادت وسرکشی، اور خصلت وعمل فرعون والوں کی طرح ہے، اور ان لوگوں کی طرح جو فرعون سے پہلے گزرے، جیسے قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط وغیرہ، جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی، اور حق کو ٹھکرا دیا، ایمان باللہ والرسل کا مذاق اڑایا۔ ان کے متعلق ارشاد ہے: ﴿وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ﴿۹﴾ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِیَةً ﴿۱۰﴾﴾ [الحاقۃ]

اس سے قبل کی آیت میں ہے: ﴿فَهَلْ تَرٰی لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِیَةٍ ﴿۸﴾﴾ [الحاقۃ]

اللہ تعالیٰ واحد و جبار اور عزیز و قہار نے ان دانشور، طاقتور، دیو ہیکل متمدّن اقوام پر عذاب کا ایسا کوڑا برسایا جنہیں ہمیشہ کیلئے موت کی نیند سلا دیا، آج پورے کرۂ ارض پر ان کا نام ونشان نہیں ہے۔ چونکہ رحمۃ للعٰلمین ﷺ کے ساتھ حضرت حق سبحانہ نے وعدہ فرمایا تھا کہ آپ کی اُمت (امتِ دعوت واجابت) پر کوئی آسمانی عذاب نہیں آئے گا۔ تب ہی تو مغرب مامون ہے۔ اگر سرور عالم ﷺ کی شفاعت نہ ہوتی تو آج مغرب کا وہی حشر ہوتا جو عاد وثمود اور فرعون کا ہوا تھا۔

﴿كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا﴾ فرعون سے پہلے وہ تمام قومیں جنہوں نے اپنے اپنے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی، اور ہماری آیتوں کا انکار کیا، اور جھٹلایا، اور احکام الٰہی اور معجزات انبیاء علیہم السلام کو سحر وجادو کہا، اور انبیاء علیہم السلام کو ساحر، شاعر، مجنون کہتے رہیں، پھر نتیجہ یہ ہوا ﴿فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ﴾ ان کے گناہوں کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے انہیں پکڑلیا۔ اگر مدینہ کے یہود، اور نجران کے نصاریٰ، اور مکہ مکرمہ کے مشرک فرعونیوں کے نقش قدم پر چلنا چاہتے ہیں تو ان کے مقدر میں بھی وہی عذاب وسزا لکھی جائے گی، جو ایک روز انہیں بھی اپنی گرفت میں لے کر ساری کسر پوری کرے گی۔

﴿وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ﴾ [البروج: ۱۲] تیرے ربّ کی گرفت نہایت سخت ہے، جب وہ پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں ہے۔

تو مشو مغرور بر حلم خدا ☆ دیر گیرد سخت گیرد مر ترا

(مثنوی)

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ﴾ ان کافروں سے کہہ دیجئے کہ عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے، آج تم اپنے مال واولاد اور قومی وانفرادی قوت کی وجہ سے کبر وغرور اور گھمنڈ میں مست ہو، اور کمزور وناتواں، بے مال وبے سرمایہ، غریب مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہو، سو یاد رکھو! عنقریب وہ وقت آنے والا ہے، اور ان غرباء کا سورج طلوع ہونے والا ہے، اور تمہاری تاریک رات کا بستر ہ گول ہونے والا ہے۔ یہ غرباء ومساکین تمہیں ایسا سبق سکھائیں گے جس سے تمہیں چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ یہ تمہاری فوج وحشم پر وہ کاری ضرب لگا کر تمہیں ایسا تباہ کریں گے جس طرح فرعون تباہ ہوا، تمہارا حشر اس سے بھی بدتر ہوگا۔ یہ تمہاری دنیوی سزا ہوگی۔

اور ﴿وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ﴾ یہ تمہاری اخروی سزا ہوگی خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تمہارا ابدی انجام

ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی پیشینگوئی پوری کر دکھائی، مختصر عرصہ میں مقامِ بدر میں کفارِ مکہ کو وہ شکستِ فاش دیدی گئی جو رہتی دنیا تک اسے یاد رکھا جائے گا، جس کا آئندہ بیان ہونے والا ہے۔

امام مقاتل رحمۃ اللہ نے کہا کہ ان آیات کا نزول غزوۂ بدر سے پہلے ہوا تھا، اور بنی قریظہ کو قتل اور بنی نضیر کو علاقہ بدر کیا گیا، اور خیبر فتح ہوا، اور وہاں کے یہودیوں پر جزیہ مقرر کیا گیا۔ مزید تفصیل آنے والی ہے، اور اس مغلوبیتِ کفار کو ایک مثال کے ذریعہ واضح کیا جا رہا ہے، جس کا تعلق غزوۂ بدر الکبریٰ کے ساتھ ہے، وہ یہ ہے:......

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ
مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿١٣﴾

ترجمہ: تحقیق تمہارے لئے نشانی ہے کہ ان دو گروہوں میں جو آپس میں ٹکرائے، ایک گروہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں لڑتا ہے، اور دوسرا کفر کرنے والا ہے دیکھتے ہیں ان کو اپنے سے دُگنا آنکھ کے ساتھ دیکھنا، اور اللہ تعالیٰ تائید کرتا ہے اپنی مدد سے جس کی چاہے، بیشک اس میں عبرت ہے بصیرت رکھنے والوں کے لئے ﴿١٣﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں سابقہ آیات کی تشریح بھی ہے اور مثال بھی، وہاں ارشاد ہوا تھا: ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ﴾ واقعۂ بدر نے سَتُغْلَبُوْنَ کی تشریح کردی، کہ غزوۂ بدر میں ایک ہزار کا مسلح لشکر اللہ تعالیٰ کے حکم سے تین سو تیرہ کے مقابلہ میں کیسے مغلوب ہو کر شکستِ فاش سے دوچار ہوا؟ اور اس کا غرور خاک میں مل گیا۔ اور اسی کے ساتھ یہودِ مدینہ کیلئے بھی تنبیہ ہے، جنہوں نے کبر وغرور، اور مال ودولت کی فراوانی کی بنیاد پر کہا تھا۔

جب مسلمانوں کے ہاتھوں مشرکینِ مکہ کے جرار لشکر کو ہزیمت ہوئی، تو مدینہ کے آس پاس بسنے والے یہودیوں نے میٹنگ کی، اور کہا کہ مکہ والے فنونِ حرب وقتال سے چونکہ نابلد اور ناواقف تھے اس لئے انہیں شکست ہوئی، اگر مسلمانوں کا کہیں ہم جیسے تجربہ کار جنگجو اور فنونِ حرب کے بہادروں سے واسطہ پڑتا تو ہم انہیں بتادیتے کہ لڑائی کیسے ہوتی ہے۔ اس آیت میں ان کیلئے تنبیہ ہے کہ جنگیں مہارت اور اسلحہ وبارود اور افرادی قوت سے ہرگز نہیں جیتی جاتی ہیں، بلکہ وہاں اخلاص وللّٰہیت اور تقویٰ وعمل کارفرما رہتے ہیں۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے لئے لڑتے ہیں، تو ان کے ساتھ اس کی نصرت شاملِ حال رہتی ہے، اگر چہ وہ عددی اور فوجی ساز وسامان کے اعتبار سے کمزور اور نہتے ہوں۔ اور جن لوگوں کے پاس سارے اسباب وسائل اگر چہ بکثرت ہوں، جب وہ شیطانی مقاصد کی خاطر لڑتے ہیں، تو ان کے مقدر میں شکست کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا، اور وہ نشانۂ عبرت بن کر ہمیشہ کیلئے خوار وذلیل ہوں گے۔ تو فرمایا:

﴿قَدۡ کَانَ لَکُمۡ اٰیَۃٌ﴾ تمہارے لئے آپس میں ٹکرانے والے دو گروہوں کی ہار وجیت میں نشانِ عبرت ہے، کیوں نہیں؟ جب ایک چیونٹی اپنی کمزوری اور بے بسی کے عالم میں ایک دیوہیکل ہاتھی پر غلبہ حاصل کرے، اور اسے تہس نہس کر کے رکھ دے، تو دنیا والوں کے لئے یہ نشانِ عبرت نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟

مکہ کے مشرکین کی تعداد ۹۵۰ تھی، اور ان کا یہ سارا لشکر مسلح تھا، روزانہ دس اونٹ ذبح کر کے کھاتے تھے۔ ان کے پاس سات سو اونٹ تھے، اور دو سو چاق وچوبند گھوڑے تھے۔ دوسری طرف مسلمان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تین سو تیرہ تھے، ستر مہاجرین، دو سو تینتالیس انصار تھے۔ ان کے پاس ستر اونٹ اور صرف دو گھوڑے تھے، آٹھ تلواریں، چھ زرہیں ان کا سامان حرب تھا۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ وہی چیونٹی اور ہاتھی والی بات ہے۔ سبحان اللہ

یہ قلیل، نہتا، بے سروسامان لشکر نعرۂ تکبیر کی صداؤں اور تسبیح وتہلیل کی گونج میں ابو جہل کے لشکر پر شاہینوں کی چال اور شیروں کی رفتار میں جب حملہ آور ہوتا ہے، تو وہ منظر قابلِ دید ہوتا ہے، جس پر قدسی فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔

دو نابالغ یتیم بچے بہادروں کی صفوں سے نکل کر شاہینوں کی طرح سردارِ قریش، سپہ سالارِ قریش عمرو بن ہشام ابو جہل کو گھوڑے سے گرا کر لہو لہان کرتے ہیں۔

قدرت اور رحمتِ الٰہی دیکھیں کہ ابو جہل ایک قدر آور سرخ گھوڑے پر سوار ہے، اور سر سے پاؤں تک (لوہے کی) زرہ میں ڈھکا ہوا ہے (بنی عمالقہ کے جالوت کی طرح) اور خوب مسلح ہے۔ ایک ہاتھ میں برہنہ شمشیر، دوسرے ہاتھ میں برہنہ یمنی نیزہ ہے، اور لشکر کے دس چاق وچوبند نوجوان اس کی حفاظت پر مامور اور نگرانی کر رہے ہیں۔ دونوں بھائی عفراء کے بیٹے مُعاذ اور مُعوّذ ابابیل پرندوں کی طرح اس پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اس کا کام تمام کر کے اپنی صفوں میں واپس آجاتے ہیں۔ اس کے بعد مُعوّذ بن عفراء زخمی ہو جاتے ہیں، ان کی ٹانگ کٹ جاتی ہے، خون زیادہ بہنے کی وجہ سے بعد میں جامِ شہادت نوش کرتے ہیں، اور خُلد بریں کے خیموں میں پہنچ جاتے ہیں۔ رضي اللہ عنہ وعن جمیع أخوانہ من الصحابۃ۔

ے بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن ☆ خدا رحمت کند این عاشقان پاک طنیت را

اس معرکہ میں مہاجرین کے علمبردار سیدنا علی کرم اللہ وجہہ تھے، اور انصار کے علمبردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ تھے۔ دوسری طرف مشرکین کے علمبردار عتبہ بن ربیعہ تھا، جو کہ اسی معرکہ میں واصلِ جہنم ہوا۔

اس معرکۂ حق وصداقت میں چودہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جامِ شہادت نوش فرمایا، جن کی قبریں (آخری آرامگاہ) اسی میدانِ بدر میں ہیں۔ سوائے حضرت عبیدہ بن الحارث بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کے کہ ان کا پیر کٹ گیا تھا، واپسی پر مقامِ صفراء میں پہنچ کر وفات پائی، اسی مقام پر دفن ہوئے۔ بڑے عرصے تک ان کی قبر سے خوشبو کی مہک پھیلتی رہی، پھر بند ہوگئی۔

شہداء بدر کے نام:

(۱) حضرت عبیدہ بن حارث المہاجری۔ (۲) مُعَوِّذ بن عفراء انصاری، قاتلِ ابو جہل۔ (۳) عمیر بن ابی وقاص المہاجری۔ (۴) ذوالشمالین بن عبد عمرو مہاجری۔ (۵) عاقل بن البکیر مہاجری۔ (۶) مجع بن صالح مہاجری، مولیٰ عمر بن الخطاب۔ (۷) صفوان بن بیضاء مہاجری۔ (۸) سعد بن خثیمہ انصاری۔ (۹) مبشر بن عبد المنذر انصاری۔ (۱۰) یزید بن حارث انصاری۔ (۱۱) عمیر بن الحمام انصاری۔ (۱۲) رافع بن معلیٰ انصاری۔ (۱۳) حارث بن سراقہ انصاری۔ (۱۴) عوف بن حارث انصاری۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین

یہ آخر الذکر حضرت مُعَوِّذ رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں، دونوں کے والد کا نام حارث ہے، والدہ کا نام عفراء ہے، ان کا تیسرا بھائی معاذ رضی اللہ عنہ ہے، جو ابو جہل کے قتل میں شریک رہا، اور بازو کٹ گیا۔ خلافتِ عثمانی میں وفات پائی۔

﴿فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ یہ تھے جان نثارانِ نبوت۔

﴿وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ﴾ یہ تھے مشرکینِ مکہ۔

﴿يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ﴾ وہ خود اپنی آنکھ سے انہیں دگنا دیکھ رہے ہیں۔ اس دیکھنے کا تعلق دونوں گروہوں سے ہے۔ اہلِ ایمان دیکھ رہے تھے کہ کفار ان سے تعداد میں دوگنے ہیں، اور واقعتاً ایسا ہی تھا، اس میں شک نہیں کہ وہ تعداد میں دگنے، بلکہ تگنے سے بھی زیادہ تھے۔ دوسری طرف یہ بھی معنی ہے کہ کفار مسلمانوں کو اپنے سے دُگنی تعداد میں دیکھتے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نصرت کے لئے پانچ ہزار فرشتے بھیج دیئے تھے۔

دوسرے مقام پر اس کی حکمت کا تذکرہ ہے: ﴿وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا﴾

[الأنفال: ۴۴] بدر کے دن تم ان کفار کو اپنے سے کم تعداد میں دیکھتے تھے۔ ﴿وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ﴾ [الأنفال: ۴۴] اور تمہیں ان کی نظروں میں کم کر کے دکھایا۔ ﴿لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا﴾ [الأنفال: ۴۴] کہ اللہ تعالیٰ جس کام کو پورا کرنا چاہتا ہے وہ مکمل ہو جاتا ہے۔

الغرض! میدانِ بدر میں اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں ایسی کیفیت پیدا کر دی تھی کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کو اپنے سے کمتر دیکھ رہے تھے۔ اہلِ ایمان نے کفار کو اپنے سے کم تعداد میں دیکھا، اور کافروں نے اہلِ ایمان کو دیکھا تو وہ انہیں بہت کم نظر آئے۔ اور واقعہ بھی ایسا تھا کہ وہ کم تھے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کفار کی تعداد کم کر کے دکھانے کی حکمت بھی بتا دی کہ اے اہلِ ایمان! تمہیں کفار کی تعداد کم کر کے دکھانے کی حکمت و مصلحت یہ تھی کہ کہیں تمہارے دلوں میں ان کی کثرت کی وجہ سے ضعف پیدا نہ ہو۔ ﴿وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشِلْتُمْ﴾ [الأنفال: ۴۳] اگر انہیں کثیر تعداد میں دکھایا جاتا تو تم پھسل جاتے، تم پر رعب طاری ہو جاتا، اور تم جم کر نہ لڑ سکتے۔

پھر جب لڑائی شروع ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتے میدان میں اتارے، تو کفار کو مسلمانوں کی تعداد زیادہ نظر آنے لگی، جس کی وجہ سے ان کفار پر رعب طاری ہو گیا، اور وہ حواس باختہ ہوئے، ان کے پاؤں اکھڑنے لگے، حتیٰ کہ انہوں نے موقع سے بھاگنا شروع کیا۔ افراتفری میں اونٹ اور سامان چھوڑ گئے۔ ادھر سید کائنات ﷺ کی وہ نیاز مندانہ تاریخی دعاء کا اثر تھا کہ جنگ کا پانسہ پلٹ گیا، اور مسلمان فتحیاب ہوئے۔

﴿وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَن يَشَاءُ﴾ اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنی تائید و نصرت سے نوازے۔ اسی کا نتیجہ ہی تھا کہ یہ فتحِ عظیم تاریخی کامیابی حاصل ہوئی، جس سے کفر و شرک کی کمر ٹوٹ گئی، اور اسلام کا بول بالا ہو گیا۔

﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ﴾ بصیرت رکھنے والوں کیلئے سامانِ عبرت ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اوپر کی آیت میں کفار کے عنقریب مغلوبیت کی جو پیشینگوئی فرمائی، اس کا اس آیت میں ثبوت ہے کہ کفار مکہ باوجود ظاہری اور صریح اکثریت کے کس طرح بدر کے میدان میں مغلوب ہوئے؟

یہ جنگ ہجرت کے اٹھارہ مہینے بعد، رمضان میں واقع ہوئی۔ دونوں فوجوں میں تعداد کے اعتبار سے، یعنی تین سو تیرہ بمقابلہ نو سو پچاس، اور ساز و سامان کے اعتبار سے، یعنی آٹھ تلواریں، چھ زرہیں، ستر اونٹ، دو گھوڑے، بمقابلہ نو سو پچاس لوگ، اور نو سو پچاس تلواریں، سات سو اونٹ، دو سو گھوڑے، اور بے شمار اسلحہ وغیرہ۔

بڑی بات اور بنیادی چیز یہ تھی کہ یہاں اخلاقی فرق مادی فرق سے کہیں زیادہ نمایاں اور کارآمد و کارگر رہا۔

ایک طرف کثرت، اور اس کے ساتھ گانے والی عورتوں کی جماعت، جو ساتھ ساتھ گاتی رہتیں، اور جنگی ترانے گا گا کر اپنے لشکر والوں کی جرأت و بہادری بیان کرتیں، اور انہیں جنگ و شمشیر زنی پر ابھارتی رہتیں، اور نام لے کر ان کی بہادری پر ان کی تعریفیں کرتیں، ساتھ ساتھ شراب و کباب کا بھی دور چلتا رہا، اور لات و عزیٰ و ہُبل کا نعرہ بھی لگتا رہا۔
دوسری طرف نماز تھی، تسبیح و تہلیل کا جذبہ و جوش تھا، تلاوت قرآن کی گونج تھی، روزے کی حالت تھی، بات بات پر رب العزت کا نام تھا، مناجاتوں اور دعاؤں کا سلسلہ گرمجوشی کے ساتھ جاری تھا، رجوع الی اللہ و انابت کا زور و شور تھا۔

جب یہ تقابل اور نمایاں فرق واضح رہا، اور چلتا رہا تو عین اسی وقت مبارزہ کا اعلان ہوا۔ ادھر سے غرور و کبر کے ساتھ عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ دندناتے ہوئے میدان میں اترے، ادھر سے انصار قبیلہ کے تین جوان میدان میں آ کر دعوتِ مبارزہ میں شریک ہوئے۔ تینوں قریشوں نے کہا:

ہم اپنے سے کم نسب لوگوں کے ساتھ مبارزہ نہیں کرتے، یعنی ان کو گوارا نہیں ہوا کہ انصار کے ساتھ مبارزہ ہو، جس کو قومی برتری حاصل نہیں ہے۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اٹھو حمزہ، علی، عبیدہ۔ جب یہ تینوں وہاں پہنچے تو انہوں نے کہا: اب ٹھیک ہے، یہ قومیت میں ہمارے برابر ہیں۔ اُدھر سے اعلان ہوا: لات و ہبل۔ اِدھر سے اعلان ہوا: اللہ اکبر۔ تو اللہ اکبر کہنے والوں نے پہنچتے ہی انہیں ڈھیر کر کے جہنم رسید کیا۔ یہ دونوں سلامت رہے، ان پر کوئی خراش نہیں آئی۔ البتہ! حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے، ان پر ولید نے تلوار چلائی، جس سے ان کا پیر کٹ گیا، جو واپسی پر مقام صفراء میں وفات کا باعث بنا۔ وہیں تنہا ان کی قبر ہے۔

❁ ❁ ❁

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ
وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ اللّٰهُ
عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ
جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ
اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ قِنَا عَذَابَ
النَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْمُنْفِقِيْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: مزین کی گئی ہے لوگوں کیلئے مرغوب چیزوں کی محبت، عورتوں سے، اور بیٹوں سے، اور سونے چاندی کے جمع کئے ہوئے خزانوں سے، اور عمدہ نشان لگے ہوئے گھوڑوں سے، اور مویشیوں سے، اور کھیتی سے، یہ تو دنیا کی زندگی میں فائدہ اٹھانے کا سامان ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بہترین ٹھکانا ہے۔﴿۱۴﴾ اے پیغمبر! (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) آپ کہہ دیجئے: کیا میں تمہیں ان چیزوں سے بہتر نہ بتاؤں ان لوگوں کے لئے جوڈرتے رہے؟ ان کے ربّ کے ہاں باغات ہیں، ان کے سامنے نہریں جاری ہیں، یہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، اور بیویاں ہیں پاکیزہ، اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی، اور اللہ تعالیٰ نگاہ میں رکھتا ہے بندوں کو۔﴿۱۵﴾ وہ لوگ جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! بیشک ہم ایمان لائے ہیں، پس بخش دے ہم کو ہمارے گناہ، اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔﴿۱۶﴾ وہ صبر کرنے والے ہیں، اور سچائی والے ہیں، اور اطاعت کرنے والے ہیں، اور خرچ کرنے والے ہیں، اور بخشش طلب کرنے والے ہیں سحریوں کے وقت﴿۱۷﴾

معارف ومنازل

سورت کے شروع سے یہاں تک اہلِ نجران اور یہود ونصاریٰ اور مشرکین کی ضد وعناد اور کفر کا بیان جاری رہا، جوتوحید کے منکر تھے۔ پھر ان کی مغلوبیت کا تذکرہ ہوا۔ اب یہاں سے کفر وسرکشی کے اسباب کا بیان شروع ہوا۔ ان میں سب سے بڑا سبب حُبِّ دنیا اور مال واسباب ساز وسامان اور سرمایہ ودولت ہے، اور اس کی محبت وخواہش ہے۔

﴿زُيِّنَ﴾ زِينَة سے ماخوذ ہے۔ اس کا مفہوم ہے: کسی چیز کا آراستہ وخوبصورت اور قابلِ ستائش اور محبوبِ خاطر ہونا۔ زینت کے اسباب کبھی داخلی ہوتے ہیں، کبھی خارجی۔ داخلی اسباب کبھی غیر مادی ہوتے ہیں، جیسے علم وعقل وغیرہ۔ اور کبھی مادی بدنی ہوتے ہیں، جیسے جمال وصورت، حسنِ قامت۔ بدنی قوتِ خارجی اسباب کی مثال جیسے عمدہ لباس، مال، مرتبہ، سواری وغیرہ۔

پھر اگر زینت واقعی نفس الامری حقیقی ہو، جیسے: ﴿وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ﴾ [الملک: ۵] (اور ہم نے قریب والے آسمان کو چراغوں سے مزین کیا)۔ یا محض اعتقادی زینت ہو۔ پھر اعتقادی زینت کی دو قسمیں ہیں: (۱) واقع کے مطابق، جیسے کلام اللہ شریف میں ہے: ﴿وَحَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ﴾ [الحجرات: ۷] (اور محبوب کردیا تمہارے لئے ایمان کو، اور اسے مزین کردیا تمہارے دلوں میں) (۲) واقع کے مطابق نہ ہو، جیسے: ﴿وَزُيِّنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ﴾ [التوبة: ۳۷] (اور مزین کردیئے گئے ہیں ان

کے لئے ان کے برے اعمال)۔ایمان اور بد عملی دونوں اعتقادی اسبابِ زینت ہیں، مگر ایمان واقعی سببِ زینت ہے، اور دوم، یعنی بد عملی محض فرضی ہے۔

﴿حُبُّ الشَّهَوَاتِ﴾ شہوت کے معنی ہیں: کسی چیز کی طرف نفس کی انتہائی رغبت، اور کامل میلان۔
آیت کریمہ میں شہوات سے مراد ہیں مُشتَہیات، یعنی مرغوبات، کیونکہ حقیقت میں یہ مرغوب چیزیں ہی اسبابِ زینت اور جاذبِ محبت ہوتی ہیں۔محبت مرغوبات کی جگہ، محبتِ شہوات کا ذکر اپنے اندر دو خوبیاں رکھتا ہے:

(۱) تنبیہ اور زجر کا مقام ہے۔اور شہوات کو ذکر کرنے سے زجر میں قوت پیدا ہوگئی۔

(۲) اس بات کی طرف اشارہ ہوگیا کہ لوگ اسبابِ زینت کی محبت میں اتنے غرق ہیں کہ اسبابِ زینت کی خواہش سے بھی محبت رکھتے ہیں۔گویا اصل کلام اس طرح تھا: زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ مَحَبَّةِ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْمَالِ وَغَيْرِهِ. اس کی مثال ایسی ہے جیسے: ﴿أَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ﴾ [ص: ۳۲] مجھے خیر کی محبت بھی محبوب ہے۔جب لیلیٰ سے محبت ہے تو اس کی محبت بھی پیاری ہے، اور عشقِ لیلیٰ بھی محبوب ہے۔مجنون بیچارے نے کہا تھا ؎

الٰہی مجھ سے جدا نہ ہو الفتِ لیلیٰ

دنیا کی محبت فطری ہے، اور اشیاء ستہ کی تزیین کی حکمت کا بیان:

جن چھ چیزوں کو اس آیت کریمہ میں بیان کیا گیا ہے، وہ عام طور پر انسان کے لئے مرکزِ توجہ اور رغبت ہوتی ہیں۔اوّل یہ کہ ان کی تخلیق، اور پھر تزیین اور کشش میں اللہ تعالیٰ نے مختلف مصالح و حکمتیں رکھی ہیں۔مصلحت یہ ہے کہ انسان کی زندگی اور بقاء انہی چیزوں پر موقوف ہے، اگر یہ چیزیں نہ ہوں، یا ان کی رغبت نہ ہو تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔

دوسرا یہ کہ اگر فطری طور پر انسان ان چیزوں کی محبت سے دستبردار ہو تو اس کی زندگی میں خوشحالی اور سکون کا خاتمہ ہو جائے گا۔

تیسرا یہ کہ انسانوں کی زندگی کے مراتب و درجات انہی چیزوں کے وجود و عدم، اور کثرت و قلت پر موقوف ہیں۔غربت و امارت وغیرہ انہیں چیزوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔

چوتھا یہ کہ اگر ان چیزوں کی طرف طبعی میلان و رغبت نہ ہو، اور انسان ان چیزوں سے مستغنی ہو، تو انسان اور فرشتے ایک ہو جائیں گے۔

پانچواں یہ کہ اگر ان اشیاء ستہ کی طرف انسان کا طبعی میلان نہ ہو، تو سارا نظامِ عالم درہم برہم اور تہہ وبالا ہوجائے گا۔

چھٹا یہ کہ تمام قرآن پاک میں ایک ایک چیز کا نام لے کر اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو نعمت ومرحمت بتایا ہے، پس نعمت میں یہ خصوصیت رکھی ہوئی ہے کہ اس کی طرف ذہنی اور طبعی میلان ہو۔

ساتواں یہ کہ دنیا کی یہ نعمتیں اخروی نعمتوں کا نمونہ ہیں۔ اگر یہ دنیوی نعمتیں نہ ہوں تو اخروی نعمتوں کی طلب خدانخواستہ طلبِ مجہول ہوجائے گی۔

آٹھواں یہ کہ ان نعمتوں کی تخلیق، اور ان کی تزیین وکشش میں ابتلاء وامتحان مقصود ہے کہ کون ان کا حق اداء کرے گا، اور کون نہیں کرے گا۔

نواں یہ کہ ان نعمتوں کے ذریعہ شکر گزاروں، اور ناشکروں کا حال معلوم ہوجائے گا۔

دسواں یہ کہ ان نعمتوں پر فریفتہ ہوکر کون شخص اللہ تعالیٰ کی رضا ورحمتوں سے دور رہے گا، اور انہی متاع کے عوض آخرت سے محروم وبرگشتہ ہوگا، اور کون ایسا نہیں ہوگا۔ وَغَیر ذٰلِکَ مِنَ الْمَصَالِحِ وَالْأَغْرَاضِ. اسی بنیاد پر ارشاد ہے: ﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ [الکھف:۷] ہم نے دنیا کی چیزوں کو جو کچھ زمین پر ہیں پیدا کرکے مزین ودلکش بنایا، تاکہ آزمائیں کہ کون اچھا عمل کرے گا، اور کون فریفتہ ہوکر دنیا کو منزلِ اصلی سمجھ کر آخرت سے غافل ہوجائے گا۔

پس اس آیت سے معلوم ہوگیا کہ دنیا کی اُن مرغوب چیزوں کو انسان کے لئے مزین کردینا بھی ایک فعلِ خداوندی ہے، اور وہی ذات پاک جس طرح ان چیزوں کی خالق ہے، اسی طرح انہیں مرغوب ومحبوب اور مزین بنانے والا بھی وہی ہے، اور امرِ الٰہی بہت سی حکمتوں پر مبنی ہے، جیسے ابھی بیان ہوا۔

اور بعض آیتوں میں اس تزیین کی نسبت شیطان کی طرف ہوئی ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ﴾ [النمل:۲۴] (اور ان کے لئے شیطان نے ان کے اعمال کو مزین کردیا ہے)۔ وہاں ایسی تزیین مراد ہے جو شرعاً حرام اور ناجائز ہو، یا عقلِ سلیم سے مخالف ہو، یا یہ کہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہو، کیونکہ حلال اور مباحات کی تزیین مطلقاً بری نہیں ہے، بلکہ اس میں بہت سے فوائد اور ان گنت مصالح بھی ہیں۔ تو تزیین بالحق اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوئی، اور تزیین بالباطل شیطان کی طرف، جو کہ برے اعمال اور محرّمات ومنکرات کو مزین کرکے لوگوں وراہ

حق سے گمراہ کرتا ہے۔

حدیث شریف میں ارشاد ہے: حُبُّ الدُّنیا رَأسُ کُلِّ خَطِیئَۃٍ۔ دنیا کی محبت ہر گناہ کا سرچشمہ ہے۔ اسی طرح: اَلدّنیَا مَلعُونَۃٌ وَمَلعُونٌ مَافِیھَا اِلّا مَاابتغیٰ بِہٖ وَجہُ اللّٰہِ۔ وفی روایۃ اِلّاذِکرُ اللّٰہِ وَمَا وَالَاہُ أَوْعَالِم أَوْ مُتَعَلِّم [طبرانی، ابن ماجہ عن أبی ہریرۃ وبی الدرداء]

قرآن کریم نے بہت سی آیتوں میں، متعدد آیتوں اور مختلف سورتوں میں جس طرح شدومد کے ساتھ شرک و کفر کی مذمت کی ہے، اسی طرح دنیا کی بھی مذمت کی ہے، کیونکہ تمام معاصی پر ابھارنے اور آمادہ کرنے والی دنیا اور اس کی لذات ہیں۔ اگر دنیا کی چیزوں اور لذتوں میں شرعِ انور کے مطابق عمل ہو، اور اعتدال پر کاربند ہونا معمول ہو تو بہت ہی بہتر، لیکن اگر حدودِ شرع کی پاسداری نہیں ہوئی، اور حدود وحقوق پامال ہوئے، تو ہلاکت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

؎ آب اندر زیر کشتی پشتی ست ☆ آب در کشتی ہلاک کشتی ست

(مثنوی)

یعنی دنیا کا ساز وسامان پانی کی مانند ہے، اور انسان کا قلب کشتی کی طرح ہے، پانی جب تک کشتی کے نیچے اور ارد گرد رہے تو کشتی کیلئے معاون اور مددگار رہے گا، اور اگر پانی کشتی کے اندر داخل ہوجائے تو کشتی کی غرقابی اور ہلاکت کا سامان ہے۔ اسی طرح دنیا کا مال ومتاع جب تک انسان کے دل میں غلبہ نہ پالے تو یہ مال ومتاع دینی و دنیوی امور میں معاون ومددگار رہے گا، اور اگر مال کی محبت دل کی گہرائیوں تک سرایت اور غلبہ کرے تو دل کیلئے ہلاکت وتباہی ہے۔

تو مرغوبات وخواہشات پر چلنے والا انسان کبھی حق تعالیٰ تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا، وہ اپنے دنیوی اغراض ومقاصد میں ایسا مقید رہے گا کہ دنیوی لذتوں سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع ضائع کرے گا۔ لیکن اگر یہ دانشمندی اور اتباعِ حق سے قرب ومقارنت اختیار کرے گا تو اس کی دنیا اور آخرت دونوں آباد رہیں گی، اور رضائے حق عزّ شانہ بھی اسے نصیب ہوگی۔ اللہ ربّ العزّت سبحانہ اپنے نیک بندوں کو دنیا اور اس کی لذتوں سے اسی طرح بچاتے دور رکھتے ہیں جس طرح تم اپنے مریضوں کو مضرتوں سے بچاتے پرہیز کراتے ہو۔ [الحدیث مشکوٰۃ]

آیت کریمہ میں دنیا کی چھ بڑی نعمتوں کو شمار کیا گیا کہ لوگ ان کی محبت میں بے تاب اور مست ہیں۔ یعنی عورتیں، اولاد، اور سونے چاندی کے ڈھیر، اور عمدہ گھوڑے، اور مال مویشی، اور کھیتی۔ اور ان کے مقابل آخرت کی

نعمتوں میں بظاہر تین نعمتوں کا یہاں تذکرہ ہوا: اوّل جنّت کے سرسبز گھنے باغات۔ دوسری پاک وصاف عورتیں۔ تیسری نعمت رضائے خداوندی۔

مفسرین حضرات رحمہم اللہ نے بیان کیا کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے جنّات اورازواج کا ذکر کیا، یہ دونوں چیزیں انسانی مرغوبات کی ہم جنس ہیں۔ جنتیں کھیتی کی جنس سے ہیں، اورازواج عورتوں کی جنس سے ہیں۔ اولاد کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ دنیا میں اولاد کا مقصد بقاءِ نسل اور زندگی کی مدد اور وراثت ہے، آخرت میں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔ اسی طرح گھوڑوں کا اور مویشی چوپایوں، اور سونے چاندی کا ذکر نہیں کیا، کیونکہ جنّت میں گھوڑوں وغیرہ کی سواری کی حاجت نہیں ہوگی۔ اور حصولِ زرسونے چاندی کے لئے جو بیع وشراء وغیرہ کی جاتی ہے جنّت میں اس کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔

آخر میں ایک ایسی عظیم الشان معطر نعمت کا اضافہ کیا، جس پر زیادتی ممکن نہیں ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی۔ پھر رِضْوَانٌ کو بصورتِ نکرہ لانے سے اشارہ کیا کہ اللہ ربّ العزّت سبحانہ کی رضامندی کی کوئی حد ہر سمجھ سے بالاتر ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اہل جنّت سے فرمائے گا: اے اہل جنت! جنتی جواب دیں گے: لَبَّیکَ رَبَّنَا وَسَعْدَیکَ وَالْخَیرُ فِی یَدَیکَ۔ اللہ تعالیٰ شانہ فرمائے گا: کیا میں اس سے بڑھ کر چیز تم کو نہ دوں؟ جنتی عرض کریں گے: اے ہمارے ربّ! اس سے بڑھ کر کیا چیز ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں تم پر اپنی خوشنودی نازل کروں گا، پھر کبھی تم پر غصہ نہیں کروں گا۔ [متفق علیہ]

میں کہتا ہوں: آیت کریمہ میں جنّات کا ذکر انسان کے تمام مرغوبات کے دوش بدوش واقع ہوا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ﴾ [الزخرف: ۷۱] (اور جنت میں ہر وہ چیز ہوگی جس کی دلوں کو خواہش ہوگی، اور جس سے آنکھوں کو لذت حاصل ہوگی)۔ اولاد واقرباء سب جنّت میں جمع ہوں گے، اور سب کے ساتھ ہمیشہ ملاقات رہے گی۔ اللہ کا دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُم بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُم مِّنْ عَمَلِهِم مِّن شَيْءٍ﴾ [الطور: ۲۱]

(اور جولوگ ایمان لائے ہیں، اوران کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کی پیروی کی ہے، تو ان کی اولاد کو بھی ہم انہی کے ساتھ شامل کردیں گے، اوران کے عمل میں سے کسی چیز کی کمی نہیں کریں گے)۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اولاد آنکھ کی ٹھنڈک اور دل کا کامل سرور ہوتی ہے، تو کیا جنتیوں

کے بچے پیدا ہوں گے؟ فرمایا: جنتی مؤمن جب اولاد کی خواہش کرے گا تو ایک ہی ساعت میں استقرارِ حمل، وضعِ حمل (بلا تعب و تکلیف) اور سنِ بلوغ و کمال اس کی خواہش کے مطابق فوراً ہوجائے گا۔ [ترمذي وقال حديث حسن، ورواه البيهقي أيضاً] حدیث کا مقصد یہ نہیں ہے کہ جنتی جنّت میں اولاد کی خواہش کرتے ہیں، بالفرض اگر ایسا معاملہ پیش آ بھی جائے تو تکمیلِ خواہش میں دیر نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم

رہے چاندی سونے کے ڈھیر، تو یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک جنّت ایسی بنائی ہے جس کی ایک اینٹ چاندی کی، ایک اینٹ سونے کی، اور گارا مشک کا ہے۔ رواه البزار والطبراني والبيهقي عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه عن النبي الكريم. اور ایک مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ دو جنّتیں چاندی کی ہیں، جن کے برتن اور اندر کی تمام چیزیں چاندی کی ہیں، اور دو جنتیں سونے کی ہیں، جن کے برتن اور ان کے اندر کی تمام چیزیں سونے کی ہیں۔ [رواه البخاري ومسلم من حديث أبي موسى]

باقی گھوڑوں، مویشی اور چوپایوں کا جنّت کے اندر ہونا، تو یہ بھی ثابت ہے۔ ایک اعرابی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے گھوڑوں سے محبت ہے، کیا جنّت میں گھوڑے ہوں گے؟ فرمایا: جب تم جنّت میں داخل ہو گے تو تمہارے سامنے یاقوت کا گھوڑا لایا جائے گا، جس کے دو بازو (پَر) ہوں گے، تم کو اس پر سوار کیا جائے گا، وہ تم کو تمہاری مرضی کے موافق اڑا کرلے جائے گا۔ [ترمذي والبيهقي والطبراني عن أبي أيوب وأبي بردة وغيرهم]

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے سیفی بن مانع رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت کی آسائشوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جنتی باہم ملاقات کے لئے اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر جائیں گے، اور جمعہ کے روز ان کے سامنے زین پوش گھوڑے لائے جائیں گے، جن کی لگامیں لگی ہوں گی، وہ لید اور پیشاب نہیں کریں گے، جنتی ان پر سوار ہو کر جہاں اللہ تعالیٰ چاہے گا پہنچ جائیں گے۔

اور ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ اور ابو الشیخ رحمۃ اللہ علیہ اور اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ جنّت میں ایک درخت ہے جس کی بالائی (چوٹی) سے لباس کے جوڑے، اور نچلے حصے سے سونے کے اَبلق گھوڑے پیدا ہوں گے، جن کی زینیں اور لگامیں موتی اور یاقوت کی ہوں گی، اور ان کے پَروں والے بازو بھی ہوں گے، ان کا ایک پَر بقدرِ رسائی نگاہ ہوگا، وہ لید اور پیشاب نہیں کریں گے، ان پر اولیاء اللہ سوار ہوں گے، اور جہاں چاہیں گے گھوڑے انہیں اڑا کرلے جائیں گے۔ نیچے والے کہیں گے: انہوں نے تو ہمارا نور ماند کردیا، اللہ تعالیٰ، یا

فرشتہ کہے گا: یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرتے تھے، اور تم نے خرچ نہیں کیا، یہ جہاد کرتے تھے، اور تم بیٹھے رہتے تھے۔

ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ جنّت میں عمدہ گھوڑے، اور اعلیٰ اونٹیاں ہوں گی، جن پر جنتی سوار ہوں گے۔ اور ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کم سے کم مرتبہ والا جنتی وہ ہوگا جو ہزار در ہزار غلمانِ جنّت کے ساتھ سرخ یاقوت کے گھوڑوں پر سوار ہوگا، اور ان گھوڑوں کے باز و سونے کے ہوں گے۔ [مظہری]

رہا کھیتی کا تذکرہ، تو اس سلسلے میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ سید کائنات نے فرمایا کہ ایک جنتی اپنے ربّ سے کھیتی کرنے کا مطالبہ کرے گا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تیرا ہر مقصد تیری خواہش کے مطابق پورا نہیں ہے؟ وہ جنتی عرض کرے گا: کیوں نہیں، لیکن میں کھیتی کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ وہ کاشت کرے گا، مگر پلک جھپکنے سے پہلے کھیتی بن کر تیار ہوگی، اور کاٹنے کے قابل ہوجائے گی، اور پہاڑوں کی طرح اس میں نمو آجائے گی۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: لو ابن آدم! تجھے کسی چیز سے سیری نہیں ہوتی۔ ابو الشیخ اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہما نے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔ اس روایت میں اتنا اور بھی ہے کہ کھیتی کی ایک ایک بالی بارہ ہاتھ کی ہوجائے گی، اور وہ شخص اپنی جگہ سے ہٹنے بھی نہ پائے گا کہ پہاڑوں کے برابر غلّہ کا ٹیلہ تیار ہوجائے گا۔

جنّت کی نعمتوں میں ازواج کے ہر مقام پر خصوصی تذکرہ کی غالبًا وجہ یہ ہے کہ نعمتیں اور راحتیں بغیر رفیقۂ حیات اور مونس و شریکِ حیات کے بے معنی اور تلخ معلوم ہوتی ہیں۔ اگر ہزاروں نعمتوں میں، ہر قسم کی خوشحالیوں میں بیوی اور مونس ساتھ نہ ہو تو ایک قسم کی عجیب غیر ارادی وحشت محسوس ہوتی ہے۔ جب تک حضرت حواء علیہا السلام کی تخلیق نہیں ہوئی حضرت آدم علیہ السلام ایک وحشت محسوس کرتے رہے، اور بے سکونی میں رہے۔ ﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً﴾ [الروم:۲۱] (اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھی ہے) کا اشارہ اسی جانب ہے۔ سید کائنات نے نیک بیوی کو تمام نعمتوں میں بڑی نعمت قرار دیا۔

ازدواجی زندگی کو اگر دیکھا جائے تو دنیا میں بھی اس کی بڑی شہرت اور منقبت و شرف ہے۔ بسا اوقات بیوی کی موت شوہر کی زندگی اور تمام مسرتوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ شریکِ حیات کے بغیر جنتی زندگی میں نہ سکون و لطف رہے گا، نہ طمانینت و خوشحالی۔ خلاصہ یہ ہے کہ بغیر رفیقۂ حیات کے ساری نعمتیں بے مقصد شمار

ہوں گی۔

باقی رہی اولاد، تو اہلِ جنّت کو عموماً اولاد کی خواہش نہیں ہوگی، بکھرے موتیوں کی طرح غلمان جنّتیوں کو اولاد کی خواہش سے مستغنی بنائیں گے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ جب جنّت کے اندر مؤمن اولاد کا خواہشمند ہوگا تو فوراً اولاد ہو جائے گی، جیسے پہلے بیان ہوا، مگر جنتی اولاد کا خواہشمند ہی نہ ہوگا۔ [ترمذي، دارمي]

اللہ تعالیٰ نے آخر میں ایک ایسی نعمتِ عظیم کا ذکر فرمایا ہے جو دنیوی اور اخروی تمام نعمتوں سے عظیم بھی ہے اور اعلیٰ واشرف بھی، جس کے مقابلے میں جنّت اور جنتی انعامات ہیچ ہیں، اور پست تر، وہ ہے حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی رضاوخوشنودی۔

جس طرح ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ کی ذات سب سے اکبر اور بڑھ کر ہے، جس کا اقرار واعتراف پانچوں اوقات کی اذان میں اعلان کر کے کیا گیا ہے "اللہ أکبر" اور اسی کے ساتھ ہر نماز کے افتتاح کے ساتھ "اللہ أکبر" جاری ہی رہتا ہے، اور نماز کی حرکات وسکنات میں یہی وظیفہ جاری رہتا ہے۔ قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ [المدثر: ۳] (اور اپنے پروردگار کی تکبیر کہو) ﴿وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا﴾ [الإسراء: ۱۱۱] (اور اس کی بڑائی بیان کرو، بڑائی بیان کر کے) ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللهِ أَكْبَرُ﴾ [التوبة: ۷۲] (اور اللہ کی رضا بڑی چیز ہے)۔ اسی تکبیر و تعظیم کے ساتھ اس کی خوشنودی اور رضا بھی نہایت عظیم اور بلند درجہ کا حامل ہے۔ مشہور دعاء ہے: اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْـأَلُکَ رِضَاکَ وَالْجَنَّۃَ وَنَعُوْذُبِکَ مِنْ سَخَطِکَ وَالنَّار. اَللّٰھُمَّ آمین

خلاصہ یہ ہے کہ جنّت اور اس کی بے شمار نعمتیں حادث اور مخلوق ہیں، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضوان یہ باری تعالیٰ کی صفتِ ذاتی ہے، اور ذاتِ الٰہی کے ساتھ قائم، ازلی وابدی ہے، اسی کی برکت وطفیل سے جنّت کی تخلیق ہوئی ہے، اور اسی کے طفیل جنّتیوں کو جنّت اور اس کی نعمتوں سے نوازا جاتا ہے۔ دراصل جنّت اسی صفتِ رضوان کا پرَتو اور ثمرہ ہی ہے۔

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ﴾ مرغوب چیزوں کی محبت کو لوگوں کے لئے مزین کیا گیا ہے، عورتوں سے، یہ مرغوبات کا اوّل نمبر ہے۔ دوسرے نمبر پر اولاد ہے۔ مرد وزن کا فطری رُشتہ اللہ تعالیٰ نے عجیب بنایا ہے، فرمایا: ﴿لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا﴾ [الروم: ۲۱] تم ان کے ذریعہ سکون وراحت حاصل کرو۔ ﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ [الروم: ۲۱] اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان محبت ومہربانی کا جذبہ پیدا فرمایا۔ ﴿هُنَّ

﴿لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾[البقرة:۱۸۷] وہ تمہارے لباس وسببِ عفت ہیں، اور تم ان کے لئے عفت وذریعہٗ پاکدامنی ہو۔ ﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ﴾[البقرة:۲۲۳] تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔ اور حسنِ معاشرہ عورتوں کے ساتھ وابستہ ہے، وہ تمہارے لختِ جگر پیارے بچوں کی ماں اور مُربی ہے۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ۔ دنیا کی مفید اشیاء میں سے نیک عورت سب سے زیادہ فائدے والی چیز ہے۔ یہاں تک عورت کے فوائد ومحاسن کا بیان ہوا، کہ عورت ایک نعمت ضرور ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ اعتدال اور فطرت کے تقاضوں کو پامال نہ کرے، اور تم بھی اس کی محبت میں اعتدال اور شرعی حدود کی پاسداری کرو۔ اگر تم نے اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تو یہی صنفِ نازک تمہاری تباہی کا سبب بن کر تمہیں ابدی نعمتوں سے محرومی کا باعث بنے گی، کیونکہ عورت فتنہ اور تباہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلنِّسَاءُ حَبَائِلُ الشَّيْطَانِ۔ عورتیں شیطان کا جال ہیں، انہی کے ذریعہ شیطان لوگوں کو شکار کرتا ہے۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اپنی امت میں عورتوں سے بڑھ کر کوئی خطرناک فتنہ چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ یعنی مردوں کے حق میں سب سے خطرناک فتنہ عورتوں کی طرف سے ہے۔ اسی طرح ارشاد فرمایا: إِذَا كَانَ أُمَرَاءُكُم خِيَارَكُم وَ اَغْنِيَاءُكُم سُمَحَاءَكُم وَ أُمُورُكُم شُورَى بَيْنَكُم فَظَهْرُ الْأَرْضِ خَيْرٌ لَكُم مِنْ بَطْنِهِ. یعنی جب تمہارے حکام پسندیدہ لوگ ہوں، اور تمہارے دولت مند سخی وغریب پرور ہوں، او تمہارے کام آپس کے مشورہ سے طے ہوں، تو ایسی حالت میں تمہارا زمین کے اوپر رہنا، یعنی زندہ رہنا زمین کے اندر چلے جانے، یعنی مرنے سے بہتر ہے۔ ہاں اگر معاملہ اُلٹ جائے، یعنی إِذَا كَانَ أُمَرَاءُكُم شِرَارَكُم وَ اَغْنِيَاءُكُم بُخَلَاءَكُم وَ أُمُورُكُم إِلَى نِسَاءِكُم فَبَطْنُ الْأَرْضِ خَيْرٌ لَكُم مِنْ ظَهْرِهَا. [ترمذی]

یعنی اگر تمہارے حاکم شریر قسم کے لوگ ہوں، اور تمہارے مالدار بخیل ہوں، اور تمہارے معاملات عورتوں کے سپرد ہوں، اور ان کے ذریعہ سے طے پاتے ہوں، تو تمہارے لئے زمین کے اندر چلے جانا، یعنی مرجانا زمین کے اوپر رہنے سے، یعنی زندہ رہنے سے بہتر ہے۔ یعنی ایسے حالات میں تمہارا مرنا ہی بہتر ہے۔ [الحدیث]

﴿وَالْبَنِيْنَ﴾ یعنی اولاد کی محبت جو کہ فطری اور غیر اختیاری ہے۔ اور مال واولاد کو دنیوی زندگی کے لئے زینت قرار دیا گیا ہے، ارشاد ہے: ﴿اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾۔[الکھف:۴۶] (مال اور بیٹے دنیا کی زندگی کی زینت ہیں)۔ مگر یہ بھی ارشاد ہے: ﴿اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾[التغابن:۱۵] (بیشک

تمہارے مال اور تمہاری اولاد فتنہ ہیں)۔ اولاد کی محبت میں اگر اعتدال ہو، اور حدود اللہ کے اندر ہو، تو یہ محمود بھی ہے، اور ہزاروں فوائد پر مشتمل بھی ہے۔ اگر اعتدال اور قیودِ شرع سے باہر ہو، تو خسارہ اور نقصان ہی اس کا ثمرہ ہوگا۔

مرغوبات کی تیسری چیز ﴿وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ﴾ سونے چاندی کے جمع کئے ہوئے ڈھیر مال۔ یہ جمع شدہ مال اگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے پاس ہو تو کیا سے کیا فوائد وثواب پر منتج ہوں گے؟ اور اگر قارون کا مال ہو، تو ہلاکت وتباہی کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا۔

﴿الْقَنَاطِيْرِ﴾ جمع ہے اَلْقِنطَار واحد ہے۔ معنی ہیں: ڈھیروں، انبار، مالِ کثیر۔ قِنطَار کی لفظی ساخت بلندی کے مفہوم کو چاہتی ہے، اسی لئے بڑے پُل اور اونچی عمارت کو قَنطَرۃ کہتے ہیں۔ مال کو ایک جگہ جمع کر کے اگر ڈھیر لگا دیا جائے تو وہ بھی اونچا ہو جائے گا، اسی مناسبت سے قِنطَار کے معنی مالِ کثیر ہو گئے۔ [قاموس]

لیکن کثرت مال (ڈھیر) کی حدود ومقدار کیا ہونی چاہئے؟ جس کو قِنطَار کہا جاسکے، اس میں اہلِ لغت کا اختلاف ہے، اور مختلف اقوال ہیں، اور ہر ایک کا کوئی نہ کوئی ماخذ ہے۔ مثلاً چالیس اوقیہ سونا، یا ہزار اوقیہ سونا، یا ہزار دینار، یا بارہ سو دینار، یا ستر ہزار دینار، یا اسی ہزار دینار، یا سو رطل سونا، یا سو رطل چاندی، یا گائے کی کھال بھر سونا، یا چاندی۔ یہ سب اقوالِ قدیمہ ہیں۔ آج کل عربی اوزان میں سو رطل وزن کا نام قِنطَار ہے۔ [معجم] آیت میں علماء تفسیر نے مالِ کثیر مراد لیا ہے، یہی مالِ کثیر بدونِ تعیینِ مقدار اقرب الی الصواب ہے۔ [لغات القرآن: ج ۵]

﴿وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ﴾ خوب پالے ہوئے نشان زدہ گھوڑے۔ اعلیٰ نسل کے عمدہ، بلند اور قد آور گھوڑوں کی پیشانی پر نشان لگوانے کا رسم بہت قدیم زمانے میں رائج رہا ہے، چنانچہ آج کل بھی عربی ممالک میں اس کا رواج ہے۔

﴿وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ﴾ محبوب ومرغوب اشیاء میں جانوروں، مویشی، گائے، بیل، بھینس، اونٹ بھیڑ بکریوں کا حسبِ مراتب بڑا دخل ہے۔ دودھ، گوشت، پشم، کھال کے فوائد کے علاوہ افزائشِ نسل، سواری، بار برداری، خرید وفروخت، مال، روپیہ کمانے کی خاطر تقریباً تمام ممالک میں مالداری کا پیشہ اپنے عروج پر ہے۔ انہی مویشی کے ذریعہ مالدار لوگ کروڑوں کا کاروبار کرتے ہیں، اور بے شمار دولت وسرمایہ اکٹھا کرتے ہیں۔ اسی طرح پورے عالم میں کھیتی، سبزی، باغات، فروٹ وپھل کا، اور گندم، گنے جوار، مکئی بے شمار اقسام دال وچاول وغیرہ اشیاء کی پیداوار پر سارے جہاں کے معاش وحیات کا دارو مدار ہے۔ اور جو ممالک زرعی لحاظ سے خود کفیل ہوتے ہیں، وہاں کی آبادی

اور عوام بڑے خوشحال ہوتے ہیں، اور مہنگائی کے عفریت سے محفوظ رہتے ہیں۔

﴿ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ یہ چیزیں صرف دنیوی زندگی کی خوشحالی کے لئے کارآمد ہیں، جبکہ اصل مقصد آخرت ہے۔ اگر ان چیزوں کا رخ آخرت کی طرف موڑ کر صدقات وزکوٰۃ، انفاق فی سبیل اللہ پر کمربستہ رہے تو نِعمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ کے مصداق قرار پائے، اور ہر قسم کی ہلاکتوں سے محفوظ رہے، ورنہ تباہی کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا۔

﴿وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ﴾ اصلی دائمی، بہترین ٹھکانا تو مالک الملک جل شانہ کے پاس ہے، اس کا ذریعۂ حصول ایمان، عملِ صالح، صدقات اور رجوع الی الآخرت ہی ہے۔ مرغوبات کا دلدادہ وہاں تک شاید رسائی حاصل نہ کر سکے، اور ساری مرغوبات کو یہاں چھوڑ کر خالی ہاتھ جانے کا انجام بہت ہی برا ہوگا، اور یہ مقامِ عبرت ہے۔

﴿حُبُّ الشَّهَوٰتِ﴾ والی آیت کے نزول پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: يَارَبَّ الْعٰلَمِين! ہمارے لئے اس سے بہتر اور نفع بخش راستہ کونسا ہوگا؟ آپ ہماری رہنمائی فرمائیں۔ اس پر یہ آیت اتری:

﴿قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ﴾ کیا ان تمام فانی مرغوبات سے تمہیں بہتر اور دائمی چیز نہ بتادوں؟ وہ یہ ہے: ﴿لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں، اور اس کی نافرمانی اور ناراضگی سے ہمیشہ ڈرتے ہیں، ان کے لئے ان کے ربّ کے ہاں گھنے سرسبز باغات ہیں، جن کے نیچے رحمت کی نہریں ہمہ وقت بہتی رہتی ہیں، اور وہ ہمیشہ ان باغات میں رہیں گے، کبھی وہاں سے وہ نہیں نکالے جائیں گے۔ یہ باغات دنیوی مرغوبات سے کھربوں مرتبہ تمہارے لئے بہتر ہیں۔

﴿وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ اور پاکیزہ بیویاں ہوں گی جو ہر قسم کے جسمانی وروحانی عیوب ونقائص غلاظتوں سے پاک ہوں گی۔

جنّت کا مختصر تعارف:

(۱)......قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: اَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَاَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ۔ قَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ: اِقْرَؤُا اِنْ شِئْتُمْ: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَاءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [السجدة:۱۷] [متفق علیه] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا، کسی کان نے نہیں سنا، اور کسی انسان کے دل سے اس کا خیال تک نہیں گزرا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر چاہو تو (یہ آیت) پڑھ لو: (ترجمہ) سو کسی شخص کو خبر نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لئے خزانۂ غیب (جنت) میں موجود ہے۔

(۲)...... ایسی عظیم الشان جنّت جس کو اللہ تعالیٰ نے بذاتِ خود اپنے دستِ مبارک سے بنایا ہو، اور اپنے محبوب وعشاق، پسندیدہ وفرمانبرداروں کا مستقر وضیافت خانہ ٹھہرایا ہو، اور اس کی بادشاہی کو مُلکِ کبیر قرار دیا ہو، اور اس کی خوبیوں کو خود سراہا ہو، اور اس کو محاسن سے سجایا ہو، اور اس کو ہر عیب ونقصان، نیز ہر قسم کی فناء وزوال سے پاک کیا ہو۔ اگر تو اس کی زمین اور خاک کا پوچھے تو وہ کستوری اور زعفران کی ہے۔ اگر تو اس کی چھت کا پوچھے تو عرشِ رحمٰن کی ہے۔ اگر تو اس کی لپائی کے گارے کا پوچھے تو وہ خالص کستوری کی ہے۔ اگر تو اس کی بجری کا پوچھے تو وہ موتی اور جواہرات کی ہے۔ اگر تو اس کی عمارت کا پوچھے تو اس کی ایک اینٹ چاندی کی اور ایک انیٹ سونے کی ہے۔ اگر تو اس کے درختوں کا پوچھے تو اس کے درختوں کا تنہ سونے چاندی کا ہے، لکڑی کا نہیں۔ اگر تو اس کے ہزاروں پھلوں کا پوچھے تو نہایت اعلیٰ خوشبودار، بیحد لذیز، خوشذائقہ، بغیر گٹھلی، بغیر چھلکے، بہت عمدہ، خوشرنگ، بڑے بڑے مٹکے کے برابر، جھاگ سے زیادہ نرم، شہد سے زیادہ شیرین، لطف اور مہک سے بھرپور ہیں۔ اگر تو درختوں کے پتوں کا پوچھے تو وہ ایک باریک اور عمدہ ونفیس پوشاکوں سے بھی انتہادرجہ کے حسین ودلکش ہیں۔ اگر تو جنت کی نہروں کا پوچھے تو کچھ نہریں دودھ کی ہیں، کچھ شراب خالص کی ہیں، کچھ شہد کی ہیں، کچھ خالص اعلیٰ جنتی پانی کی ہیں، جن کی مثال نہ ہو۔ اگر تو جنتی طعام وغذا کا پوچھے تو وہ ہر قسم کے میوے ہیں، جو چاہیں پسند کریں، اور سینکڑوں اقسام کے پرندوں کے تازہ گوشت ہیں، جو اُڑتے ہوئے پرندوں کے ہیں، آلائشوں سے پاک ہیں۔

اگر تو ان کے پینے کی چیزوں کا پوچھے تو تسنیم، کافور، زنجبیل، سلسبیل کے خوشذائقہ مشروبات ہیں۔ اگر تو ان کے لباس کا پوچھے تو بے شمار دبیز نرم ونازک، باریک خالص ریشم کے ہیں۔ اور گر تو ان کے برتنوں کا پوچھے تو وہ سونے چاندی کے ہوں گے، شیشے کی طرح صاف کہ اندر کی چیز باہر سے نظر آئے گی۔ اگر تو جنّت کے دروازوں کی چوڑائی کا پوچھے تو دروازوں کے دو چوکاٹوں کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہے، اور اگر تو دروازوں کی تعداد کا پوچھے تو ہر نیک عمل کے بدلے الگ الگ دروازہ ہے۔ اگر تو جنّت کی روشنی کا پوچھے تو مسحور کن روشنی کا دور دورہ ہوگا، جو عرشِ الٰہی کی تجلیات سے پھوٹ کر ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ اگر تو جنّت کی ہوا کا پوچھے تو نہایت خوشبودار، ہزاروں مہکوں سے معطر معتدل ہوا ہوگی۔

اگر تو جنّت کے موسم کا پوچھے تو وہ ایک معتدل معلوم ہوگا، نہ سرد نہ گرم۔ اور اگر تو جنّت کے درختوں کے سایہ کا پوچھے تو ان میں سے ایک ہی درخت ایسا ہے کہ تیز رفتار گھڑ سوار اس کے سایہ کو سو سال تک قطع نہ کر سکے گا۔ اگر تو جنّت کی کشادگی کا پوچھے تو سب سے کم درجہ کا جنتی اپنی مملکت، تخت، محلات اور باغات میں دو ہزار سال کی مسافت تک چلتا رہے گا۔ اگر تو جنّت کے خیموں اور قبوں کا پوچھے تو ان میں سے ہر خیمہ جو موتیوں سے بنا ہوا ہے، اور ایسے خولدار موتیوں سے بنا ہوا ہے جس کی لمبائی ساٹھ میل ہے۔ اگر تو جنّت کے بالا خانوں اور کوٹھیوں کا پوچھے تو یہ ایسے بالا خانے ہیں جو ایک دوسرے کے اوپر بنائے گئے ہیں، جن کی اونچائی ہزاروں میلوں تک، اور ان کے نیچے نہریں ہیں، اور حدیثوں میں محلات کی بلندی کو ستاروں کی بلندی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

اگر تو جنتیوں کے بستروں، گدیلوں کا پوچھے تو نہایت عمدہ موٹے ریشم کے، اور خود بخود لفٹ کی طرح اوپر نیچے ہونے والا نظام ہوگا۔ اگر تو جنتیوں کی عمر اور قد و قامت کا پوچھے تو ان کی عمر ۳۳ سال کی ہوگی، اور قد و قامت ساٹھ ہاتھ، یعنی نوّے فٹ، اور سینہ کی چوڑائی سات ہاتھ، یعنی تقریباً ۹ فٹ کی۔

اگر تو ان کی خوبصورتی اور حسن کا پوچھے تو نہایت آبدار، سفید و سرخ، چودھویں چاند کی طرح۔ اگر تو جنّت کے خدام غلمانوں کا پوچھے تو وہ لڑکوں کی شکل میں نہایت خوبصورت، بکھرے موتیوں کی طرح ہوں گے، جن کے چہروں میں جنتیوں اور پوری جنّت کا عکس نظر آئے گا۔ اگر تو جنّت کی عمومی زندگی کا پوچھے تو ایک معصومانہ زندگی ہوگی، دنیا کے تمام امراضِ جسمانی اور روحانی بیماریوں سے پاک۔ وہ زندگی انبیاء کرام علیہم السلام کی مقدس حیاتِ طیبہ کا عکس و نمونہ ہوگی۔

غلاظتوں، ناپاکیوں، نجاستوں کا نام ونشان تک نہیں ہوگا، بلکہ تھوک ولعاب تک نہیں ہوں گے۔ رات دن اور سونا وغفلت کچھ بھی نہیں، ہر وقت بیداری خوشی کا دور دورہ ہوگا۔ تھکاوٹ اور طبیعت پر کسی قسم کے بوجھ کا تصور تک نہیں ہوگا۔ پریشانی تو دور کی بات ہے، اس کا تصور و خیال بھی نہیں ہوگا۔

سارے لوگوں کی زندگی پیغمبرانہ زندگی کی طرح بے داغ ہوگی۔ حوروں، غلمانوں، بیویوں، یعنی دنیوی جنتی حوروں (بیویوں) میں بغض، حسد، کینہ، سوکنوں والی عداوت کا نام ونشان اور تصور تک نہیں ہوگا۔ دنیوی جنتی عورتوں کو حوروں پر ستر ہزار مرتبہ برتری ہوگی۔ یہ ایمان واعمالِ صالحہ، صوم وصلوٰۃ اور دیگر عبادات کی بجا آوری کی وجہ سے ہوگی، کیونکہ حوروں کا دامن ان اعمالِ حسنہ سے خالی ہے۔ [قاله الإمام قرطبي رحمه الله]

اگر تو جنّت کی حوروں کا پوچھے تو سنو وہ نو خاستہ جوان ہم عمر عورتیں ہوں گی، جن کے اعضاء میں شباب وجوانی

نمایاں موجزن ومسرت افروز ہوگی، گلاب کے پھول سے زیادہ نرم ونازک ان کے رخسار ہوں گے، منظوم موتیوں کی شکل دانتوں میں سمارکھی ہوگی، کمر نرم ونازک ہوگی، جب چہرے کا جلوہ دکھائے تو سورج اس کے مکھڑے کی رعنائیوں میں لہلہاتا ہو، جب مسکرائے تو بجلی اس کے دانتوں سے چمک اٹھے۔

جب تیرا اس کی شیفتگی سے آمنا سامنا ہو، تو دو خوبصورت ستاروں کے مقالہ میں، تو جو جی میں آئے کہہ سکتا ہے، جب وہ جنتی سے ہمکلام ہوگی تو تُو دو محبوبوں کی باہمی گفتگو کے متعلق کیا گمان کرتا ہے؟ جنتی اس کے پھول جیسے رخسار میں دیکھے گا تو معلوم ہوگا کہ آئینہ میرے سامنے ہے، گوشت کے اندر سے ہڈی کے اندر کا مغز ستر جوڑے لباس کے اندر سے نظر آئے گا، اور اگر جنّت کی یہ دلہن زمینِ دنیا پر جھانک لے تو آسمان وزمین کی فضاء کو خشبو سے معطر کردے، اور تمام مخلوقات کی زبانوں کو کلمۂ تکبیر اور تسبیح پکارنے پر بے ساختہ مجبور کردے، اور اس کی وجہ سے دنیا کے دونوں کنارے سج جائیں، اور سورج کے انوار اور اس کی روشنی کو ایسے ماند کردے جس طرح سورج ستاروں کی روشنی کو ماند کردیتا ہے۔ اور روئے زمین پر بسنے والے اللہ تعالیٰ پر بیخود ہو کر ایمان لائیں۔ اور اس کے سر کا دوپٹہ دنیا اور اس کی سب چیزوں سے قیمتی ہے، قولہ تعالیٰ: ﴿كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ﴾ [الرحمن: ۵۸] (گویا وہ یاقوت اور مرجان ہیں)۔ وقولہ تعالیٰ: ﴿كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ﴾۔ [الصافات: ۴۹] (گویا وہ چھپے ہوئے انڈے ہیں)۔

[حادی الأرواح ابن قیم رحمہ اللہ]

﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ﴾ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خوشنودی اور رضامندی کی بے بہا دولت اور عظیم نعمت ان کو میسر آئے گی۔ ربّ العزّت جنتیوں کو سب کچھ عطا فرمانے کے بعد ارشاد فرمائیں گے: أُحِلُّ عَلَيْكُمْ رِضْوَانِي فَلَا أَسْخَطُ عَلَيْكُمْ بَعْدَهُ أَبَدًا۔ میں نے اپنی رضا تمہارے لئے حلال کی ہے، اور اب اس کے بعد تم سے کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ اہلِ لغت نے کہا کہ رضوان بڑی رضامندی کو کہتے ہیں، اور یہ ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، عام رضامندی پر رضوان کا اطلاق نہیں ہوتا۔

﴿وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ خوب دیکھ رہا ہے ان پرہیزگار بندوں کو جو کہتے ہیں: ﴿الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾۔ اے ہمارے ربّ! بلاشبہ ہم ایمان لائے، پس ہمارے گناہ بخش دے، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

﴿فَاغْفِرْ﴾ میں "فا" سببیت کے لئے ہے، یعنی کلامِ سابق کلامِ لاحق کے لئے علت ہے، مراد یہ ہے کہ ہم

ایمان لائے، اس لئے تو ہمارے گناہ بخش دے۔

اس آیت میں ثبوت ہے اس امر کا کہ محض ایمان مغفرت کا استحقاق پیدا کر دیتا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندوں پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ اس کی عبادت کریں، اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ بنائیں، اور اللہ تعالیٰ پر بندوں کا حق ہے کہ غیر مشرک کو وہ عذاب نہ دے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا میں لوگوں کو اس کی بشارت نہ دے دوں؟ فرمایا: لوگوں کو اس کی بشارت نہ دو، کہیں وہ اسی پر بھروسہ کر کے عمل چھوڑ نہ دیں۔ [متفق علیہ]

﴿اَلصّٰبِرِیْنَ﴾ صبر کرنے والے، نفس کی مخالفت پر جم جانے والے۔ یعنی مصائب پر بے صبر ہونے سے نفس کو روکنے والے، خواہشات اور بری باتوں سے پرہیز کرنے والے، نیکیوں پر صبر کرنے والے۔ یعنی: اَلصَّبرُ عَلَی الطَّاعَاتِ وَ الصَّبرُ عَنِ الْمَعْصِیَاتِ وَ الصَّبرُ عَلَی الْبَلِیَّاتِ۔ اس میں صبر کے تینوں معنی آ گئے ہیں۔

﴿وَالصّٰدِقِیْنَ﴾ عقائد، اعمال، گفتار، کردار، معاملات، شہادات، الغرض ہر عمل میں سچے اور صادق۔ سب سے بڑا سچا عمل کلمۂ توحید، اور تصدیقِ قلبی ہے، پھر سارے اعمال مراد ہیں۔

﴿وَالْقٰنِتِیْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کی عبادت پر قیام و پابندی کے ساتھ مداومت کرنے والے۔ دعاء اور انکساری کرنے والے۔

﴿وَالْمُنْفِقِیْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر نیک اور مستحق کاموں اور مسکین و محتاجوں پر مال خرچ کرنے والے، اس میں علم والے بھی آ گئے، جو علم کی تعلیم دیتے ہیں۔

﴿وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ ظاہری و باطنی طاعات کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں، اور معافی کے طلبگار رہتے ہیں۔ جس وقت ساری خلقت خوابِ غفلت میں محوِ استراحت ہے، وہ اجابت کے وقت خاص سحری کے اوقات میں بیدار رہتے، اور استغفار کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿كَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ [الذاریات: ۱۸] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب رات کی آخری تہائی باقی رہ جاتی ہے تو باری تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے، اور ارشاد فرماتا ہے کہ میں ہی سارے جہاں کا خود مختار بادشاہ اور مالک ہوں، ہے کوئی جو مجھ سے مانگے، میں اسے دے دوں؟ اور دعاء کرے میں اسے قبول کروں؟ رزق طلب کرے میں اسے عطا کر دوں؟ بخشش طلب

کرے میں اس کی مغفرت کردوں؟ ان چند باتوں کی تخصیص نہیں ہے، بلکہ جو کچھ مطالبہ ہو سب پورے ہوں گے۔ اور یہ ارشاد ہر رات کو ہوتا ہے۔ [متفق علیہ]

صحیح مسلم کی روایت میں اتنا اور ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ اپنے دونوں ہاتھ پھیلاتا ہے، اور فرماتا ہے: کون ہے قرض دینے والا ایسے شخص کو جو مفلس نہیں ہے، اور نہ ہی حق مارنے والا ہے؟ یہ ندا صبح کی پو پھٹنے تک مسلسل جاری رہتی ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت لقمان حکیم نے اپنے بیٹے سے فرمایا: بیٹے اس مرغ سے زیادہ عاجز نہ ہو، جو سحر کے وقت چیختار ہتا ہے، اور تو بستر پر پڑا سوتا ہوتا ہے۔

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ﴿اَلْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ سحر کا وقت صبح کے قریب ہی ہوتا ہے۔ اس لئے بِالْاَسْحَارِ فرمایا۔ حسن بصری رحمۃ اللہ نے آیت کی تشریح میں فرمایا: وہ سحر کے وقت تک نماز تہجد کو دراز کرتے ہیں، پھر استغفار کرتے ہیں۔ امام نافع رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رات کو (رات بھر) عبادت کرتے تھے، آخر میں مجھ سے پوچھتے نافع! کیا سحر ہوگئی؟ میں عرض کرتا: ابھی نہیں، آپؓ لوٹ کر پھر نماز پڑھنے لگتے، اور اگر میں کہہ دیتا: جی ہاں سحر ہوگئی، تو بیٹھ کر استغفار کرتے، اور صبح تک اس میں مشغول رہتے۔

صاحب تفسیر مظہریؒ فرماتے ہیں: ﴿اَلصّٰبِرِيْنَ﴾ سے مراد صوفیا، غازی، شہداء ہیں۔ ﴿اَلصّٰدِقِيْنَ﴾ سے مراد علماء کرام ہیں۔ ﴿اَلْقٰنِتِيْنَ﴾ سے مراد وہ زاہد ہیں جو نمازوں میں طویل قیام کرتے ہیں۔ ﴿اَلْمُنْفِقِيْنَ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو حلال مال کماتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ﴿اَلْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں جو غلطی کے بعد فوراً توبہ کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے، اگر تم گناہ نہیں کروگے تو اللہ تعالیٰ تم کو لے جائے گا (فنا کردے گا) اور تمہاری جگہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا، جو گناہ کریں گے، پھر گناہ کے بعد معافی کے طلبگار ہوں گے، اور ان کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ [رواہ مسلم] امام احمد اور ابویعلیٰ رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

☆ ☆ ☆

فائدہ:

واضح ہو کہ حدیث کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ لوگوں کو گناہ پر ترغیب ہو۔ تمام نصوصِ قرآنیہ اس پر ناطق ہیں کہ حتی المقدور گناہوں سے اجتناب ضروری ہے۔ حدیث کا مقصد یہ ہے کہ اگر سارے لوگ انبیاء کرام علیہم السلام کی طرح بے گناہ اور پاک ہوں گے تو استغفار، جو کہ ایک مستقل عبادت ہے، اس کا مقصد فوت ہو جائے گا، اور اللہ تعالیٰ شانہ کی صفتِ غفوریت، عفو و کرم اور توابیت کا مطلب پورا نہیں ہوگا، کیونکہ جب خلقت میں گناہ ہی ناپید ہوگا تو مغفرت کس کی ہوگی؟

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ
قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ؕ ۱۸

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ بجز اس کے کوئی معبود نہیں ہے، اس کی شان یہ ہے کہ وہ انصاف کے ساتھ کارخانۂ عالم کا انتظام کرنے والا ہے، اور فرشتوں نے بھی اس کی شہادت دی، اور اہلِ علم نے بھی اسی کا اقرار کیا، اس زبردست اور حکمت والے کے سوا کوئی معبود ہونے کے قابل نہیں ۱۸

معارف و منازل

سابقہ آیات میں توحیدِ الٰہی کا بیان ہوا ہے، مذکورہ آیت میں بھی توحیدِ خداوندی کا مضمون ایک خاص ناقابلِ تردید انداز سے بیان فرمایا گیا ہے، اور اس پر تین عظیم المرتبت شہادتوں کا ذکر ہے۔ ایک خود اللہ تعالیٰ شانہ کی شہادت، جو کائنات کی اربوں شہادتوں پر فائق اور بھاری ہے۔ دوسرے نورانی و پاکیزہ فرشتوں کی شہادت۔ تیسرے انبیاء و رُسل علیہم السلام، اور ان کے نائبین علماء کرام کی شہادت۔

☆ اللہ تعالیٰ کی شہادت تو بطورِ مجاز ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ کی ذات و صفات اور اس کے تمام مظاہر و مصنوعات اللہ تعالیٰ کی توحید کی کھلی نشانیاں ہیں۔ ؎

فَفِی کُلِّ شَیْءٍ لَهٗ شَاهِدٌ ★ یَدُلُّ عَلٰی اَنَّهٗ وَاحِدٌ

ہر گیاہے کہ از زمین روید ☆ وحدہٗ لاشریک لہٗ گوید

اس کے علاوہ اس کی طرف سے بھیجے ہوئے رُسل، اوران پر نازل شدہ آسمانی کتابیں بھی اس کی توحید پر شاہد ہیں، اور یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، تو گویا خوداس کی شہادت اس بات پر ہے کہ اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ﴾ [الأنعام: ۱۹] (کہو: کونسی چیز ایسی ہے جو گواہی دینے کے لئے سب سے اعلیٰ درجے کی ہو؟ کہو: اللہ (اوروہی) میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے، اور مجھ پر یہ قرآن وحی کے طور پر اس لئے نازل کیا گیا ہے)۔

اسی طرح ارشادفرمایا: ﴿سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ یَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ﴾۔ [فصلت: ۵۳] (ہم انہیں اپنی نشانیاں کائنات میں بھی دکھائیں گے، اور خود ان کے اپنے وجود میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ یہی حق ہے۔ کیا تمہارے ربّ کی یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز کا گواہ ہے؟)

☆ دوسری شہادت فرشتوں کی ذکر کی گئی ہے، جو نورانی پاکیزہ مخلوق ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے مقرب اور اس کے تکوینی امور کے منتظم اور کارندے ہیں۔ وہ سب کچھ جان کر، دیکھ کر، عرش سے لے کر فرش تک پھیلے ہوئے اپنے مشاہدے کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں ہے۔

☆ تیسری شہادت اہلِ علم کی ہے۔ اہلِ علم سے مراد انبیاء علیہم السلام اور ان کے ورثاء ونائبین سارے علماء حقانی ہیں۔ حضرت امام غزالی، امام رازی، حافظ ابن کثیر اور دیگر ائمہ کرام رحمہم اللہ نے فرمایا کہ اس میں علماء کرام کی بڑی فضیلت ومنقبت ہے کہ ربّ العزّت سبحانہ نے ان کی شہادت کو اپنی شہادت، اور فرشتوں کی شہادت کے ساتھ ذکر فرمایا، گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا تزکیہ ہوا، اور انہیں اپنی توحید پر گواہ بنا کر ان کی عزّت افزائی فرمائی۔ الحمد للہ

آیت کریمہ کے فضائل، اور شانِ نزول:

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے روایت کی کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی، اورآیت: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ﴾ اور ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ﴾ تا ﴿بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ پڑھا کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کے سب گناہ معاف فرمائیں گے، اوراس کو جنّت میں جگہ دیں گے، اوراس کی ستر (۷۰) حاجتیں پوری فرمائیں گے، جن میں سے کمترین حاجت اس کی مغفرت ہے۔ [روح المعانی] تفسیر مدارک میں ہے کہ جو شخص

سوتے وقت اس آیت کی تلاوت کرتا ہے وہ قیامت میں اس فضل کا مستحق ہوگا جو ابوایوب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ صوفیاء کرام رحمہم اللہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ گزشتہ تینوں آیتوں کی فرض نماز کے بعد تلاوت کرنے کے طفیل خاتمہ بالخیر کی سعادت نصیب ہوگی۔

مسند احمد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات میں یہ آیت تلاوت کی، اور اس کے بعد فرمایا: وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکَ مِنَ الشَّاهِدِیْنَ۔ امام سلیمان بن مہران اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جو شخص اس آیت کی تلاوت کے بعد یہ کہے: ﴿وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکَ مِنَ الشَّاهِدِیْنَ۔ تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرشتوں سے فرمائیں گے کہ میرے بندے نے ایک عہد کیا ہے، اور میں سب سے زیادہ عہد پورا کرنے والا ہوں، اس لئے میرے بندے کو جنّت میں داخل کردو۔ [ابن کثیر]

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے ائمہ رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ ملکِ شام سے دو عالم مدینہ طیبہ آئے، اور مدینہ طیبہ کی بستی دیکھ کر آپس میں کہنے لگے کہ جس بستی کا ذکر تورات میں ہے، معلوم ہوتا ہے یہ وہی بستی ہے، پھر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ آپ محمد ہیں؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: ہاں میں محمد ہوں، پھر عرض کیا آپ احمد ہیں؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا: ہاں میں احمد ہوں، پھر انہوں نے عرض کیا کہ آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں، اگر آپ نے صحیح جواب دیا تو آپ پر ایمان لائیں گے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا: پوچھو۔ عرض کیا: کتاب اللہ میں سب سے بڑی شہادت کونسی ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور آپ نے پڑھ کر انہیں سنائی۔ یہ دونوں یہودی عالم فوراً مسلمان ہوئے۔

﴿قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ کے معنی کئی طرح کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ قَآئِمًا کو لفظ "اللہ" سے حال رکھا جائے، دوم یہ کہ "اُولُوا الْعِلْمِ" سے حال بنایا جائے۔ پہلے والے معنی راجح ہیں، کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، چنانچہ ترجمہ میں اسی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

﴿قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ میں عیسائیوں کے مسئلۂ کفارہ کی طرف اشارہ ہے، اور اس کی تردید ہے کہ یہ کونسا عدل اور انصاف ہے کہ جرم زید سے سرزد ہو، اور سزا عمرو کو ہو۔ اور پھر یہ عمومی حماقت کہ تمام لوگوں کی سزا حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسی ہستی کو کفارہ کے طور پر دی جائے، جیسے سرکش عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ساری دنیا کے جرائم کی پاداش میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دیا گیا۔ آخر یہ فیصلہ کس نے کیا؟ وہ کہتے ہیں کہ پیشکش عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ہوئی، اور منظوری

اللہ تعالیٰ نے دیدی، کہ یہ معصوم شخص ساری دنیا کے گناہگاروں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ سُبحانکَ هٰذا بُهتانٌ عَظِیم. قَالَ اللّٰہ تعالیٰ: ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ [الأنعام: ۱۶۴] (اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا)۔ ربّ العزّت قدوس وعادل اس قسم کی گستاخیوں اور بے انصافیوں سے پاک ومنزہ ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾

ترجمہ: بیشک دین تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے، اور اہلِ کتاب نے جو اسلام کے بارے میں اختلاف کیا، تو ایسی حالت کے بعد اختلاف کیا کہ جب ان کو اسلام کا حق ہونا معلوم ہو چکا تھا، اور یہ اختلاف بھی آپس کے حسد کی وجہ سے کیا، اور جو شخص آیاتِ خداوندی پر ایمان لانے سے انکار کرے گا تو سن لو اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے ﴿۱۹﴾

معارف ومنازل

یہود اپنی یہودیت کو، اور نصاریٰ اپنی نصرانیت کو، اور مشرکین و دیگر اقوام اپنی بت پرستی اور وثنیت کو اصلی دین اور دینِ الٰہی کہا کرتے تھے، یہاں سے ان کے تمام مزعوماتِ باطلہ اور خیالاتِ فاسدہ کی تردید ہوگئی، کہ تمہارے سارے ادیان باطل ہیں، اور دینِ حق اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔ دوم سابقہ آیت میں علماء حق کا بیان ہوا، جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر شہادت دیتے ہیں، یہاں سے علماء سوء کا بیان ہے، کہ اسلام سے منحرف، اور توحیدِ الٰہی کے خلاف گواہی دیتے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ اہلِ کتاب کا کفر اور اسلام دشمنی کسی بے علمی کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ آسمانی ہدایات کے آنے کے بعد ان کا انکارِ اسلام دشمنی اور ضد وعناد پر مبنی ہے۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے کفر پر مصر ہیں۔ پہلے بیان ہوا: ﴿يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ﴾ [البقرة: ۱۴۶] (وہ آپ ﷺ کو پہچانتے ہیں، جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، اور بیشک ان میں سے ایک گروہ حق چھپاتے ہیں)۔ نصاریٰ نے یہود کی دشمنی میں، اور یہود نے نصاریٰ کی عداوت میں باہم اختلاف کیا، اور ایک فریق نے (یہود نے) حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور

انجیل کا انکار کیا، جبکہ دوسرے فریق نصاریٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات کا انکار کیا، یہ ہر دو فریق کا انکار کسی جہالت پر مبنی نہیں تھا، بلکہ محض ضد و عناد اور حسد پر مبنی رہا۔ پھر ان دونوں فریقوں نے ہٹ دھرمی اور حسد کی بناء پر خاتم الانبیاء ﷺ اور قرآن کریم اور اسلام دینِ الٰہی کا انکار کیا۔ پہلے ارشاد ہوا تھا: ﴿فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ﴾ [البقرۃ: ۸۹]۔ (پس جب ان کے پاس وہ چیز آگئی جس کو وہ پہچانتے تھے، تو اس کا انکار کیا)۔

ایسے کفار پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، جو عرصہ تک نبی آخر الزمان ﷺ کی تشریف آوری کے منتظر رہے، اور جوں ہی افقِ دنیا میں ان کی نبوّت کا سورج طلوع ہوا، تو سب سے پہلے یہی لوگ منکر و منحرف ہوئے۔ یہاں یہ سب کچھ نجران کے عیسائی وفد اور دیگر اہلِ کتاب، یہود و نصاریٰ کے سلسلے میں بیان کیا گیا ہے۔

پہلے بیان ہوا کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے، اور وہ ایک مخفی امر ہے، اور اسلام ظاہری احکام و اعمال کا نام ہے، جو فرمانبرداری اور عمل و اطاعت کی شناخت ہے، اور دین نام ہے ایمان و اسلام دونوں کے مجموعہ کا۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

﴿الْإِسْلَام﴾ کے معنی ہیں: سونپنا، تفویض کرنا، اطاعت کرنا، اپنے کو کسی کے سپرد کرنا، اور خود کو کسی کے حوالے کر کے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا، اس کے سامنے گردن ڈال دینا، اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری اور احکام کی بجا آوری کے لئے سر جھکا دینا۔ یہ سب اسلام کے معنی ہیں۔

﴿الدِّيْن﴾ دین کے معنی ہیں: طریقہ، روش۔ اصطلاحِ شریعت میں دین کے معنی ہیں: حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت خاتم الانبیاء ﷺ تک سب انبیاء علیہم السلام کا مشترک طریقہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے جامعِ کمالات اور تمام نقائص سے پاک ہونے پر، اور اس کے سوا کسی کا لائق عبادت نہ ہونے پر، دل و جان سے ایمان اور زبان سے اقرار کرنا۔ اسی طرح روزِ قیامت اور حساب و کتاب، جنّت و دوزخ پلِ صراط، اور جزاء و سزا پر دل سے ایمان لانا، تصدیق کرنا، زبان سے اقرار کرنا، اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے سارے انبیاء و رُسل علیہم السلام اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانا، اور سارے احکام کی تصدیق کرنا، وغیرہ۔ یہ سب دین کے معنی ہیں۔

﴿الشَّرِيْعَة﴾ شریعت، المنہاج، یا مذہب، جیسے ارشاد ہے: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا﴾ [المائدۃ: ۴۸] (تم میں ہر ایک کے لئے ہم نے ایک شریعت اور طریقہ مقرر کیا ہے)۔ یہ فروعی احکام کے نام ہیں، اور ہر نبی و رسول کی شریعت اور منہاج و احکام دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، مگر دین جس طرح بیان ہوا وہ ایک ہی

ہے، اور سب میں مشترک ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہے: اَلْأَنْبِيَاءُ أَبْنَاءُ عَلَّاتٍ دِيْنُهُمْ وَاحِدٌ وَأُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى۔ [بخاری] سارے انبیاء علیہم السلام علاتی بھائی ہیں، ان کا باپ (دین) ایک ہی ہے، اور ان کی مائیں (شریعت) مختلف ہیں۔

اب اگر اسلام کو بھی دین کی طرح عمومی لغوی معنی پر رکھا جائے، تو یہ کہنا پڑے گا کہ سارے انبیاء علیہم السلام کا اسلام اور دین ایک ہی مشترک ہے۔ مگر عام طور پر ایسا نہیں ہے، کیونکہ لفظِ دین کے اشتراک میں کلام نہیں ہے، مگر اسلام خصوصیت کے ساتھ اس دین وشریعت پر بولا جاتا ہے جو سب سے آخر میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے ہیں، جس نے پچھلی تمام شرائع واحکام اور آسمانی کتب کو منسوخ کر دیا، اور یہی دینِ اسلام قیامت تک اللہ تعالیٰ کا واحد دین اور ذریعۂ نجات رہے گا۔

پس یہ اس معنی کے اعتبار سے صرف دینِ محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آخری خیر اُمّت کے لئے مخصوص ہوگا، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾. [آل عمران:۸۵] (اور جو تلاش کرے گا اسلام کے علاوہ کوئی اور دین، تو ہرگز اس سے قبول نہیں کیا جائے گا، اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا)۔ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [المائدۃ:۳] (آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی، اور تمہارے لئے اسلام کو دین کے طور پر پسند کر لیا)۔ ﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا﴾۔ [الحج:۷۸] (اپنے باپ ابراہیم کے دین کو مضبوطی سے تھام لو، اس نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا)۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہر نبی کے زمانہ میں ان کا لایا ہوا دین ہی دینِ اسلام، اور عند اللہ مقبول تھا، جو بعد میں یکے بعد دیگرے منسوخ ہوتا چلا آیا۔ (نسخ في الأحكام لا في أصل الدين)۔ آخر میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین اسلام ہی دینِ اسلام کے نام سے مخصوص ہوا، جو قیامت تک بلا نسخ اور بلا کسی تبدیلی کے قائم رہے گا۔ اگر اسلام کے دوسرے معنی لئے جائیں جو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر تشریف لائے، تو آیت میں تخصیص نہیں ہوگی، بلکہ مفہوم یہ ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں صرف وہی اسلام مقبول ہے جو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ہے۔ پچھلے ادیان کو بھی اگرچہ ان کے اوقات میں اسلام کہا جاتا تھا، مگر اب وہ منسوخ ہو چکے ہیں۔ اور دونوں صورتوں میں

نتیجۂ کلام ایک ہی ہے کہ ہر پیغمبر کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول دین وہ اسلام ہے جو اس پیغمبر کی وحی اور تعلیمات کے مطابق ہو، اس کے سوا دوسرا کوئی دین مقبول نہیں ہے، خواہ وہ پچھلی منسوخ شدہ شریعت ہی ہو، اگلے زمانے کے لئے وہ اسلام کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

شریعتِ ابراہیم علیہ السلام ان کے زمانے میں اسلام تھی، موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اس اسلام اور شریعت کے جو احکام منسوخ ہو گئے وہ اب اسلام نہیں رہے۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں شریعت موسویہ کا اگر کوئی حکم منسوخ ہوا ہے تو وہ اب اسلام نہیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں اگر شرائعِ سابقہ کے جو احکام منسوخ ہو گئے وہ اب اسلام نہیں رہے، اس لئے جو امت قرآن کریم کی مخاطب ہے، اس کے لئے اسلام کے معنی عام لئے جائیں، یا خاص، دونوں کا حاصل یہی ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد صرف دینِ اسلام کہلانے کا مستحق وہ ہے جو قرآن کریم اور سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ہو، اور وہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے، اس کے سوا کوئی دین مقبول اور ذریعۂ نجات نہیں ہے۔

یہ مضمون قرآن کریم کی بے شمار آیات میں مختلف عنوانات سے آیا ہے۔ ایک آیت کے الفاظ میں اس طرح وارد ہے: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ [آل عمران: ۸۵] یعنی جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ ہرگز اس سے قبول نہیں کیا جائے گا، اور وہ اس کے تابع جو عمل کرے گا وہ ضائع ہو جائے گا۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَوْ كَانَ مُوْسىٰ حَيًّا مَا وَسِعَهُ اِلَّا اتِّبَاعِي. [رواہ أحمد رحمہ اللہ] اگر موسیٰ علیہ السلام میرے زمانہ میں زندہ ہوتے تو اس کے لئے بھی میری پیروی کے سوا چارہ نہ ہوتا۔

نجاتِ اخروی صرف اسلام میں منحصر ہے:

عام سوسائٹی اور انسانی عقل جو مذہب بھی تجویز کرے گی اس میں ہرگز اتنی جامعیت نہیں ہوگی، اور نہ ہی وہ تمام مخلوقات کے حقوق اور بشری تقاضوں اور ضروریات کو پورا کر سکتا ہے، جو خود خالقِ کائنات اور مالک عباد اپنے بندوں کے لئے تجویز کر چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خالقِ کائنات نے کائنات کے لئے اپنا محبوب و پسندیدہ جامع دین و شریعت اسلام کو قرار دیا ہے، اور اسی کو اپنی مخلوقات کی بھلائی کے لئے ابدی طریقۂ حیات اور مدارِ نجات قرار دیا ہے، اور اہلِ کتاب و دوسرے مذاہبِ باطلہ اور تمام ملحدانہ نظریات کا قلع قمع کیا ہے۔

بعض ملحد لوگ ہر زمانہ اور ہر عصر میں یہ سمجھانے اور الحاد پھیلانے کی کوششوں میں مصروف رہے ہیں کہ کسی بھی

صورت میں کائنات کے خالق و مالک کے ساتھ تعلقات جوڑنے کا نام دین ہے، خواہ وہ یہودیت کی شکل میں ہو، یا عیسائیت، یا بدھ مت، یا بت پرستی و ستارہ پرستی کی شکل میں، طریق و طرز اعمال و عقائد خواہ کچھ بھی ہوں، مگر مرکز اور بنیاد اللہ تعالیٰ ہی ہو۔

آج کل قادیانیت، پرویزیت اور کچھ نام نہاد مسلمان، جو مغرب کے اصولوں اور نظریات کے دلدادہ ہیں، وہ سب یہی کہتے ہیں کہ مدارِ نجات صرف اسلام نہیں ہے، بلکہ دوسرے باطل نظریات پر چلنے والے بھی نجات پا سکتے ہیں، کیونکہ انسانیت کی خدمت جس انداز سے اسلام نے کی ہے، بلکہ اس کو اس زمانہ میں دوسرے مذاہب بھی اسی طرح احسن طریقے سے انسانیت کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ایسے ملحدوں کو غلط فہمی یہ ہوئی کہ انہوں نے انسانی خدمت اور خدائی خدمت میں فرق نہیں کیا۔

اسلام دراصل انسانی خدمات کی انجام دہی کا نام نہیں ہے۔ اسلام تو حید و رسالت اور عقیدۂ آخرت کا نام ہے، اور اسی کی روشنی میں انسانی خدمات انجام دینے سے تمام ظلم و زیادتیاں، بے انصافیاں ختم ہو سکتی ہیں۔ یہ نہیں کہ پورے عالم کو بارود کا ڈھیر بنا کر، جرائم و معاصی کی کھلی آزادی اور اجازت دے کر، ان کے پیچھے چند ایک اصلاحی سماجی رفاہی کام انجام دے کر، اپنی نجات کا فیصلہ کرنا حماقت و نادانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اگر آج بر قسمت پورے کرۂ ارض پر ایک روز کے لئے اسلام کا عادلانہ نظام ہو تو مدعیانِ شرافت کے تمام غرور و دعاوی ہمیشہ کے لئے ختم ہوں۔

غیر مسلم خواہ کوئی بھی ہو اگر تمام جہاں کے حقوق کی پاسداری کر کے پورے معاشرہ کو جنت نظیر کیفیت میں تبدیل کرے، خالقِ کائنات کا اس کے حق میں یہی فیصلہ ہے کہ وہ ابدی جہنمی ہے، اور اس کے سارے کرتے دھرتے ضائع اور غیر مفید رہیں گے، جبکہ ادنیٰ مسلمان کا ادنیٰ عمل بوجہِ اسلام پہاڑوں جتنا ثواب کے برابر ہوگا۔ اور اس کے ہر عمل کی قدردانی اور بڑی پزیرائی ہوگی۔ قران کریم کی ان آیات اور دیگر بے شمار آیات نے کھول کر وضاحت کی ہے کہ اسلام اور اسلامی عقائد و اعمال میں غیر اسلامی عقائد و اعمال کی پیوندکاری نہیں ہو سکتی، یا خالص اسلام ہوگا، یا خالص کفر، کوئی مرکب چیز ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔

اسلام اپنے زرین اصول و قواعد میں نہ کسی تبدیلی کی اجازت دیتا ہے نہ کسی پیوندکاری کی، اسلام نے واضح کیا کہ رات اور دن، سردی اور گرمی، اچھائی اور برائی ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح کفری اعمال بھی اسلامی اعمال سے ہر حال الگ تھلگ رہیں گے، جو شخص اصولِ اسلام میں سے کسی ایک چیز کا منکر ہوگا، وہ اسلام کا باغی قرار پائے گا،

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ [البقرة:۲۰۸] کی تفسیر میں وضاحت کے ساتھ بیان ہوا۔

اسی طرح فروعی مسائل میں، اور انسانی خدمات اخلاق اور اعمال میں اگر کوئی شخص بہت ہی آگے اور ضرب المثل ہوگا، تو وہ اس صورت میں نجات یافتہ متصور ہوگا جب وہ اصولِ اسلام کا پابند و معتقد رہے گا۔ پس اہلِ کتاب اور ان کے ہم نشیں حاشیہ بردار، نام نہاد مسلمانوں کے لئے صرف یہی ایک فیصلہ ہے کہ تمہارے سارے اعمال، سماجی، رفاہی اخلاقی، انسانی خدمات اس وقت قبول اور کارآمد رہیں گے جب تمہارا ایمان اور عقیدہ صرف اسلام پر ہو، اور غیر اسلامی تمام نظریات سے کسی قسم کا ربط و تعلق نہ ہو۔

یہاں اہلِ کتاب اور ان کے ہمنوالوگوں سے کہا جارہا ہے، اور ان کی سرکشی اور کفر پر انہیں تنبیہ ہو رہی ہے، فرمایا: ﴿وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ﴾۔ یعنی اہل کتاب نے حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کی نبوت، اور اسلام میں اختلاف اور جھگڑا ڈالا، تو وہ اس وجہ سے نہیں کہ ان کو اس معاملہ میں کوئی اشتباہ ہوا، بلکہ ان کو اپنی کتاب توراۃ اور انجیل اور دوسرے ذرائع سے پوری طرح اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی حقانیت کا روزِ روشن کی طرح علم ہو چکا تھا، لیکن مسلمانوں سے، اور اسلام و پیغمبر اسلام سے حسد، کینہ و عناد اور حبِ جاہ و مال نے ان کو اس اختلاف میں مبتلا کر دیا، اور ابدی سعادتوں سے محروم کر دیا۔ تو کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم ایسے کرنے میں کامیاب ہو گئے؟ اور ہمارا کوئی مواخذہ نہیں ہوگا؟ یہ ان کی نادانی ہے۔

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ جو بھی آیاتِ الٰہی کے ماننے اور قبول کرنے سے انکار کرے گا تو ہمیں اس سے حساب لینے میں دیر نہیں لگتی، ہم اس سے اسی زندگی میں عالمِ برزخ، اور روزِ قیامت جلد حساب لینے والے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ يَا سَرِيْعَ الْحِسَابِ اَدْخِلْنَا فِي الْجَنَّةِ بِغَيْرِ حِسَابٍ. آمین۔

فائدہ:

طبرانی میں ہے کہ حضرت غالب قطانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں کوفے میں تجارتی غرض سے گیا، اور امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ کے قریب ٹھہرا، رات کو حضرت اعمش رحمۃ اللہ علیہ تہجد کے لئے کھڑے ہوئے، پڑھتے پڑھتے جب اس آیت تک پہنچے ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ تو فرمایا: وَاَنَا اَشْهَدُ بِمَا شَهِدَ اللّٰهُ بِهٖ وَاَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ هٰذِهِ الشَّهَادَةَ وَهِيَ لِيْ عِنْدَ اللّٰهِ وَدِيْعَةٌ. یعنی میں بھی شہادت دیتا ہوں اس کی جس کی شہادت اللہ تعالیٰ نے دی، اور میں اس شہادت کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں، یہ میری امانت اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ پھر کئی دفعہ ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ

الۡاِسۡلَامُ﴾ پڑھا۔

میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ شاید اس بارے میں کوئی حدیث سنی ہوگی۔ صبح ہی صبح میں حاضرِ خدمت ہوا، اور عرض کیا کہ ابو محمد! کیا بات تھی جو آپ اس آیت کو بار بار پڑھتے رہے؟ کہا: کیا اس کی فضیلت تمہیں معلوم نہیں؟ میں نے کہا: حضرت! میں تو مہینہ بھر سے آپ کی خدمت میں ہوں، لیکن آپ نے حدیث بیان ہی نہیں کی، کہنے لگے: اللہ تعالیٰ کی قسم میں تو سال بھر تک بیان نہیں کروں گا، اب میں اس حدیث کے سننے کی خاطر سال بھر تک وہاں ٹھہرا رہا، اور ان کے دروازے پر پڑا رہا۔ جب سال کامل گزر چکا تو میں نے کہا: اے ابو محمد! سال گزر چکا، انہوں نے فرمایا: اچھا سن، مجھ سے ابو وائل نے حدیث بیان کی، اس نے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کے پڑھنے والے کو قیامت کے دن لایا جائے گا، اور اللہ عزّ وجلّ فرمائے گا: میرے اس بندے نے میرا عہد لیا ہے، اور میں عہد کو پورا کرنے میں سب سے زیادہ ہوں، میرے اس بندے کو جنّت میں لے جاؤ۔ [ابن کثیر]

فَاِنۡ حَآجُّوۡكَ فَقُلۡ اَسۡلَمۡتُ وَجۡهِىَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلۡ لِّلَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ وَالۡاُمِّيّٖنَ ءَاَسۡلَمۡتُمۡ ؕ فَاِنۡ اَسۡلَمُوۡا فَقَدِ اهۡتَدَوْا ۚ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ۝۲۰

ترجمہ: پس یہ اگر آپ سے جھگڑا کریں تو آپ کہہ دیجئے: میں نے سونپ دیا ہے اپنے چہرے کو اللہ تعالیٰ کے لئے، اور ان لوگوں نے بھی جنہوں نے میری پیروی کی، اور آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے جن کو کتاب دی گئی، اور ان پڑھوں سے بھی: کیا تم اسلام لاتے ہو؟ پس اگر وہ اسلام لائیں تو بیشک وہ ہدایت پا گئے، اور اگر وہ منہ پھیر دیں پس بیشک تیرے ذمہ پہنچا دینا ہے، اور اللہ تعالیٰ نگاہ میں رکھنے والا ہے بندوں کے حالات ۝۲۰

معارف ومنازل

دراصل مسئلہ اتمامِ حجت کا یہ ہے، کہ کفار کے سامنے ان کے خودساختہ باطل مذہب کے بطلان کو بیان کیا جائے، اور دینِ اسلام کی حقانیت کو بیان کر کے انہیں اسلام کی دعوت پیش کی جائے۔ پس اگر انہوں نے دعوتِ اسلام پر لبیک کہا، اور ایمان لے آئے، تو ان کی ہدایت کا فیصلہ ہو جائے گا، اور اگر انہوں نے اسلام قبول کرنے سے اعراض

کیاتو آپ ان سے بری الذمہ ہوں گے۔آپ کا فرضِ منصبی ابلاغ تک ہے، کسی کے اسلام لانے نہ لانے کا آپ سے نہیں پوچھا جائے گا۔آپ انہیں ربّ تعالیٰ کا سپرد کریں، بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات کونگاہ میں رکھنے والا ہے، پس وہ اپنے کئے کا بدلہ ضرور پائیں گے، خواہ دنیا میں، یا آخرت میں، یا دونوں جگہ۔

﴿فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ﴾ تا ﴿وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾ اگر یہ لوگ آپ سے مناظرہ کریں، جیسے وہ کہتے ہیں کہ یہودیت ونصرانیت تو ہمارا نسب ہے، مذہب نہیں ہے، دین تو ہمارا اسلام ہے، نجران کے وفد نے یہی کہا تھا، تب سرورعالم ﷺ نے فرمایا کہ تم جھوٹ کہتے ہو، تم اپنی نصرانیت پر ہو، تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ اور تیسرا خدا مانتے ہو، اگر تمہارا دین اسلام ہوتا تو ایسا عقیدہ نہ رکھتے، جب کہ اسلام ہمارا دین ہے، اس میں توحید کے ساتھ کسی مشرکانہ عقیدہ رکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔

میں تو اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہو گیا ہوں، دل، زبان اور سارے اعضاء کو اسی کی اطاعت پر لگا کر، سب کچھ اسی کے سپرد کر چکا ہوں۔ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ ہمارے چہرے اور رخ، یعنی تمام توجہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے، کسی دوسرے کی طرف نہ توجہ قلبی ہے، نہ التفات۔

وجہ سے ذات بھی مراد ہے، کہ میں نے اپنی پوری ہستی اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دی ہے، تن، من، دھن ظاہر و باطن، سب اس کی اطاعت پر لگا کر، ہر قسم کے غیر اللہ کی نفی کر دی ہے۔ جیسے حضرت ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ﴾ [الأنعام:٧٨] (میں بیزار ہوں اس چیز سے جس کو تم شریک بناتے ہو)۔ اور جو لوگ میری پیروی کر رہے ہیں، وہ بھی اپنی ہستی اور رخ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر چکے ہیں۔ یہاں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمانِ کامل کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اثبات ہو رہا ہے، پس اگر روافض انہیں نگاہِ بد سے دیکھیں تو ان کے کفر و گمراہی میں کوئی شک نہیں ہوگا۔ اس کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

آگے ارشاد ہے کہ آپ اہلِ کتاب اور مشرکینِ مکہ کے ناخواندہ اُمّی لوگوں سے کہہ دیں کہ تم لوگ بھی ہماری طرح صدقِ دل سے اسلام قبول کرو، اور اپنے چہروں کا رخ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف پھیر لو، اور اپنی پوری ہستی اس کے سپرد کر کے لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ پر جم جاؤ، اور اس کے حکموں پر انقیاد و تابعداری اختیار کرو، اور ہر قسم کے شرک سے تائب رہو۔

﴿ءَأَسْلَمْتُمْ﴾ میں استفہام امر کے معنی میں ہے، بمعنی أَسْلِمُوا یعنی ایمان لاؤ، اسلام قبول کرو۔

﴿فَاِنۡ اَسۡلَمُوۡا فَقَدِ اهۡتَدَوۡا﴾ اگر وہ اسلام قبول کرلیں، اور مان لیں، تو وہ یقیناً ہدایت پا گئے، اور سیدھی راہ پر آگئے۔ ﴿وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ﴾ اور اگر وہ لوگ رُوگردانی کریں، اور ہدایت قبول نہ کریں، اور بدستور اپنا منہ موڑیں، تو آپ پر ان کی کوئی بھی ذمہ داری نہیں، کیونکہ آپ کے ذمہ تو صرف پیغامِ الٰہی اور احکامِ خداوندی کا ابلاغ اور پہنچانا ہے، اور آگے خود اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال واحوال کے دیکھنے والا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر یہ لوگ دلائل سننے کے باوجود آپ کے ساتھ جھگڑا کریں، اور خواہ مخواہ کی حجت بازی کریں، تو اپنے اور اپنے فرمانبردار ساتھیوں کے اسلام کا اعلان کردیں، اور ان سب کو اسلام کی دعوت پیش کردیں۔ اگر وہ قبول کرلیں تو بہت ہی بہتر، اسی میں ان کی نجات ہے۔ اور اگر قبول نہ کریں تو ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ کردیں، وہی دانا وبینا ہے، جو اپنے بندوں کے احوال سے باخبر ہے۔ آپ کا اصل کام لوگوں تک اللہ تعالیٰ کا حکم پہنچا دینا، اور تبلیغِ احکام ہے، کسی کو ہدایت دینا آپ کا فرضِ منصبی ہرگز نہیں ہے ﴿اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ﴾. [القصص:۵۶] (آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ پسند کریں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت دیتا ہے جس کو وہ چاہے)۔

❁ ❁ ❁

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقۡتُلُوۡنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيۡرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقۡتُلُوۡنَ
الَّذِيۡنَ يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡقِسۡطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴿۲۱﴾ اُولٰٓـئِكَ
الَّذِيۡنَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴿۲۲﴾

ترجمہ: بیشک جو لوگ کفر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ، اور قتل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو، جانتے ہوئے ناحق، اور قتل کرتے ہیں ان لوگوں کو جو حکم دیتے ہیں لوگوں کو انصاف کرنے کا لوگوں میں سے، پس ایسے لوگوں کو خوشخبری سنادیجئے عذابِ الیم کی ﴿۲۱﴾ یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہوگئے، اور ان کیلئے کوئی مددگار نہیں ہوگا ﴿۲۲﴾

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرکے کفر کرنا، اور انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا، اسی کے ساتھ علماء وصلحاء اور امر بالمعروف

ونہی عن المنکر کرنے والوں کو بلاوجہ ناحق قتل کرنا، یہ تمام ناپاک خصائل بنی اسرائیل میں سے فرقہ یہود کے ہیں۔
اگرچہ یہ سارے ناروا کام سابقہ لوگوں نے کئے تھے، لیکن سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے یہودی بھی اپنے اسلاف کی ان حرکاتِ مذمومہ شنیعہ کو پسندیدہ نگاہ سے دیکھتے تھے، اس لئے ان افعالِ شنیعہ کی نسبت تمام قومِ یہود کی طرف صحیح اور برحق ہے۔ اور موجودہ یہود صرف یہ نہیں کہ اپنے اسلاف کی ان نازیبا اور غلط حرکات کو پسند کرتے تھے، بلکہ انہوں نے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کی بھی سازش کی تھی۔

خیبر کے یہودیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا منصوبہ بنایا، آپؐ کے کھانے میں زہر ملایا۔ مدینہ منورہ میں بھی بنونضیر اور بنوقینقاع کی بستی میں آپؐ کے خلاف سازش کی گئی کہ آپ کو دیوار کے سایہ میں بٹھا کر اوپر سے بہت بڑا وزنی پتھر آپؐ پر گرا دیا جائے، مگر اللہ تعالیٰ نے بذریعۂ وحی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دیدی، اور آپؐ وہاں سے چلے گئے۔

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بڑا سخت جادو کیا، جس کی پوری تفصیل سورۃ المعوذتین میں لکھ چکے ہیں۔ اس لئے پہلے اور پچھلے سارے یہود موردِ الزام ٹھہرے۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا:

''یارسول اللہ! قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب کا مستحق کون ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ شخص جو کسی نبی کو قتل کردے، یا ایسے شخص کو قتل کردے جو کسی بھلائی کا حکم کرتا ہو، اور بری باتوں سے روکتا ہو۔ پھر سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّيَقْتُلُونَ الَّذِيْنَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ﴾ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ابو عبیدہ! بنی اسرائیل نے تینتالیس (۴۳) پیغمبروں کو ایک دن دوپہر تک قتل کردیا، پھر ان کی جگہ ان کے متبعین میں سے ایک سو ستر عالموں نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی، اور یہ کارِ خیر اپنے ذمہ لے لی، لیکن ان بنی اسرائیل نے ان سب علماء اور صلحاء کو بھی شام تک قتل کر ڈالا۔ ان ہی لوگوں کا وہ واقعہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے۔ بعض روایات میں ایک سو بارہ ہیں۔ [معالم]

﴿بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ یہود جانتے تھے کہ انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا سخت گناہ اور حرام ہے، اور نبی کو قتل کرنا ہر حال میں ناحق ہے، کیونکہ وہ ہر گناہ سے معصوم ہے۔ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ وہ صرف نبیوں کو ہی قتل نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کے جانشین علماء وصلحاء اور زہاد کو بھی قتل کردیا کرتے تھے۔ گویا کہ ہدایت کی تمام راہیں اور سب دروازے ہی مسدود کرنے کے درپے تھے۔ اور ہمیشہ اہلِ باطل کا دستور یہی رہا ہے کہ انہوں نے پیغمبروں کے

بعد علماء حق کو قتل کیا ہے، اوران کے اثر کو زائل کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے، تا کہ حق کی مخالفت میں ان اہلِ باطل کو آسانیاں مہیا ہوجائیں، اورکوئی جائز وناجائز کہنے والا باقی نہ رہے، اور منافق و بے دینوں کے لئے میدان صاف ہوجائے، اورانہیں ہرقسم کی من مانی، اورطرح طرح کے معاصی پر کوئی ٹوکنے والا اور منع کرنے والا موجود نہ ہو، اور وہ بلا روک ٹوک اپنے مجرمانہ اعمال کوانجام دے سکیں۔ اورامر بالمعروف ونہی عن المنکر جیسے اعمال سے ان کو چھٹی مل جائے۔

آج ہمارے زمانے میں بھی یہی شرارت وفتنہ اپنے عروج پر ہے، سیکڑوں جید و مصلحین علماء کرام بے دردی سے شہید کئے جارہے ہیں، اور مساجد ومدارس وخانقاہوں اور مراکزِ دینیہ کا تقدس پامال ہورہا ہے، اور جن حکمرانوں اور اربابِ حل وعقد کی رضامندی اوران کے اشاروں سے یہ سب کچھ ہورہا ہے وہ سارے یہود ونصاریٰ کے ایجنٹ اورگماشتے ہیں، انہیں ان کے آقاؤں سے جوحکم ملتا ہے وہ اس کی تعمیل میں دیر نہیں لگاتے ہیں۔

﴿اَلْقِسْط﴾ کے معنی ہیں: انصاف ۔ یہ کلمہ قرآن کریم میں اپنے مشتقات کے ساتھ ۲۵ مرتبہ مختلف مقامات میں مذکور ہے، اور کلمۂ ﴿اَلْقِسْطَاس﴾ صرف دومرتبہ سورۃ الاسراء اورسورۂ شعراء میں مذکورہ ہے۔

﴿حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ﴾ کے تفصیلی معانی سورۂ بقرہ میں بیان ہوئے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ ان مذموم حرکات کے باعث ان کے تمام نیک اعمال ضائع ہوگئے، دنیا میں بھی ان کی تمام کوششیں بے کار گئیں، اورکوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا، اور آخرت میں بھی ان کے اچھے اعمال کا ان کوکوئی پھل نہیں ملا۔ اور آخرت کے عذاب کے وقت ان کا کوئی حمایتی ومددگار بھی نہیں نکلا، جوان کی کچھ مدد کرتا، اور ہر کافر کے کفر کا انجام یہی ہوا کرتا ہے۔

عذاب کی خبرکو بشارت تہکّمًا ذکر فرمایا ہے، جس طرح ایک صاحب اقتدار سزا دیتے وقت کہا کرتا ہے کہ میں تم کو بشارت دیتا ہوں کہ تم کو جیل خانہ بھیجا جارہا ہے، یا عبرتناک سزادی جانے والی ہے۔ ظالم سمجھتا ہے کہ وہ نسلاً بعد نسلٍ دنیا میں قائم رہے گا، مگر اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لئے ان کو مٹادیتا ہے۔

یزید کم نصیب کا واقعہ ہمارے سامنے ہے، وہ خاندانِ نبوت کا مکمل خاتمہ چاہتا تھا، صرف ایک فرد زین العابدین بیمار ہونے کی وجہ سے بچ گئے، ورنہ وہ بھی تلواروں کی زد میں تھے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس ایک فرد سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ریحانۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل کو کس طرح چلایا۔ آج ہر ملک ودیار میں، جگہ جگہ حسینی سادات بکثرت موجود ہیں، اور جہاں ہوتے ہیں وہاں کے عوام میں صاحب قدر ومنزلت، اور ہر دلعزیز ہیں۔

برخلاف اس کے کہ یزید کے پندرہ بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں، امام ابن کثیر رحمۃ اللہ نے البدایہ والنہایہ میں لکھا ہے کہ ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں رہا، پوری نسل صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے مٹ گئی۔ مَنْ عَادىٰ لِي وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ۔ [رواه البخاري] خاندانِ نبوت کے ساتھ دشمنی صاحبِ نبوت کے ساتھ دشمنی شمار ہوگی، اور صاحبِ نبوت کے ساتھ دشمنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ براہِ راست اعلانِ جنگ ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَارِ۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا وَارْحَمْنَا۔ آمین

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

ترجمہ: کیا نہیں دیکھا آپ نے ان لوگوں کو جن کو کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا، ان لوگوں کو جب کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے، تا کہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، پھر ان میں سے ایک گروہ منہ پھیرتا ہے، اور وہ اعراض کرنے والے ہوتے ہیں ﴿۲۳﴾ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے کہا: ہرگز نہ چھوئے گی ہم کو دوزخ کی آگ، مگر چند دن گنے ہوئے، اور دھوکا دیا ہے ان کو ان کے دین کے بارے میں ان باتوں نے جو وہ افتراء کیا کرتے تھے ﴿۲۴﴾ پس کیسے ہوگا ان کا حال جب ہم ان کو اکٹھا کریں گے اس دن میں کہ جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے، اور پورا پورا دیا جائے گا ہر ایک نفس کو جو اس نے کمایا، اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۲۵﴾

معارف ومنازل

ابن المنذر، ابن اسحاق، ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہودیوں کے مدرسہ میں یہود کی ایک جماعت کے پاس تشریف لے گئے، اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف آنے اور اسلام کی دعوت دی۔ نعیم بن عمرو اور حارث بن زید نے پوچھا: محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم کس دین پر ہو؟ آپؐ نے فرمایا: ابراہیم علیہ السلام کی ملت اور دین پر۔ وہ کہنے لگے: ابراہیم علیہ السلام تو یہودی

تھے، سید الانبیاء ﷺ نے فرمایا: آؤ! ہمارے اور تمہارے درمیان تورات حاکم ہے، دیکھو تورات نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ لاؤ تورات، تو انہوں نے انکار کیا۔ اس پر اس آیت کریمہ کا نزول ہوا: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ [الآیۃ]

کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت ابو صالح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے، جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تخریج کی ہے کہ خیبر کے یہودیوں میں ایک مرد وعورت نے زنا کیا، اور زنا کی سزا تورات میں رجم وسنگسار کرنا مقرر تھی، لیکن زانی چونکہ بڑے پایہ کا آدمی تھا، اس لئے یہودیوں نے اس کو سنگسار کرنا مناسب نہیں سمجھا، اور سرور عالم ﷺ کی خدمت میں یہ معاملہ پیش کیا۔ ان کو یہ امید تھی کہ سید کائنات ﷺ کے ہاں کچھ تخفیف مل جائے گی۔ سید عالم ﷺ نے تورات اور قرآن کریم دونوں کے حکم کے مطابق مسجد نبوی کے قریب موضعِ جنائز میں دونوں کو رجم کرنے کا حکم دیدیا۔

نعمان، ابن اُوفیٰ اور بحری بن عمرو اس سزا کو سن کر بولے: یا محمد! آپ کا فیصلہ تورات کے خلاف ہے، تورات میں زانی کی سزا رجم نہیں، بلکہ اس کا منہ کالا کر کے سیاہ چہرے کے ساتھ اس کو مجمعِ عام بازار میں گشت کرا کے پھرانا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں تورات کو فیصلہ کنندہ سمجھتا ہوں، لاؤ تورات، ابھی فیصلہ ہو جائے گا۔ وہ بولے: ابھی آپ نے درست فرمایا۔ سید عالم ﷺ نے فرمایا: تمہارے اندر تورات کا سب سے بڑا عالم کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایک چشم آدمی ہے، جو فدک کا باشندہ ہے، اس کو ابن صوریا کہا جاتا ہے، چنانچہ ابن صوریا تورات لے کر وہاں حاضر ہوا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے ابن صوریا کے حالات سید الانبیاء ﷺ کو بتادئے تھے۔

جب ابن صوریا حاضر ہوا تو سید عالم ﷺ نے فرمایا: تم ابن صوریا ہو؟ اس نے کہا: ہاں، میں ابن صوریا ہوں۔ فرمایا: کیا تم یہودیوں کے سب سے بڑے عالم ہو؟ کہنے لگے: لوگ ایسا ہی خیال کرتے ہیں۔ سید الانبیاء ﷺ نے ارشاد فرمایا: پڑھو تورات، اس میں کیا لکھا ہوا ہے؟ حسب الحکم اس نے تورات پڑھنی شروع کی، اور جب آیت رجم پر پہنچا تو اس پر انگلی رکھدی، آگے پیچھے پڑھتا رہا، اور آیت رجم کو درمیان میں چھوڑ دیا۔ اس مجلس میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، جنہیں تورات یاد تھی، کہنے لگے: اے دشمنِ خدا! ذرّا انگلی اٹھاؤ، اور وہ جگہ بھی پڑھو، جب انہوں نے انگلی اٹھالی تو نیچے صاف لکھا ہوا رجم کا حکم معلوم ہوا، اس پر وہ نہایت شرمندہ ہوئے، اور اقرار کیا کہ واقعی یہ رجم کی آیت ہے، جس میں لکھا ہوا تھا کہ جب شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت زنا کریں، اور شہادت سے ثبوت ہو جائے تو ان کو سنگسار کیا جائے، اور عورت اگر حاملہ ہو تو بچہ پیدا ہونے تک سزا کو موقوف رکھا جائے۔

اس فیصلہ کے بعد سرورِ عالم ﷺ نے موضع الجنائز کے احاطہ میں دونوں کو سنگسار کر دیا، اور یہود ناراض و شرمندہ ہو کر لوٹ گئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ﴾ تا آخر ﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ﴾ کیا آپ نے ان لوگوں کا حال ملاحظہ نہیں کیا؟ استفہام تقریری ہے، تعجب کے لئے ہے، جن کو آسمانی کتاب تورات کے علم میں سے ایک اچھا خاصا حصہ دیا گیا ہے، اور وہ تورات کے اچھے خاصے عالم ہیں، ان لوگوں کو اس مقصد کے لئے کتابِ الٰہی کی طرف دعوت دی جاتی ہے، تا کہ کتاب اللہ ان کے درمیان مذہبی اختلاف کا فیصلہ کر دے، اور تورات کے پڑھنے سے صحیح حکم معلوم ہو جائے۔ تو ان میں سے چند لوگ اس دعوت الی الکتاب سے بے رُخی اور اعراض کرتے ہوئے پہلو تہی کرتے ہیں، اور منہ پھیر لیتے ہیں۔

ان کی اس بے رُخی اور اعراض کی اصلی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے گھمنڈ و غرور میں مبتلا ہو کر کہا کرتے ہیں کہ ہم لوگ سب کے سب جنتی ہیں، ہمارا جہنم کی طرف کبھی گزر نہیں ہوگا، بصورت دیگر آتشِ دوزخ صرف چند روز کے سوا ہمیں مس بھی نہیں کرے گی۔ وہ چند روز کبھی کہتے ہیں کہ سات دن ہوں گے، اور کبھی چالیس روز بتاتے ہیں۔ تفصیل سورۂ بقرہ کی آیت: ﴿وَقَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَۃً﴾ [البقرۃ: ۸۰] کے تحت گزر چکی ہے۔

ان لوگوں کو ان کے دین کے بارے میں ان کی ان افتراپردازیوں اور ان کے خودساختہ عقائد نے اور پیغمبرزادگی نے مبتلائے فریب کر رکھا ہے، اور ان کو ایک غیر متناہی دھوکے میں مقید کیا ہوا ہے۔ مگر اس گھڑی ان کا کیا حال ہوگا جب ہم ان سب کو اس روز جمع کر لیں گے جس روز (قیامت) میں ذرّا بھر شک و شبہ نہیں، اور اس روز ہر شخص کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور کسی پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس قوم سے قرآن مجید پر ایمان لانے کی ہرگز امید نہیں رکھنی چاہئے، جبکہ وہ اپنی کتاب تورات پر ایمان نہیں رکھتے، اور اسے اپنے معاملات میں حکم تسلیم نہیں کرتے، تو قرآن کریم پر کیا ایمان لائیں گے؟ جیسے پہلے ارشاد ہوا: ﴿وَلَنۡ تَرۡضٰی عَنۡکَ الۡیَهُوۡدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡ﴾۔ [البقرۃ: ۱۲۰] سورۂ بقرہ کی آیت ۴۰ سے لے کر آیت ۱۲۳ تک قومِ یہود کی چالبازی، مکر و خیانت، دروغ گوئی، افتراء علی اللہ، افتراء علی الرُّسل، تکذیب وقتل انبیاء علیہم السلام وغیرہ، چالیس سے زائد خباثتوں کا مکمل تفصیلی بیان ہوا۔

جب ربّ العزّت کسی قوم کو مبغوض، ملعون اور مغضوب علیہم قرار دے تو اس قوم سے ایمان یا کسی خیر کی امید و

توقع رکھنا عبث ہی ہوگا، جو﴿نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾[المائدۃ:۱۸] (ہم اللہ کے بیٹے، اور اس کے محبوب ہیں) کہنے سے نہیں شرمائے، تو سوائے جہنم کے ان کا کوئی علاج و تدبیر ممکن نہیں۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الۡمُلۡكِ تُؤۡتِى الۡمُلۡكَ مَنۡ تَشَآءُ وَتَنۡزِعُ الۡمُلۡكَ مِمَّنۡ
تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الۡخَيۡرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ
قَدِيۡرٌ ۲۶ تُوۡلِجُ الَّيۡلَ فِى النَّهَارِ وَتُوۡلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيۡلِ وَتُخۡرِجُ الۡحَىَّ مِنَ
الۡمَيِّتِ وَتُخۡرِجُ الۡمَيِّتَ مِنَ الۡحَىِّ وَتَرۡزُقُ مَنۡ تَشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ۲۷

ترجمہ: اے پیغمبر! آپ اپنی دعاء میں یوں کہیں: اے اللہ تعالیٰ! تو بادشاہی کا مالک ہے، تو جس کو چاہے ملک دیتا ہے، اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لیتا ہے، اور تو جس کو چاہے عزت دیتا ہے، اور جس کو چاہے ذلیل کرتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں خیر ہے، بیشک تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ ۲۶ تو داخل کرتا ہے رات کو دن میں، اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں، اور نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے، اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے، اور تو روزی دیتا ہے جس کو چاہے بغیر حساب کے ۲۷

معارف ومنازل

امام محی السنہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ (الحمدشریف)، آیت کرسی اور سورۂ آل عمران کی دو آیتیں، یعنی ﴿شَهِدَ اللّٰهُ﴾ سے ﴿اِنَّ الدِّيۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ﴾ تک، اور ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الۡمُلۡكِ﴾ سے ﴿بِغَيۡرِ حِسَابٍ﴾ تک مقبول الشفاعت ہیں۔ ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے۔ انہوں نے کہا تھا: اے ربّ تعالیٰ! تو ہم کو زمین پر اتار کر ایسے لوگوں کے پاس بھیج رہا ہے جو تیری نافرمانی کریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں اپنی قسم کھاتا ہوں کہ میرے بندوں میں جو کوئی ہر نماز کے بعد تمہاری تلاوت کرے گا وہ کیسا ہی ہو میں جنّت کو ضرور اس کا ٹھکانا بناؤں گا، میں حظیرۃ القدس میں ضرور اس کو ٹھہراؤں گا، میں اس کی طرف ضرور نظرِ رحمت کروں گا (یعنی روزانہ ستر مرتبہ)، اور میں ہر روز اس کی ستر حاجتیں پوری کروں گا، ادنیٰ درجہ

گناہوں کی مغفرت کا ہوگا، یعنی دنیوی حاجات مراد نہیں ہیں، بلکہ آخرت کے مراتب کی ترقی مراد ہے، اور مراتب کی ترقی کا درجہ بعد کو آتا ہے۔ سب سے پہلے گناہوں کی بخشش کی ضرورت ہے، لہٰذا مغفرت کا درجہ سب سے ادنیٰ ہوگا، اور میں ہر دشمن اور حاسد سے اس کو پناہ دوں گا، اور غالب کروں گا۔ [مظہری] اس سلسلے میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت پہلے گزر چکی، وہاں دیکھا جائے۔ الحمد للہ

شانِ نزول اور تلقینِ دعاء:

ان آیات میں امت محمدیہ کو ایک دعاء و مناجات کی تلقین اس انداز سے کی گئی ہے کہ اس کے ضمن میں امت محمدیہ کے کفار پر غلبہ پانے کی طرف اشارہ بھی ہے، جیسا کہ اس کے شانِ نزول سے ثابت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فارس و روم، اور یمن فتح ہو جانے کا جب وعدہ فرمایا، تو منافقین و یہود نے استہزاء شروع کیا، اس پر یہ آیات نازل ہوئی۔ کمافي روح المعاني عن الواحدي عن ابن عباس و أنس۔

امام محی السنہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس اور حضرت انس رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ جب سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ فتح کیا تو آپ نے اپنی امت کے لئے فارس اور روم کی فتح کا وعدہ فرمایا۔ اس پر منافق اور یہودی کہنے لگے: ارے ارے کہاں محمد اور کہاں فارس اور روم کی عظیم حکومتیں؟ وہ ان سے کہیں مضبوط اور طاقتور ہیں۔ کیا محمد کے لئے مکہ اور مدینہ کافی نہیں ہیں، کہ فارس اور روم کی حکومتوں کی لالچ کرنے لگے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب مدینہ کی حفاظت کے لئے خندق کھودنے کے خطوط متعین کئے، اور ہر دس آدمیوں کے لئے بیس ہاتھ خندق کھودنا طے کر دیا، اور لوگوں نے کھدائی شروع کر دی، اور یہ خندق کئی میل لمبی، اور خاصی گہری اور چوڑی تھی، جس کو حملہ آور دشمن عبور نہ کر سکے، اور کھدائی کے لئے تکمیل جلد سے جلد کرنا تھی، اس لئے جان نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑی محنت سے اپنے کام میں مشغول ہو گئے، حتی کہ کھانے پینے اور قضائے حاجت کے لئے، اور دیگر ضروریات کے لئے یہاں سے ہٹنا مشکل ہو رہا تھا۔

مسلسل بھوکے رہ کر یہ کٹھن کام انجام دیا جا رہا تھا، اور یقیناً کام ایسا مشکل تھا کہ آج کل کی جدید آلات والی پلٹن بھی ہوتی تو اس تھوڑے وقت میں اس کام کا پورا کرنا آسان نہ ہوتا، مگر بھوک بے سروسامانی کے باوجود شیدایانِ اسلام نے وہ محیر العقول تاریخی کارنامہ انجام دیا، اور اپنی ایمانی قوت و دلجمعی سے کام مکمل کر کے تاریخی اوراق میں

ایمانی نقوش رقم کئے، اور ایک مختصر وقت میں وہ کام انجام دیا جسے ایک کھاتا پیتا لشکر بھی انجام نہ دے سکتا تھا۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک فرد کی حیثیت سے اس کھدائی کے کام میں شریک رہے۔ اس کھدائی کے دوران زمین کے اندر ایک بہت بڑی چٹان نمودار ہوئی، جن حضرات کے حصہ میں خندق کا یہ ٹکڑا تھا، وہ اپنی پوری قوت صرف کر کے عاجز ہو گئے، کیونکہ اس پتھر کو توڑنا اور ٹکڑے کرنا نہایت مشکل اور پیچیدہ تھا۔ لوگوں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا، کہ اب کیا حکم ہے؟ ہماری مدد کیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ماجرا سماعت فرمانے کے بعد بذات خود وہاں تشریف لے آئے، اور کدال ہاتھ میں لے کر ایک ایسی زوردار ضرب لگائی کہ پتھر پھٹ گیا، اور ایک روشنی کی چمک نمودار ہوئی، جس سے مدینہ کے دونوں کناروں کا درمیانی حصہ چمک اٹھا، گویا ایک تاریک کوٹھڑی میں چراغ روشن ہو گیا۔ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر کہی، مسلمانوں نے بھی تکبیر کہی۔ سرور دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ضرب سے میرے سامنے حیرہ اور فارس کے محلات نمودار ہو گئے، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کتوں کے دانت۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری ضرب لگائی، اور فرمایا: اس ضرب سے میرے سامنے سرزمینِ روم کے سرخ محلات نمودار ہو گئے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری ضرب لگائی، اور فرمایا: اس ضرب سے میرے سامنے صنعاء یمن کے محلات نمودار ہو گئے، اور جبریل علیہ السلام نے مجھے بتادیا کہ میری امت ان سب ممالک پر غالب آئے گی، پس تم کو بشارت ہو۔

اس پر منافقین اور یہود کہنے لگے: کیا تم کو اس بات سے تعجب نہیں ہوتا کہ محمد تم کو خوش کر رہے ہیں، اور امیدیں دلا رہے ہیں، اور تم سے جھوٹے وعدے کر رہے ہیں، اور تم کو بتا رہے ہیں کہ مجھے یثرب سے حیرہ سرزمین فارس کے محل نظر آ رہے ہیں، اور تم ان کو فتح کرو گے، حالانکہ تم ایک دشمن کے خوف سے مدینہ کی حفاظت کے لئے خندقیں کھود رہے ہو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یہاں دونوں روایتوں میں اگرچہ اختلاف ہے، مگر نزولِ آیت پر اتفاق ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فارس اور روم کی فتح کی بشارت سنائی تھی، یا آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی، دونوں روایتوں میں تطبیق ممکن ہے۔ اس طرح کہ فتح مکہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء کی ہو، اور دعاء قبول ہو گئی ہو، اور وحی سے دعاء کی قبولیت معلوم ہو گئی ہو، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بشارت دیدی ہو۔ [مظہری]

واضح ہو کہ آیت کریمہ میں مناجات ودعاء کے پیرایہ میں قوموں کے عروج وزوال، اور ملکوں کے انقلاب

میں حق تعالیٰ جل شانہ کی قدرتِ کاملہ کا بیان ایک نہایت بلیغ انداز سے کیا گیا ہے، اور فارس و روم کی فتوحات کے بارے میں سید الانبیاء ﷺ کی پیشینگوئی کے پورا ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا۔ اس میں دنیا کے انقلابات سے بے خبر قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ سے ناواقف قوم نوح اور عاد و ثمود کے واقعات سے غافل اور جاہل دشمنانِ اسلام کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تم ظاہری شان و شوکت کے پرستار یہ نہیں جانتے کہ دنیا کی ساری طاقتیں اور حکومتیں سب ایک ذات پاک کے قبضۂ قدرت میں ہیں، جس کا صرف امرِ کُن سارے جہاں کے وجود و بقاء کے لئے کافی ہے۔

اور ہر وہ مشکل سے مشکل کام جسے تم قابلِ حل نہیں سمجھتے ہو، اس کے صرف ارادہ سے وہ حل ہوگا۔ عزت و ذلت اُسی کے ہاتھ میں ہے، وہ بلاشبہ اس پر قادر ہے کہ غریبوں اور فقیروں کو تخت و تاج کا مالک بنادے، اور بڑے بڑے بادشاہوں سے تخت و تاج چھین لے۔ یہ سب کچھ اس کے لئے آسان ہے، اور اس کے لئے کوئی بڑے سے بڑا کام مشکل نہیں ہے کہ آج کے بے سروسامان خندق کھودنے والے فقیروں کو کل شام و عراق اور یمن کی حکومت عطا فرما دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، کہ عرب کے اُمّی و ناخواندہ قوم جن کا گزربسر اونٹوں کے دودھ پر ہوتا تھا، شتربانی ان کی فطرت کا مایہ ناز پیشہ تھا، حکمرانی کا ذوق ان کے خمیر میں نہ تھا، وہ ملک گیری و سیاست سے سراسر بے گانہ اور ناواقف تھے، وہ نانِ شبینہ کے محتاج تھے، وہ دنیا کی رونقوں اور زینتوں کو بیداری کیا خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا، مگر تعلیماتِ نبوی نے انہیں کندن بنادیا، تمام آلائشوں سے انہیں پاک کیا، اور انہیں حکمت و شجاعت اور عدالت کا تاجدار و سپوت بناکر وہ بہادری اور حوصلے دیئے کہ جنگل کے باشاہ شیر بھی ان کی قدمبوسی پر اتر آئے۔ مٹھی بھر فوجیوں کے ذریعہ دنیا کی دوہزار سالہ سلطنتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ ان کی چھتیس ہزار فوج نے میدانِ یرموک میں قیصر روم کی نو لاکھ ساٹھ ہزار فوجیوں کو لوہے کے چنے چبانے پر مجبور کیا۔

ان کے جنگی معرکوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو شاید ہوش و حواس ناکارہ ہوجائیں۔ نہ باقاعدہ منظم تربیت یافتہ فوجی تھے، نہ کیل و کانٹے سے لیس تھے، نہ ان کی فوجی چھاونی تھی، نہ تنخواہ و مراعات، اور نہ ہی پنشن کے دلدادہ تھے، نہ کسی کالج و یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے۔ وہ صرف اور صرف ایمان و تقویٰ اور دیانت کے زیور و اسلحہ سے لیس تھے۔ وہ دن کو لڑنے والے مجاہد تھے، رات کو رہبان و زہاد عبادت گزار تھے۔ دنیا کی زینتوں اور راحتوں نے انہیں ہر چند اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی، مگر وہ اور بھی دنیا سے دور اور بیزار رہے۔ وہ کسی کے سپاہی نہ تھے، صرف اسلام کے فوجی تھے۔ پہاڑوں سے ٹکرا کر انہیں خاکستر بنادیا، قیصر و کسریٰ سے ٹکرا کر انہیں زیر و زبر کردیا۔ رضي الله عنهم أجمعين

﴿قُلِ﴾: آپ کہہ دیں۔ اَللّٰھُمَّ. یہ مقولہ ہے، جس کے کہنے کا حکم ہو رہا ہے۔

﴿اَللّٰھُمَّ﴾ کی اصل یَا اَللّٰہُ ہے، حرف ندا کو حذف کر کے اس کے عوض آخر میں میم کا اضافہ کر دیا گیا، اسی لئے حرف ندا اور میم دونوں اکٹھے نہیں آتے، اور یَا اَللّٰھُمَّ نہیں کہا جاتا، تاکہ اصل اور عوض کا اجتماع لازم نہ آئے۔ اَللّٰھُمَّ کا یہ ضابطہ قیاسی نہیں ہے، سماعی ہے۔ اَللّٰھُمَّ کا کلمہ نہایت عجیب جامع کلمہ ہے، اگر کوئی اَللّٰھُمَّ سے دعاء کرے تو سمجھو کہ اس نے اس کلمہ کے کہنے میں اللہ تعالیٰ کو اس کے سارے اسماء حسنیٰ کے ساتھ پکارا۔ یہ مبارک کلمہ قرآن کریم میں پانچ مقامات پر مذکور ہے، اور کلمہ مبارک "اللہ" قرآن حکیم میں دو ہزار چھ سو اٹھانوے (۲۶۹۸) مرتبہ مذکور اور زینتِ قرآن ہے۔

اس کی بہت سی خصوصیات ہیں، سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں چند ایک کا بیان گزر چکا ہے، وہاں دیکھا جائے۔ نیز ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ حرف ندا کے عوض اس کے آخر میں میم مشدد دلائی جاتی ہے، مگر اس کے باوجود یَا اللہ کہنا معمول اور مسنون ہے۔ اور عام قاعدہ یہ ہے کہ حرف ندا اور لامِ تعریف کا اجتماع نہیں ہوتا۔ حرف "تا" جو کہ قسم کے لئے ہے، وہ صرف "اللہ" کے ساتھ مخصوص ہے۔ جیسے "تاللہ"، اور کسی کلمہ پر نہیں آتا۔ بخلاف دوسرے حروفِ قسم کے، کہ وہ عام ہیں، جیسے ﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ﴾ یا ﴿لَآ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَةِ﴾۔

﴿مٰلِكَ الۡمُلۡكِ﴾ اے مالک، ملک سلطنت کا حقیقی مالک، جس کی رحمت تمام کائنات پر شب و روز ہر لحہ سایہ فگن ہے، بخششوں اور نوازشوں کا دروازہ دن رات کھلا رہتا ہے، اور اچھے برے ہر قسم کے بندوں کی آواز الگ الگ سنتا ہے، اور کسی بھی سائل کو مسترد نہیں کرتا۔ بڑے سے بڑے مجرم کو بھی عفو و کرم کی چادر میں ڈھانپتا ہے، کبھی کسی معافی مانگنے والے کو ناامید نہیں کرتا ہے، بار بار توبہ کرنے والے کو مسترد نہیں کرتا ہے، ماں باپ سے اربوں مرتبہ زیادہ مہربان ہے۔

﴿مٰلِكَ الۡمُلۡكِ﴾ ترکیب میں منادیٰ کی صفت ہے۔ بعض نے کہا یہ دوسرا منادیٰ ہے، اور حرف ندا محذوف ہے، یعنی ﴿یَا مٰلِكَ الۡمُلۡكِ﴾ اے سارے جہاں کا مالک!

﴿تُؤۡتِی الۡمُلۡكَ مَنۡ تَشَآءُ وَتَنۡزِعُ الۡمُلۡكَ مِمَّنۡ تَشَآءُ﴾۔ [الآیۃ] یہ حضرت باری تعالیٰ کی صفتِ ذاتی حقیقی ہے، اور منادیٰ کے لئے دلیل بھی ہے، کہ جو سارے جہاں کا مالک ہوگا تو وہ ہر قسم کے تصرفات کا بھی مالک ہوگا، جس کو چاہے دے، جسے چاہے نہ دے۔ اگر مفلوک الحال محتاجوں کو تخت و تاج عطا کرے تو وہ قادر ہے، چرواہوں کو

سلطنت دیدے تو کیا مشکل، اگر تخت وتاج والوں کو فقیر بنادے، یا تختۂ دار پر لٹکائے تو کوئی بعید نہیں ہوگا۔ دنیا کے بادشاہوں اور حکمرانوں کی تاریخ مطالعہ کرنے پر یہ سارے اسرار ورموز کھل کر معلوم ہوجاتے ہیں۔

عزیز مصر کی بیوی راحیل (زلیخا) نے حضرت یوسف علیہ السلام کی پلٹن کو اپنی جھونپڑی کے سامنے سے بڑے کروفر کے ساتھ گزرتے ہوئے دیکھا تو بڑی حسرت سے یہ کہا: سُبْحَانَ الَّذِیْ جَعَلَ الْعَبِیْدَ مُلُوکًا لِطَاعَتِهِمْ سُبْحَانَ الَّذِیْ جَعَلَ الْمُلُوکَ عَبِیْدًا لِمَعْصِیَتِهِمْ. پاک ہے وہ مالکُ الملک جس نے غلاموں کو باشاہت عطا کی، ان کی فرمانبرداری کے عوض۔ پاک ہے وہ مالکُ الملک جس نے بادشاہوں کو غلام بنایا ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے۔

کتبِ تاریخ کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ عزیز مصر اور اس کی بیوی، اور اس زمانے کے فرعونِ مصر تینوں کفر سے تائب ہوکر حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔ یہی راجح قول ہے۔

﴿تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ﴾ اس کا صحیح مصداق حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم ہیں۔

﴿وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ﴾ اس کا مصداق قیصر وکسریٰ ملوکِ فارس وروم ہیں، جوکہ دوہزار سال سے زائد مدت سے فارس وروم پر ان کا اقتدار قائم تھا۔ ان کے علاوہ اکناف واطرافِ عالم میں ہروقت یہی سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تیس سالہ عرصہ بڑا تابناک دور گزرا۔ شاید انبیاء علیہم السلام کے بعد نیلے آسمان نے اپنے سایہ میں، اور گدلی زمین نے اپنی پیٹھ پر، اور فضاؤں نے اپنی ہواؤں کے تحت ایسا دور نہیں دیکھا ہوگا۔

یہ چاروں خلفاء رضی اللہ عنہم کون تھے؟ کیا یہ بادشاہوں کی اولاد شہزادے تھے؟ یا پیغمبروں کی اولاد تھے؟ یا امراء وزراء کے لاڈلے بیٹے؟ یا بھائی، یا اپنی قوموں کے سردار؟ یا سردارزادے تھے؟ ہرگز نہیں۔ یہ عام لوگوں، بلکہ ایک بت پرست قوم کی اولاد تھے۔ سوائے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے باقی تینوں غریبوں کی اولاد تھے، اور تینوں کے باپ کفر پر مرے ہیں۔

کیا کوئی سوچ سکتا تھا کہ کبھی اسلامی اقتدار کا زمام ان کے ہاتھ میں آئے گا؟ اور کشمیر تک مشرق میں کاشغر چینی ترکستان تک، اور افریقہ کے جنگلوں تک، آذربائیجان، روس اور جزائرِ بلقان تک ان کی حکومت پھیل جائے گی؟ اور ہزاروں سالوں سے قائم فارس وروم کی عظیم الشان ترقی یافتہ سلطنتیں ان کی محدود وبے سروسامان فوجوں کے سامنے ڈھیر ہوجائیں گی؟ جمشید اور افریدوں، دارا اور سکندر کے جانشین ان کے ہاتھوں عبرتناک شکست سے دوچار ہوجائیں

گے؟ یہ تاریخی شکست کیوں نمودار ہوئی؟ اور کیسے؟ اور کیوں؟ زمانہ وگردوں کی فضائیں بدل گئیں، اور جہنمی معاشرہ ہچکولیاں لے کر کس طرح جنتی معاشرہ میں تبدیل ہوگیا؟ ظلم وزیادتیوں کا دورختم ہوکر آسمانی عدل وانصاف کیسے عام ہوا؟ انسانوں کی تبدیلی ایک بڑی بات تھی، جنگل کے خونخوار بھیڑیئے اور درندے ریوڑ کی صفوں میں گھس کر بکریوں کے چیر پھاڑ سے تائب ہوکر ان کے ساتھ گھاس کھانے پر کیسے مجبور ہوگئے؟ اور اپنی فطرت کو بھول گئے، اس کے کیا اسباب تھے؟

اوّل یہ احکم الحاکمین کی حاکیت کا ثبوت واثبات ہو، کہ ﴿تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ﴾ والی صفت کاظہور ہو۔

دوم یہ ﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ﴾[الأنبياء: ۱۰۵] (اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے)۔

سوئم یہ کہ کائنات کے لئے جس ذات اقدس کو مجسم رحمت بنا کر بھیجا گیا، اس کی تعلیمات کے فوائد وثمرات کا ظہور ومشاہدہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کتنی عظیم وبابرکت ہیں، کہ کافروں کی اولاد آپ کی بدولت آسمان کے نورانی فرشتوں کے ساتھ ہمسری کرسکتے ہیں، بلکہ چند قدم ان سے بھی آگے جاسکتے ہیں۔

تیری فیاضی نے ذرّوں کو بنایا آفتاب ☆ بن گئے اونٹوں کے چرواہے زمانے کے امام
جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے ☆ کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کردیا

پس جو مالکُ الملک باشاہوں کا مالک ہے، جس کو چاہے بادشاہت دے، جس سے چاہے بادشاہت چھین لے، وہ اسی طرح مالک مختار ہے، جسے چاہے جنت اور جنتی اعمال عطا کرے، اسی طرح جسے چاہے کندۂ دوزخ بنادے۔ عزّت، ذلت، ایمان، تقویٰ، علم وعمل، رزق وروزی، اولاد، شکل وصورت، خوشحالی، غم، راحت ومصیبت، صحت وتندرستی، الغرض ساری چیزوں کا وہ خالق بھی ہے، مالک بھی ہے۔ اور دینے والا، تقسیم کرنے والا، اور نہ دینے والا بھی ہے، وہ بڑے کریم، جواد، مہربان، غفور، رحیم بھی ہے، اور تمام پاکیزہ صفات سے موصوف بھی ہے، اور تمام عیوب ونقائص، کمزوریوں اور ہر قسم کی بری صفات سے منزہ وپاک، واحد، اکیلا، یکتا، لاشریک ہے، جلّ جلالہ بِيَدِكَ الْخَيْرُ۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ﴾.[یٰس: ۸۳] (پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے)۔ اسی طرح فرمایا: ﴿تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾.

[الملک: ۱] (برکت والی ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں بادشاہت ہے)۔

کفارِ مکہ نے جسارت کر کے کہا تھا: ﴿لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾ [الزخرف: ۳۱]۔ یعنی اگر قرآن کو اترنا ہی تھا تو مکہ یا طائف کے کسی بڑے سردار پر اترا ہوتا، یہ کیسے باور کیا جائے کہ بڑے بڑے دولتمند سرداروں کو چھوڑ کر خدا نے منصبِ رسالت کے لئے ایک ایسے شخص کو چن لیا ہو جو ریاست و دولت کے اعتبار سے کوئی خاص امتیاز نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے ان کے جواب میں ارشاد فرمایا:

﴿اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾۔ [الزخرف: ۳۲] کیا تیرے ربّ کی رحمت کے بانٹنے والے یہ مشرکین ہیں؟ جب ان کی روزیوں تک کے مالک ہم ہیں، جسے چاہیں زیادہ دیں، جسے چاہیں کم دیں، تو پھر ہم پر حکومت کرنے والے یہ کون؟ کہ فلاں کو نبی کیوں نہیں بنایا؟ تو نبوت بھی ہماری ملکیت کی چیز ہے، ہم ہی جانتے ہیں کہ اس کے دیئے جانے کے قابل کون ہے، کیونکہ تمام خیرات اور تمام نعمتوں سے افضل واعلیٰ نعمت منصبِ نبوت ہے، جب ادنیٰ درجے کی خیر وخیرات ہمارے ہی ہاتھ میں ہے، جس کی تقسیم ہم ہی کرتے ہیں، تو نبوت جیسی عظیم نعمت بطریق اولیٰ ہماری ملکیت ہے (خیر وشر اور شر میں خیر کا پہلو)۔

ہر وہ چیز جس میں انسان کے لئے دینی یا دنیوی یا مادی یا روحانی فائدہ وفلاح ہو وہ خیر کہلاتی ہے۔ اس کے برعکس ضرر ونقصان کی چیز شر کہلاتی ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ خیر میں کسی جہت سے شر کا پہلو ہوتا ہے، اسی طرح شر میں کسی اعتبار سے خیر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ البتہ بعض چیزیں ایسی ہیں کہ خیر ہی خیر کہلاتی ہیں، جن میں شر کا پہلو قطعاً نہیں ہوتا، جیسے ایمان اور عملِ صالح وغیرہ۔ اسی طرح کفر ومعاصی وہ امور ہیں جن میں خیر کا پہلو قطعاً نہیں ہوتا، وہ شر ہی شر ہیں۔ انسانی عقل وسوچ اگر چہ ایک حد تک خیر وشر کا تعین کر سکتی ہے، مگر کلی طور پر نہیں۔ ہزاروں خیر کی چیزوں کو انسانوں نے شر خیال کر کے ان سے دور رہے، جیسے کفار، پس وہ ہلاک ہوئے۔ اور ہزاروں شر کی چیزوں کو خیر کہتے ہوئے ان پر عمل پیرا ہو کر تباہ ہوئے۔ تو انسانی عقل خیر وشر اور سعادت وشقاوت کے تعین سے مکمل عاجز ہے۔ پس وحی الٰہی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جو ہر خیر وشر کا مکمل تعین کرتی ہے۔

تو مسلمان قوم اس کی پابند ہے کہ وحی کے خیر پر عمل پیرا ہو، اور شر سے بیزار ہو، تا کہ اسے سعادت دستیاب ہو۔ جبکہ کافر کے لئے سوائے تباہی کے کچھ بھی نہیں۔ قرآن حکیم نے اسی بارے میں فرمایا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَ

اللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾۔[البقرۃ:۲۱۶] (تم پر جنگ کرنا فرض کیا گیا ہے، اور وہ تم پر گراں ہے، اور یہ عین ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو برا سمجھو، حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو، اور اللہ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے)۔

تو آیت کریمہ میں صرف حکومت دینے اور لینے، اسی طرح عزّت وذلّت دینے کا جو ذکر ہو رہا ہے، بظاہر اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ بِیَدِکَ الخیرُ وَالشَّرّ کہا جاتا، مگر اس میں اس اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ ظاہری طور پر دنیا میں جو شرور اور برائیاں نظر آتی ہیں وہ درحقیقت مجموعۂ عالم کے اعتبار سے خیر ہی ہوتی ہیں، جیسے رخسار کا خال اور زلف کا بال کہ تنہا وہ بال کچھ بھی نہیں، اگر فرش پر گرا ہوا ہوگا تو اٹھا کر پھینک دیتے ہیں، مگر یہی بال اگر کھال پر لگے ہوئے ہوں تو رونق، حسن اور خوبصورتی کو دوبالا کرتے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کا ہر کام مجموعۂ عالم کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو خیر ہی نظر آئے گا۔

یا یہ کہا جائے کہ موقع چونکہ خیر مانگنے کا ہے اس لئے خیر کی تخصیص کر دی، جیسے ارشاد ہے: "اَلْخَیْرُ فِی یَدَیْکَ وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ". [الحدیث] اسی میں ادب کا پہلو موجزن ہے۔

﴿تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾ تو داخل کرتا ہے رات کو دن میں، اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں۔ وجود کے بعد سب سے بڑا دائرہ زمانہ اور وقت کا ہے۔ دنیا کی چھوٹی بڑی کوئی بھی چیز اس سے باہر نہیں ہے، اور زمانہ کا تعلق آفتاب کے گرد زمین گردش سے ہے، اس سے دن رات کا فرق، اور ان میں حسب موسم کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ کبھی رات بڑی ہوتی (دن کا کچھ وقت اس میں آجاتا ہے) ہے، اور دن چھوٹے، اور کبھی دن لمبا ہوتا ہے (رات کے چند گھنٹے اس میں آجاتے ہیں) اور رات چھوٹی ہوجاتی ہے، یہی مراد ہے: ﴿يُقَلِّبُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ﴾ سے۔ یہ سب اور سارا نظام ربّ العزّت کے ہاتھ میں ہے، اس تغیر وتبدل کے اتنے بے شمار فوائد ہیں جنہیں انسانی عقل سمجھ نہیں سکتی۔

﴿وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ اور نکالتا ہے زندہ کو مردے سے، اور نکالتا ہے مردے کو زندہ سے۔ نطفہ امشاج سے انسان، اور انڈے سے چوزہ، بیج اور دانہ سے سرسبز درخت، اور طرح طرح کے پھول، اور پھر زندہ انسان سے بے جان نطفہ، اور مرغی سے مردہ انڈا، درخت اور سرسبز کھیت سے دانہ وبیج۔ اسی طرح موت وحیات کو اگر صفات واوصاف تک عام کیا جائے تو مسلمان سے کافر، جیسے نوح سے کنعان، اور کافر سے

مسلمان، جیسے مشرکین مکہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، جاہل سے عالم، اور عالم سے جاہل، علیٰ هذا القیاس۔

یہ سب حضرت حق سبحانہ کے عجائبات اور قدرتی کرشمے ہیں، اور اس کی تخلیق کی حکمتیں اور نمونے ہیں۔ درخت سبز ہے، پھل رنگدار، اور پھول مختلف رنگوں میں۔

اسپین، یورپ وغیرہ میں ایسے درخت اور بوٹیاں موجود ہیں جن میں کچھ پھول سفید، کچھ سبز، اسی طرح چھ سات رنگوں کے پھول ایک درخت پر لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ ﴿وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ﴾. [لقمان:۲۷] یعنی اگر تمام دنیا کے درختوں کو تراش کر قلم بنالیں، اور موجودہ سمندر کی سیاہی تیار کی جائے، پھر پیچھے سے سات سمندر اور اس کی کمک پر آجائیں، اور فرض کرو تمام مخلوق اپنی اپنی بساط کے موافق لکھنا شروع کرے، لکھنے والوں کی عمریں تمام ہوجائیں گی، قلم گھس گھس کر ٹوٹ جائیں گے، سیاہی ختم ہوجائے گی، مگر اللہ تعالیٰ کی تعریفیں، کمالات اور اس کی قدرت کے مظاہر و خوبیاں ختم نہ ہوں گی۔ سبحان اللہ وبحمدہ

﴿وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ تو روزی دیتا ہے جس کو چاہے بغیر حساب کے، بعض کو آسانی کے ساتھ بغیر مشقت کے، بعض کو مشقت و محنت کے بعد، اور بعض کو اتنی روزی دیتے ہو جو شمار سے باہر ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اتنی روزی دیدی جس کا حساب اور اندازہ نہیں ہوا۔ ابھی ہمارے زمانہ میں بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جنہیں اپنے سرمایہ کا حساب معلوم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہرگز کوئی باز پرس نہیں ہوگی، وہ مالک مختار ہے، اپنی حکمت کے تحت جو فیصلہ کرے یہ اس کی شان و حکمت ہے۔ فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ﴾ [الرعد: ۲۶] (اللہ رزق کشادہ کردیتا ہے جس کے لئے چاہے، اور تنگ کردیتا ہے)۔

یہی سلسلہ اولاد کا بھی ہے۔ کہیں درجنوں بچوں کا مظاہرہ ہے، کہیں دیکھو ایک اکلوتا بیٹا ہے، کہیں وہ ایک بھی نہیں۔ فرمایا: ﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۭ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۝ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝﴾ [الشوریٰ: ۵۰] (اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی سلطنت، وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، وہ جس کو چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے۔ یا پھر ان کو ملا جلا کر لڑکے بھی دیتا اور لڑکیاں بھی، اور جس کو چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے۔ یقیناً وہ علم والا ہے، قدرت والا ہے)۔

ے تو وہ مالک ہے کہ جو چاہے کرے ☆ جس کو چاہے دے، جسے چاہے نہ دے

علماء کرام نے فرمایا کہ اس آیت کی تلاوت کے بعد فوراً یہ دعاء کہو: اَللّٰھُمَّ یَامَالِکَ الْمُلْکِ اُرْزُقْنَا بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ آمین۔

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاِلَی اللّٰهِ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸﴾ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَیَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۹﴾ یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۖۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَهَا وَبَیْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِیْدًا ؕ وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾

ترجمہ: مؤمن کافروں کو دوست نہ بنائیں سوائے مؤمنوں کے، اور جو شخص ایسا کرے پس نہیں ہے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کسی چیز میں، مگر یہ کہ تم ان کافروں کے شر سے بچاؤ اختیار کرو، اور ڈراتا ہے اللہ تعالیٰ تم کو اپنے آپ سے، اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔﴿۲۸﴾ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے: اگر تم چھپاؤ اس چیز کو جو تمہارے سینوں میں ہے، یا اس کو ظاہر کرو، ہر حال میں اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے، اور وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔﴿۲۹﴾ جس دن حاضر پائے گا اپنے سامنے ہر ایک نفس جو کچھ اس نے عمل کیا ہے نیکی سے، اور جو اس نے برائی کی ہے اس کو بھی اپنے سامنے حاضر پائے گا، پسند کرے گا کاش اس کے اور برائی کے درمیان بہت دور کا فاصلہ ہوتا، اور اللہ تعالیٰ تم کو ڈراتا ہے اپنے آپ سے، اور اللہ تعالیٰ شفقت کرنے والا ہے بندوں کے ساتھ ﴿۳۰﴾

معارف ومنازل

ان آیات کا ربط وتعلق گزشتہ آیات ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ کے ساتھ ہے۔ یعنی اسلام اور اس کے ماننے والے لوگ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ ہیں، جبکہ کفر اور کفر کرنے والے لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ پس مسلمانوں کو حکم ہے کہ پسندیدہ لوگ مسلمانوں سے محبت کریں، اور ناپسندیدہ کافروں کی محبت ومولات سے

کلیۃً اجتناب کریں۔ اور متصل آیت قُلِ اللّٰھُمَّ کے بموجب مالکُ الملک عزّ شانہ کے حاکمانہ حکم پر عمل کرتے رہیں، اوراس کے دشمنوں سے محبت نہ کریں۔

اس مضمون، یعنی ترکِ موالات مع الکفار کی آیات قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مختلف عنوانات کے ساتھ بکثرت آئی ہیں، مثلاً: ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَاۗءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [المائدة: ۵۱] (اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو یارومددگار نہ بناؤ، یہ خود ہی ایک دوسرے کے یارومددگار ہیں، اورتم میں سے جو شخص ان کی دستی کا دم بھرے گا تو پھر وہ انہی میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا)۔ ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا﴾ [آل عمران: ۱۱۸] (اے ایمان والو! اپنے علاوہ کسی شخص کو راز دار نہ بناؤ)۔ ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَاۗءَ﴾ [الممتحنة: ۱] (اے ایمان والو! میرے دشمن اور تمہارے دشمن کو دوست مت بناؤ)۔ ﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَاۗدُّوْنَ مَنْ حَاۗدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَاۗءَهُمْ اَوْ اَبْنَاۗءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ﴾ [المجادلة: ۲۲]۔ (جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، ان کوتم ایسا نہیں پاؤ گے کہ وہ ان سے دوستی رکھتے ہوں جنہوں نے اللہ اوراس کے رسول کی مخالفت کی ہے، اگرچہ وہ ان کے باپ ہوں، یا ان کے بیٹے، یا ان کے بھائی، یا ان کے خاندان والے)۔

ان آیات کو دیکھ کر حقیقتِ حال سے ناواقف لوگوں کو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ اسلام میں غیر مسلموں کے ساتھ کسی قسم کا علاقہ اور تعلق رکھنے کی بھی اجازت نہیں ہے، اوران کے ساتھ حسنِ اخلاق اور رواداری کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن دوسری طرف اس کے بالمقابل جب قرآن کریم کی بہت سی آیات سے اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعامل اور برتاؤ سے غیر مسلموں کے ساتھ احسان وسلوک اور غمخواری وہمدردی کے واقعات اور احکام ایسے ایسے ثابت ہیں جن کی مثالیں دنیا کی دیگر اقوام میں ملنی مشکل ہے۔ پس ان دونوں متضاد اور مختلف پہلوؤں کو دیکھ کر حقیقتِ حال سے بے خبر لوگوں کو تضاد اور تعارض معلوم ہونے لگتا ہے۔

اسی طرح غیر مسلموں کو بھی ایک حیرانی ہوتی ہے، کہ مسلمانوں کے مذہب میں ہمارے لئے تعلق اور رواداری کا کوئی گوشہ نہیں ہے، اس پر وہ مزید اسلام سے دور ہوجاتے ہیں۔

پس اگر قرآن مجید کی مذکورہ آیات، اور اس سلسلہ میں مختلف احادیث اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل، اور ان کے واقعات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے، تو نہ غیر مسلموں کو شکایت پیدا ہوگی، اور نہ آیات اور احادیث میں کوئی تعارض باقی رہے گا، کیونکہ غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی متعدد انواع اور مختلف اقسام ہیں، جن میں سے ہر ایک کا محمل الگ ہے، اور وہ سرسری نظر میں چار اقسام ہیں، جن میں سے کچھ ممنوع اور بعض جائز ہیں۔

جب جواز وعدم جواز میں موضوع ایک نہ ہوا، تو تعارض رفع ہو کر گرد وغبار صاف ہو جائیں گے۔ تعارض کے لئے وحدتِ موضوع شرط ہے، جو کہ یہاں موجود نہیں ہے۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان ظاہری وباطنی قلبی اور دلی موالات اور محبت ہو۔ یہ مودّت کا اعلیٰ درجہ ہوگا، جو کہ مؤمنین کے ساتھ مخصوص ہے، غیر مسلم کے ساتھ مؤمن کا یہ تعلق کسی حال میں قطعاً جائز نہیں ہے۔ اور زیرِ نظر آیت کریمہ میں یہی مراد ہے، اور اسی کی ممانعت ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ قلبی اور دلی محبت مت رکھو۔

دوسرا درجہ مؤاسات ولحاظ والا ہے، جس کے معنی ہیں: ہمدردی وخیر خواہی، اور نفع رسانی۔ یہ بجز اہلِ حرب کفار کے، کہ وہ دشمنی میں پیش پیش ہیں، دیگر سب غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ﴾[الممتحنة:۸] یعنی اللہ تعالیٰ تم کو منع نہیں کرتا کہ تم ان کفار کے ساتھ احسان وخیر خواہی اور انصاف کا سلوک کرو جو تم سے نہیں لڑتے، اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ بلاشک تم ایسے لوگوں سے ہمدردی وغیرہ کر سکتے ہو۔

تیسرا درجہ مدارات کا ہے، جس کے معنی ہیں: ظاہری خوش خُلقی، اور علیک سلیک، اور دوستانہ برتاؤ۔ یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، کیونکہ مسلمان کی صفت یہی ہے کہ وہ ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئے، اگرچہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو۔ بسا اوقات ایسے اخلاقِ فاضلہ اور مدارات غیر مسلموں کے ایمان وہدایت کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ حضرت سید عطاء اللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ جیل سے رہا ہو کر گھر تشریف لائے، گھر کے صحن میں چند احباب کے ساتھ بیٹھے رہے، ادھر سے دوپہر کا کھانا حاضر ہوا، ہاتھ دھو کر سب کھانے پر بیٹھ گئے۔ عین اسی وقت عیسائی خاکروب صفائی کے لئے گھر کے دروازے پر پہنچا، شاہ صاحبؒ نے فرمایا: جمعدار کھانا تیار ہے، پہلے آ کر ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ، پھر صفائی کرو، جمعدار پر یہ بات گراں گزری، اور پریشان ہوا، کہنے لگا: شاہ جی! میں کیسے آپ کے دسترخوان

پر بیٹھ کر کھانا کھاؤں؟ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بھائی کیوں شرم کرتے ہو؟ تم بھی ہماری طرح کے انسان ہو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس پر جمعدار نے کہا: شاہ جی صاحب! میں آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہونا چاہتا ہوں، پہلے مجھے مسلمان کرو، پھر کھانا کھلاؤ۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مسلمان بنایا، پھر ہاتھ دھلا کر کھانا کھلایا، کھانے سے فارغ ہو کر اجازت چاہی، اور وہاں سے نکل کر سیدھا گھر پہنچا، بیوی اور بچوں کو غسل دے کر ظہر کی نماز سے پہلے پورے خاندان کے ساتھ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے، اور پورے خاندان کے ساتھ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، اور شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کے طفیل دوزخ سے نجات پائی۔ [سوانح امیر شریعت] شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کو "امیر شریعت" کا لقب حضرت الحجۃ محدث کبیر سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف عطا ہوا تھا۔

اگر کوئی غیر مسلم مہمان بن کر آئے، تو ابراہیمی سنت یہی ہے کہ مدارات کے ساتھ حوصلہ افزائی کی بنیاد پر اس کی خدمت بجالائی جائے۔ اگر غیر مسلموں کے ضرر اور شر سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو تو سورت آل عمران کی یہی آیت مذکورہ میں: ﴿اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً﴾ سے یہی درجہ مدارات کا مراد ہے۔ یعنی کافروں سے موالات جائز نہیں ہے، مگر ایسی حالت میں جبکہ تم ان سے اپنا بچاؤ کرنا چاہو، اور چونکہ مدارات میں بھی صورت موالات کی ہوتی ہے، اس لئے اس کو موالات سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ [معارف القرآن، مع اضافات]

چوتھا درجہ معاملات کا ہے، کہ ان سے تجارت یا اُجرت و ملازمت اور صنعت و حرفت کے معاملات کئے جائیں۔ یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، بجز ایسی حالت کے کہ ان معاملات سے عام مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تعامل اس پر شاہد ہے۔ فقہاء کرامؒ نے اسی بناء پر کفار اہل حرب کے ساتھ اسلحہ فروخت کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے، کہ اس میں عام مسلمانوں کا نقصان ہے۔ اس کے علاوہ تجارت، مزدوری، ملازمت وغیرہ سب جائز ہیں۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سارے جہاں کے لئے رحمۃ للعلمین بن کر آئے، آپؐ نے غیر مسلموں کے ساتھ جو احسان و ہمدردی اور خوش خُلقی کے معاملات کئے جن کی مثال نہیں ہے، اور اپنے جانی دشمنوں سے کبھی انتقام نہیں لیا۔ خیبر کے موقع پر جس یہودی عورت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے میں زہر ملایا تھا، اس کو معافی دے دی، پھر جب ایک شخص کی اس زہر کے اثر سے موت واقع ہوئی تو قصاص کا حکم صادر فرمایا۔ لبید بن اعصم اور اس کی بیٹیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت جادو سے مارنا چاہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان کے اقرار کے بعد معافی دے دی۔

رئیس المنافقین ابی بن سلول نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگا کر محض آپ علیہ السلام کو نہیں، بلکہ مدینہ کے سارے مسلمانوں میں افراتفری اور پریشانی پھیلائی، اوراس کے علاوہ یہ شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دینی پروگرام کے خلاف اتنی زہرافشانی اور مخالفت کی جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف انہیں معاف نہیں کیا، بلکہ اس کا جنازہ بھی پڑھایا، اور کفن کے طور پر اپنی قمیص مبارک اسے پہنائی۔ اس کے علاوہ سیکڑوں واقعات ایسے ہیں جن کو دیکھ اور سن کر ہر شخص بلاتردد یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بالیقین رحمۃ للعلمین کے عالی منصب پر فائز تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ قیامت کے روز سب سے بڑا عذب اس شخص کو ہوگا جس نے کسی پیغمبر کو شہید کیا ہو، یا پیغمبر کے ہاتھ سے مارا گیا ہو۔ اس بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کافر کے مارنے اور قتل کرنے سے باز رہتے، تا کہ اس کو سخت عذاب نہ ہو۔ پورے غزوات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کو اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا، صرف غزوہ اُحد میں جب اُبَیّ بن خلف آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ہٹانا چاہا، مگر وہ ضد پر اتر آیا، تب مجبوراً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تلوار کی نوک سے معمولی مارا، وہ چیختا ہوا بھاگ گیا، اور اپنے ساتھیوں کے پاس واویلا کرتا ہوا پہنچ گیا، لوگوں نے اسے تسلی دی کہ یہ معمولی زخم ہے، تجھے کچھ نہیں ہوگا، وہ کہنے لگا: یہ میری موت کا پیغام ہے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ کا زخم ٹھیک نہیں ہوتا، وہ روتا ہوا واصلِ جہنم ہوا۔

دنیا کے حکمران جب کسی شہر کو فتح کرتے ہیں تو وہاں قتلِ عام کا راج ہوتا ہے، لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ فتح فرمایا تو اعلان کیا: خبردار کسی کو قتل نہ کرو، جانوروں تک کو بھی تحفظ دے دو، کسی کی بے حرمتی اور بے عزتی نہ کرو۔ جب فتح مکمل ہوگئی، اور وہ ہزاروں لوگ جو اکیس سال سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پریشانی کا باعث بنے رہے، اور کسی قسم کی ظلم وزیادتی سے باز نہیں آئے، دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام جانی، مالی، دینی دشمنوں کے لئے عام معافی کا اعلان کیا، اور ان کے تمام ماضی وحال کی زیادتیوں کو معاف فرما کر مزید انعام واکرام سے نوازا۔ غیر مسلم جنگی قیدیوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنے احسانات کئے جن کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔

جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارحم الراحمین ربّ تعالیٰ کی نوازشات دوست ودشمن سب پر برابر جاری رہتی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نوازشات کا بھی یہی عالم ہوتا تھا۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور آپ

صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ اصحاب رضی اللہ عنہم نے ہر موقع وہر محاذ پر ایسے ایسے زرین کارنامے انجام دیئے، اور ایسے ایسے نقوش رقم کئے کہ ماضی وحال اور مستقبل کے تمام بادشاہوں اور حکمرانوں کے ہاتھ اور دامن ان اقدار ومراعات سے یکسر خالی ہیں، اور قیامت تک سوائے حضرت مسیح علیہ السلام کے دوسرا کوئی اس کی نظیر نہیں پیش کر سکے گا۔

اس توضیح وتشریح سے یہ معلوم ہوگیا کہ اسلام میں غیر مسلموں کے ساتھ کتنی رواداری اور حسنِ سلوک کی تعلیم ہے؟ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آیات واحادیث میں کسی قسم کا تعارض نہیں ہے، اور جس موالات ومودّت سے غیر مسلموں کے ساتھ روکا گیا ہے وہ صرف حقیقی اور دلی وقلبی محبت ہے، نہ کوئی اور۔

کفار اور غیر مسلموں کے ساتھ محبت قطعاً حرام ہے:

قرآن کریم نے غیر مسلموں سے موالات اور قلبی دوستی ومحبت کو اتنی شدت کے ساتھ کیوں ممنوع قرار دیا کہ وہ کسی حال میں کسی غیر مسلم کے ساتھ محبت قلبی کو جائز قرار نہیں دیا؟ اور یہ حکم جاری فرمایا کہ: ﴿فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيْءٍ﴾ یعنی جو کافروں سے دوستی کرے گا، وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کسی چیز میں نہیں ہوگا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا دین اور مذہب ہرگز قابلِ اعتبار نہیں ہوگا، اور وہ مسلمان انہی کافروں میں شمار ہوگا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم نے تصریح کردی:

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرۃ:۹۸] (بیشک اللہ کافروں کا دشمن ہے)۔ ﴿ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ﴾ [فصلت:۲۸] (یہ اللہ کے دشمنوں کی سزاء ہے، یعنی آگ)۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کے نزدیک کفر اور کافر دونوں ناپسندیدہ اور اللہ تعالیٰ کے دشمن قرار پائے، اور دوسری طرف ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾۔ [البقرۃ:۲۵۷] (اللہ دوست ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے، ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا)۔ اور ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾۔ [آل عمران:۱۹] (اور بیشک دین اللہ کے ہاں اسلام ہی ہے)۔ ﴿وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾۔ [المائدۃ:۳] (اور میں نے تمہارے لئے اسلام کو پسند کیا ہے بطورِ دین)۔

تو اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین اسلام اور مسلمان ہوئے، تو مسلمان کے لئے ہرگز گنجائش نہیں ہوگی کہ وہ خدا کا دوست ہو کر اس کے بدخواہوں اور دشمنوں کے ساتھ محبت کرے، ورنہ وہ خدا تعالیٰ کی دوستی اور پسندیدگی سے خارج ہو کر اس کے دشمنوں میں شامل رہے گا۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ کوئی شخص اپنے مخلص دوست کے دشمنوں کے ساتھ محبت نہیں کرتا، بصورتِ دیگر دوست کے ساتھ اس کی دوستی برقرار نہیں رہ سکتی۔ اس کے علاوہ جب کوئی اپنے بیٹے، باپ، بھائی کے دشمنوں کے ساتھ دوستی کرنے پر تیار نہیں، تو یہ کیسا مسلمان ہے کہ اپنے ربّ عزّ شانہ، اپنے نبی ﷺ، اپنی ملّت، اور اپنے بھائی مسلمانوں کے دشمن غیر مسلموں کے ساتھ دوستی کرے؟ جس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ ان سب سے منقطع اور دور ہوگیا۔

پس اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک ایسے برائے نام مسلمانوں کے ایمان ومذہب کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔ ﴿وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ﴾ [المائدة: ۵۱] (جو ان سے دوستی کرے گا تم میں سے وہ انہی میں سے ہوگا) یا اَلْمَرْأُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ کے بموجب اس کا شمار کافروں میں ہوگا، اور اسلام کو ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں ہوگی۔ پس مسلمان یا تو سراپا خداوند تعالیٰ کا رہے، یا اس کے دشمنوں کی گود میں جا کر ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

بعض مفسرین نے ایک اور وجہ کا اضافہ کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اسلام قبول کرنے اور صحیح مسلمان ہونے کے لئے شرط ہے کہ کفر اور کفار سے مکمل بیزاری ہو، پس اگر کسی نے کفار کے ساتھ محبت قلبی اور دوستی کا ثبوت دیا تو یہ رضاء بالکفر وبالکفار کا مرتکب ہوگیا، وَإِذَافَاتَ الشَّرْطُ (بَرَاءَةٌ عَنِ الْكُفْرِ) فَاتَ الْمَشْرُوطُ (قبولیت اسلام) یہ بہت اچھی توجیہ ہے، اور اسلام کا یہی تقاضا مُسلّم ہے کہ کفر وکفار سے مکمل بیزاری ہو تا کہ دوستی کی صورت میں عقائد و اعمال خراب نہ ہوں، جس طرح کافرہ عورتوں سے نکاح جائز نہیں، اس کی وجہ بھی یہی ہے، کیونکہ ایسی دوستی میں اتباعِ نفس اور اتباعِ شیطان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔

دوستی اور دشمنی میں اللہ تعالیٰ کی رضا ضروری ہے:

مسلمانوں پر لازم ہے کہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے دوستی اور دشمنی کریں۔ ایمان کا ایک عظیم الشان دروازہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سید کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ. [متفق علیہ] آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہوگی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی مروی ہے، صیغۂ خطاب کے ساتھ، یعنی تو اسی کے ساتھ ہوگا جس سے تجھے محبت ہوگی۔ [متفق علیہ] حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سید کائنات ﷺ نے فرمایا: نیک ہم نشین کی مثال ایسی ہے جیسے مشک فروخت کرنے والا، اور برے ہم نشین کی مثال ایسی ہے جیسے بھٹی دھونکنے والا لوہار۔ مشک رکھنے والا یا تو تجھے مفت میں مشک دے گا، یا تو اس سے

مشک خرید لے گا، اگر یہ دونوں نہ ہوں تو خوشبو بہر حال تجھے پہنچ جائے گی۔ اور بھٹی والا تیرے کپڑوں کو جلائے گا، یا کم سے کم تجھے بدبو ضرور آئے گی۔ [متفق علیہ]

جَلِیس صَالِح کو عطار سے تشبیہ ہے، کہ بمنزلہ مسلمان کے موالات کی ہے۔ جَلِیس سُوء کو لوہار کے ساتھ تشبیہ ہے کہ کافر کی مانند ہے، جس کے موالات کا نتیجہ سوائے نقصان کے کچھ نہیں ہوگا۔ وَعَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ قَالَ: "ثَلٰثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْأَ لَا يُحِبُّهٗ إِلَّا لِلّٰهِ وَأَنْ يَكْرَهَ أَنْ يَعُوْدَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ"۔ [بخاری] حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ محبت فی اللہ اور بغض فی اللہ، اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے محبوب اور پسندیدہ عمل ہے۔ [احمد رحمۃ اللہ علیہ، بیہقی رحمۃ اللہ علیہ شعب الایمان و بوداؤد رحمۃ اللہ علیہ]

﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ﴾ تا ﴿وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۲۸﴾ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ کافروں کو دوست نہ بنائیں، مسلمانوں کو چھوڑ کر، یہ سراسر اسلامی اقدار کے خلاف ہے، اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے ساتھ دوستی اللہ تعالیٰ کے ساتھ دشمنی کے مترادف ہے، اور جو کوئی یہ کام کرے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مگر یہ ایک صورت بجبوری جائز ہے، کہ اگر تم کافروں کے شر سے بچنا چاہو، کسی خاص بچاؤ کے ذریعہ سے تو اس صورت میں بھی بقدرِ ضرورت صرف ظاہری دوستی کی اجازت ہوگی، نہ کہ قلبی اور دلی محبت، اور یہ صرف دفعِ ضرر اور دفعِ شر کیلئے۔ اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ کافروں سے دوستی اللہ تعالیٰ کے ذاتی قہر و غضب کا موجب ہوگی، اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانا ہے، اور ہر ظاہری و باطنی عمل کا جواب دینا ہے۔

﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ تا ﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۳۰﴾ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ تم کافروں کی محبت خواہ اپنے دل اور سینوں میں چھپاؤ، یا اسے اپنے قول و فعل سے ظاہر کرو، تو خوب سمجھ لو! اللہ تعالیٰ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے، وہ تمہارے معاملات سے باخبر ہے، اس کے نزدیک ظاہر و باطن سب برابر ہیں، کائنات کا کوئی راز اور ذرّہ اس سے مخفی نہیں ہے، اور وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہو یا زمین میں ہو۔ سات سمندروں کے نیچے ریت پر چلنے والی چیونٹیوں کے پاؤں کی حرکت سے بھی باخبر ہے، اور ان کی آواز سنتا ہے۔ اَلَّذِيْ يَسْمَعُ دَبِيْبَ النَّمْلَةِ تَحْتَ ظُلُمٰتِ الْبِحَارِ۔ اور علمِ محیط کے ساتھ وہ ہر چیز

پر قدرت کا مالک بھی ہے، کوئی چیز نہ اس کے علم سے باہر ہے، نہ اس کی قدرت وگرفت سے۔ اور تم اس دن کے حساب وکتاب سے ڈرو کہ جس روز ہر نفس اپنے نیک وبداعمال کو اس کی اصلی شکل میں اپنے سامنے حاضر پائے گا۔

دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا﴾. [الکہف: ۴۹] (اور جو عمل انہوں نے کیا تھا اس کو اپنے سامنے حاضر پایا، اور تیرا ربّ کسی پر ظلم نہیں کرتا)۔ ارشاد ہے: ﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝﴾. [القیمة] (بلکہ انسان خود اپنے آپ سے اچھی طرح واقف ہوگا۔ چاہے وہ کتنے بہانے بنائے)

جب یہ سارے اعمال اپنی شکل میں آمنے سامنے ہوں گے، تو یہ انسان شرمندگی وندامت کے عالم میں یہ تمنا کرے گا کہ کاش میرے اور میرے برے اعمال کے درمیان ایک طویل اور دور دراز مسافت حائل ہوتی، اور ہم ایک دوسرے کو نہ پاتے نہ دیکھتے، اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنے قہر وجلال سے ڈراتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بندوں پر بڑا مہربان ہے، اگر اس کی رحمت کے تقاضوں کو کوئی پورا کرے تو اس کی سعادت ہوگی، نہیں تو شقاوت ہی ہوگی۔

آیت کریمہ ﴿اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً﴾ سے شیعہ روافض نے اپنے لئے تقیہ کا اثبات اخذ کیا ہے، جو کہتے ہیں: لَا إِيْمَانَ لِمَنْ لَا تَقِيَّةَ لَهُ. یہ ان کا خانہ زاد عقیدہ ہے، جو کہ باطل ہے، کیونکہ آیت کریمہ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں تو اندیشۂ ضرر ونقصان کے وقت دوستی کے ظاہری اظہار کی رخصت دی جارہی ہے، اور شیعوں کے تقیہ میں کفر کا اظہا اور ایمان کا اخفاء ہوتا ہے، حتی کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی، اور ان کے آپس میں بھی، جو کہ صریح جھوٹ اور دھوکہ ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ابتداء اسلام میں جب اسلام کا استحکام نہیں ہوا تھا، تو مجبوری کی خاطر تقیہ جائز تھا، لیکن اب وہ حالات نہیں رہے، تو مسلمانوں کیلئے دشمن سے تقیہ کرنا جائز نہیں ہے۔

……❁……❁……❁……

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۲

ترجمہ: اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے: اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میرا اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگے گا، اور تمہارے گناہ معاف کردے گا، اور اللہ تعالیٰ بہت بخشش کرنے والا، بہت ہی مہربان

ہے۔(۳۱) آپ کہہ دیجئے: اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی، اور اطاعت کرو رسول کی، اور اگر تم اعراض کرو گے تو بیشک اللہ تعالیٰ کفر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا(۳۲)

معارف ومنازل

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ اور ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے کہا: یارسول اللہ! خدا کی قسم ہم اپنے ربّ سے محبت رکھتے ہیں، اس پر ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ﴾ آیت کا نزول ہوا۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ اور محمد بن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن جعفر بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ نجران کے وفد نے کہا تھا کہ ہم حضرت مسیح علیہ السلام کی عبادت اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے کرتے ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آیت کا نزول یہود ونصاریٰ کے حق میں ہوا تھا، کیونکہ انہوں نے کہا تھا: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ [المائدۃ: ۱۸] (ہم خدا تعالیٰ کے بیٹے اور پیارے ہیں)۔ [مظهري]

اسی طرح مشرکینِ قریش نے بھی کہا تھا کہ ہم بتوں کی پوجا اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے کرتے ہیں، تاکہ یہ ہم کو خدا تعالیٰ کے قرب تک پہنچادیں، اس پر یہ آیت اتری۔ رواہ ضحاک عن ابن عباس۔ [مظهري]

ان تمام اقوال کا مآل ایک ہی ہے، کیونکہ کسی آیت کے نزول کا سبب کبھی ایک ہوتا ہے، کبھی متعدد اسباب کے تحت آیت کا نزول ہوتا ہے، لہٰذا کوئی مناقشہ نہیں ہے۔

محبت کا مفہوم اور خلاصہ:

مُحِبّ (عاشق) کے دل میں محبوب (معشوق) کا خیال واشتیاق کا پیدا ہونا، اور ایسا گہرا استغراق ہونا کہ کسی اور کی طرف توجہ نہ رہے، اور کسی وقت بھی محبوب سے استغناء نہ ہو، اور دست بکار دل بہ یار، کسی شغل ومشغلہ میں محبوب کے تصور سے قلب بیگانہ نہ ہو، یہی مطلب ہے اس قول کا کہ عشق دل کی آگ ہے، جو محبوب کے سوا ہر چیز کو جلا کر راکھ کردیتی ہے۔ گویا کہ مُحِبّ کی نظر میں محبوب کے علاوہ کوئی چیز موجود ہی نہیں ہوتی، یہاں تک کہ اس کو اپنی ہستی بھی نظر نہیں آتی، وہ صرف تصورِ محبوب میں فنا ہوتا ہے۔ اوپر، نیچے دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، جہاتِ ستہ میں اسے صرف محبوب کا عکس ہی نظر آتا ہے۔ سچے عشق کی یہی حقیقت ہوتی ہے، اور وہ محبوب کی ہر اداء اور ہر چیز پر جان دینے کو بخوشی قبول کرتا ہے۔ وہ طبعاً اسی چیز کو پسند کرتا ہے جو محبوب کی پسندیدہ ہو، اور جس چیز سے محبوب کو نفرت ہو اس سے نفرت کرتا ہے۔

عاشقی چیست ، بگو بندۂ جانان بودن ☆ دل بدست دگرے دادن وحیران بودن

أَمُرُّ عَلَى الدِّيَارِ دِيَارِ لَيلَىٰ ★ أُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارِ وَ ذَا الْجِدَارَا

وَمَا حُبُّ الدِّيَارِ شَغَفْنَ قَلْبِي ★ وَلٰكِنْ حُبُّ مَنْ سَكَنَ الدِّيَارَا

پائے سگ بوسید مجنوں خلق گفتہ این چہ بود ☆ گفت این سگ گاہ بگاہ در کوئے لیلیٰ رفتہ بود

یہ مختصر خلاصہ عشقِ مجازی کا ہوا۔ عشقِ حقیقی کا خلاصہ اتنا مشکل اور پیچیدہ ہے جو لوگوں کی عقل وسوچ کی رسائی سے بہت ہی بلند ہے۔ اور اس کی شرائط ہر آدمی کیا، خواص کے بھی دسترس سے بالاتر ہیں۔ ایک نابالغ بچے کے سامنے بیوی بچوں کے فوائد وثمرات بیان کرنا، جس طرح عبث ہے، اسی طرح ہر کس وناکس کے سامنے محبتِ الٰہی اور عشقِ حقیقی کے حقائق اور فوائد بیان کرنا، اس سے کہیں زیادہ عبث اور بے فائدہ ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جس تک رسائی اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اس کی تہہ تک پہنچنا صرف انبیاء کرام علیہم السلام کا مشغلہ ہے، اور اس کی پہلی شرط لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہے، کہ جہاتِ ستہ میں جدھر نظر گھماؤ تو غیر اللہ، بلکہ اپنے وجود تک کی نفی ہو۔

فنا فی اللہ کی تہہ میں بقا کا راز مضمر ہے ☆ جسے مرنا نہیں آتا اُسے جینا نہیں آتا

کَالْمَيِّتِ فِي يَدِ الْغَسَّالِ بن کر اپنے کو مردوں میں شمار کرنا کچھ آسان بات ہے؟ ہر گز نہیں!!

جو شخص خود کو موجودات کا حصہ سمجھتا ہے، وہ اس مقام تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس مقام تک رسائی کی اوّلین شرط ترکِ دُنیا وَمَافیھا ہے، تب ہی آدمی کا شمار بالغوں میں ہو جاتا ہے، چونکہ اس کا تعلق قلب وباطن کے ساتھ ہے، اور ظاہری سارے اعضاء اور اعضاء کے اعمال وحرکات باطن پر گواہ بنتے ہیں، اسی کی طلب اور فرمائش ہو رہی ہے کہ محبتِ الٰہی کے دعویٰ پر گواہ پیش کیا جائے، وہ ہے: فَاتَّبِعُونِي کہ اتباعِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر کسی کا بہر قدم صفت وشیوہ ہو، تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ شخص اپنے دعویٰ میں صادق ہے، اور محبتِ الٰہی کے ذرّات میں سے ایک ذرّہ کا ستر واں حصہ اسے دستیاب ہوا ہے۔ (حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ) اگر کسی کی زندگی میں کسی ایک سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کمی ہو تو سمجھو کہ لاف زنی اور جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اَلرِّجَالُ بِالْحَقِّ لَا الْحَقُّ بِالرِّجَالِ۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کیلئے ایک صحابیہ عورت نے قمیص بنا کر بھیجی، جمعے کے روز اسے پہن کر دیکھا کہ اس کی آستین بڑی لمبی ہیں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا: بیٹا چھری لاؤ، اسے کاٹ کر سنت کے مطابق بناؤں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بجائے چاقو کے قینچی حاضر کی کہ اس کی کٹائی برابر ہوتی ہے، کہنے لگے: عمر کون ہوتا ہے کہ سردار عالم

صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف عمل کرے، بیٹا قینچی کو واپس کرو۔ ایک دفعہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص کی آستین اسی طرح لمبی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھری سے کاٹنے کا حکم دیا۔ اب میں خلافِ سنت کیسے قینچی کو استعمال کرسکتا ہوں؟ [سیرت فاروق]

تو ارشاد ہوا: ﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي﴾ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو، یا محبت کے مدعی ہو تو تمہاری کیفیتِ باطنی کیلئے میرا اتباع بمنزلہ شاہد و گواہ کے ہے، پس اثباتِ دعویٰ کے لئے ضروری ہے کہ تمام امور میں میری پیروی اور اتباع کرو، اسی کی بدولت تمہیں حضرت حق سبحانہ کی محبت حاصل رہے گی، جس کے ذریعہ تمہارے گناہ معاف ہو جائیں گے، اور قرب کا مقام تمہیں نصیب ہوگا، اور تمہارے درجات بلند ہو جائیں گے۔

بہر حال! محبتِ صادقہ کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ مُحِبِّ صادق محبوب کی مرضی کا طلبگار رہتا ہے، اور اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا، اور جو چیز محبوب کی نظر اور خیال میں ناپسندیدہ ہو مُحِبِّ صادق اس سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔

اب محبوبِ حقیقی جل شانہ کی مرضی اور غیر مرضی کو معلوم کرنے میں عقل و قیاس کو کوئی دخل نہیں، اور نہ ہی یہ چیزیں ہماری رائے سے معلوم ہوسکتی ہیں، کوئی شخص اپنی عقل و رائے سے ہرگز معلوم نہیں کرسکتا کہ یہ چیز اور یہ بات محبوبِ حقیقی کے نزدیک پسندیدہ ہے، اور کونسی بات ناپسندیدہ ہے۔ تو یہ امر موقوف ہے ذات اقدس جناب حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پر، اس لئے فرمایا: جو لوگ محبوبِ حقیقی کی محبت کے مدعی ہیں، ان کو میری اتباع لازم ہے، اگر میری اتباع نہیں کریں گے تو وہ اپنے دعوؤں میں جھوٹے اور کذاب ہوں گے، کیونکہ محبت کا سب سے بڑا کام رضائے الٰہی کی تحصیل اور اس کی ناراضی سے بچنا ہے، اور یہ بات میری اتباع کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ جب تم ہر معاملہ میں میری پیروی کرو گے، تو اللہ تعالیٰ اپنی خاص توجہ سے تمہیں بہرہ مند فرمائے گا، جس کو اللہ تعالیٰ نے محبت سے تعبیر فرمایا ہے، تو یہ حصولِ محبتِ الٰہی، اور اس کی محبت تمہارے حق میں یہ بھی میری اتباع اور پیروی کا نتیجہ ہوگا، جس کے ساتھ تمہاری مغفرت وابستہ ہے، تو میری اتباع اور تعلیم اس نعمتِ مغفرت کے لئے بہت ہی ضروری ہے۔

﴿قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ﴾ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کبھی کہتے تھے کہ ہم براہِ راست خداوند تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے ہیں، ہمیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا واسطہ؟ اس کا جواب دیا گیا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لانا اور اس کی اتباع کرنا ضروری ہے، کیونکہ پیغمبر اللہ کے

نمائندہ اور پیغام رساں ہیں، اس کی اتباع اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، اور پیغمبر کی مخالفت اللہ تعالیٰ کی مخالفت ہی ہے۔

اسی لئے سید کائنات ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری سب اُمت جنت میں داخل ہو جائے گی، سوائے اس کے جس نے انکار کیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! انکار کون کرسکتا ہے؟ فرمایا: جس نے میری بات مانی اور اتباع کی وہ جنت میں جائے گا، اور جس نے میری بات نہ مانی اور اتباع نہیں کی تو اس نے انکار کیا۔ [متفق عليه]

اس حدیث میں آپ ﷺ نے جنت کے داخلہ کو اپنی پیروی کا نتیجہ قرار دیا۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا: جس نے محمد (ﷺ) کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، اور جس نے محمد (ﷺ) کی نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ محمد (ﷺ) ہی نے اللہ تعالیٰ کے فرمانبرداروں اور نافرمانوں میں فرق قائم کیا ہے۔ [بخاري من حديث جابر]

جب یہ بات سمجھ میں آگئی، تو اب غور کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ محبت کو معلوم کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ تو سوائے انبیاء علیہم السلام کے وہ طریقہ کسی صورت میں معلوم نہیں ہوسکتا ہے، اس لئے اپنے رسول ﷺ کو بتلایا کہ اے پیغمبر! جو آپ ﷺ کی پیروی کرے، اور آپ ﷺ کے قدم بہ قدم چلے، وہی ہم سے صحیح محبت کرنے والا ہے، اور اسی کو یہ توقع رکھنی چاہئے کہ ہم اس سے محبت کریں گے۔ اس لئے جیسے کہ ایک بندہ ہماری طرف پیشقدمی کرے ویسی ہی جواب اسی درجے میں ہماری طرف سے بھی ہوگا۔

اگر کوئی اعلیٰ درجے کی محبت کرے تو ہماری طرف سے بھی وہی درجہ ملحوظ ہوگا، اگر کسی کی محبت واطاعت درمیانی ہو، یا نہایت کمزور اور ادنیٰ ہو، تو ہماری طرف سے بھی اسی درجے کا سلوک ہوگا۔ یعنی جیسا وہ کرے گا ہماری طرف سے ویسا پائے گا، جیسا عمل ویسا پھل ہوگا۔ جو ہم سے محبت کرتا ہے تو ہم بھی محبت کا جواب دیتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ محبت وہی ہو جو ہماری نظر میں محبت ہو، کوئی خودساختہ خانہ ساز محبت نہ ہو۔ اور ہم اسی کی محبت کو قابلِ التفات اور قابلِ توجہ قرار دیتے ہیں جو ہمارے پیغمبر ﷺ کی سنت، اور اس کی تعلیمات پر مبنی ہو۔

یہی حال اطاعت کا ہے، کہ پیغمبر ﷺ کی اطاعت ہماری اطاعت ہے، اور اس کی نافرمانی ہماری نافرمانی شمار ہے، کیونکہ رسول ﷺ کو ہم ہی نے مطاع قرار دیا ہے، تو اس کی اطاعت کرنے والا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والا شمار ہوگا، اور اس کا نافرماں خداوند تعالیٰ کا نافرماں و کافر شمار ہوگا۔

؎ خلاف پیغمبر کسے راہ گزید ☆ کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید (سعدی رحمۃ اللہ علیہ)

پیغمبر ﷺ کی اتباع کے بغیر نہ کسی کے ایمان کا اعتبار ہے، اور نہ ہی توحید کا، توحید و رسالت دونوں ایمان کے لازمی اور ضروری اجزاء (ارکان) ہیں۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا الله کہنے سے کوئی مسلمان نہیں ہوسکتا، جب تک محمد رسول ﷺ کا اقرار نہ ہوگا۔ اور جو کلمہ کے اوّل حصے کا اقرار کرے گا، اور دوم حصے کا منکر رہے گا، تو وہ بالیقین کافر ہی کہلائے گا۔ اسی کو فرمایا:

﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ﴾ ایسی غیر شرعی، غیر آئینی توحید کا کوئی اعتبار نہیں ہے، جس میں رسالت پر ایمان لانے کا اقرار نہ ہو۔ یہ پوری شریعت کا فیصلہ اور اجماع ہے، حتی کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی پوری جماعت میں سے اگر ایک نبی کا انکار ہو تب بھی کفر ہی کفر کا فیصلہ ہوگا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ دنیا کے تمام اہلِ ادیان خدا تعالیٰ کو ایک حد تک مانتے ہیں، اگر وہ کافر ہیں تو اس لئے کہ رسالت اور نبوت و شریعت کے منکر ہیں۔ مزید تفصیل سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۰ کے تحت دیکھی جائے، تحت قوله: ﴿يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللهِ﴾ [البقرة:۱٦۵]

حضور اکرم ﷺ کی پیروی اللہ تعالیٰ کی محبت کی چابی ہے:

کلمہ طیبہ کے متعلق ارشاد نبوی ہے کہ وہ جنت کی چابی ہے، اس کے بغیر جنت کا دروازہ کسی کے لئے نہیں کھلے گا۔ اسی طرح آیت کریمہ: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ﴾ نے یہ واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی چابی سید کائنات ﷺ کی اتباع ہی ہے، اور آپ ﷺ کی اتباع کے بغیر اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور پھر آپ ﷺ کی اتباع کی چابی آپ ﷺ کی محبت ہے، اور ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کی اتباع بغیر آپ ﷺ کی محبت ممکن ہی نہیں۔ اور جن لوگوں کے قلوب آپ ﷺ کی محبت سے سرشار ہیں وہی آپ ﷺ کی اتباع کرتے ہیں۔ اور جن قلوب میں آپ ﷺ کی محبت موجزن نہیں ہے وہ کھلے بندوں آپ ﷺ کی اتباع سے یکسر محروم رہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُونَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ". تم میں سے کوئی کامل الایمان نہیں ہوسکتا جب تک وہ اس چیز کی اتباع نہ کرے جسے میں لے کر آیا ہوں۔ حضرت انس نے روایت کی کہ سید کائنات ﷺ نے فرمایا: "لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ". [بخاری] تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک میرے ساتھ اس کی

محبت والدین، اولاد اور تمام مخلوق اور لوگوں سے زیادہ نہ ہو، حتی کہ اس کی اپنی جان سے بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت وعقیدت دلوں میں پیوست ہوگی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی اور اتباع آسان ہو جائے گی، اور یہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع حق سبحانہ وتعالیٰ کی محبت تک پہنچانے کا واحد و یقینی ذریعہ ہے۔

یہود و نصاریٰ محبت کے دعوے میں اس لئے کاذب اور جھوٹے ثابت ہوئے کہ انہوں نے محبت کی چابی، یعنی اتباعِ نبوت کو ضائع کیا، خالی دعویٰ بغیر شہادت کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اور یہ اتباع کوئی آسان کام نہیں ہے، جسے ہر ہوسناک مدعی حاصل کرے۔ نبی کا نام سن کر انگلی آنکھوں پر رکھنا، چومنا بڑا آسان ہے، مگر شریعت کے تمام امور اور ہر شعبۂ حیات میں، مثلاً نماز، زکوٰۃ، حج وعمرہ، روزہ، تجارت، زراعت، ملازمت، عدل وانصاف، اخلاق، معاملات، لین دین، عبادت، سیاست، صلح، شادی، طلاق، جہاد وغیرہ امورِ زندگی سب میں اتباعِ نبوت واتباعِ سنت کی پیروی اور نگہداشت کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور مکمل اتباع کے بغیر اللہ تعالیٰ کی رضا ومحبت تک پہنچنا نہایت مشکل ہے۔

دنیا میں جھوٹے مدعیانِ محبت کی کوئی کمی نہیں، جنہوں نے محبت کی آڑ میں شرک تک کا ارتکاب کیا، اور محبوب کو خداوند تعالیٰ کا درجہ دے کر ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ دراصل ان کا یہ عقیدہ اور غیر شرعی محبت عیسائیوں کی پیداوار ہے، جنہوں نے حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدا، یا خدا کا بیٹا کہہ کر مشرک ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نے کہا: ع

رسول خدا خود خدا بن کر آیا

کیا عجیب بے سروپا محبت ہے؟ جو کہ عداوت سے کم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت نصیب کرے۔ آمین

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۳۴﴾

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ نے منتخب کیا آدم اور نوح کو، اور آل ابرہیم کو، اور آل عمران کو جہاں والوں پر۔ ﴿۳۳﴾ یہ اولاد تھی بعض بعض سے، اور اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۳۴﴾

معارف ومنازل

یاد رہے کہ انسانوں، قوموں کی خرابی یا تو عقیدے سے ہوتی ہے، یا سیاست سے، اور جب تک عدل و

انصاف کا دور دورہ نہیں ہوگا، مظلوم لوگ ظلم کی چکی میں پستے رہیں گے، اور جب تک عقیدہ درست نہیں ہوگا لوگوں کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ اصلاحِ عقیدہ کی خاطر دنیا میں انبیاء علیہم السلام تشریف لائے۔ گزشتہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ سے محبت کا بیان ہوا، جو کہ اصلاح کیلئے اصل الاصول ہے۔ پھر اس کی چابی کا بیان ہوا کہ اتباعِ نبوت ہے، اب مذکورہ آیتوں میں چند دیگر انبیاء علیہم السلام کا بیان ہے۔ یہ سلسلہ کافی طویل ہے۔

جس طرح سورۂ بقرہ کا مرکزی موضوع یہود کی اصلاح تھا، جس میں یہودیوں کی چالیس خرابیوں کا تذکرہ ہوا۔ اور سورۂ آل عمران کا مرکزی موضوع نصاریٰ کی اصلاح ہے، جو کہ شروع سورت سے چل رہا ہے۔ درمیان میں چند دیگر ضروری باتوں کا ذکر ہوا، اب دوبارہ یہ سلسلہ عالیہ انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ سے شروع ہو رہا ہے۔

نزولِ قرآن کریم کے وقت نصاریٰ میں دو قسم کی خرابیاں پائی جاتی تھیں:

پہلی خرابی تو ان کے دین میں تھی، یعنی مشرکانہ عقیدہ، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا، یا خود خدا، یا تینوں میں سے تیسرا خدا کہتے تھے۔

اور دوسری خرابی ان کی سیاسی نوعیت کی تھی۔ اس کی تفصیل کسی قدر پہلے بیان ہوئی، کچھ آئندہ بیان ہوگی۔

آئندہ آیتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کا مفصل تذکرہ ہونے والا ہے۔ مذکورہ دو آیتیں ان تفصیلی حالات کے لئے بمنزلہ تمہید کی ہیں۔ ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَنُوْحًا﴾ [الآیۃ] تمام مخلوقات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو شرف و تکریم سے نواز کر اشرف المخلوقات کا لقب اُسے عنایت فرمایا۔ پھر انسانوں کی جماعت میں انبیاء علیہم السلام کو خصوصی شرف و مقام عطا فرمایا۔ اسی پر گفتگو ہو رہی ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگ و برتر ہستیوں کو تمام جہاں پر برگزیدگی عنایت فرمائی۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اپنی روح اس میں پھونکی، انہیں خلافت کا تاج پہنایا، تمام چیزوں کے نام انہیں بتائے، اور جنت میں انہیں بسایا، پھر اپنی حکمت کے تحت ہزاروں مصلحتوں کے پیشِ نظر اور تکمیلِ خلافت کی خاطر انہیں زمین پر اتارا۔ یہ پوری تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول اور صاحب شریعت پیغمبر ہیں، جب زمین پر بت پرستی قائم ہوگئی تو اصلاحِ خلق کے لئے آپ علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ قوم نے مسلسل سرکشی کی، نسلاً بعد نسلٍ توحید قبول کرنے سے منحرف ہوئے۔ ایک لمبی عمر تک آپ علیہ السلام نے سلسلۂ تبلیغ جاری رکھا، جب آپ علیہ السلام مایوس ہوگئے، اور وحی کے ذریعہ آپ علیہ السلام کو آگاہ

کیا گیا کہ آئندہ کوئی ایمان قبول نہیں کرے گا، تب دعا کی، اور طوفان کی بشارت آ گئی، اور پوری قوم غرق ہو گئی، صرف بیاسی آدمی جو مسلمان ہوئے وہ بچ گئے۔ پھر آپ علیہ السلام کے تینوں بیٹوں سام، حام، یافث سے انسانی نسل کی دوبارہ پیدائش کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسی لئے آپ علیہ السلام آدمِ ثانی کے لقب سے یاد ہوئے۔ یہ پوری تفصیل سورۂ نوح میں دیکھیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک ایسے زمانے میں مبعوث ہوئے کہ پورا عراق اور شام بت پرستی، کواکب پرستی میں ڈوبا ہوا تھا، اور نمرود بن کنعان الوہیت کا مدّعی تھا۔ آپ علیہ السلام نے تبلیغ شروع کی، اصنام پرستی اور شرک کے خلاف جہاد کیا، بڑے بڑے امتحانات سے آپ علیہ السلام کو گزرنا پڑا، تاریخی آگ میں ڈالے گئے، اللہ تعالیٰ نے آگ کو ﴿بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِيْمَ﴾ [الأنبياء: ٦٩] (ٹھنڈی اور سلامتی والی ابراہیم پر) بنا کر آپ علیہ السلام کی ہمت افزائی فرمائی۔ یہ پورا تاریخی سلسلہ گزر چکا ہے سورۂ بقرہ میں۔

اور آل عمران سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ ہیں، جن کے حالات آئندہ مفصل بیان ہونے والے ہیں۔ البتہ آل ابراہیم علیہ السلام سے مراد حضرت اسحاق علیہ السلام اور ان کی اولاد ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل میں بقولِ مؤرخین چار ہزار پیغمبر پیدا ہوئے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں دُرِ یکتا خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جن پر نبوت کا دروازہ قیامت تک کے لئے بند ہوا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

﴿ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ﴾ یہ سارے آدم علیہ السلام سے پیدا ہوئے، جو ان کی اولاد ہیں۔ یہ سب انسان اور مخلوق ہیں، اور بشر ہیں، نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابن اللہ ہیں، اور نہ ہی سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نورٌ مِنْ نورِ اللہ ہیں۔ ہمارے زمانہ کے قبر پرستوں کا عقیدہ عیسائیوں کے عقائد سے ماخوذ ہے، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نور کہتے ہیں، اور یہ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو نور کہتے ہیں۔

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر ☆ اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

نعوذ باللہ

.......۞.......۞.......۞.......

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِىْ بَطْنِىْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّىْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٣٥﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا

وَضَعَتْ ؕ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّىْۤ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا
مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝۳۶ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ
كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ
يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۳۷

ترجمہ: جب عمران کی بیوی نے کہا: اے پروردگار! میں نے تیرے لئے نذر مانی ہے جو کچھ میرے پیٹ میں ہے، آزاد کیا ہوا، پس قبول فرما مجھ سے، بیشک تو ہی سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۳۵ اور جب اس کو جنا تو کہنے لگی: اے پروردگار! میں نے جنا ہے اس کو لڑکی، اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ اس نے جنا ہے، اور نہیں ہے لڑکا مثل لڑکی کے، اور بیشک میں نے اس کا نام مریم (علیہا السلام) رکھا ہے، اور میں اس کو تیری پناہ میں دیتی ہوں، اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے۔ ۳۶ پس قبول کیا اس کو اس کے پروردگار نے اچھی طرح قبول کرنا، اور بڑھایا اس کو اچھی طرح بڑھانا، اور کفیل بنایا اس کا حضرت زکریا کو، جب حضرت زکریا اس کے پاس حجرے میں داخل ہوتے تو اس کے پاس روزی پاتے، تو انہوں نے کہا: اے مریم! یہ روزی تمہارے پاس کہاں سے آئی؟ تو وہ کہتیں: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، بیشک اللہ تعالیٰ روزی دیتا ہے جس کو چاہے بغیر حساب کے۔

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ اور آئندہ آیات میں حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا بیان ہو رہا ہے۔ اس سے نصاریٰ کے باطل عقائد کی تردید مقصود ہے۔ انہیں واضح طور پر خبردار کیا جا رہا ہے کہ ماں بیٹے دونوں اللہ تعالیٰ کے بندے اور مخلوق ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مخلوق عبادت کے لائق نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام عمران ہے، اور حضرت مریم علیہا السلام کے والد کا نام بھی عمران ہے۔ یہ دونوں متقی پرہیزگار، نیک لوگ تھے۔ یہاں عمران سے مراد حضرت مریم علیہا السلام کے والد ہیں۔ حضرت مریم علیہا السلام کے والد کا نام عمران، اور والدہ کا نام حنہ بنت فاقوس ہے۔ حنہ زوجۂ عمران جب عمر رسیدہ ہو گئیں، اور ان کی کوئی اولاد نہیں تھی، ایک دفعہ انہوں نے ایک چڑیا کو دیکھا کہ اپنے بچوں کو دانہ کھلا رہی ہے، یہ دیکھ کر ان کے دل میں بھی اولاد کی خواہش پیدا ہوئی، تو فوراً عجز وانکساری کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی، جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی، جب وہ حاملہ ہو گئیں تو

شکرانے کے طور پر یہ منت اور نذر مانی، کہ وہ پیدا ہونے والے بچے کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے وقف کر دیں گی، اور بیت المقدس کی خدمت پر لگا دیں گی۔

اس زمانے میں ایسے کاموں کے لئے لڑکوں کو وقف کیا جاتا تھا، اور اس مقصد کے لئے لڑکیوں کے وقف کرنے کا رواج نہ تھا، کیونکہ عورت مسجد کی خدمت وغیرہ امور کی انجام دہی سے معذور اور عاجز رہتی ہے، مگر حسنِ اتفاق سے جو اللہ تعالیٰ کو منظور تھا بجائے لڑکے کے لڑکی پیدا ہوئی، کیونکہ اس لڑکی سے وہ نادر امور اور مقاصدِ عالیہ اور فوائدِ حسنہ کا ظہور مقدر تھا جو ایک لڑکے سے وہ حاصل نہیں ہو سکتے تھے، چنانچہ یہ نذر صحیح بھی ہو گئی، اور قبولیت کے ساتھ بار آور بھی ہو گئی۔ اس کی تفصیل آنے والی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نام پر نذر جائز، اور غیر اللہ کے نام پر گناہ اور شرک ہے:

نذر خواہ بدنی ہو یا مالی، یہ ایک عبادت ہے، عبادت ہر حال میں مخصوص ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ، غیر اللہ کی عبادت اور نذر مطلقاً حرام اور شرک ہے۔ اس کی تفصیل سورۂ دہر کے فوائد میں دیکھی جائے۔

جس طرح شریعت موسوی میں نذر ماننے کا رواج رہا ہے، اسی طرح ہماری شریعت میں بھی نذر ماننے کی اجازت ہے۔ اور نذر کی مختلف اقسام ہیں۔ نذر کبھی شرعی اور جائز ہوتی ہے، کبھی ناجائز اور حرام، جیسے نذر لغیر اللہ۔ پھر نذر کبھی بدنی ہوتی ہے اور کبھی مالی۔ اسی طرح نذر کبھی مشروط ہوتی ہے، اور کبھی غیر مشروط۔ علی ہذا القیاس کبھی متعین ہوتی ہے، اور کبھی مجہول اور غیر متعین، جیسے یہاں مَا فِي بَطْنِي کہ انہیں کیا معلوم کہ یہ لڑکا ہو گا یا لڑکی۔ بہر حال! نذر ماننا ایک اختیاری امر ہے، کوئی واجب نہیں ہے۔ البتہ نذر ماننے کے بعد اس کا پورا کرنا واجب اور فرض ہے۔

امام ابو بکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ تفسیر احکام القرآن میں فرماتے ہیں کہ جو نذر حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے مانی تھی ایسی نذر ہماری شریعت میں بھی جائز ہے۔ آج بھی اگر کوئی شخص منت مانے کہ میں اپنی اولاد کو دین کی خدمت، علمِ دین، تبلیغِ دین، یا کسی اور دینی شرعی خدمت کیلئے وقف کروں گا، کہ وہ صرف یہی خدماتِ دینیہ انجام دے سکے گا، اور انہیں بجالائے گا، اور اسے دیگر کسی دنیاوی کام میں نہیں لگاؤں گا، تو ایسی منت ماننا بالکل درست ہے، اور اس کا پورا کرنا واجب ہے، انتہی۔

ہم کہتے ہیں یہ کام محض مباح نہیں، بلکہ مستحسن ہے۔ پچھلے زمانے میں لوگ خود کو یا اپنی اولاد کو کسی دینی کام کے لئے وقف کرتے تھے، مثلاً علمِ دین اور خدمتِ مساجد و مدارس کے لئے، پس وہ تمام دنیوی اغراض و مقاصد سے

کنارہ کش ہو کر صرف اسی مقصد کی تحصیل اور خدمت میں لگ جاتے، اور ایسے بڑے اونچے مقام پر فائز رہتے جس کی مثال نہیں ہے۔ سلف وخلف کے بہت سارے ائمہ کرام رحمۃ اللہ علیہ اسی پایہ کے لوگ گزرے ہیں، جن کے علوم ومعارف اور دینی خدمات سے لاکھوں انسان مستفیض ہوئے، اور ہو رہے ہیں۔ آج بھی بحمدہٖ تعالیٰ ایسے لوگ بکثرت موجود ہیں، جنہوں نے اپنی پوری زندگی تبلیغ، علمِ دین، جہاد، دیانت وامانت اور دیگر مقاصدِ حسنہ کیلئے وقف کی ہوئی ہیں، اور مال ودولت اور دیگر امورِ دنیا سے مکمل مستغنی رہتے ہیں۔

این سعادت بزور بازو نیست ☆ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ کچھ لوگ اپنی دکان، مارکیٹ، باغ وزراعت اور خالی زمین مساجد، مدارس، تبلیغی مراکز اور دیگر دینی کاموں کے لئے وقف کرتے ہیں، یہ عمل حسنِ نیت شرعی نیت واخلاص کے ساتھ اتنی قیمتی اور قابلِ قدر ہے جس کا اجر وثواب رہتی دنیا تک بطورِ بَاقِیَاتِ صَالِحَات بے حساب جاری رہے گا۔ اور یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حلال مال۔ کے ساتھ فکرِ آخرت اور عقل کی نعمت کے ساتھ نوازا ہے۔ پس جس کا مال حرام یا مشکوک ہوگا، اور وہ فکرِ آخرت اور عقلِ سلیم کی نعمت سے محروم ہوگا، اس کو ایسے کاموں کی توفیق نہیں ہوگی۔ اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضىٰ وَاجْعَلْ آخِرَتَنَا خَيْرًا مِّنَ الْأُوْلىٰ۔ آمین.

حضرت مریم علیہا السلام صدیقہ کی کفالت:

اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ حضرت حنّہ کی نذر اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی (حسنِ قبولیت کے ساتھ) اور انہیں بہترین طور سے نشو ونما بخشی، ظاہری خوبی بھی عطا فرمائی، اور باطنی خوبیوں سے بھی نوازا، اور اپنے نیک بندوں سے اس کی پرورش کرائی، تا کہ علم وخیر اور دین سیکھ لیں، اور حضرت زکریا علیہ السلام کو ان کا سرپرست وکفیل بنا دیا۔

محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ اس لئے کہ حضرت مریم علیہا السلام کے والد کا انتقال ہو چکا تھا، اور وہ یتیم ہو گئی تھیں۔ لیکن دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ قحط سالی کی وجہ سے ان کی کفالت کا بوجھ حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے ذمہ لے لیا تھا، ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں باتیں درست ہوں۔ واللہ اعلم

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام ان کے خالو تھے۔ اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کے بہنوئی تھے، جیسے معراج والی حدیث میں ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام سے ملاقات کی، جو دونوں خالہ زاد بھائی ہیں۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر یہ حدیث ٹھیک ہے، کیونکہ اصطلاحِ عرب

میں ماں کی خالہ کے لڑکے کو بھی خالہ زاد بھائی کہتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ حضرت مریم علیہا السلام اپنی خالہ کی پرورش میں تھیں۔ حدیث صحیح میں ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی یتیم صاحبزادی عمرہ کو ان کی خالہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کی بیوی صاحبہ کے سپرد فرمایا تھا، اور کہا تھا کہ "اَلْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْأُمِّ"۔ یعنی خالہ ماں کی قائم مقام ہے۔

حضرت مریم علیہا السلام (اور دیگر اولیاء کرام) کی کرامات میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مریم علیہا السلام کی بزرگی اور ان کی کرامت کا ذکر فرمارہے ہیں، کہ حضرت زکریا علیہ السلام جب کبھی ان کے حجرے میں جاتے تو بے موسمی میوے ان کے پاس تیار رکھے ہوئے پاتے۔ مثلاً جاڑوں میں گرمیوں کے میوے، اور گرمیوں میں جاڑے کے میوے۔ حضرت مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابوالشعثاء، ابراہیم نخعی، ضحاک، قتادہ، ربیع بن انس، عطیہ عوفی اور سدی رحمہم اللہ اس آیت کی تفسیر میں یہی فرماتے ہیں۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی مروی ہے کہ یہاں رزق سے مراد علم اور وہ صحیفے ہیں جن میں علمی باتیں ہوتی تھیں، لیکن پہلا قول صحیح ہے۔

اس آیت میں اولیاء اللہ تعالیٰ کی کرامت کی دلیل ہے، اور اس کے ثبوت میں بہت سی حدیثیں بھی آئی ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں بھی بے موسمی انگور و پھلوں کا تذکرہ ہے۔ جب حضرت زکریا علیہ السلام پوچھتے کہ مریم! تمہارے پاس یہ میوے کہاں سے آتے ہیں؟ تو حضرت مریم صدیقہ علیہا السلام جواب دیتیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے، وہ جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیدیتا ہے۔

مسند ابویعلیٰ میں حدیث ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر بغیر کچھ کھائے کئی دن گزر گئے، بھوک سے آپ کو تکلیف ہونے لگی، اپنی سب بیویوں کے گھر تشریف لے گئے، لیکن کہیں بھی کچھ نہ پایا، پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے، اور دریافت فرمایا کہ بیٹی! تمہارے پاس کچھ ہے کھانے کے لئے؟ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے، وہاں سے بھی یہی جواب ملا کہ آپ پر میرے سب کچھ صدقے ہوں، ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے نکلے ہی تھے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی لونڈی نے دو روٹیاں اور ٹکڑا گوشت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا، آپؓ نے اسے لے کر لگن میں رکھ لیا، اور فرمانے لگیں کہ اگرچہ ہم سب کو بھوک ہے، لیکن ہم سب فاقے ہی سے گزار دیں گے، اور اللہ تعالیٰ کی قسم آج تو یہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی دوں گی۔ پھر حضرت حسن یا حسین کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا کہ آپ تشریف لائیں۔ اس وقت رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم راستے میں تھے، جو لوٹ آئے، حضرت

فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ بھجوادیا ہے، جسے میں نے آپ کے لئے چھپا کر رکھ دیا ہے۔

آپ نے ارشاد فرمایا: پیاری بیٹی! وہ لے آو، جب وہ برتن کھول کر دیکھا تو وہ اس برتن کو کھچا کھچ سالن اور گوشت سے بھرا ہوا پایا، وہ یہ دیکھ کر حیران ہوگئیں، لیکن فوراً سمجھ گئیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس میں برکت کا نزول ہوا ہے، پھر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پڑھا، اور خدمت اقدس میں پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی تعریف کی، اور دریافت فرمایا کہ بیٹی! یہ کہاں سے آیا؟ جواب دیا کہ ابا جان! اللہ تعالیٰ کے پاس سے، وہ جسے چاہے بے حساب روزی دیدے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے بنی اسرائیل کی تمام عورتوں کی سردار جیسا کردیا۔ انہیں جب کبھی اللہ تعالیٰ کوئی چیز عطا فرماتا، اور ان سے پوچھا جاتا تو یہی جواب دیا کرتی تھیں، کہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہے، اللہ تعالیٰ جسے چاہے بے حساب رزق دیدیتا ہے۔

پھر سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اور حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما نے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا، پھر بھی اتنا ہی باقی رہا جتنا پہلے تھا، جو آس پاس کے پڑوسیوں کے ہاں بھیجا گیا۔

یہ تھی خیر کثیر، اور برکت، اللہ ربّ العزّت کی طرف سے۔ اس قسم کے واقعات اتنی بکثرت زیادہ ہیں جن کا احاطہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ تَبٰرَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. [ابن کثیر]

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ
سَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ﴿٣٨﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ وَھُوَ قَاۗىِٕمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ
يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٣٩﴾
قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ
اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ﴿٤٠﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ
ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿٤١﴾

ترجمہ: اس موقع پر حضرت زکریا نے اپنے پروردگار کے سامنے دعا کی، اور عرض کیا: اے میرے پروردگار! بخش دے مجھ کو اپنی طرف سے پاکیزہ اولاد، بیشک تو دعا کا سننے والا ہے۔ ۳۸ پس زکریا کو فرشتوں نے آواز دی، جبکہ وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے کمرے کے اندر، بیشک اللہ تعالیٰ تجھ کو یحیٰ (علیہ السلام) بیٹے کی خوشخبری دیتا ہے، جو تصدیق کرنے والا ہوگا اللہ تعالیٰ کے کلمے کی، اور جو سردار ہوگا، اور جو نفسانی خواہشات سے مکمل طور پر رُکنے والا ہوگا، اور نبی ہوگا، نیکوں میں سے۔ ۳۹ حضرت زکریا نے عرض کیا: اے پروردگار! کس طرح ہوگا میرے لئے لڑکا؟ اور تحقیق پہنچ چکا ہے مجھ کو بڑھاپا، اور میری بیوی بھی بانجھ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ اسی طرح کرتا ہے جو چاہے۔ ۴۰ عرض کیا: اے پروردگار! بنادے میرے لئے نشانی، فرمایا: تیری نشانی یہ ہے کہ بات نہ کرسکے گا لوگوں سے تین دن، مگر اشارہ کر کے، اور یاد کر اپنے ربّ کو کثرت سے، اور (اس کی) پاکیزگی (بیان) کر صبح و شام ۴۱

معارف ومنازل

حضرت زکریا علیہ السلام نے جب دیکھا کہ بی بی مریم علیہا السلام کے پاس بے موسم پھلوں کا ڈھیر لگا رہتا ہے، اور ظاہری اسباب کے بغیر یہ سلسلہ جاری ہے، اور یہ سب کچھ مافوق الاسباب عنایاتِ ایزدی کے کرشمے اور نمونے ہیں، پس جو ذات بے حساب و بے موسم رزق دینے پر قادر ہے، وہ ایک عمر رسیدہ شخص کو بانجھ اور بوڑھی بیوی سے اولاد دینے پر کیوں قادر نہیں، فوراً مسجد کے محراب میں کھڑے ہو کر دعاء والتجاء میں لگ جاتے ہیں، ابھی وہ دعاء ہی میں مصروف ہیں کہ اجابت کا دروازہ کھل جاتا ہے، اور فرشتے خوشخبری سنانے پہنچ جاتے ہیں، اور ایک نیک سیرت متقی فرزند حضرت یحیٰ علیہ السلام کا مژدہ سناتے ہیں۔ صرف یہ نہیں، بلکہ ان کی معصومیت اور نبوت کا بھی پیغام دیدیتے ہیں، اور نام کی تجویز بھی اوپر سے ہو رہی ہے، اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ یہ تمہارے لخت جگر فرزند حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والے ہیں۔

حضرت ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی تصدیق کرنے والے بھی حضرت یحیٰ علیہ السلام ہیں۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ حضرت یحیٰ علیہ السلام ٹھیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روش اور آپ علیہ السلام کی طریق پر تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔ حضرت یحیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام سے اکثر ذکر کیا کرتی تھیں کہ میں اپنے پیٹ کے بچے کو ترے پیٹ کے بچے کو سجدہ کرتے ہوئے

پاتی ہوں۔ یہ تھی حضرت یحیٰ علیہ السلام کی تسلیم وتصدیق کا نمونہ۔

حضرت یحیٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے عمر میں کچھ بڑے تھے، اور دونوں کی پیشانی پر نبوت کا نور جگمگاتا ہوا جلوہ افروز ہوتا تھا۔

﴿سَیِّدًا﴾ کے معنی حلیم، بردبار، علم وعبادت میں بڑھا ہوا، متقی پرہیزگار، فقیہ، عالم، خُلق ودین میں سب سے افضل، جسے غصہ اور غضب مغلوب نہ کر سکے، شریف اور کریم ہیں۔

﴿حَصُوْرًا﴾ کے معنی ہیں: بیوی اور اولاد، نیز قوتِ نفسانیہ شہویہ سے پاک ومنزہ، جسے کبھی نفسانی مردانگی خواہشات کی رغبت نہ ہو، جیسے فرشتے ہوتے ہیں۔ مسلسل بشارتوں کے بعد حضرت زکریا علیہ السلام کو اگرچہ پختہ یقین حاصل ہو چکا تھا، مگر ان کو خیال پیدا ہوا کہ ظاہری اسباب کے فقدان کی وجہ سے مجھے مزید تسلی وتشفی کی خاطر فرشتوں سے کسی قریبی وقوی علامت کا سوال کرنا چاہیے، تب انہوں نے ازراہِ تفنن یہ پوچھا کہ اے اللہ تبارک وتعالیٰ! میرے ہاں بچہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نہایت بوڑھا، عمر رسیدہ ہوں، میرے بال سفید ہو چکے، قوتِ مردانگی نہایت خستہ ہے، اور میری بیوی عمر رسیدہ اور بانجھ ناقابلِ اولاد ہے، بظاہر اسباب سارے مفقود ہیں۔

اس پر فرشتوں نے اسی وقت جواب دیا کہ مسبب الاسباب اگر چاہے تو اسباب کے بغیر بھی اولاد دے سکتا ہے۔ حضرت یحیٰ علیہ السلام کی خوشخبری کے ساتھ مطمئن رہو، اس کی آمد کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ قادر مطلق کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے ہونے میں دیر نہیں لگتی ہے، وہ ہر چیز پر قادر وتوانا ہے۔ ﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ [یٰسٓ: ۸۲] (بیشک اس کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ: ہوجا، بس وہ ہوجاتی ہے)۔ وہ ماں باپ کے بغیر بھی پیدائش پر قادر ہے، اور صرف ماں سے بھی بغیر باپ کے پیدائش کا فیصلہ کر سکتا ہے، اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق پر اشارہ ہے، جو عنقریب ہونے والی تھی۔

اب حضرت زکریا علیہ الصلوٰۃ والسلام مزید اطمینان حاصل کرنے کی خاطر اس کی علامت طلب کرنے لگے، تو ارشاد ہوا کہ نشان یہ ہے کہ تو تین دن تک لوگوں سے حسب عادت بات نہیں کر سکے گا، اگرچہ صحیح سالم تندرست رہے گا، مگر تیری زبان بند رہے گی، صرف اشاروں سے کام لینا پڑے گا۔ دوسرے مقام پر بھی وارد ہے: ﴿ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا﴾ [مریم: ۱۰] (تین راتیں، صحتمند ہونے کے باوجود)۔ پھر انہیں حکم ہوتا ہے کہ اس حال میں تمہیں چاہیے کہ ذکر، تسبیح اور تہلیل اور تکبیر میں زیادہ مشغول رہو، اور صبح وشام اسی میں لگے رہو۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ

مریم میں آنے والی ہے۔

وَاِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓـئِكَةُ يٰمَرۡيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصۡطَفٰىكِ عَلٰى
نِسَآءِ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۴۲ يٰمَرۡيَمُ اقۡنُتِىۡ لِرَبِّكِ وَاسۡجُدِىۡ وَارۡكَعِىۡ مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ ۝۴۳
ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ ؕ وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ اِذۡ يُلۡقُوۡنَ
اَقۡلَامَهُمۡ اَيُّهُمۡ يَكۡفُلُ مَرۡيَمَ ۖ وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ اِذۡ يَخۡتَصِمُوۡنَ ۝۴۴

ترجمہ: اور جب فرشتوں نے حضرت مریم سے خطاب کرتے ہوئے کہا: اے مریم! بیشک اللہ تعالیٰ نے تجھ کو منتخب کیا ہے، اور تجھ کو پاکیزہ بنایا ہے، او تجھ کو بزرگی عطاء فرمائی ہے سب جہاں والی عورتوں پر۔ ۝۴۲ اے مریم! اپنے پروردگار کی اطاعت کرو، اور سجدہ کرو، اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ ۝۴۳ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے، ہم اس کو آپ کی طرف وحی کرتے ہیں، اور آپ ان کے پاس نہیں تھے جب کہ وہ اپنے قلموں کو ڈالتے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی کفالت کرے، اور آپ ان کے پاس نہیں تھے جب کہ وہ آپس میں جھگڑتے تھے۔ ۝۴۴

معارف ومنازل

جب کسی ہستی کو کسی بڑے اونچے مقام ومنصب پر فائز کیا جاتا ہے، تو اسے اس منصب ومرتبہ کے شایان شان مقام اور فرائض سے آگاہ کرتے ہیں، اور اس کے تعارف کے ساتھ فرائض بھی بتلا دیتے ہیں، تو فرشتے پہلے مرحلے میں حضرت مریم علیہا السلام سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: اے مریم! تیرا مقام بہت ہی بلند ہے، اللہ تعالیٰ نے تجھے چن لیا، صاف وستھرا پاکیزہ بنایا، اور سارے جہاں کی عورتوں پر تجھے فضیلت عطاء کی، جس طرح انبیاء کرام علیہم السلام کا انتخاب نبوت کیلئے ہوتا ہے، اسی طرح مقامِ صدیقیت کیلئے تیرا انتخاب ہو چکا ہے۔ تیرا مقام نہایت بلند وبالا ہے، اس مقام کا تقاضا ہے کہ تم اپنے رب کیلئے قنوت وقیام اختیار کرو، اور تمام زندگی رکوع وسجود، عبادت وبندگی میں گزارو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنی قدرت کا ایک عظیم الشان بابرکت نشان بنانے والا ہے، اسی کی خاطر تم بتول وتارک الدنیا بن کر پوری رغبت وشوق کے ساتھ اس کی اطاعت وعبادت میں مشغول رہو۔

قُنُوۡت کے معنی اطاعت کے ہیں، جو حضورِ قلب اور عاجزی کے ساتھ ہو۔ حضرت مریم علیہا السلام کے متعلق

سورۂ تحریم میں ہے: ﴿وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ﴾ [التحریم:۱۲]۔اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ﴾ [الروم:۲۶]۔یعنی اس کے تصرف اور ملکیت میں زمین وآسمان کی ہر چیز ہے، سب کے سب اس کے محکوم اور تابعِ فرمان ہیں۔ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ قرآن کریم میں جہاں کہیں **قُنُوت** کا لفظ ہے اس سے مراد اطاعت گزاری ہے۔حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام نماز میں اتنا لمبا قیام کرتی تھیں کہ دونوں ٹخنوں پر ورم چڑھ جاتا تھا، **قُنُوت** سے مراد یہی نماز میں لمبے لمبے رکوع اور قیام کرنا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ مراد یہ ہے کہ اپنے ربّ کی عبادت میں مشغول رہو، اور رکوع وسجدہ کرنے والوں میں سے ہوجاؤ۔حضرت اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مریم صدیقہ علیہا السلام اپنے عبادت خانے میں اس قدر بکثرت رکوع اور باخشوع نمازیں پڑھتی تھیں کہ دونوں پاؤں میں زرد پانی اتر آتا۔ رضي الله عنها۔[ابن کثیر]

قرعۂ فال حضرت زکریا علیہ السلام کے نام پر:

یہ اہم خبریں بیان کرکے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے نبی آخر الزمان! ان باتوں کا علم تمہیں صرف میری وحی سے ہوا، ورنہ تمہیں کیا خبر؟ تم اس وقت ان کے پاس تھوڑے ہی موجود تھے، جو ان واقعات کی خبر لوگوں کو پہنچاتے؟ لیکن ہم نے اپنی وحی سے ان واقعات کو اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کھول دیا، گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اس وقت موجود تھے، جبکہ حضرت مریم علیہا السلام کی پرورش کے بارے میں ہر شخص دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتا تھا۔ سب کی چاہت تھی کہ اس دولت گرانمایہ سے میں ہی مالا مال ہوجاؤں، اور یہ اجر مجھے نصیب ہو۔

جب آپ علیہا السلام کی والدہ ماجدہ آپ علیہا السلام کو لے کر بیت المقدس (کی مسجد سلیمان) میں تشریف لائیں، اور وہاں کے خادموں سے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل میں سے تھے، کہا کہ میں انہیں اپنی نذر کے مطابق اللہ تعالیٰ کے نام پر کرچکی ہوں، تم اسے سنبھالو۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ لڑکی ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ حیض کے ایام میں عورتیں مسجد میں نہیں ٹھہر سکتیں، اور نہیں آسکتیں، اب تم جانو تمہارا کام، میں تو اسے واپس گھر نہیں لے جاؤں گی، کیونکہ میں اسے اللہ تعالیٰ کے نام نذر کرچکی ہوں۔

حضرت مریم علیہا السلام کے والد حضرت عمران مسجد کے امامِ نماز تھے، اور قربانیوں کے مہتمم ونگراں تھے، تو ہر ایک شخص نے بڑی رغبت سے اس کی کفالت کی خواہش ظاہر کی۔ادھر سے حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنا یہ حق بھی جتایا

کہ میں رشتہ میں ان کا خالو ہوں، تو اس کی سرپرستی کا میں ہی حقدار ہوں، مگر لوگوں نے یہ بات تسلیم نہیں کی۔ آخر فیصلہ ہوا کہ قرعہ ڈالا جائے، اور قرعہ میں ان سب نے اپنے وہ قلم ڈالے جن سے وہ تورات کی کتابت کرتے رہتے تھے۔ تو قرعہ حضرت زکریا علیہ السلام کے نام نکلا، اور وہی اس سعادت سے مشرف ہوئے۔

دوسری مفصل روایتوں میں یہ بھی ہے کہ نہرِ اُردن پر جا کر یہ قلم ڈالے گئے، پانی کے بہاؤ کے ساتھ جو قلم نکل جائے وہ نہیں، اور جس کا قلم ٹھہر جائے وہ حضرت مریم علیہا السلام کا کفیل بنے گا، چنانچہ سب کے قلم پانی بہا کے لے گیا، صرف حضرت زکریا علیہ السلام کا قلم ٹھہر گیا، بلکہ الٹا اوپر کو چڑھنے لگا۔ ایک یہ کہ وہ عالی مقام نبی تھے، دوئم یہ کہ وہ قریبی رشتہ دار بھی تھے، تیسرے یہ کہ وہ مانے ہوئے سردار اور عالم تھے۔ فَصَلَوٰاتُ اللهِ وَسَلَامُهُ عَلَيهِم وَعَلىٰ جَمِيعِ الْمُرْسَلِينَ. [ابن کثیر]

حضرت مریم علیہا السلام، حضرت آسیہؓ، حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی فضیلت:

یہاں بیان ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت مریم علیہا السلام کو فرشتوں نے خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی عبادت کی کثرت، ان کی دنیا سے بے رغبتی، ان کی شرافت اور ان کے شیطانی وساوس سے دوری کی وجہ سے اپنے قربِ خاص کا درجہ عنایت فرما دیا ہے، اور تمام جہاں کی عورتوں پر انہیں خاص فضیلت دے رکھی ہے۔

صحیح مسلم شریف وغیرہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جنتی عورتیں اونٹ پر سوار ہونے والیاں ہیں، ان میں سے بہتر عورتیں قریش کی ہیں، جو اپنے چھوٹے بچوں پر بہت ہی شفقت اور پیار کرنے والی، اپنے خاوند کی چیزوں کی پوری حفاظت کرنے والی ہیں۔ حضرت مریم علیہا السلام بنت عمران کبھی اونٹ پر سوار نہیں ہوئیں۔ بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ عورتوں میں سے بہتر عورت حضرت مریم علیہا السلام بنت عمران ہیں، اور عورتوں میں سے بہتر عورت حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا ہیں۔ اور ترمذی کی صحیح حدیث میں ہے کہ ساری دنیا کی عورتوں میں سے تجھے مریم علیہا السلام بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آسیہ بیوی فرعون بس ہیں۔ رضي الله عنهن

ایک اور حدیث میں ہے کہ یہ چاروں عورتیں تمام عالم کی عورتوں سے افضل اور بہتر ہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ مردوں میں سے کامل مرد بہت سے ہیں، لیکن عورتوں میں کمال والی عورتیں صرف تین ہیں: مریم بنت عمران، آسیہ فرعون کی بیوی، خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا، اور عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید، یعنی گوشت کے

شوربے میں بھگوئی ہوئی روٹی کی فضیلت تمام کھانوں پر۔ یہ حدیث سوائے ابوداؤد کے باقی سب کتابوں میں ہے۔ صحیح بخاری کی اس حدیث میں حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کا ذکر نہیں ہے۔ میں نے اس حدیث کی تمام سندیں اور ہر سند کے الفاظ اپنی کتاب "البداية والنهاية" میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں جمع کر دیئے ہیں۔ وللہ الحمد و المنة۔ [ابن کثیر]

ابوداؤد، نسائی، حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اہلِ جنت کی عورتوں میں سب سے زیادہ فضیلت والی خدیجہ بنت خویلد اور فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔ ترمذی، احمد، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایک فرشتہ آسمان سے اترا، اللہ تعالیٰ سے اس نے اجازت لے کر مجھے سلام کیا، اور مجھے بشارت دی کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا جنت کی عورتوں کی سردار ہے۔ یہ احادیث بتارہی ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت مریم علیہا السلام سے افضل ہیں، کیونکہ اہلِ جنت کی عورتوں کی کسی خاص زمانہ کے ساتھ کوئی تخصیص نہیں ہے۔ صراحت عام ہے۔ ہاں! تخصیص کا احتمال آیت: ﴿وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ میں ہے، کہ حضرت مریم علیہا السلام کے زمانہ کی عورتیں ہی مراد ہوں۔

بخاری و مسلم میں حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ ارشادِ نبوی مذکور ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا میرا پارہ (جگر کا ٹکڑہ ہے) ہے۔ احمد، ترمذی اور حاکم نے بھی حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایسا ہی نقل کیا ہے۔

اس حدیث کا مقتضایہ ہے کہ تمام مردوں اور عورتوں پر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو برتری حاصل ہو، جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ٹکڑے کے برابر ہم کسی کو قرار نہیں دیتے۔ لیکن جمہور اہلسنت کے نزدیک اس عمومی صراحت سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جن کی فضیلت شرعاً معلوم ہو چکی ہے، یعنی انبیاء علیہم السلام اور صدیقین، اوران کے علاوہ باقی لوگ عمومی میں داخل ہیں۔ [مظہری]

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ
مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ
وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ۭ

قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾

ترجمہ:۔ یاد کرو وہ وقت جب فرشتوں نے مریم سے کہا: بیشک اللہ تعالیٰ تجھ کو خوشخبری دیتا ہے ایک کلمے کی اس کی طرف سے، جن کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا، وہ وجاہت والا ہوگا دنیا میں اور آخرت میں، اور مقربین میں سے ہوگا۔﴿۴۵﴾ اور وہ کلام کرے گا لوگوں کے ساتھ گہوارے میں اور ادھیڑ عمر میں، اور نیکوکاروں میں سے ہوگا﴿۴۶﴾ مریم نے عرض کیا: اے پروردگار! کہاں سے ہوگا میرے لئے لڑکا؟ حالانکہ نہیں ہاتھ لگایا مجھے کسی آدمی نے، اس نے فرمایا اسی طرح اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے جو چاہے، جب وہ کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو پھر وہ اسے کہتا ہے ہوجا، پس وہ بات ہوجاتی ہے۔﴿۴۷﴾

معارف ومنازل

حضرت زکریا علیہ السلام کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی بشارت کے بعد حضرت مریم علیہا السلام کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت دی جارہی ہے۔ مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ دونوں بشارتوں کے درمیانی وقفہ چھ ماہ کا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش:

جب اسلامی عقیدہ یہ ہو کہ ربّ العزّت ہر چیز پر قادر ہے، اور وہ کسی چیز کی تخلیق میں کسی مادّہ اور سبب کا محتاج نہیں ہے، بلکہ مادّہ اور سبب کا خالق بھی وہی پاک ذات ہے۔ اگر اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے، اور ان کی نسل کو حقیر نطفہ سے پیدا فرمانے کا فیصلہ کیا، تو یہ مٹی اور یہ حقیر نطفہ بھی اس کی مخلوق ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کو ماں باپ کے بغیر تخلیق فرمایا۔ حضرت حواء علیہا السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا فرمایا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے حضرت مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا فرمانا کوئی تعجب وحیرانی کی بات نہیں ہے، کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اسی بنیاد پر فرشتے حضرت مریم علیہا السلام کو خوشخبری سنارہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہیں ایک لڑکا ہوگا، بڑی شان والا، جو اللہ تعالیٰ کے کلمہ "کُنْ" کہنے سے ہوگا۔ اور یہی تفسیر ہے ﴿بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ﴾ کی، جو کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مذکور ہے۔ اور یہی جمہور علماء کرام کا قول ہے۔ جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔

مسیح نام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ زمین میں بکثرت سیاحت کریں گے، اسی بنیادی معنی کے لحاظ سے دجال

اکبر کو بھی مسیح کہا گیا ہے، مگر وہ مسیح شر ہی ہوگا، اور مسیح آخیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے واصل جہنم ہوگا۔

اِبْنِ مَرْيَمَ ماں کی طرف منسوب ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ دونوں جہانوں میں برگزیدہ اور مقربانِ خاص میں سے ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کی شریعت اور آسمانی کتاب انجیل کا نزول ہوگا، اور علم وحکمت کے خزانوں کا ان پر ورود ہوگا، اور ان پر ربّ العزّت کی مخصوص بخششوں اور عنایتوں کا نزول ہوگا، اور آخرت میں بھی اولوالعزم پیغمبروں کی طرح اللہ تعالیٰ کے حکم سے جن کے لئے اللہ تعالیٰ چاہے گا وہ شفاعت کریں گے، جو قبول ہو جائے گی۔

وہ اپنے شیر خوردنی میں جھولے میں، اور ادھیڑ عمر میں باتیں کریں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ وَحدَہٗ لَاشَرِیکَ لَہٗ کی توحید اور عبادت کی لوگوں کو بچپن ہی میں دعوت دیں گے، (جیسا کہ آئندہ سورۂ مریم میں مذکور ہے) یہ كَلَامٌ فِي الْمَهْدِ ان کا پہلا معجزہ ہوگا۔ اور بڑی عمر میں بھی جب اللہ تعالیٰ ان پر وحی کرے گا (یا آسمانوں سے نزول کے بعد) اسی طرح وہ اپنے قول وعمل میں علم صحیح رکھنے والے، اور عمل صالح کرنے والے ہوں گے۔

حضرت مریم علیہا السلام ان بشارتوں کو سن کر اپنی مناجات میں کہنے لگیں: اے اللہ! مجھے بچہ کیسے ہوگا؟ میں نے تو نکاح ہی نہیں کیا، اور نہ میرا ارادہ نکاح کرنے کا ہے، اور نہ میں ایسی بدکار عورت ہوں۔ حَاشَا لِلّٰہِ

اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے فرشتے نے جواب میں کہا کہ اللہ تعالیٰ کا امر بہت بڑا ہے، اسے کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی، وہ جو چاہے پیدا کر دے، اس کیلئے کوئی مشکل ومحال نہیں ہے۔ اس نکتے کو خیال میں رکھنا ضروری ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے اس سوال کے جواب میں اس جگہ لفظ يَفْعَلُ تھا، اور یہاں لفظ يَخْلُقُ ہے۔ یعنی پید کرتا ہے۔

نکتہ یہ ہے کہ کسی باطل پرست کو کوئی شبہ کا موقع باقی نہ رہے، اور صاف لفظوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہونا ثابت ہو جائے، اور تمام مدعیانِ تثلیث پر واضح ہو جائے، جیسا کہ آئندہ آنے والا ہے: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ﴾ [آل عمران: ۵۹] (بیشک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم جیسی ہے، اللہ نے انہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر ان سے کہا کہ: ہو جا، پس وہ ہو گئے)۔ پھر يَخْلُقُ کی مزید تاکید کر کے فرمایا: وہ جس کام کو جب کبھی کرنا چاہتا ہے تو صرف اتنا فرما دیتا ہے کہ: ہو جا، بس وہیں وہ ہو جاتا ہے، اور اس کے حکم کے بعد ڈھیل اور دیر نہیں لگتی، جیسے دوسر مقام پر فرمایا: ﴿وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ﴾ [القمر: ۵۰] (اور ہمارا حکم بس ایک ہی مرتبہ آنکھ جھپکنے کی طرح (پورا) ہو جاتا ہے)۔ یعنی ہمارے صرف

ایک مرتبہ کے حکم سے ہی بلا تاخیر فی الفور آنکھوں کے اشاروں میں وہ کام ہو جاتا ہے، ہمیں دوبارہ اسے کہنا نہیں پڑتا۔ سُبحَانَہٗ مَا اَعْظَمَ شَانَہٗ.

کم سنی، بچپن میں کلام کرنے والی شخصیات:

حضرت حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بچپن (گہوارہ) میں بات کرنے والوں کی تعداد پندرہ بتائی ہیں۔ ہم اختصار کے ساتھ یہاں صرف چھ کا بیان کرتے ہیں۔

اوّل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت مریم علیہا السلام جب قوم کے پاس لے آئیں، تو قوم نے سخت غم وغصے کا اظہار کیا، اور کہا: اے ہارون کی بہن! تیرے والدین تو برے نہیں تھے، تو غیر شادی شدہ عورت یہ بچہ کہاں سے لے آئی؟ تو حضرت مریم علیہا السلام نے بچے کی طرف اشارہ کیا، لوگوں نے کہا: گہوارے میں پڑا بچہ کیسے ہمارے ساتھ بات کرے گا؟ اس وقت نومولود عیسیٰ علیہ السلام نے بولنا شروع کیا: ﴿قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝٣٠ وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۝٣١﴾. [مریم: ۳۱] (وہ بول اٹھا کہ: میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی ہے، اور نبی بنایا ہے۔ اور جہاں بھی میں رہوں مجھے بابرکت بنایا ہے، اور جب تک زندہ رہوں مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے)۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ دیگر بعض بچوں نے بھی کم سنی میں کلام کیا۔ صحیحین میں روایت ہے کہ ایک عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی، پاس سے ایک سرکش ومغرور شخص گھوڑے پر سوار گزرا، وہ عورت اس کی شان وشوکت دیکھ کر کہنے لگی: اے اللہ! میرے بچے کو بھی ایسا ہی بنا دے، بچہ دودھ چھوڑ کر کہنے لگا: یا اللہ! مجھے ایسا نہ بنانا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں سے لوگ گزرے، جو ایک عورت پر چوری اور بدکاری کا الزام لگا کر اسے پیٹتے گھسیٹتے جا رہے تھے، مگر وہ زبان سے یہی کہہ رہی تھی: حَسْبِیَ اللّٰهُ۔ دودھ پلانے والی عورت نے اس معتوب عورت کی حالت زار دیکھ کر اپنے بچے کے متعلق کہا کہ: یا اللہ میرے بچے کو ایسا نہ بنانا، بچہ فوراً دودھ چھوڑ کر بولا: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِی مِثْلَهَا۔ اے اللہ! مجھے ایسا بنا دے۔

اس میں راز یہ ہے کہ یہ بے گناہ اور مظلوم تھی، جبکہ پہلا شخص ظالم اور جابر تھا، جسے بچے نے مسترد و ناپسند کیا۔

تیسرا ﴿وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا﴾ [یوسف: ۲۶] (اور زلیخا کے خاندان سے ایک گواہ نے گواہی دی)۔ جب عزیز مصر کی بیوی زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام پر تہمت لگائی، تو اس کے خاندان کے نومولود بچے نے

حضرت یوسف علیہ السلام کی براءت میں گواہی دی۔

چوتھے فرعون کی بیٹی کو کنگھی کرنے والی مؤمنہ عورت نے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ جب پڑھ لی تو فرعون کی لڑکی نے پوچھا یہ کیا وظیفہ ہے؟ مشاطہ نے کہا: یہ ہمارے، تمہارے، تیرے باپ اور سارے جہاں کے رب کا نام ہے، اس پر فرعون نے اس کے بچے کو آگ میں ڈالا، وہ بچہ مسلسل اپنی ماں کو صبر کی اور حق پر ہونے کی تلقین کرتا رہا، اسی چیز سے فرعون کی بیوی آسیہؓ نے متاثر ہو کر اپنے ایمان کا کھلم کھلا اظہار کیا۔ اس سے پہلے انہوں نے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھا تھا۔

پانچویں اصحاب الاخدود کے واقعہ میں صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آگ میں ڈالے ہوئے نومولود بچے نے صاف صاف بات کر کے اپنی والدہ اور دیگر مسلمانوں کو جلدی جلدی آگ میں داخل ہونے کی ترغیب دی، جس کے نتیجے میں تقریباً ستر ہزار مسلمان آگ میں ڈالے گئے۔ اور جنت کی راحتوں میں پہنچ گئے۔ تفصیل سورۃ البروج میں دیکھیں۔

چھٹے صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ حضرت جریج پر ایک عورت نے تہمت لگائی، کہ یہ نومولود میرا بچہ اسی کے زنا سے پیدا ہوا ہے۔ لوگوں نے وہاں جا کر ان کے حجرے کو منہدم کر کے توڑ دیا، اور انہیں بہت مارا پیٹا۔ انہوں نے پوچھا کہ میرا قصور بتاؤ کیا ہے؟ لوگوں نے کہا: تم نے فلاں عورت سے زنا کیا ہے، اور اس کا حرام زادہ بچہ پیدا ہوا، تو انہوں نے کہا: تم اس عورت اور اس کے بچے کو یہاں حاضر کرو، جب وہ آ گئے، تو حضرت جریج نے بچے سے پوچھا کہ بتاؤ تمہارا باپ کون ہے؟ سارے لوگوں کے سامنے بچے نے اپنے باپ کا نام بتا دیا، جس نے اس عورت کے ساتھ زنا کیا تھا، اور وہ چرواہا تھا۔ پس سارے لوگ شرمندہ ہوئے، اور حضرت جریج باعزت بری ہوئے۔ الحمد للہ!

تو لوگوں نے کہا کہ اگر تم چاہو تو تمہارے عبادت خانے کو سونے اور چاندی سے تعمیر کریں۔ حضرت جریج نے کہا: مجھے سونے چاندی کی ضرورت نہیں، میرا حجرہ جیسے پہلے مٹی سے بنا ہوا تھا دوبارہ اسی طرح بناؤ۔ [متفق علیہ]

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ
جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ

طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ
وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا
بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ
رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾

ترجمہ: اورسکھائے گا اس کو کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل۔ ﴿۴۸﴾ اور اللہ تعالیٰ اس کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا (اور وہ ان سے کہے گا) بیشک میں لایا ہوں تمہارے پاس نشانی تمہارے ربّ کی طرف سے، اور وہ یہ ہے کہ میں بناتا ہوں تمہارے سامنے گارے سے پرندے کی شکل کی طرح، پس میں پھونک مارتا ہوں اس میں، پس وہ ہوجاتا ہے اڑنے والا اللہ تعالیٰ کے حکم سے، اور میں اچھا کردیتا ہوں مادرزاد اندھے کو، اور برص والے کو، اور میں زندہ کردیتا ہوں مردوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے، اور میں بتاتا ہوں تم کو جو تم کھاتے ہو، اور جو تم ذخیرہ بنا کر رکھتے ہو اپنے گھروں میں، بیشک البتہ اس میں نشانی ہے تمہارے لئے، اگر تم ایماندار ہو۔ ﴿۴۹﴾ اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اس کی جو مجھ سے پہلے ہے تورات، اور میں اس واسطے آیا ہوں کہ میں حلال کردوں تمہارے لئے بعض وہ چیزیں جو تم پر حرام قرار دی گئی ہیں، اور میں لایا ہوں تمہارے پاس نشانیاں تمہارے ربّ کی طرف سے، پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ ﴿۵۰﴾ بیشک اللہ میرا (بھی) پالنے والا ہے، اور تمہارا (بھی) پالنے والا ہے، پس اسی کی عبادت کرو، یہ ہے میرا سیدھا راستہ۔ ﴿۵۱﴾

معارف ومنازل

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عظیم الشان معجزات:

فرشتے حضرت مریم علیہا السلام سے کہتے ہیں کہ تیرے اس لڑکے، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پروردگارِ عالم لکھنا سکھائے گا، اور حکمت سکھائے گا۔ لفظ "حکمة" کی تفسیر سورۂ بقرہ میں گزر چکی، اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اسے تورات سکھائے گا، اور انجیل سکھائے گا، چنانچہ یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ نے انہیں سکھائیں۔ آپ علیہ السلام بیک وقت تورات اور انجیل کے قاری اور حافظ رہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے علوم وہبی اور لدنی ہوتے ہیں، جن میں کسی بھی اکتساب کا دخل نہیں ہوتا۔

اور فرشتوں نے یہ بھی کہا کہ اللہ تعالیٰ انہیں بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول بنا کر مبعوث فرمائے گا، اس بات کے کہنے کے لئے کہ میرا یہ معجزہ دیکھو کہ مٹی لے لی، اس کا پرندہ بنایا، پھر پھونک مارتے ہی وہ سچ مچ کا جیتا جاگتا پرندہ بن کر سب کے سامنے اڑنے لگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے، اور اس کے فرمان سے تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اپنی قدرت سے نہیں تھا۔ یہ ایک معجزہ تھا، جو آپ علیہ السلام کی نبوت وصداقت کی نشانی تھا۔

اَكْمَه اس اندھے کو کہتے ہیں جسے دن کو کچھ دکھائی نہ دے، اور رات کو دکھائی دے۔ بعض نے کہا کہ جسے رات کو دکھائی نہ دے، مگر دن کو دکھائی دے۔ بعض نے کہا: بھینگا، اور ترچھا، اور کانا مراد ہے۔ بعض کا قول یہ بھی ہے کہ مادرزاد نابینا، یعنی ماں کے پیٹ سے بالکل اندھا پیدا ہوا ہو۔ یہاں یہی آخری قول معتبر اور راجح ہے، کیونکہ اس میں معجزے کا کمال اور بلندی ہے، اور مخالفین کو عاجز کرنے کے لئے یہ صورت اس کی اور صورتوں سے اعلیٰ ہے۔

اَبْرَص سفید داغ والی کوڑھی کو کہتے ہیں۔ یہ بہت بُرا مرض ہے، جس کے مریض سے لوگ بہت ہی نفرت کرتے ہیں۔ اس مرض کے بڑے نقصانات ہیں۔ انسانی حسن وصورت اور جمال ملیامیٹ ہو کر ایک بدصورتی کی شکل اختیار کر جاتا ہے، ایسے بیمار بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور معجزہ سے اچھے تندرست ہو جاتے تھے، حالانکہ یہ مرض تقریباً لاعلاج ہی ہے۔

مزید برآں ﴿وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردوں کو آپ علیہ السلام زندہ کرتے تھے۔ جب کبھی کسی قبرستان پر آپ علیہ السلام کا گزر ہوتا ہے، کسی قبر پر کھڑے ہو کر آواز دیتے: اٹھو، تو سیکڑوں سالوں کا مرا ہوا شخص زندہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا، آپ علیہ السلام اس سے سوالات کرتے، اور دوبارہ قبر میں لوٹا دیتے۔ تاریخی کتب میں اس قسم کہ بہت سے واقعات مندرج ہیں۔

﴿وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ﴾ [الآیہ]۔ یہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ فرمایا: جو کوئی تم میں سے آج اپنے گھر میں جو کچھ کھا کر آیا ہو، میں اسے بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے بتادوں گا، اور کل کے لئے بھی اس نے جو تیاری کی ہو، مجھے اللہ تعالیٰ کے معلوم کرانے سے معلوم ہوتا ہے، اور یہ میری صداقت کی دلیل ہے۔

رہا یہ کہ آپ علیہ السلام نے تورات کا کوئی حکم منسوخ کیا یا نہیں؟ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آپ علیہ السلام نے تورات کا کوئی حکم منسوخ نہیں کیا، البتہ بعض حلال چیزوں میں جو اختلاف تھا، اور بڑھتے بڑھتے گویا ان کی حرمت پر اجماع ہو چکا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی حقیقت بیان فرمادی، اور ان کے حلال ہونے پر مہر ثبت کردی، جیسے

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ﴾ [الزخرف: ۶۳] (میں تمہارے بعض آپس کے اختلاف میں صاف فیصلہ کردوں گا)۔ واللہ اعلم

اکثر محققین علماء کرام کہتے ہیں کہ ہر زمانے کے نبی کو اسی زمانے کی مناسبت سے خاص خاص معجزات حضرت باری تعالیٰ نے عطا فرمائے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سحر وجادو کا بڑا چرچا تھا، اور جادوگروں کی بڑی تعظیم و منزلت ہوتی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو وہ معجزات دیئے کہ تمام جادوگروں کی آنکھیں کھل گئیں، اور حیرانی و سراسیمگی ان پر چھا گئی، اور انہیں کامل یقین ہو گیا کہ یہ تو اللہ تعالیٰ واحد وجبّار کی طرف سے عطیہ ہے، یہ ہرگز جادو نہیں ہے، چنانچہ ان کی گردنیں جھک گئیں، اور یک لخت وہ اسلام کے حلقہ بگوش ہو کر سرِ تسلیم خم کر کے ﴿اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ [الشعراء] (ہم نے ایمان لایا ربّ العالمین پر) کہتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قدموں پر گرے، بالآخر وہ سارے اللہ تعالیٰ کے مقرّب بندے بن گئے، اور سر کٹوا کر خلدِ بریں پہنچ گئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طبیبوں اور حکیموں کا دور دورہ تھا، کامل اطبّاء اور ماہر حکیم علم طبعیات کے پورے عالم اور لاجواب کامل الفن استاد و معلّم جو موجود تھے، پس آپ علیہ السلام کو وہ معجزے عطا ہوئے جن سے سارے لوگ عاجز تھے۔ بھلا مادرزاد اندھوں کا بالکل بینا کر دینا، اور کوڑھیوں کو اس مہلک مرض سے نجات دلانا اتنا ہی نہیں، بلکہ جمادات جو محض بے جان چیز ہے، اس میں پھونک مار کر روح ڈالنا، اور قبروں میں سے مردوں کو زندہ کر دینا، یہ کسی طبیب اور حکیم کے بس کی بات ہے؟ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم سے بطور معجزہ یہ سب کچھ آپ علیہ السلام کے ہاتھ مبارک سے ظاہر ہوئے، جن کی نظیر پیش کرنے سے سارے مخالفین عاجز و بے بس رہے۔

اسی طرح جب ہمارے نبی اکرم سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اس وقت فصاحت وبلاغت، شعرو شاعری، نکتہ سنجی، بلند خیالی، بول چال میں لطافت ونزاکت کا زمانہ تھا۔ اس فن میں بلند پایہ شاعروں نے وہ کمالِ فائق حاصل کیا ہوا تھا کہ دنیا ان کے قدموں پر جھک پڑی تھی۔ پس سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو کتاب اللہ ایسی شان والی عطاء فرمائی گئی کہ ان سب کی بجلیاں ماند پڑ گئیں، اور کلام اللہ کے نور مبین نے انہیں نیچا دکھا دیا، اور وہ اتنے گھبرائے کہ سر نہ اٹھا سکے، اور انہیں یقینِ کامل ہو گیا کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے، اور تمام دنیا سے کہہ دیا گیا اور جتا جتا کر بتا بتا کر اور بار بار اعلان کیا گیا کہ ہے کوئی جو اس جیسا کلام پیش کرے؟ اکیلے اکیلے نہیں، سب مل کر آجاؤ، اور انسان ہی نہیں جنات کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لو، پھر سارے قرآن کے برابر بھی نہیں، صرف دس سورتوں کے برابر ہی سہی، اور اچھا یہ بھی نہ

سہی ایک ہی مختصر سورت (جیسی سورت کوثر) اس کے مثل بنا کر تو لاؤ۔

لیکن سب کی کمریں ٹوٹ گئیں، ہمتیں پست ہوگئیں، گلے خشک ہوگئے، زبانیں لٹک گئیں، اور گنگ ہوگئیں، اور آج تک ساری دنیا سے نہ بن پڑا، اور نہ آئندہ کبھی ہو سکے گا۔ بھلا کہاں اللہ تعالیٰ کا کلام، اور کہاں مخلوق کا کلام؟ تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی، وہاں دیکھی جائے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ
نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا
الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ﴿۵۴﴾

ترجمہ: پس جب (حضرت) عیسیٰ نے ان کا کفر معلوم کر لیا تو کہنے لگے: اللہ تعالیٰ کی راہ میں میری مدد کرنے والا کون کون ہے؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی راہ میں مددگار ہیں، ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے، اور آپ گواہ رہے کہ ہم تابعدار ہیں۔ ﴿۵۲﴾ اے ہمارے پالنے والے رب! ہم تیری اتاری ہوئی وحی پر ایمان لائے، اور ہم نے تیرے رسول کی بات مان لی، اتباع کر کے، پس آپ ہمیں گواہوں میں لکھ لے۔ ﴿۵۳﴾ اور کافروں نے مکر (تدبیر) کیا، اور اللہ تعالیٰ نے بھی، اور اللہ تعالیٰ سب مکر (داؤ) کرنے والوں سے بہتر ہے۔ ﴿۵۴﴾

معارف ومنازل

جب چاروں افق پر اندھیرا ہو، انسانی شرافت کا دور دور تک نام ونشان نہ ہو، ظلم و بربریت کا عمومی عروج ہو، انسان جانوروں سے بدتر ہو، کفر وشرک اور مخرّبِ اخلاق معاصی کا بازار گرم ہو، انسانوں کی پیشانی ایک طرف بادشاہوں، دوسری طرف بے جان پتھروں سے بنے ہوئے بتوں اور کواکب کے سامنے سجدہ ریز ہوں، مخلوقات کا رشتہ خالق جل شانہ سے مکمل منقطع ہو، تو ایسے وقت میں انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا فیصلہ ہو جاتا ہے، تاکہ منقطع رشتوں کا جوڑ لگائیں، اور دنیا کی ظلمتوں کو انوارِ وحی کے فیوض و برکات سے مٹائیں، شرک وکفر کا قلع قمع کر کے نُورِ توحید کو عام کریں۔

لوگوں کو غیر اللہ کی عبادت اور بندہ پرستی کے دلدل سے نکال کر حق پرستی پر ڈال دیں، پتھر دلوں کو موم کر کے

ہر قسم کے ظلم وستم سے لوگوں کو نجات دیدیں، اور ایک ایسا روحانی اسلامی انقلاب برپا کریں کہ جہنمی معاشرہ جنتی معاشرہ کا منظر پیش کرے۔ پس ظاہر ہے کہ صدیوں سے قائم جہنمی معاشرہ یک لخت تبدیل نہیں ہوسکتا، اور پیغمبر تنِ تنہا اکیلا یہ کٹھن اور مشکل کام بآسانی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے، اور اتنا سخت کام انجام دینا فردِ واحد کے لئے اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

اسی نکتہ کے پیش نظر انبیاء کرام علیہم السلام کو حکم ہوتا ہے کہ اوّلین فرصت میں کچھ لوگوں کو حسنِ تدبیر کے ساتھ اپنے ہمنوا رفیقِ کار تیار کریں، پھر ان کو ساتھ ملا کر پورے عزم وہمت کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جدوجہد جاری رکھیں۔ تو اسی سلسلے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں سے کہا تھا:

﴿مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ﴾۔ اللہ تعالیٰ کے دین کے خاطر میری مدد کرنے والا کون ہے؟ تو حواریوں نے لبّیک کہتے ہوئے کہا تھا: ﴿نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ﴾۔ اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر آپ علیہ السلام کی مدد کرنے اور ساتھ دیئے پر ہم دل وجان سے تیار ہیں۔

تو یہ چیز، یعنی کارِ نبوت کیلئے لوگوں کو آمادہ کرنا، اور ان سے مدد طلب کرنا عین مصلحت ہے، جو کہ نہ نبوت کیلئے منافی ہے، اور نہ توکّل کے لئے مضر ہے۔ اسی طرح ہمارے پیغمبر سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی مکہ مکرمہ سے ہجرت سے پہلے موسمِ حج میں فرمایا کرتے تھے کہ ہے کوئی جو مجھے اللہ تعالیٰ کا کلام پہنچانے کے لئے اپنے ہاں جگہ دیدے؟ قریش تو کلام اللہ کی تبلیغ سے مجھے روک رہے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اعلان پر عقبہ کے موقع پر آئے ہوئے مدینہ طیبہ کے انصار نے لبّیک کہتے ہوئے اس سعادت کی تحصیل میں سارے جہاں سے سبقت لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد پر کمر بستہ ہونے کا فیصلہ کیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پاس بلانے اور ہر قسم کی جانی مالی نصرت کی درخواست پیش کی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہنچے تو ایسا والہانہ، بے مثال، عجیب استقبال کیا جس کی مثال نہ ہو۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جگہ بھی دیدی، اور ہر قسم کی مدد بھی کی، اور ساری دنیا اور قریشِ مکہ ویہود وغیرہ کے مقابلے میں سینہ سپر ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت اور بے مثال مدد کی۔ یہیں سے اسلام کا عروج شروع ہوا، اور رفتہ رفتہ چاردانگِ عالم میں پھیل گیا۔ رضي الله عنهم أجمعين

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس آواز پر بھی بنی اسرائیل کے چند لوگوں (حواریوں) نے لبّیک کہا، آپ علیہ السلام پر ایمان لائے، اور مکمل تائید وتصدیق کی، اور پوری نصرت کی، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب انجیل کو سینے

کے ساتھ لگا کر اس پر عمل پیرا ہے، اور آئندہ کے لئے عزمِ مصمم کر کے اس پر چلنے کا وعدہ کیا۔

یہ حوارین دھوبی تھے، اور حواری انہیں ان کے کپڑوں کی سفیدی کی وجہ سے کہا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ شکاری تھے۔ صحیح یہ ہے کہ حواری کہتے ہیں: مددگار کو، جیسے بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہے کوئی جو سینہ سپر ہو جائے؟ اس آواز کو سنتے ہی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ تیار کھڑے ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارہ یہی فرمایا، پھر بھی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے ہی قدم اٹھایا، پس سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر نبی کے حواری ہوتے ہیں، اور میرا حواری زبیر ہے۔ پھر یہ لوگ اپنی دعاء میں کہتے ہیں کہ اے پروردگار! ہمیں شاہدوں میں لکھ لے۔ اس سے مراد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک امت محمدیہ میں لکھ لینا ہے۔ اس تفسیر کی روایت سنداً بہت عمدہ ہے۔ [ابن کثیر]

پھر بنی اسرائیل کے اس ناپاک گروہ کا ذکر ہو رہا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جانی دشمن تھے، انہیں مروا دینے اور سولی دینے کا قصد رکھتے تھے، جنہوں نے اس زمانہ کے بادشاہ کے کان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف بھر دیئے تھے، کہ یہ شخص لوگوں کو بہکاتا پھرتا ہے، ملک میں بغاوت کر رہا ہے، اور رعایا کو بگاڑ رہا ہے، باپ بیٹوں میں فساد کرا رہا ہے۔ یہ لوگ کذب و خیانت، غلط بیانی میں اتنے آگے بڑھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زانیہ کا بیٹا کہنے لگے، اور بڑے بڑے بہتانوں سے نہیں شرمائے۔

یہاں تک کہ بادشاہ بھی آپ علیہ السلام کا جانی دشمن بن گیا، اور اپنی فوج کو بھیجا کہ اسے گرفتار کر کے سخت سزا کے ساتھ پھانسی دی جائے۔ فوج نے آپ علیہ السلام کے مکان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لیا، ناکہ بندی کر کے فوجی اندر گھس گئے، لیکن ذات باری تعالیٰ عزّ شانہ نے ان کی تدبیروں کو ناکام بنا کر آپ علیہ السلام کو اوپر آسمانوں پر اٹھا لیا، اور آپ علیہ السلام کی شباہت اس گھر کے رہنے والے ایک شخص پر ڈال دی۔

یہ لوگ اس شخص کو رات کے اندھیرے میں گرفتار کر کے لے گئے، اور سخت سزا دے کر صلیب پر چڑھا کر اسے پھانسی دیدی۔ اور وہ مطمئن ہو کر کہتے رہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے نبی کو پھانسی پر لٹکا کر قتل کر دیا۔

ع تدبیر کند بندہ، تقدیر کند خندہ

اس بھیانک کردار اور بدبختی کا ثمرہ انہیں یہ ملا کہ ان کے دل ہمیشہ کے لئے سخت ہو گئے، ہدایت سے محروم ہو گئے، باطل پر اڑ گئے، اور دنیا و آخرت میں ذلیل و خوار ہو گئے، اور ابدی طوقِ لعنت اپنے گلوں میں ڈال کر مغضوب و

مبغوض قرار پائے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر انہیں مکر آتے ہیں تو کیا ہم نہیں جانتے؟ ہم تو ان سے بہتر مکر کرنے والے ہیں، یعنی تدبیر۔

دراصل مکر عربی زبان میں لطیف اور خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں، اگر یہ اچھے مقصد کے لئے ہو تو اچھا ہے، اور اگر برے مقصد کے لئے ہو تو برا ہے۔ مگر اردو وغیرہ زبانوں اور عام عرف میں مکر بری تدبیر اور سازش وحیلہ کو کہتے ہیں۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ
الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ
بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى
الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۟ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ
اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾

ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے عیسیٰ! میں تجھے پورا لینے والا ہوں، اور تجھے اپنی جانب اٹھانے والا ہوں، اور تجھے کافروں سے پاک کرنے والا ہوں، اور تیرے تابعداروں کو کافروں کے اوپر رکھنے والا ہوں، قیامت کے دن تک، پھر تم سب کا لوٹنا میری ہی طرف ہے، میں ہی تمہارے آپس کے تمام تر اختلافات کا فیصلہ کردوں گا۔ ﴿۵۵﴾ پس کافروں کو تو میں دنیا اور آخرت میں سخت ترین عذاب سے دوچار کردوں گا، اور ان کا کوئی بھی مددگار نہ ہوگا۔ ﴿۵۶﴾ لیکن ایمان والوں اور نیک اعمال والوں کو اللہ تعالیٰ ان کا پورا پورا ثواب دے گا، اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔ ﴿۵۷﴾ یہ جسے ہم تیرے سامنے پڑھ رہے ہیں آیات ہیں، اور حکمت والی نصیحت ہے۔ ﴿۵۸﴾

معارف ومنازل

حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ بعض مفسرین فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ میں تجھے اپنی طرف اٹھالوں گا، پھر اس کے بعد تجھے فوت کروں گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: یعنی میں تجھے مارنے والا ہوں (پھر اٹھانے والا ہوں) وہب ابن منبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو اٹھاتے وقت شروع دن میں تین ساعت تک فوت کردیا

تھا۔ ابن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ نصاریٰ کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو سات گھنٹے تک فوت رکھا، پھر زندہ کیا ۔ وہب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تین دن تک موت رہی، پھر زندہ کر کے اٹھالیا۔ مطر وراق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یعنی میں تجھے دنیا میں پورا پورا دینے والا ہوں، یہاں وفات سے موت مراد نہیں ہے۔

اسی طرح ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "توفی" سے یہاں مراد ان کا رفع ہے۔ اور اکثر مفسرین کے اقوال ہیں کہ "توفی" سے نیند مراد ہے، جیسے اور جگہ قرآن حکیم میں ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ﴾ [الأنعام: ٦٠] (وہ اللہ تعالیٰ جو تم کو رات کو فوت کر دیتا ہے) یعنی سلا دیتا ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہے: ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا﴾ [الزمر: ۴۲] (اللہ تعالیٰ جانوں کو فوت کر دیتا ہے ان کی موت کے وقت، اور جو نہیں مرتیں انہیں ان کی نیند کے وقت)۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نیند سے بیدار ہوتے تو فرماتے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ. اللہ تعالیٰ کا شکر ہے وہ جس نے ہمیں مار ڈالنے کے بعد پھر زندہ کر دیا۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿١٥٦﴾ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴿١٥٧﴾ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٥٨﴾ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿١٥٩﴾﴾ [النساء: ١٥٧] (اور اس لئے کہ انہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، اور مریم پر بڑے بھاری بہتان کی بات کہی۔ اور یہ کہا کہ: ہم نے اللہ کے رسول مسیح ابن مریم کو قتل کر دیا تھا، حالانکہ نہ انہوں نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کیا تھا، نہ انہیں سولی دے پائے تھے، بلکہ انہیں اشتباہ ہو گیا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے، وہ اس سلسلے میں شک کا شکار ہیں۔ انہیں گمان کے پیچھے چلنے کے سوا اس بات کا کوئی علم حاصل نہیں ، اور یہ بالکل یقینی بات ہے کہ وہ عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل نہیں کر پائے۔ بلکہ اللہ نے انہیں اپنے پاس اٹھالیا تھا، اور اللہ بڑا صاحبِ اقتدار، بڑا حکمت والا ہے۔ اور اہلِ کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو اپنی موت سے پہلے ضرور بالضرور عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان نہ لائے۔ اور قیامت کے دن وہ ان لوگوں کے خلاف گواہ بنیں گے)۔

اس آیت کریمہ نے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق ظنون وشکوک اور تمام باطل عقائد واوہام سے ایسا

پردہ اٹھا کر وضاحت کی کہ مزید کسی تفصیل کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اور یہ آیت کریمہ کذّاب قادیان مرزا غلام، اور اس کے خبیث متبعین کے منہ پر طمانچہ اور تازیانۂ عبرت ہے۔ اس مسئلہ پر فخر المحدثین نمونۂ سلف حضرت الحجۃ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ "عقيدة الإسلام في حياة عيسىٰ" نہایت جامع اور بے حد مفید ہے، اور یہ کتاب عالمِ اسلام کیلئے عظیم نعمت ہے۔ الحمدللہ

﴿وَمُطَهِّرُكَ﴾ إلي آخره۔ یعنی میں تجھے اپنی طرف اٹھا کر کافروں سے پاک کرنے والا ہوں، اور تیرے تابعداروں کو کافروں پر غالب رکھنے والا ہوں، قیامت تک۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تابعدار یہود و نصاریٰ نہیں، بلکہ اس امت کے مسلمان مراد ہیں، جو کہ اصلی تابعدار ہیں، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا پیغمبر برحق تسلیم کرتے ہیں، اور ان کی والدہ ماجدہ کو پاکیزہ صدیقہ مانتے ہیں، قربِ قیامت میں جب وہ آسمان سے جامع دمشق کے مشرقی مینار پر نزول فرمائیں گے، اور یہود کے باپ دجّال اکبر کو "باب اللد" کے پاس قتل کریں گے، اور مہدی علیہ السلام کے ساتھ مل کر اسلام کے مخالفین کے ساتھ جہاد کریں گے۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٥٩﴾
الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُن مِّنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿٦٠﴾ فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ
الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ قف
ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ﴿٦١﴾ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ
إِلَٰهٍ إِلَّا اللَّهُ ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٢﴾ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٦٣﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال ہو بہو آدم کی مثال ہے، جسے مٹی سے پیدا کر کے کہہ دیا کہ: ہو جا، پس وہ ہو گیا۔ ﴿۵۹﴾ تیرے ربّ کی طرف سے حق یہی ہے، خبردار شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔ ﴿۶۰﴾ پس جو شخص تیرے پاس اس علم کے آجانے کے بعد بھی تجھ سے اس میں جھگڑے تو آپ کہہ دیں کہ: آؤ، ہم تم اپنے اپنے فرزندوں کو، اور ہم تم اپنی اپنی عورتوں کو، اور ہم تم خاص اپنی اپنی جانوں کو بلالیں، پھر ہم زاری والتجا کریں، اور جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت کر ڈالیں۔ ﴿۶۱﴾ یقیناً صرف یہی سچا بیان ہے، اور کوئی معبود نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے، اور بے

شک غالب اور حکمت والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (۶۲) پھر بھی اگر یہ قبول نہ کریں تو اللہ تعالیٰ بھی صحیح طور پر فسادیوں کو جاننے والا ہے (۶۳)

معارف ومنازل

اس آیت کا نزول نجران کے عیسائی وفد کے حق میں ہوا تھا۔ نجران کے نمائندوں نے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ آپ ہمارے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کیوں برا بھلا کہتے ہیں؟ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: میں کیا کہتا ہوں؟ انہوں نے کہا: آپ ان کو اللہ تعالیٰ کا بندہ کہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بیشک وہ اللہ تعالیٰ کے بندے، اللہ تعالیٰ کے رسول، اور اللہ تعالیٰ کا کلمہ (یعنی صرف حکم) تھے، جو عذرا بتول حضرت مریم علیہا السلام کے شکم میں اللہ تعالیٰ نے ڈال دیا تھا۔

یہ سن کر وہ غصہ میں کہنے لگا: کیا آپ نے کوئی آدمی ایسا دیکھا ہے جو بغیر باپ کے ہو؟ تفسیر روح المعانی کے مطابق یہ وفد نجران سے متعلق ہے۔ امام قتادہ، ربیع بن انس اور ابن جریج رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ کے نزدیک اس کا تعلق یہودِ مدینہ سے ہے، اور کچھ دیگر لوگوں کے نزدیک اس کا تعلق یہود ونصاریٰ دونوں سے ہے۔

علماء محققین کے نزدیک عموم ہی بہتر ہے، چنانچہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کر رہے ہیں کہ اس کا تعلق علماء ومشائخ کے ساتھ ہے۔ نجران کے عیسائیوں کا وفد جب حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حجت بازی شروع کی، حسبِ حکمِ الٰہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو مباہلہ کی دعوت دی، چنانچہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن، حضرت حسین رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ساتھ لے کر تشریف لائے، مگر عیسائیوں کے وفد میں جو شخص ذی رائے سمجھا جاتا تھا، اس نے باہم مشورہ کرتے ہوئے اپنے رفقاء سے کہا کہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ برحق نبی ہیں، اور نبی جب کسی قوم سے مباہلہ کرتے ہیں تو وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے میری رائے میں اس سے صلح کر کے واپس چلا جانا ہمارے لئے بہتر ہے۔

چنانچہ ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق وفد نے جزیہ کی ادائیگی پر صلح کر لی، اور ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق سالانہ دو ہزار کپڑوں کے جوڑوں پر صلح ہوئی، کہ ایک ہزار جوڑے ماہِ صفر میں، اور ایک ہزار جوڑے ماہِ رجب میں ادا کئے جائیں گے، اور تیس زرہیں، اور تیس گھوڑے، اور تیس اونٹ اور ہر قسم کے تیس تیس ہتھیار پیش کرنے ہوں گے۔

مسند احمد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ اگر یہ نجرانی مباہلہ کرکے گھر لوٹتے تو ان کی اولاد، مال سب تباہ ہوجاتے۔ اور طبرانی کی مرفوع روایت کے مطابق سب میں آگ لگ جاتی۔ وَلَمَسَخُوا قِرَدَةً وخَنَازِير [ابن عساکر، بیضاوي]

فائدہ:

اس آیت سے قیاس کا شرعی حجت ہونا ثابت ہورہا ہے، کیونکہ تخلیق آدم علیہ السلام پر قیاس کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حال کو حضرت آدم علیہ السلام کے حال کے مماثل قرار دیا، اس سے قیاس کا حجت شرعی ہونا معلوم ہوا۔ پس مسلمانوں کا وہ گروہ جو صرف قرآن وسنت اور اجماع کو احکام کی علت قرار دیتا ہے، اور قیاس کو احکام کی دلیل نہیں مانتا، اس آیت سے اس کے قول کی تردید مستفاد ہوتی ہے۔ [مظہری]

مباہلہ کی حقیقت:

کسی چیز کے حق و باطل ہونے میں اگر فریقین کے درمیان نزاع ہوجائے، اور دلائل سے نزاع ختم نہ ہو، تو پھر آخری طریقہ کار یہ ہے کہ سب مل کر اللہ تعالیٰ سے دعا اور التجاء کریں کہ: اے اللہ واحد لاشریک! جو باطل پر ہو اس کو ہلاک کرڈال، اور جھوٹے پر اپنا قہر نازل فرما۔ چنانچہ جو جھوٹا ہوگا اس کو خمیازہ بھگتنا پڑے گا، اور اس طرح حق و باطل میں امتیاز ہوجائے گا۔

اس میں اصل تو خود مباحثہ کرنے والوں کا جمع ہوکر مباہلہ کرنا اور بددعا کرنا ہے، اہل وعیال، قرابتداروں کو لانا چنداں ضروری نہیں ہے، تاہم وہ بھی شریک ہوجائیں تو بات کا وزن بڑھ جاتا ہے، اور معاملہ کی اہمیت زیادہ ہوجاتی ہے، کیونکہ اولاد انسان کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہوتی ہے، ان کی تکلیف کے خیال سے بھی آدمی کو رنج لاحق ہوجاتا ہے، چہ جائیکہ ان کو قربان اور ہلاک کرنے کیلئے آمادہ ہوجائے۔

اس سے دعویٰ کی صداقت وراستی معلوم ہوجاتی ہے، اور کمال یقین پیدا ہوجاتا ہے، کیونکہ جس کو ذرا بھی تردد وتأمل ہوتا ہے اس قسم کے اقدام کی کبھی اس کو ہمت وجرأت نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں، اور ایک خوف وخطرہ اسے محسوس ہوتا ہے، اور وہ اس طرح کے اقدام سے باز رہنے کی کوشش کرتا ہے۔

چنانچہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پورے خاندان کے ساتھ بلاخوف وخطر میدان میں تشریف لے آئے، مگر وفد نجران کو اپنی تباہی وہلاکت کھلم کھلا دکھائی دی، اور وہ تذبذب وسراسیمگی کے عالم میں ہتھیار ڈال دیئے، اور اس قسم

کے اقدام سے تائب ہوئے۔ بالآخرانہوں نے جزیہ کی ادائیگی پر مصالحت کی،اور خوف وہراس کے ساتھ واپس لوٹے۔

اگر یہ لوگ مباہلہ کرتے،تو یہ وادی ان پر آگ برساتی،اور وہ صفحۂ ہستی سے اس طرح مٹ جاتے،جیسے گزشتہ اقوام عالم ثمود وعاد وغیرہ۔

جب سردار انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امام حسن وحسین اور حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ساتھ لے کر قسم کھانے (مباہلہ) کے لئے نکلے،تو نصرانیوں پر ان کے نورانی پاکیزہ چہروں کا ایک رعب پڑا،پس مباہلہ کی ان میں جرأت نہ ہوئی،اور آپس میں کہنے لگے کہ اگر یہ نورانی چہرے یہ دعا کریں کہ پہاڑ ٹل جائے تو بیشک ٹل جائے گا، ہمارے پاس ان کے مقابلہ کی ہمت نہیں ہے۔ [حاکم ابن مردویہ أبو نعیم]

واقعۂ مباہلہ اور ردّ روافض:

اس کا پس منظر یہ ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجران کے نصاریٰ کی جانب ایک فرمان بھیجا،جس میں ترتیب وار تین چیزوں کا بیان ہے:

(۱) تم لوگ اسلام قبول کرو۔ (۲) یا جزیہ ادا کرو۔ (۳) یا جنگ کیلئے تیار ہوجاؤ۔

نصاریٰ نے آپس میں مشورہ کرکے شرحبیل،عبداللہ بن شرحبیل اور جبار بن قیس کو سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا،ان لوگوں نے آکر مذہبی امور پر بات چیت شروع کی۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت ثابت کرنے میں ان لوگوں نے انتہائی بحث وتکرار سے کام لیا۔ اتنے میں یہ آیتِ مباہلہ نازل ہوئی۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نصاریٰ کو مباہلہ کی دعوت دی،اور خود بھی حضرت فاطمہ،حضرت علی،امام حسن اور امام حسین رضوان اللہ علیہم کو ساتھ لے کر مباہلہ کے لئے تیار ہوکر تشریف لائے۔

شرحبیل نے یہ دیکھ کر اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ تم کو معلوم ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں،نبی سے مباہلہ کرنے میں ہماری ہلاکت ہے،اور یقیناً بربادی ہے،اس لئے نجات کا دوسرا راستہ تلاش کرو۔

ساتھیوں نے کہا کہ تمہارے نزدیک نجات کی کیا صورت ہے؟ اس نے کہا کہ میرے نزدیک بہتر صورت یہ ہے کہ نبی کی رائے کے موافق صلح کی جائے۔ چنانچہ اسی پر ان کا اتفاق ہوگیا۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر جزیہ مقرر کرکے صلح کردی،جس کو انہوں نے بھی منظور کرلیا،جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ [ابن کثیر]

اس آیت میں ''اَبۡنَآءَنَا'' سے صرف اولادِ صلبی مراد نہیں ہے، بلکہ عام مراد ہے، خواہ اولاد ہو، یا اولاد کی اولاد ہو، کیونکہ عرف میں ان سب پر اولاد کا اطلاق ہوتا ہے، لہٰذا ''اَبۡنَآءَنَا'' میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد حضرت علی رضی اللہ عنہ داخل ہیں۔ خصوصاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ''اَبۡنَآءَنَا' میں داخل کرنا اس لئے بھی صحیح ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے تو پرورش بھی سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش رحمت میں پائی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا، اور آپ رضی اللہ عنہ کی تربیت کا پورا پورا خیال رکھا، ایسے بچے پر عرفاً بیٹے کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی، کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں داخل ہیں، لہٰذا روافض کا آپ رضی اللہ عنہ ''اَبۡنَآءَنَا'' سے خارج کر کے، اور ''اَنۡفُسَنَا'' میں داخل کر کے آپ رضی اللہ عنہ کی خلافتِ بلافصل پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ [معارف القرآن]

حافظ مؤرخ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے، اور وہ اپنے والد امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ جب سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم مباہلہ کے لئے تشریف لائے، تو ان کے ساتھ حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان ذوالنورین، علی المرتضیٰ رضوان اللہ علیہم، اور ان سب کی اولاد بھی ہمراہ تھیں۔ یہ روایت امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر درمنثور میں اسی طرح بیان کی ہے، اور یہی روایت تفسیر روح المعانی میں بھی موجود ہے۔

فائدہ:

قرآن کریم نے یہ نہیں بتلایا کہ مباہلہ کی صورت حضرت خاتم انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی اختیار کی جاسکتی ہے۔ اور یہ کہ مباہلہ کا اثر کیا ہمیشہ وہی ظاہر ہونا چاہئے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مباہلہ میں ظاہر ہونے والا تھا۔ بعض سلف کے طریقِ عمل، اور بعض فقہائے حنفیہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مباہلہ کی مشروعیت اب بھی باقی ہے، مگر ان چیزوں میں جن کا ثبوت بالکل قطعی ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ مباہلہ میں بچوں، عورتوں کو بھی شریک کیا جائے۔ نہ مباہلین پر اس قسم کا عذاب آنا ضروری ہے جو سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مباہلہ پر آتا، بلکہ ایک طرح کا اتمامِ حجت کر کے بحث وجدال سے الگ ہونا ہے۔

علماء کرام فرماتے ہیں کہ مباہلہ ہر ایک کاذب کے ساتھ نہیں ہوتا، صرف کاذبِ معاند کے ساتھ ہونا چاہئے۔

علامہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ثُمَّ قَالَ تَعَالٰی آمِرًا رَسُوْلَهٗ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُّبَاهِلَ مَنْ عَانَدَ الْحَقَّ فِيْ أَمْرِ عِيْسٰی علیہ السلام بَعْدَ ظُهُوْرِ الْبَيَانِ. یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے

اللہ تعالیٰ کے بندہ ورسول ہونے ظہور کے بعد اس بارے میں معاندین حق سے مباہلہ کریں۔

قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

ترجمہ: اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے: اے اہلِ کتاب! آؤ ایک کلمے کی طرف، جو تمہارے اور ہمارے درمیان برابر (مسلّم) ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرائیں، اور نہ بنائیں ہم میں سے بعض بعض کو ربّ، اللہ تعالیٰ کے سوا، پس اگر یہ لوگ اعراض کریں (قبول نہ کریں) تو اے مسلمانو! تم ان سے کہہ دو: تم گواہ رہو، بیشک ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں ﴿۶۴﴾

معارف ومنازل

پہلے معلوم ہوا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب نجرانی وفد کو کہا: اسلموا۔ تم لوگ اسلام قبول کرو، تو انہوں نے کہا: أسلمنا۔ ہم لوگ مسلم ہیں، تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی طرح وہ بھی مسلم ہونے کے مدّعی تھے۔ اس مذکورہ آیت کا خطاب عام ہے، جو یہود ونصاریٰ دونوں کو شامل ہے۔ جب ان دونوں کے سامنے توحید کا مسئلہ پیش ہوجاتا، تو وہ برملا کہتے کہ ہم بھی خداوند تعالیٰ کو ایک مانتے ہیں۔ آیت کریمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ جب توحید ہمارے اور تمہارے درمیان مسلّم ہے، اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام اس کی دعوت دیتے چلے آئے ہیں، تو اس متفقہ اصول کا تقاضا یہ ہے کہ سوائے خدائے تعالیٰ کے کسی کی عبادت نہ کی جائے، اور نہ کسی کو ربّ مانا جائے، اور نہ کسی کو خدا کا بیٹا اور پوتا ٹھہرایا جائے۔

اہلِ کتاب اگرچہ زبان سے اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ واحد لاشریک ہے، مگر اس کے باوجود وہ طرح طرح کے شرک میں مبتلا ہیں۔ ایک طرف حضرت عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ، اور دوسری طرف حضرت مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے ہیں، اس لئے ارشاد ہوتا ہے، کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ پھر ان کو ایک مرتبہ حق وتوحید کی دعوت دیجئے، اور ان کے ان مسلّمات سے ان پر حجت قائم کیجئے، جن کے تسلیم کے بغیر ان کو چارہ نہیں، تاکہ اس قدر لاچار اور معقول ہوجانے کے بعد شاید کسی کو اتباعِ حق کا خیال پیدا ہوجائے، اور وہ حق کو قبول کرلے۔ اس لئے فرماتے ہیں:

﴿قُلْ يٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا﴾ اے اہلِ کتاب! آؤ ایک سیدھی اور سچی بات کی طرف، جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر مسلّم ہے، جس پر قرآن اور توراۃ اور انجیل اور تمام انبیاء علیہ السلام کی شریعتیں متفق ہیں، کسی کا اس میں اختلاف نہیں۔ وہ ہے توحید الٰہی، جس کا زبان سے سب اقرار کرتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندگی اور عبادت نہ کریں، اور کسی بھی چیز کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہ ٹھرائیں، اور نہ بنائیں، آپس میں ایک دوسرے کو ربّ اور پروردگار خداوند تعالیٰ کو چھوڑ کر نہ بنائیں۔

یہود ونصاریٰ زبانی طور پر ان تینوں باتوں کا اقرار کرتے تھے، مگر ان کا عمل ان تینوں باتوں کے برخلاف ہوتا تھا۔ وہ حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے تھے، اور ان کی پرستش کرتے تھے۔ اور نصاریٰ تو کھلم کھلا تثلیث کے قائل تھے، کہ باپ اور بیٹا اور روح القدس مل کر ایک خدا ہوتے ہیں، اور اپنے احبار اور رُہبان، یعنی پادریوں اور راہبوں کو ربّ اور پروردگار کے مرتبہ پر مانتے تھے۔ یعنی احبار ورُہبان کا ہر امر اور ہر نہی حق تعالیٰ کے حکم کی طرح بے چون وچرا واجب الاطاعت اور واجب التسلیم ہے، اور ان کو تشریع او تحلیل کا کلّی اختیار ہے، کہ جس چیز کو چاہیں حلال کریں، اور جس چیز کو چاہیں حرام کریں۔

یہی عقیدہ جو عیسائیوں کا تھا، بعینہٖ روافض، اسماعیلی، بوہری، دروزی شیعوں کا بھی ہے۔ انہوں نے اپنے اماموں کو انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی اوپر اور بلند درجہ دیا ہوا ہے، کہ ہر چیز کی تحلیل وتحریم، حرمت وحلّت، جواز وعدمِ جواز پر انہیں مکمل اختیار حاصل ہے۔ اور یہی حقیقت شرک کی ہے، کہ حق تعالیٰ کی صفاتِ مختصہ، یا حقوقِ مختصہ میں کسی کو شریک یا کارساز یا مشکل کشا، حاجت روا اور متصرف، یا مدبر، یا خود مختار سمجھا جائے۔ اسی کے متعلق حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اسلام سے پہلے میرا مذہب عیسائیت تھا، میں جب سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو میرا حال یہ تھا: فِي عُنُقِي صَلِيبٌ مِنْ ذَهَبٍ، میری گردن میں سونے کی صلیب لٹک رہی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھتے ہی فرمایا: أَلْقِ عَنْكَ هٰذَا الْوَثَنَ۔ اس بت کو اپنی گردن سے اتار پھینک۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلیب کو وَثن کہا۔

صنم اور وثن میں فرق یہ ہے کہ جو بت گھڑا ہوا ہوتا ہے، وہ صنم کہلاتا ہے، اور جو گھڑا ہوا نہ ہو اُسے وثن کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے صلیب کو وثن فرمایا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿اِتَّخَذُوْٓا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [التوبۃ: ۳۱] (انہوں نے اللہ کے سوا اپنے علماء اور

درویشوں کو خدا بنالیا ہے)۔

حضرت عدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یَا رَسُولَ اللہ! مَا کُنَّا نَعْبُدُھُم. ہم تو ان کی عبادت نہیں کرتے تھے، ربّ تو جب بناتے جب ان کی عبادت کرتے۔ اس پر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَلَیس أَنَّھُم کَانُوا یُحِلُّونَ لَھُم مَا حَرَّمَ اللہُ؟ قُلتُ بَلٰی۔ کیا یہ واقع نہیں ہے کہ اہلِ کتاب کے مذہبی علماء، احبار ورُہبان اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال قرار دیتے تھے، اور لوگ اسے حلال ہی جانتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دیتے تھے، اور لوگ ان کو حرام کہتے تھے؟ حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ہاں! یا رسول اللہ! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہی تو ربّ بنانا ہے، کیونکہ ربّ تو وہی ہے جس کو حرمت وحلّت کا مکمل اختیار ہو، اور یہ ربّ العزّت کی صفتِ مختصہ ہے، اس میں کسی مخلوق کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ [رواہ البخاري والترمذي وأحمد وغيرهم]

اور یہ بات واضح ہو کہ اشیاء کی حلّت وحرمت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ردیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے دائرۂ اختیار سے بھی باہر ہے، چہ جائے کہ کسی اور کیلئے۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم وفرمان کی روشنی میں چیزوں کی حلّت وحرمت کی خبر دیتے ہیں، نہ کہ اپنی طرف سے۔ اس سلسلے میں اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی کسی چیز کے متعلق سوال کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کا انتظار فرماتے۔ بسا اوقات وحی میں تاخیر ہوتی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل انتظار میں رہتے، اور وحی کی اطلاع کے بغیر کبھی کسی بات کا جواب نہ دیتے۔

اس قسم کے واقعات احادیث میں بکثرت موجود ہیں، اور مسئلۂ اِفک ان میں سرفہرست ہے، جس میں ایک ماہ تک انتظار فرمایا۔ ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ [النجم:۴] (اور وہ اپنی خواہش نہیں بولتے۔ یہ تو وحی ہی ہے، جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے)۔ اسی حکمت وبنیاد پر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی اطاعت غیر مشروط طور پر فرض ہے، کہ وہ بالیقین حضرت حق سبحانہ کے نمائندے اور پیغام رساں ہیں۔

بخلاف ماں باپ، پیر واستاذ اور اولی الامر حکام واُمراء کے، کہ ان کی اطاعت مشروط ہے، کیونکہ ان کو وحی الٰہی کی تائید حاصل نہیں ہے، وہ غلطی سے پاک ومنزہ نہیں ہوتے، اسی لئے "لَا طَاعَةَ لِلْمَخْلُوقِ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ" کا برحق فرمان جاری ہوا، اور قرآن کریم نے والدین کے بارے میں فرمایا: ﴿وَإِن جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾ [لقمان:۱۵] (اور اگر ماں باپ تم پر زور ڈالیں کہ تم میرے ساتھ کسی کو شریک قرار دو، جس کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں م تو ان کی بات مت مانو)۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ اور حکیم بن عمرو غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ خالق جل شانہ کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ اس مقام سے اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اگر کسی کی تحقیق میں کوئی مرفوع حدیث صحیح ثابت ہوجائے، اوراس کے مقابل کوئی دوسری حدیث بھی نہ ہو، اور کوئی حدیث اس کی ناسخ بھی نہ ہو، اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ حدیث مذکور کے خلاف ہو، اور باقی ائمہ رحمہم اللہ میں سے کسی امام کا مسلک حدیث مذکور کے موافق ہو، تو اس صورت میں حدیث کا اتباع واجب ہے۔ ایسی حالت میں اگر امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے فتویٰ پر جما رہے گا تو یہ غیر اللہ کی ربوبیت کی تسلیم ہوگی۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے مدخل میں صحیح اسناد کے ساتھ عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے خود ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث مل جائے تو ہمارے سر آنکھوں پر، اور اگر کسی صحابی کا قول مل جائے تو ان کے اقوال سے ہم کسی مسلک کو ترجیح دیں گے، اور اگر کسی تابعی کا قول ہو تو ہم اس سے مقابلہ کریں گے۔

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روضۃ العلماء سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے قول کے مقابل میں میرے قول کو ترک کردو۔ یہ بھی منقول ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر حدیث ثابت ہوجائے تو وہی میرا مذہب ہے۔ ہم نے عمل بالحدیث کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ چاروں اماموں میں سے کسی امام کا قول اس حدیث کے موافق ہونا ضروری ہے۔ اس شرط کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں حدیث کے خلاف عمل کرنے سے اجماع کی خلاف ورزی لازم آئے گی، کیونکہ تیسری یا چوتھی قرن کے بعد فروعی مسائل میں اہل سنت کے چار فرقے ہوچکے، کوئی پانچواں مذہب باقی نہیں رہا۔

پس گویا اس امر پر اجماع ہوگیا کہ جو قول ان چاروں کے خلاف ہو وہ باطل ہے۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری امت کا اتفاق گمراہی پر نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا: ﴿وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾۔ [النساء:۱۱۵] (اور وہ مومنوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی پیروی کرے، اس کو ہم اسی راہ کے حوالے کردیں گے جو اس نے خود اپنائی ہے، اور اسے دوزخ میں جھونکیں گے، اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے)۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ یہ بات تو ممکن ہے کہ حدیثِ مذکور کا علم چاروں اماموں میں سے کسی کو نہ ہوا ہو، اور نہ ان کے شاگردوں میں سے کسی بڑے عالم کو اطلاع ہوئی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر سب نے

بالاتفاق حدیثِ مذکور کے خلاف فتویٰ دیا ہے، اور حدیث پر عمل ترک کر دیا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہوگی کہ اس حدیث کو کسی دوسری حدیث سے انہوں نے منسوخ یا مؤول قرار دیا ہے۔[مظہری]

﴿أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا﴾ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ سارے انبیاء کرام علیہم السلام اور تمام آسمانی کتابوں کی متفقہ تعلیم یہی ہے کہ: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ اور ﴿مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ پر مکمل عمل ہو، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا جائے۔

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لفظِ ''شَيْـًٔا'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں: لَا وَثَنًا وَلَا صَلِيْبًا وَلَا صَنَمًا وَلَا طَاغُوتًا وَلَا نَارًا وَلَا شَيْئًا۔ یعنی اے اہلِ کتاب! آؤ ہم تم سب اس بات پر متفق ہو جائیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہ بت کو شریک بنائیں گے، نہ صلیب کو، نہ طاغوت کو، نہ آگ کو اور نہ کسی اور چیز کو۔ غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کسی بھی مخلوق کیلئے جائز نہیں، اور نہ ہی کوئی پیغمبر عبادت کا حقدار ہیں۔

﴿وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللّٰهِ﴾ ہم میں سے بعض بعض کو اللہ تعالیٰ کے سوا ربّ نہ بنالیں۔ انبیاء پرستی، بادشاہ پرستی، آتش پرستی، کواکب پرستی، صلیب اور بت پرستی، یہ سب حرام اور شرک ہے، صرف ایک خدا پرستی سعادت اور ایمان کی علامت ہے۔ اور اسی مقصد کی خاطر ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر مبعوث ہوئے، اور آسمانی کتابیں نازل ہوئیں۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں کس قدر پر زور ہدایت کا طریقہ اختیار فرمایا؟ اور مناظرہ میں کتنی خوبصورت ترتیب ملحوظ رکھی گئی؟ جو قابلِ غور ہے۔ اوّل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وہ احوال و اطوار بیان کئے جو الوہیت کے منافی ہیں، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیقی حالت کو حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیقی عجیب حالت سے تشبیہ دے کر ان کے دل کے گرہ (عقدہ) اور شبہ کو دور کرنے کا طریقہ اختیار کیا، لیکن اس کے بعد بھی جب ان کی طرف سے ضد اور ہٹ دھرمی دیکھی گئی، تو معجزانہ طریقہ سے انہیں مباہلہ کی دعوت دی، اور جب دیکھا کہ مباہلہ سے وہ کترا گئے، اور کسی قدر اطاعت کا اظہار کرنے لگے، تو پھر ان کو ہدایت کرنے کی طرف رُخ کیا، اور اس طریقہ سے ہدایت کی پیشکش کی جو بہت ہی آسان اور لاجواب بنا دینے والا ہے۔

یعنی ان کو ایسی چیز کی دعوت دی جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام، انجیل اور تمام آسمانی کتابیں متفق ہیں، اور جب یہ طریقہ بھی سودمند ثابت نہیں ہوا، اور وہ صحیح حقیقی توحید سے بھی اعراض کر کے منکر ہو گئے،

اور آیات وتمام تنبیہات سے منہ موڑ کر کفر وشرک اور تثلیث کے عقیدہ پر جمے رہے، تو ارشاد ہوا:

﴿فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾ اے اہل کتاب! تم گواہ رہو کہ ہم سارے انبیاء کرام علیہم السلام اور تمام آسمانی کتابوں پر، اور توحیدِ الٰہی پر مکمل ایمان رکھتے ہیں، اور تم نہیں مانتے، اور نہیں تسلیم کرتے، اور نہیں اقرار کرتے، تم پر اتمامِ حجت ہو چکا۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے نجرانی وفد کی آمد سے پہلے نصرانیوں کے بڑے بادشاہ ہرقل روم کو جو نامہ مبارک لکھ کر حضرت دحیہ بن خلیفہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ روانہ فرمایا تھا، اس دعوت نامہ کے شروع میں یہی آیت کریمہ تحریر فرمائی تھی، جسے پڑھ کر اور چند سوالات اور ان کے صحیح واقعی جوابات سن کر ہرقل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق بھی کی تھی، اور اپنی قوم کو اسلام قبول کرنے کا مشورہ بھی دیا تھا، مگر جب قوم نے انکار کیا، تو ہرقل بھی حکومت وبادشاہت کے لالچ کی وجہ سے اسلام سے منحرف ہوا، اور ایمان کی دولت سے قوم سمیت ہمیشہ کے لئے محروم ہوا۔ پوری تفصیل صحیح بخاری میں دیکھیں۔

فائدہ:

انبیاء کرام علیہم السلام شہداء کرام، اولیاء کرام رحمہم اللہ کے نام پر نذر ونیاز ماننا، اور ان کے مزارات پر سجدہ اور طواف کرنا، اور ان سے اپنی حاجتوں کو طلب کرنا، اور ان کے مزارات پر چراغ روشن کرنا، اور مسجدیں قائم کرنا، چادر چڑھانا، جانور ذبح کرنا، میلہ لگانا، عرس کا اہتمام کرنا (عید کی طرح) یہ سب حرام اور شرک میں شمار ہوتے ہیں۔ ایسے مشرکوں کی بخشش نہیں ہوگی، اور وہ مستحقِ لعنت ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ مرض وفات میں سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دھاری دار کمبل سے چہرہ مبارک ڈھانک لیا، اور دم کشی کے بعد چادر کو چہرۂ انور سے ہٹالیا، اور فرمایا: "یہود ونصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے فعلِ بد سے اپنی امت کو بیدار کر کے ڈرایا۔ [متفق علیہ]

اسی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی دعا کر کے فرمایا: اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا یُعْبَدُ. اے اللہ تعالیٰ! میری قبر کو صنم یا بت خانہ نہ بنانا۔

امام احمدؒ اور ابوداؤد طیالسیؒ نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے: امام حاکمؒ

نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے، اور اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر، اور ان لوگوں پر جو قبروں کو سجدہ گاہ بناتے ہیں، اور قبروں پر چراغاں کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔

امام مسلمؒ نے جندب رضی اللہ عنہ بن عبد الملک کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے خود سنا وفات سے پانچ رات پہلے سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے: ہوشیار رہو، قبروں کو سجدہ گاہ نہ بناؤ، میں تم کو تاکید کے ساتھ منع کرتا ہوں۔ [مسلم]

بدنصیبی اور جہالت کا یہ عالم ہے کہ خیر اُمت کے لوگ قبر پرستی کا رواج، شر اُمت یہود و نصاریٰ سے سیکھ کر چند قدم ان سے بھی آگے نکلے۔ وہاں معبود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ محترمہ مقرر ہوئے، جبکہ ہمارے مشرکوں نے ہر ولی، ہر پیر، ہر سید کی قبر پر جھکنے اور سجدہ کرنے کو اپنا شعار و مذہب بنالیا، اور خالق عزّ شانہ کی تمام تر مخصوص صفات میں بندوں کو شریک کر کے شرک کا ایک ایسا ناگفتہ بہ رسم ایجاد کیا، جس سے قرآن وسنت کی مقدس تعلیمات کی نفی ہوگئی۔

ایک محتاط اعداد و شمار کے مطابق برصغیر میں سالانہ پانچ ہزار آٹھ سو کے قریب قبروں پر سالانہ عرس و میلہ منعقد کیا جاتا ہے، جن پر اربوں روپیہ پیسہ صرف ہوتا ہے، اور ان عرسوں میں وہ کام انجام پاتے ہیں جنہیں دیکھ کر اسلامی غیرت وحیاء کی آنکھیں خیرہ ہو کر شرم سے جھک جاتی ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ ربّ العزّت اس اُمت پر رحم فرمائے، اور اسے شعور نصیب کرے۔ آمین

يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لِمَ تُحَآجُّونَ فِيٓ إِبۡرَٰهِيمَ وَمَآ أُنزِلَتِ ٱلتَّوۡرَىٰةُ وَٱلۡإِنجِيلُ إِلَّا مِنۢ بَعۡدِهِۦٓۚ أَفَلَا تَعۡقِلُونَ ٦٥ هَٰٓأَنتُمۡ هَٰٓؤُلَآءِ حَٰجَجۡتُمۡ فِيمَا لَكُم بِهِۦ عِلۡمٞ فَلِمَ تُحَآجُّونَ فِيمَا لَيۡسَ لَكُم بِهِۦ عِلۡمٞۚ وَٱللَّهُ يَعۡلَمُ وَأَنتُمۡ لَا تَعۡلَمُونَ ٦٦ مَا كَانَ إِبۡرَٰهِيمُ يَهُودِيّٗا وَلَا نَصۡرَانِيّٗا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفٗا مُّسۡلِمٗا وَمَا كَانَ مِنَ ٱلۡمُشۡرِكِينَ ٦٧ إِنَّ أَوۡلَى ٱلنَّاسِ بِإِبۡرَٰهِيمَ لَلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا ٱلنَّبِيُّ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْۗ وَٱللَّهُ وَلِيُّ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ ٦٨

ترجمہ: اے اہلِ کتاب! تم کیوں جھگڑا کرتے ہو ابراہیم (علیہ السلام) کے بارے میں؟ حالانکہ نہیں نازل کی گئی تورات اور انجیل مگر ان کے بعد، کیا تم عقل نہیں رکھتے؟ ٦٥ سنو اے لوگو! جھگڑا کیا تم نے اس چیز میں جس کا تمہیں علم تھا، اب کیوں جھگڑا کرتے ہو اس چیز میں جس کے بارے میں تمہیں علم نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور

تم نہیں جانتے۔ ۶۶ ابراہیم (علیہ السلام) نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی، مگر وہ حنیف (سب طرف سے ہٹ کر ایک طرف لگنے والے) اور مسلمان (اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار) تھے، اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔ ۶۷ بیشک لوگوں میں سے ابراہیم (علیہ السلام) کے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کا اتباع کیا، اور یہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں (امتِ محمدیہ کے لوگ) اور اللہ تعالیٰ ایمان لانے والوں کا ولی اور کارساز ہے ۶۸

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں یہ بیان ہوا کہ تین باتیں ایسی ہیں جو اصولی طور پر ہر پیغمبر کی تعلیم میں موجود ہیں، اور کوئی آسمانی کتاب ایسی نہیں جس میں توحید کا اثبات اور شرک کی مذمت نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو ربّ بنانے کی حرمت وممانعت نہ ہو، جبکہ اہلِ کتاب ان تینوں اصولوں کے منکر ہیں۔ اب اسی مناسبت سے اہلِ کتاب کی ایک دوسری حماقت وجہالت پر انہیں تنبیہ کی جارہی ہے کہ یہ دعویٰ تمہاری بے عقلی کا نتیجہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب نجران کے عیسائی سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بحث ومناظرہ کرنے کے لئے مدینہ منورہ آئے، تو مدینے کے یہودی بھی جمع ہوگئے، عیسائیوں کا بڑا پادری بھی وفد میں شامل تھا، ادھر یہودیوں کے علماء بھی اکٹھے ہوگئے، اور یہ دونوں گروہ آپس میں جھگڑنے لگے، یہودی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہمارے طریقے پر تھے، مگر نصاریٰ یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے، ان کا دعویٰ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام عیسائیوں کے طریقے پر تھے، مگر یہود یہ ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔

جب یہ معاملہ حضرت اقدس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما کر یہود ونصاریٰ دونوں گروہوں کی تردید فرمائی، کہ دونوں فریق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقے سے مکمل ہٹے ہوئے ہیں۔ تمام اصولی عقائد واعمال اور بیشتر فروعی احکام میں ملت ابراہیمی سے اتنے دور اور منحرف ہیں جتنے مشرکینِ مکہ کے بت پرست مشرک۔ پس یہ دونوں گروہ کس منہ سے دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ابراہیمی ہیں؟ یا ابراہیم علیہ السلام ہمارے طریقے پر تھے؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام عظیم اولوالعزم پیغمبر اور بت شکن تھے، جبکہ یہ بت پرست مشرک ہیں۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے مجسمے بنا کر کلیساؤں اور عبادت خانوں میں رکھ کر ان کی پوجا شروع کردی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہنا شروع کیا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ کعبہ شریف کو چھوڑ کر مشرق و مغرب کو قبلہ بنایا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کعبہ کے پاس کبھی قدم نہیں رکھا، نہ حج کیا، اور نہ طواف، نہ صفا کے پاس آئے، نہ مروہ کے پاس۔ منیٰ، مزدلفہ، عرفات، جمرات، عید قربانی، احرام، زمزم وغیرہ تک کسی بھی ابراہیمی سنت پر عمل نہیں کیا، اور نہ ہی ان مقدس مقامات کی زیارت کی۔ پس یہی واضح ثبوت اور مسلم حقیقت ہے کہ انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں۔

ہاں! اگر ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ کوئی مذہبی دینی رشتہ ہے تو وہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی امت کو علیٰ وجہ الاتم حاصل ہے، جو ابراہیمی ملّت کے حقیقی اور برحق وارث ہیں۔

اسی نکتہ پر آج تک، اور آج سے قیامت تک یہ امت ملّت ابراہیمی کے ترکہ کی وارث ونگہبان رہے گی، اور ہر دو رکعت نماز کے قعدہ میں اپنے نبی کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام پر صلوٰۃ وسلام پیش کرے گی۔ فرمایا:

﴿یَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لِمَ تُحَآجُّونَ فِيٓ إِبۡرَٰهِيمَ﴾ اے اہلِ کتاب! تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو؟ اور ان کو یہودی اور نصرانی کہتے ہو؟ حالانکہ تورات اور انجیل حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہزاروں سال بعد نازل ہوئیں، اور یہودیت اور نصرانیت تورات اور انجیل کے نازل ہونے کے بعد پیدا ہوئیں۔

یہ یہودیت کیا ہے؟ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بگڑے ہوئے دین کا نام ہے۔ اسی طرح عیسائیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بگڑے ہوئے دین کا نام ہے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت کسی بگڑے ہوئے دین کے ساتھ سراسر ظلم اور بے انصافی نہیں تو اور کیا ہے؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بارہ سو سال مقدم ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بائیس سو سال پہلے ہیں۔ پس ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ملّت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نزولِ تورات اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزولِ انجیل سے ہزاروں سال مقدم ہے۔ تو ابراہیم علیہ السلام کی طرف یہودیت اور نصرانیت کی نسبت کیسے صحیح اور ممکن ہوسکتی ہے؟

پس کیا تم کو اتنی عقل نہیں کہ ایسی باطل اور بے بنیاد باتوں کا سہارا لے کر جھوٹ بولتے ہو، کہ جو یہودیت و نصرانیت ہزاروں سال بعد میں ظاہر ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے وجود سے پہلے کیسے ان کے متبع تھے؟

﴿هَٰٓأَنتُمۡ هَٰٓؤُلَآءِ حَٰجَجۡتُمۡ﴾ [الآیہ]: خبردار رہو! تم ہی وہ لوگ ہو جو اس چیز میں جھگڑ چکے ہو جس کا تمہیں کچھ تھوڑا بہت علم تھا، اور اس کے متعلق تمہیں کچھ شد بد تھی، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات اور نبی آخر الزمان

صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت وغیرہ کی تمہیں کچھ خبر تھی، حالانکہ عقل کا مقتضاء یہ ہے کہ جب تک آدمی کو پورا علم نہ ہو اس بارے میں بحث ومناظرہ نہ کرے۔

﴿فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ﴾ [الآیۃ] پس اے احمق و بے عقلو! اس چیز میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کوئی صحیح صحیفہ تمہارے پاس نہیں ہے، ان کی کسی تعلیم پر تمہارا عمل نہیں ہے، اور ان کے دین ومسلک کا صحیح طور پر تمہیں علم وخبر نہیں ہے، تو پھر کس بنیاد پر انہیں یہودی اور نصرانی کہتے ہو؟ اور آپس میں جھگڑتے ہو؟ بلا سند و بلا ثبوت کے؟

﴿وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ اس بارے میں اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے، اور جس چیز کو آدمی نہ جانتا ہو اس کو چاہئے کہ وہ اس کے علم کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے، نہ یہ کہ اس میں خواہ مخواہ بحث ومباحثہ کرے۔ اب سنو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ جو اللہ تعالیٰ کے علمِ محیط میں صحیح اور برحق ہے، وہ یہ ہے:

﴿مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا﴾ [الآیۃ] ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے، اور نہ نصرانی تھے، مگر وہ حنیف اور مسلمان تھے۔ یعنی سب طرف سے بیزار ہو کر صرف ایک اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور تابعدار اور حکم ماننے والے مسلمان تھے، اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے، بلکہ اوّل درجہ کے حنیف، موحّد اور مسلم تھے۔

پس اے اہلِ کتاب! خود کو ابراہیمیؑ کہنے والو! اور ابراہیم علیہ السلام کو یہودی ونصرانی شمار کرنے والو! ذرّا غور سے دیکھو، کہ تم نہ موحّد ہو، اور نہ حنیف ومسلم، اور نہ موسوی اور نہ عیسوی، شرک میں مبتلا ہو، خواہشاتِ نفسانی میں پڑے ہوئے قیدی ہو، احکامِ الٰہی سے منحرف اور تثلیث کے قائل ہو۔ پیغمبروں کے قاتل بھی ہو، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام وحضرت عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے ہو، تو پھر تم کیسے دم بھرتے، اور کہتے رہتے ہو کہ ہم ملّتِ ابراہیمی پر ہیں؟ اور ابراہیم علیہ السلام ہم میں سے ہیں؟ پس غور سے سنو!:

﴿إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا﴾ تحقیق تمام لوگوں میں سے ملّت اور مذہب کے اعتبار سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ سب سے قریب زیادہ نزدیک اور خصوصیت رکھنے والے البتہ! اوّل تو وہ لوگ تھے جنہوں نے ان کے وقت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع اور پیروی کی، وہ آپ علیہ السلام کی امت کے لوگ تھے، اور آپ علیہ السلام کے ماننے والے، اور آپ علیہ السلام کے دین پر تھے۔ اور پھر اس اخیر زمانہ میں

یہی نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلمان حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ نزدیک ہیں، کہ ان کی شریعت کے اکثر احکام ملّتِ ابراہیمی کے موافق ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر قائم ہیں۔ خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں، قربانی کرتے ہیں، حج وطواف، عمرہ، سعی بین الصفا والمروۃ بجالاتے ہیں، ختنہ کرتے ہیں، احرام باندھتے ہیں، منیٰ، مزدلفہ، عرفات اور دیگر امور واحکام بجالاتے ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ مؤمنوں کا ولی اور کارساز ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيَآؤُهُمُ الطَّاغُوْتُ﴾ [البقرۃ: ۲۵۷] (اللہ کارساز ہے ان لوگوں کا جنھوں نے ایمان لایا ہے، ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لاتا ہے۔ اور جنھوں نے کفر کیا ہے ان کے مددگار شیطان ہیں)۔ اسی طرح فرمایا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكَافِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ﴾۔ [محمد: ۱۱] (یہ اس لئے کہ اللہ کارساز ہے ان لوگوں کا جنھوں نے ایمان لایا ہے، اور یہ کہ کافروں کا کوئی کارساز نہیں ہے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے، اور نہ نصرانی، اور نہ ہی ان کا عمل تورات وانجیل پر رہا، جو کہ بعد کی کتابیں ہیں، جنہیں ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا تک نہیں۔ دوسرے مقام پر بھی ارشاد ہے: ﴿اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمَاعِيْلَ وَاِسْحَاقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ﴾ [البقرۃ: ۱۴۰] (کیا تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل اسحاق، یعقوب اور ان کی اولادیں یہودی یا نصرانی تھیں؟ کہو: کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟)۔ پس اگر یہ کہو کہ ابراہیم علیہ السلام کا دین یہودیت ونصرانیت سے نزدیک اور قریب ہے، تو یہ بھی غلط ہے، اگر ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ قرب ونزدیکی ہو تو اس آخری امت کو حاصل ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کی حنیفیت اور لقب، اسلام اور ختنہ وقربانی سے لے کر تمام مذہبی عقائد واحکام اور ابراہیم علیہ السلام کے حرم مکہ ومناسکِ حج سارے اس آخری دین کے حصے ہیں، اور قیامت تک رہیں گے۔

البتہ! اگر تم یہ کہتے ہو کہ ہم نسب کے لحاظ سے ابراہیمی ہیں، تو یاد رکھو! صرف نسبی نسبت کسی بھی مرحلے میں فائدہ مند نہیں ہے۔ تم کبھی اس سے بھی بلند وبالا نسبت پر غرہ ہو کر کہتے رہے ہو: ﴿نَحْنُ اَبْنَآءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ [المائدۃ: ۱۸] (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں)۔ پس اللہ تعالیٰ نے تمہاری اس مشرکانہ نسبت پر گرفت فرما کر پرزور تردید فرمائی: ﴿قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ﴾ [المائدۃ: ۱۸] (آپ کہہ

دیں: پھر اللہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے تمہیں سزا کیوں دیتا ہے؟ بلکہ تم انہیں انسانوں کی طرح انسان ہو جو اس نے پیدا کیے ہیں)۔

پسر نوح بابدان بنشت ☆ خاندان نبوتش گم شد

(سعدیؒ)

دینی و مذہبی نسبت، اور اس کی اقسام:

ایک چیز کا دوسری چیز سے کوئی خصوصی تعلق قائم ہو جانا نسبت کہلاتا ہے۔ اور جب کسی ادنیٰ آدمی کی نسبت (دینی، دنیوی، نسبی، عملی اور اخلاقی) کسی اعلیٰ اور عظیم ہستی سے ہوتی ہے، تو اس ادنیٰ آدمی کا مقام و مرتبہ اس نسبت کی وجہ سے بلند و بالا ہو جاتا ہے، بشرطیکہ منسوب کے اندر منسوب اِلیہ کے اعمال، کردار، کمالات، اخلاق و صفات کی جھلک و نمونہ موجود ہو۔

پس اس نسبت کی دو قسمیں ہیں:

(۱) نسبی۔ (۲) حسبی۔

اور حسبی کی پھر دو قسمیں ہیں: (۱) نسبتِ صحیحہ مفیدہ۔ (۲) نسبتِ کاذبہ غیر مفیدہ۔

نسبتِ نسبی:

وہ ہے کہ ایک شخص خود کو نسب کے طور پر کسی بڑی ہستی سے منسلک کرے، جیسے ہاشمی، صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی، قریشی۔ اس نسبت کا مقصد صرف پہچان اور معرفت ہی ہے۔ اس پر کسی نجات کا ترتب نہیں ہوتا۔

نسبتِ حسبی صحیحہ:

وہ ہے کہ منسوب و منسوب اِلیہ کے درمیان مذہبی، دینی، علمی اور اخلاقی نسبت موجود ہو، اور منسوب اِلیہ کے اعمال، گفتار، کردار، اور دیگر صفات کی جھلک منسوب کے اندر موجود ہو، جیسے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خلقًا، خُلقًا، صورۃً، سیرۃً، عملًا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نمونہ تھے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انہی چیزوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے ہوتے تھے۔ مجال نہیں کہ ان کے اعمال و کردار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخالف اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متصادم ہوں۔ یہ ہے نسبتِ صحیحہ صادقہ مفیدہ، جو کہ اعلیٰ درجہ کی چیز ہے، اور یہی حقیقی نسبت بھی ہے۔

نسبتِ کاذبہ غیر مفیدہ، وہ یہ ہے کہ بلند بانگ دعوؤں کے باوجود منسوب شخص یا جماعت میں وہ اقدار اور

مزایا اور اعمال نہ ہوں جو کہ منسوب الیہ کے خصوصی شعار اور مخصوص اعمال و اوصاف شمار ہوتے ہیں، جیسے یہود و نصاریٰ خود کو ابراہیمی کہنے والے، جو ابراہیم کے اعمال و کردار سے سراسر خالی اور محروم تھے۔ نہ توحید، نہ حنیفیت، نہ اسلام، مگر نسبت پر فخر کرتے رہتے تھے۔ یہ ہے نسبت کا ذبہ غیر مفیدہ۔ اسی طرح مشرکینِ مکہ کا بھی طور وطریق جاری رہا کہ وہ خود کو ابراہیمی کہتے تھے۔

اسی طرح ہمارے زمانے کے سلفی حضرات، جو کہ نسبت کے باوجود سَلَف کے اعمال و کردار سے کوسوں دور ہیں، بلکہ اعمال و کردار ان کے سَلَف کے خلاف ہیں، اور بہت سارے بدعتی مشرک خود کو قادری، چشتی، مجدّدی، نقشبندی وغیرہ کہنے والے لوگ، ان برگزیدہ اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم سے انہیں کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں، مگر نسبت پر جمے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اس نسبت کے معاملہ میں مکمل اہلِ کتاب کی تقلید کی ہے۔

اسی طرح کچھ ناعاقبت اندیش لوگ اپنی نسبت مسلکِ دیوبند کے ساتھ جوڑتے ہیں، اور بڑے فخر کے ساتھ خود کو دیوبندی کہتے ہیں، مگر علماءِ دیوبند کے خیالات، اور ان کے خیالات کے درمیان بعد المشرقین ہے۔ بہر حال! اس قسم کی نسبتیں غیر مفید، اور افتراء و غلط بیانی پر مبنی ہیں۔ ایک شاعر نے اسی کی ترجمانی کی ہے:

نہ سیرت، نہ صورت، نہ خال، و نہ خط ☆ نہادند محبوب و نامش غلط

اسی طرح بعض لوگ خود کو ''ربّانی'' (اللہ والے) کہتے ہیں۔ یہ کتنی اچھی نسبت ہے، مگر ان کے دیگر اعمال نہایت ناکارہ ہوتے ہیں۔ اور ان کی گفتار عمدہ اور کردار نہایت مایوس کن، خلافِ نسبت اور خلافِ سنت ہوتے ہیں۔ چاہئے کہ سارے مسلمان ان پاکیزہ نسبتوں کا احترام کریں، اور جھوٹے لوگوں سے دور رہیں۔

نسبت اگر اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، یا انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کی طرف ہو، یا قرآن حکیم وائمۂ اسلام، یا دیگر کسی ہستی کی طرف ہو، بہت ہی بہتر اور پسندیدہ ہے، اس سے کسی کو منع کرنا مقصد نہیں ہے۔ البتہ یہ نصیحت اور خیر خواہی ضرور مدِ نظر رہے کہ مقدس نسبتوں کی توہین سے بچنا چاہئے، اور ان کا احترام کرنا چاہئے، اور ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝٢ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝٣﴾ [الصف] (تم کیوں ایسی بات کہتے ہو جو کرتے نہیں؟ اللہ کے نزدیک یہ بات بڑی قابلِ نفرت ہے کہ تم ایسی بات کہو جو کرو نہیں) کی وعید سے مکمل پرہیز کرنا چاہئے، اور حطامِ دنیا کے حرص و لالچ کو دل سے نکالنا چاہئے، ورنہ نقصان کا اندیشہ ہے۔

یہی پیرِ حرم ہے، جو چرا کر بیچ کھاتا ہے ☆ گلیم بوذرؓ، دلق اویسؒ، چادر زہرہ (اقبالؒ)

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ
وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾
يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾

ترجمہ: اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ پسند کرتا ہے کہ وہ تم کو گمراہ کریں، اور وہ نہیں گمراہ کرتے مگر اپنی جانوں کو، اور وہ نہیں سمجھتے ﴿۶۹﴾ اے اہلِ کتاب! تم اللہ تعالیٰ کی آیاتوں کے ساتھ کیوں کفر کرتے ہو؟ اور تم گواہ ہو ﴿۷۰﴾ اے اہلِ کتاب! کیوں ملاتے ہو تم حق کو باطل کے ساتھ؟ اور تم حق کو چھپاتے ہو، اور تم جانتے ہو۔ ﴿۷۱﴾

معارف ومنازل

یہود قوم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور انبیاء کرام علیہم السلام کی دشمنی، اور آسمانی کتابوں کی تکذیب، اور احکامِ الٰہی کی تحریف، تغیر وتبدیلی اور کتمانِ حق، اور اسلام دشمنی میں تمام اقوامِ عالم سے پیش پیش رہ کر ماضی اور زمانہ رسالت، اور اس کے بعد آج تک، اور آج کے بعد قیامت تک جن چالبازیوں، فریب ومکر اور شیطانی حربوں سے مسلح رہی ہے، جس کی نہ مثال ہے، اور نہ ہی کوئی حد واندازہ۔

یہی وہ قوم ہے کہ اس نے دینِ مسیح کو بگاڑ کر پوری عیسائیت پر قبضہ جمایا۔ آج عیسائیت برائے نام دنیا میں موجود ہے۔ ان کے دینی اقدار ومعاشرہ اور مذہبی روایات پر یہودی قوم کا تسلط اور گرفت قائم ہے۔ آج پورے عالم پر یہودی شرارتوں اور یہودی خباثتوں کا غلبہ ہے، وہ یہ چاہتے ہیں کہ سارے جہاں پر ان کی حکومت ہو، تاکہ وہ باسانی اپنے پیر ومرشد دجّالِ اکبر کے لئے راستہ ہموار کریں۔ آج وہ ایک حد تک اس مقصد میں پیش رفت کرکے کامیاب بھی ہو چکے ہیں۔

زمانہ رسالت میں دلائل کے میدان میں شکست کھانے کے بعد یہود کے مذہبی رؤسا واحبارِ سوء نے لوگوں کو راہِ حق سے برگشتہ کرنے کے لئے ایک گہری مکارانہ سازش سے کام لینا چاہا۔ انہوں نے سوچا کہ اور کوئی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہوتی، اب اس طرح کریں کہ اپنے چند خاص چیلے مسلمانوں کے پاس بھیج دیں، جو وہاں جا کر اپنے مسلمان ہونے کا برملا اعلان کریں، کچھ وقفہ کے بعد وہ مرتد ہو جائیں، اور اسلام سے کنارہ کشی اختیار کریں، اور اس کا لوگوں میں خوب چرچا کریں کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ہمیں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا

ہے، اور ان کے ایسے عیوب اور کوتاہیاں ہم پر آشکارا ہوئی ہیں کہ ہم اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کو ترک کرنے پر مجبور ہو گئے، جس کو کچھ عرصہ پہلے ہم نے بڑے شوق اور بڑی محبت سے قبول کیا تھا، تو اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو آج دھڑا دھڑ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں مذبذب ہو کر رہ جائیں گے، اور وہ ایک بار پھر یہ سوچنے لگیں گے کہ جس دین کو اس کے ماننے والے ایک ایک کر کے چھوڑ رہے ہیں، وہ کوئی سچا اور برحق دین نہیں ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی فائدہ ہوگا کہ ہمارے جو چند افراد بلا سوچے سمجھے حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے ہیں، وہ بھی اپنے لئے واپسی کا راستہ سوچ کر دوبارہ اپنے مذہب کا رخ کر کے اسلام سے منحرف ہو جائیں گے۔

یہود کی یہ سازش بڑی خطرناک تھی، اور نفسیاتی طور پر اس کا بہت برا اثر اور نتیجہ نکلتا، اور ظاہر ہوتا۔ لیکن دانا و بینا، علیم وخبیر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس مکر وفریب اور چالبازی کو پہلے ہی نمایاں کر کے مسلمانوں کو ہشیار کر دیا، اور ان کی یہ گہری چال کو ناکام کر دیا۔ مزید وضاحت آئندہ آیات کے تحت آنے والی ہے، جس کی تمہید مختصراً بیان ہوئی۔ وباللہ التوفیق۔

ابھی زیر نظر آیات کا مطلب اور مختصر تشریح یہ ہے: ﴿وَدَّتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ﴾ [الآیۃ] حضرت معاذ بن جبل، حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم کو یہودیوں نے برگشتہ کرنے، اور اپنے مذہب یہودیت کی دعوت دی، اس پر ان آیات کا نزول ہوا۔ [مظہری] یعنی یہود کی ایک جماعت چاہتی ہے کہ تم کو تمہارے دین سے اغواء کر لے، اور لوٹا کر کفر میں لے جائے۔ ﴿فَتَكُونُونَ سَوَاءً﴾ [النساء: ۸۹] (پھر تم سب برابر ہو جاؤ)۔ یہ لوگ یہی خواہش کرتے ہیں کہ تم گمراہ ہو کر ان کے ساتھ برابر ہو جاؤ۔

چاہئے تو یہ تھا کہ وہ تورات کی پیشینگوئیوں پر عمل کر کے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کرتے، اور قرآن مجید کو برحق مانتے، اور اسلام قبول کر کے تمہارے بھائی بن کر تمہارے ساتھ برابر ہو جاتے، لیکن ایمان لانا تو کجا، ان کی ضد اور عناد کی یہ حالت ہے کہ جو لوگ راہِ راست پر چل رہے ہیں، ان کے بارے میں ان کی خواش یہ ہے کہ جیسے ہم گمراہ ہوئے وہ بھی گمراہ ہو کر ہمارے ساتھ برابر ہو جائیں، اور اگر ہمارا مذہب قبول نہیں کرتے تو کم از کم یہ ہو کہ وہ مسلمان نہ رہیں۔

آج یورپ بھی اسی نظریہ پر گامزن ہے کہ مسلمان اگر عیسائیت قبول نہیں کرتے تو نہ سہی، مگر اپنے مذہب اور قرآن سے کٹ کر مسلمان نہ رہیں، تو یہ بھی ہماری ایک حد تک کامیابی ہے۔ اسی وجہ سے وہ آئے دن قرآن مجید کی

توہین اور بے احترامی کررہے ہیں۔ مگر اِن شاء اللہ وہ اپنے ان برے عزائم میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ باذن اللہ تعالیٰ۔

﴿وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ﴾ أی لا يهلكون الا أنفسهم۔ وہ سوائے اپنے نفسوں کے کسی کو گمراہ نہیں کرتے۔ یعنی اس اغواء کا وبال انہی پر لوٹ کر پڑے گا، اوران کا عذاب دگنا ہوجائے گا۔ ایک توخودان کی گمراہی کا، دوم دوسروں کی گمراہ کرنے کی کوشش کا۔ اور یہ لوگ بے شعوروکم عقل اپنی جانوں کے دشمن ہیں۔

﴿يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ﴾ اے اہلِ کتاب! تم اللہ تعالیٰ کی ان آیاتِ ثلاثہ کا کیوں انکار کرتے ہو یعنی: (۱) تورات کی آیات کا، جس میں اسلام کی حقانیت اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفاتِ حقہ، صادقہ جو تورات میں درج ہیں۔ (۲) قرآن حکیم کی آیات کا انکار کرتے ہو۔ (۳) پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کا، جو کہ آیاتِ الٰہی کے درجے میں ہیں، کیونکہ ان تینوں چیزوں کا انکار صریح کفر ہے۔

چوتھی اور پانچویں چیز تورات میں تحریف اور کتمانِ حق، جو کہ بدترین کفر شمار ہیں، حالانکہ تم آپس کی محفلوں میں ان تمام باتوں کا اقرار کرکے گواہی بھی دیتے ہو۔

﴿يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ﴾ اے اہلِ کتاب! تم صاف ستھرے پاکیزہ حق کو ناپاک باطل کے ساتھ کیوں خلط ملط کرتے ہو؟ اور حق کو چھپاتے ہو؟ تحریف کرکے، یا اوصاف وصداقت ومعجزات خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کرکے، حالانکہ تم جانتے بھی ہو۔ جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

﴿يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ [البقرة: ۱۴۶] (پہچانتے ہیں ان کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو، اور بیشک ایک فرقہ ان میں سے چھپاتے ہیں حق کو جانتے ہوئے محض حسد وعناد کی بنیاد پر)۔

وَقَالَت طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَٰبِ ءَامِنُوا۟ بِٱلَّذِىٓ أُنزِلَ عَلَى ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَجْهَ ٱلنَّهَارِ وَٱكْفُرُوٓا۟ ءَاخِرَهُۥ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوٓا۟ إِلَّا لِمَن تَبِعَ دِينَكُمْ قُلْ إِنَّ ٱلْهُدَىٰ هُدَى ٱللَّهِ أَن يُؤْتَىٰٓ أَحَدٌ مِّثْلَ مَآ أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَآجُّوكُمْ عِندَ رَبِّكُمْ قُلْ إِنَّ ٱلْفَضْلَ بِيَدِ ٱللَّهِ يُؤْتِيهِ

مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ۚ﴿۷۳﴾ يَّخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۷۴﴾

ترجمہ: اور اہلِ کتاب میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کتاب نازل ہوئی ہے اس پر دن کے ابتدائی حصہ میں ایمان لے آؤ، اور دن کے آخری حصہ میں اس سے انکار کردو، شاید اس تدبیر سے مسلمان اپنے دین سے پھر جائیں ﴿۷۲﴾ اور انہوں نے باہم یہ بھی کہا کہ: بجز اس شخص کے جو تمہارے دین کا پیرو ہو اور کسی کی تصدیق نہ کرو۔ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے: یقیناً ہر قسم کا فضل اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، وہ اپنا فضل جس کو چاہتا ہے عطاء فرماتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑا فیاض اور کمال علم کا مالک ہے ﴿۷۳﴾ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے خاص کر لیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل کا مالک ہے ﴿۷۴﴾

معارف ومنازل

یہود کی عیارانہ تدبیر کا ذکر گزشتہ سطور میں واضح ہوا کہ انہوں نے اپنے چند لوگوں سے کہا تھا کہ دن کے ابتدائی حصہ میں جا کر ایمان لاؤ، اور اس کی تشہیر بھی کرو، پھر دن کے آخری حصہ میں مرتد ہو کر انکار کرو، اور اس کا چرچا کر کے اسلام سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرو، تاکہ لوگوں میں بے اعتمادی اور شکوک وشبہات پیدا ہوں، اور لوگ اسلام سے متنفر ہوں۔

﴿وَلَا تُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّا لِمَنۡ تَبِعَ دِيۡنَكُمۡ﴾ اور نہ تصدیق کرنا مگر اس کی جو تمہارے دین کا تابع ہو۔ یعنی صرف اپنے دین کو ہی سچا ماننا، کہیں مسلمانوں کے دین کی تصدیق نہ کر بیٹھنا۔ مقصد یہ کہ جب عارضی طور پر (نفاق کے ساتھ) دن کے اوّل حصہ میں بظاہر ایمان بھی لاؤ، تو تصدیق صرف اسی چیز کی کرنا جو تمہارے دین میں شامل ہے، کسی دوسری بات کی تصدیق نہ کرنا، کیونکہ سچا دین صرف تمہارا ہی ہے۔ اور یہ بھی سوائے اپنوں کے کسی اور پر ظاہر نہ کرنا، بلکہ اپنے اس نفاق کو مکمل مخفی رکھنا، تاکہ مقصد میں ناکامی نہ ہو۔ اب آنے والا جملہ معترضہ ہے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے پیغمبر (اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم)!

﴿قُلۡ اِنَّ الۡهُدٰى هُدَى اللّٰهِ﴾ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کہہ دیجئے کہ: ہدایت تو وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے، اور تمہاری یہودیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے، یہ تمہارا اپنا منگھڑت خودساختہ مذہب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت جو مقرر اور منظور شدہ ہے، وہ صرف اسلام ہی ہے، نہ اور کوئی۔ جملہ معترضہ کے بعد دوم جملہ:

﴿اَنْ یُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ﴾ یہ کہ کسی دوسرے کو بھی ایسی ہی چیز دی گئی ہے جو تم کو دی گئی ہے۔
بعض مفسرین رحمۃ اللہ علیہم کا خیال ہے کہ یہاں "لام نفی" مقدر ہے، یعنی یہود کہہ رہے ہیں کہ جو دین، کتاب، فضیلت و برتری تمہیں دی گئی ہے اور کسی کو نہیں دی گئی۔ یعنی مسلمانوں پر بحیثیت دین و کتاب تم برتر اور افضل ہو، تمہاری فضیلت ہر اعتبار سے مسلّم اور ممتاز ہے۔

﴿اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ﴾ یا وہ تمہارے ساتھ تمہارے ربّ کے پاس جھگڑا (حجت بازی) کریں۔
اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

☆ اگر تم نے اہلِ ایمان کی تصدیق کر دی، تو پھر بحث و مباحثہ میں وہ تم پر غالب آجائیں گے، اور یہ یہودیت کی ناکامی کا باعث ہوگا۔

☆ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اگر تم نے ان کی تصدیق کر دی، تو وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمہارے خلاف حجت قائم کریں گے، کہ اے ربّ العزّت! انہوں نے ہمارے سچے دین کی تصدیق کرنے کے باوجود تیرے آخری نبی (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور تیری آخری کتاب قرآن حکیم کو تسلیم نہیں کیا۔ اس طرح اہلِ اسلام قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور بھی تم پر غالب آجائیں گے۔ لہٰذا اسلامتی اسی بات میں ہے کہ تم صرف اپنے دین والوں کی تصدیق کرو، اس کے علاوہ اور کسی کی تصدیق نہ کرو، جیسے پہلے جملہ: ﴿وَلَا تُؤْمِنُوْۤا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ﴾ میں بیان ہوا۔ اسی قسم کا مضمون سورۂ بقرہ میں بھی بیان ہوا۔

اس کے علاوہ بنی اسرائیل کا دعویٰ تھا کہ ہماری بہتری اور فضیلت قیامت تک آنے والی قوموں پر مسلّم ہے، اور نبوت بھی قیامِ قیامت تک اولادِ اسحاق و یعقوب علیہما السلام میں مخصوص رہے گی، اور حضرت داؤد علیہ السلام نے صراحۃً فرمایا تھا کہ نبوت ہمیشہ ان کے خاندان میں رہے گی، پس وہ اپنے زعمِ باطل پر یہی سمجھتے رہے کہ اسرائیل کی اولاد کے علاوہ کسی بھی خاندان میں نبوت کا سلسلہ نہیں چلے گا۔

اسی مزعومہ فاسدہ کو بنیاد بنا کر انہوں نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوتِ صادقہ کا انکار کیا، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے اور آپس میں اقرار بھی کرتے رہتے تھے کہ آخری جامع اور کامل و ہمہ گیر نبوت بنو اسماعیل کے خاندان میں ہوگی، اور وہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبارک، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مع دیگر صفاتِ حمیدہ کے تورات و انجیل اور زبور میں ہمیشہ دیکھتے رہتے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل وسیلہ سے دشمنوں پر نصرت

اور فتح مندی کی دعا بھی کرتے تھے، جیسا کہ تفصیلاً سورۂ بقرہ میں بیان ہوا۔ مزید تفصیل سورۂ اعراف میں آیت کریمہ:
﴿اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ﴾
[الأعراف:۱۵۷] کے تحت ان شاء اللہ آنے والی ہے۔

پس قرآن حکیم نے جا بجا ان کے فاسد و بے بنیاد مزعومات کی تردید فرما کر واضح فرمایا، اور آخری پیغمبر تاجدارِ ختم نبوت ﷺ کو ساری کائنات کا پیشوا بنا کر ان کی نبوتِ عامہ کا اعلان فرمایا۔ ارشاد ہے: ﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا﴾۔ [الأعراف:۱۵۸] (آپ کہہ دیجئے: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا پیغمبر ہوں)۔ اور آپ ﷺ کی اُمت کو خیر اُمت کے لقب سے نوازا، فرمایا: ﴿كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾[آل عمران:۱۱۰] (تم بہترین امت ہو، جو پیدا کی گئی ہے لوگوں (کے فائدے) کے لئے)۔

اسی خیر اور ﴿اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ کی بدولت سید الانبیاء ﷺ نے فرمایا: قیامت کے روز سب سے پہلے میری اُمت کا فیصلہ ہوگا، اور سب سے پہلے میری اُمت کیلئے جنت میں دخول کا فیصلہ ہوگا، لہٰذا اہلِ کتاب کی دائمی برتری کا دعویٰ باطل اور بے بنیاد ہے۔ اسی نکتہ پر ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾۔ [الآیۃ] آپ (ﷺ) پورے اعتماد کے ساتھ کہہ دیں کہ فضل (نبوت) تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہے دیتا ہے، اور وہی اس کا مالک ہے۔ جب تک بنی اسرائیل حق و صداقت پر عمل پیرا رہے، یہ فضیلت ان کے پاس رہی، اور جوں ہی وہ حدود اللہ وحقوق اللہ و دینی اقدار پر تیشہ چلا کر آسمانی ہدایات سے منحرف ہو گئے، تو سنت اللہ یہی ہے کہ نافرمان و نافرجام قوم مزید آسمانی اقدار کی حقدار نہیں رہ سکتی، تو اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت ان سے سلب کر کے واپس لے لی، جس کی تفصیل قرآن حکیم میں جا بجا مذکور ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ نعمت ہمیشہ کے لئے لے لی، تو جو ذات اقدس: "كُنْتُ نَبِيًّا وَآدَمُ فِي طِيْنَتِهٖ". [الحدیث] "أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ رُوْحِي یا نُوْرِی". کے مبارک پر ختم نبوت، اور سب سے بڑی جامع نبوت کا تاج رکھا، بیشک اللہ تعالیٰ واسع و علیم ہی ہے۔ بڑی وسعت اور بڑا جاننے والا، اور استحقاق پر فیصلہ کرنے والا ہے۔ وہ اس طور پر کہ:

﴿یَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ﴾۔ خاص کرتا ہے اپنی مہربانی جس پر چاہے،

اور اللہ تعالیٰ عظیم فضل ورحمت کا مالک ہے۔

اس صاحبِ فضل وکرم کے خزانوں میں کمی نہیں ہے، اور نہ ہی اس کے خزانوں پر کسی کی اجارہ داری ہے، اور اسی کو خبر ہے کہ کس کو کیا انعام یا رتبہ وبڑائی دینی چاہئے۔ نبوت، شریعت، ایمان، اسلام اور ہر قسم کے مادی وروحانی فضائل وکمالات کا تقسیم کرنا اسی کے ہاتھ میں ہے، جسے مناسب جانے عطا کرتا ہے۔ ﴿اَللّٰهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾[الأنعام:۱۲۴] (اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کہاں اپنی نبوت رکھ دے)۔ ﴿أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ﴾ [الزخوف:۳۲] (کیا وہی لوگ تمہارے ربّ کی رحمت (نبوت) کو تقسیم کرتے ہیں؟) یعنی نبوت ورسالت کے مناصب کی تقسیم کیا تمہارے ہاتھ میں دیدی گئی ہے؟ جو انتخاب پر بحث کررہے ہو۔

جب دنیوی ساز وسامان کی تقسیم تمہارے ہاتھوں میں نہیں دی گئی، تو نبوت جیسے اعلیٰ منصب کیونکر کسی کے ہاتھ میں ہو؟ یعنی نبوت ورسالت کا شرف تو ظاہری مال وجاہ، اور دنیوی ساز وسامان سے کہیں اعلیٰ وافضل ہے، جب اللہ تعالیٰ نے دنیاوی روزی ان کی تجویز پر نہیں بانٹی، پیغمبری ان کی تجویز پر کیوں دیدے؟

تنبیہ:

مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم نے اس آیت کو مشکل ترین آیت شمار کیا ہے، اور اس میں جو متعدد جملے ہیں ان کے باہمی تعلق پر بڑی طویل بحثیں کی ہیں۔ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں: ﴿قُلْ إِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ﴾ جملہ معترضہ ہے، اور دوسرے سب جملوں کا تعلق ﴿وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ﴾۔ [قرطبي]

پہلی بات یہ ہے کہ اپنے دین کے ماننے والوں کے بغیر کسی کی بات نہ ماننا۔

دوسری بات یہ کہ یقین کرنا کہ جن انعاماتِ خداوندی سے تمہیں سرفراز کیا گیا ہے، وہ کسی دوسری قوم کو مرحمت نہیں کیئے گئے۔

تیسری بات یہ کہ تم بالکل مطمئن رہو قیامت کے دن بھی تم پر کوئی حجت قائم کرکے تمہیں شرمسار نہیں کرسکے گا۔ یہ باتیں ان کے ذہن نشین کرنے کے بعد ان کو اس خطرناک سازش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا اہم فریضہ سونپا جاتا۔ اس طرح انہیں ذہنی اور روحانی طور پر بھی اسلام کے خلاف اس گھناؤنے جرم کے ارتکاب کے لئے تیار کیا جاتا۔

مگر دانا وبینا خداوند تعالیٰ نے ان کی سازشوں کو قبل از وقت بے نقاب کرکے مسلمانوں کو مکمل خبردار کردیا،

اوراس طرح یہود کی یہ گہری سازش ناکام ہوکررہ گئی فرمایا: ﴿وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ﴾۔ [ابراهیم:۴۶] (اوروہ لوگ اپنی ساری چالیں چل چکے تھے،اوران کی ساری چالوں کا توڑ اللہ کے پاس تھا، چاہے ان کی چالیں ایسی کیوں نہ ہوں جن سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل جائیں)۔

فائدہ:

آخری دونوں آیتوں کی ہر فرض نماز کے بعد سات مرتبہ تلاوت اکسیر کا درجہ رکھتی ہے، خاص کر علماء وطلباء کے لئے۔ اِن شاء اللہ علم ومعرفت کے سارے دروازے کھل جائیں گے، اور حافظہ ترقی کرے گا، نسیان کا مرض ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے گا۔

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَا يُؤَدِّهِ
إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ۗ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ ۚ وَيَقُولُونَ
عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝٧٥ بَلٰى مَنْ أَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَإِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝٧٦

ترجمہ: اوراہلِ کتاب میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کے پاس ایک خزانہ امانت رکھیں، تو وہ اس کو تمہاری طرف لوٹا دیں گے، اوران میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کے پاس ایک دینار امانت رکھیں تو اسے آپ کی طرف واپس نہیں کریں گے، جب تک کہ آپ اس پر قائم نہ رہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اوپر اُمّی لوگوں کے حق میں کوئی گناہ نہیں ہے، اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کہتے ہیں، اور وہ جانتے ہیں ۝٧٥ کیوں نہیں، جوشخص اپنے عہد کو پورا کرے گا، اور ڈرتا رہے گا، پس بیشک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے ڈرنے والے اور تقویٰ اختیار کرنے والوں کو ۝٧٦

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں اہلِ کتاب کی دینی خیانتوں کا بیان ہوا، موجودہ آیات میں ان کی مالی خیانت کا تذکرہ ہے۔ البتہ یہ آنے والے اوصاف عمومی نہیں ہیں، چندایک اشخاص کے ساتھ ان کا تعلق ہے۔ قرآن حکیم نے دوسرے مقام پر بھی اسی طرح کا حکم صادر فرمایا، ارشاد ہے: ﴿لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ

اللہِ آنَآءَ الَّیۡلِ وَهُمۡ یَسۡجُدُوۡنَ﴾.[آل عمران: ۱۱۳] (سب ایک جیسے نہیں ہیں، اہلِ کتاب میں وہ لوگ بھی ہیں جو (راہِ راست پر) قائم ہیں، جو رات کے اوقات میں اللہ کی آیتوں کی تلات کرتے ہیں، اور جو سجدہ ریز ہوتے ہیں)۔

اسلام آنے کے بعد سارے اہلِ کتاب کافر اور غیر مقبول ہوگئے، اس لئے کہ ان کا دین وشریعت اور کتابیں منسوخ ہوگئیں، اور سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے وہ مکمل کافر ہوگئے، ورنہ اسلام سے پہلے اگر چہ بحیثیتِ مجموعی وہ بہت ہی برے اور نافرمان گزرے، مگر ہر زمانے میں ان کی صفوں میں نیک اور متقی لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ احادیثِ صحاح میں ایسے لوگوں کے بڑے اچھے اعمال کا تذکرہ موجود ہے۔

مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں یہود کے دس بڑے عالم تھے، ان میں سے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ واحد عالم تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دولت نصیب فرمائی، باقی سارے یہودی علماء اس نعمت سے محروم رہے۔ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے پاس بارہ سو (۱۲۰۰) اوقیہ امانتاً رکھا ہے، ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہوتا ہے۔ اس زمانے میں دینار (اشرفی) سونے کا سکہ ہوتا تھا، جس کا وزن چار ماشہ ہوتا تھا، اور درہم چاندی کا سکہ ہوتا تھا، جس کا وزن ساڑھے تین ماشہ کا ہوتا تھا۔ بارہ ماشہ کا وزن ایک تولہ ہوتا ہے۔

﴿قِنۡطَارٍ﴾ کے معنی ہیں: بہت مال، یعنی مال کا ڈھیر۔ سورۃ البقرہ میں اس کی تفصیل گزر گئی۔ الغرض! جب وہ امانت رکھنے والے شخص نے مطالبہ کیا تھا، تو حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فوراً بغیر چون وچرا اس کا پورا مال بارہ سو اوقیہ ادا فرمایا۔ جبکہ دوسرے یہودی عالم کے پاس ایک مشرک نے ایک دینار امانتاً رکھا تھا، ایک مدت کے بعد جب اس نے مطالبہ کیا تو یہودی عالم فنحاص بن عازورا نے اس قریشی مشرک کی امانت سے انکار کیا، اور مکر گیا۔ بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

واضح ہو کہ یہودی علماء نے ایک منگھڑت خود ساختہ مسئلہ ایجاد کیا تھا، اور وہ اس کی نسبت تورات کی طرف کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ حکم ہے، دراصل یہ مسئلہ نہ تورات کا ہے، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی حکم نازل کیا ہے، حاشا اللہ!

وہ مسئلہ یہ ہے کہ وہ کہتے تھے کہ غیر یہودی، خواہ عرب کا مشرک جاہل ان پڑھ ہو، یا اور کوئی مشرک صابی، یا مجوسی ہو، ایسے لوگوں کا مال مباح ہے، اور یہود کے لئے اس کا کھانا جائز ہے، خواہ خیانت کے ذریعہ ہو، تجارت،

فریب، دھوکہ یا دیگر کسی ذریعہ سے ہو، غیر یہودیوں کا مال بہر صورت یہودیوں کے لئے حلال ہے۔ اور یہ جھوٹی نسبت وہ اللہ تعالیٰ کی طرف کر کے وہ گناہ پر گناہ، اور کفر کا ارتکاب کرتے تھے۔ آیت کریمہ میں ان سب باتوں کا تذکرہ ہے، اور ان کی تردید و مذمت ہے، فرمایا:

﴿وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ﴾ یہ مدح اور تعریف ہے، جیسے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ وغیرہ۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا﴾ اور ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ گر آپ ان کے پاس ایک دینار امانت رکھیں، تو وہ اس کو بھی واپس نہیں کرے گا، مگر یہ کہ تو ہر وقت اس کے سر پر کھڑا رہے، جیسے خاص بن عازورا، یا کعب بن اشرف وغیرہ۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت سے اخذ کیا ہے کہ قرض خواہ اپنے قرض دار کے پاس ڈھیرا ڈال کر مطالبہ کر سکتا ہے۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ﴾ کیونکہ ان کا یہ فلسفہ رہا کہ ان پڑھ لوگوں کا مال کھانے میں ان پر کوئی گناہ نہیں ہے، وہ ان کے مال کو غنیمت سمجھ کر کھاتے رہتے تھے۔

﴿وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ یہ لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بول کر اپنا عمل نامہ سیاہ کر رہے ہیں، حالانکہ یہ خود جانتے ہیں کہ ہمارا یہ فعل شریعت تورات اور احکامِ الٰہی کے خلاف ہے، اور سراسر ظلم و بے انصافی اور غیر دانشمندانہ ہے۔

﴿بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ یعنی اے اہلِ کتاب! تم پر الزام ضرور ہوگا، اور اس قسم کی خیانت پر ضرور تمہارا مؤاخذہ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے، اور آسمانی شریعت کا قانون یہ ہے کہ جو شخص اپنے عہد کو پورا کرے گا، خواہ وہ عہد اللہ تعالیٰ سے کیا ہو، یا مخلوق سے، کوئی جائز صحیح عہد کیا ہو، اور وہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے گا، جس میں خیانت اور کفر سے بچنا بھی آ گیا، کیونکہ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا وہ خیانت اور کفر اور دیگر ہر قسم کی نافرمانیوں سے پرہیز کرے گا، تو حق تعالیٰ سبحانہ ایسے پرہیزگاروں سے راضی رہے گا، اور ان سے محبت کرے گا۔

بہر حال! آیت کریمہ کا نزول خواہ کسی خاص موقع کے ساتھ متعلق ہو، مگر مفہوم و مطلب عام ہی ہوگا کہ

ہماری شریعت میں بھی اس قسم کی خیانت، اور دوسروں کے مال پر ناجائز قبضہ جمانا حرام اور ناجائز ہی ہوگا، اور کسی غیر مسلم ذمّی کے مال کو حلال سمجھ کر کھانا ایسا ہی حرام ہوگا جیسے کہ کسی مسلمان کے مال کا معاملہ ہے۔

دارالحرب کے حربی کا مال اگر حلال ہو جاتا ہے تو جنگ اور جہاد کے بعد، نہ کسی عام طریقے سے۔ اسلام نے جن زرّین قوانین پر چلنے کا ہمیں پابند کیا ہوا ہے، وہ اتنے عمدہ اور پاکیزہ ہیں، جن میں دھوکہ، فریب، خیانت وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے ہر قسم کے ظلم و زیادتی، اور بے انصافیوں سے پاک معاشرہ و قوانین ہمیں نصیب کیا ہے، پس چاہئے کہ ہم شکر گزار بندہ بن کر شریعت پر عمل پیرا ہو جائیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۷۷﴾ وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُم بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۷۸﴾

ترجمہ: بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے تھوڑی سی قیمت خریدتے ہیں، یہی لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں کچھ حصہ نہیں، اور اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں کرے گا، اور نہ ان کی طرف نگاہ کرے گا قیامت کے دن، اور نہ ان کو پاک کرے گا، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۷۷﴾ اور بیشک ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو موڑتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب کے ساتھ تاکہ تم اُسے کتاب سے گمان کرو، حالانکہ وہ کتاب سے نہیں ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کہتے ہیں، اور وہ جانتے ہیں ﴿۷۸﴾

معارف ومنازل

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ان آیات کا تعلق یہود و نصاریٰ دونوں کے ساتھ ہے۔ اس سے پہلے یہود و نصاریٰ (اہلِ کتاب) کی دینی اور مالی خیانتوں کا تذکرہ ہوا، اب ان کی سب سے بڑی خیانتوں کا تذکرہ ہو رہا ہے، یعنی کتمانِ حق، پیشین گوئیوں کو چھپا لینا، آسمانی کتابوں میں لفظی و معنوی تحریف کرنا، اور قسم کھا کر

لوگوں کا مال ہضم کرنا، وعدہ خلافی کرنا، اور افتراء علی اللہ کا ارتکاب کرنا، وغیرہ۔

اس ضمن میں دیگر واقعات یہود اور غیر یہود کے پیش آئے، جہاں مدّعی کے پاس گواہ نہ ہونے کی وجہ سے مدعیٰ علیہ کا قسم کیلئے مثلاً تیار ہونا، اور جانتے ہوئے بلا وجہ قسم کھا کر مدّعی کے مال پر قابض ہونا۔

قرآن کریم میں اس بات کی بار بار وضاحت ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب سے عہد لیا تھا کہ ان کے پاس جو نبی آئے گا وہ اس پر ایمان لائیں گے، اس کی تصدیق کریں گے، اس کے حقوق اور صفات کی پاسداری کریں گے، اور اس کا ساتھ دیں گے۔ مگر جب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہو کر تشریف لائے، اور قرآن کریم کا نزول شروع ہوا، تو اہلِ کتاب تصدیق ونصرت کی بجائے پر زور مخالفت، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب پر کمر بستہ ہوئے، اور تورات و انجیل کی پیشین گوئیوں کو مٹا چھپا کر تبدیل کر کے یک لخت منکر ہوئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کے بجائے ضد وعناد کی بنیاد پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دینی اور جانی دشمن بن گئے، اور تمام عہد و میثاق کو بھول گئے، اور ہر قسم کی بدعہدی و خیانت پر ڈٹے رہے۔

﴿ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ سے مراد ہے متاعِ دنیا، خواہ قلیل ہو یا کثیر، کیونکہ جنت کی نعمتوں کے مقابل دنیا کی ساری نعمتیں ہیچ اور قلیل ہیں۔ علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت کا نزول کعب ابن اشرف، حیی بن اخطب، اور دیگر یہودیوں کے علماء کے حق میں ہوا ہے، جو تورات میں نازل شدہ اوصاف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھپاتے بدلتے، اور ان کی جگہ اپنی طرف سے دوسرے الفاظ وکلمات درج کرتے تھے، اور قسم کھا کر کہتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور یہ تورات میں لکھے ہوئے ہیں، اور فرمانِ الٰہی ہے۔

اور اس تبدیلی وتحریف سے ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ ان کی سرداری برقرار و باقی رہے، اور لوگوں سے ان کو شکرانہ اور رشوت کا مال بدستور ملتا رہے (یہ ناروا کردار جیسے کہ یہود کے علماء کا ہوتا تھا، یہ ہر زمانے کے دینی و مذہبی پیشواؤں میں رائج اور جاری رہا ہے، یہاں تک کہ ہمارے زمانہ کے مشرک، بدعتی، قبر پرستوں میں آج بھی یہی سلسلہ زور و شور سے جاری ہے۔ یہ بدعتی پیشوا علماء سوء اگر صحیح حق بتائیں تو ان کے سارے شکرانے، نذر و نیاز بند ہو جائیں گے۔ یہ چیز انہیں یہود و نصاریٰ کے علماء سے ورثہ میں ملی ہے۔ ان شاء اللہ ان کا حشر بھی انہی کے ساتھ ہوگا)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان کے مال مارنے کے لئے جھوٹی قسم کھائے گا، تو اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی پیشی ایسی حالت میں ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اس

پر غضبناک ہوگا۔ یہ روایت بخاری میں ہے، قدرے تفصیل کے ساتھ۔

اسی طرح سنن ترمذی اور ابوداؤد اور مسلم میں یہ روایت ہے کہ سید کائنات ﷺ کی خدمت میں دو آدمی حاضر ہوئے، ایک حضرموت کا ربیعہ بن عبدان، دوسرا کندہ کا امرءالقیس بن عابس۔ حضرمی نے عرض کیا کہ اس نے میری زمین پر قبضہ کیا ہے۔ کندی نے جواب دیا: وہ زمین میری ہے، اور میرے قبضہ میں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرمی سے فرمایا: تمہارے پاس گواہ ہیں؟ اس نے کہا نہیں۔ فرمایا: تم کو اس سے قسم لینے کا حق ہے۔ حضرمی نے کہا: یارسول اللہ! یہ شخص علانیہ فاسق ہے، اس کو کسی چیز سے باک نہیں ہے، اس کو قسم کھانے کی کوئی پروانہ ہوگی۔ فرمایا: اس کے علاوہ اس سے تم کو کوئی حق نہیں ہے۔ اس پر سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا: جو کوئی قسم کھا کر کسی کا کوئی مال مارے گا، وہ اللہ تعالیٰ کی پیشی کے وقت اللہ تعالیٰ اس سے اعراض فرمائے گا (یا وہ کوڑھی ہوگا)۔

یہ سن کر کندی نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ زمین اسی کی ہے، اور قسم کھانے سے انکار کر کے حق تسلیم کرلیا، اور زمین حضرمی کو دیدی۔

﴿أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ﴾ ان لوگوں کے لئے آخرت کی راحتوں اور نعمتوں میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ حضرت ابوامامہؓ کی روایت میں ہے کہ سید کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے قسم کھا کر کسی مسلمان شخص کا حق مارا، اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے دوزخ لازم کردی، اور جنت اس پر حرام کردی۔ اس پر ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگرچہ تھوڑی سی چیز ہو؟ فرمایا: اگرچہ درخت پیلو کی ایک ٹہنی ہو۔ یہ لفظ آپ ﷺ نے تین مرتبہ پڑھا۔ [مظہری، مسلم]

﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے رحمت و شفقت کا کلام نہیں کرے گا، اور لطف وعنایت سے ان کی طرف نظر نہیں کرے گا، نہیں دیکھے گا۔ بعض علماء کرام نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے ایسا کلام نہیں کرے گا جس سے ان کو خوشی وراحت ہو، اور نہ ان کی طرف دیکھے گا، جس سے ان کو مغفرت کی اُمید ہو۔

صحیح بات یہ ہے کہ ظاہری معنی مراد نہیں ہیں، بلکہ کنایہ ہے غیظ وغضب ناکی سے، اور اعراض وناراضگی سے، جیسے حدیث بخاری میں ہے: لَقِيَ اللهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبانُ. یا یہ لَقِيَ الله وهو عَنهُ مُعْرِض. [الحدیث]۔ مطلب دونوں باتوں کا ایک ہے، کوئی تعارض نہیں ہے۔

﴿وَلَا يُزَكِّيْهِمْ﴾ اور اللہ تعالیٰ انہیں پاک نہیں کرے گا، وہ اپنے گناہوں کی نجاستوں میں لت پت رہیں گے۔ یہ کنایہ ہے ان کی عدمِ مغفرت سے، یعنی ان کی بخشش نہیں ہوگی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: انسانوں کے اعمال ناموں کی تین مدیں (رجسٹر) ہیں: ایک مدوہ ہے جس کی پروا (یعنی سختی) اللہ تعالیٰ نہیں کرے گا۔ دوسری مدوہ ہے جس میں سے کوئی چیز (بغیر عوض کے) نہیں چھوڑے گا۔ تیسری مد وہ ہے جس کو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا۔

جس مد کو معاف نہیں فرمائے گا وہ تو شرک و نفاق ہے، جس کی مغفرت کسی صورت میں ممکن نہیں۔ اور جس مد کی کوئی خاص پروا نہیں کرے گا وہ خود انسان کا اپنی ذات پر ظلم ہے، یعنی وہ حقوق جو اللہ تعالیٰ کے براہِ راست انسان پر ہیں، ان کو ادا نہ کرنا، جیسے کوئی روزہ، یا زکوٰۃ، یا حج، یا نماز وغیرہ ترک کردے۔ ان گناہوں کی مغفرت بھی ہوسکتی ہے، اور گرفت بھی۔ تیسری مدوہ ہے جس کے اندراجات میں کوئی چیز (بغیر بدلہ وعوض کے) نہیں چھوڑے گا، وہ بندوں کی باہم حق تلفیاں ہیں، ان میں لامحالہ بدلہ وعوض دینا ہوگا۔ [رواہ أحمد و الحاکم]

اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ تین قسم کے لوگ میدان محشر میں مبعوث ہوں گے:

☆ اوّل وہ جو کہ اوّل سے آخری فیصلہ تک غنی رہیں گے، جیسے انبیاء، صدیقین اور متقین وغیرہم۔

☆ دوم وہ لوگ جو اوّل سے آخر تک فقیر و محتاج رہیں گے، جیسے مشرکین، کفار اور منافقین۔

☆ سوئم وہ لوگ جو شروع میں غنی ہیں، ان کے پاس پہاڑوں کے برابر اعمال خیر ہیں، مگر انہوں نے لوگوں کے حقوق پامال اور غصب کئے۔ کسی کا حق مارا، کسی پر ظلم کیا، کسی کی غیبت کی، کسی پر الزام اور ناحق بہتان لگایا، کسی کی بے عزّتی کی، کسی کا مال کھایا، علیٰ ہذا القیاس۔ اب حکم ہوگا کہ اس کی نیکیوں سے حقداروں کے حقوق ادا کئے جائیں، ایک ایک حق کے عوض ہزاروں قبول شدہ نمازیں دیدی جائیں گی۔ علی ھذا القیاس دیگر اعمال خیر سے بھی۔ پس اگر حقداروں کی حق رسی ہوگئی تو بہتر، اگر اس کی نیکیاں ختم ہوگئیں، اور حقداروں کے حقوق باقی رہے، تو حکم ہوگا کہ ان کے گناہ اس پر ڈال دئے جائیں، اور اسے جہنم کا راستہ بتادیا جائے۔ تو یہ شخص شروع میں غنی تھا، آخر میں فقیر۔

کتنی حماقت اور کتنا خسارہ ہوا، کہ دوسروں کے (ناکردہ) گناہوں کو اپنے سر پر رکھ کر دوزخ میں چلا گیا (نعوذ باللہ)۔ مقامِ عبرت ہے۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میری اُمت کا اصلی واقعی مسکین یہی شخص ہے۔

☆☆☆

اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے محروم لوگ:

کفر وشرک کے بعد جن چند بڑے جرائم پر سخت سے سخت وعید نازل ہوئی ہے ان میں سے ایک یہ وعید نہایت سخت اور بے انتہاء پریشان کن ہے۔ اس وعید کے ارکان (یعنی شقیں) پانچ بیان ہوئے: (۱) ﴿لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ﴾ (۲) ﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ﴾ (۳) ﴿وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ (۴) ﴿وَلَا يُزَكِّيهِمْ﴾ (۵) ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾.

اس وعید شدید کے مستحق کون ہوں گے؟ اور اس خطرناک وعید کی زد میں کون سے لوگ آئیں گے؟ پس واضح ہوا کہ اس کی زد میں آنے والے لوگ تقریباً آٹھارہ ہیں، جن میں سے چار کی نشاندہی اس آیت کریمہ میں ہوئی، اور باقی کی ترتیب وار نشاندہی حدیث مبارکہ میں تقریباً انہی قرآنی الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے:

(۱) جو شخص دنیوی اغراض اور حطامِ دنیا کی خاطر حق کو چھپائے۔ (۲) جو شخص کلامِ الٰہی میں تحریف وتبدیلی کرے۔ (۳) جو شخص کسی کے حق مارنے کیلئے قسم کھائے۔ (۴) جو شخص عہدِ الٰہی میں خیانت کرے۔ (القرآن)۔

(۵) جو شخص کبر وغرور سے تہبند، قمیص، پاجامہ، چادر ٹخنوں سے نیچے لٹکائے۔ (۶) جو شخص جب کسی کے ساتھ احسان کرتا ہے تو احسان جتلا کر اسے ایذا دیتا ہے۔ (۷) جو شخص جھوٹی قسم کھا کر اپنا مال فروخت کرتا ہے۔ [مسلم، احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی عن ابی ذرؓ]۔ (۸) وہ شخص جس کے پاس بیابان میں ضرورت سے زائد پانی ہو، اور وہ دوسرے محتاج مسافر کو نہ دے۔ (۹) وہ شخص جو عصر کے بعد جب بازار میں رونق ہوتی ہے، جھوٹ بول کر کہے کہ میں نے یہ مال اتنے میں خریدا ہے، حالانکہ وہ اتنے میں نہیں خریدا، اسی بہانہ وقسم پر فروخت کرے۔ (۱۰) وہ آدمی جس نے امام کی بیعت کی، اور صرف دنیا کے لئے کی، اگر امام نے کچھ دیدیا تو وفادار رہا، اور اگر کچھ نہیں دیا تو غداری کی، اور وفا نہ کی۔ [أصحاب سته وأحمد عن أبي هريرة رضي الله عنه]۔ (۱۱) وہ تاجر شخص جو غلط بیانی اور قسم کے زور سے تجارت کرے۔ (۱۲) وہ شخص جو کسی کے مال مارنے کیلئے جھوٹی قسم کھائے۔ (۱۳) وہ شخص جو بوڑھا عمر رسیدہ ہو اور زنا، بدکاری کرے۔ (۱۴) وہ مفلس ومحتاج جو کبر وغرور کرے۔ (۱۵) وہ شخص جو بیچنے اور خریدنے دونوں پر قسم کھاتا پھرے۔ [متفق عليه، طبراني، بيهقي عن أبي هريرة رضي الله عنه وسلمان فارسي رضي الله عنه وعصمه بن مالك رضي الله عنه] (۱۶) جو شخص اپنے والدین سے نفرت کرے، اور انہیں بے یار ومددگار چھوڑ دے۔ (۱۷) وہ شخص جو اپنی اولاد سے نفرت کرے، حسنِ سلوک اور پدرانہ شفقت سے انہیں محروم رکھے، اور انہیں کوئی سہولت مہیا نہ کرے۔ (۱۸) وہ شخص جو اپنے مربی

محسنوں کے ساتھ غداری کرے، اور ان کے احسانات کی ناقدری اور ناشکری کرے۔

ان سارے لوگوں کے لئے احادیث میں وہی وعید وارد ہے جو آیت کریمہ میں مذکور ہوئی۔ عام طور پر لوگ ان جرائم کو حقیر اور معمولی سمجھتے ہیں، اور اچھے خاصے نامدار لوگ بھی انہی معاصی میں غلط فہمی یا جہالت کی وجہ سے مبتلا ہوتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ کریم سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان گناہوں کو مہلک اور خطرناک قرار دے کر ہماری ذاتی اور معاشرتی اصلاح فرمائی۔ ہمیں چاہئے کہ ان مہلک گناہوں سے دور رہیں، اور سارے مسلمانوں کو بیدار کریں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چار چیزوں کو ہرگز حقیر مت سمجھو، یہ چاروں چیزیں نتیجہ کے طور پر خطرناک صورت اختیار کرسکتی ہیں: (۱) گناہ، اگرچہ صغیرہ ہو۔ (۲) مرض و بیماری، اگرچہ خفیف ہو۔ (۳) عداوت و دشمنی، اگرچہ معمولی ہو۔ (۴) آگ، اگرچہ چنگاری ہو۔

﴿وَاِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيۡقًا يَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الۡكِتٰبِ﴾ ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب زبان مروڑ اور دبا کر پڑھتا ہے، تاکہ تم گمان کرو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سے ہے، حالانکہ وہ کتاب اللہ تعالیٰ میں سے نہیں ہے۔ اس کی تفصیل سورۂ بقرہ لفظ "رَاعِنَا" کے تحت گزر چکی ہے، وہاں دیکھی جائے۔

اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ کتاب اللہ کی عبارت میں اپنی طرف سے، اپنے مطلب کی خاطر چند کلمات داخل کر کے پڑھتے تھے، سننے والوں پر تمیز کرنا مشکل ہوجاتی۔ اور بعض وقت اصلی عبارت کو چھوڑ کر آگے پیچھے کچھ الفاظ بڑھا کر پڑھتے تھے، جیسا کہ ﴿قُلۡ فَاۡتُوۡا بِالتَّوۡرٰىةِ فَاتۡلُوۡهَا﴾ [آل عمران: ۹۳] کی تفسیر میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ کتابِ الٰہی میں لفظی اور معنوی دونوں طرح کی تحریف کرتے تھے۔

﴿وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ﴾ اور وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں ہے۔

﴿وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ﴾ اور وہ اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتے ہیں، غلط باتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کر کے خیانت کرتے ہیں، اور جھوٹ بولتے ہیں، اور اسی کے ساتھ کتمانِ حق بھی کرتے ہیں۔

قرآن کریم اور احادیث مبارکہ اس پر گواہ اور شاہدِ عدل ہیں کہ اہل کتاب نے تورات اور انجیل میں

زبردست لفظی ومعنوی تحریف کرکے ایک طرف سے کتاب اللہ کی شکل وصورت اور آسمانی حقائق کو مسخ کیا، دوسری طرف دینِ موسوی ودینِ عیسوی کا حلیہ بگاڑ دیا۔ آج پورے عالم میں تورات وانجیل کا ایک صحیح حقیقی نسخہ بھی دستیاب نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہر یورپی ملک میں انجیل وتورات کے مختلف نسخے رکھے ہوئے ہیں۔ امریکی نسخہ الگ، جرمنی کا الگ، برطانیہ کا الگ۔ جتنے ممالک اتنے ہی نسخے۔ یہ لفظی تحریفوں کا شاخسانہ ہے۔

معنوی تحریفات کا یہ عالم ہے کہ ہر پادری کا مسلک الگ ہے۔ ان شاطر عیسائیوں اور یہودیوں، پادریوں اور مستشرقین نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، کہ اسی قسم کی تحریفات زرخرید مولوی اور پروفیسروں کے ذریعہ قرآن حکیم میں کرلیں، یا کرالیں، مگر یہ کسی کے بس میں نہیں۔ سارا جہاں ایک مختصر سورۃ کی نظیر پیش کرنے سے عاجز اور بے بس رہا، تو کس کی مجال ہے کہ قرآن میں تحریف کرے؟ بڑی تبدیلی تو درکنار، ایک زبر وپیش کی تبدیلی کا امکان بھی نہیں۔

مراکش میں رکھا ہوا قرآن وہی ہے جو ملائشیا میں ہے، دونوں نسخوں میں ایک نقطہ کا فرق نہیں ہے۔ اور دنیا میں پچاس لاکھ سے زائد قرآن کے حافظ بحمدہٖ تعالیٰ موجود ہیں۔ ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾۔ [الحجر: ۹] (ہم ہی نے قرآن کو اتارا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) یہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے۔

البتہ جب دشمنانِ اسلام اپنے اس ناپاک منصوبے میں ناکام ہوئے، تو وہ دوسرے محاذ پر جم گئے کہ کچھ برگشتہ لوگوں کی آخرت خراب کرکے ان کو خریدا جائے، اور ان کے ذریعہ قرآن وحدیث میں معنوی تحریفات کرکے مسلمانوں کے مذہب کو متنازعہ اور مختلف فیہ بنا کر اپنی مراد تک کامیابی حاصل کریں۔

چنانچہ مرزا قادیانی، اعلیٰ حضرت، سرسید احمد خان اور دیگر بہت سے لوگوں کی خدمات برطانیہ والوں نے حاصل کرلی۔ اس سلسلے میں بے چارے غیر مقلد اور شیعہ وروافض، اثنا عشری، اسماعیلی، بوہری وغیرہ بھی میدان میں اترے، جو کہ آج تک یہ نمک خور اور مراعات یافتہ اسی شیطانی عمل میں مصروف ہیں۔

دوسری طرف لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِينَ عَلَى الْحَقِّ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللهِ کی پیشینگوئی آسمان کے چاروں افق پر سورج کی طرح جگمگا رہی ہے، جو دیوبند کی سرزمین سے اٹھ کر بادلِ رحمت بن کر پورے جہاں پر آب پاشی کر رہی ہے۔ فَرَحِمَهُمُ اللهُ۔

کفر ناچا جن کے آگے بارہا تگنی کا ناچ ☆ جس طرح جلتے توے پر رقص کرتا ہے سپند

(ظفر علی خان)

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾

ترجمہ: کسی انسان کے لئے یہ بات (مناسب) نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب، حکم اور نبوت عطاء فرمائے، پھر وہ شخص لوگوں سے کہے کہ: ہو جاؤ تم میرے بندے اللہ تعالیٰ کے سوا، لیکن وہ یوں کہے گا کہ: ہو جاؤ ربّ والے اس وجہ سے کہ تم کتاب سکھلاتے ہو، اور اس وجہ سے تم اس کو پڑھتے ہو ﴿۷۹﴾ اور وہ تم کو اس بات کا حکم نہیں دے گا کہ تم اللہ تعالیٰ کے فرشتوں اور نبیوں کو ربّ (معبود) بناؤ، کیا وہ تم کو کفر کا حکم دے گا، بعد اس کے کہ تم فرمانبردار ہو چکے ہو ﴿۸۰﴾

معارف ومنازل

آیت کریمہ میں صاف صاف اور صراحۃً انبیاء علیہم السلام کی عصمت وتقدس کا بیان ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ حاملینِ نبوّت کا نہایت اونچا مقام ہے، جہاں تک کسی کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق اہلِ حق کا اجماعی عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام حضرت باری تعالیٰ عزّوجلّ کی مطلق نافرمانی سے معصوم ہوتے ہیں، صغیرہ اور کبیرہ سے پاک اور منزہ ہوتے ہیں، قصداً وارادۃً ان سے حق تعالیٰ شانہ کی نافرمانی ہرگز ممکن نہیں۔ اگر قصداً ان سے حکمِ الٰہی کی مخالفت ممکن ہوتی، تو حق تعالیٰ عزّوجلّ مخلوق کو ان کی بے چون وچرا اطاعت اور فرمانبرداری کو اپنی اطاعت قرار نہ دیتا۔ فرمایا: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾. [النساء: ۸۰] (جس نے رسول کی پیروی کی، اس نے اللہ کی پیروی کی)۔

اور انبیاء کرام علیہم السلام کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو اپنے ہاتھ پر بیعت کرنا قرار نہ دیتا۔ کوئی شخص اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں کوئی کام کرے، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس فعل پر سکوت اختیار کرے، تو نبی کا یہ سکوت بالاجماع اس فعل کے جواز کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سکوت ہی اس فعل کو معصیت سے خارج کر کے جواز اور اباحت کی حد میں داخل کر دیتا ہے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فعل معصیت سے خارج نہ ہو؟ ارشاد ہے:

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ﴾[الآیۃ] وفدِ نجران کی موجودگی میں بعض یہود ونصاریٰ نے کہا تھا کہ: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم تمہاری اسی طرح پرستش کرنے لگیں جیسے نصاریٰ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو پوجتے ہیں؟ بعض روایات میں ہے کہ کہنے والا یہودی عالم ابورافع قرظی تھا۔ اس پر سید الموحدین، حبیب ربّ العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: معاذ اللہ! تم نے بہت بڑی غلط بات کہی کہ ہم غیر اللہ کی عبادت کریں، یا دوسرے لوگوں کو اس کی دعوت دیں، یا کسی کو اس فعلِ قبیح پر دیکھ کر خاموشی وسکوت اختیار کریں۔

حق تعالیٰ نے ہم کو اس کام کیلئے نہیں بھیجا، اور نہ ہی انبیاء علیہم السلام کے متعلق اس قسم کی باتوں کا کوئی تصور کرسکتا ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ فرمایا کہ کسی بشر یا انسان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ لوگوں کو اپنی عبادت کی طرف بلائے۔

یہاں اگرچہ بشر عام ہے، مگر اس سے مراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ یعنی جس بشر کو اللہ تعالیٰ کتاب وحکمت، علم و نبوت کے عظیم منصب پر فائز کرتا ہے کہ وہ پوری خلقت کو توحید وایمان اور عبادتِ الٰہی سکھائے، اور پوری انسانیت کو ازلی وعدہ یاد دلا کر ایک معبودِ برحق کی بندگی پر تیار کرے، اور ہر قسم کے کفر وشرک کی نجاستوں سے انہیں پاک کرے، تو ایسے پیغمبر کا یہ کام ہرگز نہیں ہوسکتا کہ لوگوں کو واحد لاشریک معبودِ حقیقی کی بندگی سے ہٹا کر خود اپنا، یا کسی دوسری مخلوق کا بندہ بنانے لگے۔

اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ خداوند قدوس نے جس کو جس منصبِ عالی کا اہل وسزاوار جان کر بھیجا تھا فی الواقع وہ اس منصب کا اہل نہ تھا، اور یہ بات حق سبحانہ وتعالیٰ اور پیغمبر دونوں کی شان کے خلاف ہے، اور ایسا عقیدہ رکھنا صریح کفر ہے۔

دنیا کی کوئی حکومت بھی اگر کسی شخص کو ایک ذمہ داری کے عہدے پر مامور کرتی ہے، تو پہلے دو باتیں سوچ لیتی ہے: اوّل یہ کہ یہ شخص حکومت کی پالیسی کو سمجھنے اور اپنے فرائض کو انجام دینے کی لیاقت اور صلاحیت رکھتا ہے، یا نہیں؟ دوئم یہ کہ حکومت کے احکام کی تعمیل کرنے اور رعایا کو جادۂ وفاداری پر قائم رکھنے کی کہاں تک اس سے توقع کی جاسکتی ہے؟ کوئی بادشاہ یا پارلیمنٹ، ایوانِ بالا ایسے آدمی کو نائب السلطنت یا سفیر مقرر نہیں کرسکتی جس کی نسبت حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے، یا اس کی پالیسی اور احکام سے انحراف کرنے کا ادنیٰ شبہ ہو۔ بیشک یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی قابلیت یا جذبۂ وفاداری کا اندازہ حکومت صحیح طور پر نہ کرسکی ہو، لیکن علیم وخبیر ربّ العالمین کے یہاں یہ بھی احتمال نہیں۔

اگر کسی شخص کی نسبت اس کو علم ہے کہ یہ میری وفاداری اور اطاعت شعاری سے بال برابر تجاوز نہیں کرے گا، تو محال ہے کہ وہ آگے چل کر اس کے خلاف ثابت ہوسکے، ورنہ علمِ الٰہی کا غلط ہونا لازم آتا ہے، اور یہ غیر ممکن اور محال ہے۔ یہیں سے عصمت انبیاء کرام علیہم السلام کا مسئلہ واضح ہوجاتا ہے۔ اور پھر جب انبیاء علیہم السلام ادنیٰ عصیان سے پاک ومنزہ ہیں، تو شرک اور اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں بغاوت کرنے کا امکان کہاں باقی رہ سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ کے انتخاب میں کسی قسم کی غلطی کا کوئی امکان نہیں ہوتا، اور نہ کسی ادنی فروگذاشت کا امکان۔ پھر اس کے ساتھ یہ مسلّم ہے کہ پیغمبر تو اللہ تعالیٰ کے کامل وفادار ہوتے ہیں، دنیا میں منشائے ایزدی کی تکمیل ان کا فرض ہوتا ہے۔ دیکھیں! سیدنا مسیح علیہ السلام روزِ قیامت بڑے زور وشور سے عاجزانہ انداز پر کہیں گے، جب ان سے سوال ہوگا: ﴿وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ﴾ [المائدۃ:۱۱۶] (جب اللہ کہے گا: اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ دو معبود بناؤ؟ وہ کہیں گے: آپ کی ذات پاک ہے، میری مجال نہیں تھی کہ میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔) پھر کہتے ہیں: ﴿مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ﴾ [المائدۃ:۱۱۷] (میں نے ان لوگوں سے اس کے سوا کوئی بات نہیں کہی جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا، اور وہ یہ کہ: اللہ کی عبادت کرو، جو میرا بھی پروردگار ہے، اور تمہارا بھی پروردگار ہے)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: اے معبودِ حقیقی! تیرے لئے ہر قسم کی پاکی کا اقرار کرکے کہتا ہوں کہ میں ایسی گندی بات کیسے کہہ سکتا تھا؟ آپ کی ذات اس سے پاک ہے کہ الوہیت وغیرہ میں کسی کو اس کا شریک کیا جائے، اور جس کو آپ پیغمبری کا منصبِ جلیل عطا فرمائیں اس کی یہ شان نہیں کہ کوئی ناحق بات منہ سے نکالے، پس آپ کی سبوحیت اور میری عصمت دونوں کا اقتضا یہ ہے کہ میں ایسی ناپاک بات کبھی نہیں کہہ سکتا، اور سوچ بھی نہیں سکتا، اور سب دلائل کو چھوڑ کر آخری بات یہ ہے کہ آپ کے ''علمِ محیط'' سے کوئی چیز باہر نہیں ہوسکتی ...... الخ۔

اس سے نصاریٰ کے اس دعوے کا بھی رد ہوگیا جو کہتے تھے کہ ابنیت اور اُلوہیتِ مسیح کا عقیدہ ہم کو خود مسیح نے تعلیم فرمایا تھا، اور ان مسلمانوں کو بھی نصیحت کردی گئی جنہوں نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ ہم سلام کے بجائے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سجدہ کیا کریں، تو کیا حرج ہے؟ اور اہلِ کتاب پر بھی تعریض ہوگئی، جنہوں نے اپنے اَحبار و رُہبان کو خدائی کا درجہ دے رکھا تھا، کہ وہ جس چیز کو چاہئیں حلال کردیں، اور جس چیز کو چاہیں حرام قرار دیدیں۔

بدقسمتی سے روافض، باطنیہ، اسماعیلیہ وغیرہ کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ ہمارے اماموں کو بھی یہی حلت وحرمت کا اختیار مکمل حاصل ہے، اور وہ اپنے اماموں کو انبیاء علیہم السلام سے اعلیٰ وافضل اور معصوم سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ''تحفہ اثناعشریہ'' وغیرہ کتب کا مطالعہ ضروری ہے۔

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ﴾ سے ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ تک:

کسی بشر کے لئے یہ زیب نہیں دیتا، یا اس کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطاء کرے، اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کو چھوڑ کر میرے پرستار بن جاؤ، یعنی میری بھی پوجا کرو۔ یہاں کتاب سے مراد آسمانی صحیفہ، نبوت اور رسالت کا ایک ہی مطلب ہے۔ حکم سے مراد حکمت وسنت اور حکومت ہے۔

پس ظاہر ہے کہ نبوت اور غیر اللہ کی عبادت کا حکم دو متضاد چیزیں ہیں۔ اوّل کا مطلب توحید ہے، دوم کا مطلب شرک ہے، اور یہ دونوں ہرگز جمع نہیں ہوسکتے۔

﴿وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ﴾ بلکہ وہ، یعنی پیغمبر تو یہ کہتے ہیں کہ تم ربانی بن جاؤ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا بندہ بن جاؤ، خالص اس کی بندگی کرو، ہر قسم کے شرک سے بیزار ہوجاؤ۔ ربّانی وہ شخص ہے جو ربّ کی طرف منسوب ہو، یعنی اللہ والا۔ "الف" اور "نون" کو مبالغہ کے لئے زیادہ کیا گیا ہے، جیسے لحیانی بڑی داڑھی والا، رقبانی بڑی موٹی گردن والا۔

ربانی کے معنی کیا ہیں؟ مختلف علماء کرام نے مختلف معانی بیان کئے ہیں۔ مثلاً کسی چیز کی تکمیل کرنے والا، لوگوں کی علمی تربیت کرنے والا، عالمِ باعمل، علم وحکمت کا جامع، اخلاص وعمل کا جامع۔ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ قال: اَلْعُلَمَاءُ وَالْفُقَهَاءُ. مراد ہیں، لوگوں کو تعلیم دینے والا۔

بہرحال! یہ معانی اگرچہ متعدد ہیں، مگر مآل سب کا ایک ہے، جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ظاہر فرمایا۔

جس روز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا طائف کے مقام پر انتقال ہوا، تو حضرت محمد بن الحنفیہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے صاحبزادے نے کہا: اَلْيَوْمَ مَاتَ رَبَّانِيُّ هٰذِهِ الْأُمَّةِ. آج اس اُمت کے ایک بہت بڑے ربانی عالم دنیا سے رخصت ہوگئے، جس کا لقب تھا: حِبرُ الأمة. رضي الله عنه

﴿بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾ بلکہ وہ نبی تمہیں یہ کہتے ہیں کہ تم ربانی اور اللہ والے بن جاؤ، اور واحد لاشریک ربّ کی محبت واطاعت اور صرف اس کی عبادت وبندگی میں فنا ہوجاؤ، اس لئے کہ تم دوسروں کو اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تعلیم دیتے ہو، اور اس وجہ سے بھی کہ تم خود بھی اس کتابِ الٰہی کا درس دیتے۔ یعنی خود

بھی پڑھتے رہتے ہو، اور جب تم کتاب کو پڑھتے پڑھاتے، اور جانتے سکھاتے ہو، اس لئے ربانی ہو جاؤ، اور تم میں جو پہلے دینداری تھی کتاب کا پڑھنا اور سکھانا وہ اب تم میں باقی نہیں رہی، کیونکہ یہود نے تمام دینی اقدار کو ضائع کیا تھا، اب میری صحبت میں وہی کمال حاصل کرو، قرآن حکیم پڑھو اور پڑھاؤ، اور سیکھو اور سکھاؤ، اور عالم، حکیم، فقیہ، عارف، مدبّر، متقی اور پکے خدا پرست بن جاؤ۔ اور یہ بات اب تو قرآن حکیم پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

﴿وَلَا يَأْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا﴾ اور نہ اس کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کو ربّ بنانے کا تم کو حکم دے۔

''وَلَا يَأْمُرَكُمْ'' کا عطف ''يَقُوْلَ'' پر ہے، اور مَا كَانَ لِبَشَرٍ میں جو نفی کے معنی ہیں، اس کی تاکید کے لئے حرف ''لا'' کو زائد کر دیا گیا ہے۔ قریش اور صابی فرقہ ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے، یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے تھے۔ اس کی تردید میں فرمایا: کسی ایسے شخص کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنایا ہو، اپنی عبادت کا، یا ملائکہ و انبیاء علیہم السلام کو اولادِ خدا کہنے کا حکم دینا جائز نہیں ہے (ممکن بھی نہیں) بلکہ وہ نبی ان چیزوں سے سختی کے ساتھ منع کرتے ہیں۔

﴿اَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ استفہام تعجب و انکار کیلئے ہے۔ یعنی تعجب ہے کہ وہ تم کو کفر کا حکم دے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، بعد اس کے کہ اگر بالفرض تم اس کی تعلیم و تلقین سے اگر موحّد اور مسلمان بن جاؤ، اور یہ عام معنی کے لحاظ سے بھی صحیح ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا کام اشاعتِ توحید ہی ہے، اور کافروں کو مسلمان و موحّد بنانا ہے، نہ کہ مسلمان و موحّد لوگوں کو (العیاذ باللہ) کافر و مشرک بنانا، یہ تو شیطان کا پیشہ اور کام ہے۔

واضح ہو کہ عبادت و اطاعت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، غیر اللہ کے لئے قطعاً حرام اور شرک ہے، مگر اطاعت عام ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور والدین، ائمہ، علماء وغیرہ سب کے لئے ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ
جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ

ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰى ذٰلِكُمۡ اِصۡرِىۡ ؕ قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا ؕ قَالَ فَاشۡهَدُوۡا
وَاَنَا مَعَكُمۡ مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنۡ تَوَلّٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓٮِٕكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۸۲﴾

ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو، جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام (علیہم السلام) سے پختہ عہد لیا کہ جب میں نے تم کو کتاب اور حکمت دی، پھر آیا تمہارے پاس رسول تصدیق کرنے والا اس کی جو تمہارے پاس ہے، البتہ ضرور اس پر ایمان لاؤ گے، اور البتہ ضرور اس کی مدد کرو گے، فرمایا اللہ تعالیٰ نے: کیا اقرار کیا تم نے؟ اور لیا تم نے اس بات پر میرا پختہ عہد؟ انہوں نے کہا: ہم نے قرار کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: گواہ ہو جاؤ، اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہی دینے والوں میں سے ہوں۔ ﴿۸۱﴾ پس جس نے اس کے بعد روگردانی کی، پس وہی لوگ نافرمان ہیں ﴿۸۲﴾

معارف ومنازل

عہد کی تعریف یہ ہے کہ عہد اس پختہ قول واقرار کا نام ہے جو فریقین کے درمیان باہمی بات چیت سے طے ہوتا ہے، جس پر فریقین کو قائم رہنا ضروری ہوتا ہے۔ بخلاف وعدہ کے، کہ وہ صرف جانبِ واحد سے ہوتا ہے، یعنی عہد عام ہے، اور وعدہ خاص ہے۔ وعدہ خلافی ہو، یا عہد کی خلاف ورزی، دونوں گناہ کبیرہ ہیں۔ گزشتہ آیات میں عہد شکنی کی سزا مکمل بیان ہوئی، جو پانچ وعیدوں پر مشتمل تھی۔

اللہ تعالیٰ سبحانہ کے تین عہد:

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے تین عہد لیے ہیں: ایک عہد عمومی، جس کا ذکر سورۃ اعراف میں ہے: ﴿وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ وَاَشۡهَدَهُمۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰى ﴾. [الأعراف:۱۷۲] (اور جب تمہارے پروردگار نے آدم کے بیٹوں کی پشت سے ان کی ساری اولاد کو نکالا تھا، اور ان کو خود اپنے اوپر گواہ بنایا تھا (اور پوچھا تھا کہ:) کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا تھا کہ: کیوں نہیں؟)۔ اس عہد کا نام "عہدِ الست" ہے۔ اس عہد کا مقصد یہ تھا کہ تمام بنی نوع انسان اللہ تعالیٰ کی ہستی، اور ربوبیتِ عامہ پر اعتقاد رکھے، کیونکہ دین کی ساری عمارت کی سنگ بنیاد یہی ہے۔ جب تک یہ اعتقاد نہ ہو، مذہبی میدان میں عقل وفکر کی رہنمائی کوئی نفع نہیں پہنچا سکتی۔ مزید تفصیل اپنے مقام پر آنے والی ہے۔

دوسرے عہد کا ذکر ﴿وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكۡتُمُوۡنَهٗ ﴾

[آل عمران:۱۸۷] (اورجب اللہ نے اہلِ کتاب سے یہ عہد لیا تھا کہ: تم اس کتاب کو لوگوں کے سامنے ضرور کھول کھول کر بیان کروگے، اور اس کو چھپاؤ گے نہیں) سے کیا گیا۔ یہ عہد مخصوص ہے، یعنی صرف اہلِ کتاب کے علماء سے لیا گیا تھا کہ وہ حق کو نہ چھپائیں، بلکہ صاف اور واضح طور پر بیان کریں۔

تیسرے عہد کا بیان اسی آیت کریمہ میں ہے، جس کی تفصیل آئندہ سطور میں آنے والی ہے۔

میثاق سے کیا مراد ہے، اور یہ کہاں ہوا؟

حکیم الامت حضرت شاہ محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میثاق یا تو عالمِ ارواح میں ہوا، یا عالمِ دنیا میں بذریعۂ وحی ہوا، دونوں احتمال ہیں۔ [بیان القرآن] یہ میثاق کیا ہے؟ اس کی تصریح تو قرآن حکیم نے کردی ہے، لیکن یہ میثاق کس چیز کے بارے میں لیا گیا ہے؟ اس میں اقوال مختلف ہیں۔ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ یہ میثاق عمومی نہیں ہے، بلکہ مخصوص ہے ذات اقدس خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ۔ یعنی یہ عہد اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام علیہم السلام سے صرف سید الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں لیا تھا، کہ اگر وہ خود ان کا زمانہ پائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائیں، اور ان کی تائید و نصرت کریں، اور اپنی اپنی امتوں کو بھی یہی ہدایت کرجائیں۔

امام قتادہ، حسن بصری اور حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ یہ میثاق عمومی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اللہ تعالیٰ نے سارے انبیاء کرام علیہم السلام سے لیا تھا، کہ ہر نبی دوسرے نبی کی تصدیق و تائید اور نصرت کرے گا۔

اس دوسرے قول کی تائید سورت احزاب کی آیت کریمہ میں ہے: ﴿وَإِذۡ أَخَذۡنَا مِنَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ مِيثَٰقَهُمۡ وَمِنكَ وَمِن نُّوحٖ وَإِبۡرَٰهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ٱبۡنِ مَرۡيَمَۖ وَأَخَذۡنَا مِنۡهُم مِّيثَٰقًا غَلِيظٗا﴾.

[الأحزاب:۷] (اور جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا تھا، اور تم سے بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی۔ اور ہم نے ان سے نہایت پختہ عہد لیا تھا) کیونکہ یہ عہد ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کے لئے لیا گیا تھا۔ [تفسیر احمدی]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ تفسیر اوپر کی تفسیر کے خلاف ہے، بلکہ یہ اس کی تائید ہے، اور دونوں مراد لی جاسکتی ہیں۔ اس لئے حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے لڑکے کی روایت مثل روایت حضرت علی و حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے بھی مروی ہے۔ [ابن کثیرؒ]

تمام انبیاء علیہم السلام سے ایمان ونصرت کا مطالبہ:

بظاہر یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو علیم وخبیر ہے، ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی نبی کی موجودگی میں تشریف نہیں لائیں گے، پھر تو انبیاء کرام علیہم السلام کے ایمان لانے اور نصرت کا کیا مطلب وفائدہ؟

☆ ذرا غور کرنے سے فائدہ واضح طور پر معلوم ہوگا کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے ارشاد پر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والاصفات پر ایمان لانے کا پختہ ارادہ کریں گے، تو اسی وقت سے ثواب پائیں گے۔

☆ دوم انہیں اچھی طرح معلوم ہوجائے گا کہ ہمارے سب کا قابلِ قدر سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اور وہ بحیثیتِ خاتم النبیین سب سے اخیر میں تشریف لائیں گے۔

☆ سوئم یہ کہ وہ اپنی اپنی اُمتوں کو اس پر ایمان لانے اور ان کی نصرت کی ہدایت جاری کریں گے۔

☆ چہارم یہ کہ قیامت تک آنے والے بنی نوع انسان کو خبردار کرنا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی خاتم الانبیاء ہوں گے، اور سارے انبیاء کرام علیہم السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس عظیم منصب کی پہلے سے تصدیق کر چکے ہیں۔

☆ پنجم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے یہود ونصاریٰ پر واضح کرنا ہے کہ جب تمہارے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام اس آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لاچکے، اور ان کی تصدیق ونصرت کا وعدہ کر چکے، تو تمہارے لئے اور کوئی چارہ کار نہیں سوائے اس پر ایمان لانے اور تصدیق کرنے کے، ورنہ جس طرح تم اس پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے کافر شمار ہوجاؤ گے، اسی طرح اپنے اپنے نبیوں کی بات نہ ماننے کی وجہ سے بھی کافر ہوجاؤ گے، کیونکہ اس نبی کے نہ ماننے کی وجہ سے تم اپنے نبیوں کے ایمان کے منکر ہوگئے۔

سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت عامہ جامعہ:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ﴾ [الآیۃ] ان آیات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام علیہم السلام سے یہ پختہ عہد لیا کہ جب تم میں سے کسی نبی کے بعد دوسرے نبی آئیں، جو یقیناً پہلے انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابوں کی تصدیق کرنے والے ہوں گے، تو پہلے نبی کے لئے ضروری ہے کہ پچھلے نبی کی سچائی اور نبوت پر ایمان خود بھی لائیں، اور دوسروں کو بھی اس کی ہدایت کریں۔

قرآن حکیم کے اس قاعدہ کلیہ سے روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بھی اسی طرح کا عہد انبیاء کرام علیہم السلام سے لیا ہوگا، جیسا کہ علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ: "التعظیم

والمنة فی لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ" میں فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں رسول سے مراد حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اور کوئی نبی بھی ایسا نہیں گزرا جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والا صفات کے بارے میں تائید و نصرت، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کا عہد نہ لیا ہو، اور کوئی بھی ایسا نبی نہیں گزرا جس نے اپنی اُمت کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے اور تائید و نصرت کی ہدایت اور وصیت نہ کی ہو۔ اور اگر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت انبیاء کرام علیہم السلام کے زمانے میں ہوتی، تو ان سب کے نبی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہوتے، اور وہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت میں شمار ہوتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان محض نبی الامت ہی کی نہیں ہے، بلکہ نبی الانبیاء کی بھی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر آج موسیٰ (علیہ السلام) بھی زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ ہوتا۔ اور ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ جب عیسیٰ (علیہ السلام) آسمان سے نازل ہوں گے، تو وہ بھی قرآن حکیم اور تمہارے نبی ہی کے احکام پر عمل کریں گے۔ [ابن کثیر]

اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت "عامہ اور شاملہ" ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت میں سابقہ تمام شریعتیں مدغم ہیں۔ اس بیان سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد: "بُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ كَافَّةً" کا صحیح مفہوم بھی واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے، کہ اس حدیث کا مطلب یہ سمجھنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا زمانہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت سے پہلے شروع ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: "كُنْتُ نَبِيًّا وَّآدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ"۔

محشر میں شفاعتِ کبریٰ کے لئے پیش قدمی کرنا، اور تمام اولادِ آدم کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جھنڈے تلے جمع ہونا، اور شبِ معراج میں بیت المقدس کے اندر تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی امامت کرانا سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی سیادتِ عامہ اور امامتِ عظمیٰ کے آثار میں سے ہے۔

﴿لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ﴾ جب میں نے تمہیں کتاب اور حکمت، علم و دانشمندی عطاء کی۔

﴿ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ﴾ پھر آ گئے تمہارے پاس رسول۔ رسول سے مراد ہر رسول بھی ہے، جیسے پہلے بیان ہوا، اور اس سے مراد بڑے رسول بھی ہیں، یعنی سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ اس اعتبار سے تنوین تعظیم کے لئے ہوگی، یعنی عظیم الشان رسول آ گئے۔

﴿مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ﴾ وہ ان کتابوں کی تصدیق کرنے والے ہوں جو تمہارے پاس ہیں۔

پس تمہارا فرض ہے کہ...... ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ ضرور ان پر ایمان لاؤ گے، اور ضرور ان کی نصرت کرو گے۔

﴿قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ﴾ اللہ تعالیٰ نے دریافت فرمایا: کیا تم اقرار کرتے ہو؟

﴿وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ﴾ اور تم نے اس بات پر میرا پختہ عہد لیا؟ اِصْرٌ بوجھ کو کہتے ہیں، جیسے سورۂ بقرہ میں فرمایا: ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ [البقرۃ: ۲۸۶] یہاں اِصْر سے مراد پختہ عہد ہے۔ اس کو مِيْثَاقًا غَلِيْظًا بھی کہتے ہیں۔ جس طرح بوجھ کو اٹھانا ضروری اور تکلیف دہ ہوتا ہے، یہی حال میثاق و پختہ عہد کا بھی ہے۔

﴿قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ سارے انبیاء علیہم السلام نے کہا: ہم نے اقرار کیا کہ ہم اس عہد کو پورا کریں گے۔ ہر آنے والے نبی پر خصوصًا خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں گے، اور تائید و نصرت بھی کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم سب گواہ بن جاؤ کہ تم سب نے اقرار کرلیا ہے، اور اس بات پر میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں، اور پختہ عہد کرنے کے بعد:

﴿فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ تمہارے متبعین میں سے اگر کوئی عہد شکنی کرے، اور عہد کی پابندی نہ کرے تو ایسے لوگ فاسق اور نافرمان ہوں گے، کیونکہ عہد شکنی گناہ کبیرہ ہے۔ پس اس کا مرتکب فاسق، نافرمان اور کافر ہی ہوگا۔ انبیاء کرام علیہم السلام تو معصوم ہوتے ہیں۔ ان کے حق میں عہد شکنی کا کوئی ادنیٰ تصور بھی نہیں ہوسکتا۔

البتہ! یہاں ان کی اُمت کے لوگوں کی عہد شکنی و فسق مراد ہے، خاص کر اہلِ کتاب، جنہوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے مواثیق و عہود کی تکذیب کر کے عہد شکنی پر اتر آئے۔ یہاں روئے سخن اگرچہ اہل کتاب کی طرف ہے، مگر اس آخری اُمت کے لوگوں کو بھی خبردار کیا جارہا ہے کہ اہلِ کتاب کے نقش قدم پر چل کر تم بھی نقضِ عہد کا ارتکاب نہ کرو، اور ہر قسم کے فسق و فجور سے بالکلیہ (مکمل) اجتناب کرو۔

صاحب مظہریؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت صراحۃً بتارہی ہے کہ سارے انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی اُمتوں سے سب سے یہ عہد لیا گیا تھا، مگر پیشواؤں کے ذکر کے بعد متبعین (اُمتیوں) کے ذکر کی ضرورت نہ رہی، اس لئے

پیشواؤں کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا۔

﴿فَمَنْ تَوَلّٰى﴾ کا جملہ اس کی دلیل ہے کہ یہ جملہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں نہیں ہے، کیونکہ وہ معصوم ہیں، بلکہ متبعین کے بارے میں ہے، جیسا ابھی بیان ہوا۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾

ترجمہ: کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرتے ہیں؟ حالانکہ اسی اللہ تعالیٰ کے لئے فرمانبرداری کرتے ہیں وہ جو آسمانوں میں ہیں، اور وہ جو زمین میں ہیں، خوشی اور ناخوشی سے، اور اسی کی طرف سب لوٹائے جائیں گے ﴿۸۳﴾ اے پیغمبر! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کہہ دیجئے: ہم ایمان لائے ہیں اللہ تعالیٰ پر، اور اس چیز پر جو اتاری گئی ہے ہمارے اوپر، اور اس چیز پر جو اتاری گئی ہے (حضرت) ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) پر، اور ان کی اولاد پر، اور جو چیز دی گئی ہے موسیٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) کو، اور جو چیز دی گئی ہے سب نبیوں کو ان کے ربّ کی طرف سے، ہم تفریق نہیں کرتے کسی ایک کے درمیان، اور ہم اسی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں ﴿۸۴﴾۔

معارف ومنازل

توحید اور رسالت کے بعد دینِ اسلام کی حقانیت اور اس کی حقیقت کا بیان ہو رہا ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور مکمل فرمانبرداری کا نام ہے، اور یہی تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا دین ہے، جس کے متعلق میثاق ومواعید وعہود کا تذکرہ ابھی بیان ہوا، اور یہی اسلام تمام کائنات کا واحد و یکتا اور برگزیدہ دین ہے۔ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی دین کی دعوت دینے اور اس کو عام کرنے کیلئے مبعوث ہوئے ہیں، جس کی طرف سارے انبیاء کرام علیہم السلام دعوت دیتے چلے آئے، اور آخرت کی سعادت ونجات کا دارومدار یہی دینِ اسلام ہے۔

پس جو اس دینِ حنیف سے منحرف ہوگا، وہی تو فاسق ہی ہوگا، تو کیا فاسق لوگ اسلام کو چھوڑ کر کوئی متبادل اور

باطل دین کے طالب اور متلاشی رہتے ہیں؟ پس انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ خسارے، اور سراسر نقصان میں رہیں گے فرمایا:

﴿أَفَغَيْرَ دِينِ اللّٰهِ يَبْغُونَ﴾ کیا یہ لوگ آنے والے رسول ﷺ پر ایمان لانے اور ان کی تائید ونصرت کا پختہ عہد و پیان کرنے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کے دین کو چھوڑ کر کسی اور دین کو طلب کرتے ہیں؟ اور اپنے عہد پیان کا پاس نہیں کرتے؟ کہ جس دین کی انہیں دعوت دی جارہی ہے اس کو بخوشی قبول کریں، حالانکہ زمین وآسمان کی کل مخلوقات حق تعالیٰ ہی کے سامنے سر تسلیم و نیاز خم کئے ہوئے سرافگندہ ہیں، کوئی خوشی سے کوئی ناخوشی سے، اور قیامت کے روز سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

فائدہ:

احکام کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک تشریعی، اختیاری، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، نکاح، طلاق، بیع وشرا، وغیرہ، جن میں بندے کو مکمل اختیار حاصل ہے۔ اور یہ سب کچھ اس کی مرضی پر ہورہا ہے۔

(۲) اور دوسری تکوینی، غیر اختیاری، جس میں بندے کے اختیار کا دخل نہیں ہے، جیسے موت، بیماری، قحط سالی، زلزلہ وغیرہ۔

احکامِ تکوینیہ کے تو سب مسخر ہیں، کوئی اس کے خلاف کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ ''کُرْهًا'' بمعنی زبردستی، ناخوشی۔ اس سے یہی تسخیری اطاعت مراد ہے۔ اور ''طَوْعًا'' بمعنی خوشی۔ اس سے احکامِ تشریعیہ کی اختیاری اطاعت مراد ہے۔ اور خوشی سے اطاعت کرنے والے فرشتے ہیں، اور جن وانس میں ایماندار لوگ ہیں۔ ارشاد ہوا:

﴿قُلْ آمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ اے پیغمبر! (ﷺ) آپ کہہ دیجئے کہ جس دینِ اسلام کی میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں وہی تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ پر، اور اس چیز پر جو اتاری گئی ہم پر، یعنی قرآن کریم، اور اس چیز پر جو اتاری گئی حضرت ابراہیم پر، اور حضرت اسماعیل پر، اور حضرت اسحاق پر، اور حضرت یعقوب علیہم السلام پر، اور اس کی اولاد پر، جن کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنایا، اور جن پر آسمانی کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے۔

﴿وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ﴾ [الآیہ] اور اس پر بھی جو موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کو دی گئی، اور اس چیز پر بھی

جوتمام پیغمبروں علیہم السلام کو ان کے پروردگار کی طرف سے دی گئی۔ اور ہم انبیاء علیہم السلام میں تفریق نہیں کرتے، جیسا کہ یہود و نصاریٰ کا حال ہے، کہ بعض کی تصدیق اور بعض کی تکذیب کرتے ہیں، ہم سارے پیغمبروں علیہم السلام کو برحق سمجھتے ہیں، اور سب کی یکساں تصدیق کرتے ہیں کہ سب کا دین ایک ہی اسلام ہے، اور احکامِ شرعیہ میں جو اختلاف ہے وہ وقتی، عصری اور ملک وطن کی وجہ سے ہے، سرچشمہ سب کا ایک ہی ہے، اور ہم سب اسی ذاتِ واحد لاشریک لہٗ کے ماننے والے فرمانبردار ہیں۔ ﴿وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾ [البقرۃ: ۱۳۳] (ہم صرف اسی کے فرمانبردار ہیں) ﴿وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ﴾ [البقرۃ: ۱۳۹] (ہم اپنی بندگی اسی کے لئے خالص کرنے والے ہیں) ﴿وَنَحْنُ لَهُ عٰبِدُونَ﴾ [البقرۃ: ۱۳۸] (ہم صرف اسی کی عبادت کرنے والے ہیں) ہمارا نظریہ واعتقاد ہے۔ الحمد للہ

❁ ❁ ❁

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٨٥﴾ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٦﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿٨٧﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿٨٨﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٨٩﴾

ترجمہ: اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا، پس اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، اور وہ شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا ﴿٨٥﴾ اللہ تعالیٰ کس طرح راہ بتلائے گا اس قوم کو جنہوں نے کفر کیا ایمان کے پیچھے، اور انہوں نے گواہی دی کہ بیشک رسول برحق ہے، اور ان کے پاس کھلی نشانیاں آئیں، اور اللہ تعالیٰ نہیں راہ دکھاتا اس قوم کو جو ظلم کرنے والی ہو ﴿٨٦﴾ یہی لوگ ہیں جن کا بدلہ یہ ہے کہ بیشک ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے، اور فرشتوں کی، اور سب لوگوں کی ﴿٨٧﴾ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور ان سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا، اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی ﴿٨٨﴾ ہاں! مگر وہ لوگ جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی، اور اچھے کام کئے، تو اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا اور بڑا مہربان ہے۔ ﴿٨٩﴾

☆ ☆ ☆

معارف ومنازل

شروع سورت سے توحید ورسالت کی حقانیت کا سلسلہ چلا تھا۔ آیت ۱۸ میں ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور فرشتے اور سب اہلِ علم بھی راستی اور انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں کہ اس زبردست حکیم وعلیم کے سوا فی الواقع کوئی خدا نہیں ہے۔ اسی طرح یہ گواہی بھی سابقہ گواہی کا حصہ وتتمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان کے لئے صرف ایک ہی نظامِ زندگی، اور ایک ہی طریقۂ حیات صحیح ودرست ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو اپنا مالک ومعبود تسلیم کرے، اور اس کی بندگی وغلامی میں اپنے آپ کو بالکل سپرد کرے، اور اس کی بندگی بجالانے کا طریقہ خود ایجاد نہ کرے، بلکہ اس نے پیغمبروں علیہم السلام کے ذریعہ سے جو ہدایت بھیجی ہے، ہر کمی وبیشی کے بغیر صرف اسی کی پیروی کرے، اسی طرزِ فکر وعمل کا نام ''اسلام'' ہے۔

اور یہ بات سراسر بجا ہے کہ کائنات کا خالق ومالک اپنی مخلوق اور بندوں کے لئے اس اسلام کے سوا کسی دوسرے طرزِ عمل کو جائز تسلیم نہیں کرتا، اس لئے فرمایا کہ اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اگر اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا، اور آخرت میں وہ ناکام ونامراد رہے گا۔ مسند احمد میں ہے سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن نیک اعمال آئیں گے، نماز آکر کہے گی کہ اے اللہ! میں نماز ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تو اچھی چیز ہے، اور صدقہ آکر کہے گا: اے اللہ! میں صدقہ ہوں، جواب ملے گا: تو بھی خیر پر ہے۔ روزہ آکر کہے گا: میں روزہ ہوں، جواب ملے گا: تو بھی بہتری پر ہے۔

پھر اسی طرح دیگر اعمال بھی آتے جائیں گے، اور سب کو یہی جواب ملتا رہے گا۔ پھر اسلام آئے گا، اور کہے گا: اے اللہ! تو سلام ہے، اور میں اسلام ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو خیر ہے، آج تیرے ہی باعث میں انعام دوں گا، اور تیرے ہی باعث مؤاخذہ کروں گا۔ یہ حدیث صرف مسند احمد میں ہے۔ اور اس کے راوی حسن کا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع نہیں ہے۔ [ابن کثیر]

اسلام کی تعریف اور اس کا مدارِ نجات ہونا:

اسلام کے لفظی معنی اطاعت وفرمانبرداری کے ہیں، جیسے ارشاد ہے: ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ

﴿اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ [البقرة:۱۳۱] (اور جب اس کے ربّ نے اس سے کہا کہ تسلیم ہو جا، اس نے کہا کہ میں ربّ العالمین کے سامنے تسلیم ہو چکا ہوں)۔ اور اصطلاح میں خاص اس دین کی اطاعت کا نام ''اسلام'' ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں علیہم السلام کے ذریعہ انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے، کیونکہ اصولِ دین تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتوں میں ایک ہی ہیں۔

پھر لفظِ اسلام کبھی تو اس عام مفہوم کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اور کبھی صرف اس آخری شریعت کے لئے بولا جاتا ہے جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی۔ قرآن کریم میں یہ دونوں طرح کے اطلاقات موجود ہیں۔

انبیاء سابقین علیہم السلام کا اپنے آپ کو مسلم کہنا، اور اپنی اُمت کو اُمتِ مسلمہ کہنا بھی نصوصِ قرآن سے ثابت ہے، اور اس نام کا حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کے ساتھ مخصوص ہونا بھی مذکور ہے۔ ارشاد ہے: ﴿هُوَ سَمّٰىكُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَفِیۡ هٰذَا﴾۔ [الحج:۷۸] (اللہ نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے، اس سے پہلے، اور اس دین میں)۔

خلاصہ یہ کہ ہر دینِ الٰہی جو کسی نبی و رسول کے ذریعہ دنیا میں آیا اس کو بھی اسلام کہا جاتا ہے، اور اُمت محمدیہ کے لئے یہ خاص لقب کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ پس اس جگہ خواہ اسلام کا مفہوم عام مراد لیں، یا مخصوص اُمت محمدیہ کا دین مراد لیں، نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد صرف وہی دین اسلام کہلائے گا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ دنیا کو پہنچا ہے۔ وہی تمام انسانوں کے لئے مدارِ نجات ہے، کیونکہ اس دینِ محمدی اور قرآن حکیم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسلام سے سابقہ تمام ادیان و شرائع منسوخ ہو گئے۔

آیت کریمہ مذکورہ میں اسی کے متعلق فرمایا گیا کہ اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین جو شخص اختیار کرے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں ہے۔ اس کی تفصیل ﴿اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ﴾ کے تحت گزر چکی ہے۔

﴿كَیۡفَ یَهۡدِی اللّٰهُ قَوۡمًا كَفَرُوۡا بَعۡدَ اِیۡمَانِهِمۡ وَشَهِدُوۡۤا اَنَّ الرَّسُوۡلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الۡبَیِّنٰتُ وَاللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ جنت کا راستہ کیسے دکھائے گا ایسے لوگوں کو جنہوں نے نعمتِ ایمان پالینے کے بعد پھر کفر اختیار کیا، حالانکہ وہ خود اس بات پر گواہی دے چکے ہیں کہ یہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برحق اور سچا ہے، اور ان کے پاس روشن نشانیاں بھی آچکی ہیں، یعنی قرآن کریم، اور معجزات سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں یہودی علماء جان چکے تھے، اور ان کی زبانوں تک سے اس امر کی شہادت ادا ہو چکی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی برحق

ہیں، اور جو قرآن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لائے ہیں یہ وہی کتاب اور برحق تعلیم ہے جو پچھلے انبیاء کرام علیہم السلام لاتے رہے ہیں۔

اس کے باوجود وہ ضد وعناد کی وجہ سے منکر ہو گئے، اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا، اور ان کے ظلم کا صحیح بدلہ یہی ہے کہ وہ لعنتی ہوئے۔

﴿أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ ......تا...... وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ﴾ ان کا بدلہ تو یہ ہے کہ ان پر خدا تعالیٰ کی پھٹکار ہے (یعنی لعنت) خدا کی رحمتوں سے دوری، اور محرومی، اور اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کی بھی ان پر لعنت ہے، اور ان پر ساری خلقت کی بھی لعنت ہوتی ہے، اور لعنتوں کا ثمرہ یہ ہوگا کہ: ﴿خَالِدِينَ فِيهَا﴾ وہ ہمیشہ ابدالآباد ان لعنتوں میں گرفتار رہیں گے، نہ ان کے شدید عذاب میں تخفیف ہوگی، اور نہ انہیں کوئی مہلت ملی گی۔ وہ ہر سہولت سے محروم رہیں گے۔ پھر اپنے لطف واحسان، رحمت ورأفت کا اظہار فرما کر ارشاد ہوا کہ میری رحمت نہایت وسیع ہے، اور توبہ کا دروازہ بھی بند نہیں، اگر کوئی مرتد ہونے کے بعد اور اس بدترین جرم کے بعد بھی میری طرف جھک کر آنا چاہے، اور تائب ہو کر اپنے اعمالِ بد کی اصلاح پر آمادہ ہو جائے، اور آئندہ کیلئے اصلاح کا عہد کرلے تو درگزر ہو سکتا ہے۔ ؎

باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ ☆ گر کافر ومرتد وبت پرستی باز آ

این درگہہ مادر گہہ نومیدی نیست ☆ صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

علماء کرام فرماتے ہیں کہ اللہ ربّ العزّت دو چیزوں کو کبھی رد نہیں فرماتے ہیں: ایک صلوٰۃ وسلام علیٰ خیر الانام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، دوم صدق دل واخلاص کے ساتھ توبہ وپشیمانی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک انصاری مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو گیا، لیکن پھر اسے پشیمانی ہوئی، اس نے اپنے خاندان والوں کے پاس پیام بھیجا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جا کر یہ عرض کرو کہ میرے لئے توبہ کی گنجائش ہے کہ میں توبہ کرلوں؟ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، اور انصاری کے خاندان والوں نے اس کو اطلاع کر کے بلایا، وہ مدینہ آکر پھر مسلمان ہو گیا، اور مکمل توبہ کی۔ [مظهري بحواله نسائي، ابن حبان، حاكم]

ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے مسند میں، اور عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے مصنف میں حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ حارث بن سوید آکر مسلمان ہوا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد کافر ہو کر اپنے قبیلہ میں لوٹ گیا، یہ آیت اس موقع پر نازل ہوئی۔ اس کے خاندان کے ایک شخص نے یہ آیت لے جا کر اس کو سنادی۔ حارث نے کہا: خدا کی قسم میری دانست میں تم بڑے سچے آدمی ہو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم سے زیادہ سچے ہیں، اور اللہ تعالیٰ دونوں سے بڑھ کر سچے ہیں۔ اس

کے بعد حارث بن سوید واپس آ کر مسلمان ہو گیا، اور اچھا مسلمان ہو گیا۔ رضی اللہ عنہ۔ [مظہری]

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بَعۡدَ اِیۡمَانِہِمۡ ثُمَّ ازۡدَادُوۡا کُفۡرًا لَّنۡ تُقۡبَلَ تَوۡبَتُہُمۡ ۚ وَ اُولٰٓئِکَ
ہُمُ الضَّآلُّوۡنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ مَاتُوۡا وَ ہُمۡ کُفَّارٌ فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡ اَحَدِہِمۡ مِّلۡءُ
الۡاَرۡضِ ذَہَبًا وَّ لَوِ افۡتَدٰی بِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ وَّ مَا لَہُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ ﴿۹۱﴾

ترجمہ: بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اپنے ایمان لانے کے بعد، اور پھر وہ کفر میں بڑھتے رہے، پس ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی، اور یہی لوگ گمراہ ہیں ﴿۹۰﴾ بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، اور اس حالت میں مر گئے کہ وہ کفر کرنے والے ہیں، پس ان میں سے کسی ایک سے ہرگز قبول نہیں کی جائے گی سونے سے بھری ہوئی زمین، اگرچہ وہ اس کا فدیہ دے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب ہے، اور ان کے لئے کوئی بھی مددگار نہ ہوگا ﴿۹۱﴾

معارف ومنازل

حضرت قتادہ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہما کا بیان ہے کہ اس آیت کا نزول یہودیوں کے حق میں ہوا، جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توریت پر ایمان لانے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کو ماننے سے انکار کر دیا، پھر کفر میں اور ترقی کی کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن حکیم کو نہیں مانا۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر آیت کا نزول یہود و نصاریٰ دونوں کے حق میں ہوا۔ ان دونوں نے کفر کرنے کے بعد حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن حکیم کا انکار کیا، اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف وحالات جو ان کی کتابوں میں درج تھے انہیں چھپایا، اور انکار وتکذیب کی، اور کفر میں ترقی کرتے گئے۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آیت کا نزول تمام کفار کے حق میں ہوا، جو اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کا اقرار کرنے کے باوجود شرک کرتے ہیں، پھر کفر میں بڑھ جاتے ہیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام وآسمانی کتابوں کا انکار کرتے رہے ہیں، اور مرتے دم تک کفر پر قائم رہتے ہیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: کفر میں بڑھنے کے معنی یہ ہیں کہ جو جو آیات نازل ہوتی گئیں وہ ان کا انکار

کرتے گئے، جس طرح مؤمن کے ایمان میں تصدیق کرنے سے زیادتی پیدا ہوتی ہے۔

﴿لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ﴾ توبہ کی عدمِ قبولیت کے معنی یہ ہیں کہ ان کو توبہ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ یا یہ کہا جائے کہ جس توبہ میں خلوصِ قلب شامل نہ ہو، اور صرف زبانی توبہ ہو، جیسے منافقوں کی توبہ ہے، تو یہ توبہ قابلِ قبول نہیں ہوتی، ورنہ جب تک توبہ کا دروازہ کھلا ہے توبہ کی قبولیت میں کوئی شک نہیں ہے۔ واللہ اعلم

﴿أُولٰئِكَ هُمُ الضَّالُّوْنَ﴾ اور یہ وہ لوگ ہیں جو راہِ حق سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ﴾ بیشک جن لوگوں نے کفر کیا، اور بغیر توبہ کے کفر کی حالت میں مر گئے، تو ہرگز قبول نہ کیا جائے گا ایسے کسی شخص سے روئے زمین کے برابر سونا، اگرچہ وہ سونے کی اتنی مقدار کو عذاب کے فدیہ اور معاوضہ میں لا کر پیش بھی کردے، اور یہ کہے کہ مجھ کو عذاب سے چھوڑو، تب بھی نہیں قبول کیا جائے گا، اور بدونِ پیش کئے تو پوچھتا ہی کون ہے؟ یعنی اگر بالفرض کافر کے پاس روئے زمین کے برابر سونا موجود بھی ہو، اور بطور فدیہ کے عذاب سے رہائی کے لئے پیش بھی کرنا چاہے، تب بھی قبول نہیں، چہ جائیکہ خالی ہاتھ ہو، اور ایک ذرّہ کا مالک بھی نہ ہو، تو ایسے کو کون پوچھتا ہے؟ پس ایسے لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہوگا، اور کوئی ان کی مدد کرنے والا نہ ہوگا جو ان کو عذاب سے بچا سکے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن خفیف ترین عذاب والے دوزخی سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اگر تیرے پاس روئے زمین کی تمام چیزیں ہوں تو کیا آج کے عذاب سے چھوٹنے کے لئے تو وہ سب چیزیں فدیہ کے طور پر دینے کو تیار ہے؟ دوزخی کہے گا: جی ہاں! پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو جھوٹ بولتا ہے، جب تو آدم علیہ السلام کی پشت میں تھا، اس وقت میں نے تجھ سے اس سے بہت زیادہ آسان چیز کی فرمائش کی تھی، کہ پیدا ہونے کے بعد میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، مگر تو نے بغیر شرک کے اور کچھ نہ کیا۔ [متفق علیہ]

فائدہ:

کافروں کی تین قسمیں ہیں: ایک وہ جو صدقِ دل سے توبہ کر لیتے ہیں۔ ان کے حق ہیں ﴿إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا﴾ فرمایا۔ دوئم وہ جو صدقِ دل سے توبہ نہیں کرتے، اور پیغمبر کی مخالفت میں، نیز کفر میں روز بروز ترقی کرتے ہیں، جیسے یہود مدینہ۔ ان کے لئے ﴿لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ﴾ فرمایا۔ تیسرے وہ جو توبہ کرتے بھی نہیں، اور کفر پر مرجاتے

ہیں۔ان کے بارے میں تین باتیں ارشاد فرمائیں:

(۱) اگر وہ بالفرض روئے زمین کے برابر سونا پیش کریں، فدیہ کے طور پر، تو ہرگز قبول نہ ہوگا۔

(۲) ان کو دردناک عذاب ہوگا، جس میں کسی قسم کی تخفیف نہیں ہوگی۔

(۳) کوئی ان کا مددگار وسفارشی نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سبحانہ ہم پر رحم فرمائے، اور کافروں کے اعمال اور ان کے برے انجام سے حفاظت فرمائے۔آمین

﴿اَلْجُزْءُ الرَّابِعُ﴾

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۹۲﴾

ترجمہ: ہرگز حاصل نہ کرسکو گے نیکی، یہاں تک کہ تم خرچ کرو اس چیز میں سے جسے تم پسند کرتے ہو، اور جو چیز بھی تم خرچ کرو گے بیشک اللہ تعالیٰ اس کو خوب جاننے والا ہے ﴿۹۲﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیت میں ذکر تھا کہ قیامت میں کفار اگر زمین بھر کر سونا فدیہ میں دینا چاہیں تو ہرگز قبول نہ ہوگا۔ اس مناسبت سے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف کرنے کا ذکر آ گیا کہ تم مسلمانوں کو بِرّ، یعنی نیکی کامل، اور اَبرار کا مرتبہ جب ہی حاصل ہوجائے گا جب تم اپنا محبوب وپسندیدہ چیز اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو۔

بِرّ اور بَرّ کی اصطلاحیں قرآن وسنت میں کثرت سے استعمال ہوئی ہیں۔ ''اَلْبَرّ'' اللہ تعالیٰ کا اسم پاک بھی ہے، جیسے ﴿اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِیْمُ﴾ [الطور: ۲۸] جب بندوں کے حق میں استعمال ہو تو اس کی جمع اَبرار ہوگی، صفت کا صیغہ اَلْبَارّ ہے۔ اس کی جمع بَرَرَۃ ہے، جیسے ﴿بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ﴾ [عبس: ۱۶] اَبرار کی مثال ﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ﴾ [الانفطار: ۱۳] ہے۔ ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ [الروم: ۴۱] میں وسیع میدان کے معنی میں ہے، کیونکہ بَرّ ہر اس نیکوکار آدمی کو کہتے ہیں، جس میں وسعت عمل اور وسیع النظر فی ہو۔

''اَلْبِرّ'' بالکسر کے معنی ہیں: انعام، جنت، بھلائی، احسان کی وسعت، سچائی۔ [قاموس]۔ اگر ''بِرّ'' کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو مراد ہوتی ہے: رضا، جنت، رحمت۔ اس وقت اس کے مقابل غضب اور عذاب کا لفظ آتا ہے۔ لیکن اگر ''بِرّ'' کی نسبت بندے کی طرف ہو، تو مراد ہوتی ہے: طاعت، سچائی اور احسان کی وسعت۔ اس وقت اس کے مقابل فجور اور عقوق کا لفظ آتا ہے۔ [مظہری]

حدیث میں اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ. فجور کی ضد ہے۔ قرآن حکیم میں ﴿وَبَرًّا بِوَالِدَتِیْ﴾ [مریم: ۳۲] یا ﴿بَرًّا بِوَالِدَیْهِ﴾ [مریم: ۱۴] میں عقوق کی ضد مراد ہے۔ ''بِرّ'' کی تمام شاخوں اور اقسام کا بیان سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

﴿لَن تَنَالُوا الْبِرَّ﴾ آیت کریمہ میں بِـرّ سے مراد کیا ہے؟ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جنت مراد ہے۔ حضرت مقاتل بن حیان رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تقویٰ مراد ہے۔ بعض علماء کے نزدیک طاعت، اور بعض کے نزدیک بھلائی احسان مراد ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: تم أبرار نہیں ہوسکتے، یعنی کثیر الخیر، وسیع الاحسان اور طاعت گزار نہیں ہوسکتے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: تم کمالِ خیر تک نہیں پہنچ سکتے۔

حقیقت "بِـر" یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا، رحمت اور جنت کو نہیں پہنچ سکتے نہیں پا سکتے۔ اوّل قول پر "اَلْبِرّ" میں لام جنسی، اور دوسری صورت میں عہدی ہوگا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عَلَيْكَ بِالصِّدْقِ فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ. سچائی کو اختیار کرو، کیونکہ سچائی بِـرّ کی طرف لیجاتی ہے، اور بِـرّ جنت کی طرف لیجاتی ہے۔

آدمی برابر سچ بولتا رہتا ہے، اور سچ کی نیت کرتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کو صدیق لکھ دیا جاتا ہے، اور جھوٹ سے پرہیز کرو، اور اس کا ارادہ ترک کرو، کیونکہ جھوٹ برائی کی طرف لیجاتا ہے، اور برائی دوزخ کی طرف لیجاتی ہے۔ آدمی برابر جھوٹ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کو کذّاب لکھ دیا جاتا ہے۔
[مسلم، أحمد، ترمذي]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ صدق کو اختیار کرو، صدق "بِرّ" کے ساتھ ہوتا ہے، اور یہ دونوں جنت میں لیجاتے ہیں، اور کذب سے پرہیز رکھو، کذب فجور کے ساتھ ہوتا ہے، اور یہ دونوں دوزخ میں لیجاتے ہیں۔ [أحمد، ابن ماجه اور بخاري في الأدب]

﴿حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ یہاں تک کہ تم اپنے محبوب مال کا کچھ حصہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو۔ مِنْ تبعیضیہ ہے۔ "تُحِبُّوْن" سے مراد ہر قسم کا پسندیدہ مال ہے۔

لفظ "بِر" اپنے عموم کے اعتبار سے صدقاتِ واجبہ اور نفلیہ سب کو شامل ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ "بِر" سے صدقاتِ واجبہ مراد ہیں، اور بعض کے نزدیک صدقاتِ نافلہ مراد ہیں۔ لیکن جمہور محققین نے اس کے مفہوم کو عام رکھا ہے، صدقاتِ واجبہ، زکوٰۃ وغیرہ، اور صدقاتِ نافلہ دونوں کو شامل ہے، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آئندہ آنے والے واقعات اسی عموم کے حصے ہیں، اور سورۂ بقرہ کے شروع میں ﴿وَمِمَّا

رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ میں بھی عمومی معنی مراد لیا گیا ہے۔

اور قرآن حکیم میں دیگر بہت سے مقامات اور حدیثوں میں بھی یہی عمومی معنی کارفرما ہیں، یہاں تک کہ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ انفاق کا تعلق صرف مال کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ ہر محبوب و پسندیدہ چیز کو، جذبہ محبت و اطاعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا، اور قربانی دینا، سب کو شامل ہے، جیسے علم وصلاحیت کی قربانی، علم و ہنر اور عزت و جاہ، وزارت و سرداری وغیرہ، ہر قسم کی قربانی اس عموم کا حصہ ہے۔

اس لئے آیت کا عمومی مفہوم یہ ہوگا کہ جو صدقہ مال وغیر مال، پھر صدقہ واجبہ اور نفلیہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدق ومحبت اور اطاعت کے جذبہ کے ساتھ خرچ کیا جائے، اعلیٰ درجہ کا ''بِر'' شمار ہوگا، اور اعلیٰ درجہ پر مقبولیت کا شرف حاصل ہو جائے گا، یہاں تک کہ جن کے پاس مال نہیں ہے، وہ اس مقام پر اپنے علم و تدریس تالیف وتصنیف، تبلیغ وفتویٰ، تلاوت واذکار، نوافل و وظائف، صوم وصلوٰۃ، حج وعمرہ، اور دیگر عبادات کے ذریعہ یہ مقام حاصل کر سکتے، اور ''بِر'' کو پا سکتے ہیں۔ یہ سارے معانی إشارۃ النص سے آیت کریمہ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

اعمالِ ''بِر'' کی ایک طویل فہرست جو کہ اکتالیس أبواب البر پر مشتمل تھی، سورۂ بقرہ میں گزر چکی۔ اب آیت کریمہ میں فرمایا جارہا ہے کہ افضل ترین بر (نیکی) اپنی محبوب ومرغوب پسندیدہ چیزوں کو (خواہ مال ہو، یا غیر مال، حتی کہ ایک شخص نے اپنی بیٹی یا بیٹیاں دینی مقاصد کے لئے وقف کرے، جیسے امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مریم علیہا السلام کے واقعہ میں وضاحت کے ساتھ لکھا، اور یہ اعلیٰ درجہ پر ﴿مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ پر منطبق ہے)۔

اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو احکام قرآن کے اوّلین مخاطب ہیں، وہ شب و روز ہر لمحہ اسی انتظار میں رہتے تھے، کہ کسی خیر وبھلائی پر رہنمائی ہوتا کہ اوّلین فرصت میں اسے سینے سے لگا کر اس پر عمل شروع کریں، اور عملی زندگی میں اس کی تعمیل کریں۔ ایک مختصر جھلک مشت نمونۂ خروار ملاحظہ فرمائیں۔

پہلا واقعہ:

حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ اس آیت کے نازل ہونے پر اپنا ایک پسندیدہ باغ جو مسجد نبوی کے متصل بالمقابل واقع تھا، بیرحا نامی باغ بڑا عمدہ، اور اس میں میٹھے پانی کا کنواں بھی تھا، سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی کبھی اس باغ کی سیر فرماتے، وہاں تھوڑی دیر آرام فرماتے، اور کنویں کے پانی سے پیتے، اور وضو فرماتے۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہو کر عرض کرتے ہیں: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرا یہ باغ بڑا قیمتی ہے، اور میرے سارے اموال میں سب سے زیادہ

مجھے محبوب بھی ہے۔ آیت کریمہ میں سب سے محبوب مال کے خرچ کرنے کی ترغیب اور حکم ہے، آپ ﷺ گواہ رہئے کہ میں نے اس باغ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کیا، مجھے اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کی امید ہے۔

جب سرور عالم ﷺ نے ان کی یہ بڑی قربانی اور جذبات کی ساعت فرمائی تو ارشاد فرمایا: بَخٍ بَخٍ ذَاکَ مَالٌ رَابِحٌ. واہ واہ، یہ تو ایک بہت بڑا کارنامہ اور فائدہ مند سودا ہے۔ اب میری رائے یہ ہے کہ آپ اسے اپنے قریبی رشتہ دار غریب عزیزوں پر تقسیم کرو، چنانچہ انہوں نے تعمیل ارشاد کرتے ہوئے اپنے چچازاد بھائیوں اور قرابتداروں میں تقسیم کردیا۔ [متفق علیہ]

دوسرا واقعہ:

اس آیت کے نزول پر حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنی باندی (کنیز) جو آپ کے پورے اموال میں سب سے زیادہ قیمتی تھی، لوجہ اللہ اس کو آزاد فرمایا۔

تیسرا واقعہ:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی خوبصورت رومی کنیز کو بھی آزاد فرمایا۔

چوتھا واقعہ:

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے اپنے گھوڑے جو کہ سبیل نامی مشہور تھا، اور بہت ہی عمدہ اور قیمتی تھا، خدمت اقدس میں حاضر ہوکر صدقہ کیا، پھر آپ ﷺ نے قبول فرمانے کے بعد اس کے بیٹے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو بخش دیا، اور فرمایا: تمہارا صدقہ قبول ہوا، یہ اسامہ رضی اللہ عنہ حقدار ہیں، اور مجاہد بھی ہے، اس لئے میں نے یہ اسے دے دیا۔ علیٰ ہذا القیاس دیگر بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے اپنے محبوب اور پسندیدہ چیزوں کی پیش کش کی، اور آپ ﷺ قبول فرماتے رہے، اور مستحقین کو دیتے رہے۔

مسائلِ ثمانیہ جزئیہ:

(۱) آیت میں لفظ ''مِمَّا'' سے اشارہ ہے کہ تمام پسندیدہ چیزوں کا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا ضروری نہیں، ہے تحصیلِ بِر کے لئے چند محبوب چیزوں کا خرچ کرنا بھی کافی ہے۔ ہاں! اگر کوئی سارا مال خرچ کرے تو جائز ہے، مگر مستحسن نہیں ہے، کیونکہ وہ، اور اس کے بچے محتاج رہیں گے۔

(۲) یہ ذہن میں رہے کہ محبوب چیز کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قیمت میں بھی اعلیٰ ہو۔ حضرت حسن

بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حصولِ بِر کے لئے ایک کھجور کی بخشش بھی کارآمد ہے، بشرطیکہ اخلاص قوی ہو، دارومدار اخلاص پر ہے قلیل وکثیر پر نہیں ہے۔

(۳) قبولیتِ صدقہ ہو یا عام عمل، ایمان واسلام کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح اگر مال حرام یا مشکوک ہو تو ثواب کی کوئی امید نہیں ہے، اگرچہ صدقہ کرنے والا اچھا مسلمان ہو۔

(۴) صدقات کے اوّلین مستحق اپنے عزیز ورشتہ دار ہیں، ان کے دینے میں دوہرا ثواب ہے، ایک ثواب صدقہ کا، دوسرا قرابت وصلہ رحمی کا۔ ان کے بعد دوسرے فقراء کا۔

(۵) جو شخص دوسروں کا مقروض ہو، یا اس کے ذمے فرضی زکوٰۃ واجب الاداء ہو، اس کا صدقہ صحیح نہیں ہے، جب تک کہ وہ فرض سے بری الزمہ نہ ہو۔

(۶) حصولِ بِر یہ ایک خاص عظیم مرتبہ ہے، اس کے لئے محبوب چیزوں کا خرچ کرنا لازم ہے، مگر عام ثواب اس پر موقوف نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص بچا ہوا سالن، روٹی، پرانا چپل، پرانے مستعمل کپڑے، پرانے برتن یا عام معمولی چیز اللہ تعالیٰ کی رضاء میں دیدے، تو بلاشک اس کو ثواب ملے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ قدردان ہے، اس کے ہاں ہر قلیل وکثیر نیکیوں کی پزیرائی منصوص ہے۔

(۷) جیسے کہ بِر اور نیکیوں کے مختلف درجات ہیں، اسی طرح عبادات، طاعات، صدقات وغیرہ کے بھی مختلف درجات ہیں۔ پس تحصیلِ بِر کے لئے صرف محبوب مال خرچ کرنا ضروری نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص غریب ہو، مال کی استطاعت نہ رکھتا ہو، وہ یہ خیرِ عظیم، درجۂ کبیر دوسرے اعمال کے ذریعہ سے، مثلاً نماز، صوم، تہجد، تلاوت قرآن، علم وتحصیل علم، تبلیغ کثرت نوافل، ذکر واذکار سے بھی حاصل کرسکتا ہے۔

(۸) اللہ تعالیٰ کی راہ میں ردّی اور ناکارہ چیزوں کو خرچ کرنا، ایسے لوگوں کے لئے جائز نہیں ہے کہ جن کے پاس عمدہ اور اعلیٰ چیزیں بھی ہوں۔ اگر کسی غریب کے پاس عمدہ چیز کوئی نہ ہو، اور اس کا پورا سرمایہ ایک معمولی ردّی چیز ہو، مثلاً پرانا ٹوٹا ہوا قلم، یا پھٹی ہوئی کوئی چادر، یا قمیص، جو کسی یتیم اور شکستہ دل مفلس کے لئے کارآمد ہو، دے دینا نہایت بیش قیمت ثواب اور باعثِ اجر ومغفرت ہے، کیونکہ اس بیچارے کا یہی سرمایہ ہے۔

ایک بنی اسرائیلی فاحشہ عورت نے ایک کتے کو پانی پلانے سے مغفرت حاصل کی، اور جنتی بن گئی۔ [بخاری]

اور ایک شخص نے اخلاص کے ساتھ ایک قبر پر مٹھی بھر مٹی ڈال دی، اس پر اس کی مغفرت ہوگئی۔ [مرقات المفاتیح]

ایک شخص کا گزر ایک گدھے پر ہوا، اس کی پیٹھ پر زخم تھا، جس کو کوے نوچ رہے تھے، اور خون بہہ رہا تھا۔ اس شخص نے اس کے زخم کو صاف کیا، پھر اپنی پگڑی سے اس پر پٹی باندھ کر مضبوط باندھا، جس سے زخم چھپ گیا، اور وہ گدھا ہشاش بشاش ہو کر مصیبت سے نجات پائی۔ یہ شخص وہاں سے روانہ ہوا، راستے میں حضرت خضر علیہ السلام نے استقبال کر کے اس کو جنت کی خوشخبری سنائی، اور اس کو اس عمل پر مبارک باد دیدی۔ [حکایات أولیاء]

﴿وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾ اس آخری جملہ میں انہی چیزوں پر تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ارادوں اور تمہاری نیتوں سے پورا پورا باخبر اور واقف ہے، کہ کون اس کی رضا کا خواہش مند و طالب ہے، اور کون اپنے نام و نمود اور شہرت کیلئے سب کچھ کر رہا ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایک عورت کھانا کھا رہی تھی، آخری لقمہ منہ میں ڈال دیتے وقت ایک سائل آیا، اور روٹی مانگی، اس نے وہ آخری لقمہ منہ سے نکال کر سائل کو دیدیا۔ ایک دن میدان میں بچے کھیل رہے تھے، نزدیکی پہاڑ سے ایک درندہ بھیڑیا اتر کر اس کے بچے کو اٹھا کر پہاڑ کی طرف بھاگا، سارے بچے دوڑتے ہوئے آکر کہنے لگے کہ پہاڑی بھیڑیا تمہارے بچے کو اٹھا کر لے گیا، اس بیچاری نے روتی ہوئی پریشانی کے عالم میں پہاڑ کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھتی ہے کہ ایک نوجوان اس کے بچے کے ہاتھ تھامے ہوئے کھڑا ہے، وہ کہنے لگے: گھبراؤ مت، یہ تمہارا بچہ صحیح سالم ہے، میں نے اسے بھیڑیئے سے چھڑا لیا، وہ یہ ہے۔ عورت نے خوش ہو کر اللہ کا شکر ادا کیا، اور کہنے لگی: تم کون ہو؟ اس نے کہا میں تمہارے منہ کا وہ لقمہ ہوں جسے تم نے منہ سے نکال کر ایک سائل کو دیا تھا، جسے رب العزت نے قبول فرمایا تھا، آج تمہیں کام آیا۔ [مشکوٰۃ]

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ مِن
قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ ۗ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٩٣﴾
فَمَنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٩٤﴾ قُلْ
صَدَقَ اللَّهُ ۗ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٩٥﴾

ترجمہ: بنی اسرائیل کے لئے ہر قسم کے کھانے کی چیزیں حلال تھیں، سوائے ان کے جن کو اسرائیل (یعقوب

علیہ السلام) نے خود اپنے اوپر حرام قرار دیا تھا، اس سے قبل کہ تورات نازل ہو، آپ کہہ دیجئے: تورات لاؤ، اور اس کو پڑھو، اگر تم سچے ہو۹۳ جو شخص اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتا ہے اس کے بعد، پس یہی لوگ بڑے بے انصاف ہیں ۹۴ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے: اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے، پس تابعداری کرو ملّتِ ابراہیم کی، جو حنیف تھے، اور وہ شرک کرنے والوں میں نہیں تھے ۹۵

معارف ومنازل

پچھلی چند آیات سے اہلِ کتاب کے ساتھ بحث چلی آرہی ہے، کہیں یہود سے، کہیں نصاریٰ سے، کہیں دونوں سے۔ اس آیت میں یہود کے ساتھ مکالمہ ہو رہا ہے۔ یہود سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تم اپنے کو دینِ ابراہیم پر کیسے بتلاتے ہو؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ بیت المقدس تھا، پھر تم نے بیت المقدس کی بجائے بیت اللہ شریف کو اپنا قبلہ کیوں مقرر کرلیا ہے؟ اور یہود یہ بھی دعویٰ کرتے تھے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل سارے لوگوں کا قبلہ بیت المقدس تھا، اور یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام ودیگر انبیاء علیہم السلام کا قبلہ رہا، مگر آپ لوگوں نے اس کو چھوڑ کر کعبۃ اللہ کو قبلہ بنالیا، یہ تو ملّتِ ابراہیمی کی کھلم کھلا مخالفت اور خلاف ورزی ہے۔ یہ تھا یہود کا پہلا اعتراض۔ اس کا مکمل جواب تفصیلاً آنے والی آیتوں میں آنے والا ہے۔

یہود کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ تم لوگ وہ چیزیں کھاتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے گھرانے پر حرام کی تھیں، جیسے اونٹ کا گوشت اور دودھ۔ اس کے ساتھ انہوں نے دیگر چند چیزوں کا تذکرہ کیا، جن کی تفصیل آنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب فرما کر ارشاد فرمایا کہ جتنی چیزیں اب لوگ کھاتے ہیں یہ سب ابراہیم علیہ السلام کے وقت میں حلال تھیں، جب تک تورات نازل ہوئی۔ بیشک تورات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہزاروں سال بعد خاص بنی اسرائیل پر ان کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے بعض چیزیں جو حرام ہوئی ہیں، وہ ملّتِ ابراہیم علیہ السلام میں حلال تھیں، بطورِ عذاب ہزاروں سال بعد یہود پر حرام ہوئیں، جن کا تذکرہ سورۃ انعام میں آنے والا ہے، وہ یہ ہے: ﴿وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ ۖ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝١٤٦﴾ [أنعام: ۱۴۶]

یعنی یہود پر ان کی شرارتوں کی سزا میں ہر ناخن (کُھر) والا جانور، جن کی انگلیاں پھٹی نہ ہوں، جیسے اونٹ، شترمرغ، بطخ وغیرہ حرام کیا گیا تھا۔ نیز گائے، بکری کی جو چربی پشت یا انتڑیوں پر لگی ہو، یا ہڈی کے ساتھ نہ ملی ہو، ان

پر حرام کردی گئی تھی، جیسے گردہ کی چربی۔

بنی اسرائیل شرم کے مارے یہ کہاں کہہ سکتے تھے کہ ان چیزوں کی حرمت کا سبب ہمارے آباء واجداد کے معاصی اور ظلم وزیادتی ہے، بلکہ ان چیزوں کی حرمت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ملت کی طرف منسوب کرتے تھے، اور مسلمانوں پر الٹا اعتراض کرتے تھے کہ تم ابراہیمی گھرانے پر حرام شدہ چیزوں کو حلال سمجھ کر ان کی ملت کی خلاف ورزی کرر ہے ہو۔

فرمایا کہ یہود کا دعویٰ غلط ہے کہ یہ چیزیں ابراہیم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے زمانہ ہی سے مستمر طور پر حرام چلی آتی ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ان چیزوں سے کوئی چیز عہدِ ابراہیمی میں حرام نہ تھی۔ یہود کی نافرمانیوں اور شرارتوں کی وجہ سے یہ سب چیزیں حرام ہوئیں۔

البتہ! اونٹ کا گوشت، اور دودھ، یہ تورات سے پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے کھانے سے قسم کھائی تھی، ان کی پیروی میں ان کی اولاد نے بھی چھوڑ دیا تھا۔ اور اس قسم کا سبب یہ تھا کہ یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء کا درد تھا، انہوں نے منت نذر مانی کہ اگر مجھے تندرستی ہوئی تو جو چیز میری رغبت کی ہے اسے چھوڑ دوں گا۔ انہیں یہی اونٹ کا گوشت اور دودھ مرغوب تھا، پس نذر کے سبب چھوڑ دیا۔

اس قسم کی نذر جو تحریمِ حلال پر مشتمل ہو، ہماری شریعت میں روا نہیں ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ﴾. [التحریم: ۱] (اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کیوں حرام کررہے ہیں اس چیز کو جس کو اللہ نے آپ کے لئے حلال کیا ہے؟ آپ اپنی بیویوں کی رضامندی کو ڈھونڈ رہے ہیں) ۔اگر کسی نے کر لی تو توڑ دے، اور کفارہ ادا کرے۔ [عثمانی]

خلاصہ یہ ہے کہ نزولِ تورات سے پہلے تمام پاکیزہ چیزیں بنی اسرائیل کے لئے حلال تھیں، مگر یہودیوں کی بیجا حرکتوں اور شرارتوں کی وجہ سے نزولِ تورات کے بعد بعض چیزیں ان پر بطورِ سزا حرام کردی گئیں، جیسے ارشاد ہے:

﴿فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَثِیْرًا﴾. [النساء: ۱۶۰] (پس یہودیوں کی سنگین زیادتی کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں حرام کردیں جو پہلے ان کے لئے حلال کی گئی تھیں۔ اور اس لئے کہ وہ بکثرت لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے تھے)۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہودیوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، چربیاں ان پر حرام کردی گئیں، تو انہوں

نے ان کو پگھلا کر فروخت کیا، اور پیسے کھائے۔ [متفق علیہ]

﴿قُلۡ فَاۡتُوۡا بِالتَّوۡرٰىةِ فَاتۡلُوۡهَاۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ﴾ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو، تو تورات لاؤ، اور پڑھو، تمہارا جھوٹ خود تورات سے ظاہر ہو جائے گا۔ سید کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ ہے کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے تورات لانے اور پڑھنے کا انہیں چیلنج دیا، چنانچہ وہ لاجواب ہو گئے، اور تورات نہیں لائے، کیونکہ تورات میں وہی کچھ تھا جو قرآن حکیم نے واضح کیا۔

اس آیت سے یہ بھی واضح ہوا کہ شریعتِ موسوی میں بھی نسخ کے احکام جاری رہے، اگرچہ یہود اس کے منکر رہے۔ نسخ تو یہی ہے کہ چند چیزیں ان کے لئے حلال تھیں، اور حلت منسوخ ہو کر اس کی جگہ حرمت کا حکم آ گیا۔

﴿فَمَنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ﴾ پس اب جو لوگ اللہ تعالیٰ پر دروغ بندی کریں گے، اور دعویٰ کریں گے کہ اونٹ کا گوشت اور دودھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے حرام کیا گیا تھا، وہ جھوٹے، مفتری اور کذاب ہیں، اور جو کوئی اس قسم کی حرکت کرے وہ ظالم، بے انصاف اور ناقدر شناس ہی ہوگا۔ فَلَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الۡكَاذِبِيۡنَ.

﴿قُلۡ صَدَقَ اللّٰهُ﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے۔ ﴿اِنَّ اَوۡلَى النَّاسِ بِاِبۡرٰهِيۡمَ لَلَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَهٰذَا النَّبِىُّ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ [آل عمران: ۶۸] (ابراہیم کے ساتھ تعلق کے سب سے زیادہ حق دار وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی، نیز یہ نبی (آخر الزمان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) اور وہ لوگ ہیں جو (ان پر) ایمان لائے ہیں، اور اللہ مومنوں کا کارساز ہے)۔

اللہ تعالیٰ سچا ہے، اس کا فرمان سچ ہے، اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بھی سچے ہیں، یہود جھوٹے ہیں کہ خود کو ابراہیمی کہتے ہیں، یا ابراہیم علیہ السلام کو یہودی اور نصرانی کہتے ہیں۔ ﴿مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّلَا نَصۡرَانِيًّا وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ﴾ [آل عمران: ۶۷] (ابراہیم نے یہودی تھے، نہ نصرانی، بلکہ وہ تو سیدھے سیدھے مسلمان تھے، اور شرک کرنے والوں میں کبھی شامل نہیں ہوئے)۔ ارشاد فرمایا:

﴿فَاتَّبِعُوۡا مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا﴾ پس ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا اتباع کرو۔ یعنی دینِ اسلام کا۔ ﴿حَنِيۡفًا﴾ جو حنیف تھے۔ یعنی تمام چیزوں، اور ہر قسم کے خیالات و برے عقائد سے کٹ کر خدا کی بندگی اور ایمان باللہ پر مضبوطی سے جم کر توحید کے علمبردار ہو کر ہر قسم کے شک سے پاک رہے۔ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ اور ابراہیم علیہ السلام مشرکوں میں سے نہیں تھے۔ تم یہود و نصاریٰ شرک میں مبتلا ہو، حنیفیت سے بیزار ہو، افراط و تفریط میں گرے ہوئے ہو۔ حق باتوں کو چھپاتے ہو وغیرہ، پھر تم کس بنیاد پر ابراہیمی ہونے کا مدعی ہو؟ تمہیں ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ملت سے نہ کوئی مناسبت ہے، نہ قرب و موافقت، پس تم بالیقین واقعی جھوٹے ہو۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ کا پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے، البتہ وہ ہے جو بکہ (مکہ مکرمہ) میں ہے، برکت والا ہے، اور تمام جہانوں کے لئے ہدایت ہے ﴿۹۶﴾ اس میں واضح نشانیاں ہیں، جیسے مقامِ ابراہیم، اور جو شخص اس میں داخل ہوگا وہ امن والا ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کے لئے لوگوں پر حج ہے اس گھر کا، جو طاقت رکھتا ہے اس کی طرف راستے پر جانے کی، اور جس شخص نے انکار کیا تو بیشک اللہ تعالیٰ سب جہاں والوں سے بے پرواہ ہے ﴿۹۷﴾

معارف و منازل

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہودیوں نے مسلمانوں سے کہا: ہمارا قبلہ بیت المقدس ہے، جو کعبہ شریف سے افضل ہے، اور پرانا بھی ہے، اور انبیاء کرام علیہم السلام کا قبلہ و مقامِ ہجرت بھی ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ بھی ہے۔ مسلمانوں نے جواب دیا کہ ہمارا قبلہ کعبہ شریف افضل بھی ہے، اور قدیم بھی، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ بھی ہے۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ [مظہری]

ان آیات میں یہود کے اعتراض کا مکمل جواب ہے، جنہوں نے کہا، اور اعتراض کیا تھا کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے سب انبیاء علیہم السلام کا قبلہ بیت المقدس تھا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کر کے ملتِ ابراہیمی کی مخالفت و خلاف ورزی کی۔ اس پر ارشاد فرمایا کہ یہود کے دعویٰ میں کوئی صداقت نہیں، اور ان کا دعویٰ سراسر جھوٹ ہے۔ اور حقیقت (نفس الامری واقعی) یہ ہے کہ ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ﴾

[الآیہ]۔ بیشک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے وہ بکہ شریف میں ہے۔

مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں لفظِ بیت سے مراد مطلق گھر نہیں ہے، بلکہ عبادت خانہ ہے۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اوّل ترین مسجد اور عبادت خانہ مراد ہے، جیسے سورۂ نور کی آیت میں ہے: ﴿فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ﴾ [النور:۳۶] اس جگہ بیوت سے مراد مساجد ہیں۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! زمین پر کونسی مسجد سب سے پہلے قائم کی گئی؟ فرمایا: مسجد حرام۔ میں نے پھر عرض کیا: پھر کونسی؟ فرمایا: مسجد اقصیٰ۔ میں نے عرض کیا: دونوں میں کتنا فاصلہ رہا؟ فرمایا: چالیس سال، پھر جہاں بھی تم کو نماز کا وقت آجائے پڑھ لو، اس میں فضیلت ہے۔ [متفق علیه]

بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے دو ہزار سال قبل اللہ تعالیٰ نے کعبۃ اللہ شریف کی تعمیر کا فرشتوں کو حکم دیا، انہوں نے کعبہ کی تعمیر مکمل کر لی۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت آدم وحواء علیہما السلام کے دنیا میں آنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جبریل امین علیہ السلام کے ذریعہ ان کو یہ حکم بھیجا کہ وہ کعبہ شریف کی تعمیر کریں، تو ان حضرات نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی۔ پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر اس کا طواف بھی کیا، اور ان سے کہا گیا کہ آپ سب سے پہلے انسان ہیں، اور یہ گھر ﴿أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ﴾ ہے۔ [ابن کثیر]

دونوں روایتوں میں تطبیق یہ ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبۃ اللہ کے معمار کہلاتے ہیں، اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام بھی معماروں میں شمار ہیں۔ اصل بناء اور اوّل تعمیر حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے فرشتوں کی ہے، جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت شیث علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ کعبہ کی تعمیر کے چالیس سال بعد فرشتوں نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کی، پھر طوفان کے بعد پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبۃ اللہ کی تعمیر کی، اور پھر مسجد اقصیٰ کی۔

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ مسجد اقصیٰ کی دوسری مرتبہ تعمیر حضرت آدم علیہ السلام نے کی ہے، اور تیسری مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی تعمیر کی۔ البتہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے مسجد اقصیٰ کی جو تعمیر کی ہے وہ پانچویں تعمیر کہلائے گی۔

کعبۃ اللہ شریف کی تعمیر ہمارے زمانہ تک گیارہ مرتبہ ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

(۱) تعمیر ملائکہ۔ (۲) تعمیر حضرت آدم علیہ السلام۔ (۳) بناء حضرت شیث علیہ السلام۔ (۴) تعمیر و بناء حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ (۵) بناء قبیلہ جرہم۔ (٦) بناء عمالقہ۔ (۷) بناء قُصَی بن کلاب قریشی۔ (۸) بناء قریش، جنہوں نے کعبہ پر چھت ڈال کر اُسے دومنزلہ بنایا، اور حطیم کو کعبہ سے الگ کردیا، اور غربی دروازہ بند کرکے شرقی دروازہ کو آٹھ فٹ اوپر رکھا، وغیرہ۔ (۹) بناء حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بمشورۃ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا۔ (۱۰) بناء حجاج بن یوسف ثقفی بامر خلیفہ عبدالملک بن مروان۔ (۱۱) بناء سلطان مراد بن سلطان احمد خان عثمانی ترکی۔ رحمۃ اللہ علیہ و علی آبائہ و أجدادہ و أولادہ۔

مسجد اقصیٰ کی بناء کا سلسلہ یہ ہے:

(۱) ملائکہ کرام۔ (۲) حضرت آدم علیہ السلام۔ (۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام (۴) بخت نصر نے جب مسجد اقصیٰ کو شہید کیا تو ستر سال بعد بنی اسرائیلیوں نے مل کر اس کی تعمیر کی۔ یہ حضرت عزیر علیہ السلام کی سوسالہ وفات کے زمانہ میں، جنہوں نے بیت المقدس کی حالتِ زار دیکھ کر کہا تھا: ﴿اَنّٰی یُحۡیٖ ہٰذِہِ اللّٰہُ بَعۡدَ مَوۡتِہَا﴾ (۵) حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے جنات کے ذریعہ تعمیر فرمائی۔

بعض علماء نے کہا کہ کعبہ کی اوّلیت زمانہ کے لحاظ سے مراد نہیں ہے، بلکہ افضلیت کے اعتبار سے ہے۔ یعنی کعبہ افضل ترین عمارت ہے۔ یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔ پس کعبہ کو یہ شرف حاصل ہی رہے گا کہ وہ دنیا کا سب سے پہلا گھر بھی ہے، اور سب سے پہلا عبادت خانہ و مرکزِ ہدایت بھی، جبکہ اس کے اوّل بانی ملائکہ کرام علیہم السلام ہیں۔

﴿لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا﴾ راجح قول یہی ہے کہ بکّۃ مکّہ شریف کا اسی طرح نام ہے جیسے اُمُّ القریٰ۔ کعبہ برکت والا ہے، اس کا اجر وثواب بہت زیادہ ہے۔ وہاں شب و روز ایک سو بیس رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ نمازیوں کے لئے چالیس، نظارہ کرنے والوں کے لئے بیس، طواف کرنے والوں کے لئے ساٹھ۔ اور ایک نماز کا ثواب سو ہزار (یعنی ایک لاکھ) نمازوں کے ثواب سے زیادہ ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے گھر کے اندر آدمی کی نماز ایک نماز کے برابر ہے، اور محلہ کی مسجد میں ایک نماز پچیس نمازوں کے برابر ہے، اور جامع مسجد میں پانچ سو نمازوں کے برابر ہے، اور مسجد اقصیٰ میں ایک ہزار نمازوں کے برابر ہے، اور مسجد نبوی میں پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے، اور مسجد حرام میں ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے

۔[ابن ماجه]

کعبہ شریف کے فضائل بے شمار ہیں:

عربی میں مشہور ہے مقولہ ہے: كَثْرَةُ الأَسمَاءِ تَدُلُّ عَلٰى شَرَفِ المُسَمّٰى۔ کسی چیز کے ناموں کی زیادتی اور کثرت اس کی فضیلت اور شرف کی علامت ہے۔ مکہ مکرمہ کے چالیس اسماء جو اس کی فضیلت وشرف پر دلالت کرنے والے ہیں یہ ہیں:

اَلْمشَابَة۔ اَلْأَمَان۔ اَلْبلَد۔ اَلْمُبَارَكه۔ اَلْمُكَرَّمَه۔ اَلْمُعَظَّمَه۔ اَلْمُشَرَّفَه۔ مَكّه۔ بَكّه۔ أُمّ القُرىٰ۔ اَلْبَيت۔ اَلْقِيَام۔ اَلْكَعْبَة۔ اَلْبَيْتُ الْحَرَام۔ بَيْتُ الْعَتِيق۔ اَلْبَلَدُالْأَمِين۔ اَلْبَلَدُ الْمَأمُون۔ أُمّ رَحم۔ اَلْبَرَكَة۔ اَلصَّلَاح۔ اَلْعَرْش۔ اَلْقَادِس۔ اَلْمُقَدَّس۔ اَلطَّاهِر۔ اَلْمُطَهِّر۔ اَلْكَوْثَر۔ اَلنَّاسَة۔ اَلْقَيِم۔ اَلْهَاسَه۔ اَلرَّائِس۔ اَلنَّبِيه۔ اَلسَّعْد۔ اَلسَّعِيد۔ اَلشَّرِيف۔ اَلتَّوْر۔ اَلْمُظْهَر۔ اَلْقَائِم۔ اَلْآيَة۔ اَلْهُدىٰ۔ اَلرَّحْمَة۔ وغیرہ۔ [ابن کثیر ودیگر کتب لغۃ وتفسیر]

اسی وجہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ظاہری اور باطنی اور روحانی طور پر اس مقدس مقام کو کتنی فضیلت وبرکتوں سے نوازا ہے۔ اور یہ مقام اتنا کثیر الخیر والبرکت ہے کہ روئے زمین پر کوئی مرکز وامام اس کے پایہ کا نہیں ہے ۔اور یہی مقدس سرزمین حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملّتِ اسلامیہ کی نشان وعلامت ہے۔ اور یہی بیتِ عتیق بقاء دنیا کی نشانی وعلامت بھی ہے۔

.جس طرح دنیا میں آبادی کے لحاظ سے سب سے پہلا گھر ہے، اسی طرح قیامِ قیامت کے آثار وظہور کے اعتبار سے (بحیثیتِ خرابی) بھی پہلا گھر ہے۔ بخاری ومسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قربِ قیامت میں کعبہ شریف کو دو پنڈلیوں والا حبشی پھر خراب کرے گا۔ فرماتے ہیں: میں گویا اسے دیکھ رہا ہوں۔ وہ سیاہ فام ایک ایک پتھر الگ الگ کرتا رہے گا، اور اس کا غلاف اتار دے گا، اور اس کا خزانہ بھی لے جائے گا۔ وہ ٹیڑھے ہاتھ پاؤں والا، اور گنجا ہوگا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ گویا وہ کدال چلا رہا ہے، اور برابر تخریب کے ساتھ کعبہ کے پتھروں کو ریزہ ریزہ کر رہا ہے۔ [الحدیث]

غالباً یہ افسوسناک ناشدنی واقعہ جس کے دیکھنے سے اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ رکھے، یاجوج وماجوج کے نکل چکنے کے بعد ہوگا۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ سید کائنات ﷺ نے فرمایا کہ تم یاجوج وماجوج کے نکلنے بعد بھی بیت اللہ کا حج وعمرہ کرو گے۔ [ابن کثیر]

خلاصہ یہ ہے کہ بیت اللہ شریف بیت المقدس سے، بلکہ تمام کائنات سے افضل ہے۔ اوّل یہ کہ یہ عبادت کا پہلا گھر ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء ﷺ تک سارے انبیاء کرام علیہم السلام کا قبلہ ہے، اور سارے انبیاء کرام علیہم السلام کے مرکزِ حج وعمرہ ہے۔ چھ ماہ تک، یا چالیس روز تک حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی نے کعبہ کا طواف کیا، اور حضرت آدم علیہ السلام وحضرت نوح علیہ السلام ودیگر بہت سے انبیاء کرام علیہم السلام کی قبریں کعبہ شریف کے قرب وجوار میں واقع ہیں۔ بعض روایات میں ستر کے قریب انبیاء کرام علیہم السلام کی قبور ہیں۔

دوم یہ کہ مرکزِ ہدایت مبارک اور کثیر البرکات کا منبع وسرچشمہ ہے۔ اور زمین کی تخلیق یہاں سے ہوئی ہے۔ یہ وسط الارض اور سُرۃ الارض ہے، بمنزلہ زمین کے ناف کے۔ اور تمام ظاہری وباطنی اور روحانی غذاؤں اور برکتوں کا مرکز وسرچشمہ ہے۔ جیسے پہلے بیان ہوا کہ ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے ثواب کے برابر ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ عظیم اور جلیل القدر عبادت فریضہ حج کا مرکز ہے، جہاں قیامِ دنیا سے لے کر قیامِ ساعت تک انسانوں، فرشتوں، جنات سالانہ بے شمار تعداد میں فریضۂ حج ادا کرتے ہیں، اور سلسلۂ عمرہ وطواف تو پورے سال تمام اوقات میں بلاتوقف وانقطاع جاری رہتا ہے، ایک لحہ بھی بند نہیں ہوتا ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ سارے انبیاء کرام علیہم السلام سے برتر (سوائے سید الانبیاء ﷺ)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کردہ مقدس حرم پاک ہے، جس کے لئے حضرت خلیل علیہ السلام نے خصوصی دعاء فرمائی: ﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ﴾ [البقرة: ۱۲۶] (اے میرے پروردگار! اس کو امن والا شہر بنادے، اور اس کے رہنے والوں کو رزق دے پھلوں میں سے)۔ اور باپ بیٹے مل کر اس کی تعمیر کرتے ہیں، اور اس کی قیادت وسرپرستی کے لئے خاتم الانبیاء ﷺ کے حق میں بھی دعاء کرتے ہیں: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ [البقرة: ۱۲۹] (اے ہمارے پروردگار! ان میں ایک رسول بھیج دے انہی میں سے، جو ان پر تیری آیتوں کی تلاوت کریں، اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیں، اور ان کا تزکیہ کریں، بیشک تو ہی زبردست حکمت والا ہے)۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ خانہ کعبہ جو ﴿هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (تمام جہاں کے لئے ہدایت) ہے، اور تمام جہاں کا قبلہ ہے، اور کعبہ شریف بمنزلہ مرکزی درمیانی نقطہ کے ہے، اور روئے زمین پر نمازیوں کی صفوف بمنزلہ دوائر کے ہیں، اور چاروں طرف سے اس کی سمت پر شب و روز بغیر کسی وقفہ کے سجدے ہو رہے ہیں، اور مشرق و مغرب، جنوب و شمال میں کروڑوں مساجد اور اربوں کی تعداد میں نمازی سب کا رخ اسی مرکزِ انوار و تجلیات کی طرف ہوتا ہے، جس کی مثال پوری دنیا کا کوئی مذہب پیش نہیں کر سکتا۔

چھٹی فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ: ﴿فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ﴾ خود اس مرکزِ اسلام، پاکیزہ گھر میں اس کی حرمت و عظمت کی روشن نشانیاں اور تابناک انوار و برکات موجود ہیں، جو کوئی اس میں غلط ارادے سے داخل ہونا چاہے، وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ ﴿وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ [الحج: ۲۵] (اور جو کوئی اس میں ٹیڑی راہ اختیار کرے ظلم کے ساتھ ہم اسے دردناک عذاب کا مزہ چکھائیں گے)۔ اصحابِ فیل کے واقعہ سے، اور ابرہہ اشرم کی تباہی سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اور دیگر بھی بہت سے واقعات اس پر شاہد عدل ہیں۔

ساتویں فضیلت یہ ہے کہ اس میں مقامِ ابراہیم ہے۔ اس سے وہ پتھر مراد ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ خانہ کعبہ کی دیواریں جوں جوں اونچی ہوتی جاتی تھیں یہ پتھر خود بخود موم کی طرح اونچا ہوتا جاتا تھا، اور ضرورت پر خود بخود نیچے ہو جاتا۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاؤں کے نشانات ہیں، جو کہ ہزاروں سالوں سے محفوظ ہیں۔ اس وقت مضبوط شیشہ کے خول میں بند ہے، اور مطاف میں رکھا ہوا ہے، اور موسمی اثرات سے محفوظ ہے۔ حجاج و زائرین بآسانی اس کی زیارت کرتے ہیں، اور دیکھتے ہیں۔

آٹھویں فضیلت یہ ہے کہ یہاں زمزم شریف کے متبرک پانی کا چشمہ ہے، جو کہ حوضِ کوثر کے پانی سے زیادہ بابرکت ہے، اور یہ دنیا کے عجائبات میں شمار ہے۔ بعض علماء کرام نے اس پر مستقل رسالے تصنیف کئے ہیں، اور اس کے سیکڑوں فوائد و خصوصیات بیان کئے ہیں۔

نویں خصوصیت یہ ہے کہ ﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾ حرم کی حدود میں داخل ہونے والا شخص ہر قسم کے نقصان و مضرات سے مامون ہوگا، اور بحمد اللہ آخرت کے عذاب سے بھی نجات پائے گا۔ اگر صدق دل اور اخلاص کے ساتھ داخل ہوا۔

دسویں فضیلت اور سب سے اونچی اور اعلیٰ فضیلت یہ ہے کہ یہ بلد امین دونوں جہاں کے پیشوا ساری

کائنات کیلئے رحمت جناب خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ (فِدَاہُ اَرْوَاحُنَا) صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ وعلیٰ آلہ وأصحابہ کی جائے پیدائش اور مرکزِ ولادت ہے۔ تِلْکَ عَشَرَۃٌ کَامِلَۃٌ۔ اس کے علاوہ بھی دیگر بہت سے فضائل وخصوصیات ہیں، جو تواریخِ مکہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

﴿فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ﴾ [الآیہ]۔ اس میں واضح نشانیاں ہیں، منجملہ ان کے مقامِ ابراہیم ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہاں ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کعبہ سے پہلے اپنی بیوی سیدہ ہاجرہؑ اور شیرخوار بچے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ٹھہرایا تھا، اور خود ملک شام چلے گئے تھے۔ اس کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ پتھر جس پر انہوں نے کھڑے ہو کر کعبۃ اللہ کی تعمیر کی، جس پر آپ علیہ السلام کے قدموں کے نشانات مرورِ زمانہ کے باوجود معجزہ کے طور پر واضح اور نمایاں ہیں۔ اکثر مفسرین کی یہی رائے ہے کہ مقامِ ابراہیم سے مراد یہی پتھر ہے۔

کعبہ کی خصوصیت بیان فرمارہے ہیں کہ جو کوئی اس میں داخل ہوگا وہ مامون رہے گا۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی کعبہ کی یہی خصوصیت رہی کہ لوگ اپنے باپ کے قاتلوں سے یہاں انتقام لینے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ چاروں طرف قتل وغارت کا بازار اور ہر قسم کے فساد وفتنوں کا بازار گرم رہتا تھا، مگر مکہ والوں سے کوئی کسی قسم کا تعرض نہیں کرتا تھا۔ سورت قریش میں ارشاد ہے: ﴿الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ﴾ [القریش: ۴] (جس نے بھوک کی حالت میں انہیں کھانا دیا، اور بدامنی سے انہیں محفوظ رکھا)۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ﴾ [العنکبوت: ۶۷] (نہیں دیکھتے کہ ہم نے مقرر کی ہے پناہ کی جگہ، اور لوگ اُچکے جاتے ہیں آس پاس چاروں طرف سے (یعنی بدامنی میں)۔

بعض علماء نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ جو شخص حرم مکہ کی تعظیم اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے اندر داخل ہوگا، قیامت کے دن عذاب سے مامون ہوگا۔ اور داؤد طیالسی رحمۃ اللہ علیہ نے مسند میں، اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے، اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے کبیر میں، اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت سے، اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اوسط میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے، اور دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے سنن میں حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص دونوں حرموں میں سے کسی میں وفات پائے گا، قیامت کے دن دوزخ سے بے خوف اٹھے گا، یعنی

مامون ہوگا۔ [مظہری]

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ اللہ تعالیٰ کی رضا اور تعمیلِ حکم کی سعادت حاصل کرنے کی خاطر ہر اس شخص پر اس پاکیزہ گھر کا حج فرض ہے جو اس کی طرف جانے کی استطاعت رکھتا ہو۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: استطاعت سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: اَلزَّادُ وَالرَّاحِلَة. یعنی سواری اور نان نفقہ۔ یعنی سفر کے لئے سواری کی سہولت ہو، اور اپنے سفر کے لئے خرچہ بھی ہو، اور اپنے بال بچوں کے لئے اتنا سامان موجود ہو جو حاجی کی واپسی تک انہیں کافی ہو۔

اس بارے میں اجماعِ امت ہے کہ حج ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن اور فرض عین ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں آیا ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اشاد فرمایا: بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ. [الحدیث]۔ اسلام کی عمارت پانچ امور کی بناء پر ہے: (۱) لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا اقرار۔ (۲) اور اقامتِ صلوٰۃ، ٹھیک ٹھیک نماز کی ادائے گی۔ (۳) اور زکوٰۃ دینا۔ (۴) اور حج کرنا۔ (۵) اور رمضان کے روزے رکھنا۔ [متفق علیہ]

فرضیتِ حج کے متعلق احادیث بکثرت ہیں۔ اصح قول یہ ہے کہ حج کی فرضیت ۹ سنہ ھ میں ہوئی، اگرچہ ۵ سنہ ھ کا قول بھی ہے۔

صاحبِ مدارک فرماتے ہیں کہ حِج بکسرِ حاء اسم ہے، اور حَج بفتحِ حاء مصدر ہے۔ حج کے لغوی معنی ہیں: قصد کرنا۔ شرعی معنی ہیں: مخصوص عبادت کا مخصوص وقت میں، مخصوص اعمال کا ارادہ کرنا۔ حج صرف اہلِ استطاعت پر مخصوص شرائط کے ساتھ، عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے۔ مثلاً اسلام، صحت وتندرستی، بلوغ، عاقل ہونا، حریت وآزادی، زاد وراحلہ۔ اور اگر عورت ہو تو محرم کا ہونا۔

کافر اگر حج کرے، اسی طرح نابالغ اور پاگل حج کریں، اور بعد میں کافر مسلمان ہو، اور نابالغ بالغ ہو، پاگل تندرست ہوا، ان تینوں پر آئندہ حج کرنا لازم ہوجائے گا۔ اور سابق حج کا اعتبار نہ ہوگا۔ یہی حکم غلام کے لئے بھی ہے کہ آزادی کے بعد اس پر حج فرض ہوجائے گا۔ بیمار مثلاً اپاہج، پاؤں سے معذور، نابینا وغیرہ پر حج فرض نہیں ہے، اگرچہ مالدار ہو۔ اسی طرح مالدار عورت پر حج فرض نہیں ہے، اگر اس کا کوئی محرم نہ ہو۔ محرم سے مراد وہ مرد ہے جس کے ساتھ نکاح ہمیشہ کے لئے جائز نہ ہو۔ محرم کے لئے مرد ہونا ضروری ہے، عورت عورت کے لئے محرم نہیں بن سکتی۔

علماء کرام کا متفقہ فتویٰ ہے کہ راستہ کا مامون ہونا وجوبِ حج کے لئے شرط ہے۔ بدامنی کی صورت میں حج

فرض نہیں ہے۔ مزید تفصیلات کتب فقہ میں درج ہیں، وہاں رجوع کیا جائے۔

﴿وَمَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ جو کوئی کفر کرے، یعنی یہود کی طرح سرے سے حج کا انکار کرے، تو وہ بیشک انکارِ حج کی وجہ سے کافر ہو جائے گا۔ کفر کے حقیقی معنی یہی ہیں۔ البتہ اگر کفر سے مجازی معنی مراد لئے جائیں، کہ جو شخص مسلمان ہو کر استطاعت اور تندرستی کے باوجود کفرانِ نعمت کرتے ہوئے حج نہ کرے، جیسے بہت سے لوگ نماز سے منکر نہیں ہیں، مگر لاپرواہی اور غفلت کی وجہ سے نماز نہیں پڑھتے، اسی طرح غفلت ولاپرواہی یا بخل و کنجوسی کی وجہ سے حج نہ کرے، تو ایسا شخص مجرم و فاسق تو ہوگا، مگر کافر نہیں ہوگا۔ ایسے لوگوں کے لئے احادیث میں سخت وعید آئی ہوئی ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنا چاہئے۔ تو اللہ تعالیٰ کو ایسے لوگوں کی پرواہ نہیں ہے۔ خیال رہے کہ یہ بھی سخت وعید اور قطع تعلق کی دھمکی ہے۔

یہ آیت کریمہ ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ﴾ سے ﴿عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ تک حکمِ حج کے مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر تاکید کے ساتھ بیان کر رہی ہے:

(۱) امرِ وجوبی کی تعبیر صیغۂ خبر سے کی گئی۔

(۲) امر کو جملہ اسمیہ کی صورت میں ظاہر کیا گیا۔

(۳) اللہ تعالیٰ کا بندوں پر وجوبی حق بیان کیا گیا۔

(۴) پہلے عمومی حکم دیا، اور فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الۡبَيۡتِ﴾ پھر حکم کو ایک خاص شرط کے ساتھ مخصوص کر دیا، اور فرمایا: ﴿مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَيۡهِ سَبِيۡلًا﴾ گویا ابہام کے بعد وضاحت فرمائی، اور دوبارہ حکم دیا، ایک بار مبہم، دوسری بار واضح۔

(۵) ترکِ حج کو کفر سے تعبیر فرمایا۔ گویا یہ کافروں کا فعل ہے۔

(۶) اپنا استغناء ظاہر فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ سارے جہاں سے بے نیاز ہے، اس کو کسی کی عبادت کی ضرورت نہیں ہے، جو عبادت کرے گا اپنے لئے کرے گا۔ اور اس جگہ استغناء کا ذکر نفرت اور بغض پر دلالت کر رہا ہے، گویا اللہ تعالیٰ تارکِ حج سے نفرت اور بغض کرتا ہے۔

(۷) لفظ جل جلالہ "اللہ" کو دو دفعہ ذکر فرمایا، اور ضمیر ذکر نہیں کی، تاکہ تارکِ حج کی طرف سے اللہ تعالیٰ کا استغناء بصورتِ تعمیم مدلل طور پر ظاہر ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کا انتہائی غضب معلوم ہو جائے۔

(۸) ﴿حِجُّ الْبَيْتِ﴾ میں حج کی اضافت بیت کی جانب بتارہی ہے کہ کعبہ وجوب حج کا سبب ہے (جیسے صلوۃ الظہر، زکوۃ المال، صوم رمضان)۔ چونکہ کعبہ ایک ہے، متعدد نہیں ہے، اسے لئے عمر میں حج کا وجوب بھی ایک مرتبہ ہے، بار بار نہیں ہے۔ سید کائنات ﷺ نے فرمایا: حج عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے، جو زیادہ کرے گا نفل ہوگا۔ [نسائی، احمد]

فائدہ:

کعبہ کسی خاص عمارت، چھت، پتھروں کا نام نہیں ہے۔ پتھر، مٹی دیواروں کو اٹھا کر کہیں دور ڈالدیا جائے، تو کعبہ منتقل نہیں ہوگا۔ اگر ان پتھروں سے دوسری جگہ کوئی عمارت بنائی جائے، تو وہ کعبہ اور قبلہ شمار نہیں ہوگا۔ بلکہ کعبہ ایک ربانی لطیفہ ہے، جس کی فرودگاہ ایک مخفی موہومی مکان ہے، جہاں تجلیات ذاتیہ الٰہیہ کی بارش ہوتی ہے۔ پس ظاہرِ کعبہ اگرچہ مخلوق ومرئی ہے، اور اس کا تعلق عالمِ خلق سے ہے، مگر حقیقت میں کعبہ ایک باطنی نسبت ہے، جس کا ادراک نہ حِس کرسکتی ہے نہ خیال، بلکہ وہ محسوس (ظاہر) ہونے کے باوجود محسوس نہیں ہے، اور جہتِ مخصوصہ میں ہونے کے باوجود اس کی کوئی جہت نہیں ہے۔ یہ ظاہرِ کعبہ کی شان ہے۔ رہی کعبہ کی حقیقت اس کو کوئی نہیں جانتا۔

پاک ہے وہ ذات جس نے ممکنات کو وجوب کا آئینہ اور پرتو بنایا، اور عدمِ ذاتی کو وجوب ووجود کا مظہر قرار دیا۔ پھر کعبہ کی حقیقت سے اوپر حقیقتِ قرآن ہے، جو کہ مخلوق نہیں۔ [مظہری] یاد رہے کہ صاحبِ مظہری کا مقام بہت بلند ہے، وہ اصحابِ باطن میں سے ہیں، یہاں ان کا کلام خواص کیلئے ہے، جس کو عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ رحمہ اللہ

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ۞۹۸ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۞۹۹ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۞۱۰۰ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۞۱۰۱

ترجمہ: اے پیغمبر! (ﷺ) آپ کہہ دیجئے: اے اہلِ کتاب! تم اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کیوں

کفر کرتے ہو؟ اور اللہ تعالیٰ گواہ ہے اُن چیزوں پر جو تم کرتے ہو ﴿۹۸﴾ آپ کہہ دیجئے: اے اہلِ کتاب! تم اللہ تعالیٰ کے راستے سے کیوں روکتے ہو اس شخص کو جو ایمان لاتا ہے؟ تم اس راستے میں کجی تلاش کرتے ہو، اور تم گواہ ہو، اور اللہ تعالیٰ اُن کاموں سے غافل نہیں ہے جو تم کرتے ہو ﴿۹۹﴾ اے ایمان والو! اگر تم ان لوگوں میں سے ایک فریق کی بات مانو گے جنہیں کتاب دی گئی ہے، تو وہ تمہیں پلٹا دیں گے تمہارے ایمانوں کے بعد کفر کی طرف، اور تم کفر کس طرح کرو گے؟ حالانکہ تم پر اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں، اور تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ کا رسول موجود ہے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوطی سے پکڑے گا تو یقیناً اس کو سیدھے راستے کی ہدایت دی گئی ﴿۱۰۱﴾

معارف ومنازل

مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اس آیت کے شانِ نزول میں شماس بن قیس یہودی کی ایک شرارت بیان کی ہے۔ یہ شخص بڑا فتنہ باز متعصب تھا، اور مسلمانوں کی ترقی، اور ان کی باہمی محبت کو بڑے خطرے کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

اسلام سے پہلے مدینہ کے دو مشہور قبیلے اوس اور خزرج میں بڑی دشمنی تھی، اور آئے دن ان میں لڑائیاں ہوتی تھیں۔ لیکن مسلمان ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان میں اُلفت پیدا کردی، جس کا بیان آئندہ آنے والا ہے۔ اسلام سے پہلے ان میں اتنی سخت عداوت اور دشمنی تھی، ذرّا ذرّا بات پر لڑائی اور خونریزی کا بازار گرم ہو جاتا تھا، جو برسوں تک سرد نہ ہوتا تھا، چنانچہ "بعاث" کی مشہور جنگ ایک سو بیس سال تک رہی، جس میں جانبین کے بے شمار لوگ مارے گئے۔

آخر رحمت عالم سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت پر ان کی قسمت کا ستارہ چمکا، اور اسلام کی تعلیم اور رحمۃ للعٰلمین کے فیض صحبت نے دونوں قبیلوں کو، جو صدیوں سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہتے تھے، ملا کر شیر وشکر کر دیا، اور نہایت مضبوط برادرانہ تعلقات قائم کر دیئے۔

یہود مدینہ کو ان دونوں حریف خاندانوں کا اس طرح مل بیٹھنا، اور متفقہ طاقت سے اسلام کی خدمت وحمایت کرنا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، چنانچہ ایک اندھے یہودی شماس بن قیس نے کسی فتنہ پرداز شخص کو بھیجا کہ جس مجلس میں دونوں خاندان جمع ہوں، وہاں کسی ترکیب سے بعاث کی لڑائی کا ذکر چھیڑ دے، چنانچہ اس نے مناسب موقع پا کر بعاث کی یاد تازہ کرنے والے اشعار سنانے شروع کر دیئے، اشعار کا سننا تھا کہ ایک مرتبہ بجھی ہوئی چنگھاریاں پھر سُلگ اٹھیں۔ زبانی جنگ سے گزر کر ہتھیاروں کی لڑائی شروع ہونے کو تھی کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم جماعت مہاجرین کو

ہمراہ لئے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے گروہ مسلمین! اللہ تعالیٰ کی طرف سے میں تمہارے اندر موجود ہوں، پھر یہ جاہلیت کی پکار کیسی؟ اللہ تعالیٰ نے تم کو ہدایت دی، اسلام سے مشرف فرمایا، جاہلیت کی تاریکیوں کو محو فرمادیا، تو کیا ان کی کفریات کی طرف پھر اُلٹے پاؤں لوٹنا چاہتے ہو؟ جن سے نکل کر آئے تھے''۔

اس پیغمبرانہ آواز کا سننا تھا کہ شیطانی جال کے سب حلقے ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے، اور اوس وخزرج نے ہتھیار پھینک دیئے، اور ایک دوسرے سے گلے مل کر رونے لگے۔سب نے سمجھ لیا کہ یہ سب ان کے دشمنوں کی فتنہ انگیزی تھا، جس سے آئندہ ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہئے۔اسی واقعہ کے متعلق یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

﴿قُلْ يَٰٓأَهْلَ الْكِتَٰبِ لِمَ تَكْفُرُونَ﴾ اے اہلِ کتاب! تم اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کیوں کفر کرتے ہو؟ یہاں سے اہل کتاب کو پھر توبیخ اور تنبیہ کی جارہی ہے کہ حق وصداقت کے واضح دلائل، اور قرآن کریم کی ایسی سچی اور پکی باتیں سننے کے بعد بھی تمہیں کیا ہوا کہ باوجود اہلِ کتاب کہلانے کے برابر کتاب اللہ اور اس کے لانے والے کے انکار پر تلے ہوئے ہو؟ یادرکھو، تمہاری سب کاروائیاں اللہ تعالیٰ کے سامنے ہیں، تمہاری نیتوں اور تدبیروں کو وہ خوب جانتا ہے، جس وقت تمہیں پکڑے گا تو رتی رتی کا حساب لے کر چھوڑے گا۔

﴿قُلْ يَٰٓأَهْلَ الْكِتَٰبِ لِمَ تَصُدُّونَ﴾ اے اہلِ کتاب! تم اللہ تعالیٰ کے راستے سے لوگوں کو کیوں روکتے ہو؟ یعنی نہ صرف یہ کہ خود ایمانی سعادت حاصل کرنے سے محروم ہو، دوسروں کو بھی چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ سے روک دو۔اور جو سعید روحیں مشرف بایمان ہو چکی ہیں، ان کو اسلام کے فرضی عیب بتلا کر دینِ اسلام سے واپس لے آؤ۔پھر یہ حرکتیں محض جہل وبیخبری سے نہیں کر رہے ہو، بلکہ سمجھ بوجھ کر سیدھی باتوں کو ٹیڑھا ثابت کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہو، تمہارے اس ہیر پھیر سے اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں ہے، مناسب وقت پر اکٹھی سخت سزا دے گا۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِن تُطِيعُوا۟ فَرِيقًا﴾ تا ﴿إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾

پہلے اہلِ کتاب کو ڈانٹا گیا تھا کہ جان بوجھ کر کیوں لوگوں کو گمراہ کرتے پھرتے ہو؟ یہاں مسلمانوں کو نصیحت کی جارہی ہے کہ تم ان مفسدوں کے مکروفریب میں نہ آنا، اگر تم ان کے اشاروں پر چلو گے تو اندیشہ ہے کہ آہستہ آہستہ نورِ ایمان سے نکل کر کفر کے تاریک گڑھے میں دوبارہ نہ جاگرو۔

یہ بہت بعید ہے کہ وہ قوم جو ایمان لائے کافر بن جائے، یا کافروں جیسے کام کرنے لگے، جس کے درمیان

رب العزت کا عظیم الشان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جلوہ افروز ہوں، جو شب و روز ان کو اللہ تعالیٰ کا روح پرور کلام اور اس کی تازہ بتازہ آیتیں پڑھ کر سناتے رہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جس نے ہر طرف سے قطع نظر کر کے ایک خدا کو مضبوط پکڑ لیا، اور اسی پر دل سے اعتماد و توکل کیا، اسے کوئی طاقت کامیابی کے سیدھے راستے سے اِدھر اُدھر نہیں ہٹا سکتی۔

﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ﴾ میں کَیْفَ استفہامیہ تعجب و انکار کیلئے ہے، اس لئے ہم نے اس کے مطابق تشریح کی کہ یہ بہت بعید ہے، ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا۔ [عثمانی بزیادۃ]

اس آیت میں دو عظیم نعمتوں کا ذکر ہے، کتاب اللہ، رسول اللہ۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو کہ آیت کے اصلی مخاطب تھے، ان کے پاس یہ دونوں عظیم الشان نعمتیں جلوہ افروز تھیں۔ ہمارے اس زمانے میں قرآن حکیم موجود ہے، اور ان شاء اللہ قیامت تک رہے گا۔ اسی طرح سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث و سنت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحانیت و رحمت، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحیح اولاد و عترت، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین وارث علماء حقانی ہمارے اوپر قیامت تک سایہ فگن رہیں گے، ان کے ہوتے ہوئے ہم ابلیس کی گمراہیوں سے ان شاء اللہ محفوظ رہیں گے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَ اعْتَصِمُوْا
بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ
بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَ
كُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ
یَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَیْرِ وَ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے، جیسا کہ حق ہے اس سے ڈرنے کا، اور تم نہ مرو مگر اس حالت میں کہ تم فرمانبرداری کرنے والے (مسلمان) ہو ﴿۱۰۲﴾ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کو یاد کرو جو اس نے تم پر کی، جبکہ تم آپس میں دشمن تھے، اس نے تمہارے دلوں میں اُلفت ڈال دی، پس تم اس کے فضل سے آپس میں بھائی بھائی ہوگئے، اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، پس اللہ تعالیٰ نے تم کو بچالیا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کھول بیان کرتا ہے تمہارے لئے اپنی آیتیں، تاکہ تم ہدایت پاجاؤ ﴿۱۰۳﴾ پس چاہئے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہو جو خیر کی دعوت دے،

اور معروف کا حکم کرے، اور برائی کے کاموں سے منع کرے، اور یہی لوگ کامیاب ہیں (فلاح پانے والے) ﴿۱۰۴﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیت میں اہلِ کتاب کی گمراہی کے ذکر کرنے کے بعد اہلِ ایمان مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی کہ اگر انہوں نے اہلِ کتاب کے کسی گروہ کی بات مان لی، تو وہ انہیں ہدایت کے راستے سے کفر کی طرف پھیر دیں گے۔ پھر وضاحت فرمائی کہ اگر عقیدے میں ان کی بات مانی تو کافر ہو جاؤ گے، اور اگر اعمال میں ان کا اتباع کیا تو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول لو گے۔

اب ان آیات میں مسلمانوں کی خاص طور پر رہنمائی فرمارہے ہیں، اور دین کے بنیادی اصولوں پر قائم رہنے اور بدعقیدگی اور معصیت سے بچنے کی تلقین فرمارہے ہیں، اور یہ سلسلہ آئندہ چند آیتوں تک جاری رہے گا۔ اس کے بعد دوبارہ سابق مضمون یہود و نصاریٰ کے کفر و غرور کا تذکرہ شروع ہوگا۔

مسلمانوں کی اجتماعی قوت کے دو اہم اصول: "تقویٰ" اور "باہمی اتفاق"۔

مذکورہ بالا آیتوں میں سے پہلی آیت میں پہلا اصول، اور دوسری آیت میں دوسرا اُصول بتلایا گیا ہے۔ پہلا اصول یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے، یعنی اس کی ناپسندیدہ چیزوں سے بچنے کا مکمل اہتمام، جو اللہ تعالیٰ کے حق اور حکم کے مطابق ہو۔

لفظِ ''تقویٰ'' عربی زبان میں بچنے اور اجتناب کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اس کا ترجمہ ڈرنا بھی اسی مناسبت سے کیا جاتا ہے، کہ جن چیزوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے وہ اجتناب اور ڈرنے ہی کی چیزیں ہوتی ہیں۔ یا کہ ان سے عذابِ الٰہی کا خطرہ ہے۔ تقویٰ کے کئی درجات ہیں۔ ادنیٰ اور سب سے اہم وضروری درجہ کفر و شرک اور نفاق سے بچنا ہے، جس کے بغیر ابدی عذاب سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے ہر مسلمان متقی کہلاتا ہے، اگرچہ گناہوں میں مبتلا ہو۔ اس معنی کے لئے بھی قرآن کریم میں کئی جگہ لفظِ تقویٰ اور مُتَّقِیْن استعمال ہوا ہے۔

دوسرا درجہ جو آیت کریمہ میں مطلوب ہے، وہ یہ ہے کہ اس چیز سے بچنا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔ یعنی معاصی اور ہر قسم کے گناہوں سے بچنا۔

تقویٰ کے فضائل وبرکات، جو قرآن وحدیث میں مذکور ہیں، وہ اسی درجہ پر موعود ہیں، اور عام عرف میں

لوگ اگر کسی کو متقی کہتے ہیں تو اسی معنی کے لحاظ سے۔

تیسرا درجہ تقویٰ کا اعلیٰ مقام ہے، جو انبیاء علیہم السلام اور ان کے خاص نائبین اولیاء اللہ کو نصیب ہوتا ہے، کہ اپنے قلب کو ہر غیر اللہ سے بچانا، اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی رضا جوئی سے اپنے قلب کو منور و روشن رکھنا۔ مذکورہ آیت میں ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ میں کلمہ (لفظ) ''حَقَّ تُقٰتِهٖ'' کا اضافہ اسی درجہ کے حصول کی خاطر بڑھا گیا ہے، جو عام متوسط تقویٰ سے اوپر کا درجہ مراد ہے۔ اگر یہ لفظ نہ ہوتا تو عام متوسط درجہ مراد ہوتا۔ واللہ اعلم

تقویٰ کا حقیقی مفہوم:

تقویٰ اور اس کی پوری حقیقت پر سورۂ بقرہ کے شروع میں مفصل کلام ہو چکا ہے، وہاں دیکھا جائے۔ امام عبدالرزاق، فریابی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، قرطبی، روح المعانی کے مؤلف، وغیرہ مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے اپنی اپنی تفسیروں میں، طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے معجم میں، حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں، اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح میں، اور ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حلیہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی موقوف روایت نقل کی ہے، بلکہ ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو مرفوع بھی کہا ہے کہ: حق تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ: أَنْ يُطَاعَ فَلَا يُعْصٰى وَأَن يُذْكَرَ فَلَا يُنْسٰى وَأَن يُشْكَرَ فَلَا يُكْفَر. کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کی جائے، اور نافرمانی نہ کی جائے، اور اس کو یاد رکھا جائے، فراموش نہ کیا جائے، اور اس کا شکر کیا جائے، ناشکری نہ کی جائے۔

وَقَالَ ابنُ عَبَّاس هُوَ أَنْ لَا يُعْصٰى طَرْفَةَ عَيْنٍ [قرطبی] آنکھ کے اشارہ برابر اس کی نافرانی نہ کی جائے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کے مطلب کی توضیح اس طرح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کا حق ادا کرو۔ احکامِ خداوندی کی تعمیل سے تم کو کسی ملامت کنندہ کی ملامت نہ روکے۔ اللہ تعالیٰ کے لئے انصاف قائم کرنے کے لئے کھڑے ہو جاؤ، خواہ خود تمہارا، تمہارے ماں باپ، اور اولاد کا اس میں نقصان ہو رہا ہو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قول ایک روایت میں آیا ہے کہ بندہ اس وقت تک حقِ تقویٰ ادا نہیں کر سکتا جب تک اپنی زبان کی نگہداشت نہ کرے۔

میں کہتا ہوں کہ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور انس رضی اللہ عنہ نے وہ راستہ بتایا ہے جو کمالِ ولایت کو پہنچتا ہے، کیونکہ کم کھانا، کم سونا، کم بولنا، ہمیشہ زبان کو لغو باتوں سے حفاظت کرتا ہے، اور کثرتِ ذکر اللہ کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عوام الناس سے اختلاط کم رکھنا، اور حقوق اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں عوام کی پروانہ کرنا کمالِ ولایت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

[مظہری] مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے پریشان ہوئے، اور انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس حکم کی پوری تعمیل کرنے کی کس میں طاقت ہے؟ اس پر حق سبحانہ نے یہ آیت نازل فرمائی ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ [التغابن: ۱۶] (جہاں تک طاقت ہو تقویٰ اختیار کرو)۔ پس اس آیت کریمہ سے پہلی آیت کا حکم منسوخ ہو گیا۔

حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: آل عمران میں سوائے اس آیت کے کوئی دوسری آیت منسوخ نہیں۔ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نسخ کا قول بہتر نہیں ہے، بلکہ یہ کہا جائے کہ اس دوسری آیت نے پہلی آیت کی وضاحت فرمائی، کہ یک لخت تمام ممنوعاتِ شرعیہ اور ہر قسم کی معاصی کو ترک کرنا نہایت دشوار ہے، لہٰذا حسبِ توفیق آہستہ آہستہ گنجائش وطاقت کے مطابق تقویٰ اختیار کیا جائے۔ اس طرح تدریجاً معاصی کا ترک آسان ہو جائے گا، اور یہ عمل رفتہ رفتہ طبیعتِ ثانیہ بن جائے گا، ورنہ گناہوں سے بچنے کے حکم کی منسوخ ہونے کا کوئی صحیح معنی متصور نہ ہوگا، اور اس کا کوئی قائل نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مقدور بھر گناہوں سے بچو، اور جس قدر حق تمہارے ذمہ واجب کیا گیا ہے، اور وہ تمہارے لئے آسان بھی ہے، جیسے شرک وکفر سے بچنا، اس کو ضرور پورا کرو، باقی اس کے علاوہ ہزاروں منہیات سے بچنا، یہ اگر بیک وقت سخت اور مشکل ہے، تو حسبِ استطاعت آہستہ آہستہ اہتمام رکھو، اور فکر مند رہو، ان شاء اللہ یہ مرحلہ بھی سہل ہو جائے گا۔

﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ یعنی حقیقی اسلام پر ہی مرو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام اوامر ونواہی پر شب وروز پابندی کرو۔ تمام اعمال وافکار میں خلوص رکھو۔ سارے کام اللہ جل جلالہ کے سپرد کرو۔ اکثر وبیشتر اوقات میں ذکر اللہ کی کثرت جاری رکھو، ایک لمحہ اللہ تعالیٰ سے غافل نہ رہو۔ تو جب موت اسی حالت پر آئے گی تو یہ اسلام پر ہی شمار ہوگی، کیونکہ یہ بدیہی امر ہے کہ ہر شخص کی موت اس حال پر آئے گی جس حال میں وہ زندگی گزار رہا ہے۔ مسلمان کی موت اسلام پر، کافر کی کفر پر، نماز گزار کی مسجد میں، شرابی کی شراب خانہ میں، علیٰ ھذا القیاس۔

پس اسلام پر ہر لمحہ پابندی کرنے والے کی موت اسلام ہی پر ہوگی۔ اگر کوئی چاہے کہ میری موت تبلیغ پر ہو تو آسان ترکیب یہ ہے کہ پوری زندگی تبلیغ میں لگائے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ یہ چاہتے تھے کہ میری موت مدینہ طیبہ میں ہو، تو فیصلہ کیا کہ سوائے حجِ فرض کے باقی پوری زندگی مدینہ میں رہوں گا، کبھی ایک گھنٹہ کے لئے مدینہ سے باہر نہیں

جاؤں گا۔ چنانچہ ان کی موت حسبِ خواہش مدینہ میں واقع ہوئی۔ اللہ تعالیٰ شانہ ہمارے سب کی موت اسلام پر کردے۔ آمین

﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا﴾ تم سب مل کر اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑلو۔ ﴿حَبْلُ اللهِ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کی رسی سے مراد قرآن حکیم سرچشمۂ ہدایت ہے، جو قیامت میں تمہاری رہنمائی کرنے والا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إِنَّمَا سَتَكُونُ فِتْنَةٌ. قلت: مَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: كِتَابُ اللهِ، فِيهِ نَبَأُ مِنْ قَبْلِكُمْ وَخَبَرُ بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ وَهُوَ حَبْلُ اللهِ الْمَتِينُ. [ترمذی] فرمایا: لوگو! یادرکھو، ایک بڑا فتنہ آنے والا ہے، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس فتنہ سے بچ نکلنے کا کیا ذریعہ ہے؟ فرمایا: وہ ذریعہ کتاب اللہ ہے، جس میں تم سے پہلی اُمتوں کے واقعات ہیں، اور تمہارے بعد آنے والی اطلاعات واخبارات ہیں، اور تمہاری زندگی میں پیش آنے والے معاملات کے متعلق واضح احکام اور ہدایات ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے، روزِ اوّل، یومِ ازل سے، روزِ آخر حشر ونشر، دخولِ جنت ونار تک کے سارے حالات اور پوری اطلاعات اس میں موجود ہیں، جو اسے مضبوط پکڑے گا، اور اس کی ہدایات پر کاربند رہے گا وہ نجات پائے گا، اور جو اسے نظرانداز کرے گا وہ ہلاک ہوجائے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: اَلْقُرْآنُ كِتَابُ اللهِ حَبْلُ اللهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ. قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رسی ہے، جو آسمان سے زمین کی طرف لٹک رہی ہے۔

اس فرمان کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی گہرے کنویں میں گرجائے، تو لوگ کسی مضبوط رسی کے ذریعے اسے کنویں سے باہر اس طرح نکالتے ہیں کہ دو تین طاقتور آدمی مضبوط تر رسی کو کنویں میں لٹکا کر اس شخص کی کمر پر باندھ کر اسے آواز دیتے ہیں کہ: رسی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑیں، اس کاروائی کے بعد بسم اللہ کر کے اسے اوپر کھینچ کر باہر نکالتے ہیں۔ سیدنا یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قافلہ والوں نے اسی تدبیر سے باہر نکالا تھا۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ قرآن کریم کو ایک ایسی رسی کے ساتھ تشبیہ دی جارہی ہے، یا براہِ راست اُسے آسمان سے زمین کی طرف لٹکتی ہوئی رسی کہا جارہا ہے، اور مسلمانوں کو حکم دیا جارہا ہے کہ اس رسی کو سب مل کر مضبوطی کے ساتھ پکڑلو، تاکہ تم کامل متقی بن جاؤ، اور دوزخ کے گڑھے سے نجات پاکر جنت تک پہنچ جاؤ، کیونکہ دنیا دوزخ کا کنواں اور دوزخ کا ایریا (علاقہ) ہے، جنت کا ایریا (علاقہ) آسمانوں سے اوپر ہے، اور یہ رسی (قرآن) وہاں سے

لٹک کر تمہارے پاس آئی ہوئی ہے، اگر تم اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑو گے، تو یہ تمہیں اوپر کھینچ کر دنیا اور جہنم کے کنویں سے آسمان اور جنت تک پہنچا کر دوزخ کے ایریا سے نکال کر جنتوں تک پہنچائے گی۔

﴿وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾. اور حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنَ وَالْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَآءِ کے معنی یہی ہیں۔

اسی بنیاد پر وہ صحیح حدیث کی روایت ہے کہ جنت کے درجات قرآن کریم کی آیتوں کے برابر ہیں، اور قیامت کے دن باعمل حافظ وقاری قرآن سے کہا جائے گا: اِقْرَأْ وَارْتَقِ وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا فَاِنَّ مَنْزِلَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرَءُهَا. [الحدیث] قرآن کریم کو ترتیل کے ساتھ اسی طرح پڑھتا جا جیسے کہ دنیا میں پڑھتا تھا، اسی کے ساتھ جنت کے درجات پر چڑھتا جا، جہاں آپ کی آخری آیت کی تلاوت ہوگی وہاں جنت کا آخری درجہ ہوگا، وہی تمہاری ابدی منزل (ٹھکانا) ہوگی۔

سبحان اللہ! کیا شان ونزاکت ہے؟ کہ قرآن کی ہر آیت جنت کے ہر درجہ کے حصول کا ذریعہ ہے۔ سید کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تین چیزوں کو پسند فرمایا ہے، اور تین چیزوں کو ناپسند۔ پسندیدہ چیزیں یہ ہیں:

(۱) اوّل یہ کہ تم عبادت خاص اللہ تعالیٰ کے لئے کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

(۲) دوئم یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامو، اور نااتفاقی سے بچو۔

(۳) سوئم یہ کہ اپنے حکام اور اولوالامر کے حق میں خیر خواہی کا جذبہ رکھو۔ اور اللہ کی ناپسندیدہ چیزیں یہ ہیں:

☆ اوّل یہ کہ بغیر ضرورت قیل وقال، بحث ومباحثہ نہ کرو۔

☆ دوئم یہ کہ بلا ضرورت سوال کرنا۔

☆ سوئم اضاعت مال۔ یعنی غلط کاموں اور ناجائز امور اور رسومات میں مال خرچ کرنا۔ [مسلم، أحمد]

اسلامی وحدت واتفاق کی بنیاد قرآن کریم ہے:

وحدت واتفاق کے لئے ضروری ہے کہ اس وحدت کا کوئی غیر متزلزل پختہ مرکز ہو، کیونکہ مرکز کے بغیر مختلف الخیال اور مختلف نظریہ کے لوگوں کا اتحاد واتفاق ہر گز ممکن نہیں، کیونکہ ہر طبقہ، ہر جماعت، ہر فرد کا نظریہ اور خیال الگ الگ ہوتا ہے۔ پھر ہر طبقہ، اور ہر گروہ، اور ہر فرد وہر تنظیم دوسرے لوگوں کو اپنے خود ساختہ وخانہ ساز پروگرام پر متحدو

متفق رکھنا چاہتا ہے، اور اپنے خام خیالات کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ اور جبکہ دوسرے لوگ خود اپنا بنایا ہوا کوئی نظام و پروگرام رکھتے ہوں، تو وہ ان سے متفق ہونے کی بجائے ان کو اپنے پروگرام پر متحد ہونے کی دعوت دیتا ہے، اور اپنے پروگرام و نظریات کو حرف صحیح قرار دے کر دوسروں کے نظریات کو حرف غلط قرار دیتے ہیں۔ اور یہ مرض آئے دن ترقی کرتا ہوا تمام اتحادوں کو پارہ پارہ کر کے رکھ دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک دنیا کے علماء، عقلاء، لیڈر اور قومی رہنماؤں کا کسی ایک نظریہ اور ضابطۂ حیات پر اتفاق نہ ہوسکا۔

اس لئے قرآن کریم نے صرف اتحاد و اتفاق، اور تنظیم و اجتماع کا وعظ ہی نہیں فرمایا، بلکہ اس کے حاصل کرنے اور باقی رکھنے کا ایک ایسا منصفانہ اور عادلانہ، ہمہ گیر اصول بھی بتلادیا جس کے ماننے سے کسی گروہ کو اختلاف نہیں ہونا چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ کسی انسانی دماغ یا چند انسانوں کے بتائے ہوئے نظام و پروگرام کو دوسرے انسانوں پر تھوپ کر ان سے یہ امید رکھنا کہ وہ سب اس پر متفق ہو جائیں گے، عقل و انصاف کے خلاف اور خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔ البتہ خالقِ کائنات ربّ العٰلمین کا دیا ہوا نظام و پروگرام ضرور ایسی چیز ہے کہ اس پر سب انسانوں کو متفق ہونا ہی چاہئے۔ ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ [الملک: ۱۴] (کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا؟ جبکہ وہ بہت باریک بین، مکمل طور پر باخبر ہے)۔ اسی نکتۂ صداقت و انصاف کا ترجمان ہے۔

کوئی عقلمند انسان اس سے اصولاً انکار نہیں کرسکتا۔ اب اگر اختلاف کی کوئی راہ باقی رہتی ہے تو وہ صرف اس بات کے پہچاننے میں ہوسکتی ہے کہ ربّ العٰلمین اَحکم الحاکمین کا بھیجا ہوا نظام کیا، اور کونسا ہے؟ یہودی نظامِ تورات، کو اور عیسائی نظامِ انجیل کو خدا کا بھیجا ہوا واجب التعمیل بتلاتے ہیں، یہاں تک کہ مشرکین بت پرستوں کی مختلف جماعتیں بھی اپنی اپنی مذہبی رسوم کو خدا تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کرتی ہیں۔

لیکن اوّل تو اگر انسان اپنے جماعتی تعصب اور آبائی تقلید سے ذرّا بلند ہو کر اپنی عقلِ خداداد سے کام لے، تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آجاتی ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ تعالیٰ کا آخری پیام قرآن حکیم کی صورت میں لائے ہیں، آج اس کے سوا کوئی نظام خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں ہے۔ اس سے بھی قطع نظر کیجئے، تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخاطب مسلمان قوم ہے، ان کا ایمان اسی پر ہے کہ آج قرآن کریم ہی ایک ایسا پختہ نظامِ حیات ہے، جو بلا شبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوا ہے، اور چونکہ خود حق تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے، اس لئے قیامت تک اس میں کسی قسم کی تحریف اور ردو بدل کمی، بیشی کا امکان نہیں ہے۔

قرآن پر ایمان رکھنے والوں سے درخواست:

ہم سر دست غیر مسلموں اور غیر مسلم اقوام کو چھوڑ کر قرآن کریم پر ایمان رکھنے والوں سے درخواست اور التجاء کرتے ہیں کہ تمہارا تو صرف یہی لائحہ عمل ہے، کہ آپ تمام نظریات وخیالات اور خودساختہ نظامِ حیات کو چھوڑ کر ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا﴾ بنیں۔ اگر مسلمانوں کی مختلف پارٹیاں اور تنظیمیں قرآن کریم کے نظام پر متفق ہوجائیں، تو ہزاروں گروہی، نفسیاتی، لسانی، وطنی اور نسلی اختلافات، جو اغیار یہود ونصاریٰ کے پیدا کردہ ہیں، ایک لحظہ میں یکسر ختم ہوسکتے ہیں، جو انسانیت کی اور ہمارے اسلامی مذہبی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔

پھر اگر مسلمانوں میں کوئی باہمی اختلاف رہے گا تو وہ صرف فہمِ قرآن، اور تعبیرِ قرآن میں رہ سکتا ہے، اور اگر ایسا اختلاف فروعی اور حدود کے اندر رہے، تو نہ وہ مذموم ہوگا، اور نہ انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے مضر ونقصان دہ ہوگا، بلکہ ایسا اختلاف رائے عقلاء کے درمیان رہنا فطری امر ہے۔ پس اس پر قابو پانا، اور حدود کے اندر رکھنا کچھ دشوار نہیں ہے۔ بخلاف اس کے کہ قرآنی نظام سے بالکلیہ آزاد ہو کر ہمارے گروہ آپس میں لڑتے رہیں، اور پارٹیاں بڑی بیبا کی سے ایک دوسرے پر چڑھائی کرتی رہیں، تو اس وقت اس جنگ وجدال کا کوئی علاج نہ ہوگا۔

اور قرآن کریم نے ﴿وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ﴾ [الأنفال: ۴۶] (اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ تم کمزور پڑجاؤ گے، اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی) کا اعلان شائع کر کے اس قسم کے اختلاف وانتشار سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، اور آج اسی قرآنی اصول کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے ہماری پوری ملّتِ اسلامیہ انتشار وافتراق کے دلدل میں پھنس کر برباد ہو رہی ہے۔

تو قرآن کریم کی آیتِ مذکورہ میں اس لاعلاج افتراق کو مٹانے کا اکسیری نسخہ اس طرح واضح ہوا:

﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا﴾ تم سب مل کر اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو، اور افتراق سے بچو۔

قرآن کریم نے لسانی، وطنی، نسلی، جغرافیائی تمام بے سروپا خودساختہ وحدتوں پر کاری ضرب لگا کر ایک ہی مرکزی وحدت حَبلُ اللہ پر تمہیں جمع ہونے اور ڈٹ کر قائم رہنے کا حکم دیدیا ہے، اور یہ دوٹوک فیصلہ کر دیا کہ مؤمن عربی، فارسی، پنجابی، پشتون، بلوچ، سندھی سب ایک ہیں، اور ایک قوم ہیں، اور حَبلُ اللہ المتین سے وابستہ ہیں، ان سب کا ربّ ایک ہی ہے، نبی ایک، مذہب وملّت ایک، شریعت وقرآن ایک، دین وایمان ایک، اور قبلہ وکعبہ بھی

ایک۔

ہاں! یہ ضرور ہے کہ کافر جب حَبلُ اللہ سے وابستہ نہیں، اوران پاکیزہ وحدتوں سے محروم ہے، تو وہ دھرتی پر دوسری قوم کہلائے گی۔تو دنیا میں صرف دو ہی قومیں آباد ہیں: اوّل قوم مسلم، دوئم قوم کافر، تیسری کوئی نہیں۔

منفعت ایک ہے اس قوم کا، نقصان بھی ایک ☆ ایک ہے سب کا نبی، دین بھی ایمان بھی ایک

حرم پاک ـــــ بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک ☆ کیا بڑی بات تھی ہوتے تو مسلمان بھی ایک

اقوامِ عالم نے اپنی اپنی رائے کے مطابق مرکزِ وحدت مختلف قرار دیئے ہیں، کہیں نسل ونسب کے رشتوں کو مرکزِ وحدت سمجھا گیا، کہیں رنگتوں کو یہ درجہ دیا گیا، سفید وسیاہ پر قوموں کو تقسیم کیا گیا، کہیں وطن وزبان اور لسانیت کو وحدت کا معیار بنایا گیا، مگر قرآن حکیم نے ان تمام وحدتوں کا پردہ چاک کر کے ایک ہی مضبوط رسی کتاب اللہ کو معیارِ اصلی قرار دے کر حَبلُ اللہِ الْمَتِینُ کو پورے عالم کے لئے سرچشمۂ حیات اور بقاء انسانیت کا مرکز قرار دیا۔ اسی کے طفیل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے چاردانگ عالم پر اپنا اسلامی پرچم لہرایا، اور ہزاروں سالوں سے قائم عظیم ناقابلِ تسخیر سلطنتوں کوتہ وبالا کر کے رکھ دیا۔ یہ سب کچھ اسی حَبلُ اللہِ الْمَتِینُ کی برکت سے تھا۔

مگر صدمہ یہ ہوا کہ بعد کے آنے والوں نے ان کی تعلیمات اور کارناموں کی ناقدری کی، اورقرآنی تعلیمات اور سنّتِ مطہرہ کے فیوض وبرکات کو دنیا کی عیش وعشرت پر قربان کر کے خود بھی ذلیل ہوگئے، اور پوری امت کو بھی ناگفتہ بہ حالات سے دوچار کردیا۔

جب فضاء میں قرآنی تعلیمات کا معتدبہ چرچا مدہم ہوا، تو اغیار کو مداخلت کا موقع ملا۔ یورپ نے پورے زوروشور کے ساتھ اپنے کافرانہ نظریات کو ہمارے مسلمان ممالک میں پھیلانا شروع کیا، اور پورے اسلامی ممالک کو جغرافیائی اورادبی وتعلیمی لحاظ سے اپنی گرفت میں لے لیا، اوراس قدر تیزی کے ساتھ آگے بڑھا کہ مسلمان قوم اپنا نظریہ اوراسلامی اقدار سارے بھول گئے۔ پھراسلامی تعلیمات پر قدغن لگا کر اپنا ناکارہ اسلام دشمن نظامِ تعلیم بآسانی ان پر مسلط کیا۔ یہاں تک کہ آج کا عالمِ دین متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

آج اہلِ مدارس بھی یہی سوچ رہے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مدارس میں عصری یورپی تعلیم کی کچھ چاشنی بھی ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سونے کی پلیٹ میں پاخانہ رکھا جائے۔ برین عقل ودانش بباید گریست۔

اللہ تعالیٰ اس اُمت پر رحم فرمائے، اوروارثانِ نبوت کو سمجھ عطا فرمائے، اوراپنے اسلاف کے نقش قدم پر

چلنے کی توفیق دے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. آمین

﴿وَلَا تَفَرَّقُوْا﴾ آپس میں تفرقہ واختلاف نہ کرو۔ اس جملہ کا ایک مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ پورے قرآن کو مانو، اور آپس میں بھی تفرقہ نہ کرو، کہ کچھ مانو اور کچھ نہ مانو، یا کوئی مانے اور کوئی نہ مانے، بلکہ سب مل کر پورے قرآن کو پکڑے رہو۔ یعنی اہلِ کتاب کی طرح مت بنو۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو حالت بنی اسرائیل کی ہوئی، وہی حالت میری اُمت پر آئے گی۔ یہ لوگ بھی بنی اسرائیل کے نقشِ قدم پر چلیں گے، یہاں تک کہ بنی اسرائیل میں سے اگر کسی نے اپنی ماں سے علانیہ زنا کیا ہوگا، تو میری اُمت میں بھی کوئی ایسا کرے گا۔ بنی اسرائیل بٹ کر بہتر (۷۲) فرقے بن گئے تھے، اور میری اُمت تہتر (۷۳) فرقوں میں تقسیم ہوجائے گی، جن میں سے سوائے ایک فرقے کے سب دوزخی ہوجائیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ نجات پانے والا فرقہ کونسا ہوگا؟ فرمایا: وہ نجات پانے والا فرقہ وہی ہوگا جو میرے اور میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے طریقہ پر ہوگا۔ [ترمذی]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ: بہتر (۷۲) فرقے دوذخ میں، اور ایک جنت میں ہوگا، اور وہ ایک نجات یافتہ فرقہ جماعت ہے۔ اور میری اُمت میں سے عنقریب کچھ جماعتیں ایسی نکلیں گی کہ خواہشات ان کے رگ وپے میں گھس جائیں گی، اور انہیں ہلاک کریں گی، جیسے داء الکلب کی بیماری اپنے مریض کے جسم میں گھس جائے گی، کوئی رگ، کوئی جوڑ ایسا نہیں رہے گا کہ یہ بیماری اس میں سرایت نہ کرے۔ [مظھري بحواله أحمد وأبوداؤد]

فائدہ:

یہاں چار جملوں میں عجیب نظم وارتباط رکھا گیا ہے، ہر آنے والا جملہ سابق جملہ کا ثمرہ ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کا ثمرہ ﴿اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ ہے، کیونکہ تقویٰ ایمان کا پھل اور ثمرہ ہے۔ پھر ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ﴾ یہ تقویٰ کا ثمرہ ہے، کیونکہ اعتصام بحبل اللہ کا وجود تقویٰ پر موقوف ہے، جبکہ اعتصام بحبل اللہ کا پھل وثمرہ ﴿وَلَا تَفَرَّقُوْا﴾ ہے، کیونکہ اعتصام کی برکت سے لازماً اتفاق پیدا ہوتا ہے، جو کہ تفرقہ کی ضد ہے۔

☆ ☆ ☆

بہر حال! ان آیات میں مسلمانوں کے لئے چند ہدایات ہیں:

(۱) تمام دنیا کے مسلمانوں کو چاہئے کہ توحید باری تعالیٰ کو حرزِ جان بنائیں۔(۲) تقویٰ کو اپنا شعار بنائیں۔(۳) اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں۔(۴) اتفاق واتحاد پر جم کر قائم رہیں۔(۵) ہر قسم کی فرقہ بندی واختلاف سے دور رہیں۔

﴿وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَآءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ﴾ [الآیہ]

اللہ تعالیٰ کے اُن احسانات کو یاد کرو جو اس نے تم پر کئے، بلکہ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے، اور جاہلی عصبیت میں ڈوبے ہوئے تھے، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، ذرّا ذرّا سی بات پر لڑنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے، ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں اُلفت ومحبت ڈال دی، پرانی صدیوں سے نفرت و عداوت کے اثرات ختم کر کے اسلام کی بدولت باہم سب کو شیر وشکر بنا دیئے۔

یعنی یہ کس قدر عظیم الشان نعمت ہے کہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ایک جگری دوست بن گئے، کہ ایک کے پسینہ کی جگہ دوسرا اپنا خون بہانے کو تیار رہا۔ یہ اسلامی اور جانی محبت واُلفت دنیا کی تاریخ کا بے مثال نمونہ ہے۔ سورۃ انفال میں ارشاد ہے: ﴿وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ﴾ [الأنفال: ۶۳] یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اُلفت پیدا کی، اگر آپ پوری دنیا کے خزانے بھی خرچ کر دیتے تو ان کے درمیان پیار ومحبت کی فضاء قائم نہ کر سکتے۔

یہ تو ایمان اور اسلام کی اُلفت ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر ﷺ کو مبعوث فرما کر ان کے درمیان پیدا کی، اور اپنی آخری کتاب نازل فرما کر ﴿مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ﴾ [الإسراء: ۸۲] (جو شفاء اور رحمت ہے مؤمنوں کے لئے) کے طفیل سے تمہیں ہزاروں روحانی بیماریوں سے صحت وتندرستی عطا فرمائی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ:

﴿فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا﴾ تم اللہ تعالیٰ کے فضل سے آپس میں شیر وشکر بن کر بھائی بھائی بن گئے۔ تمہاری صدیوں کی عداوتیں یک لخت ختم ہوئیں، اور قبائلی وخاندانی عصبیتوں کے طلسم ٹوٹ گئے، اور صدیوں سے جاہلیت کی شکار قوم تہذیب وتمدن کے بامِ عروج پر پہنچ گئی۔ یہ سب کچھ اسلام کی بدولت نصیب ہوا۔

اور یہ بھی یاد رکھو کہ: ﴿وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾ تم کفر وضلالت کی وجہ

سے جہنم کے گڑھے کے کنارہ پر تھے، موت آنے کے ساتھ تم اس گڑھے میں (جہنم) میں گر جاتے، اور ابدی جہنم میں خوار وذلیل ہو جاتے، مگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس گڑھے میں گرنے سے بچالیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقہ ہے، قرآن کریم کی رحمت ہے، اور اسلام کی برکت ہے، کہ تمہیں کامیابی نصیب ہوگئی، اور رہتی دنیا تک تمہارا ذکرِ خیر رہے گا، اور لوگ تمہارے حق میں رضي الله عنهم کہتے رہیں گے۔

﴿كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾

اسی طرح اللہ تعالیٰ کھول کھول کر تمہارے لئے احکام واصول بیان فرماتا ہے، اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے، تاکہ تم ہر قسم کی تاریکیوں سے نکل کر روشنی اور ہدایت سے فائدہ مند بن جاؤ، اور اسلامی ہدایات وانوار سے مستفیض ومستفید رہو، اور جنت کے بالاخانوں تک تمہیں پہنچنا نصیب ہو۔

﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾

اسلامی زندگی ایک متحرک گاڑی کی مانند ہے، جو دو پہیوں پر شب وروز رواں دواں ہو، ایک اصلاحِ نفس، دوئم اصلاحِ خلق۔ گزشتہ آیات میں اصلاحِ نفس کا بیان ہوا، اور اب اصلاحِ خلق کا بیان ہورہا ہے۔ تو فرمایا کہ تم میں ایک گروہ یا جماعت ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کو خیر (کتاب وسنت) کی طرف دعوت دے، جب یہ اُمت خود سراسر مجسمۂ خیر وبرکت ہے، جیسے آئندہ ارشاد ہے: ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾. [آل عمران: ۱۱۰] (تم وہ بہترین امت ہو جو پیدا کی گئی ہے لوگوں (کے فائدہ) کے لئے، تم حکم دیتے ہو اچھائی کا، اور منع کرتے ہو برائی سے، اور ایمان رکھتے ہو اللہ پر)۔

تو ضروری ہوا کہ اس میں ایک ایسی جماعت مستعد ہو جو شب وروز اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی کی خاطر لوگوں کو خیر کی دعوت دے، اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے، اور دعوت وارشاد کا سلسلہ جاری رکھے۔ حدیث شریف میں روایت ہے سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلْخَيْرُ اِتِّبَاعُ الْقُرآنِ وَالسُّنَة. یعنی خیر سے مراد قرآن وسنت کا اتباع ہی ہے۔ [أحمد، ترمذي، ابن ماجه]

مسلمانوں کی قومی اور اجتماعی فلاح دو چیزوں پر موقوف ہے:

پہلے تقویٰ اور اِعْتِصَام بِحَبْلِ الله کے ذریعہ اپنی اصلاح، دوسرے دعوت وتبلیغ کے ذریعہ دوسروں کی اصلاح۔ آیت ﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ﴾ میں اسی دوسری ہدایت کا بیان ہے۔ گویا ان دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ خود

بھی اپنے اعمال و اخلاق کو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے قانون کے مطابق درست کرو، اور اپنے دوسرے بھائیوں کے اعمال کو درست کرنے کی بھی فکر و اہتمام کرو۔

یہی مضمون سورۃ العصر میں موجود ہے: ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳﴾ [العصر] یعنی آخرت کے خسارہ سے صرف وہ لوگ محفوظ رہیں گے جو خود بھی ایمان اور عملِ صالح کے پابند ہوں، اور دوسروں کو بھی عقیدۂ صحیحہ اور اعمالِ صالحہ کی ہدایت کرتے رہتے ہیں۔

قومی اور اجتماعی زندگی کے لئے جس طرح یہ ضروری تھا کہ ان کا کوئی مضبوط و مستحکم رشتۂ وحدت ہو، جس کو پہلی آیت میں اِعْتِصَام بِحَبْلِ اللّٰہ کے الفاظ سے واضح فرمایا گیا ہے۔ اسی رشتہ کو قائم اور باقی رکھنے کے لئے یہ دوسرا عمل بھی ضروری ہے، جو اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ یعنی دوسرے بھائیوں کو احکامِ قرآن و سنت کے مطابق اعمالِ صالحہ کی ہدایت، اور برے کاموں سے روکنے کو ہر شخص اپنا فریضہ سمجھے، اور اقدام کرے تاکہ یہ حَبْلُ اللّٰہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے، کیونکہ یہ رسی ٹوٹ تو نہیں سکتی، ہاں چھوٹ سکتی ہے۔

اس لئے قرآن حکیم نے اس رسی کے چھوٹ جانے کے خطرے کے پیشِ نظر یہ ہدایت جاری فرمائی کہ ہر مسلمان جس طرح خود نیک عمل کرنے کو، اور گناہ سے بچنے کو اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے، تو اس کو بھی ضروری سمجھے کہ دوسرے لوگوں کو بھی نیک عمل کی ہدایت، اور برے اعمال سے روکنے کی کوشش کرتا رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ سب مل کر مضبوطی کے ساتھ حَبْلُ اللّٰہ کو تھامے رہیں گے، اور اس کے نتیجہ میں فلاح دنیا و آخرت ان کے ساتھ ہوگی ببرکت امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

اپنی اصلاح کے ساتھ دوسروں کی اصلاح کی ذمہ داری ہر مسلمان پر ڈالنے کے لئے قرآن حکیم میں بہت سے واضح ارشادات وارد ہیں۔ سورۃ آل عمران میں بھی ارشاد ہے، جو آئندہ آنے والی آیت: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ تم بہترین اُمت ہو، جو لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے، کیونکہ تم نیک کاموں کا لوگوں کو امر کرتے ہو، اور برے کاموں سے روکتے ہو۔

اس میں بھی پوری اُمت پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ عائد کیا گیا ہے، اور دوسری امتوں پر اس کی بہتری و فضیلت کا سبب ہی اس خاص کام کو بتلایا گیا ہے۔ اسی طرح سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات اس بارے میں بے شمار ہیں۔ ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ

لَتَأمُرُنَّ بالمَعرُوفِ وَلَتَنهَوُنَّ عَنِ المُنكَرِ أو لَيوشِكَنَّ اللهُ أنْ يَبعَثَ عَلَيكُمْ عِقَابًا مِنْ عِندِهٖ ثُمَّ لَتَدعُنَهٗ فَلَا يَستَجِيبُ لَكُمْ. وفي رواية: ثُمَّ يَدعُو خِيَارُكُمْ فَلَا يُستَجَابُ لَهُمْ۔ یعنی قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تم ضرور بضرور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے رہو، ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں کے ساتھ تم سب پر بھی اپنا عذاب بھیج دے، اس وقت تم خدا تعالیٰ سے دعاء مانگو گے، یا تمہارے نیک لوگ دعاء کریں گے تو قبول نہ ہوگی۔

موجودہ زمانہ اور ہمارے مسلمانوں کا معاشرہ اتنا زیادہ غیر اسلامی بن چکا ہے کہ کھلم کھلا گناہوں اور غیر اسلامی کاموں کا فخریہ طور پر مظاہرہ ہو رہا ہے۔ زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی اجتماعی یا شخصی اسلامی نہیں ہے۔ اتنی تباہی پھیل رہی ہے جسے دیکھ کر حیا کی آنکھیں جھک کر پست ہو جاتی ہیں، اور نیک لوگ شب و روز دعاؤں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہیں، مگر عام لوگ، خاص کر سرمایہ دار طبقہ ان کا مذاق اڑا رہا ہے۔

پورے ملک میں ہر جگہ شہروں، بستیوں میں، سڑکوں پر، بازاروں میں، گلی کوچوں میں قتل وغارت کا بازار گرم ہے، اور بے انتہا بدامنی، چوری، ڈکیتی، لوٹ مار اپنے عروج پر ہے۔

بیماریوں کی کثرت ہے۔ مہنگائی حد سے زیادہ ہے۔ ملک میں قحط اور ہر قسم کی بدامنی ہے۔ یہی تو عذابِ خداوندی ہے، جس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں، کیونکہ اس اُمت پر آسمانی عذابوں کا دروازہ تو بند ہے، پس یہی غیر یقینی حالات ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہوئے عذاب شمار ہوں گے، جس کے نتیجے میں نہ کسی کی جان محفوظ ہے، نہ عزّت آبرو وعفت، اور نہ ہی مال۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے: مَنْ رَآى مِنكُمْ مُنكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَإِنْ لَمْ يَستَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ وَإِنْ لَمْ يَستَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ. [مسلم عن أبی سعید الخدری] یعنی تم میں سے جو شخص کوئی گناہ ہوتا ہوا دیکھے، تو چاہئے کہ اس کو اپنے ہاتھ اور قوت سے روک دے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے، تو زبان سے بدل دے، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو کم از کم دل میں اس گناہ کو برا سمجھے، اور یہ ادنیٰ درجہ کا ایمان ہے، اس سے آگے ایمان کا ایک ادنی رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی درجہ نہیں۔ وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ اِيْمَانٍ۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: میں نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، فرما رہے تھے کہ اگر لوگ بدکاریاں دیکھ کر اس کو بدلنے کی کوشش ہاتھ سے، یا زبان یا دل سے نہیں کریں گے، تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان

سب پر اپنا عمومی عذاب بھیج دے۔ [ترمذي، أبو داؤد، ابن ماجه]

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مسلمان پر فرض ہے:

بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آیت کریمہ ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ﴾ میں "مِنْ" تبعیضیہ ہے، اور "أُمَّةٌ" سے مراد ایک گروہ، اور ایک خاص جماعت ہے، نہ کہ پوری اُمت کا ہر فرد۔

دوئم یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے باقاعدہ علم ضروری ہے، اور یہ ہر شخص پر فرض نہیں، بدلیلِ قولہ تعالیٰ: ﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ﴾ [التوبة: ۱۲۲] (ایسا کیوں نہ ہو کہ ہر بڑی جماعت میں سے ایک گروہ نکلے، تاکہ دین کی سمجھ حاصل کریں)۔ اس آیت کریمہ کے تحت مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم نے لکھا کہ جس طرح جہاد فرضِ کفایہ ہے، اسی طرح طلبِ علم بھی فرضِ کفایہ ہے۔

سوئم یہ کہ جس طرح جہاد پر ہر شخص استطاعت نہیں رکھتا، اسی طرح ہر شخص کے لئے بھی طلبِ علم ناممکن ہے۔

مگر جمہور علماء کرام رحمۃ اللہ علیہم کا مذہب یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر شخص پر فرض ہے، کیونکہ ہر شخص کا دائرۂ اختیار اور ادائیگی فرض اسی کی استطاعت پر مبنی ہے۔ اور بعض امور ایسے سہل اور بدیہی ہوتے ہیں جہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بغیر علم کے بھی ممکن ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ گزشتہ آیات اور احادیث سے یہی ثابت ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اُمت کے ہر فرد پر لازم ہے، البتہ! تمام احکامِ شرعیہ کی طرح اس میں بھی ہر شخص کی قدرت واستطاعت پر احکام دائر ہوں گے، جس کو جتنی قدرت ہوا تنا ہی امر بالمعروف کا فریضہ اس پر عائد ہوگا۔ ابھی حدیث گزری جس میں دو مرتبہ "فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ" کے الفاظ مذکور ہوئے، وہ اسی استطاعت کی کم وبیش کی غمازی تھی۔

یہ ظاہر بات ہے کہ بعض نیکیاں، اور اسی طرح کچھ برائیاں اس قدر شہرت وتواتر کے درجے میں ہوتی ہیں، جنہیں سب لوگ، خواہ وہ علم والے ہوں، یا ناخواندہ، سب کے سامنے واضح ہوتی ہیں۔ مثلاً نماز، زکوٰۃ، روزہ اور صدقہ، سچائی، غریب پروری، یا گناہ، جیسے بے نمازی، جھوٹ، چوری، شراب نوشی، تو کیا ان بدیہی نیکیوں کے لئے اگر امر بالمعروف کا فریضہ انجام دینا ہو عالم ہونا ضروری ہے؟ یا ان بدیہی گناہوں سے منع کرنے کیلئے عالم فاضل ہونا شرط ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ ہر شخص اگرچہ وہ اَن پڑھ کیوں نہ ہو ایسے امورِ بدیہہ میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا مجاز

ہوگا۔ والدین اَن پڑھ ہوتے ہوئے صبح وشام اپنی اولاد اور دیگر رشتہ داروں کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے تھکتے نہیں۔

البتہ دیگر بڑے نظری اور پیچیدہ مسائل میں یہ ضروری ہے کہ علم کے بغیر وہاں رائے زنی نہ ہو۔ پھر استطاعت وقدرت ہر کام کی جدا ہوتی ہے۔ امر بالمعروف کی قدرت پہلے تو اس پر موقوف ہے کہ وہ معروف ومنکر اس شخص کو پوری طرح صحیح صحیح معلوم ہو۔

پھر جس کو خود ہی معروف ومنکر کی تمیز نہ ہو، اور معروف ومنکر سے وہ سراسر ناواقف ہو، یا اس مسئلہ کا پورا علم نہ ہو، وہ اگر دوسروں کو امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کرنا شروع کرے، تو ظاہر ہے کہ بجائے اصلاح ہونے کے فساد ہوگا۔ اور یہ ممکن ہے کہ ایک شخص اپنی بے علمی کی وجہ سے کسی معروف کو منع کرنے لگے، یا کسی منکر کا حکم کرنے لگے، لہٰذا اتنا ضروری ہے کہ جب تک مسائل سے پوری واقفیت نہ ہو، اس وقت تک تعلیم کرنا، تبلیغ کرنا، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنا، لوگوں کو مسائل کی تلقین کرنا، فتویٰ دینا سب ممنوع ہیں۔

دیکھئے! تبلیغی جماعت کے بانی ہمارے علماء دیوبند میں سے ہیں، دیوبند کے وہ نابغۂ روزگار شیوخ و محدّث، محقق، علمِ حدیث وتفسیر قرآن کے مانے ہوئے امام، جو اپنے خداداد علم وتقویٰ کے اعتبار سے سلفِ صالحین کے نمونہ تھے، اس تبلیغی جماعت کی انہوں نے سرپرستی اور آبیاری فرمائی۔ انہوں نے تبلیغ میں جڑے ہوئے بے علم عوام کو باور کرایا کہ پوری اُمت میں ہدایت کو عام کرنا، گھر گھر تک قرآن وحدیث کی تعلیمات کو پہنچانا، اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ کو انجام دینا، اور لوگوں میں یہ خوبصورت عقیدہ قائم کرنا کہ اللہ تعالیٰ سے سب کچھ ہونے کا، اور مخلوق سے کچھ نہ ہونے کا عقیدہ رکھو۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اس جماعت نے لاکھوں کی تعداد میں خلوص وللّٰہیت سے تبلیغِ دین کا بیڑا اٹھا کر چاردانگ عالم کا رُخ کر کے کروڑوں لوگوں کی تقدیر بدل ڈالی، اور کروڑوں بے نمازوں کو پابند صوم وصلوٰۃ بنا کر بے شمار انسانوں کو شرک وکفر کی تاریک گھاٹیوں سے نکال کر توحید پر لگا دیا، اور جہنمی گڑھوں سے نکال کر جنت کا راستہ ہموار کیا۔ یہ لوگ علماء نہیں ہیں، مشائخ نہیں ہیں، دینی مدارس سے فارغ شدہ نہیں ہیں، غالب اکثریت میں بے علم عوام الناس ہیں۔ ان میں علماء آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔

روزِ اوّل سے آج تک عوامی، مشہور، متداول، نہایت سہل، بدیہی مسائل کے سلسلے میں امر بالمعروف اور

نہی عن المنکر کے سلسلے کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ پیچیدہ سخت مختلف فیہ گہرے علمی مسائل کو آج تک نہ چھیڑا، اور نہ ہی بیان کیا۔ اگر کسی نے استدلال ونظر پر مبنی مسئلہ پوچھا، تو کہتے ہیں کہ یہ مسائل بڑے علماء کرام سے پوچھیں، ہمیں ایسے مسائل کی زحمت نہ دیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ معروف ومنکرات کے بے شمار اور مختلف مراتب ومسائل ہیں، ان سب کی اصلاح کے لئے باقاعدہ معیاری علم کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ البتہ بعض مسائل جو گہرے سخت ہوں، یا استدلالی نظری ہوں، یا خاص علمی پیچیدہ ہوں، تب تو ضروری ہے کہ ایسے مسائل کو بغیر معیاری علم کے بیان نہ کیا جائے، اور امر بالمعروف کے سلسلہ کو بند کیا جائے، تاکہ جائز ناجائز کے ساتھ، اور حرام حلال کے ساتھ خلط ملط نہ ہوں۔ لہٰذا جمہور علماء کا مسلک أَقْرَبْ إِلَى الصَّوَاب ہے، کہ حسبِ معلومات واستطاعت بدیہی اور مشہور احکام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اُمت کے ہر فرد پر اپنے دائرہ میں فرض ہے۔ واللہ اعلم

فائدہ:

جب ہم نے کہا کہ اُمت کے ہر فرد پر اس کی قدرت واستطاعت کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض ہے، لیکن اس وجوب وفرضیت کی تفصیل اس طرح ہے کہ امورِ واجبہ میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر واجب ہے، اور امورِ مستحبہ میں مستحب ہے، اور مباح امور میں مباح ہے۔ مثلاً نماز، روزہ فرض ہیں، تو وہاں نماز اور روزہ کا حکم کرنا بھی فرض ہوگا، اور نوافل ومستحبات کے متعلق حکم کرنا مستحب ہوگا، وغیرہ۔

آیت کے اختتام پر اس جماعت کے انجامِ محمودہ اور عاقبتِ سعیدہ کا بیان یہ ہے: ﴿وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ یعنی درحقیت کامیاب یہی لوگ ہیں، اور فلاح وسعادتِ دارین انہی کا حصہ ہے۔ کلمہ "فَلَاح" اتنا جامع لفظ ہے کہ تمام کامیابیوں کو شامل ہے۔

اس جماعت کا سب سے پہلا اور حقیقی مصداق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، جو دعوت الی الخیر، امر بالمعروف نہی عن المنکر، اور اعتصام بحبل اللہ، اور تقویٰ وطہارت کے عظیم مقاصد کو لے کر خالی ہاتھ، اعتماد وتوکّل علی اللہ کی دولت کو ہاتھ میں لے کر پورے عالم پر چھا گئے، اور قلیل عرصہ میں سارے جہاں کے سورماؤں اور عظیم چٹانوں سے ٹکرا کر انہیں پارہ پارہ کیا۔ دشتوں، صحراؤں، دریاؤں کو بغیر کشتی پار کر کے پوری اور ساری ظلمتوں کو مٹا کر نورِ قرآن سے دنیا کو روشن کر دیا۔

روم وایران کے ہزاروں سالوں سے قائم عظیم سلطنتوں کو روند ڈالا، اور دنیا کے اکناف واطراف تک پاکیزہ اخلاق ومحمودہ اعمال کا راج قائم کیا۔ نیکی اور تقویٰ کی شمعیں روشن کیں۔ عدل وانصاف کے وہ ریکارڈ قائم کئے کہ فرشتوں کو رشک آیا۔ اونٹوں کے چرواہے عدل وحکمرانی کے نمونے ثابت ہوئے۔ یہ سب کچھ آپ ﷺ کی صحبت کا اثر اور قرآنی انوار کا کرشمہ تھا۔

تیری فیاضی نے ذروں کو بنایا آفتاب ☆ بن گئے اونٹوں کے چرواہے زمانے کے امام

جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے ☆ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٥﴾ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿١٠٦﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١٠٧﴾ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۗ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِلْعَالَمِينَ ﴿١٠٨﴾ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿١٠٩﴾

ترجمہ: تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوں جنہوں نے تفرقہ ڈالا، اور اختلاف کیا، جبکہ ان کے پاس کھلی نشانیاں آچکیں، اور یہی لوگ ہیں جن کے لئے بڑا عذاب ہے ﴿١٠٥﴾ جس دن کئی چہرے سفید ہوں گے، اور کئی چہرے سیاہ ہوں گے، بہرحال وہ لوگ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے (ان سے کہا جائے گا): کیا تم نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا؟ پس عذاب چکھو، یہ بدلہ ہے اس کا جو تم کفر کرتے تھے ﴿١٠٦﴾ اور بہرحال، وہ لوگ جن کے چہرے سفید ہوں گے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں ہوں گے، اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ﴿١٠٧﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں، جنہیں ہم آپ پر حق کے ساتھ پڑھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ظلم کا ارادہ نہیں کرتا جہاں والوں پر ﴿١٠٨﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹائے جائیں گے ﴿١٠٩﴾

معارف ومنازل

یہ آیت درحقیقت آیت ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا﴾ کا تتمہ ہے۔ وہاں کا حکم اثبات میں بیان ہوا،

اور اب کا حکم نفی میں ہے، کیونکہ اعتصام تب مکمل ہوگا جب تفرقہ نہ ہو۔ گویا اس آیت میں ہدایت دی جا رہی ہے کہ یہود و نصاریٰ کی طرح نہ بنو، جنہوں نے واضح اور روشن دلائل آنے کے بعد اپنی خواہشات کی خاطر اختلاف کیا، اور تباہ ہو گئے، مغضوب وملعون ہو گئے۔ فرمایا: ﴿لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنۢ بَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُۥدَ وَعِيسَى ٱبۡنِ مَرۡيَمَ﴾ [المائدة:۷۸] (لعنت کی گئی ہے ان لوگوں پر جنہوں نے کفر کیا بنی اسرائیل میں سے داؤد (علیہ السلام) کی زبان پر، اور عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کی زبان پر)۔ اندازہ لگائیے کہ ان کے اپنے پیغمبروں نے انہیں مغضوب وملعون قرار دیا۔ پس اے مسلمانو! ان سے عبرت حاصل کرو، اور اپنے اندر یہ مرض پیدا نہ ہونے دو۔

آیت میں جس تفرق و اختلاف کی مذمت ہے، اس سے مراد وہ تفریق ہے جو اصولِ دین میں ہو، یا فروع میں نفسانیت و خواہشات کے غلبہ کی وجہ سے ہو، چنانچہ آیت میں یہ قید "کہ احکامِ واضحہ آنے کے بعد" اس بات پر واضح قرینہ ہے، کیونکہ اصولِ دین سب واضح ہوتے ہیں، اور بعض فروع بھی ایسے واضح ہوتے ہیں کہ اگر نفسانیت نہ ہو تو اختلاف کی گنجائش نہ ہوگی۔

لیکن جو فروع غیر واضح ہیں، کسی نصِ صریح نہ ہونے کی وجہ سے، یا نصوص کے ظاہری تعارض کی وجہ سے ایسے فروع میں رائے واجتہاد سے جو اختلاف پیدا ہوتا ہے، وہ اس آیت کے مفہوم میں داخل نہیں ہے۔ اور وہ حدیثِ صحیح اس کی اجازت کے لئے کافی ہے، جس کو بخاری و مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے مرفوعاً حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب کوئی اجتہاد کرے، اور وہ حکم ٹھیک ہو، تو اس کو دو اجر ملتے ہیں، اور جب اجتہاد میں غلطی کرے تو اس کو ایک اجر ملتا ہے۔ [متفق علیه]

عبد بن حمید رحمۃ اللہ علیہ نے مسند میں، اور دارمی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے سنن میں، اور عبدری رحمۃ اللہ علیہ نے الجمع بین الصحیحین میں، اور ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے اپنے ربّ سے اپنے ساتھیوں کے اس اختلاف کے متعلق دریافت کیا، جو میرے بعد ہوگا (کہ ان لوگوں کا کیا ہوگا؟) اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) تیرے ساتھی میرے نزدیک ستاروں کی طرح ہیں، بعض بعض سے زیادہ قوی (روشنی والے) ہیں۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ بعض بعض سے زیادہ روشن ہیں، اور روشنی ہر ایک میں ہے۔ اب اختلافی مسائل میں جو بھی جس مسلک کو لے گا وہ میرے نزدیک ہدایت پر ہوگا۔ [رواه الدارقطني رحمه الله في فضائل الصحابة وبن عبدالبر رحمه الله عن جابر رضي الله عنه والبيهقي رحمه الله في

المدخل عن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما]

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے سندِ ضعیف کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم کو جو کچھ (حکم) اللہ تعالیٰ کی کتاب سے دیا گیا ہے، اس پر عمل کرو، کسی کے لئے کتاب اللہ کو ترک کرنے کا عذر نہیں ہوسکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں نہ ہوتو نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت فیصلہ کن ہے۔ اگر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت میں بھی نہ ہوتو جو کچھ میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کہیں (اس پر عمل کرو)۔ میرے اصحاب آسمان کے ستاروں کی طرح ہیں، جس کو پکڑلو گے (اس کی اقتداء کرو گے) ہدایت پاؤ گے۔ میرے اصحاب کا اختلاف تمہارے لئے رحمت ہے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے المدخل میں، اورابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے طبقات میں حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہم کا قول نقل کیا ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کا اختلاف اللہ تعالیٰ کے بندوں کے لئے رحمت ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امیر المؤمنین عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔[مظہری]

﴿وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ یعنی قطعی دلائل کے بعد جن لوگوں نے تفرقہ کیا تو ان کے لئے عذابِ عظیم ہے۔

﴿يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ﴾ وُجُوْهٌ میں دونوں جگہ تنوینِ مضاف الیہ کے عوض میں آئی ہے۔ یعنی تَبْيَضُّ وُجُوْهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَتَسْوَدُّ وُجُوْهُ الْكٰفِرِيْنَ۔ مؤمنون کے چہرے سفید نورانی ہوں گے، اور کافروں کے چہرے کالے سیاہ ہوں گے۔ تنوین تکثیر کے لئے بھی ہوسکتی ہے۔ یعنی بہت سے چہرے گورے، اور بہت سے چہرے سیاہ ہوں گے۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ اہلِ سنت کے چہرے گورے، اور اہلِ بدعت کے چہرے سیاہ ہوں گے۔

دیلمی رحمۃ اللہ علیہ نے مسند الفردوس میں ضعیف سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول لکھا ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اہلسنت کے چہرے گورے، اور اہلِ بدعت کے کالے ہوں گے۔

چہرے کی سفیدی، اور سیاہی سے کیا مراد ہے؟

چہرے کی سفیدی اور سیاہی کا ذکر قرآن کریم میں بہت سے مقامات میں آیا ہے۔ مثلاً: ﴿وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ﴾ [الزمر: ۶۰] (اور قیامت کے دن تو دیکھے گا ان لوگوں کو جنہوں

نے اللہ پر جھوٹ بولا تھا کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے)۔ ﴿وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ مُّسۡفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسۡتَبۡشِرَةٌ وَوُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ عَلَیۡهَا غَبَرَةٌ تَرۡهَقُهَا قَتَرَةٌ﴾ [عبس: ۴۱] (اس روز کتنے چہرے تو چمکتے دمکتے ہوں گے۔ ہنستے، خوشی مناتے ہوئے۔ اور کتنے چہرے اس دن ایسے ہوں گے کہ ان پر خاک پڑی ہوگی۔ سیاہی نے انہیں ڈھانپ رکھا ہوگا)۔ ﴿وُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ وَوُجُوۡهٌ یَّوۡمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾ تَظُنُّ اَنۡ یُّفۡعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۲۵﴾﴾ [القیمة] (اس دن بہت سے چہرے شاداب ہوں گے۔ اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ اور بہت سے چہرے اس دن بگڑے ہوئے ہوں گے۔ سمجھ رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ وہ معاملہ ہوگا جو کمر توڑ دینے والا ہے)۔

ان آیات میں ایک ہی مفہوم سے متعلق متعدد الفاظ ذکر کئے گئے ہیں۔ یعنی بیاض اور سواد۔ غَبَرَة۔ قَتَرَة۔ نَضِرَة اور بَاسِرَة۔ جمہور مفسرین کے نزدیک سفیدی سے مراد نورِ ایمان کی روشنی ہے۔ یعنی مؤمنین کے چہرے نورِ ایمان سے روشن اور غایتِ مسرت سے چمکدار، خنداں وفرحاں ہوں گے۔ اور سیاہی سے مراد کفر، نفاق، بدعات کی سیاہی ہے، یعنی اعتقادی کفار اور عملی کفار کے چہروں پر سیاہی کی کدورت چھائی ہوگی، اور اوپر سے فسق وفجور کی ظلمت اور زیادہ، تیرہ وتاریک کردے گی۔

سفید چہرے والے، اور سیاہ چہرے والے کون لوگ ہیں؟

ان لوگوں کی تعیین میں مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم کے متعدد اقول ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت گزر چکی ہے کہ سفید چہرے والے اہلسنت والجماعۃ کے لوگ ہیں۔ اور اہلِ بدعت کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ یہ حکم عمومی ہے، اس آخری اُمت کے لوگوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ پس مطلب یہی ہوگا کہ ہر اُمت میں جن لوگوں نے صحیح معنوں میں انبیاء کرام علیہم السلام کی اطاعت کی ہے، اور ان کی تعلیمات پر بغیر کسی کمی بیشی کے مکمل عمل کیا ہے، تو ان کے چہرے سفید نورانی ہوں گے، اور جن لوگوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کا صحیح اتباع نہیں کیا، جیسے ہمارے زمانہ کے بدعتی لوگ، تو ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔

حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مہاجرین اور انصار کے چہرے سفید ہوں گے، اور بنی قریضہ اور بنی نضیر کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ [قرطبی] حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث سات مرتبہ سنی کہ خوارج کے چہرے سیاہ اور کالے ہوں گے، اور ان کے قاتلوں کے چہرے سفید ہوں گے۔

[ترمذی] حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں کہ سیاہ چہرے اہل کتاب کے ان لوگوں کے ہوں گے جو سید الانبیاء ﷺ کی بعثت سے قبل تو آپ ﷺ کی تصدیق کرتے تھے، لیکن جب آپ ﷺ مبعوث ہوئے تو بجائے آپ ﷺ کی تائید و نصرت کے اُلٹا تکذیب کرنی شروع کی۔ [قرطبی]

صحیح بات یہ ہے کہ ﴿الَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا﴾ اور اسی طرح ﴿اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ﴾ میں سب بدعقیدہ لوگ داخل ہیں، خواہ وہ مرتد ہوں، عام کفار اور مشرکین ہوں، مجوسی یا صابی ہوں، یا اہلِ کتاب کے کفار ہوں، جیسے کہ وہ یہودی جو مسیح علیہ السلام پر ایمان نہیں لائے، ان کی تکذیب کی، یا وہ نصاریٰ جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تکذیب کی، یا وہ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ جنہوں نے سید الانبیاء ﷺ اور قرآن کریم کی تکذیب کی، یا عام منافقین اور فساق و فجار اور اہلِ بدعت فرق باطلہ ہوں، آیت کریمہ سب کو شامل ہے، کیونکہ کفر بھی دو قسم کا ہے: ایک اعتقادی، دوم عملی۔

اہلِ کتاب نے خاتم الانبیاء ﷺ پر ایمان لانے کے بعد جب آپ ﷺ مبعوث ہو کر تشریف لائے، تو آپ ﷺ کی تکذیب کی، اور کفر کے مرتکب ہوئے۔ منافق بھی حقیقی اعتقادی کفر کے مرتکب ہوئے۔ عام کفار و مشرکین تو وہ بھی یومِ میثاق (اَزل، یومِ اَلست) میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کر چکے تھے، مگر دنیا میں آنے کے بعد اپنے اقرار سے پھر گئے، یہی حال مرتدین کا ہے، کہ پہلے ایمان لائے، پھر کافر ہو گئے۔ یہ سب لوگ اعتقادی کافر ہیں، جن کے چہرے سیاہ ہوں گے۔

رہے فساق و فجار، اور اہلِ بدعت، و اہلِ اَہواء، اور فِرَقِ باطلہ! تو وہ لوگ عملی کافر ہیں۔ قیامت کے دن ان سے یہی کہا جائے گا کہ تم نے کتاب و سنت کے واضح دلائل پر ایمان لانے کے بعد عملی کفر اختیار کیا، اور اپنے نفسانی خیالات و خواہشات کی بنیاد پر واضح ہدایات کے برخلاف عملی کفر کر کے ہدایت و صراطِ مستقیم سے ہٹ کر دور ہوئے۔ ﴿فَسَنُخْبِرُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ اسی طرح فِرَقِ باطلہ کا مکمل تفصیلی بیان، اور ان کے عقائدِ زائغہ و اعمالِ خبیثہ کا امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی آیت کی روشنی میں واضح کیا ہے، اور بہتر (۷۲) اقسام کی نشاندہی کی ہے۔

فائدہ:

واضح ہو کہ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے جن بہتر (۷۲) قسم کے فِرَقِ باطلہ کی نشاندہی کی ہے، یہ وہ فِرَقِ باطلہ ہیں کہ امام موصوف رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ اور اس سے پہلے گزرے ہیں۔ بعد میں مرورِ زمانہ کے ساتھ ان فرقوں میں سے چند

آپس میں ضم ہو گئے، اور چند ایک صفحۂ ہستی سے مٹ کر ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو گئے۔ البتہ ان میں سے چند ایک ابھی بھی باقی ہیں۔ خذلھم اللہ۔

امام موصوف رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ کے بعد کچھ نئے گمراہ فرقے جو پیدا ہوئے، نیز ہمارے زمانے میں برطانوی اقتدار کے بعد جو خطرناک فرقے وجود میں آئے، آج اگر ان کا حساب لگایا جائے تو بآسانی بہتر (۷۲) فرقے پورے ہو سکتے ہیں، کیونکہ حق و باطل کی جنگ ختم نہیں ہوئی، یہ سلسلہ قربِ قیامت تک جاری رہے گا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز ☆ چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

(اقبال)

نکتہ لطیفہ:

﴿یَوْمَ تَبْیَضُّ﴾ کے اجمال میں روشن چہروں کا ذکر پہلے، اور سیاہ چہروں کا ذکر بعد میں کیا گیا، مگر تفصیل میں ﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ﴾ میں یہ ترتیب برعکس کر کے اشارہ کیا کہ مقصدِ تخلیق اہلِ بیاض ہیں، نہ کہ اہلِ سواد، اسی لئے آیت کے خاتمہ پر ﴿فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ﴾ ارشاد فرما کر اسی مقصد کی تائید فرما دی کہ آیت کے شروع میں جن کا ذکر ہے آیت کے خاتمہ پر انہی کا ذکر مناسب ہوا، مگر اہلِ سواد اس کے مستحق نہیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے حقدار نہیں ہیں۔

دوئم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے رحمت کی تفسیر جنت کے ساتھ کی ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ انسان کتنا ہی عابد و زاہد بن جائے، مگر جنت محض رجاء و رحمت الٰہی سے ہی ملے گی، کیونکہ عبادت کرنا انسان کا اپنا ذاتی کمال نہیں ہے، بلکہ یہ توفیقِ الٰہی پر موقوف ہے۔ اس لئے ہر بات رحمتِ الٰہی پر جا کر ٹھہرتی ہے۔

یہ سمجھنا غلط ہے کہ اہلِ طاعت کے لئے اللہ تعالیٰ پر انعام کرنا لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ پر کسی کے لئے کوئی چیز لازم نہیں ہے، بلکہ یہ سب کچھ اس ذات پاک کا تفضّل و احسان ہے۔

﴿هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ ارشاد فرما کر بتلا دیا کہ ہماری یہ رحمت عارضی نہیں ہے، جو چند دن کے لئے ہو، بلکہ دائمی اور ابدی ہوگی۔ مگر اہلِ سواد کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے کریم النفس ہونے کی وجہ سے یہاں دوامِ عذاب کا اظہار نہیں فرمایا، بلکہ ﴿فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ﴾ فرما کر اشارہ کر دیا کہ یہ عذاب ہماری طرف سے نہیں ہے، بلکہ یہ تمہارے برے اعمال کا نتیجہ ہے، کوئی جیسا کرے گا ویسا بھرے گا، اسی لئے فرمایا:

﴿وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ کہ ہم تو کسی پر کسی قسم کے ظلم کا ارادہ بھی نہیں کرتے، انسان نے جو کچھ کیا ہوگا وہی سامنے آئے گا۔

گندم از گندم بروید جوز جو ☆ از مکافات عمل غافل مشو

(سعدی رحمۃ اللہ علیہ)

سیدھے راستہ پر اگر تم چلنے والے ہوتے تو آج نتیجہ اس کے برعکس ہوتا۔ خود تم لوگوں نے اپنے لئے جانتے ہوئے سزا کا انتخاب کیا ہے۔

آیت کریمہ کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے معاملات میں ظلم کرنا نہیں چاہتا، کہ نیکی کرنے والے کا ثواب گھٹا دے، یا مجرم کی سزا کو جرم کی مقدار سے بڑھا دے۔ اور کفر چونکہ سب سے بڑا جرم ہے، اس لئے اس کا عذاب تمام گناہوں کے عذاب سے بڑا ہے۔

﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ اور آسمان وزمین میں جو کچھ ہے، اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، اس کی مخلوق اور اس کی ملکیت ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف تمام امور کی آخری واپسی ہوگی۔ پس وہی وعدہ اور وعید کے موافق جزاء وسزا دے گا، اور بعینہٖ ﴿وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ﴾ یا ﴿وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ وغیرہ متعدد جملوں کا مطلب یہ ہے کہ سب لوٹ کر اسی کے پاس آئیں گے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَھْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ ۭ مِنْھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۱۱۰

ترجمہ: تم سب سے بہتر امت ہو، جس کو ظاہر کیا گیا ہے لوگوں کے فائدے کے لئے، تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو، اور بری باتوں سے منع کرتے ہو، اور تم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو، اور اگر اہلِ کتاب ایمان لاتے، تو البتہ یہ ان کے لئے بہتر ہوتا، ان میں سے بعض ایمان پر ہیں، اور ان میں سے اکثر بے ایمان اور نافرمان ہیں ۱۱۰

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ کا ربط قریبی آیتوں اور سورۂ بقرہ کی آیت ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا

شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾ [البقرة: ۱۴۳] کے ساتھ بھی ہے۔ ان دونوں آیتوں اور قرآن کریم کی دیگر متعدد آیتوں میں اس آخری اُمت کیلئے نہات بڑا اعزاز اور فضیلت کا بیان ہے۔

جس طرح دنیا میں امراء وسلاطین اپنے مخصوص لوگوں کو ان کی حسنِ کارکردگی، اور عوامی، سماجی، فوجی وغیرہ خدمات کی انجام دہی پر خصوصی انعامات اور اعزازی سرٹیفکیٹ اور خصوصی تمغے ودیگر نوازشات امتیازی سے نوازتے ہیں، اس آیت کریمہ ودیگر آیات میں اس اُمت کے لئے اسی قسم کے خاص امتیازی اور اعزازی تمغوں کا ربّ العزت سبحانہ کی طرف سے اعلان ہورہا ہے۔

اور اس اُمت کو کائنات کی تمام اُمتوں پر فضیلت وبرتری اور خَيرُ الأُمَم کا لقب دیا جارہا ہے۔ جس طرح سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی الانبیاء اور سید الرُّسُل ہیں، اور ساری کائنات کے بلاشک وشبہ معلّمِ عظیم، وسردار ہیں، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت سَيِّدُ الأُمَم و خَيرُ الأُمَم بھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

كُنتُ نَبِيًّا وَإِنَّ آدَمَ لَمُنجَدِلٌ بَينَ الْمَاءِ وَالطِّينِ. أَنَا أَوَّلُهُم خَلقًا آخِرُهُم بَعثًا. أَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدمَ وَأَنَا سَيِّدُ الأَنبِيَاءِ وَنَبِيُّ الأَنبِيَاءِ وَقَائِدُ النَّاس. يُحشَرُ النَّاسُ رِجَالًا وَأُحشَرُ رَاكِبًا عَلَى البُرَاقِ وَأَنَا خَطِيبُهُم إِذَا أَنصِتُوا وَأَنَا مُبَشِّرُهُم إِذَا ائِسُوا وَأَنَا مُستَشفِعُهُم إِذَا حَبِسُوا مَفَاتِيحُ الْجَنَّةِ بِيَدِي يَومَ الْقِيمَةِ لِوَاءُ الْحَمْدِ بِيَدِي جَمِيعُ الأَنبِيَاءِ مِن وَلَدِ آدمَ تَحتَ لِوَائِي يَطُوفُ عَلَيهَا أَلفُ أَلفِ خَادِمٍ.

جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام مخلوقِ خدا کے امام اور خطیب وشفاعت کنندہ ہیں، اسی طرح جنتوں کے چابی بردار بھی ہیں۔ تیسرے پارے کے آخر میں گزرا کہ تمام انبیاء علیہم السلام سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد ونصرت کرنے پر عہد ومیثاق لیا گیا۔ پھر چوتھے پارے میں ان کے مَعْبَد، یعنی کعبۃ اللہ کو اوّلِ بیت فرمایا۔ اسی کے ساتھ برگزیدہ پیغمبر ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملّت کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملت قرار دیا گیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کو تمام شرائع کا خلاصہ اور جامع بتایا گیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کتاب کو تمام آسمانی کتابوں کی شرح اور ناسخ مانا گیا۔

اسی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت وشریعت اور قرآن حکیم کو حَبلُ الله کہا گیا، اور اسے مضبوطی کے ساتھ تھامنے کا حکم صادر فرمایا۔ اب آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کو خیر اُمت کے تمغہ سے نوازا گیا۔ اَلحمدُلله۔ اس خیریتِ اُمت کے متعلق مفسرین حضرات کے تین قول ہیں:

☆ اوّل یہ کہ اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مراد ہیں، جیسا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

☆ دوئم یہ کہ اس سے مراد مہاجرین حضرات ہیں، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

☆ سوئم یہ کہ اس سے مراد تمام اُمتِ محمد یہ ہے، جیسا کہ عام رجحان اور جمہور علماء کا قول ہے، کہ تمام اُمت محمد یہ **خیر الأمَم وافضل الأمَم** ہے۔

البتہ! پوری اُمت پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی برتری مسلّم بھی ہے، اور اس پر اجماع بھی ہے۔ اور خیر القرون کی برتری پر پوری اُمت کا اجماع ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جنت کا داخلہ اس وقت تک تمام انبیاء علیہم السلام پر ممنوع ہے جب تک میں جنت میں داخل نہ ہو جاؤں، اور جب تک میری اُمت جنت میں داخل نہ ہو جائے اس وقت تک دوسری امتوں پر جنت کا داخلہ حرام ہے۔ یعنی نبیوں میں سب سے پہلے میں داخل ہوں گا، اور اُمتوں میں سب سے پہلے میری اُمت داخل ہو گی۔

ترمذی، حاکم، طبرانی وغیرہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس، ابن مسعود، ابوموسیٰ اشعری، جابر، معاویہ بن جندہ رضی اللہ عنہم سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ اہلِ جنت کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی، جن میں اسی اس اُمت کی، اور باقی دوسری امتوں کی ہوں گی۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے: فرمایا سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے: میری اُمت کی مثال بارش کی ہے، بارش کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا ابتدائی حصہ بہتر ہے، یا آخری حصہ بہتر ہے۔ [ترمذي، معالم بغوي، قرطبي، مظهري]

بعض علماء کرام نے کہا کہ اس اُمت کی افضلیت کا ہمہ گیر سبب جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے موضح القرآن میں اسی کو راجح کہا ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اس اُمت کی امتیازی صفتِ مخصوصہ ہے، کیونکہ اس اُمت کی دعوت عام ہے، اور تمام اقوامِ عالم کے لئے جہاں جہاں اطرافِ عالم تک سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت عامہ کا تعلق ہے، وہاں وہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کی صفتِ خاصہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا تعلق رہے گا۔ اور یہ دونوں باتیں دوسری امتوں کو حاصل نہ تھیں۔

اگر کسی اُمت میں جہاد تھا، لیکن یہ جہاد اور امر بالمعروف وغیرہ عالمگیر نہ تھے۔ اور کچھ اُمتوں میں جہاد کا کوئی

حکم نہ تھا، جبکہ یہ تمام امور اس اُمت کی عالمگیر امتیازی صفات ہیں۔ غرض یہ کہ یہ اُمت ہر طرح امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو انجام دیتی رہے گی، خواہ علم کے ذریعہ، یا درس وتدریس، تقریر وتحریر، تبلیغ، یا تلوار کے ذریعے جہاد سے ہو۔

اس اُمت کی خیریت کے چند اسباب وخصوصیات کا بیان:

امت محمدیہ جو ایک عرصہ سے بشمولِ موجودہ زمانہ تا قیامِ قیامت اگر خدا تعالیٰ کی زمین پر خدائی احکام و فرامین کا امین ونگہبان ہے، تو یہی اُمتِ مرحومہ ہے۔ پورے جہاں میں مشرق سے لے کر مغرب تک، جنوب سے لے کر شمال تک، آسمانی ہدایات وعوامل پر اگر کوئی کاربند ہے تو یہی اُمت ہے۔ تمام عالم شرک وکفر اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں ڈوبا ہوا ہے، اگر توحید وایمان اور اعمالِ صالحہ واحکامِ شرعیہ الٰہیہ کی کوئی کرن ونمونہ موجود ہے، تو اسی اُمت کی بدولت ہے، باقی سارا عالم خدا کا باغی اور نافرمان ہے۔

یہی اس اُمت کی خیریت کا سب سے بڑا نمایاں امتیازی شان وصفت ہے۔ اس کے علاوہ اور کئی اسباب بھی ہیں، جن میں سے چند اسباب یہ ہیں:

(۱) یہ اُمت افراط وتفریط سے پاک معتدل اُمت ہے۔ عدل واعتدال پر قائم ہے۔ (۲) جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام کائنات سے افضل ہے، تو اس کی اُمت بھی سب سے افضل ہوگی۔ (۳) یہ اُمت تمام پیغمبروں علیہم السلام پر بلا تفریق ایمان رکھتی ہے۔ (۴) تمام آسمانی کتابوں کی بلا امتیاز تصدیق کرتی ہے۔ (۵) ان کی کتاب تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ (۶) ان کی شریعت ہر قسم کے افراط وتفریط سے پاک ومنزہ ہے۔ (۷) ان کی شریعت تمام شرائع کیلئے ناسخ ہے۔ (۸) ان کا قبلہ عالمگیر ہے، اور تمام امتوں کے قبلوں سے افضل ہے۔ (۹) فریضۂ حج اس کی منفرد صفت اور عبادت ہے۔ (۱۰) اس کی عدالت پر خود ربّ العزّت سبحانہ نے گواہی دی ہے۔ (۱۱) قیامت کے روز یہ اُمت سارے انبیاء علیہم السلام کے حق میں، اور ان کی امتوں کے خلاف گواہی دے گی، اور اس کی گواہی پر فیصلہ ہوگا۔ (۱۲) اس اُمت کی صداقت پر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنفس نفیس گواہی ادا کریں گے۔ (۱۳) قیامت کے روز سب سے پہلے اس امت کا فیصلہ ہوگا۔ (۱۴) پل صراط کو سب سے پہلے یہی عبور کرے گی۔ (۱۵) جنت میں سب سے پہلے ان کا داخلہ ہوگا۔ (۱۶) اَنَاجِیلُهُمْ صُدُوْرُهُمْ ان کے ہر فرد میں قرآن حفظ کرنے کی استعداد ہے، برخلاف دیگر امتوں کے۔ (۱۷) ان کی کتاب کی حفاظت کی اللہ تعالیٰ شانہ نے ذمہ داری لی ہے۔ (۱۸) ان کی کتاب کی حدیثوں کے علاوہ لاکھوں تفاسیر وشروحات ہیں، جبکہ یہ چیز دیگر امتوں میں نہیں ہے۔ (۱۹) ان کے ائمہ وعلماء

ربانی کو مسائل میں اجتہاد کا مکمل حق حاصل ہے۔(۲۰)ان کے لئے جہاد کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے۔(۲۱)ان کے لئے مالِ غنیمت مکمل حلال ہے۔(۲۲)تمام روئے زمین ان کیلئے مسجد کے حکم میں ہے۔(۲۳)ان کی ملت حضرت ابوالانبیاء ابراہم علیہ السلام کی ملت کے ساتھ منسلک ہے۔(۲۴)اس کی خیریت ازلی ہے،اور لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہے۔(۲۵)اس اُمت کو سارے جہاں کے فائدے کیلئے پیدا کی گئی ہے۔(۲۶)خالق کائنات جل جلالہ نے خود اس اُمت کا انتخاب فرمایا،اور اسے خَیرِ اُمَّۃ کا لقب عطا فرمایا۔(۲۷)اس اُمت کو خدا اور رسولوں کے ساتھ بغاوت کرنے کا کبھی طعنہ نہ دیا گیا۔(۲۸)آسمانی وحی نے دیگر امتوں کو طرح طرح کے بُرے القاب سے یاد فرمایا، مگر اس اُمت کے عمل کو آسمانی وحی نے ہمیشہ سراہا،اور اس کی مدح فرمائی،اور کبھی اس کی مذمت نہیں فرمائی۔(۲۹)اس اُمت کو وحی الٰہی نے حمّادُون کے عمدہ وبرگزیدہ لقب سے یاد فرمایا۔(۳۰)اس اُمت کے جنتی لوگ دوسری امتوں سے دوگنے (زیادہ) ہیں۔ساری امتوں کے جنتی لوگوں کی چالیس صفیں ہوں گی،جبکہ تنہا اس اُمت کی اسی صفیں ہوں گی۔اس کے علاوہ بے شمار فضائل وخصوصیات ہیں۔اس سلسلے میں خصائص کُبریٰ علامہ سیوطیؒ کی جامع کتاب ہے،اس کا مطالعہ کیا جائے۔وَبِاللہِ التَّوفِیقُ وَھُوَ الْمُستَعَانُ.

﴿کُنتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ﴾ تا ﴿وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ﴾ ماضی کے صیغہ سے یہی مراد ہے کہ تم بہت بہتر اُمت ہو، پہلے سے اللہ تعالیٰ تمہاری خیریت کا فیصلہ کر چکا ہے۔تو تمہاری بہتری بہت پرانی ہے،جو کہ لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہے۔تمہیں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے خیر وصلاح،اور فائدہ پہنچانے کیلئے پیدا فرمایا ہے۔تم لوگوں کو نیکی اور بھلائی کا حکم دیتے ہو،اور برائیوں سے منع کرتے ہو،اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ تم اسلام قبول کرتے ہو،اور تمام ایمانی عقائد واقدار کی تصدیق کرتے ہو۔کلمہ طیبہ لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے اقرار کے ساتھ پانچ نمازوں،زکوٰۃ،روزہ،حج بیت اللہ پر ایمان لاتے ہو،اور ارکانِ خمسہ کی ادائیگی بھی کرتے ہو،اور اس کے ساتھ پورے احکامِ شریعت پر عامل رہتے ہو، کیونکہ ایمان باللہ میں یہ ساری چیزیں آجاتی ہیں،اور محض اللہ تعالیٰ کے ماننے سے ایمان ہرگز ثابت نہیں ہوتا،اور یہ کفار کو بھی تو حاصل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مانتے ہی ہیں۔

﴿وَلَوْ اٰمَنَ اَھْلُ الْکِتٰبِ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ﴾ اگر اہلِ کتاب بھی (تمہاری طرح) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم پر ایمان لاتے،تو ان کے لئے بہتر ہوتا۔اس طرح خیر اُمت میں شامل ہوتے،اور فلاحِ

دارین حاصل کرتے۔ مگر حسد وتعصب نے انہیں اندھا کیا ہوا ہے۔ البتہ آٹے میں نمک برابران کے اچھے نکلے فرمایا:
﴿مِنۡهُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ﴾ ان میں سے بعض لوگ ایماندار بھی ہیں۔ یہ لوگ آٹھ نو افراد تھے، زیادہ نہیں تھے۔
﴿وَاَكۡثَرُهُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ﴾ ان کی اکثریت، بھاری اکثریت فاسق اور کافر ہی رہی، جیسے موجودہ زمانہ میں خال خال عیسائیوں نے اسلام قبول کیا، اور کر رہے ہیں، مگر یہودیوں میں نہیں ہے، کیونکہ ان کا غرور حد سے زیادہ اور پختہ ہے، وہ ہرگز اسلام قبول نہیں کرتے۔

لَنۡ يَّضُرُّوۡكُمۡ اِلَّاۤ اَذًى ؕ وَاِنۡ يُّقَاتِلُوۡكُمۡ يُوَلُّوۡكُمُ الۡاَدۡبَارَ ۛ ثُمَّ لَا يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾
ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوۡ
بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡمَسۡكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ
يَقۡتُلُوۡنَ الۡاَنۡۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوۡا وَّكَانُوۡا يَعۡتَدُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾ لَيۡسُوۡا سَوَآءً ؕ مِنۡ
اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتۡلُوۡنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيۡلِ وَهُمۡ يَسۡجُدُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ
وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَيُسَارِعُوۡنَ فِى الۡخَيۡرٰتِ ؕ وَ
اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا يَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَلَنۡ يُّكۡفَرُوۡهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِالۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۱۵﴾

ترجمہ: وہ تمہیں ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، مگر زبان سے ستانا، اور اگر وہ تم سے لڑیں گے تو تمہاری طرف پیٹھ پھیر دیں گے، پھر ان کی مدد نہ کی جائیگی ﴿۱۱۱﴾ ان پر ذلت مسلط کی گئی ہے، جہاں بھی وہ پائے جائیں، مگر اللہ تعالیٰ کی رسی کے ساتھ، اور لوگوں کی رسی کے ساتھ، اور وہ اللہ تعالیٰ کا غضب لے کر لوٹے، اور مسلط کی گئی ان پر مسکنت، یہ اس وجہ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نافرمانی کی، اور وہ حد سے بڑھنے والے تھے ﴿۱۱۲﴾ یہ سب کے سب برابر نہیں ہیں، اہلِ کتاب میں سے ایک اُمت ایسی بھی ہے جو سیدھے راستے پر قائم ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو رات کی گھڑیوں میں پڑھتے ہیں، اور وہ سجدہ ریز ہوتے ہیں ﴿۱۱۳﴾ وہ ایمان رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ پر، اور قیامت کے دن پر، اور اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں، اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں، اور وہ نیکی کے کاموں میں سبقت کرتے ہیں، اور یہی لوگ

نیک بختوں میں ہیں ﴿۱۱۴﴾ اور جو بھی وہ نیکی کا کام کریں گے، اس کی ناقدری ہرگز نہیں ہوگی، اور اللہ تعالیٰ پوری طرح باخبر ہے ان لوگوں سے جو متقی ہیں ﴿۱۱۵﴾

معارف ومنازل

اہلِ ایمان کو تسلی دی جارہی ہے، کہ ان اہلِ کتاب سے کوئی خطرہ محسوس نہ کرو، تمہارے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت شاملِ حال ہے، اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے محروم ہیں، اور یہ لوگ زبانی حد تک تو تمہیں ستائیں گے، مگر تمہارا کوئی نقصان نہیں کرسکیں گے۔ اگر یہ تمہارے مقابلے میں آئیں گے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، یہ قرآنی پیشینگوئی پوری ہوئی، چند دنوں میں خیبر کے یہودیوں کو شکست ہوئی، مدینہ منورہ کے اطراف میں آباد یہودیوں کے قبائل بنوقریظہ، بنونضیر اور بنوقینقاع سب ذلیل ہوئے۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کے مقابلے میں رومیوں کو شکست فاش ہوئی۔ شام فلسطین اور مصر کے علاقے سارے فتح ہوئے، رومیوں کا دوہزار سالہ اقتدار ہمیشہ کے لئے ختم ہوا، اور جب تک مسلمانوں میں جذبۂ جہاد باقی رہا، اور وہ کتاب وسنت پر مضبوطی سے قائم وعامل رہے، تو وہ ہر طرح کی اقوام پر غالب رہے۔

پھر جب ساتویں صدی میں مسلمانوں کا انحطاط شروع ہوا، تو نتائج اس طرح سامنے آئے کہ یہود ونصاریٰ کو غلبہ حاصل ہوتا رہا، اور مسلمان اپنے اسلاف سے دور ہوتے گئے، اور آج تک ان کا انحطاط ومغلوبیت جاری ہے، معلوم نہیں آئندہ کیا ہوگا۔ ؎

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہوکر ☆ تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

﴿لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى﴾ اہلِ کتاب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاسکیں گے، مگر ستانے اور پریشان کرنے کے علاوہ۔

﴿وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ﴾ اور اگر لڑیں گے تمہارے ساتھ، تو تمہاری طرف پیٹھ پھیر دیں گے، تم سے لڑنے کی ہمت نہیں پائیں گے۔

﴿ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ﴾ پھر ان کی ہرگز مدد نہیں کی جائے گی، اور یہ ناکام ہوکر ذلیل ہوجائیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، قرآن کریم کی پیشینگوئی پوری ہوئی، مدینہ طیبہ کے یہود اور خیبر کے یہود سارے شکست کھاکر خوار وذلیل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب، خصوصاً یہودیوں کے متعلق فرمایا:

﴿ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡٓا﴾ یہود پر ذلت مسلط کردی گئی، جہاں بھی وہ پائے جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہوں گے، ذلیل وخوار ہی رہیں گے۔ جب سے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تحریف کی ہے، اور شرک وعصیان اور سرکشی وطغیانی میں ملوث ہوئے ہیں، اس وقت سے سزا کے طور پر ذلیل اور خوار ہوئے ہیں۔

قرآن مجید میں یہودیوں کی ذلّت کا ذکر بہت سے دوسرے مقامات پر بھی موجود ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۶۱ میں قدرے تفصیل سے گزر چکا ہے، اور آئندہ اس ذلّت وخواری کا متعدد مقامات پر تذکرہ آنے والا ہے۔

ان کی ذلت ورسوائی کے متعلق پہلی بات تو یہ ہے کہ یہودی سیاسی عروج اور اقتدار سے محروم کردیئے گئے ہیں۔ گزشتہ اڑھائی ہزار سالہ تاریخ سے ظاہر ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں انہیں اقتدار حاصل نہیں ہوا، اس سے پہلے ان کی عظیم الشان سلطنتیں تھیں، جیسے سورۂ بقرہ میں گزرا، مگر اب وہ اقتدار سے محروم ہیں، اور دوسروں کے دست نگر غلام ہیں، جیسے فرعون کے زمانے میں تھے۔ ﴿اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡٓا﴾ کا یہی مطلب ہے، کہ یہ لوگ جہاں کہیں بھی ہوں گے محکوم ہی رہیں گے، اور ذلت وخواری کے پنجرے میں محبوس رہیں گے۔

یہودیوں کی ذلت کی دوسری بات یہ ہے کہ یہ لوگ عزّتِ نفس سے محروم رہے ہیں۔ کروڑ پتی اور سرمایہ دار ہونے کے باوجود بھکاریوں، فقیروں کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ مال سے محبت، بخل وکنجوسی، غلامانہ ذہنیت، سازش، ہر قوم سے مکاری، فریب اور چالاکی ان کی خصوصی خصلت رہی ہے۔ ان کو کہیں بھی آرام سے رہنا اور سکون سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا۔ ایک جگہ شرارت کی تو دوسری جگہ چلے گئے، وہاں سازش کی تو وہاں سے نکالے گئے۔

گزشتہ تاریخ سے واضح ہے کہ دنیا کی کوئی قوم انہیں عزّت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے تک نصاریٰ سے بھی ان کی ایسی ہی اَن بَن تھی، جیسے مسلمانوں کے ساتھ۔

یہودی کبھی نصاریٰ کے ماتحت رہے، اور انہیں خوشامد کرتے رہے، اور کبھی مسلمانوں کے ماتحت رہے، اور انہیں خوشامد کرتے رہے، اور کبھی دیگر اقوام کے۔ مگر باطنی طور پر سب کے مخالف رہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ جہاں بھی پائے جائیں ان پر ذلت ورسوائی مسلط ہوگی۔ ﴿اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ ہاں اگر اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑلیں گے، پھر تو رسوائی سے بچ جائیں گے۔

یہاں اللہ تعالیٰ کی رسی سے مراد یا تو قرآن کریم ہے، یا تورات مراد ہے۔ اوّل کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ

لوگ اسلام قبول کریں، اورقرآن کریم پر ایمان لائیں، تو ذلت سے بچ جائیں گے۔ دوئم معنیٰ یہ ہے کہ اگر یہ لوگ تورات کی وہ بچی کھچی چند احکام پر عمل کریں گے، اور کسی حد تک تورات پر عامل رہیں گے تو رسوائی سے بچ جائیں گے۔

مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم سے دونوں تفسیریں منقول ہیں۔ مگر اوّل تفسیر راجح ہے۔ دوسرے قول کا مطلب یہ ہے کہ تورات سے کسی حد تک وابستگی کی وجہ سے ہی یہ لوگ دنیا میں جیسی کیسی زندگی گزار رہے ہیں، اگر اتنا بھی نہ ہوتا تو یہ لوگ دیگر اقوام کی طرح صفحۂ ہستی سے مکمل طور پر مٹ چکے ہوتے۔ فرمایا: یہودیوں کی دنیا میں زندہ رہنے کی دوسری صورت یہ ہے: ﴿وَ حَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾ کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ معاہدہ کر کے ان کی ماتحتی میں رہنا قبول کرلیں، تو پھر بھی ذلت سے بچ جائیں گے۔

بعض مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم نے ﴿حَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ کا ترجمہ اللہ تعالیٰ کی دستاویز اور ﴿حَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾ کا ترجمہ لوگوں کی دستاویز کیا ہے۔ مقصد ایک ہی ہے، کہ یا تو ایمان بالقرآن ہو، یا تورات کے ساتھ کسی حد تک لگاؤ ہو، یا پھر دوسری اقوام کے ساتھ عہد و پیمان کر کے، یا مسلمانوں کو جزیہ ادا کر کے گزر اوقات کرسکیں گے۔ یعنی دوسروں کی محکومی قبول کریں، اور رعایا بنیں۔ حضرت شاہ عبد القادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے موضح القرآن میں یہی تفسیر فرمائی ہے۔

بعض مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے "حَبۡل" کے معنی ذمہ کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا ذمہ، اور مسلمانوں کا ذمہ۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کو اپنے امان میں لے لے، یا مسلمان ان کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھائیں، تو ذلت سے بچ سکیں گے۔

بعض مفسرین رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ "اَلنَّاس" سے مراد عام لوگ ہیں۔ اگر کوئی دوسری قوم ان کی پشت پناہی کرلے، تو بھی رسوائی سے وہ بچے رہیں گے، جیسے موجودہ زمانہ میں عیسائی اقوام، اور دیگر دہریہ کمیونسٹ اقوام سب کی سب مختلف خطوں میں یہودی قوم کی سرپرستی کررہی ہیں، جن کی وجہ سے یہود قوم کا عروج پورے عالم میں نمایاں ہے، یہاں تک کہ وہ پوری دنیا پر قبضہ اور تسلط کا خواب دیکھ رہی ہے۔

اگر یہود کی سابقہ تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے تجارت کے بہانے جہاں بھی قدم جمانے کی کوشش کی، ہمیشہ تکلیف اٹھائی۔ جرمن قوم نے انہیں خوب مارا، اور بے دریغ تہہ تیغ کیا، کیونکہ وہ خطرناک سازشوں میں ملوث رہے۔ اسی طرح دہریہ روس نے بھی انہیں ان کی سازشوں کی وجہ سے بے دردی کے ساتھ قتل کیا، اور جلاوطن کیا۔ یہ سب تاریخ کے اوراق میں لکھا ہوا ہے۔

اب موجودہ زمانے میں صورتِ حال بہت مختلف ہے، تقریباً پینتالیس پچاس سال قبل اسرائیل کی حکومت

قائم ہوئی، اور یہودیوں کو ٹھکانا نصیب ہوا، اس پر چہ میگوئیاں ہونے لگی ہیں، کہ کیا قرآن کریم کا دعویٰ معاذ اللہ غلط ثابت ہوا ہے کہ یہودیوں پر ذلت مسلط کردی گئی، اور وہ اقتدار سے محروم رہیں گے۔ اس سلسلے میں واضح ہو کہ یہودیوں کی موجودہ حکومت کوئی بااختیار حکومت نہیں ہے، یہ محض کھوکھلی اور بے بنیاد حکومت ہے، اور ان کا یہ موجودہ اقتدار محض حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ کے کندھوں پر رکھا ہوا ہے۔ اس سے مراد غیر مسلم طاقتیں ہیں، جن میں سے اکثر و بیشتر عیسائی ہیں، اور کچھ دہریہ کمیونسٹ ہیں۔

آج یہودی انہیں کی دستاویز اور رحم و کرم پر زندہ ہیں، اور بڑی بڑی عالمی کمپنیوں اور بینکوں کے مالک ہیں۔ اگر بنظرِ عمیق دیکھا جائے تو اسرائیل کو چار عالمی طاقتوں، یعنی امریکا، برطانیہ، فرانس اور روس کی پشت پناہی اور سرپرستی حاصل ہے۔ گویا کہ اسرائیل ان چاروں، اور ان کے دیگر تمام اتحادیوں کا ذیلی ادارہ اور جزء لَایَنْفَک ہے۔ ان میں اوّل تینوں عیسائی ہیں، اور آخر الذکر روس دہریہ کمیونسٹ ہے۔ اور اسرائیل ان سب کی مشترکہ چھاؤنی ہے، جسے اردگرد کے مسلمان ملکوں کو تنگ کرنے، اور ان کے بے پناہ وسائل پر قبضہ کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔

اسرائیل کا قیام ان ہی چاروں عالمی طاقتوں کی مسلمانوں کے خلاف سازش کا نتیجہ ہے، اگر آج یہ چاروں طاقتیں اسرائیل سے اپنا سایہ اٹھالیں، تو یہودی ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتے، اور ایک ہی ہفتہ میں اسرائیل کے اقتدار کا سورج غروب ہوجائے گا۔ اسی خاطر انہوں نے پورے عالم کو دو بلاکوں پر تقسیم کر کے سارا عالم کفر ایک ہی حریف مسلم قوم کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اور اسلام دشمنی میں یہ سب متحد و متفق رہتے ہیں، اور پوری سازش میں امریکہ سرفہرست رہا ہے، اور مرکزی کردار وہی ادا کر رہا ہے۔

یہ سارے کفار آپس میں متحد ہیں، اور ملّتِ واحدہ ہیں۔ ان کی ایک جان ہے، اور قالب متفرق۔ ان کا ہدف ایک ہی ہے، کہ دنیا سے قرآن اور اسلام کو (معاذ اللہ) مٹایا جائے۔ ساٹھ کے قریب مسلم ممالک ہیں، سب کے سب نہتیا بے سروسامان ہیں۔ ان کا اقتدار امریکہ کے ہاتھ میں ہے، جسے چاہے رکھے، جسے چاہے ہٹائے۔ یہ بیچارے نام کے مسلمان ضرور ہیں، مگر فکر و سوچ، اور ان کے خیالات و تعلیم سب یہود و نصاریٰ کے ہیں۔

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بانی مبانی یہی تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے آپس کے مشورہ سے طے کیا کہ سویت روس مسلم ممالک کا اتحادی رہے، اور باقی تینوں اسرائیل کے۔ اندرونِ خانہ چاروں اس بات پر متفق رہے کہ مسلمانوں کو شکست سے دوچار کیا جائے۔ اس کے نتیجہ میں روس نے نہایت کمزور و ناکارہ اسلحہ عربوں کو فراہم کیا،

اس کے منطقی نتیجہ میں چھوٹی سی اسرائیل کو گیارہ ممالک عربیہ کے مقابلہ میں جتوا کر فتح دلایا، اور مسلمانوں کو وہ شکست ہوئی جس کی مثال چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ پیش کرنے سے عاجز ہے۔

یہ داستان نہایت خوفناک اور پریشان کن ہے۔ اتنے پر اکتفاء کیا گیا۔ یہ اسلام کی حقانیت نہیں تو اور کیا ہے، کہ چاروں طرف سے آج نہیں، چودہ سو سال سے یہود ونصاریٰ، مجوس، صابی، پارسی، رافضی، مشرکین، بدھ مت، ہندو، ہنود، سکھ وغیرہ سارے بھیڑئے درندے ہر جانب سے تمام ممکنہ ذرائع سے خشکی، دریا، سمندر، زمینی، فضائی ہر طرح سے بکثرت حملے کر رہے ہیں۔ اگر اسلام کی حقانیت اور قدرتی من جانب اللہ تحفظ نہ ہوتا، تو وہ کب سے صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہوتا۔ مگر بحکمِ الٰہی وہ ان تمام حملہ آوروں کے درمیان درخشاں وتابندہ، اپنی اصلی شکل وصورت اور وضع میں موجود ہے۔ الحمدللہ

اور تو چھوڑیئے، اس کے پاس دفاعی قوت کا بھی فقدان اور کمی بھی ہے، مگر اس کی حقانیت وصداقت میں کوئی ادنیٰ فرق بھی نہیں آیا، اور نہ آئندہ آئے گا۔ ان شاء اللہ

ایک طرف سے یہ سارے درندے متفق ومتحد ہو کر اکھٹے ہوئے ہیں، سیاسی، تعلیمی، معاشی، اخلاقی طور پر مختلف ذرائع سے بڑی بیباکی کے ساتھ کوشاں رہتے ہیں کہ مسلمان قوم کو ہر سطح پر اسلام اور قرآن وسنت کے طریقوں سے کاٹ کر انہیں کافرانہ معاشرے کا فرد اور دلدادہ بنایا جائے۔ مگر دوسری طرف نہتے، بے سروسامان، دنیوی وسائل سے مکمل مستغنی طائفہ منصورہ بشکلِ علماء وخطباء، بصورتِ تبلیغی جماعت، وبوضعِ طالبان ومجاہدین شب وروز اسلام کی ترقی وخدمت واشاعت میں مصروف ومشغول ہیں، بلکہ بعض محاذوں پر زبرست دنیوی اور عالمی قوتوں کو لوہے کے چنے چبانے پر مجبور کئے ہوئے ہیں۔

یہ افغانستان ہمارے سب کے سامنے ہے، جہاں چودہ سو سال بعد فضائے بدر کا منظر پیش کر رہا ہے، اور عالمی کفری عظیم طاقتوں کو راتوں کی تاریکی میں بھاگنے پر مجبور کیا ہوا ہے۔ ان شاء اللہ آنے والے دنوں میں وہ مناظر دیکھنے میں آئیں گے جنہیں کفار ومشرک سوچ نہیں سکتے، ہے کوئی عبرت سیکھنے والا کہ ان ہاتھیوں اور چیونٹیوں کی جنگ ومعرکوں کا اندازہ لگائے، اور صحیح فیصلہ کرے؟

صحیح حدیث شریف کے مطابق ایک وہ وقت بھی آنے والا ہے جب یہود قوم کو شجر وحجر بھی پناہ نہیں دیں گے، اگر کوئی یہودی کسی درخت کے پیچھے چھپا ہوگا، تو وہ درخت مجاہدِ اسلام کو پکار کر کہے گا: اے مسلمان مجاہد! یہودی یہاں

چھپا ہوا ہے، اس کو پکڑ کر قتل کر دو۔ ساری کائنات الٹ پلٹ کر تبدیل ہو سکتی ہے، مگر ہمارے پیشوا قائد حضرت محمد ﷺ کی باتوں کی صداقت میں کوئی ادنیٰ کمی بیشی بھی نہیں ہو سکتی۔

فرمایا: ﴿وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ وہ اللہ تعالیٰ کا غضب لے کر لوٹے۔ یعنی غضب الٰہی کے مستحق ہو گئے۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ﴾ [البقرة: ۹۰] غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے۔

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ﴾ ان پر کنجوسی، مسکینی ڈال دی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ تا ﴿يَعْتَدُوْنَ﴾ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ کفر کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو جانتے ہوئے ناحق قتل کیا، اور اسی روز ایک سو ستر متقی پرہیز گاروں کو قتل کیا، جو ان مقتول انبیاء کرام علیہم السلام کے خلفاء اور شاگرد تھے۔ یہ سب کچھ، یعنی غضب و ذلت اور مسکنت وغیرہ اس لئے کہ وہ حد سے تجاوز کرنے والے نافرمانی کرنے والے تھے۔

البتہ! اس قسم کی ذلت و رسوائی سے وہ لوگ مستثنیٰ رہیں گے، جنہوں نے حق کی حمایت و تصدیق کی، فرمایا:

﴿لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ﴾ سے تا ﴿وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾

تاہم یہ سب برابر نہیں ہیں، ان میں کچھ سعید و نیک بخت بھی ہیں۔ ان میں سے ایک مختصر گروہ کے لوگ ہدایت یافتہ، اللہ تعالیٰ کے امر پر قائم رہنے والے بھی ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو رات کی گھڑیوں میں پڑھتے، اور شب بیداری کرتے ہیں۔ نجران کے عربی النسل چالیس عیسائیوں نے اسلام قبول کیا۔ اصحمہ شاہ حبشہ نے بخوشی اسلام قبول کیا، جب ان کی وفات ہوگئی تو رحمت عالم ﷺ نے مدینہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ غائبانہ ان کا جنازہ پڑھایا، اور ان کی مغفرت کے لئے دعاء فرمائی۔

اس موقعے پر تیس سے زائد دوسرے خوش قسمت لوگ بھی حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ ملک شام کے دو یہودی عالم مدینہ آکر مشرف باسلام ہوئے، اور مدینہ منورہ کے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ یہودی عالم، اور چھ دوسرے افراد بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اسی طرح روم سے آئے ہوئے آٹھ لوگوں نے بھی اسلام قبول کیا۔ رِضْوَانُ اللّٰهِ عَلَيْهِمْ أَجْمَعِيْن.

یہ سارے وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اوامر پر قائم رہیں، راتوں کو کتابِ الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں، اور

شب خیزی کے مرحلوں میں بکثرت سجدہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر، اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ دوسروں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہیں، اور برائیوں سے منع کرتے ہیں۔ اور نیک کاموں میں سبقت کرتے ہیں۔ پس یہی لوگ صالح اور نیکوکار ہیں، انہیں آگاہ کیا جارہا ہے کہ تمہارے نیک اعمال مقبول ہوں گے، اور ان کی قدردانی بھی ہوگی۔ اور حدیث کے مطابق انہیں دہرا ثواب واجر ملے گا۔ ثَلٰثَةٌ لَهُمْ أَجْرَانِ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنَ بِنَبِيِّهٖ وَآمَنَ بِمُحَمَّدٍ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لَهٗ أَجْرَانِ. الحدیث۔ [متفق علیہ]

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ تقویٰ والوں سے خوب واقف ہے۔ یہ جملہ متقیوں کے لئے بشارت بھی ہے، اور ناقدری نہ ہونے کی علت بھی ہے، کیونکہ کریم کا اپنے بندہ کی نیکیوں کو جان لینا ہی اچھا بدلہ عطاء فرمانے کی علت ہے۔ اس آیت میں تنبیہ ہے کہ اوصافِ مذکورہ سے جو لوگ متصف ہیں، وہ صالح بھی ہیں، اور متقی بھی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ مقام نصیب فرمائے۔ آمین

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

ترجمہ: بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، ہرگز کام نہیں آئیں گے ان کے مال اور نہ اولاد، اللہ تعالیٰ کے سامنے کچھ بھی، اور یہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ﴿۱۱۶﴾ مثال اس کی جو خرچ کرتے ہیں اس دنیا کی زندگی میں، مثل اس ہوا کے ہے جس میں شدید سردی ہے، جو پہنچی ہے ایسی قوم کے کھیت کو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، پس اس کو ہلاک کردیا، اور اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا، بلکہ یہ خود اپنے نفسوں پر ظلم کرتے تھے ﴿۱۱۷﴾

معارف ومنازل

اہلِ کتاب کی ذلت وخواری کا بیان مکمل ہونے کے بعد اب ایک عام حکم سنایا جارہا ہے، جو کہ اہلِ کتاب اور ان کے ہمنوا مشرکین سب کو شامل ہے۔ یہ سارے لوگ جن چیزوں پر بھروسہ کرتے تھے، اور ان کی وجہ سے بڑے

گھمنڈ وغرور میں مبتلا ہو کر حق کی تکذیب پر مصر رہتے تھے، یعنی مال کی کثرت اور اولاد کی کثرت وقوت سے، ان آیات میں انہیں تنبیہ کی جا رہی ہے کہ قیامت کے روز تمہیں سخت ندامت ہوگی۔

تمہارے سامان وسرمایہ اور اولاد وہاں کچھ بھی کام نہیں آئیں گے، وہاں کی کامیابی کا سارا دارومدار ایمان اور عملِ صالح پر ہے، جبکہ ان دونوں نعمتوں سے تمہارا دامن خالی ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا﴾ سے ﴿خٰلِدُوۡنَ﴾ تک تحقیق۔ جن لوگوں نے کفر کیا، وہ اپنے اموال واولاد پر نظر کر کے یہ نہ سمجھیں کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ لوگ ہیں، اس لئے ہم پر یہ انعامات ہوئے۔ اور یہ فقراء مسلمین ہم سے کمتر اور معتوب ہیں، اس لئے وہ ان انعامات کے حقدار نہیں رہے۔ حق سبحانہ نے انہیں تنبیہ کر کے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب کے دفع کرنے میں ان کے مال اور اولاد ہرگز کوئی ذرّہ بھر کام نہیں آئیں گے، کیونکہ غضبِ الٰہی سے بچانے والا صرف ایمان اور تقویٰ ہے۔ اور مالی صدقہ وخیرات غضبِ الٰہی سے جب ہی بچاتا ہے کہ جب وہ صدقہ ایمان باللہ وبالیومِ الآخِر پر مبنی ہو، اور اولاد بھی قیامت میں جب ہی کام آتی ہے کہ جب وہ خود بھی مؤمن ہو، اور زندگی میں اپنے مسلمان ماں باپ کے لئے صدقہ اور دعاء مغفرت کرتی ہو، جبکہ کافر ماں باپ کیلئے مؤمن اولاد کی دعائے مغفرت بھی بے کار رہے۔ اور ایسے کافر لوگ دوزخی ہیں، اور وہ ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے، اور کبھی دوزخ سے نہیں نکلیں گے۔

دینا دَارُ العَمل ہے، یہاں مال ہو یا اولاد ایک حد تک ذریعۂ نجات بھی ہیں، اور سببِ خوشحالی اور موجبِ استراحت وحفاظت بھی، جبکہ عالم آخرت دَارُ الجزاء ہے، وہاں یہ چیزیں ہرگز کارآمد نہیں ہوں گی، وہاں کا ضابطہ وقانون یہاں کے قانون سے الگ ہے، وہاں کارآمد چیز صرف ایمان اور تقویٰ وعمل ہے، نہ اور کوئی چیز۔

﴿مَثَلُ مَا یُنۡفِقُوۡنَ فِیۡ هٰذِهِ الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا کَمَثَلِ رِیۡحٍ فِیۡهَا صِرٌّ﴾ تا آخر الآیۃ۔ مثال اس چیز کی کہ جس کو یہ کفار دنیا کی اس فانی زندگی میں خرچ کرتے ہیں، اس کی مثال اس ہوا کی ہے، جس میں سخت سردی ہو، اور یہ سرد ہوا ایسی قوم کی کھیتی پر آئی ہو جس نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، پس وہ اس کھیتی کو تباہ و برباد کر گئی ہو۔ یہ ایک تمثیل ہے، کہ کفار بھی مسلمانوں کی طرح کبھی اچھے کام کرتے ہیں، خیرات وصدقات دیتے ہیں، غرباء ومساکین کی سرپرستی کرتے ہیں، عام رفاہی کاموں میں پیسہ خرچ کرتے ہیں، تو کیا انہیں ان کاموں کا بدلہ وثواب اور معاوضہ ملے گا؟ یا ان کے عذاب میں کسی تخفیف کی امکانی صورت پیدا ہو سکتی ہے؟

تو آیت کریمہ نے بالکل واضح کیا کہ ہر قسم کی حسنات اور نیکیوں کی قبولیت کے لئے ایمان باللہ و بالیوم الآخر بنیادی شرط ہے۔ جہاں ایمان ہوگا تو وہاں ذرّہ بھر نیکی پہاڑوں کے برابر قبولیت کا شرف حاصل کر سکے گی، اور جہاں ایمان نہ ہو وہاں پہاڑوں برابر نیکیوں کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہوگی۔ اور وہ سب کی سب اس کھیتی کی طرح ضائع وتباہ ہو جائیں گی جس پر سخت سرد پالے نے تباہی مچادی ہو۔ اسی طرح کفار کے کفر سے تمام حسنات پر تباہی آجائے گی، کوئی ایک ذرّہ عمل بھی باقی نہیں رہے گا۔

البتہ! کفار کی نیکیوں کا معاوضہ انہیں دنیا میں ضرور ملے گا، کیونکہ فیصلہ حتمی یہی ہو چکا ہے کہ: ﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ آخرت کا اجر وثواب صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے، اس میں کفار ومنافقین کا کوئی ادنیٰ حصہ بھی نہیں ہوگا۔

﴿وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، لیکن وہ اپنی جانوں پر خود ہی ظلم کرتے ہیں۔ آخر سوچنا چاہئے کہ ثواب وعقاب کیلئے اللہ تعالیٰ نے شرائط وضع کی ہیں، پھر اپنے بندوں کی مکمل رہنمائی بھی کی ہے، اور انہیں ثواب وعقاب کے اختیار کرنے، اور انتخاب کرنے کا مکمل اختیار بھی عطاء کیا ہے۔ اس طرح اتمامِ حجت کرنے کیلئے انہیں آزادی بھی دی ہوئی ہے۔ پس اگر کسی نے کفر کا انتخاب کر کے نیکیوں کو ضائع کیا، اور عقاب وعذاب کو خریدا تو قصور اس کا اپنا ہی ہوگا، کہ جانتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو تباہ و برباد کیا، اور اپنی آخرت کی کھیتی خود خراب کر دی۔

قرآن حکیم نے مؤمنوں کے لئے فرمایا: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ﴾۔ [الأنبیاء: ۹۴] (پس جو بھی نیکیوں کا عمل کرے، اور وہ مؤمن ہو، تو اس کی کوشش کی ناقدری نہیں ہوگی، اور ہم اسے لکھنے والے ہیں)۔ دیکھئے! تمام حسنات اور نیکیوں کے لئے ایمان شرط ہے، اس کے ساتھ ادنیٰ ذرّہ نیکی کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں ہے، اور کفر کے ساتھ کسی بڑی سے بڑی نیکی کے کارآمد ہونے کی اُمید نہیں۔ تو انبیاء کرام علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کی یہی تعلیم سب کے سامنے واضح ہوئی کہ ایمان اختیار کرو، اور کفر سے اجتناب کرو۔ پس جو قبول کرے گا نجات پائے گا، اور جو نہیں کرے گا وہ ہلاک ہو جائے گا۔

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ
خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَمَا
تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! مخلص دوست نہ بناؤ اپنوں کے سوا دوسروں کو، وہ تمہارے حق میں خرابی پیدا کرنے میں کمی نہیں کرتے، وہ اس چیز کو پسند کرتے ہیں جو تمہیں مشقت میں مبتلا کرے، تحقیق دشمنی ان کے مونہوں (زبانوں) سے ظاہر ہو چکی ہے، اور جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں وہ بہت زیادہ ہے، تحقیق ہم نے تمہارے لئے آیتیں بیان کر دی ہیں، اگر تم عقل رکھتے ہو ﴿۱۱۸﴾

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ شانہ کا جتنا شکر بجالائیں، اور کائنات کے ذرّات جتنی اس کی مدح وثناء بیان کریں، ہر لمحہ اس کے حضور جھک کر سر بسجود رہیں، پھر بھی کم ہے۔ اس کے حقوق کی ادائیگی سے سارا عالم عاجز وقاصر ہے۔ یہ ان کا کتنا کرم ہے کہ وہ واضح اعلان کرتا ہے: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ [البقرة: ۲۵۷] (اللہ کارساز ہے ان لوگوں کا جنہوں نے ایمان لایا ہے، ان کو نکالتا ہے اندھیروں سے روشنی کی طرف)۔

یہ اتنا قیمتی اعلان ہے کہ سارا جہاں اور اس کی نعمتیں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ قدم قدم پر اپنے بندوں کیلئے، اور ان کی آبادی وخوشحالی کے لئے ہدایات ورہنما اصول وضع کرتے ہیں، اور ارشاد فرماتے ہیں، اور کیسے پیارے خطاب سے نوازتے ہیں: ''اے میرے مؤمن بندو! ذرّا ادھر متوجہ ہو جاؤ''۔

﴿لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ﴾ یہ یہود ونصاریٰ، یہ مشرکین، یہ دشمنانِ اسلام تمہارے ربّ کے اور تمہارے عظیم الشان پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور تمہارے قرآن کے، اور تمہارے مقدس دین کے دشمن اور بدخواہ ہیں، تمہاری وفاداری اور اخلاص کا یہی تقاضاء ہے کہ اپنے ربّ جل شانہ کے دشمنوں کے ساتھ باطنی وقلبی دوستی سے باز رہو، اور ان کے ساتھ اسی طرز وطریقے پر دشمنی رکھو، اور لاتعلق رہو، جس طرز پر تمہارا پروردگار ان سے دشمنی رکھتا ہے، تاکہ تم ان کے مکر وفریب، اور ہر قسم کے شر فساد سے محفوظ رہو۔

تم ذرّا دیکھو! کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے بہی خواہ اور دوست ہیں، اور تمہارے دینی، مذہبی، مالی اور

جانی دشمن ہیں۔ پس تم بھی آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور بہی خواہ رہو، اور اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر ان کا مکمل دشمن بنو، اوران کی صفوں سے دور رہو۔

یہاں پر ''بِطَانَة'' کا لفظ آیا ہے، جو کہ خاص الخاص راز دان اور گہرے باطنی قلبی دوست کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ بِطَانَۃُ الرَّجل کا استعمال نہایت باطنی اور قلبی دوست کے لئے ہوتا ہے۔ بِطَانَة عربی میں کوٹ، واسکٹ اور قمیص کے استر، یعنی اندر لگائے جانے والے کپڑے کو کہتے ہیں، جس کا عربی میں دوسرا نام شِعَار ہے، جیسے کہ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ سید عالم ﷺ نے انصارِ مدینہ کے متعلق فرمایا: اَلْاَنْصَارُ شِعَارٌ وَالنَّاسُ دِثَارٌ. یعنی انصار میرے لئے بمنزلہ استر و بطانہ کے ہیں، اور باقی لوگ باہر کے کپڑے کی مانند ہیں۔

تو شعار و بطانہ نہایت قریبی مخلص دوست کیلئے بولا جاتا ہے۔ تو مسلمانوں کو نصیحت کی جارہی ہے کہ اہل ایمان کے علاوہ کسی بھی دشمنِ خدا، اور دشمن سول سے محبت نہ کرو، اور انہیں قریبی دوست بنانے سے پرہیز کرو۔ سورۃ ممتحنۃ میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ﴾ [الممتحنۃ: ۱] (اے ایمان والو! میرے دشمن اور تمہارے دشمن کو دوست مت بناؤ)۔ سورۂ مائدہ میں اس سے بھی سخت حکم کے ساتھ ارشاد ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِیَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ﴾ [المائدۃ: ۵۱] (اے یمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست مت بناؤ، وہ خود بعض بعض کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو بھی ان سے دوستی کرے گا تو وہ انہی میں سے ہوگا)۔ اس آخری جملہ میں وعیدِ شدید ہے، جو ایمان کے لئے بڑا خطرہ ہے۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهَا.

اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں متعدد اقوال ہیں۔ بہر حال! شانِ نزول کچھ بھی ہو آیت کریمہ کا حکم عام ہے، قیامت تک کے لئے اہلِ ایمان کو خبردار کیا جارہا ہے کہ دشمنانِ اسلام کے ساتھ دوستی نہ کرو۔ یہ اس لئے کہ: ﴿لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا﴾ وہ تمہارے درمیان فتنہ و فساد برپا کرنے میں کوئی کمی نہیں کریں گے۔

''خَبَال'' کے معنی فساد۔ کفار کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح نقصان پہنچائیں، اور انہیں ہر طرح بے بس ولاچار کر کے مجبور کریں۔ انہیں تمہاری آبادی اور خوشحالی ہرگز منظور نہیں۔ ان سے دوستی قائم کرنے کی صورت میں مسلمانوں کو دین اور دنیا دونوں جگہ نقصان ہوگا۔ سورۂ بقرہ میں گزر چکا کہ اہلِ کتاب ہرگز پسند نہیں کرتے کہ اہلِ اسلام پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی بہتری نازل ہو، یا ان کو اس دنیا میں کوئی ترقی اور

عزت نصیب ہو۔ وہ ہمیشہ یہی چاہتے ہیں کہ مسلمان ان سے زیادہ پستی میں چلے جائیں۔

﴿وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ﴾ وہ تمہارے رنج والم، اور ہر طرح کی مشقت کو پسند کرتے ہیں، اور ان کی دلی خواہش ہر وقت یہ ہوتی ہے کہ مسلمان مصیبت اور پریشانیوں میں مبتلا ہوں۔ ان کی اسلام دشمنی اور بدخواہی کی بات بعض اوقات اتفاقاً ان کی زبانوں پر بھی آجاتی ہے۔ وہ لاکھ کوشش کریں کہ ان کی اسلام کے ساتھ دشمنی مخفی رہے، مگر پھر بھی کبھی منہ سے کوئی نہ کوئی بات ایسی نکل جاتی ہے جو ان کی اندرونی خباثت کا مظہر ہوتی ہے، اور جو کچھ ان کے دلوں میں چھپی ہوئی غلاظت ہے، وہ تو اس سے کہیں بڑھ کر ہے، لہٰذا ان سے ہمیشہ خبردار اور محتاط رہنا چاہئے، کوئی راز کی بات ان تک نہیں پہنچنا چاہئے۔

﴿قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ عام طور پر عقلمند لوگوں کے لئے محض ایک اشارہ بھی کافی ہوتا ہے، مگر ربّ العزت عزیز وکریم تمہیں وضاحت کے ساتھ کھول کھول کر اپنی نشانیاں، اور تمہارے دشمنوں کی چالوں کو بیان کردیا ہے، اگر تم عقل وشعور رکھتے ہو تو ان ہدایاتِ ربانی پر عامل اور کاربند رہو، اور اپنے خیرخواہ و بدخواہ میں تمیز کرو، اور اپنے پروردگار کا شکر ادا کرو۔

بہ نزدِ من آنکس نکوخواہ تست ☆ کہ گوید فلان خار در راہ تست

(سعدی)

هَآنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا
اٰمَنَّا ۖ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۚ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ
عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۖ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا
بِهَا ۚ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ۚ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾

ترجمہ: سنو اے لوگو! تم ان سے محبت کرتے ہو، اور وہ تم سے محبت نہیں کرتے، اور تم ایمان رکھتے ہو سب کتابوں پر، اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم بھی ایمان لائے ہیں، اور جب وہ الگ ہوتے ہیں تو غصے کی وجہ سے تم پر انگلیاں کاٹتے ہیں، اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے: تم اپنے ہی غصے سے مرو، بیشک اللہ تعالیٰ سینے کے

رازوں کو جانتا ہے ﴿۱۱۹﴾ اے اہلِ ایمان! اگر تم کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو ان کو بری لگتی ہے، اور اگر تم کو کوئی برائی پہنچتی ہے تو اس کے ساتھ خوش ہوتے ہیں، اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو، تو اِن کی تدبیر کچھ نقصان نہ پہنچائے گی، بیشک اللہ تعالیٰ احاطہ کرنے والا ہے اس کا جو کچھ وہ عمل کرتے ہیں ﴿۱۲۰﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں جو ہدایت مسلمانوں کے لئے نازل ہوئی کہ اپنے دینی دشمنوں کے ساتھ خصوصی محبت سے اجتناب کرو، مذکورہ آیات میں اس حکم کی تشریح ہے، اور واضح دلائل بھی ہیں۔

پہلی بات: ﴿هٰٓاَنۡتُمۡ اُولَآءِ تُحِبُّوۡنَهُمۡ﴾ سنو اور دیکھو! تم تو قرابت یا دوستی کے پیشِ نظر ان منافقین سے محبت کرتے ہو، حالانکہ وہ اختلافِ مذہب کی وجہ سے تم سے محبت نہیں کرتے۔ یہ ایک عجیب بات ہے، تو پھر تمہیں بھی ان سے محبت نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ محبت ہمیشہ جانبین سے ہوتی ہے، یک طرفہ محبت کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ مشہور مقولہ ہے کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے، نہ کہ ایک ہاتھ سے۔

دوسری بات: ﴿وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ كُلِّهٖ﴾ اور باوجودیکہ تم سب کتابوں تورات، انجیل، زبور، قرآن کریم پر ایمان رکھتے ہو، جبکہ وہ آسمانی کتابوں میں تفریق کرتے ہیں۔ یہود انجیل اور قرآن کریم پر ایمان نہیں لائے، اور نصاریٰ نے تورات وقرآن مجید کا انکار کیا، اور یہ دونوں نے مل کر قرآن کریم کی تکذیب کی۔ اور یہ بات بھی ہے کہ یہود بھی مکمل تورات پر ایمان نہیں لائے، جیسے ارشاد ہے: ﴿اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ﴾ [البقرة:۸۵] (کیا تم بعض کتاب پر ایمان لاتے ہو، اور بعض کا انکار کرتے ہو؟) کہ تورات کے چند احکام کو مانے، اور کچھ احکام سے منحرف ہوئے۔ اور یہی کیفیت نصاریٰ کی ہے، کہ انجیل کے اکثر حکموں سے منحرف ہوئے، کیونکہ تورات وانجیل میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف، اور قرآن حکیم، اور آخری اُمت کے جتنے فضائل اور اوصاف مذکور ہیں، انہوں نے ان کا مکمل انکار کیا، اور سب باتوں میں تحریف کی وغیرہ۔

اس بات سے اشارہ ہے کہ مسلمان جتنے حق پر مضبوط ہیں، وہ لوگ باطل پر اسی طرح مضبوط ہیں۔ پس اہلِ حق کی اہلِ باطل کے ساتھ نہ کسی دوستی کی گنجائش باقی رہتی ہے، نہ کسی اتحاد کی۔ گویا یہ حکمِ سابق کے لئے بمنزلہ دلیل کے ہے۔ اسی طرح یہ آئندہ آنے والا حکم بھی جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَاِذَا لَقُوۡكُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا﴾ وہ تم سے ملتے ہیں تو نفاق کے ساتھ کہتے ہیں: ہم تمہاری طرح مسلمان

ہیں، قرآن کریم اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہمارا ایمان ہے۔

﴿وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ﴾ جب تنہائی میں اپنے ہم مشرب لوگوں کے پاس جاتے ہیں، تو غصہ سے تم مسلمانوں پر انگلیاں کاٹتے ہیں۔ صحاح میں ہے کہ ''غَیظ'' کے معنی ہیں: شدّت غضب، یعنی وہ حرارت جو خون کے جوش میں آنے کی وجہ سے انسان اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ تمہاری سلطنت دیکھتے ہیں تو حسد کی آگ میں جل جاتے ہیں، اور تم کو ضرر پہنچانے کا کوئی راستہ ان کو نہیں مل جاتا تو شدّتِ غضب کی وجہ سے نہایت حسرت وافسوس کے ساتھ اپنی انگلیاں چبا کر کاٹتے ہیں۔ یا یوں سمجھو، اس سبب سے انگلیاں کاٹتے ہیں کہ اظہارِ ایمان کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ نہیں ہوتا، اور وہ دل سے اسے پسند نہیں کرتے، پس افسوس کے ساتھ انگلیاں چبا کر کاٹتے رہتے ہیں۔

﴿قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ﴾ آپ انہیں توبیخ وزجر کے ساتھ کہئے، تا کہ ان کے اندرونی زخموں پر خوب نمک پاشی ہو، کہ اے دشمنانِ اسلام! تم اپنے غیظ وغضب کی آگ میں جل کر مر جاؤ، کیونکہ جوں جوں اسلام کو ترقی ہوتی رہے گی، اور مسلمان آئے دن بڑھتے رہیں گے، اور ان کی شان وشوکت میں اضافہ اور زیادتی ہوتی رہے گی، تم مسلسل جلتے رہو، اور مرتے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کے احوال سے باخبر ہے، اور زندگی بھر اس کے حکم سے تمہیں کوئی سکون نصیب نہ ہوگا۔

﴿إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾ اور اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں چھپے ہوئے نفاق سے خبردار ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ ان منافقین کی دوستی سے تمہیں اللہ تعالیٰ جب منع کرتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے قلوب میں تمہارا حسد وبغض چھپا ہوا ہے، جس سے اللہ تعالیٰ مکمل باخبر ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ:

﴿إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا﴾ اگر تم کو کوئی بھلائی یا فائدہ حاصل ہو تو یہ بڑے پریشان ہوتے ہیں، ان کو بہت رنج وتکلیف پہنچتی ہے۔ مثلاً یہ کہ تمہیں دشمن پر غلبہ حاصل ہوا، یا کوئی خوشحالی ہاتھ آئی، یا مالِ غنیمت حاصل ہوا، یا فراغت نصیب ہوئی، تو ان پر قیامت آجاتی ہے، ان کا سکون و راحت غارت ہوجاتی ہے، اور غم کے مارے مرنے لگتے ہیں، اور اگر تم پر کوئی برائی یا پریشانی آجاتی ہے تو خوب خوش ہوجاتے ہیں، آپس میں ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں، اور اپنے گھروں میں جشن مناتے ہیں، تو کیا ایسے

بدخواہوں کے ساتھ کسی دوستی کا جواز ہے؟ ہرگز نہیں!!

﴿وَإِنۡ تَصۡبِرُوۡا﴾ اگر ان کی عداوت پر، یا تمام مصائب و پریشانیوں پر، یا ان کے ناشائستہ رویہ پر، یا اللہ تعالیٰ کے حکموں پر صبر کرو گے، اور ہر طرح برداشت کرو گے۔

﴿وَتَتَّقُوۡا﴾ اور تقویٰ اختیار کرو گے، جزع فزع سے پرہیز کرو گے، رضائے الٰہی کا انتظار کرو گے، قضاء الٰہی پر راضی رہو گے، تو یہ انعام مقرر ہے: ﴿لَا یَضُرُّکُمۡ کَیۡدُھُمۡ شَیۡـًٔا﴾ ان کی مکاری تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ اگر وہ پوشیدہ طور پر تمہیں نقصان پہنچانا چاہیں تو ہرگز کامیاب نہیں ہوں گے، بلکہ الٹا ان کی تدبیریں انہی کو نقصان سے دوچار کریں گی، اور ان کا مکر ان کے اپنے گلے میں طوقِ لعنت بن کر ڈالا جائے، اور اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم، اور اس کی حفاظت جس کا وعدہ صبر اور تقویٰ والوں کے ساتھ کیا گیا ہے، تمہیں شامل حال رہے گی۔

یاد رہے کہ مسلمان کی زندگی مکمل صبر وتقویٰ سے عبارت ہے۔ ہر محاذ پر صبر، ہر موقع پر تقویٰ اسلامی زندگی کا محور ہے۔ آخرت کی تمام مسرتیں اور راحتیں صابرین اور متقین کیلئے مقرر ہیں۔ پھر مؤمن کے لئے ہر مصیبت، پریشانی، بیماری، دکھ یہاں تک کہ کسی کانٹے کے چبھنے پر بھی ثواب کا وعدہ ہے۔ اس لئے پرہیزگاروں کو مصیبت پر بہ نسبت نعمت کے زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ ہر ادنیٰ پریشانی پر ثواب ملتا ہے، درجات بلند ہوتے ہیں، اور گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھے ایک ایسی آیت معلوم ہے اگر لوگ اس کو پکڑ لیں تو وہی ان کے لئے کافی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّہٗ مَخۡرَجًا ۙ﴿۲﴾ وَّیَرۡزُقۡہُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَحۡتَسِبُ ؕ وَمَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسۡبُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمۡرِہٖ ؕ قَدۡ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیۡءٍ قَدۡرًا ﴿۳﴾﴾ [الطلاق۔ رواہ أحمد، ابن ماجه و دارمي] (اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا، اللہ اس کے لئے مشکل سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کردے گا۔ اور اسے ایسی جگہ سے رزق عطاء کرے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوگا۔ اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے، تو اللہ اس (کا کام بنانے) کے لئے کافی ہے۔ یقین رکھو کہ اللہ اپنا کام پورا کرکے رہتا ہے۔ (البتہ) اللہ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر رکھا ہے)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ایک روز میں حضرت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے تھا، آپؐ نے مجھے خطاب فرمایا: اے بیٹے! اللہ تعالیٰ کا لحاظ رکھ، اللہ تعالیٰ تیری نگہداشت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا لحاظ رکھ، تو اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے پائے گا۔ اگر کچھ مانگنا ہو تو اللہ تعالیٰ سے مانگ۔ اگر مدد کی درخواست ہو تو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر۔ اور

معلوم کرو، سمجھو کہ اگر سب لوگ جمع ہو کر تجھے کچھ نفع پہنچانا چاہیں گے تو بس اتنا ہی نفع پہنچائیں گے جتنا اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے۔ اور اگر سب لوگ مل کر تجھے کچھ نقصان پہچانا چاہیں گے تو صرف اتنا ہی نقصان پہنچائیں گے جتنا اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے۔ قلم اٹھا لئے گئے، اور لکھی ہوئی تحریریں خشک ہو گئیں۔ [ترمذي، أحمد]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جل شانہ نے فرمایا ہے کہ اگر میرے بندے میری فرمانبراری کرتے تو میں رات میں ان پر بقدر سیرابی پانی برساتا، اور دن میں سورج نکالتا، اور گرج کی آواز بھی نہ سناتا۔ یعنی لوگوں کی تجارت وصنعت اور دوسرے کاروبار بھی خراب نہ ہوتے، اور زراعت کا نقصان بھی نہ ہوتا، اور نباتات وحیوانات پیاسے بھی نہ رہتے۔ [رواہ أحمد]

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مؤمن کا معاملہ عجیب ہے، اس کے سارے کام خیر ہی خیر ہیں، اور یہ بات مؤمن کے علاوہ کسی کو میسر نہیں۔ اگر اس کو راحت ملتی ہے تو شکر کرتا ہے، اور یہ شکر اس کے لئے سراسر موجبِ خیر ہوتا ہے۔ اور اگر اسے کچھ دکھ پہنچتا ہے تو صبر کرتا ہے، اور یہ صبر اس کے لئے سراسر موجبِ خیر ہوتا ہے۔ [رواہ مسلم]

﴿إِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ﴾ بالیقین اللہ تعالیٰ اپنے علمِ کلی کے ساتھ ان کے اعمال پر احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اگر اہلِ کتاب، کفار، منافقین مسلمانوں کو ضرر پہنچاتے ہیں، یا ان کی بدخواہی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا علم ان سب پر محیط ہے۔ وہ اگر چاہے تم کو دشمنوں کی ایذاء رسانی سے محفوظ فرمائے گا، اور انہیں دنیا یا آخرت یا دونوں میں سزا دے گا، اور تمہیں پریشانیوں پر ثواب عطا فرمائے گا۔

❁ ❁ ❁

وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٢١﴾ إِذْ
هَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنكُمْ أَن تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١٢٢﴾

ترجمہ: اور جب آپ صبح کے وقت نکلے اپنے گھر سے، آپ ٹھکانے مقرر کرتے تھے ایمان والوں کے لئے، لڑائی کے واسطے، اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے ﴿١٢١﴾ جب خیال کیا تم میں سے دو گروہوں نے کہ وہ بزدل ہو جائیں، اور اللہ تعالیٰ ہی ان کا ولی ہے، اور چاہیے کہ ایمان والے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں ﴿١٢٢﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں بیان ہوا کہ تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو تو تمہیں کوئی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی، اور اگر غزوۂ اُحد میں تمہیں عارضی شکست ہوئی، یا جانی نقصان ہوا تو انہی دونوں چیزوں کی کمی کی وجہ سے، لہٰذا آئندہ تمہیں محتاط رہنا چاہیے۔

غزوۂ اُحد کا پس منظر:

آیت کریمہ کی تفسیر سے قبل ضروری ہے کہ غزوۂ اُحد کے واقعاتی پس منظر کو سمجھ لیا جائے۔ رمضان المبارک ۲ سنہ ھ میں بدر کے مقام پر قریشی فوج اور مسلمان مجاہدین میں جنگ ہوئی، جس میں کفار مکہ کے ستر (۷۰) نامور اشخاص مارے گئے، اور اسی قدر گرفتار ہوئے۔ اس تباہ کن اور ذلت آمیز شکست سے جو در حقیقت عذابِ الٰہی کی پہلی قسط تھی، قریش کا جذبۂ انتقام بھڑک اٹھا، اور جو سردار مارے گئے تھے ان کے اقارب نے تمام عرب کو غیرت دلائی، اور یہ معاہدہ کیا کہ جب تک ہم اس کا بدلہ مسلمانوں سے نہ لیں گے، چین سے نہ بیٹھیں گے، اور اہلِ مکہ سے اپیل کی کہ ان کا تجارتی قافلہ جو مال شام سے لایا ہے، وہ سب اسی مہم پر خرچ کیا جائے تا کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں سے اپنے مقتولین کا بدلہ لے سکیں۔

اس بات پر سب نے اتفاق کیا۔ یہ مال تقریباً پچاس ہزار دینار کی مقدار میں تھا۔ چنانچہ ۳ سنہ ھ میں قریش کے ساتھ بہت سے دوسرے قبائل بھی مدینہ پر چڑھائی کرنے کی غرض سے نکل پڑے، حتیٰ کہ عورتیں بھی ساتھ آئیں، تا کہ موقع آنے پر مردوں کو غیرت دلا کر کسی پسپائی سے روک سکیں۔

جس وقت یہ تین ہزار کا لشکر اسلحہ وغیرہ سے پوری طرح آراستہ ہو کر مدینہ سے تین چار میل جَبلِ اُحد کے قریب خیمہ زن ہوا، تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں سے مشورہ لیا۔ آپؐ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ بہت آسانی اور کامیابی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول، جو بظاہر مسلمانوں میں شامل تھا، اس سے بھی رائے لی گئی، جو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے کے موافق تھی۔

مگر بعض پر جوش مسلمان جنہیں بدر کی شرکت نصیب نہیں ہوئی تھی، اور انہیں شوقِ شہادت بے چین کر رہا تھا، مُصر ہوئے کہ ہم کو مدینہ سے نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے، تا کہ دشمن ہمارے بارے میں بزدلی اور کمزوری کا گمان نہ

کرے۔ چنانچہ کثرت رائے اسی طرف ہوگئی۔

اتنے میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مکان کے اندر تشریف لے گئے، اور زرہ پہن کر باہر تشریف لائے، تو اس وقت بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ ہم نے آپؐ کو آپؐ کی رائے کے خلاف مدینہ سے باہر جنگ کرنے پر مجبور کیا، یہ کوئی اچھی بات نہ ہوئی، اس لئے انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر آپ کا منشا نہ ہو تو یہاں مدینہ تشریف رکھیں، اور یہاں مقابلہ ہو۔ اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ایک پیغمبر کو یہ زیب نہیں دیتا کہ جب وہ زرہ پہن لے، اور ہتھیار اٹھائے، پھر بدونِ قتال کے اسے بدن سے اُتار لے۔ اس جملہ میں نبی اور غیر نبی کا فرق واضح ہو رہا ہے کہ نبی کی ذات سے کبھی کمزوری کا اظہار نہیں ہو سکتا، اور اس میں اُمت کے لئے بھی بڑا سبق ہے۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مدینہ سے باہر تشریف لے گئے، تقریباً ایک ہزار آدمی آپؐ کے ساتھ تھے، مگر منافق ابن سلول تقریباً تین سو آدمیوں کو لے کر راستے سے یہ کہتا ہوا واپس ہو گیا کہ جب میرا مشورہ نہ مانا، اور دوسروں کے مشورہ پر عمل کیا تو ہم کو لڑنے کی ضرورت نہیں، کیوں ہم خواہ مخواہ اپنے کو ہلاکت میں ڈالیں۔ اس کے ساتھیوں میں زیادہ تر منافق ہی تھے، مگر بعض مسلمان بھی اس کے فریب میں آ کر واپس ہو گئے۔ آخر آپؐ کُل سات سو سپاہیوں کی جمعیت لے کر میدانِ جنگ میں پہنچ گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بہ نفسِ نفیس فوجی قاعدہ سے صفیں ترتیب دیں۔ صف آرائی اس طرح فرمائی کہ جبلِ اُحد کو پشت کی جانب میں رکھا، اور دوسرے انتظامات اس طرح کئے کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو علم (جھنڈا) عنایت کیا۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کو رسالہ کا افسر مقرر فرمایا۔ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کو اس حصہ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھا۔ پشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن ادھر سے حملہ کرے، اس لئے پچاس تیر اندازوں کا دستہ وہاں متعین کیا، اور حکم دیا کہ وہ پشت کی جانب ٹیلہ پر حفاظت کا کام سرانجام دیں، لڑنے والوں کی فتح وشکست سے تعلق نہ رکھیں، اور کسی بھی صورت اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ ان تیر اندازوں کے افسر مقرر ہوئے۔

قریش کو بدر میں تجربہ ہو چکا تھا، اس لئے انہوں نے بھی ترتیب سے صف آرائی کی، اور منظم ہو گئے۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جنگی ترتیب غیروں کی نظر میں:

دنیا میں کوئی ایسا کمال نہیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ اقدس کو اوّلیت حاصل نہ ہو۔ فنِ سپہ گری، فنونِ حرب، فوج کی صف آرائی اور کمان کرنے کے سارے اصول آپؐ کے غلام مانے جاتے ہیں۔ معرکۂ اُحد میں آپؐ کی

فوجوں کو صف آرائی اور ترتیب سے انہیں جنگی مقامات پر متعین کرنا، یہ آپؐ کی عظیم دانشمندی اور عقلمندی کی نشانی ہے۔ آپؐ کے علم ومعرفت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ آپؐ امت کے رہبر کامل مُقدّس پیشوا، اور نبی ہونے کے ساتھ سپہ سالارِ اعظم کے لحاظ سے بھی بے مثال وبے بدل ہیں۔

آپ ﷺ نے جس انداز سے مورچے قائم کئے، اورلڑائی کا نظم متعین کیا اُس وقت کی دنیا اس سے ناآشنا تھی، اور آج جبکہ فنِ حرب ایک مستقل سائنس کی حیثیت اختیار کر گیا ہے وہ بھی آپؐ کے فوجی قواعد اور نظم وضبط کو سراہتا ہے۔ اس حقیقت کو دیکھ کر ایک مسیحی مؤرخ بول اٹھا:

"برخلاف اپنے مخالفین کے جو محض ہمت وشجاعت ہی رکھتے تھے، محمد (ﷺ) نے کہنا چاہئے کہ فنِ حرب کی بھی نئی راہ نکالی۔ مکہ والوں کی بے دھڑک اور اندھادھند لڑائی کے مقابلہ میں خوب دوراندیشی، اور سخت قسم کے نظم وضبط سے کام لیا"۔

اَلْفَضْلُ مَاشَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ. مسیحی مؤرخین اور مستشرقین اتنے متعصب اور حد درجہ سے زیادہ بہتان تراش دشمن ہوتے ہیں، جہاں شاید ابلیس کی بھی رسائی نہ ہو، مگر ربّ العزّت سبحانہ کبھی ان کی زبان اور قلم سے غیر اختیاری طور اس قسم کی باتیں نکالتے ہیں۔

جنگ کا آغاز:

اس کے بعد جنگ باقاعدہ شروع ہوئی۔ ابتداء میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا، یہاں تک کہ دشمن کی فوج میں ابتری پھیل گئی، مسلمان سمجھے کہ فتح ہوگئی (حالانکہ یہ عارضی وقتی فتح تھی) مگر مسلمانوں کو غلط فہمی ہوئی۔ شاید قدرت کی طرف سے اسی میں مصلحت اور حکمت پوشیدہ تھی۔ پس کیا ہوا کہ مسلمان مالِ غنیمت کی طرف متوجہ ہوئے۔ ادھر جن پچاس تیراندازوں کو ٹیلے کے اوپر بٹھادیا گیا تھا، اور انہیں صاف کہا گیا تھا کہ میدانِ جنگ کی فتح وشکست سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے، تم ہر صورت یہاں پر جم کر رہو، اور کبھی یہاں سے نہ ہٹو۔

مگر انہوں نے جب دیکھا کہ دشمن بھاگ نکلا ہے، تو وہ اپنی جگہ چھوڑ کر پہاڑ کے دامن کی طرف اترنے لگے۔ ان کے افسر عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے ہر چند انہیں سمجھایا، اور خاتم الانبیاء ﷺ کی نصیحت وہدایت انہیں یاد دلائی، اور انہیں روکنے کی کوشش کی، مگر سات آدمیوں کے سوا دوسروں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ کے حکم کی تعمیل تو

موقت تھی، اب ہمیں میدان میں آکر سب کے ساتھ ملنا چاہئے، چنانچہ وہ سارے نیچے اترے، اور پہاڑ خالی ہوا، جس پر صرف سات آدمی برقرار رہے۔

اللہ تعالیٰ کی شان دیکھئے! ادھر خالد بن ولید نے جو کہ قریشی فوج کے ایک دستہ کی قیادت پر مامور تھے، (ابھی تک وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے) اس موقع سے فائدہ اٹھایا، اور پہاڑ کا چکر کاٹ کر عقب کے درّہ سے زوردار حملہ کردیا۔ عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ اوران کے قلیل ساتھیوں نے اس حملہ کو جرأت وشجاعت سے روکنا چاہا، مگر جرار لشکر کا مقابلہ اور مدافعت نہ کرسکے، اور سارے شہید ہوگئے، اور یہ سیلاب یکایک مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔

دوسری طرف جو دشمن بھاگ گئے تھے، وہ بھی پلٹ کر حملہ آور ہوئے۔ اس طرح جنگ کا پانسہ ایک دم پلٹ گیا، اور مسلمان اس غیر متوقع صورت حال سے اس قدر سراسیمہ ہوئے، کہ ان کا ایک بڑا حصہ پراگندہ ہوکر میدان سے چلا گیا۔

تاہم کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میدان میں ثابت قدمی سے ڈٹے ہوئے تھے۔ اتنے میں کہیں سے یہ افواہ اڑ گئی کہ جناب سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہوگئے۔ اس جانگداز خبر نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے رہے سہے ہوش وحواس بھی گم کردیئے، اور باقی ماندہ لوگ بھی ہمت ہار کر بیٹھ گئے۔ اس وقت آپؐ کے گرد وپیش صرف دس بارہ جان نثار رہ گئے تھے، اور آپؐ خود بھی زخمی ہوگئے تھے۔ شکست کی تکمیل میں کوئی کسر باقی نہیں رہی تھی، کہ عین اسی وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معلوم ہوگیا کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بسلامت تشریف رکھتے ہیں، چنانچہ وہ ہر طرف سے سمٹ کر پھر آپؐ کے گرد جمع ہوگئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بسلامت پہاڑی کی طرف لے گئے۔

اس شکست کے بعد مسلمان حد درجہ پریشان رہے، اور یہ عارضی شکست چند اسباب کا نتیجہ تھی۔ قرآن کریم نے ہر سبب پر واضح الفاظ میں تبصرہ کیا، اور آئندہ کے لئے محتاط رہنے کی ہدایت وتلقین فرمائی۔ اس واقعہ کی تفصیل میں کچھ ایسے واقعات ہیں جو اپنے اندر عظیم سبق لئے ہوئے ہیں، اور اس میں تمام مسلمانوں کے لئے موعظت ونصیحت کے جواہر پارے مخفی ہیں۔

اُحد کے واقعہ سے چند سبق:

(۱)...... پہلی بات جیسا کہ پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ کفارِ قریش اس جنگ میں عورتوں کو بھی لائے تھے۔ تاکہ وہ مردوں کو پسپائی سے روک سکیں۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا کہ عورتیں ہندہ بنت عتبہ زوجہ ابوسفیان بن حرب کی

سربراہی میں اشعار گا کر مردوں کو جوش دلا رہی ہیں، اور یہ اشعار پڑھ رہی تھیں:

إن تقبلوا نعانق	⋆	ونفرش النمارق
أوتدبروا نفارق	⋆	فراق وامق

مطلب یہ تھا کہ اگر مقابلہ پر ڈٹے رہے، اور فتح پائی تو ہم تم کو گلے لگائیں گی، اور تمہارے لئے نرم بستر بچھائیں گی۔ لیکن اگر تم نے پیٹھ موڑی تو ہم تم کو بالکل چھوڑ دیں گی۔

اس وقت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان حق بیان پر یہ الفاظ دعائیہ جاری تھے: اَللّٰھُمَّ بِکَ أَحُوْلُ وَبِکَ أَصُوْلُ وَبِکَ أُقَاتِلُ حَسْبِیَ اللہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ۔ "اے اللہ! میں تجھ ہی سے قوت حاصل کرتا ہوں، اور تیرے ہی نام سے حملہ کرتا ہوں، اور تیرے ہی دین کے لئے قتال کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے، اور وہ بڑا اچھا کارساز ہے"۔

اس دعاء کا ایک ایک لفظ تعلق مع اللہ کی تاکید اور مسلمانوں کے تمام اعمال وافعال حتی کہ جنگ وقتال کو بھی دیگر اقوام کے جنگ وقتال سے ممتاز کر رہا ہے۔

فائدہ:

اصحابِ سیرت نے ان عورتوں کی تعداد بارہ (۱۲) بتائی ہے۔ فتحِ مکہ کے روز ان میں سے دس مشرف باسلام ہوئیں، سوائے دو (۲) کے، ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک کا نام عمرۃ تھا، جو شہید فی سبیل اللہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی بدنصیب والدہ تھی۔

(۲)...... دوسری چیز قابلِ غور یہ ہے کہ اس غزوہ میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بہادری وشجاعت وجان نثاری اور فدائیت کے وہ نقوش رقم کئے کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے اپنے جسم کو سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ڈھال بنایا تھا، کہ ہر آنے والا تیر اپنے سینہ پر کھاتے تھے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح اپنے بدن کو چھلنی کرالیا تھا، اور ان کی انگلیاں کٹ گئی تھیں، لیکن آپ کی رفاقت کو نہیں چھوڑا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا حضرت انس بن النضر رضی اللہ عنہ جنگ بدر سے غیر حاضر رہے تھے، اس لئے ان کو اس کا افسوس تھا، وہ آرزو کرتے تھے کہ آپ کی رفاقت میں کوئی موقع ہاتھ آئے، تو اپنے دل کی حسرت پوری کروں گا۔ جب جنگِ اُحد کا واقعہ پیش آیا تو انس بن النضر رضی اللہ عنہ شریک ہوئے، اور پوری شجاعت وبہادری سے لڑے اور شہید ہوئے۔

(۳)...... تیسری بات یہ ہے کہ غزوۂ بدر کے ستر قیدیوں کے بارے میں جب مشورہ ہوا تھا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے کہ تھا کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ محاربہ کیا ہے، لہٰذا ان سب کو قتل کیا جائے، مگر دیگر سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ مشورہ دیا تھا کہ انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ حضرت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے شفقت و مرحمت اور دلجوئی کی بنیاد پر ان کی رائے پر فیصلہ فرمایا تھا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ روایت کرتے ہیں کہ اس موقع پر حضرت جبرئیل امین علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا: یارسول اللہ! اسیرانِ بدر کے بارے میں آپ اپنے اصحاب کو اختیار دیدیں، چاہے انہیں قتل کریں، چاہے فدیہ لے کر انہیں آزاد کردیں، مگر شرط یہ ہے کہ آئندہ سال تم میں سے اتنے ہی آدمی قتل ہوں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کفار سے فدیہ لینے اور سال آئندہ اپنے قتل ہونے کو اختیار کیا۔ چنانچہ اسی وجہ سے اُحد کی جنگ میں وہ شہید ہوئے۔ [ترمذي، نسائي، ابن حبان، حاکم] مزید تفصیل اپنے موقع پر سورت انفال میں ان شاء اللہ آنے والی ہے۔

﴿وَاِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ﴾ جب آپ صبح کے وقت اپنے گھر سے نکلے، اور اُحد کے لئے روانہ ہوئے۔ اُس روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے گھر پر تھا، اور وہیں سے آپ زرہ پہن کر نکلے تھے۔ اس سے مفسرین کرام استدلال کرتے ہیں کہ اُمّ المؤمنین سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلِ بیت میں شامل ہیں۔ مکمل تفصیل سورۃ احزاب میں آئے گی۔

برخلاف اس کے کہ روافض حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو نہ صرف اہلِ بیت سے خارج کرتے ہیں بلکہ آپ کو نعوذ باللہ منافق کہتے ہیں۔ یہاں اَهۡلِكَ کا لفظ ان کی مکمل تردید میں ہے۔

﴿تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ﴾ لڑائی کے لئے مؤمنوں کے ٹھکانے مقرر کرتے تھے۔ جگہ مقرر کرنا، ڈیوٹی مقرر کرنا، نظم و نسق مقرر کرکے طریقہ و ترتیب بتانا، صف بندی کرنا، وغیرہ۔ یہ تمام امور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیئے، اور مجاہدین کو بتلائے۔

﴿وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ﴾ اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا بھی ہے، اور جانتا بھی ہے۔

﴿اِذۡ هَمَّتۡ طَّآئِفَتٰنِ مِنۡكُمۡ اَنۡ تَفۡشَلَا﴾ قبیلہ اوس و خزرج کے دونوں خاندان، یعنی بنوسلمہ و بنوحارثہ، ایک کا تعلق اوس سے، دوسرے کا خزرج سے تھا، جب رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس

ہوا، تو ان دونوں قبیلوں پر کچھ ضعف و کمزوری کا اثر طاری ہوا، کہ ہم بھی میدان چھوڑ کر واپس ہو جائیں، مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت نے انہیں سہارا دے کر ایسا کرنے سے باز رکھا، اوران کی کمزوری کو ہمت و جرأت کے ساتھ تبدیل فرمایا، چنانچہ وہ جنگ کے لئے آگے بڑھ گئے، اور معرکہ میں شامل ہو گئے، اور ثابت قدم رہے۔

﴿وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا﴾ اللہ تعالیٰ ان کا کارساز ہے، اوران کی دستگیری کرنے والا ہے، اور منافقین کے عمل سے انہیں بچانے والا ہے۔

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ چاہئے کہ اہل ایمان اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسہ رکھیں۔ فتح و شکست اسی مالک الملک قادر مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ سارے اسباب و وسائل کو بروئے کار لاکر جمع کریں، پھر نتیجہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں، اور اس پر ہی اعتماد و بھروسہ رکھیں، اور اس کی حکم عدولی و نافرمانی سے پرہیز کریں۔

پہلے بیان ہوا کہ صبر و تقویٰ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھو، اور اپنے ربّ کے بھروسہ پر میدان میں قدم رکھو، تو کامیاب و فتح مند رہو گے، اور دشمن پر غالب بھی رہو گے، کوئی دشمن تمہیں مغلوب کر کے نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾۔ [آل عمران: ۱۳۹] (اورتم ہی غالب ہو، اگر تم مؤمن ہو)۔

آگے اسی فتح و نصرت کا بیان ہے، کہ تمہارے صبر و تقویٰ نے میدانِ بدر میں تمہیں کامیاب کیا۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

ترجمہ: البتہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کی ہے بدر کے مقام میں، اور تم نہایت کمزور اور بے سروسامان تھے، پس ڈرو اللہ تعالیٰ سے تاکہ تم شکر ادا کرسکو ﴿۱۲۳﴾ اور جب آپ اہل ایمان سے کہہ رہے تھے: کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ تم کو مدد پہنچائے تمہارا پروردگار تین ہزار اُتارے ہوئے فرشتوں سے؟ ﴿۱۲۴﴾ کیوں نہیں، اگر تم صبر کرتے رہو گے، اور ڈرتے رہو گے، اور تمہارے دشمن اسی وقت تمہارے پاس آجائیں تو تمہارا پروردگار پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا، جو نشان لگانے والے ہوں گے ﴿۱۲۵﴾

معارف ومنازل

جنگ اُحد کے مختصر بیان کے بعد جنگ بدر کا مختصر تذکرہ ہو رہا ہے۔اس کے بعد بقیہ جنگ اُحد کا تذکرہ ہوگا۔
یہاں اشارہ اسی بات کی طرف ہو رہا ہے کہ میدانِ جنگ میں فتح وکامیابی کا اصلی سبب توکّل اور اعتماد علی اللہ ہی ہے، بشرطیکہ اس کے ساتھ صبر اور تقویٰ کی شمولیت ہو، چونکہ غزوۂ بدر میں بے انتہا کمزوری کے باوجود لشکر اسلام ہر طرح اپنے کمانڈر عظیم قائد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر طرح مطیع ومنقاد اور فرمانبردار رہا، اور اسبابِ ظاہری پر ذرّہ بھر تکیہ نہ کیا، تو اللہ تعالیٰ نے امدادِ غیبی فرشتوں سے پہنچائی، اور مسلمانوں کو تاریخی کامیابی اور فتحِ مبین حاصل ہوئی۔

جبکہ جنگ اُحد میں صورت حال اس کے برعکس رہی۔لشکر ہی کے ایک چاک وچوبند حصے نے حکمِ عدولی کی اور بے صبری کے ساتھ پہاڑ سے نیچے اُترے، اور اعتماد علی اللہ واطاعتِ رسولؐ میں رخنہ پیدا کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فتح شکست کے ساتھ بدل گئی، اور ستر (۷۰) کے قریب قیمتی جانیں تلف ہوئیں، کیونکہ تھوڑی دیر کیلئے آسمانی مدد رک گئی، اسی کے متعلق ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ﴾ اے مسلمانو! غزوۂ بدر میں تم کمزور اور تھوڑے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی خاص نصرت سے فتحِ مبین عطا فرمائی۔

اَلْبَدر مدینہ منوّر کے جنوب مغرب میں اسی (۸۰) میل کے فاصلہ پر، اور ساحلِ بحر احمر سے ایک منزل پر ایک پڑاؤ اور تجارتی منڈی کا نام ہے۔یہ مقام مکہ ومدینہ اور ملکِ شام سے آنے والے قافلوں کا تجارتی مرکز رہا ہے، اور یہاں عمدہ میٹھا پانی کے بہت سے کنویں ہوتے تھے، مال ومویشیوں کی چراگاہ بھی یہیں ہوتی تھی۔ پہاڑی علاقہ ہے۔ یہاں کے پہاڑ سرسبز وشاداب ہیں۔قبیلہ جہینہ کے بدر نامی ایک مالدار تاجر نے یہاں قیام کیا تھا، اُسی کے نام پر یہ مشہور ہوا۔لوگ یہاں کے درختوں سے عمدہ تیل نکالتے ہیں، اور برآمد کرتے ہیں، وغیرہ۔

اسلام اور کفر کے درمیان یہیں سب سے پہلا معرکہ بروزِ جمعہ ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ مطابق ۱۱ مارچ سن ۶۲۴ء کو پیش آیا تھا۔یہ غزوہ بظاہر تو ایک جنگ معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے دنیا کی تاریخ میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا، اسی لئے قرآن کریم کی زبان میں اس کو یَوْمُ الْفُرْقَان کہا گیا ہے، اور تمام اقوامِ عالم میں اس کی شہرت عام بھی ہے۔

﴿وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ﴾ یعنی تم اس وقت تعداد میں قلیل، اور جنگی سامان میں حقیر اور کمزور تھے۔مسلمان تعداد میں قوی روایت کے مطابق ۳۱۳ تھے۔اس فوج کے ہمراہ گھوڑے صرف دو تھے، اور اونٹ ستر کے قریب تھے،

انہی پر لوگ باری باری سوار ہوتے تھے، اور تلواریں تقریباً آٹھ تھیں۔ اس کے برخلاف مشرکین مکہ کی تعداد نوسو پچاس (۹۵۰) تھی، آٹھ سو (۸۰۰) کے قریب ان کے پاس اونٹ تھے، دوسو (۲۰۰) گھوڑے تھے، چار سو (۴۰۰) زرہیں، اور چھ سو (۶۰۰) تلواریں تھیں، ساٹھ (۶۰) کے قریب تیز انداز بندوق والے تھے، وغیرہ۔

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تم شکر گزار رہو۔ قرآن کریم نے جگہ جگہ منافقین کے کید اور شدید مخالفین کے عناد و مخالفت کے نتائج بد سے محفوظ رہنے کے لئے تقویٰ اور صبر کو علاج بتلایا ہے۔ انہی دو چیزوں کے اندر ساری تنظیمی جدو جہد اور فتحِ مبین کا راز مضمر ہے، جیسا کہ پہلے بار بار بیان ہو چکا ہے۔ اور یہاں صبر و تقویٰ کے بجائے صرف تقویٰ پر اکتفاء کیا گیا ہے، کیونکہ درحقیقت تقویٰ ایسی جامع صفت ہے کہ صبر بھی اس میں شامل ہے۔

﴿اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ﴾ الآیہ۔ سورۃ انفال میں غزوۂ بدر کے موقع پر ایک ہزار فرشتوں کی امداد کا وعدہ ہے، جیسے فرمایا: ﴿اِنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ﴾ [الأنفال: ۹] (میں تمہاری مدد کے لئے ایک ہزار فرشتوں کی کمک بھیجنے والا ہوں، جو لگاتار آئیں گے)۔ اور اس مقام پر تین ہزار اور پانچ ہزار فرشتوں کی امداد کا وعدہ ہے۔

دراصل یہ تینوں اعداد و شمار برحق اور صحیح ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں خدائی فوج، یعنی فرشتوں کے ذریعہ غیبی امداد کے تین وعدے کئے گئے ہیں:

پہلے ایک ہزار فرشتوں کی کمک کا، پھر تین ہزار کا، پھر پانچ ہزار کا۔ ان تینوں وعدوں کا ایک سبب تو مشترک ہے، جس کا بیان ﴿بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا﴾ میں کیا گیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ تینوں وعدوں کے علیحدہ علیحدہ اسباب بھی ہیں، مثلاً پہلے وعدے کا سبب سورۂ انفال میں استغاثہ و دعاء کو بتلایا گیا ہے، ﴿اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ﴾ [الأنفال: ۹] (جب تم اپنے ربّ سے فریاد کر رہے تھے، تو اس نے تمہاری فریاد کا جواب دیا کہ میں تمہاری مدد کے لئے ایک ہزار فرشتوں کو بھیجنے والا ہوں)۔

دوسری کمک کا سبب کرز بن جابر محاربی کی طرف سے کفار کی حمایت میں فوج کشی ہے، جس سے مسلمانوں میں سراسیمگی اور سخت اضطراب پیدا ہوا تھا۔

تیسری امداد کا سبب صبر و تقویٰ کا التزام ہے، جو کہ آیت کریمہ میں موجود ہے۔ تاہم اس میں اختلاف ہے

کہ تیسرا وعدہ پورا ہوا ہے یا نہیں؟ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس وعدہ کے ساتھ ﴿یَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ﴾ کی شرط اور قید ہے، اور چونکہ کرز بن جابر کی طرف سے کوئی کمک نہیں پہنچ سکی، اس لئے وعدہ پورا ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن جن حضرات نے اس کو مطلق وعدہ (غیرہ مشروط) سمجھا ہے، اور یہ قید محض تاکید اور مبالغہ کے لئے مانی ہے، وہ اس وعدہ کا پورا ہونا بھی مانتے ہیں۔

نیز اس میں بھی اختلاف ہے کہ تین ہزار اور پانچ ہزار فرشتوں کی امدادی کمک کے وعدوں میں ایک ہزار اور تین ہزار پہلے عدد میں بھی داخل ہیں، یا یہ تعداد پہلی تعداد کے علاوہ شمار ہوگی۔ ان دونوں طرف اہلِ علم گئے ہیں، مگر قرینِ قیاس یہ ہے کہ اعداد میں تداخل معتبر ہے، اور آخری عدد پانچ ہزار ہے، نو ہزار نہیں۔ واللہ اعلم

غزوۂ بدر میں نصرت کے تین وعدوں میں مناسبت:

اور ان تینوں تعداد میں لطیفہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہزار کافروں کے مقابلہ میں ایک ہزار فرشتے مقرر ہوئے، پھر مسلمانوں کی نسبت کافروں کی تعداد تین گنا زیادہ تھی، اس لئے فرشتوں کو بھی کافروں سے تین گنا زیادہ کردیا گیا، پھر اس پر نظر کرتے ہوئے کہ لشکر کے پانچ حصے ہوتے ہیں: قلب، میمنہ، میسرہ، مقدمہ، خلف، ہر حصہ کا لحاظ کرتے ہوئے فرشتوں کی تعداد کافروں کی مجموعی تعداد کے برابر کردی گئی، تاکہ مسلمان مکمل طور پر مطمئن رہیں۔

عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا عمامہ چونکہ زرد تھا، اس لئے غزوۂ بدر میں ملائکہ بھی زرد عماموں کے ساتھ نازل ہوئے۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: فرشتے سفید عمامے باندھے ہوئے تھے، ان کے شملے مونڈھوں کے درمیان پڑے ہوئے تھے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو عماموں کا رنگ شترمرغ کے پاؤں جیسا نظر آیا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سفید اون کا۔ اور حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کو سرخ۔ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو اپنے عمامہ کے مطابق زرد۔ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو سیاہ رنگ کے۔ تطبیق یہ ہے کہ مختلف مقامات، مختلف حالات اور مختلف رنگ کے عمامے ہوں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: غزوۂ بدر کے علاوہ فرشتے کبھی کسی جنگ میں شامل نہیں ہوئے، اور سفید رنگ عماموں کی علامت تھی، یہ فرشتے صرف مدد کے لئے، اور گنتی بڑھانے کیلئے تھے، نہ کہ لڑنے کے لئے۔ پھر فرمایا کہ یہ فرشتوں کا نزول، اور تم کو اس کی خبر دینا، صرف تمہاری خوشی و دلجوئی اور اطمینان کے لئے ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ

کو قدرت ہے کہ بغیر ان کو اتارے، بلکہ بغیر تمہارے لڑے بھی تم کو غالب کردے۔ ہر قسم کی مدد اس کی طرف سے ہے، جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَلَوْ يَشَاءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ﴾ [محمد: ۴] (اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو خود ہی ان سے بدلہ لیتا، لیکن وہ ہر ایک کو آزما رہا ہے)۔ [ابن کثیر]

فائدہ:

اگر فرشتے لڑنے کے لئے آئے ہوتے، تو ایک فرشتہ ہزاروں لاکھوں کافروں کو بخوشی مارنے کیلئے کافی ہوتا، جیسے گزشتہ ہلاک شدہ اقوام کی تباہی کیلئے صرف حضرت جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے۔ البتہ اگر ایک دو کافر فرشتوں نے مارا ہو، تو وہ مستثنیٰ ہے۔

فرشتوں کی اصل آمد کا مطلب مجاہدین کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی تھی، جو حاصل ہوئی۔ نیز اسی کے ساتھ کافروں کے دلوں میں رُعب اور بزدلی پیدا کرنا مقصود تھا، جو کہ یہ بھی حاصل ہوا۔

تیسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کا منشاء کبھی یہ نہیں کہ دنیا سے یک لخت کفر کا خاتمہ ہو، بلکہ کفر کا وجود ناگزیر ہے، بلکہ مطلب یہ تھا کہ کفر کی شوکت و دبدبہ کمزور اور ضعیف ہو۔ ؎

درکارخانہ عشق از کفر ناگزیر ست ☆ دوزخ کرا بسوزد گر بولہب بناشد

پوری تفصیل ان شاء اللہ سورۃ انفال میں آنے والی ہے، جس کا دوسرا نام ہے سورۃ البدر۔

فائدہ:

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ پانچ ہزار فرشتے قیامت تک جہاد میں مسلمانوں کی مدد کے لئے مقرر ہیں، جہاد کے ہر محاذ پر حاضر رہیں گے۔ [قرطبی]

جنگ اُحد میں مسلمانوں کے لئے غیبی امداد سے محرومی کے دو سبب ہوئے: ایک سبب تو بدر کے جنگی قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا۔ دوئم سبب کچھ مسلمانوں کا خاص مورچہ سے باوجود تنبیہ و پختہ ہدایات کے ہٹ جانا، اور مورچہ خالی کرنا۔ واللہ اعلم

﴿مُسَوِّمِيْنَ﴾ نشاندار، خصوصی علامت یا نشان۔ ہوسکتا ہے کہ فرشتوں کا مخصوص نشان زدہ وردی یا لباس مراد ہو، یا باعتبار رنگ، جیسے ان کے عماموں کے متعلق بیان ہوا، یا خاص کوئی شناختی علامت، جو ان کے گھوڑوں پر لگی ہوئی ہو، وغیرہ۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۭ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَھُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَاۗىِٕبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾
لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَھُمْ فَاِنَّھُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾

ترجمہ: اور نہیں بنائی اللہ نے (تمہاری یہ امداد فرشتوں کے نزول سے) مگر تمہارے لئے خوشخبری، اور تاکہ تمہارے دل مطمئن ہوں، اور نہیں ہے مدد مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے، جو غالب ہے، اور کمال حکمت کا مالک ہے ﴿۱۲۶﴾ تاکہ قطع کرے ایک گروہ کو ان لوگوں میں سے جنہوں نے کفر کیا، یا ان کو ذلیل کردے، پس وہ ناکام ہو کر لوٹیں ﴿۱۲۷﴾ اے پیغمبر! نہیں آپ کیلئے اس معاملہ میں کچھ اختیار، اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرے، یا ان کو سزا دے کہ وہ ظلم کرنے والے ہیں ﴿۱۲۸﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اللہ تعالیٰ بخشتا ہے جس کو چاہے، اور سزا دیتا ہے جس کو چاہے، اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، اور نہایت مہربان ہے ﴿۱۲۹﴾

معارف ومنازل

ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ شانہ نے نزولِ ملائکہ کی حکمت بیان فرمائی ہے، اور واضح کیا ہے کہ فرشتوں کو میدانِ جنگ میں اتارنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی طرف سے کفر کے ساتھ براہِ راست جنگ میں شریک ہوں، بلکہ جنگ تو بہر حال مسلمانوں نے ہی لڑنی ہے، اور جہاد کے مقدس فریضہ کو مجاہدینِ اسلام نے انجام دینا ہے، تاہم مجاہدین ﴿اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ﴾ [الأنفال] جب تم اپنے پروردگار کے حضور استغاثہ اور فریاد کر رہے تھے، اور اللہ تعالیٰ سے امداد مانگ رہے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری دعاء قبول فرمائی، اور تمہاری مدد کے لئے فرشتے اُتار دیئے، اور تمہارے حق میں ایسے حالات پیدا فرما دیئے کہ تمہیں فتحِ مبین حاصل ہوگئی۔

فرشتے اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ لطیف مخلوق ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ نے اطاعت وقوت بہت زیادہ رکھی ہے، جیسا کہ روایات میں آتا ہے۔ بدر کے مقام پر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی دائیں بائیں حضرت جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام تھے، وہ براہِ راست لڑائی میں شریک نہیں تھے، البتہ اگر جزوی طور پر انہوں نے کسی کافر کو مار قتل کیا ہو تو یہ الگ بات ہے۔ پس ان فرشتوں کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ جو فرمایا:

﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ﴾ تا ﴿الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾ نہیں بنایا اللہ تعالیٰ نے نزولِ ملائکہ کو مگر تمہارے لئے باعثِ مسرت وخوشخبری، تاکہ تمہیں بشارت وخوشخبری ہو کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کی امداد تمہارے ساتھ ہے۔ یہ تمہارے اطمینانِ قلبی اور حوصلہ مندی کا سامان ہے، جس سے تم بآسانی اندازہ لگا سکتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی سرپرستی اور معیت تمہیں حاصل ہے، اور وہ تمہارا حامی وناصر ہے، اور تمہارا یہ عملِ جہاد اسی کی رضا کی خاطر ہے، اور تمہارا طرفدار ومددگار وحامی ہے۔

﴿وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ﴾ کا مطلب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رفاقت سے تمہارے قلوب اطمینان وسکون حاصل کریں۔ سورۂ انفال میں ارشاد ہے: ﴿اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ [الأنفال: ۱۲] اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر وحی نازل کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم اہلِ ایمان کے دلوں کو مضبوط رکھو۔

مسند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ فرشتے ویسے بھی مؤمنوں کے دلوں میں اچھے خیالات القاء کرتے ہیں، جس طرح شیاطین وسوسہ اندازی کرکے انسان کو بُرے کاموں کی ترغیب دیتے ہیں، اسی طرح رحمت کے فرشتے اچھے کاموں پر ابھارتے ہیں، اور میدانِ جنگ میں ثابت قدمی اور دادِ شجاعت دینے پر مسلمانوں کو ابھار کر ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں فرشتوں کی تعریف کی، اور کہا کہ ہم نے واضح طور پر ایسی بات دیکھی اور محسوس کی۔ آپ نے ارشاد فرمایا: ذٰلِكَ مِنْ مَدَدِ السَّمَاءِ الثَّالِثِ. اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کیلئے یہ فرشتے تیسرے آسمان سے نازل فرمائے ہیں۔

غزوات میں خصوصی طور پر، اور علماء کرام فرماتے ہیں کہ علمی اور دوسرے کاموں میں بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے رحمت کے فرشتوں کا نزول ہوتا ہے، خاص کر تلاوت قرآن، درس قرآن وحدیث کی محفلوں میں القاء خیر کے لئے نزول کرتے ہیں، جسے متقی پرہیزگار لوگ بآسانی محسوس کرتے ہیں، اور خواص مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔ بہرحال فرشتوں کا نزول اطمینان وطمانینت، اور حوصلہ وعزائم کی بلندی کیلئے مسلّم ہے۔

حقیقی نصرت وفتح وہ ربّ العزت سبحانہ کے اختیار میں ہے، ظاہری اور مادی اسباب پر کچھ بھی موقوف نہیں۔ مسبّب الاسباب جو چاہے گا وہی ہوگا۔

جنگ یرموک ایک ایسی جنگ کا نام ہے جسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایمانی قوت، صبر وتقویٰ اور استقامت سے

فتح کیا۔ رومیوں کی تعداد نو لاکھ ساٹھ ہزار تھی۔ ساٹھ ہزار خالص عرب تھے، باقی دوسرے رومی تھے۔ انہوں نے کھانے پینے، سواری اور جنگی اسلحہ و دیگر ہر قسم کے ساز و سامان کا ڈھیر لگایا تھا، اور پورے صحرائے سینا کو بھر دیا تھا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس عظیم تاریخی فوج کے مقابلے پر چھتیس ہزار کا لشکر روانہ فرمایا، جن کے پاس مادی اسباب، جنگی اسلحہ، سواری، خورد و نوش اور دیگر ضروری سامان کی قلت تھی۔ گویا یہ لشکر بجائے مادی اسباب کے روحانی اسلحہ صبر و تقویٰ، ایمانی عزم و ہمت سے لیس تھا۔

امیر المؤمنین نے اس جنگ کے لئے پانچ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کمانڈر مقرر کیا: (۱) ابوعبیدہ بن جراح۔ (۲) خالد بن ولید۔ (۳) یزید ابن ابی سفیان۔ (۴) شرجیل بن حسنہ۔ (۵) عیاض بن غنم۔

اور آپؓ نے حکم دیا تھا کہ بحیثیتِ مجموعی اور پوری فوج کی کمان حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس ہوگی، تاہم باقی جرنیل اپنے اپنے دستوں کے سردار ہوں گے، اور اپنے اپنے یونٹوں میں فوجی انتظامات کے ذمہ دار ہوں گے۔ جب رومیوں کے ساتھ لڑائی شروع ہوئی، تو مسلمانوں نے کچھ کمزوری محسوس کی، ان کے کئی مجاہد شہید ہو گئے، چنانچہ انہوں نے امیر المؤمنین کو مزید کمک کے لئے خط لکھا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جواباً لکھا کہ میں تمہاری رہنمائی اس ذات کی طرف کرتا ہوں جو کہ أَعَزُّ نَصْرًا ہے۔ یعنی جس کی نصرت سب پر غالب ہے، اور جس کا لشکر ہر وقت حاضر ہے۔ میں تمہاری رہنمائی اس خداوند قدوس کی طرف کرتا ہوں، جس نے مقامِ بدر پر اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو بڑے لشکر کے مقابلہ میں فتح عظیم سے نوازا، لہٰذا تم مدد کیلئے اسی مالک الملک کی طرف رجوع کرو، اور دشمن سے ڈٹ کر مقابلہ کرو، اور مجھے دوبارہ خط نہ لکھو، اور مجھ سے کمک طلب نہ کرو۔

اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے بدر میں قلیل تعداد اور بے سروسامانی کی حالت میں تمہاری مدد کی تھی، وہ زیادہ نفری اور وافر ساز و سامان کے ساتھ کیوں تمہاری مدد نہیں فرمائے گا؟ تم اسی کی طرف رجوع کرو، آئندہ میری طرف مراجعت نہ کرنا۔

اس روایت کے راوی حضرت عیاض اشعری فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ خط جب مسلمانوں کو پہنچا تو انہوں نے نصرتِ الٰہی پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے ایسا زبردست حملہ کیا کہ دشمن کو بارہ میل تک پیچھے بھگا دیا، ان کے پاؤں جم نہ سکے، اور ان کا بے تحاشا نقصان ہوا، اور مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ اس فتح نے پورے شام اور

فلسطین کو ہمیشہ کے لئے رومیوں سے پاک کر دیا، اور یہ علاقے مرکزِ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ﴾ مدد تو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے، جو کہ غالب اور کمالِ حکمت کا مالک ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے نصرتِ الٰہی کا نتیجہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اس لئے آئی:

- ﴿لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ تاکہ کفار کی جمعیت میں سے ایک گروہ کو قطع کر دے، ان کی کمر توڑ کر رکھ دے، اور ان کے غرور کا سر نیچا کر دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا (ان شاء اللہ ہمیشہ ایسا ہوتا رہے گا)۔

جنگ بدر میں مشرکین کے ستر صنادید بڑے سردار جہنم رسید ہو گئے۔ اسی کے ساتھ فرمایا: ﴿أَوْ يَكْبِتَهُمْ﴾ یا ان کو ذلیل کر دے۔ چنانچہ ستر قتل ہوئے، اور ستر قیدی بنا لئے گئے، اور جب یہ قیدی مدینہ منورہ لائے گئے تو ایک خاتون نے انہیں مخاطب ہو کر کہا: اس ذلت سے وہاں پر شرافت کی موت تمہارے لئے بہتر تھی۔ باقی لوگ جب خائب و خاسر مکہ مکرمہ پہنچے، تو وہاں کی عورتوں نے انہیں برا بھلا کہہ کر ان کے منہ پر مٹی پانی میں ملا کر پھینک دی۔ پھر ان قیدیوں کے لئے فدیہ دینا یہ بہت بڑی ذلت سے کم نہیں تھی۔

یہ لوگ بڑے جوش وخروش، اور بڑے غرور و ڈھٹائی کے ساتھ جب مکہ سے نکلے تھے، تو یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے تھے کہ مسلمانوں کو اس مرتبہ صفحۂ ہستی سے مٹا کر دم لیں گے۔ مگر انہیں اللہ تعالیٰ نے اتنا رسوا اور ذلیل کیا کہ تاریخِ اقوامِ عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔

غزوۂ بدر کے مختصر تذکرے کے بعد غزوۂ اُحد کا بقیہ تذکرہ ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ﴿١٢٨﴾﴾ اس معاملہ میں آپ کے لئے کوئی چیز (یعنی اختیار) نہیں ہے۔ یعنی کسی کی توبہ قبول کرنا، یا کسی کو عذاب دینا، یہ صرف اور صرف ربّ العٰلمین کے اختیار میں ہے۔ مسلمان ایمان و جہاد پر قائم رہیں، اور کافروں کی توبہ اور عذاب کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں۔

(۱) جب سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا دانت مبارک رُباعیہ اُحد کے دن شہید ہو گیا، سر مبارک زخمی ہوا، اور چہرۂ انور لہولہان ہو گیا، تو آپؐ نے فرمایا: وہ لوگ کیسے فلاح پا سکتے ہیں جنہوں نے اپنے نبی کا سر زخمی کیا، اور دانت شہید کیا؟ آپؐ ان لوگوں کے لئے بددعاء فرما رہے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ [قرطبی]

(۲) سید انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے خلاف بددعاء کا ارادہ ہی فرمایا تھا، أي هَمَّ أن يَدْعُوَ عَلَى

اَلْمُشْرِكِيْنَ فَنَزَلَتْ. اس پر آیت کریم کا نزول ہوا۔ [قرطبی]

(۳) وَقِيْلَ اِسْتَاْذَنَ فِي أَنْ يَدْعُوَ فِي اِسْتِئْصَالِهِمْ ... الخ. یعنی آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے اجازت چاہی کہ مشرکین کے مکمل خاتمے کی دعاء فرمائیں، جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپؐ کو علم ہوا کہ ان میں سے کئی لوگ اسلام قبول کریں گے۔ چنانچہ ان میں سے بہت سے لوگ (ہزاروں کی تعداد میں فتحِ مکہ کے دن) مسلمان ہوئے۔ جیسے ابوسفیان، خالد بن ولید، صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل، عمرو بن العاص وغیرہ ہزاروں کی تعداد میں۔

اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ سید عالم ﷺ ان مشرکین میں سے چار کے لئے بددعاء فرمانا چاہتے تھے، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، اور پھر ان لوگوں کو اسلام کی ہدایت عطا فرمائی۔ [قرطبی]

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ یہ چند اقوال ذکر کرنے کے بعد وہ روایات ذکر کرتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے بددعاء نہیں فرمائی، بلکہ ان الفاظ میں دعا فرمائی: رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ. اے میرے ربّ! میری قوم کی مغفرت فرما، یہ لوگ نہیں جانتے، (اگر جانتے ہوتے تو ایسا غلط کام نہ کرتے، اور اپنے نبی کی بے احترامی اور اس ؐ کے خلاف جنگ نہ کرتے)۔ [قرطبی]

مطلب اور خلاصہ:

اُحد میں ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے، جن میں سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ مشرکین نے وحشیانہ طور پر شہداء کا مثلہ کیا (ناک، کان وغیرہ کاٹے) پیٹ چاک کئے، حتی کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جگر نکال کر ہندہ بنت عتبہ زوجۂ ابوسفیان نے دانتوں سے چبا چبا کر پھینک دیا۔ حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کے سامنے ستر کے قریب جان نثاروں کی لاشیں میدان میں پڑی رہیں، تو اس وقت آپؐ کی قلبی کیفیت اور حزن وملال قابل دید تھا۔

اس کے ساتھ آپؐ بھی زخمی ہوئے، اور سامنے کے چار دانتوں میں سے نیچے کا دایاں دانت (رُباعیہ جو کہ نوکدار ہوتا ہے) شہید ہوا، اور لوہے کی جنگی ٹوپی، جسے خود کہتے ہیں اس کی کڑیاں ٹوٹ کر رُخسار مبارک میں گھس گئیں، اور آپ ﷺ کی پیشانی مبارک کے اوپر کے حصے پر گہرا زخم آیا، اور پورا بدن لہولہان تھا۔ اسی حالت میں آپؐ زمین پر گر کر بیہوش ہوگئے، اور کفار نے مشہور کیا کہ آپؐ شہید ہوگئے۔

اس پریشان کن آواز کو سن کر لوگ بیتاب ہوگئے، اور بیخودی کے عالم میں کچھ وہاں سے چلے گئے، اور کچھ

مایوسی کی کیفیت میں بیٹھ گئے، اور روتے رہے۔ جب آپ ﷺ نے ہوش سنبھالا، تو لوگوں کو تسلی دی، اور فرمانے لگے کہ: وہ قوم کیونکر فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کا چہرہ زخمی کیا، جو ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا تھا۔

مشرکین کے وحشیانہ شدائد و مظالم کو دیکھ کر آپ ﷺ سے رہا نہ گیا، اور ان میں سے چند نامور اشخاص کے حق میں بددعاء کا ارادہ کیا، مگر حق تعالیٰ کو منظور تھا کہ آپؐ اپنے منصبِ جلیل کے موافق اس سے بھی بلند مقام پر کھڑے ہوں۔ وہ ظلم کرتے جائیں آپ سہتے جائیں، جیسے میدانِ طائف کا خون چکاں منظر آپؐ کے سامنے رہا، اور جبریل امینؑ حاضر ہو کر آپؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپؐ اجازت دیں اخشبین کی پہاڑیوں کو آپس میں ٹکرا کر پوری آبادی کو تباہ کروں۔ وہاں آپؐ کے الفاظ یہ تھے کہ: نہیں، ہوسکتا ہے کہ ان کی نسلوں میں ایسے لوگ پیدا ہوں جو میری آواز پر لبیک کہتے ہوں۔

تو آیت کریمہ کے سیاق سے یہی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو دشمنوں کے ظلم وستم پر صبر کرنے کا حکم دیا، کہ اگر وہ ظلم وستم کریں تو آپؐ اپنی شان کے مطابق صبر کریں، اور خاموش رہیں، اور جتنی بات کا آپؐ کو حکم ہے، مثلاً دعوت وتبلیغ اور جہاد وغیرہ، آپؐ اسے انجام دیتے رہیں، باقی ان کا انجام خدا تعالیٰ کے حوالے کریں۔ اس کی جو حکمت ہوگی وہی کرے گا، آپؐ کی بددعاء سے وہ ہلاک کردئے جائیں، کیا اس کی جگہ یہ بہتر نہیں کہ ان ہی دشمنوں کو اسلام کا محافظ، اور آپ کا جان نثار عاشق بنا دیا جائے؟

چنانچہ جن لوگوں کے حق میں آپ ﷺ بددعاء کرتے تھے چند روز بعد ان سب کو حق تعالیٰ نے آپؐ کے قدموں میں لا ڈالا، اور اسلام کا ایسا جانباز سپاہی بنا دیا جنہوں نے آپؐ کے ہر اشارہ پر جان دینے اور سب کچھ قربان کرنے کا حق ادا کیا۔

غرض یہ ہے کہ ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ﴾ میں اللہ تعالیٰ نے سرور کائنات ﷺ کی تربیت فرمائی کہ بندے کو اختیار نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرح جو چاہے سو کرے۔ اوّل تو اس لئے کہ پیغمبر اعظم ﷺ اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں، اور ان کے اختیارات محدود ہیں، اور وہ محدود علم کے مالک ہیں، اس لئے ان کو کہا جا رہا ہے کہ کافر اگر تمہارے دشمن ہیں، اور ظلم پر ہیں، مگر ان کا مستقبل تمہارے اختیار میں نہیں ہے، اور نہ ہی تمہارے پاس علمِ محیط ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ مالک الملک خود مختار ہے، چاہے انہیں ہدایت دے، چاہے عذاب دے، آپ اپنی طرف سے بددعاء نہ کریں۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عفو و درگزر پر عمل کر کے مشرکین کے خاتمے کیلئے بد دعاء نہیں کی، اس پر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جو فرمایا اس کا ترجمہ یہ ہے کہ: اے اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے بد دعاء کی کہ اے ربّ! زمین پر کسی کافر کو زندہ نہ رہنے دے۔ اگر سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی طرح ہمارے لئے بد دعاء کرتے، تو ہم سب کے سب ہلاک ہو جاتے، لیکن اے رحمۃ للعلمین! آپ کی پشت پاک، یعنی پیٹھ پر قدم رکھے گئے، آپ کے چہرۂ انور کو زخمی کیا گیا، آپ کے دندانِ مبارک کو شہید کیا گیا، بایں ہمہ آپ نے بد دعاء نہیں کی، اور دعاء خیر ہی فرمائی کہ: اے میرا ربّ! میری قوم بے علمی سے یہ سب کچھ کر رہی ہے، آپ انہیں بخش دے، معافی دیدے۔ [قرطبی]

﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ تا ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾۔ زمین و آسمانوں میں جو کچھ بھی ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے۔ ہر چیز پر اسی کا اقتدار اور تصرف ہے۔ ہر ہر مقام پر حکم اور حکومت اللہ تعالیٰ شانہ کی ہے۔ آپؐ تو اللہ تعالیٰ کے برحق رسول اور نمائندے ہیں۔ آپؐ کا کام تبلیغ و ابلاغ ہے۔ آپؐ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرنے والے ہیں۔ آپؐ کسی کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ [الغاشیۃ: ۲۲] (آپ کو ان پر زبردستی کرنے کے لئے مسلّط نہیں کیا گیا) کے حامل ہیں۔ وہ جس کو چاہے ہدایت دے اور معافی دے۔ وہ جس کو چاہے عذاب دے۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے بخشش اور کافروں کے لئے سزا، یہ سب تیرے ربّ کے اختیار میں ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے، بہت بخشنے والا اور نہایت رحم کرنے والا ہے، لہٰذا آپ بد دعاء کرنے میں پیش قدمی نہ کریں۔ یہ آیت سابقہ آیت کی تاکید بھی ہے، اور تشریح و دلیل بھی ہے، کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! مت کھاؤ سود دگنے پر دگنا، اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے تا کہ تم فلاح پا جاؤ۱۳۰ اور ڈرو اس آگ سے جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے ۱۳۱ اور اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی، اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی، تا کہ تم پر رحم کیا جائے ۱۳۲ اور سبقت کرو بخشش کی طرف، جو تمہارے ربّ کی طرف سے ہے، اور جنت کی طرف، جس کا عرض آسمانوں اور زمین کی طرح ہے، وہ تیار کی گئی ہے متقیوں کیلئے ۱۳۳ وہ جو خرچ کرتے ہیں خوشی کی حالت میں، اور تکلیف کی حالت میں، اور وہ جو غصے کو دباتے ہیں، اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۱۳۴

معارف ومنازل

غزوۂ اُحد میں جب مسلمانوں کو شکست ہوگئی تو ان کے دلوں میں جذبۂ انتقام بھڑک اٹھا، چنانچہ انہوں نے غم و غصے میں عہد کیا کہ اگر آئندہ ہم کفار پر غالب آئے تو ان سے دوہرا انتقام لیں گے۔ کافروں نے ہمارے شہداء کے ساتھ بڑا وحشیانہ کام کیا، ان کے چہرے مسخ کئے، کان، ناک کاٹ ڈالے، لہٰذا ہم بھی ان سے سخت انتقام لیں گے، وغیرہ وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ شانہ اسی جذبۂ انتقام کو کم کرنے کیلئے آیت سود کو غزوۂ اُحد کے واقعہ کے ساتھ ذکر فرما کر تنبیہ فرمائی کہ جس طرح سود انسان کی شرافت اور اخلاق کو بگاڑتا ہے، بالکل اسی طرح حدِ اعتدال سے زائد انتقام بھی شرافت و دیانت کا دشمن ہے، لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے جذبات پر قابو رکھیں، کیونکہ سود اور انتقام دونوں ایک قبیل سے ہیں۔ اور قرآن کریم نے تمہارے لئے ضابطۂ اخلاق یہ وضع کیا ہوا ہے: ﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ﴾ [النحل:۱۲۶] (اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی زیادتی تمہارے ساتھ کی گئی تھی۔ اور اگر صبر ہی کرلو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت بہتر ہے)۔ اسی طرح ﴿فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ﴾ [البقرۃ:۱۹۴] (اگر کوئی شخص تم پر کوئی زیادتی کرے، تو تم بھی ویسی ہی زیادتی اس پر کرو جیسی زیادتی اس نے تم پر کی ہو)۔

سود کی حرمت بیان کرنے کے ساتھ متصل صبر وتقویٰ، اور اطاعتِ الٰہی واطاعتِ رسولؐ کی تاکید فرمائی، اور انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دی، کیونکہ جس طرح سود اور تعدی سے اخلاق بگڑ جاتے ہیں، اسی طرح صبر وتقویٰ

اطاعت و انفاق فی سبیل اللہ سے اخلاق و اعمال سدھر جاتے، اور پاکیزہ بنتے ہیں، جس سے قربِ الٰہی اور مغفرت و جنت کا حصول آسان ہو جاتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً﴾ اے ایمان والو! مت کھاؤ سود دگنے پر دگنا۔ مطلب یہ ہے کہ صرف کھانے کی حرمت پر تنبیہ نہیں ہے، بلکہ سودی کاروبار، سودی لین دین، لینا، دینا، کمانا، غرض ہر جہت کی حرمت پر تنبیہ ہے۔ اس کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

﴿اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً﴾ یہ حرمت سود و ممانعتِ سود کی قید نہیں ہے، بلکہ سود کی قباحت کو واضح کرنے کے لئے ہے، کیونکہ سود خواہ مفرد ہو یا مرکب، نقود میں ہو یا اجناس میں، اس کی حرمت قطعی ہے۔ یہ صرف سود ہی کی قباحت ہے جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ براہِ راست جنگ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ایامِ جاہلیت میں لوگ سود پر قرض دیتے تھے، اور مدّت مقرر کرتے تھے، اگر مقررہ مدّت پر پیسہ وصول نہ ہوتا تو مدّت بڑھا کر سود پر سود بڑھا دیا کرتے تھے۔ اسی طرح سود در سود مل ملا کر اصل رقم کئی گنا بڑھ جاتی۔ یہ سراسر ظلم، بے رحمی، حق تلفی اور بد اخلاقی کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سختی سے منع فرمایا، اور اس ناپاک مجرمانہ عمل کو خلافِ اسلام و خلافِ تقویٰ قرار دیا، اور ارشاد فرمایا کہ:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، سودی کاروبار سے بچو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔ آگے مزید ارشاد ہے کہ سودی کاروبار جہنمیوں کا عمل اور ان کا شیوہ ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ جہنمی اعمال سے اجتناب کریں۔ اور جہنم کفار کیلئے پیدا کی گئی ہے، لہٰذا مسلمان اس سے بچنے کی کوشش کریں، کیونکہ اگر مسلمان کافروں جیسے سودی کاروبار کریں گے تو کافروں کے لئے تیار شدہ جہنم سے نہیں بچ سکیں گے۔ یہی مطلب ہے:

﴿وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ﴾ کا، چونکہ جہنم اور عذابِ الٰہی سے بچنا اس بات پر موقوف ہے کہ آدمی ایمان کے تقاضوں پر پورا پورا عامل ہو، تو اسی کی خاطر فرمایا:

﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ صرف اَطِیْعُوا اللّٰهَ کافی نہیں ہے۔ اگر کوئی لاکھ مرتبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا رٹ لگائے، وہ مؤمن نہیں ہوگا، جب تک کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا اقرار نہ کرے۔ محض اقرار بھی کافی نہیں، جب تک اطاعت و انقیاد اور تسلیم نہ کرے۔ اسی طرح قرآن حکیم کو ماننے سے اطاعت مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک قرآن کی شرح حدیث شریف پر ایمان نہ لائے۔

قرآن کریم صرف احکام کا حکم دے کر کہتا ہے: نماز پڑھو، زکوٰۃ ادا کرو، روزہ رکھو، حج کرو، جہاد کرو، تقویٰ اختیار کرو۔ اسی طرح شرک سے بچو، زنا وشراب سے پرہیز کرو، سود سے اجتناب کرو۔ ان سارے احکامات کی تشریح اور ہر ہر بات کی نشاندہی وحی خفی حدیث ہی سے معلوم ہوسکتی ہے۔ اگر حدیث سے قطع نظر کیا جائے تو قرآن پاک کے کسی بھی حکم پر عمل ممکن نہ ہوگا۔ اسی لئے قرآن حکیم ہر مقام پر اطاعتِ الٰہی کے ساتھ اطاعت رسول کا حکم دیتا رہے گا۔ فرمایا: ﴿مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [النساء: ۸۰] (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی)۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ اگر خدانخواستہ سنت نبی اور سیرت مقدسہ کو قرآن حکیم سے علیٰحدہ کیا جائے، تو قرآن پاک حرفِ بے معنی کی طرح قابلِ عمل نہیں رہے گا، اور ہزاروں احکام پردۂ خفاء میں رہیں گے، اور بے شمار مسائل سے ہدایت کے دروازے (معاذ اللہ) بند ہوجائیں گے۔ قرآن کریم وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے: ﴿لَا تُحَرِّكۡ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعۡجَلَ بِهٖ ۝۱۶ اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ ۝۱۷ فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ ۝۱۸ ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ ۝۱۹﴾ [القیمۃ] (تم اس قرآن کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو ہلایا نہ کرو۔ یقیناً اس کو یاد کرانا، اور پڑھوانا ہماری ذمہ داری ہے۔ پھر جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کرو۔ پھر اس کی وضاحت بھی ہماری ذمہ داری ہے)۔ اس مسئلے کی تفصیل آئندہ آنے والی ہے۔ یہاں ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ﴾ سے حدیث شریف کی طرف اشارہ ہے۔

﴿وَسَارِعُوۡۤا اِلٰى مَغۡفِرَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَجَنَّةٍ عَرۡضُهَا السَّمٰوٰتُ﴾ تا ﴿اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِيۡنَ﴾ یعنی مسابقت ومسارعت کرو، دوڑ لگاؤ، اپنے ربّ کی مغفرت کی طرف۔ یہاں مغفرت سے مراد اسبابِ مغفرت ہیں، یعنی وہ اعمالِ صالحہ جو باعثِ مغفرتِ الٰہی ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین حضرات رحمۃ اللہ علیہم سے اس کی تفسیریں مختلف عنوانات سے مذکور اور منقول ہیں، مگر معنون اور مضمون سب کا ایک ہی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر "ادائیگی وفرائض" سے فرمائی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے "اسلام" سے۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے "ہجرت" سے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے "تکبیر اولیٰ" سے۔ حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے "اداء طاعت" سے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے "جہاد" سے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے "توبہ" سے کی ہے۔

ان تمام اقوال کا حاصل یہی ہے کہ مغفرت سے مراد وہ تمام اعمالِ صالحہ ہیں جو مغفرتِ الٰہی کا باعث اور سبب

ہوتے ہیں۔اس مقام پر دو باتیں قابلِ غور ہیں:

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس آیت میں مغفرت اور جنت کی طرف مسابقت اور مُسارعت کا حکم دیا جارہا ہے، حالانکہ دوسری آیت میں ﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾[النساء:۳۲] (اور جن چیزوں میں ہم نے تم کو ایک دوسرے پر فوقیت دی ہے، ان کی تمنا نہ کرو) فرما کر دوسروں کے فضائل حاصل کرنے کی تمنا کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ فضائل دو قسم کے ہیں: ایک وہ فضائل جو غیر اختیاری ہیں، جیسے صحت، خوبصورتی، عقلمندی یا خاندانی فضائل وغیرہ۔ دوسرے وہ فضائل جو کہ اختیاری ہیں، ہر شخص انہیں محنت سے حاصل کرسکتا ہے۔ قسمِ اوّل فضائلِ غیر اختیاری جو ہیں وہ آیت کریمہ ﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا﴾ کے مصداق ہیں، جنہیں کسی محنت وکوشش سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ وہاں غبطہ تو جائز ہوگا، مگر حسد حرام ہے۔

قسم دوم اختیاری میں ہر طرح مسابقت ومسارعت کی اجازت ہے۔ آیت کریمہ ﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ﴾ کے یہی مصداق ہیں، جیسا کہ بیان ہوا۔ اسی طرح دوسری آیت میں ہے: ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ [البقرة:۱۴۸] (نیکیوں میں مسابقت کرو) اسی طرح ﴿وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنٰفِسُوْنَ﴾ [المطففين:۲۶] (اور اسی میں للچانے والوں کو بڑھ چڑھ کر للچانا چاہئے) کا حکم ہوا۔ اسی طرح ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝﴾ [الواقعة] (جو سبقت لے جانے والے ہیں وہ تو ہیں ہی سبقت لے جانے والے۔ وہی ہیں جو اللہ کے خاص مقرّب بندے ہیں)۔

دوسری چیز جو اس جگہ قابلِ غور ہے وہ یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مغفرت کو جنت پر مقدم کیا، اس میں ممکن ہے کہ اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ جنت کا حاصل کرلینا بغیر مغفرتِ الٰہی کے ناممکن ہے، کیونکہ انسان اگر تمام عمر نیکیاں کرتا رہے، اور معاصی سے اجتناب کرتا رہے، تب بھی اس کے یہ تمام اعمال جنت کی قیمت نہیں بن سکتے، کیونکہ جنت میں لے جانے والی چیز مغفرتِ الٰہی اور فضلِ الٰہی ہی ہے۔ اسی مغفرت اور فضل کی بدولت جنت مل سکتی ہے۔ سید کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا: راستی اور حق کو اختیار کرو، اور درمیانی راہ اختیار کرو، اور اللہ تعالیٰ کے فضل کی بشارت حاصل کرو، کسی شخص کا عمل اس کو جنت میں نہیں پہنچائے گا۔ لوگوں نے کہا: نہ آپ کا (عمل) یارسول اللہ! آپؐ نے فرمایا: نہ میرا عمل جنت میں پہنچائے گا، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اپنے رحمت سے ڈھانپ لے۔ [متفق علیه، الترغیب

والترھیب]

حاصل یہ ہے کہ ہمارے اعمال جنت کی قیمت نہیں ہیں، لیکن عادت اللہ یہی ہے کہ ربّ العزت اپنے فضل سے اسی بندے کو نوازتا ہے، جو اعمالِ صالحہ کرتا ہے، بلکہ جس کو اعمالِ صالحہ کی توفیق ہوگی وہی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہیں، لہٰذا اعمال کی ادائیگی میں کوتاہی کبھی نہیں کرنا چاہئے۔

تو معلوم ہوا کہ دخولِ جنت کا اصلی باعث اور سبب مغفرتِ الٰہی ہے، اور مغفرت کا سبب عملِ صالح ہے۔ اسی لئے مغفرت کی اہمیت کے پیشِ نظر مطلق مغفرت نہیں فرمایا گیا، بلکہ ﴿مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ فرمایا گیا۔ پس صفتِ ربوبیت کے بیان کرنے میں مزید لطف و کرم کا اظہار مقصود ہے۔

تیسری چیز جس کی طرف مسابقت کا حکم دیا جارہا ہے، وہ جنت ہے۔ اور جنت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس کی وُسعت اس قدر ہے جتنا سارا آسمان وزمین ہے۔ انسان کے دماغ میں آسمان وزمین کی وُسعت سے زیادہ اور کوئی وُسعت آ ہی نہیں سکتی، اس لئے سمجھانے کے لئے جنت کے عرض کو اس سے تشبیہ دی گئی۔ گویا یہ بتلادیا کہ جنت بہت وسیع ہے، اس کے عرض میں سارے آسمان وزمین سما سکتے ہیں۔ پھر جب اس کے عرض کا یہ حال ہے تو طول کا حال خدا جانے کیا ہوگا۔

یہ معنی تو اس وقت ہیں جب عرض کو طول کے مقابل لیا جائے، لیکن اگر عرض کو قیمت کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جنت کوئی معمولی شئے نہیں ہے، اس کی قیمت سارا آسمان وزمین ہیں، لہٰذا ایسی قیمتی اور عظیم الشان چیز کے لئے خوب مسارعت کرو۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو مسلم رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہی نقل کیا ہے کہ اس سے مراد جنت کی قیمت ہی ہے۔

جنت کا دوسرا وصف بتلایا: ﴿أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾ یعنی جنت پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جنت، اور اسی طرح جہنم پیدا کی جاچکی ہیں۔ یہی مذہب اہلسنت والجماعت کا ہے۔ قرآن وحدیث کے واضح اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ساتویں آسمان کے اوپر ہے، جہنم ساتویں زمین کے نیچے ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ ہرقلِ روم نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطورِ اعتراض کے ایک خط لکھ بھیجا کہ آپ مجھے اس جنت کی دعوت دے رہے ہیں جس کی چوڑائی آسمان وزمین کے برابر ہے، تو یہ فرمائے کہ پھر جہنم کہاں گئی؟

سیدالانبیاء ﷺ نے فرمایا: سبحان اللہ! جب دن آتا ہے تو رات کہاں جاتی ہے؟ جو قاصد ہرقل کا خط لے کر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا تھا، اس سے حضرت یعلی بن مرہ کی ملاقات حمص میں ہوئی تھی۔ کہتے ہیں اس وقت یہ بہت بوڑھا ہوگیا تھا، کہنے لگا: جب میں نے یہ خط حضور انور ﷺ کو دیا تو آپؐ نے اپنی دائیں طرف کے ایک صحابی کو دیا۔ میں نے لوگوں سے پوچھا ان کا کیا نام ہے؟ لوگوں نے کہا یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی یہی سوال ہوا تھا، تو آپؓ نے فرمایا تھا کہ دن کے وقت رات اور رات کے وقت دن کہاں جاتا ہے؟ یہودی یہ جواب سن کر کہنے لگا کہ یہ تورات سے اخذ کیا ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی جواب مروی ہے۔

ایک مرفوع حدیث میں ہے کسی نے سردار دو عالم ﷺ سے پوچھا، تو آپؐ نے جواب میں فرمایا: جب ہر چیز پر رات آجاتی ہے تو دن کہاں جاتا ہے؟ اس نے کہا: جہاں اللہ تعالیٰ چاہے۔ آپؐ نے فرمایا: اسی طرح جہنم بھی جہاں اللہ تعالیٰ چاہے۔ [بزار] اس جملہ کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک تو یہ کہ رات کے وقت گو ہم دن کو نہیں دیکھ سکتے، لیکن تاہم دن کا کسی جگہ ہونا ناممکن نہیں، اسی طرح گو جنت کا عرض اتنا ہی ہے، لیکن پھر بھی جہنم کے وجود سے انکار نہیں ہوسکتا، جہاں اللہ چاہے وہ بھی ہے۔ دوسرے معنی یہ کہ جب دن ایک طرف سے چڑھنے لگا رات دوسری جانب ہوتی ہے، اسی طرح جنت اَعلیٰ عِلّیین میں ہے، اور دوزخ اسفل السافلین میں، تو کوئی منافات نہ رہی۔ [ابن کثیر]

یہ بات قابلِ غور ہے کہ جس چیز کو ہم کائنات کہتے ہیں وہ صرف سات آسمانوں اور سات زمینوں کا نام نہیں ہے، بلکہ ﴿وَسِعَ كُرۡسِيُّهُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضَ﴾ [البقرة: ۲۵۵] (اس کی کرسی شامل ہے آسمانوں اور زمین کو)۔ یعنی کرسی بھی کائنات کا حصہ ہے، جو کہ سب علویات وسفلیات پر مشتمل ہے، چاہئے کہ اس مقام پر کرسی کو بھی شامل کیا جائے۔

البتہ! اگر مطلب یہ ہو کہ مسافت کی بجائے قیمت والے معنی مراد ہوں، یا جنت کی عظمت کے متعلق بطورِ مبالغہ تمثیل ہو، تو پھر کوئی مناقشہ باقی نہیں رہے گا۔ واللہ اعلم

﴿ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي ٱلسَّرَّآءِ وَٱلضَّرَّآءِ﴾ یہاں سے متقین کے بعض نمایاں اور پسندیدہ اوصاف کا بیان ہو رہا ہے، کہ سختی میں، آسانی میں، خوشی میں اور غمی میں، تندرستی میں اور بیماری میں، غرض ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں، جیسے دوسرے مقام پر فرمایا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دن رات، کھلے چھپے خرچ کرتے

رہتے ہیں، کوئی چیز انہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے باز نہیں رکھ سکتی، اس کی مخلوق پر اس کے حکم سے احسان کرتے رہتے ہیں۔

یہ انفاق فی سبیل اللہ کیا ہی عمدہ صفت ہے، جو سود کی جڑ کو کاٹتی ہے۔ ایک طرف سود خور کسی غریب کی غربت سے فائدہ اٹھا کر قرضے پر سود در سود وصول کرتا ہے، اور دوسری طرف اہلِ ایمان ہیں کہ وہ ایسے غرباء و مساکین پر ہمیشہ ہمیشہ مال خرچ کرتے ہیں۔ وہ خود خوشی اور آسائش میں ہوں، یا تکلیف اور پریشانی میں ہوں، لیکن ان کا یہ بلند و نمایاں کارنامہ انفاق فی سبیل اللہ ہر حال جاری رہتا ہے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مِن جُملہ ان اوصاف کے جو اہلِ تقویٰ کو مستحقِ جنت بناتے ہیں، سب سے اوّل سخاوت ہے۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سخی اللہ تعالیٰ سے قریب ہے، جنت سے قریب ہے، اور لوگوں سے قریب ہے، اور دوزخ سے بعید و دور ہے۔ اور بخیل اللہ تعالیٰ سے دور ہے، جنت سے دور ہے، لوگوں سے دور ہے، اور دوزخ سے قریب ہے۔ جاہل سخی عابد بخیل سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اچھا ہے۔ [ترمذي عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ] ایک روایت میں عابد بخیل کی بجائے عالم بخیل آیا ہوا ہے۔ [رواه البيهقي عن جابر رضی اللہ عنہ والطبراني عن عائشه رضی اللہ عنہا]

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت ہے کہ سخاوت اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی صفت ہے۔ [مظہری بحوالہ ابن النجار] سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سخاوت جنت کے درختوں میں سے ایک درخت ہے، جس کی شاخیں دنیا میں لٹکی ہوئی ہیں، جو شخص ان ٹہنیوں میں سے کسی ٹہنی کو پکڑ لے گا وہ ٹہنی اس کو جنت کی طرف کھینچ کر لے جائے گی، اور کنجوسی و بخیلی دوزخ کے درختوں میں سے ایک درخت ہے، جس کی شاخیں دنیا میں لٹکی ہوئی ہیں، جو شخص ان ٹہنیوں میں سے کسی ٹہنی کو پکڑ لے گا، وہ ٹہنی اس کو کھینچ کر دوزخ کی طرف لے جائے گی۔ [مظهري، بيهقي، دارقطني، حلية وغيره]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایک درہم ایک لاکھ درہم سے بازی لے گیا، ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ کیسے؟ آپؐ نے فرمایا: ایک آدمی ہو جو بڑا مالدار ہو، وہ اپنے مال میں سے ایک لاکھ درہم خیرات کر دے، اور ایک دوسرا آدمی ہو جس کے پاس صرف دو درہم ہوں، اور وہ اپنے دو درہموں میں سے ایک درہم خیرات کر دے۔ پس غریب کا یہ ایک درہم امیر کے ایک لاکھ درہم سے بہتر ہوگا۔ [رواه النسائي وصححه وبن خزيمه وابن حبان والحاكم، مظهري]

﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ اور سخت غصہ کو ضبط کرنے والے۔ اَلْكَظْمُ والْكُظُوْم سانس کے نکلنے کا راستہ۔ كَظَمُ الرَّجُل. كَظْمُ الْفَمِ عِنْدَ التَّثَاؤُبِ، كَظْمُ السِّقَاءِ. یہ سب معانی بندش کے لئے ہیں۔ یہاں مطلب واضح ہے کہ سخت غصہ کی حالت میں منہ بند رکھنا، اور غصے کو پی جانا نہایت اعلیٰ اور پسندیدہ عمل ہے، جو کہ متقین کے شایان شان ہے۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے سخت غصے کو ضبط کیا باوجود اس کے کہ اس کو پورا کرنے کی قدرت حاصل تھی، اللہ تعالیٰ اس کے دل کو امن اور ایمان سے بھر دے گا۔ [أحمد، عبدالرزاق، ابن ابي الدنيا]

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص سخت غصہ کو پی گیا (ضبط وتحمل کرکے) باوجودیکہ غصہ نکالنے پر اس کو قدرت تھی، قیامت کے دن سب مخلوق کے سامنے اللہ تعالیٰ اس کو بلائے گا، اور اسے اختیار دے گا کہ جس جنتی حور کو چاہے لے لے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مرفوع حدیث ہے کہ جو شخص اپنے غصے کو روکے گا اللہ تعالیٰ اس کی عیب پوشی فرمائے گا۔ [ابن أبي الدينا] بعض روایتوں میں ہے: اے ابن آدم! اگر غصے کے وقت تو مجھے یاد رکھے گا، یعنی میرا حکم مان کر میری خاطر غصہ پی جائے گا، تو میں بھی اپنے غصے کے وقت (بروزِ قیامت) تجھے یاد رکھوں گا، اور تجھے ہلاکت سے بچالوں گا۔ [ابن أبي حاتم] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِی يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ. پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسروں کو بچھاڑتا ہے، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھتا ہے۔

حضرت حارثہ بن قدامہ سعدی رضی اللہ عنہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ مجھے کوئی نفع کی بات بتائے۔ آپؐ نے فرمایا: غصہ نہ کرو، انہوں نے کئی مرتبہ پوچھا، اور بار بار عرض کرتا رہا، آپؐ نے ہر مرتبہ یہی فرمایا: غصہ نہ کرو۔ [احمد، ابن کثیر]

﴿وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ اور لوگوں کو معاف کرنے والے، اور ان سے درگزر کرنے والے۔ یہ متقین کی تیسری صفت ہے۔ کیا پیارا اندازِ بیان ہے؟ اسی ایک صفت میں گویا تین صفتیں شامل ہیں، یعنی اپنے غصہ پر قابو پانا۔ تکلیف دینے والوں کو معاف کرنا۔ پھر ان کے ساتھ احسان کا سلوک کرنا۔ یہ وہ اوصافِ حمیدہ ہیں جو جنتی لوگوں کے ساتھ مخصوص ہیں، دوزخی لوگ ایسے اوصاف کے مالک ہرگز نہیں ہو سکتے ہیں۔

☆☆☆

حضرت علی (زین العابدین) ابن حسین رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ اونچے طبقہ کے علماء وصلحاء میں سے ہیں، روزانہ پانچ سو رکعت نوافل ادا کرتے تھے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں سیدنا علی بن حسین رحمۃ اللہ علیہ کا ایک عجیب واقعہ نقل فرمایا ہے کہ آپ کی ایک کنیز آپ رحمۃ اللہ علیہ کو وضوء کرا رہی تھی، کہ اچانک پانی کا برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر حضرت کے اوپر گرا، تمام کپڑے تر ہو گئے، غصہ آنا طبعی امر تھا۔ کنیز کو خطرہ ہوا تو اس نے فوراً یہ آیت پڑھی: ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ یہ سنتے ہی خاندانِ نبوت کے ولی کامل کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، اور خاموش رہے۔

اس کے بعد کنیز نے آیت کا دوسرا حصہ ﴿وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ پڑھ دیا، تو حضرتؒ نے فرمایا: میں نے تجھے دل سے بھی معاف کر دیا۔ کنیز بڑی ہوشیار تھی، اس نے آیت کا تیسرا حصہ ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ بھی پڑھ لیا، تو حضرتؒ نے یہ سن کر فرمایا کہ جا میں نے تجھے آزاد کر دیا۔ [روح المعاني بحواله بيهقي]

لوگوں کی خطاؤں اور غلطیوں اور بے رحمیوں کو معاف کر دینا انسانی اعمال واخلاق میں ایک بہت بڑا درجہ رکھتا ہے، اور آخرت میں وزنِ اعمال کے ترازو میں اس سے بڑا وزنی عمل شاید نہ ہو۔ یہ اتنا عظیم عمل ہے کہ اس کا اجر و ثواب بہت اعلیٰ ہے۔ اور اقوامِ عالم کا دامن اس سے سراسر خالی ہے۔

اگر عفو وکرم اور لوگوں سے درگزر، پھر ان کے جرائم کے عوض ان کے ساتھ احسان کا معاملہ اگر کسی کو دیکھنا ہو، یا سیکھنا ہو، تو دونوں جہانوں کے سردار سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے جان نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کا مطالعہ کرے، اور مشرکینِ مکہ کے تاریخی بے رحمانہ اور بے پناہ ظلم وزیادتیوں کے بعد آپؐ نے ان کے ساتھ جو کریمانہ مشفقانہ سلوک فرمایا، اس کی مثال نہیں ملتی۔ فتحِ مکہ کے روز بشمولِ ابوسفیان سارے دشمنوں کو عام معافی دے کر رحم و کرم کے سنہرے سلوک ورواداری کے نقوش رقم فرما کر اپنی صفت رحمۃ للعٰلمین پر حجت قائم فرمائی۔ صلی اللہ علیہ و علی آلہ وسلم، و کذلک علی سیدنا یوسف علیہ السلام۔

سَیِّدُ الصَّادِقِینَ إِمَامُ الْمُحْسِنِینَ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ قیامت کے روز خالق کائنات جل جلالہ کی طرف سے منادی ہوگی کہ: جس شخص کا اللہ تعالیٰ پر اگر کوئی حق ہے تو وہ کھڑا ہو جائے، تو اس اعلان پر وہ لوگ کھڑے ہو جائیں گے جنھوں نے خلقِ خدا کے جور وستم اور ظلم وزیادتیوں کو دنیا میں معاف کیا ہوگا۔

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے: جو شخص یہ چاہے کہ اس کے محلات جنت میں اونچے ہوں، اور اس کے

درجات بلند ہوں، اس کو چاہئے کہ جس نے اس پر ظلم کیا ہو اس کو معاف کر دے، اور جس نے اس کو کبھی کچھ نہ دیا ہو اس کو بخشش و ہدیہ دیا کرے، اور جس نے اس سے ترکِ تعلقات کیا ہو، یہ اس سے ملنے میں اجتناب نہ کرے۔

قرآن کریم نے اپنے ماننے والوں پر کتنا احسان فرمایا کہ انہیں ایسے اعلیٰ اصول و اعمال بتائے جن پر چل کر وہ نہایت اعلیٰ مقامات تک رسائی حاصل کر سکیں، اور قربِ الٰہی کے بڑے بڑے درجات انہیں نصیب ہوں۔ جس خُلقِ عظیم کو سرورِ کونین رحمۃ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعارف کرایا باید ہے کہ اس کو ساری امت اپنا کر دنیا کا نقشہ اور رنگ تبدیل کریں، تاکہ اس کی بدولت دشمن بھی دوست بن جائیں۔ ارشاد فرمایا: ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ﴾ [فصلت: ۳۴] (یعنی برائی کی مدافعت احسان اور بھلائی سے کرو، تو جس کے ساتھ دشمنی ہے وہ تمہارا گہرا دوست بن جائے گا)۔ جس سے سارا معاشرہ جنت نظیر ہو جائے گا۔

سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اخلاقی تربیت بھی ان عظیم اقدار و فلاحی امور پر واضح ہدایت ہے۔ ارشاد فرمایا: جو شخص آپ سے قطع تعلق کرے آپ اس سے ملیں۔ یعنی قربت کریں، اور جو تم پر ظلم کرے آپ اس کو معاف کریں، اور جو آپ کے ساتھ برائی کرے آپ اس پر احسان کریں۔ [مشکوٰۃ]

بد قسمتی کہیے یا بے علمی! آج مسلمان اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظامؒ کی اخلاقی تعلیمات سے بے بہرہ اور خالی الذہن ہے، تب بھی تو معاشرہ میں یا بدنام ہے، یا دیگر اقوام سے چند قدم پیچھے ہے۔ اللہ تعالیٰ استقامت نصیب فرمائے۔

وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪
وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪۫ وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓىٕكَ
جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَنِعْمَ
اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ﴿۱۳۶﴾ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا
كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۱۳۷﴾ هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۳۸﴾

ترجمہ: اور وہ لوگ کہ جب وہ کوئی بے حیائی کی بات کر بیٹھتے ہیں، یا اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں، تو یاد

کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کو، اور بخشش طلب کرتے ہیں اپنے گناہوں کے لئے، اور کون ہے جو گناہوں کو بخشتا ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے، اور وہ اصرار نہیں کرتے اس پر جو انہوں نے کیا، اور وہ جانتے ہیں ۱۳۵ یہی لوگ ہیں کہ ان کا بدلہ یہ ہے کہ ان کے ربّ کی طرف سے بخشش ہوگی، اور باغات ہوں گے، جن کے سامنے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے، اور اچھا بدلہ ہے عمل کرنے والوں کا ۱۳۶ تحقیق گزر چکے ہیں تم سے پہلے واقعات، پس چلو پھرو زمین میں، دیکھو کیسا ہوا جھٹلانے والوں کا انجام ۱۳۷ یہ لوگوں کے لئے بیان اور متقیوں کے لئے ہدایت اور نصیحت ہے ۱۳۸

منازل ومعارف

پہلی آیت کریمہ میں دو قسم کے گناہوں کی طرف اشارہ ہے: ایک کو فاحشہ فرمایا، اور دوسرے کو اپنی جانوں پر ظلم کرنے سے تعبیر فرمایا۔ فحش کے معنی قبیح اور حد سے نکل جانے کے ہیں۔ عام طور سے اس کا اطلاق زنا پر ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے یہاں کبیرہ گناہ مراد ہوں۔ اور ﴿ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ﴾ سے مراد صغیرہ گناہ ہوں۔ یا یہ کہ فحشاء سے مراد زنا ہو، اور ﴿ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ﴾ سے مراد زنا سے کم درجے کے گناہ مراد ہوں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فاحشہ سے مراد حقوق العباد ہوں، اور ﴿ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ﴾ سے مراد حقوق اللہ ہوں۔

الغرض! قرآن کریم کے ان دو جملوں میں ہر قسم کے گناہ داخل ہیں، خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، حقوق اللہ سے متعلق ہوں یا حقوق العباد سے۔

﴿ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ زبان سے یا قلب سے یا دونوں سے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا، اور اس کی عظمت وجلال، اس کے وعدے اور وعید، اور اس کا حق عبادت واطاعت، اور اس کی رضا وناراضگی یاد کرکے توبہ واستغفار میں مشغول ہوگئے، اگر بندے کے حق میں کوتاہی کی تھی، تو توبہ کے ساتھ ساتھ بندے سے بھی اس کا حق معاف کرایا، یا ادا کردیا، اور یا بخشوایا، یا پہنچایا۔ اور اگر حق صرف اللہ تعالیٰ کا تھا تو اس سے معافی طلب کی، اور اس کے رُوبرو خشوع وخضوع سے گڑگڑائے، اور ندامت کے ساتھ خوب توبہ کی۔

﴿وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا﴾ یعنی وہ اپنے افعالِ قبیحہ پر اصرار نہیں کرتے، اور کسی گناہ پر خوش نہیں ہوتے، اور نہ ہی کسی گناہ پر فخر کرتے ہیں، اور کسی گناہ کی تعریف نہیں کرتے ہیں۔ اگر توبہ کرتے وقت پھر گناہ کا ارادہ ہو، اور یا ترکِ گناہ کا پختہ ارادہ نہ ہو، اور ندامت بھی نہ ہو، یہ سب صورتیں اصرار میں داخل ہیں۔

﴿وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ گناہ پر اگر چہ صغیرہ کیوں نہ ہوں، اصرار کرنا خود مستقل ایک گناہ ہے، اور یہ عقیدہ صرف اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے ہو۔ یعنی اعمال کی اصلاح اور عقائد کی درستگی بھی ہو۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہ یہ جانتے ہوں کہ مغفرت کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ بعض نے کہا: ان کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت ایسی ہے کہ خواہ گناہ کتنے ہی زیادہ ہوں وہ سب کو معاف کر دیتا ہے، اور وہ یہ بھی جانتے ہوں کہ ہمارا پروردگار توبہ واستغفار سے راضی اور خوش ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قرآن مجید میں دو آیتیں ایسی ہیں کہ جب گناہ کا مرتکب آدمی ان آیتوں کو پڑھتا ہے، اور پھر استغفار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ شانہ اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے، ایک یہی آیت: ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً......﴾ اور دوسری پانچویں پارے کی آیت: ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾. [النساء:۱۱۰] (اور جو شخص برائی کا عمل کرے، یا اپنے اوپر ظلم کرے، پھر اللہ سے معافی چاہے، تو اللہ کو معاف کرنے والا اور مہربان پائے گا)۔

بہرحال! اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر اتنا کرم کیا ہے کہ بندے قدم قدم پر گناہ کرتے رہتے ہیں، اور توبہ و استغفار کے ساتھ ان کے سارے گناہ پہاڑوں کے برابر معاف ہوتے رہتے ہیں۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ. گناہوں سے توبہ کرنے والا گناہوں سے ایسا پاک ہوتا ہے جیسے اس نے گناہ ہی نہ کیا ہو۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص اپنے گناہوں پر استغفار کرتا رہتا ہے، وہ اصرار کرنے والوں میں شمار نہیں ہوتا، خواہ اس نے ستر بار گناہ کا ارتکاب کیوں نہ کیا ہو۔ [أبو داؤد، ترمذي] امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مسند میں ہے کہ جس شخص سے کسی گناہ کا صدور ہو جائے، اور وہ وضوء کر کے دو رکعت نفل (صلوٰۃ توبہ) پڑھے، اور اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرے، تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے۔

صحیح مسلم میں اتنا اور زائد ہے کہ وضوء کے بعد کہے: اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ. پھر دو رکعت پڑھے، اور گناہ معاف کرائے، تو اس کی بخشش ہو جائے گی۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کی توثیق کی ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ جب یہ آیت: ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا...﴾ نازل ہوئی، تو ابلیس رویا، اور ماتم کیا۔ [مصنف عبدالرزاق]

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ایک اور مرفوع روایت ہے، فرمایا سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے: تم لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

اور استغفار کو اپنے اوپر لازم کرو، کیونکہ شیطان نے کہا ہے کہ میں نے لوگوں کو گناہوں سے ہلاک کیا، اور لوگوں نے مجھ کو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اور استغفار سے ہلاک کر دیا۔ جب میں نے یہ دیکھا تو میں نے ان کو ہَوا اور خواہشاتِ نفس سے ہلاک کیا، وہ گناہ کرتے ہیں، اور گناہ کو اچھا سمجھتے ہیں۔ [ابویعلی]

ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے موجودہ زمانے میں یہی کچھ ہو رہا ہے، کہ لوگ کھلم کھلا گناہ کرتے ہیں، اور گناہوں کے ارتکاب پر شرمندہ نہیں ہوتے، بلکہ اپنے گناہوں اور خلافِ شریعت برائیوں پر خوش ہوتے، اور فخر بھی کرتے ہیں۔ یہ سب ابلیسی کارندے، اور شیطانی ہتھکنڈے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ رکھے۔ آمین

﴿اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ﴾ یہی وہ لوگ ہیں جن کی جزاء اور صلہ مغفرت اور بخشش ہے، ان کے ربّ کی طرف سے، اور ایسے ایسے باغات ہیں، جن کے نیچے میٹھی عمدہ نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یہ لوگ ان باغات میں ابدی ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔ یہ کیا خوب مزدوری اور اچھا حق الخدمت ہے ان کام کرنے والوں کے لئے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر چہ یہ لوگ کم درجے کے ہیں، کیونکہ کبھی کبھی کبائر وصغائر اور حقوق اللہ وحقوق العباد میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں، لیکن چونکہ اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو یاد بھی کرتے، اور استغفار کر لیتے ہیں، اس لئے ان کو بھی مغفرت سے نوازا جائے گا، اور جنت جو متقیوں کے لئے تیار کی گئی ہے، ان کو بھی اس میں داخل کیا جائے گا۔ وہ باغات اور ان کے محلات کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ آخر میں اجر کی مدح فرمائی، کہ یہ مزدوری بہت اچھی ہے جو ان کو ملے گی۔ یہ ان باغات سے کبھی علیحدہ نہیں کئے جائیں گے۔

﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ﴾ تا ﴿وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ یہاں سے پھر غزوۂ اُحد کا ذکر ہے، اور زمانہ کے اُتار چڑھاؤ، مدوجزر سے مسلمانوں کو تسلی دینا مقصود ہے، اور ان کی حوصلہ افزائی کرنی ہے کہ اس قسم کے جزوی امور اور عارضی شکست کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ دنیا میں ہر وقت یہ ہوتا رہا ہے کہ کبھی اہلِ حق کو نقصان پہنچا ہے، لیکن انجام کا خسارہ ہمیشہ باطل کے مقدر میں رہا ہے۔

﴿سُنَنٌ﴾ سنة کی جمع ہے، جس کے معنی طریقہ کے ہیں۔ یہاں مراد ہے طریقہ، وقائع اور ادوار۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے زمانے میں بھی اچھے برے لوگ گزر چکے ہیں، اور تم سے پہلے ادوار میں بھی مختلف الخیال لوگ ہوئے ہیں، اور ان میں قتل وقتال بھی ہوتے رہے ہیں، لیکن نتیجہ اور انجام کے اعتبار سے تکذیب کرنے والے ہی ہلاک اور

تباہ ہوئے ہیں۔ اگر تم ان کی اُجڑی ہوئی بستیوں کو، اور ان کے تباہ شدہ مکانات کو بچشمِ بصیرت وعبرت دیکھنا چاہو تو اپنے گھروں سے نکل کر ان شہروں اور بستیوں تک ایک سرسری سیر کرو، اور اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ ان مُکذِبین کا کیا حشر ہوا؟ اور وہ ہر اعتبار سے، جسمانی، بدنی، مالی قوتوں کے مالک ہونے کے باوجود کیسے مٹ گئے؟ اور کیوں تباہ ہوئے؟ یہ اُجڑی بستیاں تمہارے پڑوس میں ہیں، کہیں دور نہیں ہیں۔

اے مسلمانانِ مدینہ! تمہارے تجارتی قافلے جب ملک شام کا سفر کرتے ہیں، تو راستہ میں مدائنِ صالح پر ان کا گزر ہوتا ہے، ذرّا دیکھ کر عبرت بھی حاصل کرو، اور مکذبین کے انجامِ بد پر خوش بھی ہو جاؤ، کہ تمہارے مخالفین کا بھی یہی حال ہوگا۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۳۹﴾ إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ
الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ
مِنْكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿۱۴۰﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ ﴿۱۴۱﴾
أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ ﴿۱۴۲﴾
وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۱۴۳﴾

ترجمہ: اور نہ سست ہو، اور نہ غم کھاؤ، اور تم ہی سربلند رہو گے، اگر تم ایماندار ہوئے ﴿۱۳۹﴾ اگر پہنچا ہے تم کو زخم پس بیشک پہنچا ہے ان لوگوں کو بھی زخم اس جیسا، اور یہ زمانے کے دن ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے ہیں، اور تا کہ اللہ تعالیٰ ممتاز کردے ان لوگوں کو جو ایمان لائے، اور تا کہ بنائے تم میں سے شہید، اور اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کے ساتھ محبت نہیں کرتا ﴿۱۴۰﴾ اور تا کہ اللہ تعالیٰ پاک کردے ان لوگوں کو جو ایمان لائے، اور مٹادے اللہ تعالیٰ کفر کرنے والوں کو ﴿۱۴۱﴾ کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، اور ابھی تک اللہ تعالیٰ نے ظاہر نہیں کیا ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا، اور ظاہر نہیں کیا ان لوگوں کو جنہوں نے صبر کیا ﴿۱۴۲﴾ اور البتہ تحقیق تم تمنا کرتے تھے موت کی قبل اس کے کہ تم اس سے ملتے، پس بیشک تم نے دیکھ لیا اس کو، اور تم آنکھوں کے سامنے اس کو دیکھ رہے ہو ﴿۱۴۳﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں پھر قصہ اُحد کے متعلق مسلمانوں کو تسلی دی جا رہی ہے، اور عارضی شکست کے اسباب بیان کرنے کے ساتھ انہیں آئندہ کیلئے بیدار کیا جا رہا ہے، کہ گھبراؤ مت، یہ ہمارا اٹل فیصلہ رہے کہ ﴿وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴾ [الصافات:۱۷۳] (اور بیشک ہمارے لشکر ہی غالب رہیں گے) کہ عاقبت الامر تمہارے حق میں کامیابی وغلبہ کا فیصلہ ہو چکا ہے، اور تمہارے دشمن کے مقدر میں مغلوبیت اور شکست کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

ہاں! تمہیں گذشتہ سے ضرور سبق سیکھنا ہوگا، تو ارشاد ہوا کہ اگر تم عارضی طور پر مغلوب ہو گئے، تو کیا ہوا، آئندہ کیلئے ہمت مت ہارو، اور غم نہ کرو، آئندہ غالب تم ہی رہو گے، اگر تم پورے مؤمن، صابر و متقی رہے، اور فرمانِ الٰہی اور ہدایاتِ نبویؐ پر کاربند رہے، اور ایمانی تقاضوں پر عامل رہے۔

اگر تمہیں غزوۂ اُحد میں زخم پہنچا ہے، تو یہ کوئی ایسی تکلیف نہیں جو صرف تمہیں آپہنچی ہے، بلکہ اس قسم کا زخم، بلکہ اس سے بھی بڑی تکلیف ایک سال قبل میدانِ بدر میں تمہارے مخالفین کو بھی پہنچی ہے، کہ ان کے بڑے بڑے ستر سرداروں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر تم نے قلیبوں میں پھینک دیئے، اور ستر افراد کو قیدی بنا کر ان سے فدیہ وصول کیا۔ یہ گرفتاری اور فدیہ کی ذلت ان کے ہزاروں زخموں پر نمک پاشی سے کم نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت وحکمت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ جیسے موسموں میں اس کے حکموں سے تبدیلی عینِ مصلحت ہے، اسی طرح جنگی حالات، فتح وشکست کی تبدیلی بھی عینِ مصلحت ہے۔

ابوسفیان نے ہرقل کی مجلس میں کہا تھا کہ یَنَالُ مِنَّا وَنَنَالُ مِنْهُ۔ ہمارے اور اس کے درمیان جنگ کا سلسلہ ایک طرفہ نہیں، کبھی ہم مغلوب وہ غالب رہتا ہے، اور کبھی ہم غالب وہ مغلوب ہوتا ہے۔ ہرقل نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے، انہیں دشمن کے مقابلے میں کبھی فتح ہوتی ہے، اور کبھی شکست، مگر بالآخر اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو غلبہ عطا کرتا ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ [الغافر:۵۱] (بیشک ہم اپنے پیغمبروں اور ایمان لانے والوں کی دنیوی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں)۔ یہ پہلی حکمت ہوئی۔

دوسری حکمت یہ ہے تاکہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ظاہری طور پر بھی جان لے، کیونکہ مخلص وغیر مخلص کی شناخت امتحان کے بعد ہوتی ہے۔

تیسری حکمت یہ ہے کہ تم میں سے بعض کو شہادت کے مرتبہ عالیہ پر فائز کرنا تھا۔

چوتھی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں گناہوں کے میل کچیل سے پاک اور صاف کرنا تھا، جس طرح سنار کی بھٹی میں سونے چاندی کو صاف کیا جاتا ہے۔

پانچویں حکمت یہ ہے کہ تدریجاً کافروں کے زور و قوت کو ختم کرنا تھا۔ اب یہ غالب ہونے کی وجہ سے دوبارہ تمہارے مقابلے پر آتے رہیں گے، اور مٹتے گھٹتے چلے جائیں گے، حتیٰ کے مکمل ختم ہو جائیں گے۔

البتہ یاد رکھو! کیا تم نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ تم یوں ہی کلمہ پڑھنے اور ایمان لانے کے ساتھ جنت میں بغیر کسی امتحان و آزمائش کے داخل ہو جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی تک اللہ تعالیٰ نے تم میں سے مجاہدین کو ظاہر نہیں کیا۔ جان کی بازی لگانے والوں کا پتہ تو جب چلے گا جب جہاد کا موقع آئے گا۔ جہاد کرنے والے لوگ اس وقت ظاہر ہوں گے جب وہ دشمن کے مقابلے میں آئیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ پہلی آزمائش تو یہ ہوگی کہ جہاد کیلئے تلوار لے کر میدان میں کون اترتا ہے، اور پھر جب میدانِ جنگ میں تکلیف پہنچتی ہے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ کون صبر کرتا ہے، اور ثابت قدم رہتا ہے۔ اور جہاد میں تکلیف برداشت کرنے والا کون ہے۔ کیا بغیر کسی سرزنش اور مصائب و عذاب کے جنت کا دخول اوّلی حاصل ہوگا؟ اور درجاتِ عالیہ میسر ہوں گے؟

سو یہ مقام و مرتبہ بدون مشقت اور تکالیف کے حاصل نہیں ہوتا۔ ورنہ یوں جنت میں جانے کو تو ہر مسلمان داخل ہونا ہی چاہے گا، خواہ عذاب بھگت کر، یا رحمت خداوندی کے بل پر۔ پھر بعض مسلمان شہدائے بدر کے فضائل سن سن کر شہادت کی تمنا کیا کرتے رہتے تھے، کہ کاش ہمیں اگر ایسا موقع ہاتھ آئے، تاکہ شہادت کا درجہ حاصل کریں۔ اب حال یہ ہے کہ جب شہادت کا موقع آیا، اور جان قربان کرنے کا وقت آیا، تو میدانِ شہادت چھوڑ کر جان بچانے کیلئے وہاں سے بھاگ نکلے۔ اس بناء پر ربّ العزّت کی طرف سے انہیں سرزنش ہوئی۔

جنگِ اُحد کی عارضی شکست کے اسباب:

اس عارضی شکست کے بظاہر تین ہی اسباب تھے: پہلا یہ کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو حکم پچاس تیر اندازوں کو دیا تھا، وہ اس حکم پر قائم نہ رہے، بعض نے حکم پر عمل کیا، وہ دس یا سات آدمی تھے، بقیہ لوگوں نے ان کی مخالفت کی، اور پہاڑ سے نیچے اترے۔

دوسرا سبب یہ ہوا کہ جب سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کی خبر مشہور ہوگئی، تو مسلمانوں کے قلوب پر نا قابلِ

برداشت صدمہ کا ورود ہو گیا، اور ان میں نا امیدی اور کمزوری پیدا ہو گئی۔ اکثر لوگوں کے دماغ ماؤف ہو گئے، اور وہ بزدلی وضعف کا شکار ہو گئے، اور میدان چھوڑ کر چلے گئے

تیسرا سبب یہ تھا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جنگ بدر کے قیدیوں کے متعلق فرمایا تھا کہ یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اسیرانِ بدر کے بارے میں آپؐ اپنے اصحاب کو اختیار دیدیں، چاہے انہیں قتل کر دیں، چاہے فدیہ لے کر انہیں آزاد کر دیں، مگر شرط یہ ہے کہ آئندہ سال تم میں سے اتنے آدمی ہی قتل ہوں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کفار سے فدیہ لینے، اور سال آئندہ اپنے اتنے آدمیوں کو شہید ہونے کو قبول کیا تھا، چنانچہ ان کے ستر آدمی جنگ اُحد میں قتل ہوئے۔ [ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم]

﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ یعنی نہ ہمت ہارو، اور نہ آئندہ جہاد میں سستی کرو، اور جو شہید ہو گئے ہیں، ان پر غمگین اور آزردہ خاطر نہ ہو، اور تم ہی سربلند اور غالب رہو گے، اگر تم مؤمن رہو، اور ایمان کے تقاضوں کو پورا کرو۔

﴿إِنْ يَمْسَسْكُمْ﴾ اگر تم کو اس لڑائی میں کوئی زخم لگا ہے، تو گروہِ کفار کو بھی معرکۂ بدر میں ایسا ہی زخم لگ چکا ہے، باوجود اس کے کہ وہ کمزور نہیں ہوئے، پھر تم کیوں حق کی حمایت میں ہمت ہارتے ہو؟ علاوہ ازیں یہ دن ہم لوگوں میں باری باری سے پھرا کرتے رہتے ہیں، یعنی بمقتضائے رحمت اور حکمت فتح وشکست میں تبدیلیوں کا آنا عین مصلحت ہے، اور اس لئے:

﴿وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ﴾......تا......﴿الظَّالِمِينَ﴾ کہ سچے ایمان والوں کو منافقین سے ممتاز اور الگ کر دے، اہلِ اخلاص اور اہلِ نفاق جدا اور الگ ہوں۔ اگر ہر موقع پر فتح تمہارے لئے ہو، اور شکست تمہارے دشمنوں کیلئے ہو، تو وہ مجبوراً ایمان پر آمادہ ہو جائیں گے، تو ایمان اختیاری نہیں رہے گا۔ اور دوم یہ کہ تم میں سے بعض کو شہید بنائے، جس کیلئے تم مسلسل تڑپ رہے ہو۔ اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا، لہٰذا تم یہ نہ سمجھو کہ ان کی عارضی فتح ان کے مقرب ہونے کی علامت ہے، ہرگز نہیں۔

تیسری مصلحت یہ ہے: ﴿وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ﴾ کہ اہلِ ایمان کو صاف کر دے، نکھار دے، ان کے گناہوں کا میل وکچیل ان سے صاف کر دے، اور کافروں کو مٹا دے، کیونکہ وہ عارضی فتح پر مغرور ہو کر بار بار تمہارے مقابلے پر آئیں گے، اس طرح وہ مٹتے اور گھٹتے رہیں گے، حتی کہ ختم ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے کفر و نافرمانی اور حق کی

مخالفت کی وجہ سے عذابِ الٰہی کی گرفت میں آکر تباہ ہوجائیں۔

﴿اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَیَعۡلَمَ الصّٰبِرِیۡنَ﴾ کیا تم نے یہ خیال کیا ہے کہ مشقت وتکلیف برداشت کئے بغیر جنت میں داخل ہوجاؤ گے؟ اور جنت کے بلند وبالا درجات پر فائز ہوجاؤ گے؟ حالانکہ ابھی تک اللہ تعالیٰ نے ممتاز نہیں کیا ان لوگوں کو کہ جو تم میں سے مجاہد ہیں، اور نہ جدا کیا صابرین کو۔ یعنی تم نے یہ خیال کرباندھا ہے کہ محض ایمان کے ساتھ بغیر مشقتوں کے، اور میدانِ جہاد میں اترنے اور ثابت قدم وصابر رہنے کے جنت میں داخل ہوجاؤ گے۔

پس خوب جان لو کہ جب تک اللہ تعالیٰ تمہارا امتحان لے کر مجاہدین کو غیر مجاہدین سے، اور صابرین کو غیر صابرین سے لوگوں کی نظر میں واضح طور پر جدا اور ممتاز نہیں کرے گا، اس وقت تک درجاتِ عالیہ کی تمنا خام خیالی کے سوا کچھ نہیں۔ دیکھو! تم نے ایک ادنیٰ اور وقتی جھڑپ سے کیوں استقامت اور ثابت قدمی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

﴿وَلَقَدۡ كُنۡتُمۡ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَلۡقَوۡهُ فَقَدۡ رَاَیۡتُمُوۡهُ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ﴾

تحقیق تم تو موت کے سامنے آنے سے پہلے ہی موت کی تمنا اور آرزوئیں کرتے تھے، تم ہی نے شوقِ شہادت میں جنگ اُحد کے وقت یہ مشورہ دیا تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر لڑنا چاہئے۔ پس تم نے اپنی تمنا اور آرزوئے موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ ہی لیا۔ یعنی جس وقت تمہاری تمنا ومطلوب تمہارے سامنے آگئی تو اُسے چھوڑ کر کیوں تم پیچھے ہٹتے ہو۔

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو یاد دلایا کہ تم جہاد اور شہادت کی تمنا کرتے تھے، اب تو یہ موقع تمہیں فراہم کیا جارہا ہے جسے تم نے دیکھ لیا ہے، اور تم اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہو، تو بسم اللہ کرکے جان کی بازی لگانے کیلئے تیار ہوجاؤ، اور شہادت کی عظیم قیمتی موت کو سینے سے لگالو۔ زہے سعادت۔ البتہ یہ یاد رکھو! ربّ العزت کی نصرت ومعیت تمہارے ساتھ ہے، تو مطمئن رہو۔

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ☆ سر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی

جنگ اُحد کا نہایت مختصر خلاصہ:

یہ خلاصہ نہایت مختصر اور نمبر وار بیان ہوگا:

(۱)......اُحد کے معنی ہیں: وہ اکیلا پہاڑ جو دوسرے پہاڑوں کی قطار سے الگ تھلگ ہے۔ یہ بابرکت جنتی

پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے۔ (۲)...... یہاں جنگ بروز ہفتہ ۱۲ شوال ۳ھ کو ہوئی، اور یہ جنگ یک روزہ ہوئی۔ (۳)...... مسلمانوں کی کُل تعداد ایک ہزار تھی، مگر راستے سے جب تین سو منافقین اپنے سردار عبداللہ بن ابی کی معیت میں مدینہ واپس ہوئے تو مسلمانوں کی تعداد سات سورہ گئی۔ (۴)...... دشمن، یعنی مشرکین مکہ کے لشکر کی تعداد تین ہزار مرد اور پندرہ عورتیں، یہ کل تین ہزار پندرہ ہوئے۔ (۵)...... مشرکین کے لوگ جن میں سات سو زرہ پوش، دوسو گھوڑے، اور تین ہزار اونٹ تھے۔ (۶) یہ جرار لشکر ۵ شوال کو ابوسفیان، یعنی صخر بن حرب اموی قریشی کی قیادت میں مکہ سے روانہ ہوا۔ (۷)...... ان کی روانگی اور دیگر حالات عباس بن عبدالمطلبؓ نے ایک قاصد کے ذریعہ مدینہ روانہ کر کے بھیجا (بذریعہ خط) (۸)...... بروز جمعرات ۱۰ شوال ابوسفیان کا لشکر جبل اُحد کے درمیان میں خیمہ زن ہوا۔ (۹)...... نماز جمعہ کے بعد سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ کے آداب پر خطبہ پڑھا، اور مجلس مشاورت قائم کی۔ آپؐ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ کے اندر جنگ ہو، اور تجربہ کار حضرات کا خیال بھی یہی رہا، مگر جوشیلے نوجوان یہی کہتے رہے کہ جنگ وہاں میدانِ اُحد میں ہو، اس درمیان عصر کی نماز ادا کی گئی۔ (۱۰)...... نماز عصر کے بعد آپؐ گھر تشریف لے گئے، اور زرہ پہن کر باہر تشریف لائے۔ اب کچھ لوگوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا: یارسول اللہ! جنگ کیلئے آپؐ کی رائے کے موافق مدینہ ہی موزوں ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ نبی جب زرہ پہن کر روانہ ہو تو بغیر جنگ کے زرہ کھولنا اس کیلئے اچھا نہیں ہوتا۔ (۱۱)...... بروز جمعہ ۱۱ شوال، بعد عصر آپؐ قدسیوں کا لشکر لے کر میدانِ اُحد کی طرف روانہ ہوئے۔ (۱۲)...... آپؐ ایک ہزار لوگوں کو لے کر روانہ ہوئے۔ مقام شیخین پہنچے تو منافق واپس لوٹے۔ آپؐ نے وہاں صف بندی کر کے لشکر کا اندازہ لگایا، اور معائنہ فرمایا۔

نابالغ آٹھ بچوں کو وہاں سے واپس کیا۔ وہ یہ ہیں: ابوسعید خدریؓ، اسامہ بن زیدؓ، اسید بن حضیرؓ، براء بن عازبؓ، زید بن ثابتؓ، زید بن ارقمؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عرابہ بن اوسؓ۔ ان کے علاوہ رافع بن خدیجؓ اور سمرہ بن جندبؓ اگرچہ نابالغ ہی تھے، مگر کسی مصلحت کے تحت انہیں منظور فرمایا۔ اور واپس نہیں کیا۔ اس اثناء میں میدان کے کسی کونے پر چند مسلح لوگوں کو چاق و چوبند دیکھ کر دریافت کیا کہ یہ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا: یہ لوگ ہماری مدد کیلئے مشرکین کے ساتھ لڑنے آئے ہیں۔ فرمایا: یہ مسلمان ہیں؟ جواب ملا: نہیں۔ ارشاد فرمایا: ان سے جا کر کہہ دو: ہمیں کسی کافر کی مدد کی ضرورت نہیں، یہاں سے چلے جاؤ۔

(۱۳)...... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقام شیخین ہی میں تھے کہ مغرب کا وقت ہوگیا۔ اسی مقام پر آپؐ نے قیام فرمایا،

اور رات گزاری۔ سحری کے وقت یہاں سے روانہ ہوئے، اور مقام جنگ پر پہنچے۔ یہاں حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فجر کی آذان دیدی۔ نماز کے بعد جنگ کیلئے صف بندی شروع ہوئی۔

﴿تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ کا مرحلہ شروع ہوا۔ اس وقت آپؐ کے ساتھ سات سو صحابہؓ تھے، جن میں سے صرف ایک سو آدمی زرہ پوش تھے۔ سارے لشکر میں صرف دو گھوڑے تھے، ایک آپؐ کا ایک ابو بردہ رضی اللہ عنہ کا۔ (۱۴)......دونوں طرف سے صف بندی ہوئی۔ اس وقت آپؐ کے ہاتھ میں ایک تلوار تھی۔ ارشاد فرمایا: جو شخص اس کا حق ادا کرسکتا ہے اسے قبول کرے۔ بہت سے حضرات آگے بڑھ کر میدان میں اترے، مگر آپؐ نے حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کو دیدی، اور ان کیلئے دعا فرمائی۔ (۱۵)......حسبِ معمول جنگ سے پہلے مبارزہ شروع ہوا۔ قریش کے علمبردار پہلوان باری باری سے آتے رہے، اور جہنم رسید ہوتے گئے، یہاں تک کہ قبیلہ بنی عبدالدار کے گیارہ پہلوان علمبردار آتے گئے، اور جہنم رسید ہوتے گئے۔ قریش کا علم زمین پر پڑا رہا، اسے اٹھا کر بلند کرنے والا کوئی نہیں بچا۔ اس موقع پر ان کے بائیس نامور لوگ مارے گئے۔ ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے بہت سوں جہنم رسید کیا۔

دوسرے درجے میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اپنے مخالفین کو جہنم رسید کیا۔ اسی اثناء میں وہ خود خُلد بریں پہنچ گئے۔ (۱۶)......حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا قاتل حبشی غلام وحشی بن حرب ایک بڑے پتھر کے پیچھے خنجر لے کر چھپا ہوا تھا، جوں ہی آپؓ کا وہاں سے گزر ہوا، وحشی نے پیچھے سے زوردار حملہ کیا، اور آپؓ شہید ہوگئے۔ (۱۷)......کیا لطف و کرم ہے جس کا اندازہ نہیں۔ بعد میں اس کی تفصیل بیان کریں گے۔ اس اثناء میں ہندہ بنت عتبہ زوجۂ ابوسفیان نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا پیٹ چاک کرکے ان کا خون چوسا، اور جگر چبا چبا کر کھانہ سکی، تو تھوک دیا، کیونکہ اسی اسد اللہ سید الشہداءؓ نے غزوۂ بدر میں ہندہ عورت کے خبیث باپ عتبہ کو ہمیشہ کیلئے جہنم رسید کیا تھا۔

(۱۸)......سبحان اللہ! تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ۔ یہ سب کچھ دلیری اور چابکدستی سے ہوتا رہا۔ قریش کی لاش پر لاش گرتی رہی، یہاں تک کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے، اور ڈھیروں اموال غنیمت میدان میں چھوڑ گئے۔ پہاڑی مورچہ والوں نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر دونوں کی نافرمانی اور حکمِ عدولی کرکے مال غنیمت جمع کرنے کیلئے پہاڑی سے نیچے اترے۔

خالد بن ولید نے چابکدستی کے ساتھ دو سو گھڑ سواروں کے ساتھ مورچوں پر قبضہ کیا، اور تیر باری شروع کرکے بھاگے ہوئے اپنے لشکر کو آواز دے کر واپس پلٹایا۔ زوردار حملہ دونوں طرف سے جب شروع ہوا، تو مسلمان

دونوں طرف سے کفار کے نرغے میں آگئے۔اس طرح لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا، اور فتح شکست میں تبدیل ہوگئی۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

(۱۹)...... مشرکین کا یہ دوطرفہ حملہ اتنا سخت تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قدم جما کر نہ لڑ سکے۔تین ہزار فوج ایک طرف سے، پھر یہ سارے پا پیادہ تھے، اور دشمن کے دوسو گھوڑوں کے زوردار ٹاپوں سے اٹھنے والے گرد وغبار میں اپنے ساتھیوں کی شناخت نہ کرسکے، نتیجہ یہ ہوا کہ تتر بتر ہوگئے۔(۲۰)...... عین اسی افراتفری میں وہ جانگداز، حوصلہ شکن افواہ پھیل گئی کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں نہیں رہے، شہید ہوگئے۔اس خبر نے رہے سہے ہوش وحواس کو ختم کر کے رکھ دیا، اور پہلوانوں کے قدم ڈگمگا کر اکھڑ گئے۔کئی لوگ مایوس ہوکر میدان چھوڑ گئے، اور کئی لوگ حواس باختگی کے عالم میں بیٹھ گئے۔پورے لشکر پر غم کے بادل چھا گئے۔کسی کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔قیامت کا منظر بالکل سامنے تھا۔پھر جب سنبھل گئے، اور جمع ہوکر حملہ آور ہوگئے، تو دشمن کو بھاگنا پڑا، اور میدان صاف ہوگیا۔

اسی کے ساتھ دشمن کے دلوں پر ایک قدرتی رعب چھا گیا، ورنہ دشمن نے ان کے آخری خاتمہ کا منصوبہ بنایا تھا، اور پھر مدینہ پر حملہ کرنے کا خواب بھی دیکھ چکا تھا۔باقی چند ضروری تفصیلات اور جزوی واقعات اور مصلحتوں اور قدرتی حکمتوں کے بیانات وقتاً فوقتاً آئندہ آیتوں میں بیان ہوتے رہیں گے۔ان شاء اللہ تعالیٰ

یارب تو کریمے وحبیب تو کریم ☆ صد شکر کہ ہستیم بمیان دو کریم

اگر کوئی اسلام کی حقانیت کا مطالعہ کرے تو اُسے واضح طور پر معلوم ہوجائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے دین میں صداقت، ورحمت، لطف وکرم ورواداری اتنا عام اور کامل ومکمل ہے جس کا عُشرِ عشیر تو کیا ایک ادنیٰ نمونہ وجھلک اقوامِ عالم کے منشور میں موجود نہیں۔

یہی ابوسفیان جس کی اسلام دشمنی ابوجہل بن ہشام سے ہزاروں درجہ زیادہ رہی، فتح مکہ کے روز یہی ابوسفیان بمعہ اپنے قوم وقبیلے کے اسی پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے جان نثاروں کے ہاتھوں میں محبوس رہے۔اگر دنیا کا کوئی بادشاہ ہوتا تو اپنے اس دشمن اور اس کی قوم وفوج کو ایک ایک کر کے وہ عبرتناک سزا دے دیتا شاید اس کی نظیر نہ ہو، مگر یہاں وہ انداز بادشاہانہ اور فخر وغرور خسروانہ نہیں، یہاں رحمۃ للعلمین والی صفت ظاہر، موجزن، اور نمایاں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اِذْھَبُوْا اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ. جاؤ، تمہارے سب کے گناہ اور سارے جرائم معاف ہیں، نہ کسی پر تنقید، نہ کسی پر گرفت۔ہند بنت عتبہ بھی معاف، ابوسفیان اور وحشی بن حرب بھی معافی کے لپیٹ میں۔پوری قوم قریش کیلئے محض

معافی کا اعلان نہیں، بلکہ قیامت کی شفاعت کا بھی وعدہ ہے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ اور عمرو بن العاصؓ فتح مکہ سے پہلے مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ اَلْحمدُ للہ یَا رَب صلِّ وسلِّم دائماً أبداً علیٰ حَبِیبِکَ خَیرِ الخلقِ کُلِّھِم۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

ترجمہ: اور نہیں ہے حضرت محمد مگر اللہ تعالیٰ کے رسول، تحقیق گزر چکی ہیں ان سے پہلے بھی رسول، اگر وہ وفات پائیں یا شہید کر دیئے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے؟ اور جو شخص اُلٹے گا اپنی ایڑیوں پر پس ہرگز وہ اللہ تعالیٰ کو کچھ نقصان نہیں پہنچائے گا، اور اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو بدلہ دیتا ہے ﴿۱۴۴﴾ اور نہیں ہے کسی جان کیلئے کہ وہ مرے مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے، ایک مقرر کیا ہوا نوشتہ ہے، اور جو شخص دنیا کا ارادہ کرتا ہے ہم اس کو بدلہ دیتے ہیں اس میں سے، اور جو آخرت کا ارادہ کرتا ہے ہم اس کو اس میں سے بدلہ دیتے ہیں، اور ہم شکر ادا کرنے والوں کا بدلہ دیں گے ﴿۱۴۵﴾

معارف ومنازل

یہاں ایک بہت بڑی عظیم اصل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، کہ حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بندے اور آخری رسول ہی تو ہیں، وہ مالک الملک اور خدا تو نہیں ہیں، ان کو ان کی حیثیت سے پہچانو، اور منصبِ رسالت و بندگی کی پہچان میں حدِّ اعتدال سے تجاوز نہ کرو۔ آپؐ سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں، جن کے قافلے کے یہی آخری امیر و سرکار ہیں۔ اگر آپؐ کی وفات ہو جائے، یا آپؐ کو شہید کر دیا جائے، تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟

تمہیں بتلایا جاتا ہے کہ کوئی شخصیت خواہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، مگر اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ سچائی کی راہ

دکھلانے والی ہے۔ پس اگر کسی وجہ سے وہ شخص ہم میں باقی نہ رہے، تو ہم سچائی سے کیوں منہ موڑ لیں۔ سچائی اپنی جگہ تو بدستور موجود ہے۔ اگر معلمِ حق باقی نہ رہے تو اس کی تعلیم کردہ دینِ حق تو برقرار ہے۔ فرض کرو اگر جنگ اُحد کی بات اگر سچ ہو جاتی، تو کیا پھر آپؐ کی موت کے ساتھ تمہاری خدا پرستی پر بھی موت طاری ہو جاتی؟

اگر تم اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کیلئے لڑ رہے تھے، تو جس طرح آپؐ کی زندگی میں یہ عمل برحق تھا، اسی طرح آپؐ کے بعد بھی حق، حق ہی رہے گا، جس پر کبھی موت نہیں آسکتی۔ وہ ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا۔ اسی طرح پیغمبر بھی اُمت کیلئے رہنما اور مینارِ ہدایت ہوتے ہیں، اور انہیں حق کی دعوت دیتے ہیں، تو ان کے جانے سے متزلزل ہو جانا بھی مشاہدۂ حق کے منافی ہے۔ اور یہ مسلمانوں کے شایان شان نہیں ہے۔

پس یاد رکھو! تم میں سے جو کوئی منافقوں کی شرارت اور پروپیگنڈہ کی وجہ سے متزلزل ہو کر حق سے پھر جائے گا (الٹے پاؤں کفر کا راستہ اختیار کرے گا) وہ اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں کرے گا، بلکہ اپنا سرمایہ وحق پرستی پر پانی پھیر کر اسے تباہ کرے گا، اور اللہ تعالیٰ ثواب دے گا شکر گزاروں وحق پرستوں کو (قدردانوں کو)۔

اس میں تنبیہ فرما دی کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو ایک نہ ایک دن اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں۔ آپؐ کے بعد بھی مسلمانوں کو دینِ اسلام پر ثابت قدم رہنا ہے۔ آپؐ کی وفات پر رازدارِ نبوت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اسی آیت کی تلاوت کر کے فرمایا تھا: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ﴾۔ آخر میں منکرینِ موت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بشمول حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خطاب کر کے کہا تھا: مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَ مَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللهَ فَاِنَّ اللهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ. قال الله تعالیٰ: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ﴾ [الآیۃ]۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے خطاب کر کے کہا تھا: وہ قسم کھانے والا تلوار ہاتھ میں لے کر کھڑے ہو بیٹھ جاؤ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی آمد سے پہلے ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوئے، اور کہا کہ جو شخص یہ کہے گا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی ہے میں اس تلوار سے اس کی گردن ماروں گا، قتل کروں گا۔

لوگ سارے پریشان اور غم میں ڈوبے ہوئے اور حواس باختہ ڈر کے مارے خاموش تھے، اور انہیں کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا، اور قرآنی اعلان بھول چکے تھے، اور سراسیمگی کے عالم میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ جوں ہی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا، اور آیت پڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کی خبر دیدی، تو مجمع کی آنکھیں کھل گئیں، اور سب نے

زار و قطار رونا شروع کیا، اور مدینے میں قیامت قائم ہوگئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تھے، تو چاروں طرف شجر و حجر، در و دیوار جگمگا کر روشن ہوگئے تھے۔ اللہ اللہ، وہی مدینہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات حسرت آیات سے غم کی تاریکیوں میں ڈوب گیا، اور کئی لوگ نابینا ہوگئے، اور کئی لوگ دماغی توازن کھو بیٹھے، اور کئی گونگے بہرے ہوگئے، اور کئی ہاتھ پاؤں سے شل اور اپاہج ہوگئے، اور کئی حاملہ خواتین کے بچوں کا اسقاط ہوا، حتیٰ کہ جانوروں پر بھی اثر ہوا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات نے سب کو ہلا کر رکھ دیا، اور اونٹنیوں نے گھاس کھانا چھوڑ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سواری کے دراز گوش (یعفور) نے ایک ویران کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی۔

بہر حال! جب خالد بن ولید نے ڈھائی سو سواروں کے رسالہ کے ساتھ تیراندازوں کی گھاٹی پر قابض ہوئے، وہاں موجود نو دس لوگ ان کا کیا مقابلہ کرسکتے تھے، تاہم انہوں نے حسبِ مقدور مقابلہ کرلیا، مگر وہ سب اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے۔ مجاہدینِ اسلام اپنے عقب سے مطمئن تھے، اور انہوں نے کفار پر زبردست حملہ کر کے انہیں شکست دی تھی، اور بھاگنے پر مجبور کر چکے تھے۔ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ تیرانداز پہاڑی کو چھوڑ کر نیچے اترے ہیں، اور دشمن آٹھ دس میلوں کا چکر کاٹ کر درّہ پر قابض ہوگا، اور دونوں طرف سے ہم پر حملہ آور ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور مسلمان دو طرف سے دشمن کے تابڑ توڑ حملے کی زد میں آگئے، اور سخت افراتفری پھیل گئی، یہاں تک کہ اپنے ساتھیوں کی شناخت بھی مشکل ہوگئی، اسی عدم شناخت کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنے ساتھی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہ پر حملہ کردیا، اور انہیں شہید کردیا۔

اس زبردست لڑائی کے شروع میں مسلمانوں کا پلہ جو بھاری رہا، اور وہ غالب رہے، یہاں تک کہ لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا، اور ان کی فتح شکست میں تبدیل ہوگئی، اور ان کے ۷۵ پچھتر آدمی ایک ہی میدان میں شہید ہوئے۔ اسی افراتفری میں کافروں کے دو آدمی سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر براہ راست حملہ آور ہوئے، ایک عتبہ ابن ابی وقاص، حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے بھائی، دوسرا ابن قمیہ۔ اس خبیث نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک بھاری پتھر نہایت نزدیکی سے پھینکا، جس سے دندان مبارک شہید ہوا، اور چہرۂ انور زخمی ہوا، اور نیچے والا ہونٹ مبارک بھی زخمی ہوا۔

ابن قمیہ نے آگے بڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنا چاہا، مگر مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے جن کے ہاتھ میں اسلام کا جھنڈا تھا، مدافعت کی، اور اسی میں وہ شہید ہوگئے، اور ابن قمیہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ البتہ دوسرے حملہ آور عتبہ

بن ابی وقاص کو حضرت حاطب بن ابی بلتعہ مہاجری رضی اللہ عنہ نے جہنم رسید کیا۔

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جھنڈا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوا۔ ادھر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زخموں کی شدت اور خون زیادہ بہنے سے زمین پر گرے۔ کسی شیطان نے (یا اسی ابن قیمہ نے) زور سے آواز لگادی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قتل کیے گئے۔ یہ سنتے ہی مسلمانوں کے ہوش وحواس خطا ہو گئے، ان کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ بعض مسلمان ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیخودی میں بیٹھ گئے۔ بعض ضعفاء کو خیال ہوا کہ مشرکین کے سردار ابوسفیان سے امن حاصل کرلیں۔

بعض منافقین کہنے لگے کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قتل کردیئے گئے تو ان کے اسلام کو چھوڑ کر اپنے قدیم مذہب میں واپس چلا جانا چاہئے۔ اس وقت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا انس بن النضر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں نہیں رہے تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ربّ حیّ وقیوم زندہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تمہارا زندہ رہنا کس مقصد کیلئے ہے، جس چیز پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قتل ہوئے اسی پر تم کٹ مرو، اور جس چیز پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جان قربان کی ہے اسی پر تم بھی جان قربان کرو۔ اگر وہ دنیا میں نہیں رہے تو اس کا دین دائمی اور ابدی ہے، جو قیامت تک رہے گا۔ یہ کہہ کر آگے بڑھے، اور خوب لڑے، یہاں تک کہ جام شہادت نوش کیا۔

جب جنگ ختم ہوگئی، اور شہداء کو ایک میدان میں اکٹھا کیا گیا، تو ان کی شناخت نہیں ہوسکتی تھی کہ یہ کون ہے، ان کے بدن پر تقریباً ننانوے زخم تھے، سارا بدن چور چور تھا، اور سارے اعضاء کٹے ہوئے تھے، اس اثناء میں ان کی بہن آئیں، اور انگلیوں کے پوروں سے ان کی شناخت کی کہ میرے بھائی یہی ہیں۔ [بخاری]

ما پروریم دشمن وما می کشیم دوست ☆ کس را مجال چون وچرا در قضائے ما

اسی اثناء میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیدار ہوئے، اور آواز دی: اِلَیَّ عِبَادَ اللهِ أنا رسول الله۔ میں اللہ تعالیٰ کا رسول تمہیں بلاتا ہوں، جلدی سے میرے پاس پہنچو۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچان لیا، اور چلائے: اے مسلمانو! بشارت حاصل کرو، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بقیدِ حیات یہاں موجود ہیں۔ آواز کا سننا تھا کہ مسلمان ادھر پہنچے، مردہ جانوں میں جان آگئی، فضاء کا رنگ بدل گیا۔

تیس کے قریب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بروقت آئے، اور خوب مدافعت میں لگ گئے، اور اتنی ہمت اور بے مثال قوت سے لڑے کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے، اور چار طرف بھاگنے لگے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک کوئی کافر ٹھہر نہ سکا۔ جاں نثاروں نے تحفظ کا حق ادا کرلیا۔ آخر مشرکین میدان چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور ہوئے، اور یہ

آیت نازل ہوئی: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ......﴾ [الآیۃ]

یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی آخر خدا تو نہیں، ایک رسول ہیں، ان سے پہلے کتنے رسول گزر چکے ہیں، جن کے بعد ان کے متبعین نے دین کو سنبھالا، اور جان و مال قربان کر کے قائم رکھا۔ آپ ﷺ کا اس دنیا سے گزرنا بھی کچھ تعجب کی بات نہیں ہے، اس وقت نہ سہی اگر کسی وقت آپ ﷺ کی وفات ہوگئی، یا شہید کر دیئے گئے، تو کیا دین کی خدمت و حفاظت کے راستے سے اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور جہاد فی سبیل اللہ ترک کر دو گے؟ جیسے اس وقت محض خبر قتل سن کر بہت سے لوگ حوصلہ چھوڑ کر بیٹھنے لگے تھے، یا منافقین کے مشورہ کے موافق العیاذ باللہ سرے سے دین کو خیر باد کہہ دو گے؟ تم سے ایسی امید ہرگز نہیں، اور اگر کسی نے ایسا کیا تو اپنا ہی نقصان کرے گا۔ وہ خدا کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ وہ تمہاری مدد کا محتاج نہیں ہے، بلکہ تم شکر کرو کہ اس نے تمہیں اپنے دین کی خدمت اور جہاد جیسے پاکیزہ عمل میں لگا دیا۔ ؎

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی ☆ منت ازو شناس کہ بخدمت گذاشتت

اور شکر یہی ہے کہ ہم بیش از بیش خدمتِ دین میں مضبوط و ثابت قدم ہوں، اس میں اشارہ نکلتا ہے کہ حضرت سرورِ کونین ﷺ کی وفات پر بعض لوگ دین سے پھر جائیں گے، اور جو قائم رہیں گے ان کیلئے بیحد بڑا ثواب و اجرِ عظیم ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد بہت سے لوگ مرتد ہوئے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان کو پھر مسلمان کیا، اور بعض مارے گئے۔ اس کی تفصیل کتبِ سیرت میں محفوظ ہے۔

خبرِ وفات میں حکمتِ الٰہی:

اس عارضی شکست اور سید کائنات ﷺ کے زخمی ہونے میں اسی طرح خبرِ وفات کے پھیل جانے، اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پست ہمت اور بے حوصلہ ہونے میں ایک اہم اور نمایاں راز یہ ہے کہ مسلمان اس اصولی مسئلہ میں عملاً ابھی سے پختہ ہو جائیں، کہ جہاں ایک طرف حضور پر نور ﷺ کی محبت و عظمت جزِ ایمان ہے، اور اس میں کوتاہی کفر کے درجہ میں ہے، وہیں اس کی نگہداشت کرنی ضروری تھی، کہ جس طرح عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی محبت کو عبادت و پرستش اور اُلوہیت کے درجہ تک پہنچا دیا تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان بھی اس میں مبتلا ہوں۔ اس لئے منافقوں کی زبان سے نکلے ہوئے جملوں کو سامنے رکھتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کان کھول دیئے، اور بتادیا کہ دین اور اس کے تمام تر احکام اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں، جو حیّ و قیوم، واحد لاشریک ہے۔

اس لئے بالفرض یہ خبر شہادت صحیح بھی ہوتی تو حادثۂ وفات ایک نہ ایک دن ہونا ہی ہے، تو کیا تم پھر دینِ الٰہی چھوڑ دو گے؟ یہ چیز تمہارے شایانِ شان نہیں ہے کہ جس کام کو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم پر چھوڑ گئے ہیں اسی میں ہمیں جانیں کھپانی ہیں۔ بہر حال حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم ایک نہ ایک دن دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں۔ اب تم کو یہ کام سنبھالنا اور مکمل کرنا ہے، کیونکہ تم ہی ان کی محنتوں کا پھل ہو۔ نقش انہوں نے قائم کیا، اب اسے تم ہی نے دوام بخشنا ہے۔

اس خبر شہادت میں بڑی حکمت یہ ثابت ہوئی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال پر جو احوال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پیش آ سکتے تھے وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں رونما اور ظاہر کر دیئے گئے، تاکہ اس سلسلے میں صحیح نمونہ سامنے آ جائے، اور جہاں اصلاح کی ضرورت ہو وہاں وہ لسانِ نبوت سے ظاہر ہو جائے، اور جب کبھی سچ مچ یہ واقعہ پیش آ جائے تو عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہیں بے قابو ہو کر کہیں اپنی جانیں نہ گنواں بیٹھیں، اور کوئی غیر شرعی غلط اقدام نہ کر جائیں، چنانچہ سانحۂ وصال کے وقت یہی ہوا کہ بڑے بڑے اَجلّہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہوش و حواس بھی بجا نہ تھے۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے لوگوں کے اعصاب بھی متزلزل رہے۔ پس صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بڑی عزیمت اور قوتِ قلب سے کام لے کر سب کو سنبھالا۔ دوسری طرف مکہ کے لوگوں کو حضرت سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے سنبھالا، اور تباہی سے بچا لیا۔

تنبیہ:

بعض بدبختوں نے اس آیت سے اپنے مکروہ مقصد حاصل کرنے کی خاطر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ قرآن کریم فرماتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے جتنے رسول تھے فوت ہو چکے ہیں، اس لئے عیسیٰ علیہ السلام بھی زندہ نہیں ہیں، لیکن ان کا مدّعیٰ تب ثابت ہوتا کہ آیت کے الفاظ یوں ہوتے: ﴿قَدْ مَاتَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے جتنے رسول تھے وہ وفات پا چکے۔ حالانکہ قرآن کے الفاظ ہیں: ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ اور خَلَا يَخْلُو کے معنی ہیں: گزر جانا، الگ ہو جانا، علیحدہ ہو جانا، نہ کہ مر جانا، جیسے چند آیات پہلے ارشاد فرمایا: ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ﴾ [آل عمران: ۱۳۷] (تحقیق گزر چکے ہیں تم سے پہلے واقعات)۔ اور منافقین کے بارے میں فرمایا: ﴿وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ﴾ [البقرۃ: ۱۴] (اور جب وہ اکیلے ہو جاتے ہیں اپنے شیطانوں کے ساتھ)۔ اسی طرح یہود کے بارے میں: ﴿وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ

الْاَنَامِلَ﴾[آل عمران:۱۱۹] (اور جب اکیلے ہوجاتے ہیں تو غصے کے مارے اپنی انگلیاں چپاتے ہیں)۔ اس میں "خلوا" کے یہ معنی نہیں کہ جب وہ مرجاتے ہیں، بلکہ جب وہ الگ ہوجاتے ہیں۔ جنتیوں کے بارہ میں ہے: ﴿بِمَا اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَةِ﴾[الحاقۃ:۲۴] (ان اعمال کے بدلے جو تم نے گزرہوئے دنوں میں کئے ہیں)۔ (وَالسلامُ علی منِ اتبعَ الھُدیٰ)۔

﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِی الشّٰكِرِيْنَ﴾

یعنی بغیر اذنِ الٰہی اور بدونِ اللہ تعالیٰ کے حکم کے کسی جاندار کا مرنا، اور اس کو موت آنا ممکن نہیں، خواہ طبعاً مرے یا قتل کیا جائے، جس میں تقدیم وتاخیر کی ایک لحہ بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ اور جو شخص اپنے اعمال کا بدلہ اور نتیجہ دنیا میں حاصل کرنا چاہتا ہے، تو ہم اس کو دنیا کے حصہ میں سے اپنی مشیت کے موافق دیدیتے ہیں، اور جو شخص آخرت کا ثواب اور اُخروی بدلہ چاہتا ہے، تو ہم اس کو آخرت کے ثواب کا حصہ دیدیتے ہیں، اور ہم عنقریب ایسے شکر گزاروں کو اچھا بدلہ اور نیک صلہ عطا فرمائیں گے۔

خلاصہ ہے کہ موت کا ایک مقرر وقت لکھا ہوا ہے، اور کوئی کسی طرح مرے اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر نہیں مرسکتا۔ مرنا اس کے لئے ممکن ہی نہیں، اور چونکہ موت مشیت اور حکمِ الٰہی پر موقوف ہے، تو اس پر گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہے، بلکہ حکمِ الٰہی پر راضی رہنے کی ضرورت ہے۔ اور جب موت کا مقررہ وقت لکھا ہوا ہے تو میدانِ جہاد سے بھاگنے اور میدان چھوڑنے کی ضرورت نہ تھی، بلکہ توکّل اور ثابت قدمی کی ضرورت تھی۔

اور چونکہ بعض لوگ مالِ غنیمت جمع کرنے کی خواہش میں مبتلا ہوگئے تھے، اور بعض جنگ میں کامیابی اور مسلمانوں کی فتح کے خواہشمند تھے، اس لئے فرمایا کہ دنیا میں اپنے اعمال کا بدلہ چاہنے والے دنیا کو شاید پالیں، مگر آخرت کے اجر وثواب سے محروم رہیں گے۔ اور لطف یہ کہ آخرت چاہنے والوں کو بیک وقت آخرت کا ثواب بھی ملے گا، اور دنیا بھی ان کے قدموں پر نثار ہوجائے گی۔ پوری تفصیل سورۃ بقرہ میں گزر چکی ہے، ﴿رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً﴾[البقرۃ:۲۰۱] آیت کریمہ کے ذیل میں دیکھیں۔

اوپر کی آیت میں نیک اعمال بجالانے والوں کو شاکرین فرمایا، اس آیت میں آخرت کے ثواب کی نیت رکھنے والوں کو شاکرین فرمایا، اس لئے تکرار نہیں ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس شاکر سے تیسری قسم مراد ہو، یعنی

بعض وہ لوگ جو دنیوی پھل چاہتے ہیں، اور بعض وہ لوگ جو آخروی پھل چاہتے ہیں، اور کچھ وہ بندگانِ خاص بھی ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے طلبگار رہیں، نہ ان کے سامنے دنیا ہے نہ آخرت۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: طَالِبُ الْمَوْلٰی مُذَکَّرٌ، وَ طَالِبُ الْاٰخِرَۃِ مُؤَنَّثٌ، وَ طَالِبُ الدُّنْیَا مُخَنَّثٌ۔ آخرت کا طالب عورت ہے، دنیا کا طالب نر مادہ ناکارہ ہے، اور اللہ تعالیٰ عزّ شانہ کا طالب مرد ہے۔ فرمایا انہیں طالبانِ مولیٰ کو عنقریب ان کی نیک نیتی کا صلہ دیں گے، اور ہم یہ بتانا نہیں چاہتے کہ ان کو کیا کچھ دیں گے، کیونکہ کسی فہم وادراک سے وہ بالاتر ہوگا، کیونکہ یہ لوگ طالبِ مولیٰ اور حق شناس ہیں۔ رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا نے کہا تھا میں انہی میں سے ہوں۔

حدیث میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے: جس شخص کی طلب آخرت کی طلب ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کے دل کو غنا سے بھر دیتا ہے، اور اس کی ہمت مضبوط کر دیتا ہے، اور جس شخص کی طلب دنیا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان پیشانی پر فقر اور محتاجی لکھواتا ہے، اور اس کی ہمت کو پراگندہ کر دیتا ہے (اس کا دل غنا سے خالی ہوتا ہے) اور اس کے لئے جو کچھ لکھ دیا گیا ہے اس سے زائد اس کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ یعنی مالداری کے باوجود فقیر ومحتاج رہے گا۔ [معالم]

حکایت:

عباسی خلیفہ ہارون رشید مدینہ منورہ آکر حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے درسِ حدیث میں شریک ہوئے۔ اختتام پر درس کے بعد دس ہزار کا تھیلہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کیا۔ امام صاحبؒ نے فرمایا: یہ مال فقیروں کو دیدو، بادشاہ نے کہا: یہ آپ اور آپ سے درسِ حدیث لینے والے طلبہ کے لئے ہیں۔ امامؒ نے فرمایا: ہم اور یہ سارے غنی ومالدار ہیں، اس مجلس میں سب سے بڑا فقیر تم اور تمہارے وزیر ہیں، بہتر یہ ہے کہ اپنے پاس رکھو، ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ بادشاہ بیچارہ شرمندہ ہوا، اور اپنے وزیر فضل سے کہا: امام مالکؒ صحیح کہتے ہیں۔ درحقیقت ہم ہی فقیر اور محتاج ہیں، بادشاہت کے باوجود مزید مال ملنے کے انتظار کرتے رہتے ہیں۔ [سیرت مالک رحمۃ اللہ علیہ]

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ

مَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا
اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾
فَاٰتٰىھُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

ترجمہ: اور بہت سے نبی ایسے گذرے ہیں کہ ان کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی، پس وہ ہمت نہیں ہارے، اس پر جو بھی ان کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں تکلیف پہنچی، اور نہ وہ ضعیف یا سست ہوئے، اور نہ وہ (دشمن کے سامنے) دبے، اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ﴿۱۴۶﴾ اور نہیں تھی ان کی بات مگر یہ کہ انہوں نے کہا: اے ہمارے پروردگار! ہمارے لئے ہمارے گناہ بخش دے، اور ہمارے معاملے میں ہماری زیادتی کو بھی (بخش دے) اور ہمارے قدموں کو ثابت رکھ، اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما ﴿۱۴۷﴾ پس اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کا ثواب بھی دیا، اور آخرت کا اچھا بدلہ بھی عطا فرمایا، اور اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ﴿۱۴۸﴾

معارف و منازل

﴿كَاَيِّنْ﴾ یہ لفظ اصل میں كَاَيٍّ تھا، قرآنی اِملاء میں تنوین کو بصورت نون لکھا گیا۔ یہ لفظ ہمیشہ خبری صورت میں مستعمل ہے، مگر شاذ و نادر استفہام کے لئے بھی آتا ہے، جیسے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا: كَاَيِّنْ تقرأ سُوْرَةَ الْاَحْزَابِ اٰيَةً؟ آپ سورۃ احزاب کی کتنی آیات پڑھتے ہیں؟ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ثَلٰثًا وَّ سَبْعِيْنَ اٰيَةً. [قاموس]

یہ کلمہ مبہم کثیر تعداد پر دلالت کرتا ہے۔ ابہام کو دور کرنے کے لئے اس کے بعد بطور تمیز کوئی لفظ ضرور مذکور ہوتا ہے۔ عموماً تمیز لفظ مِنْ کے ساتھ آتا ہے، جیسے ﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ﴾. بکثرت پیغمبروں کی معیت میں بہت اللہ والوں نے کافروں سے جہاد کیا۔ اس مثال میں ''وَكَاَيِّنْ'' نے کثیر تعداد کو ظاہر کیا، لیکن کس کی؟ یہ بات مبہم تھی، جب اس کے بعد ﴿مِّنْ نَّبِيٍّ﴾ آیا تو ابہام دور ہو گیا، اور معلوم ہو گیا کہ کثیر تعداد پیغمبروں کی تھی۔ [لغات القرآن]

☆☆☆

ربط:

گزشتہ آیات میں مسلمانوں کی کمزوری پر شکایت اور ملامت کا ذکر تھا کہ وہ مالِ غنیمت کی خاطر اپنے مورچوں سے نیچے اتر کر پوری فوجِ اسلامی کو شکست سے دوچار کیا، چند لوگوں کی غلطی نے پورے لشکر کی کامیابی اور فتح پر پانی پھیر دیا۔ اب ان آیات میں ان کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ تم سے پہلے دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی اُمتوں میں جہاد کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے، ان اُمتوں کے نیک وصالح لوگ بکثرت اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کی معیّت میں فریضۂ جہاد ادا کیا ہے، اور بعض اوقات میدانِ جہاد میں ان کے انبیاء علیہم السلام بھی شہید ہو چکے ہیں، لیکن ان لوگوں نے ثابت قدمی کے ساتھ سلسلۂ جہاد جاری رکھا ہے، اور میدان سے بھاگ کر اپنے عمل جہاد کو ناکام نہیں کیا ہے۔

حضرت طالوت کے ۳۱۳ لشکر کا پورا واقعہ تمہارے سامنے ہے۔ تم کو بھی ایسا ہی ہونا چاہئے، اور تم تو خیر الاُمَم ہو، تم کو تو ان سے بڑھ کر صبر واستقامت کا ثبوت دینا چاہئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

﴿وَ كَاَيِّنۡ مِّنۡ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ﴾...... تا ......﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيۡنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ کے کتنے ہی نبی ایسے گزرے ہیں جنہوں نے جنگ کی اس حالت میں کہ ان کے ساتھ کثیر تعداد میں اللہ والے اور خدا پرست لوگ شامل تھے، اور کافروں کے ساتھ جہاد وقتال کیا، پس یہ جہاد خاص تمہارے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ سابقہ انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی جہاد کا حکم اسی طرح تھا جس طرح نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے ہے، جن اللہ والوں نے کافروں کے ساتھ جہاد کیا، اور تکلیف برداشت کی، مگر ان تکلیفوں کی وجہ سے جو ان کو خدا کی راہ میں پہنچیں ان سے گھبرا کر نہ تو انہوں نے ہمت ہاری، اور نہ جہاد وقتال میں سست پڑے، اور نہ دشمن کے سامنے جھکے، اور نہ اس سے دبے (اور نہ ہی بھاگے، یا ہاتھ ہاتھ پر رکھ کر بیٹھ گئے) اور نہ ہی دشمن کے سامنے کوئی عاجزی ظاہر کی، جیسے جنگ اُحد میں بعض منافقین کہنے لگے کہ کاش کوئی ہمارے لئے ابوسفیان سے امان حاصل کرلے۔

اور اللہ تعالیٰ شدائد اور مصائب پر صبر کرنے والوں اور ثابت قدم رہنے والوں کو محبوب رکھتا ہے، پس جس طرح انبیاء سابقین علیہم السلام کے متبعین نے تکلیفوں کی وجہ سے ہمت نہیں ہاری، اور باوجود انبیاء علیہم السلام کے شہید ہو جانے کے اپنے دین کو نہیں چھوڑا، جیسے انبیاء کرام علیہم السلام کی معیت اور زندگی میں دینی جدوجہد جاری رکھی، اس لئے وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے محبوب بنے، پس وہ تمہارے جیسے ہیں، تم ان کی زندگی اور کارناموں سے سبق سیکھو، اور خوب عبرت حاصل

کرو کہ انہوں نے صبر واستقامت کے وہ قیمتی نمونے اور اثاثے چھوڑے جن پر چل کر تم بھی صبر واستقامت کا پہاڑ ثابت ہو جاؤ۔

وہ لوگ سرتاپا مجسم صبر واستقامت کے نمونے گزرے، عملی لغزش وکمزوری درکنار، انہوں نے مصیبتوں پر زبان سے اُف تک نہیں کہا۔ البتہ اگر کچھ بولا تو یہ کہا:

﴿وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّآ أَن قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِىٓ أَمْرِنَا﴾ ......تا ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ اے ہمارے پروردگار! ہماری تقصیرات کو، اور اس کام میں ہماری تمام زیادتیوں کو معاف فرما، اور دشمنوں کے مقابلہ میں ہم کو ثابت قدم رکھ، اور کافر قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کی بھی جزا دی، اور آخرت کا بھی ان کو اچھا بدلہ دیا، اور اللہ تعالیٰ نیکو کاروں اور مخلصوں کو محبوب رکھتا ہے۔

﴿رِبِّيُّونَ﴾ بکسر "راء" وتشدید "باء" وکسرہ، وضم "یاء"۔ معنی خدا پرست، اللہ والے۔ ہزاروں جماعتیں رِبِّيّ کی جمع، جو رَبَّانِيّ کی طرح ہے۔ یہ امام راغبؒ کا بیان ہے۔ امام بخاریؒ نے اس کے معنی جماعتوں کے کئے ہیں، اور اس کا واحد رِبِّيّ بتایا ہے۔ یہ معنی اصل میں امام لغت ابوعبیدہؒ سے منقول ہیں۔ اس صورت میں حسب تصریح قاضی بیضاویؒ رِبِّيّ رِبِّيَّة کی طرف بطورِ مبالغہ منسوب ہے، بمعنی جماعت کے۔ اور ابو حاتم احمد بن حمدان لغویؒ کہتے ہیں کہ یہ سریانی لفظ ہے، اس میں راء پر کسرہ خلاف قیاس ہے۔ [روح، لغات القرآن]

اَلْوَهْنُ: اِنْكِسَارُ الْجِدِّ بِالْخَوْفِ۔ [قرطبی] خوف کی وجہ سے عزم کا کمزور ہونا وھن ہے۔ شکست کے بعد عمومی طور پر وہ پیدا ہوتا ہے، جس کے معنی ہیں: کم ہمتی، یا حبِّ دنیا ومال، جس کا مطلب دوسری حدیث میں یہ بیان ہوا: حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ۔

جب موتِ شہادت سے خوف پیدا ہو بہ سبب حبِّ دنیا کے، تو ضعف، یعنی قوت میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے، پھر اِسْتِكَانَة کا مرحلہ آجاتا ہے، کہ عاجز ہو کر کافروں کے سامنے جھکنے کی نوبت آجاتی ہے۔ اسی لئے ان تینوں چیزوں سے بچنے کی تلقین کی گئی۔ اور اس کا علاج استغفار بتایا گیا۔ یعنی جان بچانا، ایک دوسرے پر الزام لگانے، اور کافروں کے قدموں پر جھکنے کی بجائے فوراً اپنے گناہوں اور غلطیوں پر نظر کر لی جائے، اور خوب سچے دل سے اللہ تعالیٰ کے حضور استغفار کیا جائے، اور اس سے مدد مانگی جائے، تو پھر انسان شکست سے پیدا ہونے والی ان تینوں بیماریوں سے بچ سکتا ہے۔

آخر مسلمان جب اپنے لئے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے لئے لڑتا ہو تو اُسے شکست نہیں ہونی چاہئے۔ ﴿وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴾ [الصافات: ۱۷۳] (اور بیشک ہمارے لشکر ہی غالب رہیں گے) کا اس کے ساتھ وعدہ ہے۔ اس کے باجود اگر وہ مغلوب ہوتا ہے، اور شکست کھاتا ہے، تو اس کا سبب اس کی نافرمانی اور بے راہی کے علاوہ کوئی اور کچھ نہیں۔

جنگ بدر کی فتح کا سبب ان کی فرمانبرداری رہی، اور جنگ اُحد کی شکست کا سبب ان کی نافرمانی اور طلبِ دنیا نہیں، تو اور کیا ہے؟ جب تک بندہ کی نظر اور توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف رہتی ہے، وہاں سے بھی توجہ برقرار رہتی ہے، جوں ہی بندہ نے اللہ تعالیٰ سے توجہ ہٹالی، اور مال و دنیا کی طرف متوجہ ہوا، تو حق تعالیٰ کی توجہ بھی اس سے ہٹ جاتی ہے، اور بندہ اپنے نفس کا سپرد ہوجاتا ہے۔ پس نفس اُسے کیا بچائے گا؟ یہ قانون وضابطہ صرف جہاد کے لئے نہیں ہے، بلکہ سارے اعمال کیلئے ہے، حتی کہ نماز کے لئے بھی۔ [خلاصہ حدیث]

مرفوع حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ ایک دور ایسا آئے گا کہ میری اُمت کے مسلمانوں کو مٹانے اور فنا کرنے کی غرض سے تمام کفار، یعنی پوری ملتِ کفر ایک دوسرے کو بلا بلا کر جمع ہوجائیں گے، اور انہیں اس طرح فنا کرنے کے درپے ہوجائیں گے جس طرح ایک بھوکی جماعت کسی بڑی لگن (تھالی) پر بیٹھ کر کھانا شروع کریں، اور سب اس میں ہاتھ ڈال کر کھانے لگیں۔ کسی نے پوچھا: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا اُس دن ہم تھوڑے ہوں گے؟ فرمایا: نہیں، اس دن آج کی بہ نسبت تمہاری تعداد بہت زیادہ ہوگی، مگر تمہارے اندر وہن کا مرض پیدا ہوگا۔ پوچھا: وَھن کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: حُبّ الدُّنْیَا وَ کَرَاهِیَةُ الْمَوْتِ. یعنی دنیا سے محبت اور موت سے خوف ونفرت۔ [اَبوداؤد]

جب تم تارکِ دنیا تھے، اور موت کو برائے شہادت سینے سے لگانے کے لئے تیار تھے، اور جہاد کے لئے تن، من، دھن، مستعد و تیار رہتے تھے، تو تمہارا رعب باوجود قلت اور بے سروسامانی کے دشمن کے دل میں پیوست اور موجزن رہتا تھا، اور وہ جرأت ہی نہیں کرسکتا تھا کہ میلی آنکھوں سے تمہاری طرف دیکھے، لیکن جب تم موت سے خوفزدہ ہوں گے، اور دنیا کے عاشقِ زار بنو گے، تو تمہاری ہوا نکل جائے گی، اور دشمن کے دل سے تمہارا خداداد رعب محو ہو کر خارج ہوجائے گا، تو وہ کھلونے کی طرح تمہاری ننگ وغیرت کے ساتھ کھیلنا شروع کریں گے، اور ساری ملتِ کفر ہر محاذ پر تمہیں گاجر مولی کی طرح کاٹنے میں شروع ہوجائے گی۔

کویت، عراق، شام و یمن، مصر و لیبیا، مراکش و تیونس اور افغانستان کی وادیوں میں لاکھوں کی تعداد میں تمہارے جوانوں، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو قربانی کا بکرا بنا کر تہہ تیغ کریں گے۔ تم ہاتھ اٹھا کر گڑگڑا کر چیخ چیخ کر دعا کرو گے: اے ہمارے پروردگار! ہمارا حال دیکھ، حکم ہوتا ہے کہ تو اپنا نامۂ اعمال دیکھ۔

یہ وہ زمانہ ہوگا جب تم مسلمان ہوتے ہوئے فریضۂ جہاد اور احکامِ اسلام کا عملاً باغی رہو گے (اِلّا ماشاءاللہ)

کسی وقت وہ تم ہی تو تھے کہ دریاؤں پر حکمرانی کرتے تھے۔ حجر بن عدی رضی اللہ عنہ جب دشمنانِ اسلام کے مقابلہ میں جاتے ہیں، اور دریائے دجلہ بیچ میں آجاتا ہے، اور لشکرِ اسلام ٹھٹھک کر کھڑا ہو جاتا ہے، تو آپؓ اس آیت کی تلاوت کر کے فرماتے ہیں کہ کوئی بے اجل نہیں مرتا، آجائیں دریائے دجلہ میں گھوڑے ڈال دیں۔ یہ فرما کر اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ آپؓ کو دیکھ کر سارا لشکر بسم اللہ کر کے گھوڑوں کے ساتھ دریاء میں گھس جاتا ہے۔

انہیں دشمن دیکھ کر ان کا خون خشک ہو جاتا ہے، اور اس پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے، اور کہنے لگتے ہیں: دیوان آمدند۔ یہ دیو اور بلا آ گئے، ان کا مقابلہ ہمارے لئے مشکل ہے۔ یہ دریا کے اندر گھس کر پانی کی موجوں سے کھیلتے ہیں، جلدی بھاگو، جان بچاؤ۔ چنانچہ سب کے سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ [ابن کثیر]

اسی طرح اسی دجلہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بارہ ہزار کے لشکر نے گھوڑے دوڑا کر ایران اور مداین کو فتح کیا تھا، اور پانی پر حکمرانی کی تھی۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو ☆ اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خوان ہمارا

سردارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم ہماری صفوں میں جلوہ افروز ہیں، اور بہ نفسِ نفیس پاکبازوں کی کمان کر رہے ہیں، اوپر فضاء سے وحیِ الٰہی کا پاکباز فرشتہ وحی لے کر اتر رہا ہے، معرکہ بڑے زور و شور سے جاری ہے۔ ابوسفیان کا لشکر کٹ مر رہا ہے، باری باری سے ان کے پرچم اٹھانے والے جہنم رسید ہو رہے ہیں۔ بارہ پرچم اٹھانے والے ڈھیر ہو گئے۔ جھنڈا زمین پر گرا ہے، اس کا اٹھانے والا کوئی نہیں ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شیروں کی طرح مقابلہ کر رہے ہیں۔ سراسیمگی کے عالم میں میدان چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں، مسلمانوں کی فتح یقینی ہو چکی ہے، اسی اثناء میں چالیس کے قریب لوگوں کی حکم عدولی کی وجہ سے جنگ کا پانسہ پلٹ جاتا ہے، اور شکست سے دوچار مشرکین کا لشکر موقع پا کر عقب سے زوردار حملہ کرتا ہے۔ دوسری طرف سے بھاگے ہوئے واپس ہو کر حملہ کرتے ہیں۔ مسلمان ان کے درمیان گھرے ہوئے محصور ہو جاتے ہیں، اور ان کی فتح لمحوں میں

شکست سے بدل جاتی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

اب ہمارے قلوب حبِّ الٰہی اور اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیگانہ ہیں۔ جہاد کا نام سن کر ہمارے اوپر مرگی کا دورہ پڑتا ہے۔ دشمنانِ اسلام نے مل کر ہماری تہذیب و اخلاق پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ جہاد کو دہشت گردی کہتے ہیں۔ ان کی صدائے بازگشت میں ہمارے روشن خیال حکمران بھی ہاں میں ہاں ملا کر جہاد کے نام سے خوفزدہ ہیں۔ زمین، صحراء، پہاڑ، جنگل، دریاء اور اوپر کی فضاء سمیت سب پر ہمارے دشمن کا قبضہ وتسلط ہے۔

ہاتھیوں کے جرار لشکر کا چند ایک چیونٹیوں پر بے رحمانہ یلغار ہے۔ درجنوں چیونٹیوں کا اربوں ہاتھیوں کے ساتھ مقابلہ نصف صدی سے چل رہا ہے، مگر جتنا وہ دبا رہے ہیں اتنا یہ ابھر رہے ہیں۔ یہ ہے ربّ العزّت کی رحمت و شفقت کی نظر۔ ابھی کفر بھی پریشان ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ شاید اس کو سمجھ آئے یا نہ آئے۔

۞ ۞ ۞

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ ﴿۱۴۹﴾
بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ خَیْرُ النّٰصِرِیْنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَاۤ
اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَ بِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۵۱﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اگر تم کافروں کی بات مانو گے تو وہ تم کو تمہاری ایڑیوں کے بل پلٹا دیں (یعنی تم کو مرتد بنا دیں گے) پھر تم نامراد و ناکام ہو جاؤ گے ﴿۱۴۹﴾ بلکہ اللہ تعالیٰ ہی تمہارا مولا ہے، اور وہی بہترین مددگار ہے ﴿۱۵۰﴾ ہم عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے، اور اس وجہ سے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان چیزوں کو شریک کرتے ہیں جس کی کوئی دلیل اللہ تعالیٰ نے نہیں اُتاری، ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور ان ظالموں کی بری جگہ ہے ﴿۱۵۱﴾

معارف ومنازل

یہ آیت پچھلے کلام کا تتمہ ہے۔ وہ اس طرح کہ جب کفار نے سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کا اعلان کر کے مسلمانوں میں خوف وہراس پھیلا دیا، اور کچھ منافقین نے مسلمانوں کو دوبارہ کافر ہونے کی دعوت دی، تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کافروں اور منافقوں کی طرف توجہ کرنے، اور ان کی بات ماننے سے روک دیا۔ [کبیر]

مطلب یہ ہے کہ ظاہری شکست کے اس موقع کا فائدہ اٹھا کر تمہارے دشمن کفار ومنافقین تمہیں غلط راستے پر

ڈالنے کی کوشش کریں گے۔تم ہرگز اپنے دشمن کی بات نہ مانو، ورنہ خسارہ اٹھاؤ گے۔تمہیں کسی سے مدد مانگنے کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارا حامی و مددگار ہے، اور اسی کی مدد سب سے بہتر ہے۔تو فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ یہاں کافروں سے کون مراد ہے؟ اس بارے میں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے چار اقوال ذکر فرمائے ہیں:

(۱)......اس سے مراد ابوسفیان ہیں، کیونکہ اس دن کافروں کے سردار وہی تھے۔اور شکست کے وقت مسلمانوں کو ترغیب دی جارہی تھی کہ عبداللہ بن ابی منافق کے توسط سے ابوسفیان سے امان لے لی جائے، تو اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا کہ ابوسفیان کے سامنے نہ جھکو، اور نہ ہی کسی کافر سے مرعوب ہو جاؤ۔

(۲)......﴿كَفَرُوا﴾ سے مراد عبداللہ بن ابی منافق اور اس کے ساتھی ہیں۔یہی لوگ کمزور دل والے مسلمانوں کے دلوں میں شبہات ڈال رہے تھے، اور کہہ رہے تھے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے برحق رسول ہوتے تو ان کے ساتھ یہ واقعہ پیش نہ آتا، اور تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم لوگ واپس اپنے دین کی طرف لوٹ آؤ۔

(۳)......﴿كَفَرُوا﴾ سے مراد یہودی ہیں، کیونکہ مدینہ میں یہودیوں کا ایک ایسا گروہ موجود تھا، جس کے افراد مسلمانوں کے دلوں میں شبہات ڈالتے رہتے تھے، خصوصاً اس غزوۂ اُحد کے بعد، جس طرح ان کے متعلق پہلے بھی حکم ہوا تھا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تُطِيعُوا فَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ﴾ [آل عمران: ۱۰۰] (اے ایمان والو! اگر تم اہلِ کتاب کے ایک گروہ کی بات مان لوگے، تو وہ تمہارے ایمان لانے کے بعد تم کو دوبارہ کافر بنا دیں گے)۔

(۴)......سب سے بہتر بات یہ ہے کہ ﴿كَفَرُوا﴾ کو اپنے عموم پر رکھا جائے، اور اس سے مراد تمام کافر (یہود نصاریٰ، مشرکین، منافقین وغیرہ) ہوں، کہ یہ سارے تمہارے دشمن ہیں، اور اسلام و جہاد کے بارے میں جو کچھ شبہات پیش کریں، تم ان کی بات ہرگز نہ مانو۔تمہیں مسلمانوں کو ان کی مدد کی قطعاً ضرورت نہیں۔تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی نصرت کافی اور بہتر ہے، کیونکہ:

(۱) قادر مطلق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔(۲) اللہ تعالیٰ صرف تمہارا مولا ہے، نہ اور کسی کا۔(۳) علمِ حقیقی کا مالک صرف وہی ہے۔(۴) تمہاری دعاؤں کا سننے والا اور قبول کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔(۵) اگر وہ چاہے تو کفار کو پھر سے شکست دیدے، جیسے میدانِ بدر میں ان کو شکست دیدی۔(۶) تمہاری یہ شکست عارضی ہے، اور تنبیہ

کی خاطر ہے کہ تم آئندہ باخبر رہو، اور سید عالم ﷺ کے مرتب کردہ نقشۂ جنگ کی خلاف ورزی نہ کرو۔ (۷) دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہی تمہارا حامی و ناصر ہے۔

﴿سَنُلْقِىْ فِىْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کے شان نزول میں دو قول ذکر فرمائے ہیں:

اَلأوَّلُ: لَمَّا ارْتَحَلَ أبو سفيانَ وَالمُشْرِكُونَ يومَ أُحُدٍ متوَجِّهِينَ نَحْوَ مَكَّة..... الخ.

جب ابوسفیان اور باقی مشرکین اُحد کے دن مکہ کی طرف واپس لوٹے، تو راستے میں انہیں ندامت ہوئی، اور وہ آپس میں کہنے لگے کہ یہ تم نے کیا کیا؟ تم نے مسلمانوں کو مارا، اور جب ان کا لشکر بکھر گیا، اور ان میں دم نہیں رہا تو تم لوٹ آئے۔ اب واپس چلو، اور چل کر ان کا مکمل خاتمہ کر دو۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، اور وہ بے ہمت ہو کر مکہ لوٹ گئے۔ راستے میں ان کو ایک بدّو ملا، تو اس کو کچھ اجرت دے کر کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور اس کے ساتھیوں کو ڈرا دینا کہ ہم واپس حملہ کرنے آرہے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ان کے عزائم کی خبر دیدی، چنانچہ آپ ﷺ نے مدینہ سے نکل کر ان کا پیچھا کیا، یہاں تک کہ حمراء الاسد تک جا پہنچے۔ اس پر یہ آیت اتری۔

وَالثّاني: وَقِيلَ اِنَّ الآيَةَ نَزَلَتْ فِي يومِ الأَحْزابِ. ایک قول یہ ہے کہ آیت کا نزول یومِ احزاب کے بارے میں ہوا۔ [روح المعانی]

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر بحث فرمائی ہے کہ ''اِلْقاءِ رُعب'' یعنی دشمن کے دل میں رعب ڈالنے کا یہ وعدہ غزوۂ اُحد کے ساتھ خاص تھا، یا یہ وعدہ عام ہے؟ بعض مفسرین رحمہم اللہ اسے غزوۂ اُحد کے ساتھ خاص قرار دیتے ہیں، جبکہ دیگر حضرات کے نزدیک یہ وعدہ عام ہے۔ قفال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: گویا کہ اس آیت میں فرمایا گیا کہ اُحد کے دن تمہارے ساتھ یہ (آزمائش والا) واقعہ ہوا، مگر اب اس کے بعد اللہ تعالیٰ تمہارا رعب کافروں کے دلوں میں ڈال دے گا، یہاں تک کہ کافروں کو مغلوب فرمادے گا، اور تمہارے دینِ اسلام کو سارے ادیان پر غالب فرمادے گا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کیا، یہاں تک کہ دینِ اسلام تمام قوموں اور ادیان پر غالب آگیا، جیسے ارشاد ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا﴾ [الفتح: ۲۸] (وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے، تا کہ اسے ہر دوسرے دین پر

غالب کردے، اور (اس کی) گواہی دینے کے لئے اللہ کافی ہے)۔

اور سید کائنات ﷺ کا فرمان ہے: نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ۔ میری ایک ماہ کی مسافت سے طاری ہونے والے رعب کے ذریعہ مدد دی گئی ہے۔ [کبیر]

اردو مفسرین میں سے بڑے اہلِ تحقیق حضرات کی بھی یہی رائے ہے کہ رعب کا یہ وعدہ عام ہے، غزوۂ اُحد کے فوراً بعد بھی اس کا ظہور ہوا کہ ابوسفیان اور مشرکین نے واپس آنے کی جرأت نہیں کی، اور پھر آئندہ بھی اس وعدہ کا ظہور ہوتا رہا۔ ملاحظہ ہو چند حوالے:

(۱) ہم کفار کے دل میں ان کے کفر کی شامت سے رعب ڈال دیں گے، ان کا ظاہری کرّ و فر کچھ کام نہ آئے گا، چنانچہ اس پیشینگوئی کے مطابق واقع ہوا، روم اور ایران کے جرار سپاہ کے دل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا رعب ڈال دیا گیا، جو کملی پوش اور بے سروسامان تھے۔ [تفسیر حقانی]

(۲) دشمنانِ دین کے دلوں میں القاء رعب یا ہیبتِ حق کے معجزانہ ظہور کی ایک یادگاری مثال تاریخ کے صفحات میں یوں محفوظ ہے کہ معرکۂ اُحد میں جب آخری فتح بظاہر مشرکینِ مکہ کو ہوگئی، تو اب قدرتی نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ وہ لوگ وہیں سے شہرِ مدینہ پر چڑھ دوڑتے، فاصلہ اب رہ ہی کتنا گیا تھا، لیکن ہمت اس کی انہیں کسی طرح نہ پڑی، بلکہ الٹا انہیں واپس جانا ہی پڑا، اور اس کے برعکس خود "زخم خوردہ" مسلمانوں نے اپنے بے مثل و بے مثال سالار ﷺ کے ماتحت مدینہ سے آٹھ میل "حمراء الاسد" تک تعاقب کیا، اور تین دن تک مسلمانوں کا کیمپ رہا، اور لگے ہاتھوں غنیم (یعنی دشمن) کا ایک آدمی بھی گرفتار کر کے لائے۔ [ماجدی]

(۳) مشرک خواہ کتنا ہی زور دکھلائے، اس کا دل کمزور ہوتا ہے، کیونکہ وہ کمزور مخلوق کی عبادت کرتا ہے۔ پس جیسا معبود ویسے عابد ﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ﴾ [الحج:۷۳] (طالب اور مطلوب دونوں کمزور)۔ اور ویسے بھی اصلی زور و قوت تو فی الحقیقۃ خدا تعالیٰ کی تائید و امداد سے ہے، جس سے کفار مشرکین یقیناً محروم ہیں، اس لئے جب تک مسلمان، مسلمان رہے ہمیشہ کفار ان سے خائف و مرعوب رہے، بلکہ ہم آج تک مشاہدہ کرتے ہیں کہ باوجود مسلمانوں کے انتشار و تشتت اور ضعف و تنزل کے، دنیا کی تمام کافر طاقتیں اس سوئے ہوئے زخمی شیر سے ڈرتی رہتی ہیں، اور ہمیشہ فکر رکھتی ہیں کہ یہ قوم بیدار نہ ہونے پائے۔ علمی اور مذہبی مناظروں میں بھی اسلام کا یہ ہی رعب مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ حدیث میں سید عالم ﷺ نے فرمایا: میرا رعب ایک مہینہ کی مسافت سے دشمنوں کے دل میں ڈال

دیا جاتا ہے۔ بیشک اسی کا اثر ہے جو اُمت کو ملا ہے۔ [(عثمانی رحمۃ اللہ علیہ]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے پانچ باتیں دی گئی ہیں، جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں: (۱)...... میری مدد رعب سے کی گئی ہے مہینہ بھر کی مسافت تک۔ (۲)...... میرے لئے زمین مسجد اور وضوء کی پاک چیز بنائی گئی ہے۔ (۳)...... میرے لئے غنیمت کے مال حلال کئے گئے۔ (۴)...... مجھے شفاعتِ کبریٰ دی گئی ہے۔ (۵)...... اور ہر نبی اپنی اپنی قوم کی طرف خاصۃً مبعوث ہوا، اور میری بعثت تمام دنیا کیلئے ہوئی (قیامت تک میری نبوت عام رہے گی)۔ [متفق علیہ]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ تمام اُمتوں پر مجھے چار فضیلتیں دی گئی ہیں: (۱) مجھے تمام جہان کیلئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ (۲) میرے اور میری اُمت کے لئے تمام زمین مسجد اور پاک بنائی گئ، میری امتی کو جہاں نماز کا وقت آجائے وہیں اس کی مسجد اور اس کا وضو (تیمم) ہے۔ (۳) میرا دشمن مجھ سے مہینہ بھر کی مسافت پر ہو، وہیں سے اللہ تعالیٰ اس کے دل کو رعب سے بھر دیتا ہے، اور وہ کانپنے لگتا ہے۔ (۴) میرے لئے غنیمت کا مال حلال کیا گیا ہے۔ [مسند احمد]

دوسری روایت میں فرمایا: (۱) میں سرخ وسفید سب کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ (۲) میرے لئے تمام زمین مسجد اور وضو کی جگہ بنائی گئی ہے۔ (۳) میرے لئے غنیمت کے مال حلال کئے گئے، جو مجھ سے پہلے کسی کیلئے حلال نہ تھے۔ (۴) میری مدد رعب سے مہینہ بھر کی مسافت سے کی گئی ہے۔ (۵) مجھے شفاعت دی گئی ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام نے شفاعت (مخصوص دعوتِ مستجابہ) دنیا میں مانگ لی، لیکن میں نے اپنی شفاعت (دعوتِ مستجابہ) کو اپنی اُمت کے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو چھپا رکھی ہے۔ [مسند أحمد]

...... ۞ ...... ۞ ...... ۞ ......

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓي اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ

غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

ترجمہ: اور بیشک اللہ تعالیٰ نے تم سے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا، جو اس نے تم سے کیا تھا، جس وقت تم دشمنوں کو بحکمِ خداوندی قتل کررہے تھے، یہاں تک کہ جب تم کم ہمت ہو گئے، اور حکم کے بارے میں تم نے آپس میں اختلاف کیا، اور تم نے اس کے بعد نافرمانی کی، جب تمہیں اللہ تعالیٰ نے وہ چیز دکھا دی جسے تم محبوب رکھتے تھے، تم میں سے بعض دنیا چاہتے تھے، اور بعض آخرت کے طلبگار تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تم کو دشمنوں کی طرف سے پھیر دیا، تا کہ تم کو آزمائے، اور البتہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے تم کو معاف فرما دیا، اور اللہ تعالیٰ مؤمنین پر بڑے فضل والا ہے ﴿۱۵۲﴾ جب تم دور چلے جارہے تھے، اور کسی کو مڑ کر نہیں دیکھ رہے تھے، اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم کو پکار رہے تھے، تمہارے پیچھے سے، پس اللہ تعالیٰ نے تمہیں غم کی پاداش میں غم دیدیا، تا کہ تم غمگین نہ ہو اس چیز پر جو تم سے جاتی رہے، اور نہ اس مصیبت پر جو تم کو پہنچ جائے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں سے باخبر ہے ﴿۱۵۳﴾

معارف ومنازل

آیت کریمہ کا شانِ نزول یہ ہے کہ غزوۂ اُحد کی عارضی شکست کے بعد مسلمان کہنے لگے، یعنی آپس میں کہتے رہے کہ: اللہ تعالیٰ نے ہم سے نصرت و سربلندی کا وعدہ فرمایا تھا، مگر معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ اسی طرح منافقین نے بھی طنز و مذاق کے طور پر مسلمانوں سے کہا کہ: تمہارے وہ بلند بانگ خدائی دعوؤں کا یہی نتیجہ نکلا کہ تم لوگ کٹ مرے، اور زخمی ہوئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اور اللہ تعالیٰ نے اس شکست کے اسباب سے پردہ اٹھایا، کہ تمہارے پروردگار کا وعدۂ نصرت اس موقع پر بھی پورا ہوا تھا کہ تم انہیں خوب قتل کررہے تھے، اور ان کے دس گیارہ علم برداروں کو یکے بعد دیگرے قتل کر کے انہیں اس طرح بے بس کیا تھا کہ ان کا پرچم زمین پر پڑا رہا، اس کا کوئی اٹھانے بلند کرنے والا نہ تھا، جبکہ تمہارا جھنڈا باوجود قلت و بے سروسامانی کے مسلسل بلند رہا۔ تم نے دشمن پر کاری ضرب لگا کر انہیں چھٹی کا دودھ یاد دلایا، جو کہ ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ہم پر قہرِ الٰہی اس انداز سے نازل ہوگا، یہاں تک کہ ان کے قدم اکھڑ گئے، اور میدانِ جنگ سے بھاگنا شروع ہو گئے، اور ان کی گانے والی غزل خواں عورتوں کی چیخ نکلی، اور پائنچے چڑھا کر بھاگنے لگیں، اور نوحہ خوانی کرتی رہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نصرت نہ تھی تو کیا تھی؟

کاش کہ تم اس زرّیں فتح ونصرت کو برقرار رکھتے، اور اسے ضائع نہ کرتے، تو چند لمحوں میں تمہاری فتح ونصرت کا سورج پورے زور وشور سے طلوع ہوتا، اور ابوسفیان کے سارے منصوبے خاک میں مل جاتے، مگر تم نے اللہ تعالیٰ کی نصرت کو اپنی حکمِ عدولی اور نافرمانی کے ساتھ شکست میں تبدیل کیا، اور عین فتح وکامرانی کے لمحات میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی، اور ان کے بتائے ہوئے نقشۂ جنگ پر پانی پھیر دیا، اور ان کی دل آزاری کی پاداش میں تم پر ناگفتہ بہ پریشانیوں کا یلغار ہوگیا، اور جنگ کا نقشہ یک لخت بدل گیا، اور فاتح مفتوح بن کر بھاگنے پر مجبور ہوئے، اور مفتوح ومکسور بھاگے ہوئے لوگ فاتح بن کر تمہارے پچھتر ہیرو پہلوانوں کو خون میں تڑپایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ۔

یہ جو کچھ ہوا تمہارے دشمنوں کی کثرت وقوت کی وجہ سے نہیں ہوا، بلکہ تمہارے اپنے کردار اور ناعاقبت اندیشی، اور حکمِ عدولی واختلاف کی وجہ سے ہوا۔ کاش تم صبر واستقلال اور تقویٰ واستقامت سے کام لیتے، تو یہ روزِ بد دیکھنے کی نوبت نہ آتی، مگر شکست کے باوجود اب بھی تمہارا پلّہ بھاری ہے، اور تمہاری غلطیوں پر عفو وکرم کی چادر ڈال کر تمہاری پردہ پوشی کا ﴿وَلَقَدۡ عَفَا عَنۡکُمۡ﴾ اعلان ہو رہا ہے۔

یہی مطلب ہے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا بجوابِ ابوسفیان کہ: اَللّٰہُ مَوۡلَانَا وَلَا مَوۡلٰی لَکُمۡ. اور یہ بات ذہن نشین ہو کہ وَاللّٰہُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ. یہ تمہارے لئے بڑی بشارت ہے۔ اسی لئے ارشاد ہوا:

﴿وَلَقَدۡ صَدَقَکُمُ اللّٰہُ﴾ البتہ بیشک (تاکید کے ساتھ) تمہیں سوچنا چاہئے تھا۔ اللہ تعالیٰ اگر تمہاری مدد ونصرت نہیں کرے گا، تو پھر کس کی نصرت کرے گا؟ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نازونیاز کے ساتھ تمہارے بارے میں دربارِ الٰہی میں استغاثہ کرکے کہا تھا: اے میرے معبود! آج اگر یہ جماعت ہلاک ہوجائے تو قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہ ہوگا۔ اسی خاطر اللہ تعالیٰ نے شروع میں اپنا وعدہ پورا کیا تھا، اور تم گھاس کی طرح دشمن کو کاٹتے رہے۔ اوّل حملہ میں انہیں تہہ تیغ کرکے بھگا دیا، مگر تم نے خود نافرمانی کرکے یہ مصیبت مول لی۔

فائدہ:

(۱) اللہ تعالیٰ کی نصرت کا وعدہ ابدی، دائمی ہے، جس کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی نصرت کا وعدہ اہلِ حق کے ساتھ مخصوص ہے، کسی غیر کا اس میں حصہ نہیں ہے۔

(۳) قرآن وسنت کی رُو سے اللہ تعالیٰ کی نصرت مشروط ہے ایمان، صبر اور تقویٰ کے ساتھ۔

(۴) چند لوگوں کی حکمِ عدولی اور بے صبری کی وجہ سے پوری جماعت کو ناکامی ہوسکتی ہے۔

(۵) جس طرح اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمِ عدولی ناکامی کا سبب بنی، اس طرح مجاہدین کے امیراور کمانڈر کی حکمِ عدولی سے بھی شکست ہوسکتی ہے۔اور جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔ان شاءاللہ۔پس ہرزمانہ میں مجاہدین پر لازم ہے کہ صبر وتقویٰ اوراطاعتِ امیر کواپنا شعار بنائیں۔

شانِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین:

یہ وہ پاکباز جماعت ہے کہ ان میں سے ایک کے ایمان کواگر پوری اُمت پر تقسیم کیا جائے تو سب کی نجات کے لئے کافی ہے۔یہ وہ جماعت ہے کہ ان کی محبت ایمان کا حصہ ہے، اوران سے بغض رکھنا کفر کی علامت ہے۔یہ وہ جماعت ہے جن کا دامن محبتِ دنیا، یا مال وزر کی محبت سے سراسر خالی ہے۔یہ وہ جماعت ہے کہ ان کا انتخاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔یہ وہ جماعت ہے جس کی برتری پوری اُمت پر ہے۔

• یہ وہ جماعت ہے جن میں دوزخی کوئی نہیں ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جن سے محبت ہراُمتی پر فرض ہے۔یہ وہ جماعت ہے جس کا ہر فرد مجاہد فی سبیل اللہ ہے۔یہ وہ جماعت ہے جس کا ہر فرد اُمت کا محسن ہے، اور قیامت تک آنے والے مسلمانوں پران کے احسانات ہیں۔یہ وہ جماعت ہے جن کے نصف صاع گندم کے صدقہ کا ثواب ہمارے پہاڑوں جتنے سونے کے صدقہ سے افضل ہے۔ الغرض ان کے کمالات وفضائل اتنے بے شمار ہیں کہ ان کا صحیح احاطہ نہیں ہوسکتا، اورانبیاء کرام علیہم السلام کے بعدان کا مقام ومرتبہ ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ غزوۂ اُحد میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رائے اور سوچ کی غلطی ہوئی تھی، اور یہ غلطی ان کی رائے تک محدود تھی، نہ کہ ان کے عقیدہ کا حصہ ہو۔مجتہد کی رائے میں غلطی کا امکان ہوسکتا ہے، نہ کہ عقیدہ کا۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اتنے راسخ الایمان تھے جن کا عقیدہ بڑے بڑے پہاڑوں سے زیادہ محکم اور مضبوط تھا۔رائے کی غلطی سے ایمان ہرگز متاثر نہیں ہوسکتا، اور نہ اس کا امکان ہے۔

چونکہ حَسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ شمار ہوتے ہیں، اس لئے انہیں سخت تنبیہ کا سامنا کرنا پڑا، اور انہیں سرزنش اور عتاب ہوئی۔مگر اس عتاب اور تنبیہات کے اندر بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ حضرت حق جل شانہ کی عنایات قابلِ دیداور ہمت افزاء وخوش کن ہیں۔

اول تو ﴿لِيَبْتَلِيَكُمْ﴾ فرما کر اظہار فرمایا کہ عارضی شکست کی جوصورت پیش آئی ہے یہ بطورِ سزا وگرفت کے نہیں ہے، بلکہ امتحان وآزمائش کے لئے ہے۔پھر صاف الفاظ سے اس خطاء کی بخشش اور معافی کا اعلان ہوا: ﴿وَ

لَقَدۡ عَفَا عَنۡكُمۡ﴾ اور یہ بہت بڑا انعام اوران کی پذیرائی ہے۔

آیاتِ مذکورہ میں ارشاد ہوا ہے کہ اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دوگروہ ہو گئے تھے، بعض دنیا چاہتے تھے، اور دوسرے بعض آخرت کے طلبگار تھے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ جن حضرات کے متعلق طالبِ دنیا ہونے کا ذکر ہے، جیسے غزوۂ بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے والوں پر طالبِ دنیا ہونے کا بھی اطلاق ہوا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ یہ ان کے کس عمل کی بناء پر ہے؟ ظاہر ہے کہ حبِّ دنیا کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ مطلب یہ ہوتا تھا کہ ہمارا دشمن مالی اعتبار سے قوی ہے، اوراس کے پاس سامانِ جنگ وافر مقدار میں ہے، جبکہ ہمارے پاس مال نہ ہونے کی وجہ سے وسائل کی کمی اور فقدان ہے۔ اگر ہم قیدیوں سے فدیہ وصول کریں، اوراس مال سے اسلحہ اور سامانِ حرب خرید کرلیں، تو آئندہ ہمارے لئے دشمن کا مقابلہ کرنا آسان ہو جائے گا۔

تو یہ طلبِ دنیا نہ ہوئی، اوراس موقع (غزوۂ اُحد) میں ظاہر ہے کہ ان کا یہی ارادہ اور عزم تھا۔ اس کے علاوہ یہ کہ مالِ غنیمت جمع کرنے کے ارادے کو اگر طلبِ دنیا سے تعبیر کیا گیا ہے تو یہ حضرات اپنے مورچے پر جمے رہتے، اور مالِ غنیمت جمع کرنے میں شریک نہ ہوتے۔ تو کیا ان کے حصہ غنیمت میں کوئی کمی آجاتی؟ اور شریک ہو گئے تو کوئی زیادہ حصہ ان کو مل گیا؟

قرآن وحدیث سے ثابت شدہ قانونِ غنیمت کو جو شخص جانتا ہے اس کو اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ مالِ غنیمت سے جو حصہ ان کو ملے گا، اس میں کسی حال کوئی فرق کمی بیشی کا نہ تھا۔ مالِ غنیمت جمع کرنے کی صورت میں بھی ان کا حصہ وہی رہے گا جو اپنی جگہ مورچے پر جمے رہنے کے وقت ملتا۔ تو اب یہ ظاہر ہے کہ ان کا یہ عمل خالص طلبِ دنیا تو نہیں ہوسکتا، بلکہ مجاہدین کے کام میں شرکت ہے۔

ہاں! طبعی طور پر اس وقت مالِ غنیمت کا خیال دل میں آجانا مستبعد نہیں ہے، مگر حق سبحانہ وتعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کے قلوب کو اس سے بھی پاک وصاف دیکھنا چاہتے ہیں کہ مال کا تصور ہی کیوں آئے۔ اس لئے اس تصور کو طلبِ دنیا سے تعبیر کر کے ناپسندیدگی کا اظہار فرمادیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ طلبِ دنیا دو قسم پر ہے:

(۱) طلب دنیا لِلدِّین ولِخِدمۃ الاسلام۔ یہ محمود ہے۔ (۲) طلب دنیا لِلدُّنیا۔ یہ مذموم ہے۔ اور طلبِ دنیا کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہرگز طالبِ دنیا نہیں تھے، جو مذموم ہے۔ ان کی طلبِ دنیا کا وہی

حال تھا جس کی طرف پہلے اشارہ ہوا کہ وہ ہماری طرح طالبِ دنیا بالذات نہیں تھے، بلکہ طالب بالعرض تھے۔ یعنی آخرت اور جہاد کی خاطر دنیا کے طالب تھے۔ لہٰذا مالِ غنیمت کے تعاقب کو طلبِ دنیا سے تعبیر کرنا اپنے ظاہر کے اعتبار سے ہے۔

اوران کے دوسرے ساتھی جو مورچے پر قائم رہے، اور غنیمت پر توجہ مبذول نہیں کیا، وہ محض آخرت کے طالب کہلائے، گویا دونوں گروہ فی الحقیقۃ آخرت ہی کے طلبگار تھے، ایک گروہ دنیا (غنیمت) کے راستے آخرت کا طالب تھا، دوسرا براہِ راست آخرت چاہتا تھا۔ دنیا سے رغبت کسی کو نہ تھی۔ چونکہ اس وقت مالِ غنیمت سامنے موجود تھا، اورانہوں نے اس کو لینے میں عجلت کی، تو اس عجلت کی وجہ سے موردِ عتاب ٹھہرے، اوراسے طلبِ دنیا سے تعبیر کیا گیا۔

اور مال غنیمت کے جمع کرنے میں عجلت نہ کرتے، بلاشک فتح مکمل کرنے کے بعد یہ اقدام کرتے تو طالبِ دنیا نہ کہلاتے، جیسے جنگ بدر کے موقع پر ہوا تھا کہ انہوں نے فتح مکمل ہونے کے بعد مالِ غنیمت کو جمع کیا تھا، جس سے کوئی نقصان نہ ہوا۔

اس کے علاوہ یہ بنیادی وجہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے، وہ اپنے مقربین کی معمولی لغزش کا بھی نوٹس لیتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے مرتبے کے لوگ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس معمولی سی لغزش (جو کہ اجتہادی تھی) پر بھی انہیں آزمائش میں ڈال دیا۔ ان کی یہ لغزش بعینہٖ حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش کی طرح ہے، آپ کو ﴿وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ [البقرۃ:۳۵] (تم دونوں اس درخت کے قریب بھی مت جانا) کہنے کے باوجود، اورشیطان کی دشمنی کی اطلاع کے باجود لغزش ہوئی۔ اوراس لغزش کو قرآن کریم نے عصیان سے تعبیر فرما کر کہا: ﴿وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى﴾ [طٰہٰ:۱۲۱] (پس آدم نے اپنے ربّ کا کہا ٹالا، اور بھٹک گئے)۔ ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا، اور کہا: ﴿وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾ [طٰہٰ:۱۱۵] (اور ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک بات کی تاکید کی تھی، پھر ان سے بھول ہوگئی، اور ہم نے ان میں عزم نہیں پایا)۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ معاملہ ہو بہو اسی طرح ہے، تب ہی تو ارشاد ہوا: ﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ﴾۔

پھر فرمایا: ﴿اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ﴾ تا ﴿وَاللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ یعنی تم بھاگ کر پہاڑوں جنگلوں کو چڑھے جارہے تھے، اور گھبراہٹ میں پیچھے مڑ کر بھی کسی کو نہ دیکھتے تھے۔ اس وقت خدا کا پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) بدستور اپنی جگہ (زخمی حالت میں) کھڑے ہوئے تم کو اس قبیح حرکت

سے روک رہے تھے، اور اِلَیَّ عِبَادَ اللہ أنا رَسُولُ اللہِ کہتے ہوئے اپنی طرف بلا رہے تھے، مگر تم تشویش واضطراب میں آواز کہاں سننے والے تھے۔ آخر جب کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بقید حیات صحیح سلامت حال میں دیکھ کر پہچان لیا، اور خوش ہوکر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرلیا، اور زوردار آواز میں چلا کر لوگوں کو پکارا کہ: اے اللہ کے بندو! اللہ تعالیٰ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ سلامت ہیں، اور تمہیں بلا رہے ہیں، جلدی میں پہنچو۔

اس اعلان کو سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اُڑے ہوئے ہوش وحواس ٹھکانے پر آگئے، اور مردہ جانوں میں جان آگئی۔ فرط مسرت سے دوڑتے ہوئے چابک دستی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اردگرد جمع ہونا شروع ہوگئے، اور جانوں کی قربانی پیش کرنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوگئے۔ یہ منظر قابلِ دید ہوتا تھا، جب ان کی ساری نا اُمیدیاں ختم ہوگئیں۔

﴿فَاَثَابَكُمۡ غَمًّۢا بِغَمٍّ﴾ یعنی تم لوگوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل کو تنگ کیا، اس کے بدلے تم پر تنگی آگئی، غم کا بدلہ غم ملا، تاکہ آئندہ آگے کو یاد رکھو کہ ہر حالت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر چلنا چاہئے، خواہ کوئی نفع کی چیز فوت ہو یا کوئی مصیبت آجائے، تمہیں ہر حال میں اطاعت شعاری پر چلنا ضروری ہے۔

دیکھئے! لوگ شکست اور افواہوں کی وجہ سے افراتفری اور شدّتِ غم سے نڈھال ہوکر نشیبی علاقہ سے پہاڑوں اور بلندیوں کی طرف بھاگ رہے ہیں، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان تمام مشکلات کی مطلقاً پرواہ نہیں کرتے، اور اپنے مقام پر ثابت قدمی اور عزم وہمت سے ڈٹے ہوئے کھڑے ہیں، اور انہیں واپس آنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ جب حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی آواز سنتے ہیں تو ان کی نا اُمیدی ختم ہوجاتی ہے، اور واپس آنا شروع ہوجاتے ہیں۔

غزوۂ حنین میں بھی ایسا مرحلہ پیش آیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی شجاعت وثابت قدمی کا اظہار فرمایا۔ مسلمان بھاگ کر منتشر ہورہے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دشمن کی صفوں کی طرف بڑھ کر پیشقدمی کر رہے تھے، اور ارشاد فرما رہے تھے: أنَا النَّبِيُّ لَا كَذِب أنَا ابنُ عَبدِ المُطَّلب. میں اللہ تعالیٰ کا حقیقی سچا فرستادہ ہوں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

نبی کے لئے ناممکن ہے کہ وہ میدانِ جنگ سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہٹ جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شجاعت وبسالت اور پختہ عزم ودلیری سے عرب کا بچہ بچہ بھی واقف تھا۔ ایسے اعلیٰ ترین خاندان کا فرزند اِن مشکلات وموانع میں کبھی میدان چھوڑ سکتا ہے؟ بلکہ یہی میدان جنگ اس کے کمالات وفضائل قومی کے اظہار کا بہترین محل ہے۔ اس

سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرزِ عمل فوجی کمانڈروں کے لئے ایک مشعلِ راہ اور اسوۂ حسنہ ہے کہ ان کو کس قدر نڈر اور جانباز ہونا ضروری ہے، اور اپنے آپ کو سب سے آگے رکھنا چاہئے، تاکہ سپاہیوں میں جوش و جذبہ اور جرأت و بہادری پیدا ہو۔

﴿غَمًّا بِغَمٍّ﴾ میں اگر "باء" معاوضہ کے لئے ہو تو معنی یہ ہوں گے: (۱) تم نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو نافرمانی کے ذریعہ غم پہنچایا، تو اس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں غم پہنچایا۔ یہ زجاجؒ کا قول ہے۔ (۲) بدر کے دن مشرکین کو جو غم پہنچا تھا، اس کے بدلے اب تمہیں غم پہنچا، تاکہ تمہارا دل دنیا سے بالکل بے رغبت ہو جائے، نہ دنیا کے ملنے سے خوش ہوں، اور نہ اس کے منہ موڑنے سے غمگین ہوں۔ یہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ (۳) ﴿فَاَثَابَكُمْ﴾ کی ضمیر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے راجع ہو۔ مطلب یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زخمی حالت میں دیکھا، تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے غم میں مبتلا ہو گئے، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حکمِ عدولی دیکھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب حکمِ عدلی اور اس کے نتیجہ میں نقصان کو دیکھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے نقصان پر غم میں مبتلا ہو گئے۔

اور اگر "باء" مع کے معنی میں ہو، یعنی ایک غم کے ساتھ دوسرا غم پہنچا، تو اس کی یہ صورتیں ہوں گی: (۱) پہلا غم نزاع اور بزدلی کا، دوسرا غم شکست کا۔ (۲) پہلا غم غنیمت کے فوت ہونے کا، اور دوسرا غم دشمن کے حملہ کے بعد نقصانات کا۔ (۳) پہلا غم مشرکین کے ہاتھوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قتل ہونے اور نقصان اٹھانے کا، دوسرا غم اس خوف کا کہ اگر مشرکین راستے سے واپس لوٹ آئے، تو وہ سب کو شہید کر دیں گے۔ (۴) پہلا غم اپنی جان و مال کے نقصان کا، اور دوسرا غم رَحْمَةً لِّلعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر کا، جس نے تمام غموں کو بھلا دیا، کیونکہ مسلمانوں کو پہلے یہ غم تھا کہ دشمن ہمارے تعاقب سے بچ گیا، اور مالِ غنیمت وصول نہ ہو سکا، مگر اب جو رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت دیکھی، تو اپنا غم تو بھول گئے، تمام تکلیفیں اور مصیبتیں فراموش ہو گئیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصیبت ان سب پر غالب آگئی، وہ حیران تھے کہ یہ کیا ہو گیا۔

ایک عورت کو خبر دی گئی کہ اس کا والد، اس کا بیٹا اور اس کا خاوند تینوں اس جنگ میں شہید ہو گئے ہیں، اس نے تمام باتوں کے جواب میں صرف اتنا پوچھا کہ بتاؤ حضرت اقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے کہا کہ وہ خیریت سے ہیں، اس پر وہ کہنے لگی: مجھے دکھاؤ میں چہرۂ انور دیکھنا چاہتی ہوں، جب اس نے منظر

دیکھا تو بول اٹھی: كلّ مُصِيبةٍ بَعدكَ جلل. آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ ہیں تو سب کچھ ٹھیک ہے، اب مجھے تسلی ہوئی کوئی، پرواہ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہوتے ہوئے سب مصیبتیں ہیچ ہیں۔

اور جب مدینہ کی دیگر عورتوں کو یہ اطلاع مل گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندہ ہیں، تو انہوں نے اپنے شوہروں، بیٹوں اور بھائیوں کی وفات پر ذرّہ برابر بھی اظہار رنج وغم نہ کیا۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک تیسرا قول بھی ہے، جسے امام قفال رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے کہ غَمًّا بِغَمٍّ میں دو غم مراد نہیں ہیں، بلکہ مسلسل غموں کی بوچھاڑ مراد ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے بہت سے غموں کے ذریعہ تمہیں تنبیہ فرمائی۔ [تفسیر کبیر]

﴿لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ﴾ تاکہ تم غم نہ کرو اس چیز پر جو ہاتھ سے نکل گئی، اور نہ اس مصیبت پر جو تمہیں پیش آئی۔ یا یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ غم اس لئے دیئے تاکہ دنیا کا غم تمہارے دل سے نکل جائے، اور اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جذبہ پختہ ہوجائے۔ بیشک دنیا کے غموں کو زیادہ محسوس کرنے والے اطاعت کے جذبہ سے محروم ہوکر اپنی فکر میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ آئندہ آیت کے معنی پر غور کرنے سے اس تفسیر کی قدر و قیمت بخوبی معلوم ہوجاتی ہے۔ وَاللّٰہ المُوَفق وهو المُلهِم للصَّواب. والله أعلم.

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ
قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا
مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ
لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ
بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ
صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾

ترجمہ: پھر اتارا اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر غم کے بعد امن اونگھ، جو ڈھانپ رہی تھی ایک گروہ کو تم میں سے، اور ایک گروہ ایسا تھا کہ ان کو فکر مند کیا تھا ان کی جانوں نے، وہ گمان کرتے تھے اللہ تعالیٰ کے بارے میں ناحق

خیال، جاہلیت کا خیال، وہ کہتے تھے: کیا معاملہ میں ہمارے لئے بھی کچھ ہے؟ آپ کہہ دیجئے: معاملہ سب کا سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، یہ اپنے نفسوں میں ان باتوں کو چھپاتے ہیں جن کو آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے، کہتے ہیں: اگر معاملے میں ہمارے لئے کچھ ہوتا تو ہم یہاں قتل نہ کئے جاتے۔ آپ کہہ دیجئے: اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو وہ لوگ نکلتے جن پر قتل کیا جانا لکھا گیا ہے اپنی قتل گاہوں کی طرف، تا کہ اللہ تعالیٰ آزمائے اس چیز کو جو تمہارے باطن میں ہے، اور تا کہ صاف کر دے اللہ تعالیٰ اس چیز کو جو تمہارے دلوں میں ہے، اور اللہ تعالیٰ دلوں کے راز کو جانتا ہے ﴿۱۵۴﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں یہ ارشاد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ تمہارا حامی وناصر ہے، اگر کسی مصلحت وحکمت کے تحت، یا تمہاری کسی نافرمانی کی وجہ سے تمہیں "غَمًّا بِغَمٍّ" کے ورطۂ امتحان میں آزمایا، اور پھر تمہاری مغفرت بھی فرمادی، تو جو ذات غم دینے پر قادر ہے، وہ غم دور کرنے پر بھی قادر ہے، چنانچہ اس نے میدان جنگ میں تمہاری پریشانی اور تعب و تھکاوٹ دور کرنے کی خاطر ﴿وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا﴾ [النباء: ۹] (اور تمہاری نیند کو تھکن دور کرنے کا ذریعہ ہم نے بنایا) تمہارے اوپر نیند اور راحت وسکون کی اونگھ مسلط کر کے تمہیں از سر نو لڑنے کا قابل بنا دیا، اور تمام ظاہری پریشانیاں دور فرمائیں، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا...﴾ [الآیۃ] پھر اللہ تعالیٰ نے غم اور انتشار کے بعد تم پر امن وسکون کی حالت نازل فرمائی، اور وہ یہ تھا نُّعَاسًا اونگھ تھی، جو تم پر طاری ہوگئی۔

امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مفسرین کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ دورانِ جنگ نیند یا اونگھ کا وارد ہو جانا سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت وصداقت کی عظیم دلیل اور معجزہ ہے۔

اس وقت تمہاری حالت یہ تھی کہ بہت سے مجاہدین شہید ہو چکے تھے، بہت سے زخمی حالت میں تھے۔ سپہ سالارِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی زخمی تھے، اور تمہاری شکست پر رنجیدہ تھے۔ یہ تمہارے لئے ناقابلِ برداشت پریشانی تھی، اور تم سارے تعب وتھکاوٹ میں چور چور تھے۔ ایسے وقت میں نیند تو کجا، ذرّا سا چین وسکون بھی نصیب نہیں ہو سکتا، تو اللہ تعالیٰ کی شفقت ورحمت کا شکر بجا لاؤ کہ اس نے ایسی حالت میں تم پر سکون کی نیند طاری کردی، جس سے تمام پریشانیاں دور ہوگئیں۔

ایک طرف سے یہ خصوصی مہربانی ہوئی، دوسری طرف سے عام قانون بھی یہی ہے کہ اگر کبھی لڑائی کی حالت میں نیند طاری ہوجائے تو فتح وکامیابی کی علامت شمار ہوتی ہے۔ اور یہ ایک نیک فال ہوتا ہے، کیونکہ تھکے ماندے پریشان حال شخص کو کچھ دیر کے لئے نیند آجائے، تو اسے سکون حاصل ہوجاتا ہے، اور پریشانی دور ہوجاتی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی فوج کو صفین کی لڑائی میں ایسا ہی واقعہ غنودگی پیش آیا۔ [عثمانی] اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ نیند کی حالت صرف خاص ایمان والوں پر طاری ہوئی تھی، منافقین اس نعمت اور اطمینانِ قلبی دونوں سے محروم رہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ اونگھ اور نیند کی حالت میں بار بار ہمارے ہاتھوں سے تلوار، نیزے اور دیگر اسلحے گرتے رہتے تھے، ہم انہیں اٹھاتے رہتے، یہاں تک کہ سارے مؤمنین پر جو غنودگی طاری رہی، وہ نہایت اطمینان وسکون کا باعث بنی۔ یہ صرف ﴿يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ﴾۔ مؤمنین اور مخلصین کے طائفہ تک محدود رہی، منافقین کو نصیب نہیں ہوئی، جن کے متعلق ارشاد ہورہا ہے، فرمایا ﴿وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ﴾

طائفۂ دوم منافقوں کی حالت اس وقت یہ تھی کہ ان کو ان کے نفسوں نے نہایت فکرمند پریشان کررکھا تھا، ان کو کوئی چین وسکون نصیب نہیں ہوا، وہ مسلسل شش و پنج میں رہے کہ پتہ نہیں ہمارا نتیجہ کیا ہوگا، ہماری نجات کا کیا طریقہ ہوگا۔

ان کے دلوں میں بے اعتمادی، باطل خیالات جنم لیتے رہے۔ جاہلیت اور بدعقیدوں کے سہارے اللہ تعالیٰ سے مایوس اور نااُمید رہے، اور کہتے رہے کہ معلوم نہیں اللہ تعالیٰ نے کوئی وعدہ کیا تھا یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت اگر ابھی نہیں آئی تو کب آئے گی؟ اور یہ بھی کہتے رہے کہ ﴿مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا﴾ [الأحزاب: ۱۲] (اللہ اور رسول نے ہمارے ساتھ (نعوذ باللہ) دھوکے کا وعدہ کیا تھا) یہ سب دھوکہ ہے، اور اس کی کوئی حقیقت نہیں، معلوم نہیں ہمارا کیا بنے گا، وغیرہ۔

دراصل ان کا اللہ تعالیٰ کے متعلق عقیدہ اور خیال سوائے تکذیب اور انکارِ حق کے کچھ نہیں ہوتا تھا۔

﴿يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ﴾ کیا اس معاملے میں ہمارے لئے کچھ ہے؟ یعنی ہمیں تو غم پر غم مل رہا ہے، لگتا ہے کہ ہمارے لئے کچھ بھی نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دے کر انہیں سرزنش کی، فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ﴾ اے پیغمبر! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان سے کہہ دیجئے کہ سارے کا سارا معاملہ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، اس کی مشیت اور ارادے میں کسی کو مداخلت کا اختیار اور حق نہیں ہے، وہ جو

کرے گا سو وہی ہوگا، اور وہ تمہارے ارادوں سے پورا باخبر ہے۔ تو فرماتے ہیں:

﴿يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ﴾ یہ لوگ اپنے نفسوں میں منافقانہ سازشوں اور گندے خیالات کو چھپاتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے تھے کہ ابوسفیان سے مل کر امان کی درخواست کریں گے۔ یہ لوگ اپنی منافقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

﴿يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا﴾ کہتے ہیں: معاملے میں (مشورے میں) اگر ہمارے لئے بھی کچھ ہوتا، یعنی اگر ہماری بات بھی سنی جاتی، تو ہم یہاں قتل نہ کئے جاتے، یعنی اللہ تعالیٰ کو اگر ہماری بھلائی منظور ہوتی تو ہمارے اتنے آدمی شہید نہ ہوتے۔ یا یہ کہ اگر ہمارے مشورہ پر عمل ہوتا تو آج ہمارے اتنے لوگ نہ مارے جاتے۔ جواب ملا:

﴿قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ﴾ یہ خیال نہ کرو کہ گھر میں رہنے سے موت نہیں آتی، اور جو میدان پر اترتا ہے وہی مرتا ہے، موت کے لئے ایک وقت مقرر ہے، اس سے پہلے کوئی نہیں مرے گا، اور اس وقت کے آنے پر کوئی نہیں بچے گا، اور کئی لوگ میدانِ جنگ میں اترنے کے باوجود نہیں مرے، اور جن کے مقدر میں موت لکھی ہوئی ہو، وہ ہزار کوشش کے باوجود گھر میں نہیں رہ سکیں گے۔ موت کا پیغام بہر صورت انہیں گھروں سے نکال گھسیٹ کر میدان میں لے آئے گا، یا گھروں کے اندر انہیں آہنی پنجوں میں لے کر مروائے گا۔

اللہ تعالیٰ کے پیغام اور تقدیر کے فیصلے سے کوئی نہیں بچ سکتا، پس تقدیر پر ایمان لانا تمہارے لئے ایسا ناگزیر ہے جیسا کہ مخلص مسلمانوں پر ضروری ہے، جسے انہوں نے بخوشی قبول کیا ہوا ہے۔

دیکھو! حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اپنی ساری زندگی جہاد میں گزار دی، اور مسلسل شہادت کی تمنا میں رہے، مگر شہید نہ ہوئے، وفات کے وقت فرمایا کہ میرے بدن پر کوئی جگہ تیر، نیزہ، تلوار کے زخم سے خالی نہیں، میں ہر بار دشمن کی صفوں میں گھس کر شہادت کی سعادت حاصل کرنا چاہا، مگر مایوس ہوا، آج افسوس کرتا ہوں کہ اونٹ کی طرح گھر میں بستر پر مر رہا ہوں، فَلَا قَرَّتْ اَعْيُنُ الْجُبَنَاءِ۔ خدا کرے بزدلوں کی آنکھیں ٹھنڈی نہ ہوں۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سیف اللہ کا لقب دیا ہوا تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی تلوار، پھر کس کی مجال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تلوار کو توڑ دے، اسی لئے وہ شہید نہیں ہوئے۔

؎ فنا فی اللہ کی تہہ میں بقاء کا راز مضمر ہے ☆ جو جیتا ہے تو مرنے کے لئے تیار ہو جائے

تو منافقوں کا یہ گمان کہ اگر مدینہ میں اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے، اور میدان اُحد میں نہ نکلتے تو نہ مارے جاتے، یہ بالکل غلط ہے۔ قضاء وقدر لوگوں کو گھروں سے نکال کر قتل کے لئے میدان میں لاکر کھڑا کر دیتی ہے، لہٰذا منافقین کا مسلمانوں کو یہ الزام دینا کہ انہوں نے ہم کو میدان میں لاکر مروایا ہے، سراسر غلط ہے۔ موت تو کسی حال میں نہیں ٹلتی، البتہ بہترین موت وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی راہ میں آئے، اور بڑا خوش نصیب وہ ہے جو بہادروں کی موت مرے، اور راہِ خداوند تعالیٰ میں شہید ہو جائے۔ اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا شَهَادَةً فِي سَبِيْلِكَ. آمین.

فرمایا: غزوۂ اُحد کی شکست تمہارے مقدر میں لکھی ہوئی تھی، جس کی حکمت یہ ہے:

﴿وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ تاکہ اللہ تعالیٰ آزمائے اس چیز کو جو تمہارے دلوں میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ شکست ایک آزمائش تھی، جس سے کھرے کھوٹے کی پہچان ہوگئی۔ ظاہر بین واصحابِ باطن کی شناخت ہوئی۔ گفتار وکردار والے پہچانے گئے۔ فرمانبردار اور نا فرمانوں کی تمیز ہوگئی۔ اور دلوں کے میل کچیل صاف ہو جائے۔ ایمان، عقیدہ، اخلاص، رضا بالقدر نکھر کر دلوں کے زنگ، سینوں کے نفاق سارے بخوبی واضح ہو جائیں، اور بھی بہت سی حکمتیں ہیں، جنہیں اربابِ باطن واصحابِ تفسیر نے لکھیں، اور بیان کیں۔

فائدہ:

قرآن کریم میں صرف دو ہی آیتیں ایسی ہیں جن میں تمام ۲۸ حروف تہجی مذکور ہیں، ایک یہی آیت قطب، دوم سورۂ فتح کی آخری آیت۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾

ترجمہ: بیشک تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے پشت پھیری جس دن دو جماعتوں کی آپس میں ٹکر ہوئی، بیشک ان کو پھسلایا شیطان نے، ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے، اور البتہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا ہے،

بیشک اللہ تعالیٰ بہت بخشش کرنے والا، بردبار ہے ۱۵۵

معارف ومنازل

گزشتہ واقعہ کا خلاصہ اور حکمت بیان فرما رہے ہیں۔ اسی طرح سابقہ مغفرتِ الٰہیہ کا تاکید کی خاطر تذکرہ ہو رہا ہے، تاکہ آئندہ کوئی شخص اس جماعتِ حقہ کے بارے میں اس عفوودرگزر کے بعد کوئی لب کشائی نہ کرے۔ فرمایا:

جس روز دونوں گروہوں کا، یعنی اہلِ اسلام اور اہلِ شرک کا مقابلہ ہوا، اور تم میں سے کچھ لوگ بے حوصلہ اور پست ہمت ہو کر بھاگ گئے (اکثر لوگ بھاگ گئے تھے سوائے بارہ تیرہ جان نثاروں کے جو ثابت قدم رہے) ان کا سبب اور عذر بیان ہو رہا ہے کہ:

﴿اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا﴾ ایک وجہ یہ ہوئی کہ انہیں شیطان نے ایسا کرنے پر آمادہ کیا، دوئم یہ کہ یہ ان کے کسی سابقہ گناہوں کی وجہ سے ہوا۔ جب شیطان نے انہیں ورغلایا، تو شیطان کا مقصد پورا ہو گیا، مگر اس لغزش اور اس کے پیچھے آنے والے نتائج میں یہ تکوینی حکمتیں پوشیدہ تھیں، جن کو ''لِيَبْتَلِيَكُمْ'' میں بیان فرمایا گیا۔

روح المعانی میں زجاج رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ شیطان نے ان کو بعض وہ گناہ یاد دلائے جن کو لے کر حق تعالیٰ سے ملنا ان کو اچھا نہ معلوم ہوا، اس لئے میدانِ جہاد سے ہٹ گئے، تاکہ وہ اپنی حالت کو درست کر کے، پھر پسندیدہ حالت میں جہاد کریں، اور شہید ہو کر اللہ تعالیٰ سے ملیں، کیونکہ ایک گناہ دوسرے گناہ کو اسی طرح کھینچ لیتا ہے جس طرح نیکی دوسری نیکی کو کھینچ لیتی ہے، کیونکہ اعمالِ حسنہ اور سیئہ میں تجاذب کا مادہ رکھا ہوا ہوتا ہے۔ جب انسان کوئی ایک نیک کام کر لیتا ہے تو تجربہ شاہد ہے کہ اس کے لئے دوسری نیکیاں بھی آسان ہو جاتی ہیں۔ اس کے دل میں رغبت پیدا ہو جاتی ہے کہ متواتر نیکیاں کرے۔ اسی طرح گناہ کرنے سے دوسرے گناہوں کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے، اور مسلسل گناہ کرنے کی رغبت پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ گناہ کرنے سے دل میں سیاہی اور ظلمت پیدا ہوتی ہے، جو آئندہ گناہوں کا سبب بن جاتی ہے۔ یہی حال نیکیوں کا بھی ہے کہ جن سے انشراحِ صدر اور انوار پیدا ہو جاتے ہیں، جو دیگر نیکیوں پر مسلسل آمادہ کرتے رہتے ہیں۔

یہیں سے اہلِ سنت والجماعت کے اس عقیدہ اور عمل کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اگرچہ گناہوں سے معصوم نہیں ہیں، ان سے کبھی بڑے گناہ بھی ہو سکتے ہیں، اور ہوئے بھی ہیں، لیکن اس کے

باوجود اُمت کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ ان کی طرف کسی گناہ اور عیب کی نسبت کرے۔

جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی اتنی بڑی لغزشوں اور خطاؤں کو معاف کر کے ان کے ساتھ لطف و کرم کا خصوصی معاملہ فرمایا، اور ان کو پوری اُمت کے لئے قابلِ احترام خصوصی نمونہ بنایا، اور ان کو ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ [البينة:۸] (اللہ ان سے راضی ہوا، اور وہ اللہ سے راضی ہوئے) کی سند عطا فرمائی، تو پھر کسی کو کیا حق ہے کہ وہ ان میں سے کسی کا برائی کے ساتھ تذکرہ کرے؟

دینِ اسلام جو کہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی امانت ہے، اور یہ عظیم الشان نعمت امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سپرد ہوئی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس گرانقدر عظیم نعمت کے لئے جس قوم کو منتخب فرما کر یہ نعمت انہیں کو سپرد فرمائی، یہ جماعت حقہ یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت تھی، جنہوں نے اس نعمت کا ایسا حق ادا فرمایا، کہ بغیر کسی کمی بیشی کے اسے چاردانگِ عالم میں پھیلایا، جس کے نمونے اور فیوض وبرکات ڈیڑھ ہزار سال بعد اب بھی موجود ہیں، اور آئندہ بھی رہیں گے۔

اس لئے اہلِ سنت والجماعت کے عقائد کی تمام کتابیں اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ، اور اس کے رسول امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پسندیدہ جماعت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعظیم واحترام اُمت پر واجب ہے، اور ان پر طعن واعتراض حرام ہے۔ اگر کوئی ان کے خلاف لب کشائی کرے تو اس کا ایمان خطرہ میں رہے گا۔ اَللّٰھمّ ارزُقنا حُبّھم واتّباعَھم. آمین!

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ
أَوْ كَانُوا غُزًّى لَّوْ كَانُوا عِندَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ۗ
وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١٥٦﴾ وَلَئِن قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ
لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿١٥٧﴾ وَلَئِن مُّتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللَّهِ تُحْشَرُونَ ﴿١٥٨﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جنہوں نے کفر کیا، اور اپنے بھائی بندوں سے کہا، جبکہ انہوں نے زمین میں سفر کیا، یا وہ مجاہد تھے کہ: اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے، یا نہ مارے جاتے، تاکہ کردے اللہ تعالیٰ اس بات کو حسرت ان کے دلوں میں، اور اللہ تعالیٰ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، اور اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے

جو کچھ تم کام کرتے ہو۝ اور اگر تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں مارے گئے، یا مر گئے، البتہ بخشش اللہ تعالیٰ کی جانب سے اور مہربانی بہتر ہے اس چیز سے جس کو یہ جمع کرتے ہیں۝ اور اگر تم مر گئے یا مارے گئے، تو البتہ اللہ کی طرف سے تم سب اکٹھے کئے جاؤ گے۝

معارف ومنازل

منافقین نے ہر محاذ پر مسلمانوں کو دھوکہ دینے اور گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے، اور ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے، اور اسلام، خاص کر جہاد سے روکنے اور متنفر کرنے کی ہر تدبیر اختیار کی ہے۔ غزوۂ اُحد میں جب بکثرت مسلمان شہید ہوئے، تو ان دشمنانِ دین نے زوردار پروپیگنڈہ شروع کیا کہ: بھئی دیکھو، جب ہم میدان میں نہیں گئے تو نہ مرے، اور نہ مارے گئے، تم لوگ اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی باتوں پر بھروسہ کرکے گھروں سے نکلے، تمہیں انہوں نے سبز باغ دکھا کر گھروں سے نکالا، نتیجہ یہ ہوا کہ تم کٹ مرے، زخمی ہوئے۔ اگر تم ہماری طرح گھروں میں بیٹھے رہتے، تو تمہیں یہ روزِ بد نہ دیکھنا پڑتا۔

ہمیں تمہاری شکست پر حسرت اور صدمہ ہوا، آئندہ کبھی ایسا اقدام نہ کرنا۔ منافقین کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اپنے اس اقدام پر حسرت اور پشیمانی اختیار کریں، اور آئندہ کے لئے بزدلی اختیار کرکے جہاد میں شرکت سے باز رہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے انہیں خبردار کیا کہ ان کفار کے کہنے میں نہ آئیں، اور ان کے شیطانی وسوسے اور ہتھکنڈوں پر کان نہ دھریں۔ موت کے لئے جو وقت مقرر ہے وہ کبھی نہ اس سے پہلے آسکتی ہے، اور نہ ہی کسی تدبیر سے ٹل سکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ میدان جہاد میں موت آئے، اور گھروں میں بیٹھے رہنے سے ٹل جائے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے سبق سیکھو، اور منافقین کے مکروفریب سے بچو، اور شہادت کی موت کو سینے سے لگا کر ابدی راحت اور جنت کی زندگی کا طالب رہو تو فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا﴾ اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ ان کفار میں منافقین کا گروہ بھی شامل ہے، خاص طور پر اعتقادی منافق، جن کے متعلق فرمایا تھا: ﴿وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ﴾ [البقرۃ:۸] (اور وہ مؤمن نہیں ہیں)۔ اسی طرح: ﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ [النساء:۱۴۵] (منافقین کا ٹھکانا جہنم کے سب سے نیچے خطرناک گھڑے میں ہوگا)۔

ان کی سازش کا یہ حال ہے: ﴿وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ﴾ کہ انہوں نے اپنے بھائی بندوں کے بارے میں کہا

تھا۔اور بھائی بندوں سے مراد مسلمان ہیں، اور یہ بات انہوں نے اس وقت کہی ﴿إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى﴾ جب مسلمانوں نے زمین میں سفر کیا، یا جب وہ غازی بن کر جہاد میں شریک ہوئے۔

مطلب یہ کہ جب کبھی مسلمان تجارتی یا جہادی سفر پر گئے، اور وہاں موت آگئی، یا انہیں شہادت نصیب ہوگئی، ایسی صورت حال میں منافقین کہنے لگے: ﴿لَّوْ كَانُوا عِندَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا﴾ اگر یہ مسلمان ہمارے پاس ہوتے اور مذکورہ سفر پر نہ جاتے، یا جہاد میں شریک نہ ہوتے، تو کیا ہوتا کہ وہ نہ مرتے، اور نہ مارے جاتے، بلکہ بچ جاتے۔

دراصل منافق مسلمانوں کو سفر اور جہاد سے بدظن کرتے، اور خوفزدہ کرنا چاہتے تھے، یہی چیزیں ان کی موت کا سبب بن رہی ہیں، لہٰذا نہ ان کو کسی سفر پر جانا چاہئے، اور نہ جہاد میں شریک ہونا چاہئے۔

اس مقام پر ﴿إِخْوَانِهِمْ﴾ کا لفظ توجہ طلب ہے۔ منافقین اور مسلمانوں کو بھائی بند اور اخوان کہا گیا ہے، اور یہ اس اعتبار سے کہ مدینہ میں رہنے والے سارے بھائی تھے، یعنی قومی برادری کے لوگ تھے، مختلف خاندانوں سے تعلق رکھنے کے باوجود بحیثیتِ قوم یہ سارے بھائی بھائی تھے۔ ایسا بھی تھا کہ ایک خاندان کے افراد ہونے کے باوجود بعض لوگ مسلمان ہوگئے، اور بعض کافر اور منافق رہے، اور ان میں سے بعض یہودی تھے، لہٰذا یہ سب لوگ ایک ہی برادری کے لوگ شمار ہوتے تھے، تو اخوان سے قومی برادری کے لوگ مراد ہوئے، نہ کہ دینی اور مذہبی۔

تو خلاصہ یہ ہوا کہ منافق اپنے قومی برادری کے مسلمان بھائی بندوں سے کہا کرتے تھے کہ تم خواہ مخواہ دور دراز کا سفر کرتے ہو، اور جہاد میں شریک ہو کر اپنی موت کو دعوت دیتے ہو، اگر ہماری طرح گھروں میں رہو گے تو موت سے بچ جاؤ گے۔

منافقین کا مقصد یہ تھا ﴿لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ﴾ تا کہ اللہ تعالیٰ ان (مسلمانوں) کے دلوں میں حسرت پیدا کردے، اور ان کے دلوں میں یہ بات راسخ ہوجائے کہ منافقین بات تو صحیح کہتے ہیں کہ واقعی اگر ہم جہاد میں سریک نہ ہوتے تو ہماری جان بچ جاتی، اور ہمارے لوگ نہ مرتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ منافقین کی ایسی مایوس کن منگھڑت باتوں پر یقین نہ کریں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں، اور ابدی سعادت حاصل کریں، اسی میں تمہاری بقاء اور تمہارے دین کی سربلندی اور عظمت ہے۔

﴿حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ﴾ کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقین کے دلوں میں حسرت پیدا

کردے، اگر مسلمان بیدار رہ کر منافقین و کفار کی اس چال میں نہ آئیں، اور ان کی باتوں پر توجہ نہ دیں، اور سفرِ تجارت اور جہاد کو برابر جاری رکھیں، تو یہ چیز خود منافقین کے لئے باعثِ حسرت ہوگی، کہ ان کی تمام تر جدوجہد کے باوجود مسلمان ان کے بہکاوے میں نہ آئے، اور ان کے مشوروں کو اہمیت نہ دی، لہٰذا وہ مایوس ہو کر اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جلتے رہیں گے، اور حسرت کریں گے۔

﴿حَسْرَةً فِىْ قُلُوْبِهِمْ﴾ کا تیسرا مطلب بھی ہے، اور یہ روزِ قیامت کے ساتھ متعلق ہے، کہ جب قیامت کے دن مجاہدین اور شہداء جنت کے اونچے درجات پر فائز رہیں گے، تو منافقین حسرت و افسوس کے دریا میں غرق ہوجائیں گے، اور پچھتائیں گے۔

﴿وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ﴾ زندہ کرنا، موت دینا تو اللہ تعالیٰ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اس کا تعلق مکتوبِ تقدیر اور مشیتِ ایزدی کے ساتھ ہے، وہ جس طرح جہاد میں موت دینے پر قادر ہے، اس طرح گھر میں حشم وخدم اور پہرہ داروں کی جھرمٹ میں بھی موت دینے پر قادر ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝١٦٨ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝١٦٩﴾ [آل عمران] (جو لوگ اپنے بھائیوں سے جو کہتے ہیں، حالانکہ خود بیٹھ رہے تھے، جہاد میں شریک نہیں ہوئے، کہ وہ اگر ہماری بات مان لیتے، اور جہاد میں شریک نہ ہوتے تو نہ مارے جاتے، بلکہ بچ جاتے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہہ دیجئے: اے گھروں میں بیٹھنے والو! اگر تم سچے ہو تو خود کو موت سے بچاؤ، یہ ہرگز نہ ہوگا، ہزاروں لوگ جہاد میں شریک ہوئے صحیح سلامت گھروں کو لوٹے، اور ہزاروں بزدل جہاد سے کترائے، گھروں میں بیٹھے موت کا لقمہ بنے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے یہی کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ بزدل کی آنکھیں ٹھنڈی نہ کرے جو موت کے ڈر سے جہاد میں شریک نہیں ہوتا۔ فَلَا قَرَّتْ أَعْيُنُ الْجُبَنَاءِ.

﴿وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾ اگر تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہوگئے، یا طبعی موت مرے، ہر حال میں تمہارے گناہ معاف ہوجائیں گے۔ شہادت کی صورت میں معافی تو یقینی ہے، طبعی موت اگر غربت اور سفر میں ہو، بشرطیکہ سفر معصیت کا نہ ہو۔ یہ بھی مُكَفِّرٌ لِلسَّيِّئَاتِ ہوگا۔

یہاں مغفرت نکرہ واقع ہوئی، اور لام تاکید کے ساتھ۔ پھر لَرَحۡمَةٌ و خَیۡرٌ دونوں کے ساتھ یہ بہت بڑے انعام اور صلہ کو مشتمل ہے۔ اس مغفرت ورحمت کا اندازہ ہی نہیں۔

یہ دراصل جواب ہوگا منافقین کے خدشات کا کہ تم غلط کہتے ہو کہ جہاد اور شرکت فی الجہاد کی موت اور شہادت سے گھر بیٹھنا اور زندہ رہنا بہتر ہے۔ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کی عبادت کے پس منظر میں تین نظریات ہوتے ہیں: پہلی صورت یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اس کی عبادت بجالاتا ہے۔ وہ مامورات ومنہیات کو اس لئے انجام دیتا ہے کہ کہیں وہ خدا کی گرفت میں نہ آجائے، اس کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدۡخِلَ الۡجَنَّةَ فَقَدۡ فَازَ﴾ [آل عمران: ۱۸۵] (جس شخص کو دوزخ کے عذاب سے بچالیا گیا، اور جنت میں داخل کیا گیا، وہ یقیناً کامیاب ہوگیا) اور سب کچھ پالیا۔

غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈر کر عبادت گزار کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے مغفرت حاصل ہوجاتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ساری خطاؤں کو معاف فرماتے ہیں۔

غزوۂ اُحد میں مسلمانوں سے غلطی ہوئی، مگر وہ خالص خدا پرست لوگ تھے، جوں ہی انہیں غلطی کا احساس ہوا تو پھر سے اکٹھے ہوگئے، اور جانبازی کا ثبوت دیا، تو انہوں نے بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت حاصل کرلی۔ اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا: ﴿وَلَقَدۡ عَفَا اللّٰهُ عَنۡهُمۡ﴾

اور دوسری چیز یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں حاصل ہوں، اس کی خوشنودی اور تقرب حاصل ہو، اور اس کے صلہ میں اُسے بلند درجہ نصیب ہو، فرمایا: ایسے شخص کا مقام رحمت ہے، اس لئے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہونے والوں کا صلہ مغفرت اور رحمت ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں تمام دنیا کی چیزوں سے اعلیٰ و بہتر ہیں۔ لوگ جتنی دولت، سرمایہ، عزّت و مال جتنی کثرت سے جمع کریں تو مغفرت ورحمت تک وہ نہیں پہنچ سکتے۔ ایک ادنیٰ مغفرت و رحمت دنیا اور اس کی نعمتوں سے بہتر وافضل ہے۔

تیسرا مقصد و مدعا یہ ہے کہ عبادت گزار کا نظریہ، یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے راضی ہوجائے، وہ یہی دعا کرتا ہے: اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسۡاَلُکَ رِضَاکَ. اے میرے پروردگار! میں تیری رضا وخوشنودی چاہتا ہوں، اور یہ سب سے بلند مقام ہے۔ ﴿وَرِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكۡبَرُ﴾ [التوبة: ۷۲] (اور اللہ کی طرف سے رضا بڑی چیز ہے)۔

﴿وَلَئِنۡ مُّتُّمۡ اَوۡ قُتِلۡتُمۡ لَاِلَى اللّٰهِ تُحۡشَرُوۡنَ﴾ اگر تم طبعی موت مرو، یا شہادت پاؤ، تو لامحالہ تم سب اللہ

تعالیٰ کے پاس اکٹھے کئے جاؤ گے، اور اپنے اچھے اعمال کا ثواب واجر، اور برے اعمال کی سزا وعقاب پاؤ گے۔ مؤمن کے لئے یہ موقع ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور مغفرتوں کو حاصل کرے، جہاد کے لئے گھر سے نکلے۔ رِبَاطُ یَوْمٍ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ خَیْرٌ مِنَ الدُّنْیَا وَ مَا فِیْهَا. یہ مقام بھی اس کے لئے ہے۔

حدیث میں ارشاد ہے کہ جہاد کے سفر کا گرد وغبار اور جہنم کا دھواں جمع نہیں ہوسکتے۔ جہاد کی راہ میں طبعی موت اتنی قیمتی ہے کہ تمام دنیوی نعمتیں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ باقی شہادت وہ تو ایک خاص نعمت ہے، جس کے حصول کے لئے انبیاء علیہم السلام جیسی ہستیوں نے بھی خواہش فرمائی ہیں۔ امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: وَدِدْتُ أَنِّی أُقْتَلُ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ أُحْیٰ ثُمَّ أُقْتَلُ ثُمَّ أُحْیٰ. بعض روایات میں عشر مرات کے الفاظ وارد ہیں۔ تو مسلمانوں سے کہا جارہا ہے کہ یہ خیال نہ کرو کہ زندہ رہنے میں تمہارا فائدہ ہے، جیسا کہ منافقین کا خیال ہے، بلکہ تمہاری کامیابی جہاد اور شہادت فی سبیل اللہ میں ہے۔ پس اسی کو حاصل کرو، اس سے کسی ادنیٰ چیز پر قناعت نہ کرو۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ
حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ
عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿١٥٩﴾ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ
يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١٦٠﴾

ترجمہ: پس اللہ تعالیٰ کی رحمت سے آپ ان کے لئے نرم خو ہیں، اور اگر آپ سخت مزاج اور تنگدل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے اردگرد سے پراگندہ ہوجاتے، پس ان کو معاف کردیں، اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگیں، اور ہر معاملے میں ان سے مشورہ کریں۔ پس جب آپ نے پختہ ارادہ کرلیا تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں، بیشک اللہ تعالیٰ بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ﴿۱۵۹﴾ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا پس تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا، اور اگر وہ تمہیں رسوا کردے تو کون ہے وہ جو اس کے سوا تمہاری مدد کرے؟ اور چاہئے کہ ایمان والے اللہ ہی پر بھروسہ کریں ﴿۱۶۰﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

ان آیات میں، مرشد ومربی اور مصلح ومبلغ اوّلاً وبالذات سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے، اور ثانیاً وبالتبع تمام مبلغین ومصلحین اُمت کے لئے چند اہم اور رہنما اصول بیان کئے گئے ہیں۔ اور یہ اصول اتنے اہم اور ضروری ہیں کہ جن کے قیام اور اپنانے سے معاشرہ اسلامی مستحکم اور منظم رہے گا، اور جماعتی پروگرام میں استحکام پیدا ہوجائے گا۔ دراصل یہ صفات دیگر عمومی اصول وقواعد کے خلاصہ اور بنیاد ہی ہیں:

☆ اوّل یہ کہ امیر اور مبلغ کے لئے ضروری ہے کہ وہ رحیم وکریم، نرم طبیعت وخوش اخلاق ہو۔

☆ دوم یہ کہ اس میں لطف وکرم اور عفوودرگزر کا مکمل مظاہرہ ہو۔

☆ سوم اس میں انتقام کا جذبہ قطعاً نہ ہو، بلکہ اس میں رواداری کی صفت ہو۔

☆ چہارم یہ کہ اپنے ماتحت لوگوں کا مکمل خیر خواہ ہو۔

☆ پنجم یہ کہ مکمل صبر وبرداشت کا پیکر ہو۔

☆ ششم اپنے ماتحت لوگوں کے لئے دعاء واستغفار کرنے والا ہو۔

☆ ہفتم یہ کہ حسنِ سلوک کرنے والا ہو۔

☆ ہشتم یہ کہ ضروری اور اہم امور میں عمومی مشورہ کا پابند ہو۔

☆ نہم یہ کہ اللہ تعالیٰ پر توکّل اور بھروسہ کرنے والا ہو۔

☆ دہم یہ کہ صاحبِ عزم وحوصلہ ہو۔

☆ یازدہم یہ کہ متواضع، منکسر المزاج ہو۔ ان تمام اوصاف کا تعلق اسی آیت کریمہ کے ساتھ مربوط ہے۔

آیت کریمہ کا مختصر خلاصہ وتعارف:

غزوۂ اُحد میں جان نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو غیر ارادی طور پر کوتاہیاں سرزد ہوئیں، اس پر مسلمانوں کو ان کی کوتاہیوں پر متنبہ فرمانے، اور معافی کا اعلان سنانے کے بعد نصیحت کی تھی کہ آئندہ اس مارِ آستین (منافقین کی جماعت کی باتوں سے فریب مت کھانا۔ اس آیت میں ان کے عفو تقصیر (یعنی غلطی کی معافی) کی تکمیل کی گئی ہے، چونکہ جنگ اُحد میں سخت خوفناک غلطی، اور زبردست کوتاہی مسلمانوں سے ہوئی تھی۔ شاید رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دل مبارک

خفا ہوا ہوگا، اور چاہا ہوگا کہ آئندہ ان سے مشورہ لے کر کام نہ کیا جائے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے عجیب پیرایہ (یعنی انداز) میں ان کی سفارش کی۔

اوّل اپنی طرف سے معافی کا اعلان کر دیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ اور رنج خالص اپنے پروردگار کے لئے ہوتا ہے۔ پھر فرمایا: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ﴾۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی رحمت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور ان پر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس قدر خوش اخلاق اور نرم خو بنا دیا۔ کوئی اور ہوتا تو خدا جانے ایسے سخت معاملہ میں کیا رویہ اختیار کرتا۔

یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی مہربانی ہے کہ تجھ جیسا شفیق نرم دل پیغمبر ان کو مل گیا۔ فرض کریں اگر خدانخواستہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دل سخت ہوتا، اور مزاج میں شدّت ہوتی تو یہ قوم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد کہاں جمع رہ سکتی تھی؟ ان سے کوئی غلطی ہوتی، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سخت پکڑتے تو شرم و دہشت کے مارے پاس بھی نہ آسکتے۔ اس طرح یہ لوگ بڑی سعادت اور خیر سے محروم رہ جاتے، اور جمعیت اسلامی کا شیرازہ بکھر جاتا۔ لیکن حق تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نرم دل اور نرم خو بنا دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصلاح کے ساتھ ان کی کوتاہیوں سے اغماض، یعنی چشم پوشی کرتے رہتے ہیں، سو یہ کوتاہی بھی جہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقوق کا تعلق ہے معاف کر دیجئے، اور گو اللہ تعالیٰ اپنا حق معاف کر چکا ہے، تاہم ان کی مزید دلجوئی اور تطییبِ خاطر کے لئے ہم سے بھی ان کے لئے معافی طلب کریں، تاکہ یہ شکستہ دل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشنودی اور انبساط محسوس کر کے بالکل مطمئن اور منشرح ہو جائیں۔

اور صرف معاف کر دینا ہی نہیں، آئندہ بدستور ان سے معاملات میں مشورہ لیا کریں، مشاورت کے بعد جب ایک بات طے ہو جائے اور پختہ ارادہ کر لیا جائے، پھر خدا تعالیٰ پر توکّل کر کے اس کو بلا پس و پیش کر گزرے۔ خدا تعالیٰ متوکّلین کو پسند کرتا ہے، اور ان کے کام بنا دیتا ہے۔ [تفسیر عثمانی]

مشورہ اور اس کے فوائد و برکات:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ [الآية] الْأَمْر کے معنی میں بہت توسع ہے۔ یہ تمام اقوال و افعال کے لئے عام ہے۔ قولہ تعالیٰ: ﴿وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ﴾ [ھود: ۱۲۳] (اور اسی کی طرف سارے معاملات لوٹائے جائیں گے) یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہے سب کاموں کا۔ تو اس کے معانی متعدد ہیں: مثلاً کام، شئے، حکم، معاملہ، حالت، حکومت وغیرہ۔

﴿اَلْمَشْوَرَۃ﴾ کسی کام کے فائدے ونقصان معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اس کام کے کرنے نہ کرنے پر لوگوں سے رائے لینے کا نام مشورہ ہے۔ اگر وہ کام دینی ہوتو مشورہ لینا بعض اوقات میں واجب ہے، اور بعض اوقات میں مستحب ہوتا ہے۔ پھراس کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم یہ ہے کہ مشورہ صرف انہی چیزوں میں مستحب ومسنون ہے جن کے متعلق قرآن وحدیث اوراجماع اُمت میں کوئی واضح قطعی حکم شرعی موجود نہ ہو، ورنہ جہاں کوئی قطعی اور واضح حکم شرعی موجود ہوتو اس میں کسی مشورے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ جائز بھی نہیں، جیسے نماز پڑھنے نہ پڑھنے کی بابت مشورہ، وعلیٰ ہذاالقیاس دوسرے امورِشرعیہ، عباداتِ مفروضہ وغیرہ۔

دوسری قسم وہ امورِشرعیہ ہیں جن کے متعلق کوئی شرعی حد مقرر نہ ہو، جیسے اسیرانِ بدر کے متعلق امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ اوررائے طلب کرنا، یا غزوۂ اُحد کے متعلق مشورہ کہ کفار کے ساتھ لڑائی مدینہ کے اندر ہو یا باہر کسی کھلے میدان میں۔

رہے دنیوی امور میں مشورہ، سو یہ قسم مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، یہ سلسلہ کلّی اور جزوی طور پر بڑے اور چھوٹے تمام امور میں شب وروز لوگوں میں جاری ہے، اور ہمیشہ لوگ اپنے ہر قسم کے معاملات میں اس پر عمل پیرا رہتے ہیں، جس کی افادیت واہمیت سب کے سامنے واضح اورعیاں ہے، اور جو لوگ اپنے معاملات میں مشورہ پرعمل کرتے ہیں وہ اکثر وبیشتر نقصانات سے محفوظ رہتے ہیں، اور بغیر مشورہ کام کرنے والوں کو اکثر نقصان ہی ہوتا ہے، اِلّا ماشاءاللہ۔ پھر دینی امور ہوں یا دنیوی ان میں یہ ضروری ہے کہ جن لوگوں سے مشورہ لیا جاتا ہو وہ ان صفات کے حامل ہوں: امین ہوں، خیرخواہ ہوں، صاحب رائے عقلمند ہوں، اور متقی پختہ کار تجربہ کار ہوں۔

اگر معاملہ شرعی ہے تو علماء وفقہاء ہوں، لالچی اور مفاد پرست نہ ہوں۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے: اِذَا کَانَ أُمَرَاءُ کُم خِیَارُکُم وأَغْنِیاءُ کُم سُمَحاءُ کُم و أُمُورُ کُم شُورَیٰ بَینَکُم فَظَهرُ الأَرضِ خَیرٌ لکُم مِنْ بَطْنِهَا وَ أَمَّا اِذَا کَانَ أُمَراءُ کُم شِرَارُ کُم و أَغْنِیاءُ کُم بُخَلاءُ کُم و أُمور کُم اِلَی نِسَاءِ کُم فَبطنُ الأَرضِ خَیرٌ لکُم مِنْ ظَهْرِهَا۔ یعنی تمہارے حکام جب تم میں سے بہترین آدمی ہوں، اور تمہارے مالدار سخی ہوں، اور تمہارے معاملات آپس کے مشوروں سے طے ہوا کریں، تو زمین کے اوپر رہنا تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور جب تمہارے حکام تم میں سے بدترین افراد ہوں، اور تمہارے مالدار بخیل ہوں، اور تمہارے معاملات عورتوں کے سپرد ہوں، تو زمین کے اندر دفن ہوجانا تمہارے زندہ رہنے سے بہتر ہوگا۔ [مشکوٰۃ]

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی کام کا ارادہ کرے، اور باہم مشورہ کرنے کے بعد اس کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو صحیح اور مفید صورت کی طرف ہدایت مل جاتی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کے بعد اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کا حکم صراحۃً قرآن میں نازل نہیں ہوا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس کے متعلق کوئی ارشاد ہم نے نہ سنا ہو، تو ہم کیا کریں؟ آنحضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایسے کام کے لئے اپنے لوگوں میں سے عبادت گزار متقی فقہاء کو جمع کرو، اور ان کے مشورہ سے اس کا فیصلہ کرو، کسی کی تنہا رائے سے فیصلہ نہ کرو۔ [مجمع الزوائد]

سورۃ شوریٰ جس میں سچے مسلمانوں کی صفات بیان کرتے ہوئے ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے: ﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ [الشوریٰ:۳۸] یعنی اور ان کا کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت کریمہ میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاحبِ وحی ہوتے ہوئے اکثر اوقات میں غیر منصوص معاملات میں تعلیم اور تربیت اُمت اور ان کی رہنمائی کی خاطر، اور ان کی دلجوئی کی خاطر مشورہ لیتے رہے ہیں۔ اور یہ مشورہ اطمینانِ قلب، اور ہر قسم کی پریشانیوں سے بچنے کی خاطر نہایت اہم ہے، اور یہ ہرگز نبوت ورسالت کے منافی نہیں ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی حیاتِ طیبہ میں ہمیشہ اس پر قائم رہے، اور خاص کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے ہر چھوٹے بڑے معاملات میں مشورہ لیتے، اور دیتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دونوں رفیقین وزیرین صدیق اکبر وفاروق اعظم رضی اللہ عنہما سے فرمایا: لَوِ اجْتَمَعْتُمَا فِي مَشْوَرَةٍ مَا خَالَفْتُكُمَا. [ابن کثیر] اگر تم دونوں کسی بات پر متفق ہو جاؤ، تو میں تم دونوں کی تائید کر کے تمہاری مخالفت نہیں کرتا ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر پابندر ہے، کہ انہوں نے بغیر مشورہ کے کوئی کام نہ کیا، خصوصاً حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے ہر دینی معاملہ میں اصحابِ علم ومعرفت، واصحابِ بدر وحدیبیہ، اور عشرہ مبشرہ رِضْوَانُ اللهِ عَلَيهِم أجمَعِين سے مشورہ لے کر جہادی اقدام کئے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ ایک مجلس مشاورت قائم کی تھی، جس کے ممبر عشرہ مبشرہ، اور دوسرے اصحابِ عقل ورائے جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما صغرسنی کے باوجود اس مجلس کے

ممبر تھے۔ اس کے علاوہ امیر المؤمنین بہت سے امور میں حضرت عائشہ، حضرت اُمّ سلمہ اور حضرت اسماء بنت عمیس اور دیگر صحابیات رضوان اللہ علیہن سے مشورہ لیتے رہتے تھے۔

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ پس اللہ تعالیٰ ہی کی عظیم الشان رحمت (جوتم پر اور تمہاری اُمت پر ہے) کی وجہ سے تم مؤمنوں کے حق میں نرم دل ہوئے، اور باوجودیکہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے خلاف کیا، پھر بھی ان کی تکلیف پر اللہ تعالیٰ کی توفیق، اور خداداد قلبی وجدان کے زیر اثر رنجیدہ ہوتے ہو، تمہاری یہ نرمی قلب باعثِ رحمت اس وجہ سے ہے کہ:

﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ﴾ اگر تم درشت رُو، زشت خو اور سخت دل ہوتے ﴿لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ تو وہ تمہارے آس پاس سے بچھڑ جاتے، اور دائرۂ اسلام سے نکل جاتے، اور جنت کے استحقاق سے محروم ہوجاتے، اور متبعین کی تعداد کم ہونے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اجر کم ہوجاتا۔ پس ان کو معاف کریں، ان پر جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حق ہے اس سے درگزر کریں، اور اللہ تعالیٰ کے جو حقوق ان کے ذمہ ہیں، اور یہ ادا نہیں کرسکے ہیں ان کے لئے ان حقوق کی معافی کی اللہ تعالیٰ سے دعاء کریں، اور معافی مانگیں۔

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ اور جنگ کا معاملہ یا کوئی اور معاملہ، بہر حال جن چیزوں کا تعلق مشورہ سے ہو، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو کوئی خاص ہدایت نہ ملی ہو، تو ان سے مشورہ کریں، اور ان کی رائے طلب کریں، تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے مشورے سے قوت حاصل ہو، اور ان کی حوصلہ افزائی ہو۔ (سبحان اللہ! کیا پیارا مشورہ اور ہمت افزائی کا پیغام ہے؟ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے عظیم دلجوئی ہے؟)۔

اور آئندہ اُمت کے لئے ایک ابدی زندہ دستور العمل ہو کہ وہ اپنے دینی اور دنیوی معاملات کو آپس کے مشوروں سے طے کرلیا کریں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ لوگوں سے مشورہ لینے والا میں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا۔ [مظہری]

﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ پھر جب مشورہ کے بعد تمہارا ارادہ محکم اور پختہ ہوجائے، تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں۔ یعنی اپنا معاملہ سب اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں، اور اس پر اعتماد رکھیں۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہی عادت مبارکہ تھی، جوکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متوکلین کے سردار پیشوا تھے۔ اسی وجہ سے وہ جب اُحد کے دن جنگ کے ارادہ سے گھر سے باہر تشریف لائے، اور لوگ پشیمان ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میدان میں جانے سے روکنے کی کوشش کی، تو

آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ کسی نبی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ جب اس نے زرہ پہن لی ہو تو بغیر جنگ کئے اُسے اتار دے۔

توکّل کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دی جائے، اور اسی سے درخواست کی جائے کہ ہر چیز کا نتیجہ بہتر ثابت ہو، اور اللہ تعالیٰ پر حسنِ ظن رکھ کر ہر قسم کی بداعتمادی سے پرہیز کیا جائے۔ بعض لوگ ترکِ اسباب کو توکّل سے تعبیر کرتے ہیں، جو کہ صحیح نہیں ہے۔ توکّل کے معنی یہ ہیں کہ: تمام اسباب اور وسائل کو بروئے کار لا کر نتیجہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا جائے، اور اسباب پر اعتماد نہ کیا جائے، بلکہ مُسبِّب الاسباب پر اعتماد ہو۔

گفت پیغمبر بآواز بلند ☆ بر توکّل زانوے اشتر بہ بند

اونٹ کے زانوں باندھو، دکان اور گودام کو تالا لگا دو، پس اللہ تعالیٰ پر توکّل کر کے روانہ ہو جاؤ۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، اور انہیں اچھا صلہ عنایت کرتا ہے، اور ان کی دستگیری و نصرت کا فیصلہ کرتا ہے۔ جب توکّل کرنے والا شخص اللہ تعالیٰ کا محبوب و پسندیدہ ہوا تو اسے کون نقصان پہنچا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ ارشاد فرمایا: ﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ﴾ [الطلاق: ۳] حدیث قدسی میں ارشاد ہے: أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي. میں اپنے بندے کے گمان وعقیدہ کے پاس ہوں، میرا بندہ جیسا میرے متعلق اچھا یا برا گمان کرتا ہے، میں ویسا ہی اس کے ساتھ سلوک کرتا ہوں، کتنی بڑی قیمتی بات ہے۔

﴿إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ﴾ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے توکّل کی بنیاد پر تمہاری مدد کرے، تو پھر کوئی تم پر غلبہ پانے والا نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا مدد یافتہ کسی سے مغلوب نہیں ہوتا، ورنہ العیاذ باللہ، اللہ تعالیٰ شانہ کا عاجز اور کمزور ہونا لازم آئے گا، جو قطعاً محال ہے۔

﴿وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ﴾ اور اگر وہ تم کو بے یار و مددگار چھوڑ دے تو کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ اگر سارا جہاں مل کر تمہاری مدد کے لئے آئے، پھر بھی تمہاری مدد اور نجات نہیں ہو سکتی، خوب سمجھو! جب پورا جہاں تمہاری مدد سے عاجز و کمزور رہے گا، تو چاہئے کہ تم جہاں والوں پر بھروسہ چھوڑ دو، اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ جماؤ۔ فرمایا: ﴿وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾ صرف اللہ تعالیٰ پر ہی مومنوں کو توکّل کرنا چاہئے، کیونکہ اہلِ ایمان خوب جانتے ہیں کہ غیر اللہ پر اعتماد کرنا حرام ہے۔

خویش را دیدیم و رسوائی خویش ☆ امتحان ما مکن اے شاہ بیش [مثنوی]

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ
مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۱۶۱ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ
مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۶۲ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۶۳

ترجمہ: اور کسی نبی کی شان نہیں کہ خیانت کرے، اور جو کوئی خیانت کرے گا اس چیز کو قیامت کے دن لائے گا جو خیانت کی تھی، پھر ہر کوئی پورا پالے گا جو اس نے کمایا تھا، اور وہ ظلم نہیں کئے جائیں گے ۝۱۶۱ آیا وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا تابع ہے اس کے برابر ہوسکتا ہے جو غضبِ الٰہی کا مستحق ہو، اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے؟ اور وہ بہت بری جگہ ہے ۝۱۶۲ اللہ تعالیٰ کے ہاں لوگوں کے مختلف درجے ہیں، اور اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں ۝۱۶۳

معارف ومنازل

گزشتہ آیت میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے ساتھ نرمی اور خوش اخلاقی، نیز عفو و درگزر کا حکم دیا گیا، اب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سمجھایا جارہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نرمی، تواضع اور خوش اخلاقی کا یہ مطلب نہیں کہ تمہارے دلوں میں ان کے ادب واحترام میں کمی آجائے، یا یہ کہ شیطانی وسوسے اور منافقین کی باتوں سے متاثر ہوکر کوئی یہ گمان کرے کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بظاہر ہم سب کو تو معاف کردیا، مگر دل میں ناراضگی اور غصہ پوشیدہ طور پر چھپایا ہو (یعنی غلول بمعنی چھپانے کے)۔

آیت کریمہ میں اس کی وضاحت کی گئی کہ ایسا ہرگز ممکن نہیں، اور معصوم نبی کی شان کے یہ سراسر خلاف ہے۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم زبان سے کچھ کہیں، اور دل میں کچھ اور چھپائیں، تو ایسا ہرگز ممکن نہیں۔

یا اس طرح کہا جائے کہ غزوۂ بدر میں ایک چیز (تلوار یا چادر) مال غنیمت میں گم ہوگئی تھی، کسی نے کہا شاید سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے واسطے رکھی ہوگی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یا یہ بات ہو کہ غلول کے معنی خیانت بھی تو ہے، جب سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مال غنیمت مجاہدین میں تقسیم فرمایا، تو ظاہر ہے کہ سارے مال ایک جیسے نہیں ہوتے، ان میں اصلی اور اعلیٰ بھی ہوتا ہے، اور معمولی بھی، جیسے آیت میں مذکور ہے دَرَجٰتٌ، پس کچھ لوگوں نے غیر اختیاری طور پر کہا ہو، یا کسی کے دل میں بطور وسوسہ یہ آیا ہو کہ تقسیم غنیمت میں (العیاذ باللہ!) خیانت ہوگئی، اس پر یہ آیت اتری۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی منقول ہے کہ بعض لوگوں کو شاید ایسا خیال پیدا ہوا ہو۔ (واللہ اعلم)۔

بعض علماء نے یہ معنی بتائے کہ غلول بمعنی چھپانے کے، کہ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کسی حکم کو چھپالے، اور اُمت تک اُسے نہ پہنچائے۔ یہی روایت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے صحیحین میں منقول ہے۔ اور یہ بھی علماء نے کہا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق آیت کا یہ مطلب ہوگا کہ نبی کی ذات ایسی نہیں کہ ان کے پاس والے (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) ان کی خیانت کریں۔

پس یہاں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ کی بھی مدح ہوگی۔ اس وقت صیغہ مضارع (اَنْ یُّغَلَّ) کو مجہول قرار دیا جائے، جیسے کہ بعض قراءتوں میں ہے۔ [ابن کثیر]

خلاصہ:

مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر سارے انبیاء علیہم السلام تمام صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے معصوم اور پاک ہیں۔ مرتبۂ نبوت اتنا عظیم اور پیغمبرانہ اخلاق اتنے اونچے اور بلند ہوتے ہیں جہاں نورانی فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے۔

یہ دنیادار مشرک یہود و نصاریٰ اور ہمارے عوام الناس عقل کے یتیم فہم و فراست سے تہی دامن لوگ نبوت کے منصب عالی کو کیا سمجھتے ہیں؟ خاص کر ہمارے زمانے کے یورپی کلمہ پڑھنے والے، نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ، ڈگریوں میں پھلنے پھولنے والے لیڈر اور قومی نمائندے، جنہیں دعائے قنوت تو چھوڑیئے کلمہ تک، یا اس کا مفہوم یاد نہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

انہوں نے دین کیا سیکھا ہے جا کر شیخ کے گھر میں ☆ پلے کالج کے چکر میں، مرے صاحب کے دفتر میں

[اکبر رحمۃ اللہ علیہ]

قیامت کی رسوائی نہایت خطرناک اور تباہ کن ہے:

لفظ غُلول مطلق خیانت کے معنی میں مستعمل ہے، اور خاص کر مال غنیمت کی خیانت کے لئے بھی (اکثر عمومی اموال، جس میں بہت سے لوگوں کا حق مشترک ہو) اور مالِ غنیمت اور دیگر مشترک اموال، جیسے تنظیموں اور سکولوں، مدارس، اداروں وغیرہ کے فنڈ، جو عوامی چندوں اور عام لوگوں کے تعاون سے اداروں کے لئے اکٹھے کئے جاتے ہیں۔ پس اس طرح کے اموال میں چوری اور خیانت کا جرم عام چوریوں اور خیانتوں سے نہایت سخت اور

ہلاکت آفرین ہے، کیونکہ ان عمومی مشترک اموال میں ایک پوری آبادی جم غفیر لوگوں کا حق ہوتا ہے۔ تو جس نے ایسے اموال میں چوری یا خیانت کی، تو یقین جانئے کہ اس نے ہزاروں اور لاکھوں لوگوں کی چوری اور خیانت کی۔ اگر اس کو بالفرض تلافی اور ادائیگی کا خیال پیدا ہو جائے، تو بہت ہی مشکل، اور نا قابلِ عمل ہو گا۔

یہ کیسے لاکھوں انسانوں کا حق پہنچائے گا، یا ادا کر سکے گا، یہ کسی کے بس میں نہیں ہو گا، یا کیسے معاف کرائے گا۔ اور اس کی صورت کیا ہو گی سوائے آخرت کی تباہی کے۔ بخلاف دوسرے شخصی حقوق کے، کہ وہاں مال اور حق کا مالک معلوم اور متعین ہے۔ اگر کسی وقت اللہ تعالیٰ نے توبہ کی توفیق عنایت فرمائی تو حقدار کو ادئیگی کرنا یا اس سے معاف کرانا آسان ہو گا۔

یہی وجہ ہے کہ ایک غزوہ میں ایک شخص نے اونٹ کے اون (پشم) کا ایک قطعہ چھپا کر اپنے سامان میں رکھا تھا، مالِ غنیمت تقسیم ہونے کے بعد اس کو خیال آیا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر یہ ٹکڑا اون کا پیش کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم باجود ﴿رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ہونے کے، اور اُمت پر ماں باپ سے زیادہ مہربان و شفیق ہونے کے اس شخص کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں اب اس کو کس طرح سارے لشکر میں تقسیم کروں؟ اب تو قیامت کے روز ہی تم اس کو لے کر حاضر ہو جاؤ گے۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جلیل القدر صحابی حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر اسے ایک مشن پر امیر بنانا چاہا، اور فرمایا کہ تم فلاں علاقہ میں جاؤ، وہاں کے اموال جمع کر کے لاؤ، کہنے لگے: یا رسول اللہ! اس میں میری رضامندی کو دخل ہے یا نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! کہنے لگے: یا رسول اللہ! میری معذرت قبول فرمایئے، اس سے مجھے بچایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے، اور اس کے لئے دعاء فرمائی۔

یہ عظیم شخص جانتے تھے کہ یہ طرح طرح کے اموال جب میرے ہاتھ میں آئیں گے، تو میرے لئے مصیبت بنیں گے، میں کس طرح فارغ الذمہ بن کر جان چھڑا سکتا ہوں، اس لئے معذرت کر لی، اسی صحابی کو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے دمشق شام کا گورنر بنانا چاہا، تو انہوں نے معذرت کی، اور امیر المؤمنین سے کہا مجھے براہِ کرم جہنم سے بچایئں۔ رضی اللہ عنہ۔

اسی لئے غلول (مال غنیمت) اور دیگر مشترک عمومی اموال کی چوری کا جرم نہایت سخت ہے، کیونکہ میدانِ محشر میں جہاں ساری خلقت جمع ہو گی، سب کے سامنے اس کو اس طرح رسوا اور بے عزت کیا جائے گا کہ جو مال چوری کیا

تھا، یا خیانت کی تھی، وہ سارا کا سارا مال، خواہ وہ اونٹ ہوں، یا ہزاروں گاڑیاں ہوں، یا لاکھوں چینی اور گندم کی بوریاں ہوں، یہ سارا اس کی گردن پر لدا ہوا (رکھا ہوا) ہوگا۔ اگر کوئی زمین یا بنگلہ یا پلاٹ ہوتو اسے باقی زمینوں سے الگ کٹوا کر ساتوں زمینوں کو سوراخ کر کے فرشتے طوق کی طرح اس کے گلے میں ڈالیں گے۔ یہ روایت صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور سعید بن زید بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

اسی طرح صحیحین میں بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو، ایسا نہ ہو کہ قیامت میں تم میں سے کسی کو اس طرح دیکھوں کہ اس کی گردن پر ایک اونٹ لدا ہوا ہو، اور یہ اعلان ہوتا ہو کہ اس نے مالِ غنیمت کا اونٹ چرایا تھا، وہ شخص اگر مجھ سے شفاعت کا طالب ہوگا تو میں اس کو صاف جواب دیدوں گا کہ میں نے دنیا میں حکمِ الٰہی پہنچایا تھا، اور تمہیں خبردار کیا تھا، اب میں تیرے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ اور اسی مضمون کی بکثرت احادیث کتب وحدیث وکتبِ تفاسیر میں صحیح سندوں کے ساتھ مذکور ہیں فلیراجع۔

اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، اور اپنے متقی دیندار بندوں کی حفاظت فرمائے۔ یہ میدان محشر کی رسوائی ایسی خطرناک وتباہ کن ہوگی کہ بعض روایات میں ہے کہ جن کے ساتھ یہ معاملہ ہوگا وہ تمنا کریں گے کہ ہمیں جلدی جہنم بھیج دیا جائے، تاکہ اس رسوائی سے بچ جائیں، حالانکہ انہیں جہنم کے عذاب کا پورا علم ہے، کہ وہ نہایت سخت اور ناقابلِ برداشت ہے۔

ملکی بیت المال، سرکاری خزانہ، ملک اور حکومت میں چوری وخیانت کا بیان:

یہی حال مساجد، مدارس، تعلیمی ادارے، خانقاہوں، محکمہ اوقاف، ملکی ادارے، اور مختلف وزارتوں کے عمومی فنڈ، ترقیاتی فنڈ وغیرہ اموال کا ہے، جن میں ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کے چندہ اور حقوق ہوتے ہیں۔ اگر کوئی چوری اور خیانت کرنے والا معاف بھی کرائے، تو کس کس کے معاف کرائے؟ اسی طرح حکومت کے سرکاری خزانے (بیت المال) کا حکم ہے، کیونکہ اس میں پورے ملک کے باشندوں اور عوام کا حق ہے۔ جو کوئی اس میں چوری یا خیانت کرے گا گویا اس نے سب کی چوری اور خیانت کی۔

مگر چونکہ یہ اموال عموماً ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی خاص شخص مالک نہیں ہوتا، نگرانی کرنے والے لاپرواہی کرتے ہیں، کرپشن، چوری کے مواقع بکثرت ہوتے ہیں، اور محاسبہ کا عمل سرے سے ہوتا ہی نہیں، یا ہوتا ہے مگر برائے نام، بسا اوقات محاسب خود بھی اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں، یا رشوت لے کر چشم پوشی کرتے ہیں، یا بڑی مچھلیاں ماتحت لوگوں سے کچھ مقرر حصہ کے خواہاں ہوتے ہیں، اور یہ لوگ چوری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور اس قسم کے

ہتھکنڈے اور قوانین وضع کرتے ہیں کہ لوگ تو کیا، ابلیس بھی کفِ افسوس مل کر ایک طرف بیٹھ کر پریشان ہو جاتا ہے۔

غرض یہ کہ آج کل باقی دنیا میں عموماً، اور مسلمان ممالک میں خصوصاً سب سے زیادہ چوری اور خیانت انہی اموال میں ہوتی ہے، اور لوگ اس کے انجامِ بد، اور عظیم وبال سے بالکل غافل ہیں، کہ اس جرم کی سزا علاوہ عذابِ جہنم کے میدانِ محشر کی رسوائی بھی ہے، اور عذابِ قبر اس کا پہلا ہدف ہوگا۔

تیسرے درجے میں روزِ محشر شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکت شفاعت سے محرومی اس کے علاوہ ہوگی۔

چوتھے درجے میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ، اور دیگر قریب وعزیزوں کو جہنم کی خوراک مال حرام کھلا کھلا کر انہیں جہنم کے عذاب کے لئے تیار کرنا ہے۔ یہ کتنی بڑی حماقت ہوگی؟ حدیث میں ارشاد ہے: لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ جَسَدٌ غُذِیَ بِالْحَرَامِ. جس شخص کی پرورش حرام سے ہو وہ جنت سے محروم ہوگا۔

چھٹے درجے میں دیکھا جائے تو ایسے لوگوں کی نمازیں، صوم، زکوٰۃ، حج، قربانی، صدقات ودیگر تمام طاعات ضائع اور بے مقصد ہو جاتی ہیں۔ اور بقول بعض علماء وصلحاء ایسے لوگوں کو خاتمہ بالخیر بھی شاید نصیب نہ ہو، کیونکہ یہ لوگ صرف عوام کے چور و مجرم نہیں، یہ اللہ تعالیٰ اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حکموں اور شریعت اسلامیہ کے باغی اور مجرم ہیں۔ وَمَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغ.

واقعۂ عبرت:

جو لوگ ملکی خزانے کو شیرِ مادر سمجھ کر خوب لوٹتے اور کھاتے ہیں، وہ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں۔ یہ شخص (مدعم) شہید ہے، صحابی رضی اللہ عنہ ہیں، اور خادم رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ غزوہ خیبر سے واپسی پر شہید ہوتے ہیں۔ ان کا قصور صرف یہ ہے کہ مال غنیمت کی تقسیم سے قبل مال مشترک سے ایک پھٹی پرانی سرخ چادر، جس کی قیمت تین درہم ہے، بلا اجازت اٹھا لیتے ہیں۔ شہادت کے بعد اس کا جنازہ رکھا جاتا ہے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اُسے شہادت پر مبارکباد پیش کر رہے ہیں۔ شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کر رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں: یہ دوزخی ہے، میں اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھتا، اس نے ایک چادر چوری کی ہے، میں اُسے جہنم میں دیکھ رہا ہوں۔ اِنَّ الشَّمْلَةَ الَّتِی أَخَذَهَا یَوْمَ خَیْبَرَ لَتَشْعَلُ عَلَیْهِ نَاراً. وہ چھوٹی چادر جو اس نے خیبر کی جنگ میں مال غنیمت سے اٹھالی ہے، وہ اس کے اوپر آگ بن کر بھڑک رہی ہے۔

یہ بات سن کر ایک شخص ایک یا دو تسمے لے کر آیا، اور خدمت گرامی میں پیش کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یہ بھی آگ کے ہیں، اگر یہ داخل نہ کئے جاتے تو مرنے کے بعد تمہارے اوپر آگ بن جاتے۔ [بخاری، معالم، مظہری، روح]

حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ خیبر کے دن ایک شخص کا انتقال ہوگیا، لوگوں نے اس کا ذکر حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنے ساتھی کی نماز پڑھو۔ یہ سن کر لوگوں کے رنگ فق ہوگئے۔ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے ساتھی نے مال غنیمت میں خیانت کی ہے، ہم نے اس کا سامان کھول کر دیکھا تو اس میں یہودیوں سے لوٹے ہوئے کچھ نقلی موتی (پوتھ) ملے، جو دو درہم قیمت کے تھے۔ [مظہری بحوالہ موطا ونسائی]

حضرت عدی بن عمیرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہم نے تم میں سے جس کسی کو کسی کام پر مقرر کیا، اور اس نے ہم سے ایک سوئی یا اس سے زیادہ کوئی چیز چھپالی، تو یہ چوری ہوگی جس کو ساتھ لے کر قیامت کے دن اس کو لانا ہوگا۔ [مظہری، مسلم]

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے فرمایا: امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے سامان پر ایک شخص مقرر تھا، اس کا نام کرکرہ تھا، اور وہ مرگیا، تو امام الہدیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ دوزخ میں ہے۔ لوگ اس کا سامان دیکھنے گئے تو اس میں ایک عبا ملا، جس کی اس نے خیانت کی تھی۔ [بخاری]

حضرت عمر فاروق، حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرۃ، حضرت ابو مالک اشعری، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت سعد بن عبادہ، حضرت ابن مسعود، حضرت عبادہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی اسی طرح کی احادیث منقول ہیں۔ [قرطبی، ابن کثیر، مظہری وغیرہ]

فائدہ:

ان متعدد احادیث میں جو مذکور ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کا اونٹ چوری کرے گا، یا کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ کرے گا، تو اس اونٹ یا بہت سے اونٹوں کو اپنی گردن پر اٹھا کر لائے گا، یا زمین کا وہ قطعہ ساتوں زمین نیچے تک اس کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا، جو اسے کھینچتا ہوا میدان محشر میں لائے گا۔ بعض لوگوں نے اس پر اشکال پیش کیا ہے کہ زمین جیسی بڑی چیز، یا مثلاً سو اونٹ ایک آدمی کیسے اٹھا کر لائے گا؟

اس ضمن میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسی باتیں مغربی ذہن کے

انگریزی خواں لوگ پیش کرتے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہی سوال کسی صحابی نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز کفار کے جسم اتنے بڑے بڑے ہو جائیں گے کہ ان کی ایک داڑھ اُحد پہاڑ کے برابر ہوگی، اور ان کے بیٹھنے کی جگہ مدینہ سے ربذہ تک یعنی چھتیس (۳۶) میل لمبی چوڑی ہوگی، تو اتنے بڑے جسم کے لئے سو اونٹ یا کوئی زمین جیسی بڑی چیز اٹھانا کیا مشکل ہوگا؟

اس کے علاوہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اٹھائی جانے والی چیز حقیقی نہ ہو، بلکہ مثالی ہو، اونٹ سو ہوں یا ہزار مثالی رنگ میں پیش کرنا کونسا مشکل ہے؟

دراصل قیامت کے معاملات کو دنیوی چیزوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ ساتھ یہ بھی کہ ربّ العزّت ہر چیز پر قادر ہے، تو کیا ضروری ہے کہ ہر بات ہماری ناقص عقول کے مطابق ہو۔ پھر کیا ایزدی قدرتیں جنہیں رات دن ہم دیکھتے اور مشاہدہ کررہے ہیں، ہماری عقول نے ان کا احاطہ کیا ہوا ہے؟ یا ہم انہیں جان چکے ہیں؟ اس طرح لاکھوں چیزیں ہمارے مشاہدہ میں ہیں، جنہیں آج تک نہیں سمجھ سکے ہیں۔ واللہ اعلم

فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَھُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ [الآیۃ] یہ بات کسی نبی کے لائق اور شایانِ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے، یا کسی چیز کو چھپائے۔ ایک معصوم ہستی سے گناہ ہو ہی نہیں سکتا، اور جو کوئی خیانت کا ارتکاب کرے گا، وہ خیانت شدہ چیز کو قیامت کے دن اپنے ساتھ لے کر آئے گا۔ پھر اس کی رسوائی ہوگی، اور یہ رسوائی مجرموں کے مقدر میں ہے، نہ کہ معصوم اور پاکیزہ ہستیوں کے۔ پھر ہر نفس کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور نبی کا عمل اتنا اہم اور مقبول ہوگا کہ اس کا اکیلا عمل پوری اُمت کے اعمالِ صالحہ پر بھاری ہوگا، اور کسی پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوگی۔

﴿اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَاۗءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ کیا وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا طالب ہے، اس شخص کی مانند ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی لے کر لوٹا ہے۔ یعنی کفر و شرک اور سارے معاصی میں لگا رہا، وہ ہرگز متقی، موحّد، پرہیزگاروں کے ساتھ برابر تو درکنار، وہ مجرم شخص نیکیوں سے اتنا دور ہوگا کہ ان کے غبار تک کا برابر نہیں ہوسکتا۔ اور ایسے مجرم کا ٹھکانا جہنم ہوگا، جو کہ بہت بری جگہ ہے، اور مسلمانوں کی جگہ جنت ہی ہوگی، جو کہ بہت بہترین جگہ ہے۔

﴿هُمْ دَرَجٰتٌ﴾ نیک لوگ اور نیکیوں کے درجات الگ اور مختلف ہیں۔ اسی طرح برے لوگ اور برائیوں

کے درجات بھی مختلف ہیں۔ پس ہر شخص اپنے درجے میں ہوگا، اور یہی قانون مجازات کا تقاضا ہے۔ سارے جنتی ایک جیسے نہیں ہوں گے، اور سارے دوزخی بھی ایک جیسے نہیں ہوں گے۔ ہر ایک طبقہ کا درجہ الگ ہوگا۔ اصحاب الیمین الگ ہوں گے، اصحاب الشمال الگ ہوں گے۔ ﴿وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾ [یس: ۵۹] (الگ ہو جاؤ، اے مجرمو!) کا منظر ہوگا۔

دنیا میں ایک ملک، ایک شہر، ایک محلہ، ایک معاشرہ میں مخلوط رہے، یہ دار العمل کا میدان تھا، جبکہ آخرت دار الجزاء کا گہوارہ ہوگا یہ رِضْوَانُ اللہ کے طالبین کے لئے۔ اور ابدی حبس و سزا کا مظہر ہوگا سَخَطُ اللہ والوں کے لئے۔ پھر جنتیوں کے درجات جنت میں بھی مختلف ہوں گے، اور دوزخیوں کے درجات جہنم میں بھی مختلف ہوں گے۔ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ الْجَنَّةَ بِفَضْلِکَ وَ نَعُوْذُبِکَ مِنْ جَھَنَّمَ وَ مَا قَرَّبَ اِلَیْھَا مِنْ قَوْلٍ وَّ عَمَلٍ. آمین

❀ ❀ ❀

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ
وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

ترجمہ: تحقیق اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے اندر انہی میں سے ایک رسول بھیجا ہے، وہ ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، اور ان کا تزکیہ کرتا ہے، اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، اور بیشک اس سے پہلے یہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے ﴿۱۶۴﴾

معارف ومنازل

ربط:

مالِ غنیمت میں خیانت کسی طالبِ دنیا کے لئے شاید ممکن ہو، مگر جس کی صفت خاصہ ترکِ دنیا ہو، اس کے لئے یہ کام ممکن ہی نہیں۔ اسی طرح جس کی صفت تعلیم وتربیت اور تزکیہ نفوس ہو، وہ کیسے حبِ دنیا کی نجاستوں کے ساتھ مخلوط ہو سکتا ہے؟ پھر جس کا وجود سراسر رحمت ہو، اس کے لئے ایسے نامناسب کام فضول شمار ہوں گے۔ اگر کسی وقت مکہ کے امراء و سردار کسی کو ڈھیروں برابر مال کی پیش کش کر چکے ہوں، اور وہ اپنے استغناء وحق پرستی کی بنیاد پر اُسے ٹھکرا دیا ہو، ایسی ہستی کے لئے عقلاً ممکن نہیں کہ وہ کسی ادنیٰ مال کے لئے اپنی عفت وشرافت پر سودا بازی کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ساری کائنات کلاً وجزءاً، حقیقۃً ومعنیً اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، اور اس کی تخلیق صرف انسانوں کے لئے ہے، جس کی تشریح جا بجا قرآن کریم میں ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، جس کے متعلق ارشاد ہے: ﴿وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا﴾ [ابراھیم: ۳۴] (اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو، تو نہیں گن سکتے) مگر کائنات اپنی وسعتوں اور عظمتوں کے باوجود انسان کے لئے مادی نعمت ہے، ضرورت اس کی ہے کہ جب انسان کی پیدائش اللہ تعالیٰ کی معرفت وتوحید کے لئے ہو، تو ایک ایسی روحانی نعمت جو کہ کائنات کا ہم پلّہ یا اس سے بھی وسیع وجامع ہو، نہایت ضروری ہے۔

پس وہ نعمتِ عظمیٰ، اور رحمتِ ایزدی صرف حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی، اور فیض سبحانی، اور رحمتِ الٰہی ہی ہے، جن کی قدر ومنزلت، منصب وشرافت پوری کائنات پر مکمل جاری ومحیط ہے، بلکہ جس کے وجودِ مسعود تخلیقِ کائنات کے لئے علّت غائی اور سببِ حقیقی ہے، بمصداقِ حدیث: لَولَاکَ لَمَا خَلقتُ الأفلَاکَ۔ یہ حدیث اپنے مفہوم ومعنی، اور مقصد کے اعتبار سے مسلم وثابت ہے، گو اس کے الفاظ وعبارت ثابت نہیں۔ واللہ اعلم

اسی بنیاد پر علامہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کائنات مختلف مرکب اجسام کا نام ہے، اور ہر جسم بغیر روح کے مردہ ہوتا ہے، سو سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود، باجودِ مسعود کائنات کی حقیقی روح وحقیقت ہے، تب ہی تو تخلیقِ آدم علیہ السلام سے ہزاروں سال قبل تخلیقِ کائنات کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ہوئی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور جگمگا تا رہا، جیسے فرمایا: أوّلُ مَا خَلقَ اللهُ نُورِی. (روحی)۔ اور ارشاد فرمایا: کُنتُ نَبِیاً وَ آدمُ فِی طِینَتِه. [درمنثور]

اس آیت کی تفسیر پہلے اور دوسرے پارے میں گزر چکی ہے۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی صفت کا یہ بیان ہے: ﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ﴾ [الأنبياء: ۱۰۷] (اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر مخلوقات کے لئے رحمت بنا کر) چونکہ ساری کائنات کے لئے رحمت بن کر مبعوث ہوئے، یہی عمومی صفت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب قرآن حکیم کی بھی ہے، جو کہ ﴿هُدًى لِّلۡعٰلَمِيۡنَ اور هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بھی اسی صفتِ عمومی کے ساتھ موصوف ہے۔ ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىۡ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلۡعٰلَمِيۡنَ﴾ [آل عمران: ۹۶] (بیشک وہ پہلا گھر جس کو لوگوں کے لئے رکھا گیا ہے مکہ میں، برکت والا، اور ہدایت کا ذریعہ مخلوق کیلئے)۔

تو یہاں ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ میں صرف مؤمنین کی تخصیص اس مقصد کے لئے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے صرف یہی لوگ مستفیض ہوئے، اور ابدی سعادت حاصل کی، جبکہ اُمتِ دعوت و دیگر اقوام محروم رہیں۔ اسی طرح قرآن حکیم اور کعبۃ اللہ سے فائدہ و ہدایت بھی مؤمنین نے حاصل کی۔ پس بجا طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شانہ کی ننانوے صفات (اسماء حسنیٰ) کا تعلق اگرچہ پوری کائنات کے ساتھ ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفتِ ولایت صرف مسلمانوں کو حاصل ہے۔ فرمایا: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ [البقرة: ۲۵۷] (اللہ کارساز ہے ان لوگوں کا جنہوں نے ایمان لایا ہے)۔ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾۔ [محمد: ۱۱] (اور یہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کارساز ہے ان لوگوں کا جنہوں نے ایمان لایا ہے)۔ اسی طرح ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ﴾ [الصف: ۴] (بیشک اللہ پسند کرتا ہے ان لوگوں کو جو جہاد کرتے ہیں)۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ [التوبة: ۴] (بیشک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے پرہیزگاروں کو)۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [البقرة: ۱۹۵] (بیشک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے نیکوکاروں کو) وغیرہ۔ یہ ساری صفات مؤمنین کی ہیں۔

تو ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ میں مسلمانوں کی تخصیص مستند اور مبنی برحقیقت ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے اس عظیم احسان کی قدر کرنے والے، اور اس سے سعادت حاصل کرنے والے صرف مسلمان ہی ہیں۔ علماء اُمت کا متفقہ فیصلہ ہے کہ کفار و مشرکین اور تمام اقوامِ عالم نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے عمومی بعثت، اور رحمۃ للعلمین والی صفت سے بکثرت دنیوی فوائد حاصل کئے، جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت روحانی فوائد اور ابدی سعادت سے مشرف ہوئی۔

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ [التوبة: ۱۲۸] (تمہارے پاس ایک ایسا رسول آیا ہے جو تمہی میں سے ہے، جس کو تمہاری ہر تکلیف بہت گراں معلوم ہوتی ہے، جسے تمہاری بھلائی کی دھن لگی ہوئی ہے، جو مؤمنوں کے لئے انتہائی شفیق، نہایت مہربان ہے) میں اسی خصوصی روحانی فیوض و برکات کی طرف اشارہ ہے۔ اس کی تفصیل اپنے مواقع پر آنے والی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ تو فرمایا:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ [الآية]

﴿مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرشتوں اور جنات میں سے نہیں ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم خالص قریشی مضری ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنی ہاشم میں سے ہیں، اور یہ سارے اولاد آدم علیہ السلام اور انسان تھے۔ آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحمدہٖ تعالیٰ انسان ہیں، اور سارے انسانوں کے سردار اور پوری خلقت سے اعلیٰ وافضل ہیں۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔

مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بشر ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ عربی النسل ہیں۔ قریشی اور ہاشمی ہیں۔ کتنے ظالم ہیں وہ لوگ جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشریت اور انسانیت کے منکر ہیں؟ اور عیسائیوں کے نقش قدم پر چل کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نُوْرٌ مِنْ نُوْرِ اللهِ کہہ کر اللہ تعالیٰ کا جزء قرار دیتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نورانیت مسلّم ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نورانیت میں کوئی کلام نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کتاب بھی نور ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین بھی نور ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قبلہ بھی نور ہے، اسلام کا ہر عمل اور احکام بھی نور، مگر صفات و برکات کے لحاظ سے، نہ کہ جنس اور ذات کے لحاظ سے۔

اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کو نور تسلیم کیا جائے تو سلسلۂ نسب اور شرفِ آدمیت اور فضیلتِ انسانیت سب معدوم ہو جائیں گے، اور ان سب کی نفی سے کفر ہی لازم آئے گا۔ أَعَاذَنَا اللهُ مِنْهَا.

آگے ربّ العزّت سبحانہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات، کمالات، فرائض منصبی بیان فرمائے، جو کہ چار ہیں:

(۱) ﴿يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ کی آیتیں تم پر تلاوت کرے گا۔ دوسرے مقام پر تلاوت قرآن کے مقصد کی وضاحت ہے: ﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ﴾ ۔ [العنکبوت:۴۵] (تلاوت کریں اس کتاب کی جو تیری کی طرف وحی کی گئی ہے، اور نماز قائم کریں) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے سامنے نازل شدہ قرآن پاک کی تلاوت کریں، تا کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام و فرامین کا علم ہو سکے۔

قرآن پاک کی تلاوت کا اصلی بنیادی مقصد تبلیغ احکام ہے۔ دوسرا مقصد قربِ الٰہی کا حصول اور ثواب ہے۔ یہ اتنا بابرکت عمل ہے کہ ہر حرف کے عوض اللہ تعالیٰ دس نیکیاں عطا فرمائے گا۔ اس کے علاوہ قرآن کریم اپنے پڑھنے والے، تلاوت کرنے والوں کے لئے قیامت کے دن زبردست شفاعت کرے گا، اور انہیں نجات دلائے گا۔

(۲) ﴿وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ اور ان کا تزکیہ کرتا ہے: کفر و شرک، نفاق و معاصی اور دیگر غیر شرعی جاہلانہ رسوم و رواج کی آلائشوں، اور بد عملیوں سے تم کو پاک اور صاف کرتا ہے۔ تمہارے اعمال اور اخلاق کو سنوارتا ہے، اور تہذیبِ اخلاق کی ایسی تعلیم دیتا ہے، اور تربیت کرتا ہے کہ تمہارے اعمال و کردار اور پوری زندگی کے اطوار نورانی فرشتوں جیسے بن جاتے ہیں۔

(۳) ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ تمہیں کتاب اللہ کی تعلیم دیتا ہے، اور اس کی تفسیر سکھاتا ہے، قرآن پاک کے حقیقی مطلب و مراد تمہیں بتاتا ہے، جہالت کے اندھیروں سے نکال کر علم کی روشنی سے نوازتا ہے۔

(۴) ﴿وَالْحِكْمَةَ﴾ حکمت، دانائی، علمِ حدیث، سیرتِ نبوی، تقویٰ وطہارت، انوارِ شریعت، برکاتِ شریعت، اسرار و لطائف و معارف، وغیرہ کی تمہیں تعلیم دیتا ہے۔ سبحان اللہ! اس علم وعمل اور تہذیب و شریعت کے حامل و پیکر نے چند دن کی صحبت کے اثر سے دنیا بھر کی درماندہ، پسماندہ، غیر مہذب، ناخواندہ قوم کو کہاں سے کہاں پہنچادیا، اونٹوں کے چرواہوں، اور علم و ہنر کے ابجد سے ناواقف شتر بانوں کو اتنا بلند و بالا منصب دلایا جس پر ملاء اعلیٰ کے نورانی فرشتوں کو بھی رشک آیا، اور زمین کی پستیوں سے اٹھا کر انہیں عرشِ معلّی کی تجلّیوں تک پہنچنے کے آداب سکھادیئے۔

بہرحال! پہلے حصے میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بیان فرمائی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار فرائض بتائے، اور آخر میں فرمایا: کسی شخص کی خوبیاں، اور اس کے وجود کی برکت اس طرح معلوم ہوسکتی ہے کہ اس کی تشریف آوری سے قبل کی، اور اس کی تشریف آوری سے بعد کی دونوں حالتوں کا موازنہ کر کے دیکھیں تاکہ تم کو معلوم ہوسکے کہ اس کی تعلیمات سے قبل تم کیا تھے، اور اس کی تعلیمات کے بعد تم کیا ہوگئے۔ اس وقت تم کہاں کھڑے تھے، اور اب تم کہاں پہنچ گئے ہو۔ اس وقت تمہاری تہذیب کی دنیا میں کیا قیمت تھی، اور اب کیا بھاؤ ہے۔ اس کو معلوم کر کے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت اور اس رحمت اور اس برکت کی قدر کرو، جس کو اس نے سید الانبیاء و خاتم الرسل حضرت محمد مصطفٰے احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم (فِدَاہُ أزْوَاحنا) کی صورت دیکر اور اس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم) رکھ کر تمہارے پاس بھیجا ہے۔ یہی مولائے کُل حضرت ابرہیم علیہ السلام کی دعا ہے، اور یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہے۔ اَللّٰھم صلِّ وَسلِّم وَبارِکْ علٰی رُوحِ أرْوَاحِنَا مُحمّدٍ وّعلٰی اٰلِہٖ وَصَحبِہٖ بِعَدَدِ اٰیَاتِکْ.

ے دُرفشانی نے تیری قطروں کو دریا کردیا ☆ دل کو روشن کردیا آنکھوں کو بینا کردیا
جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے ☆ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کردیا
تیری فیاضی نے ذروں کو بنایا آفتاب ☆ بن گئے اونٹوں کے چرواہے زمانے کے امام

أَوَلَمَّآ أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا ۖ قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ
أَنفُسِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۶۵﴾ وَمَآ أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ
وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۶۶﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۚ وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ
أَوِ ادْفَعُوا ۖ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ ۗ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ
يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ﴿۱۶۷﴾ الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ
وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا ۗ قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ أَنفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۶۸﴾

ترجمہ: کیا جس وقت پہنچی تم کو مصیبت، توتم نے پہنچائی تھی اس سے دوگنی، تم نے کہا یہ مصیبت کہاں سے آئی ہے؟ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے: وہ تمہارے نفسوں کی طرف سے آئی ہے، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ﴿۱۶۵﴾ اور جو کچھ تم کو اس دن پہنچا جس دن دو جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں، پس اللہ تعالیٰ کے حکم سے، اور تا کہ اللہ تعالیٰ ظاہر کردے ایمان والوں کو ﴿۱۶۶﴾ اور تا کہ ظاہر کردے ان لوگوں کو جنہوں نے منافقت اختیار کی، اور ان سے کہا گیا آؤ لڑو اللہ تعالیٰ کے راستے میں، یا دفاع کرو دشمن کا، تو وہ کہنے لگے کہ اگر ہم جانتے کوئی لڑائی تو ضرور تمہارا اتباع کرتے، وہ لوگ کفر کی طرف اس دن زیادہ قریب تھے بہ نسبت ایمان کے، اپنے موہنوں (زبانوں) سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اس چیز کو جو یہ چھپاتے ہیں ﴿۱۶۷﴾ وہ لوگ جو اپنے بھائی بندوں کے بارے میں کہا، اور خود بیٹھ گئے، اگر یہ ہماری بات مان لیتے تو نہ مارے جاتے، اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے: پس ہٹاؤ تم اپنے نفسوں سے موت کو، اگر تم سچے ہو ﴿۱۶۸﴾

معارف ومنازل

جس طرح ایک شکست خوردہ فوج کو صدمہ و پریشانی اور حیرانی وتعجب ہوتا ہے، وہی صورت اُحد میں بھی مسلمانوں کو پیش آئی۔ یہاں تعجب کی وجہ اس قدر اور بھی رہی کہ علاوہ جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم کے جو حقائق شناس تھے، عام لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم صرف اللہ تعالیٰ کے لئے لڑ رہے ہیں، اور ہمارے اندر حبیب خدا حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفس نفیس خود موجود ہیں، اور ہمارا مقصد بھی اعلیٰ ہے کہ ہم اسلام کی سربلندی چاہتے ہیں، اور ظلم و تعدی بھی کفار کی طرف سے ہے کہ ہم پر چڑھ آئے ہیں، تو ایسی حالت میں شکست کے کیا معنیٰ؟

پھر وجوہاتِ شکست پر بحث ہونے لگی کہ ایسا کیوں ہوا؟ کدھر سے یہ ہار آئی؟ اور ہم کو ہزیمت کیوں ہوئی؟ حضرت حق سبحانہ نے اس کا جواب دیا، اور ان کے تعجب کو دور کیا، اور فرمایا: تمہاری ہی وجہ سے یہ مصیبت آئی۔ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی نہ کرتے، اور گھاٹی چھوڑ کر نہ نکلتے تو یہ مصیبت نہ آتی، اور نہ ہی ہزیمت پیش آتی۔ اللہ تعالیٰ کو سب قدرت ہے، وہ چاہے غلبہ دے، چاہے مغلوب کردے۔

بدر میں تم نے اطاعت کی، تو ستر کافر قتل ہوئے، اور ستر گرفتار ہوئے۔ اگر تم چاہتے انہیں قتل کر سکتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی بھی یہی مرضی تھی، مگر تم نے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف فدیہ لے کر انہیں آزاد کردیا، اور اسی تعداد پر آئندہ کے لئے اپنے ستر آدمیوں کی شہادت پر راضی ہوئے، اور سودا بازی کی۔

اُحد میں بھی شروع شروع میں تمہیں کامیابی ہوئی، لیکن تمہاری غلطی نے جنگ کا رُخ تبدیل کیا۔ اس طرح تمہاری فتح شکست میں تبدیل ہوگئی، اور تمہارے ستر جانباز شہید ہوگئے، اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوئے، اور تمہارے چند دوسرے لوگ بھی زخمی ہوئے۔ اور بدر میں "مِثْلَيْهَا" یعنی دومثل اس لئے فرمایا کہ قیدیوں پر قابو پالینا بھی ان کے قتل کے برابر ہے، اگر تم چاہتے تو انہیں بآسانی قتل کر سکتے تھے، لیکن تم نے فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دیا، تو یہاں ستر، اور وہاں ایک سو چالیس، پھر تعجب کی کیا وجہ ہے؟

خلاصہ یہ کہ تعجب نہ کرو، مطمئن رہو، ابھی بھی تمہارا پلہ بھاری ہے۔ تم پہلے جیت چکے ہو، اور اگر اب ہار گئے، اور وہ بھی اپنی غلطی سے (جس میں بہت سی حکمتیں ہیں جیسے پہلے بیان ہوا) تو پریشانی کی کوئی وجہ نہیں۔ کم از کم آئندہ کے لئے تمہیں اچھا سبق تو مل گیا۔ یہ کوئی آخری لڑائی نہیں ہے، آئندہ بھی تمہیں ان ہی خطوط پر لڑنا ہوگا ہوشیار ہوکر۔

اس شکست کی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ظاہری طور پر تمہیں پرکھنا اور جاننا چاہتا تھا، اور وہ یہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کو متمیز کردے، اور جن لوگوں نے اس دن منافقانہ برتاؤ کیا، ان کو نمایاں اور آشکارا کرنا تھا، تاکہ مسلمان الگ اور منافق الگ پہچانے جائیں۔ پھر اس کو بیان کیا جو عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھیوں نے اُحد میں کہا تھا۔

یعنی جس وقت تم نے منافقوں سے کہا کہ تم ہمارے ساتھ مل کر دشمن سے لڑو، اگر تمہیں لڑنے کی ہمت نہیں تو کم از کم ہمارے ساتھ شریک رہو، تاکہ تمہاری وجہ سے ہماری تعداد زیادہ دکھائی دے، اور کافر مرعوب ہوجائیں، اگر لڑائی نہ سہی تو مدافعت میں تو شریک تو رہو۔ اگر خدانخواستہ اس جنگ میں مسلمان مغلوب ہوگئے، اور مدینہ پر دشمن نے

حملہ کیا، تو دشمن بلا امتیاز مسلمان اور منافق سب کو قتل کرے گا، اور کافر سب کو لوٹیں گے، اس لئے اگر تم لڑتے نہیں تو مدافعت میں شریک رہو۔ عبداللہ بن اُبی نے جواب دیا:

﴿لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ﴾ اگر اس لڑائی کو ہم قرینے اور ڈھنگ کی لڑائی سمجھتے تو ضرور ہم تمہارے ساتھ رہتے، یہ لڑائی کہاں ہے، یہ تو اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنا اور خودکشی کے مترادف ہے۔ یہ منافق اس دن بہ نسبت ایمان کے کفر سے قریب تر ہوگئے۔ یعنی ان کا چھپا ہوا کفر ظاہر ہوگیا۔ یہ اپنے منہ سے اسلام کے مدّعی ہیں، اور باطن میں کافر ہیں۔

یہ جن باتوں کو چھپاتے ہیں سو اللہ تعالیٰ ان کو خوب جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یوں تو منافق پہلے بھی مسلمان نہیں تھے، لیکن ظاہری رواداری اور برتاؤ کے اعتبار سے اسلام اور ایمان سے قریب معلوم ہوتے تھے، لیکن اس بیہودہ زہریلے اور ناشائستہ جواب دینے سے اس دن ظاہری طور پر بھی بجائے ایمان کے کفر سے قریب ہوگئے۔

﴿لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ پہلے ظاہری طور پر وہ طَیِّبِین (مسلمانوں) میں شامل رہے، اور باطنی طور پر کافر رہے، آج قلعی کھل گئی، اور ان کا کفر ظاہری طور پر بھی معلوم ہوگیا۔

اور جس طرح ان کا کفر آشکارا ہوا، اسی طرح یہ راز بھی کھل گیا کہ وہ کفار کے غلبہ اور مسلمانوں کی مغلوبیت پر باطنی طور پر راضی تھے، کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ یہ جنگ کوئی جنگ ہی نہیں، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ایک طرف ٹڈی دل فوج، ہر قسم کے سامانِ جنگ اور اسلحہ سے پوری طرح مسلح ہے، اور دوسری طرف کچھ بھی نہیں، تو ظاہری اسباب کے لحاظ سے مسلمان نہتے اور کمزور ہیں، ہوسکتا ہے کہ ان کا نقصان زیادہ ہو، مگر باطن میں وہ خوش تھے کہ مسلمانوں کا نقصان ہو، اور کفار کو غلبہ حاصل ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی تسلی کیلئے ارشاد فرمایا:

﴿اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ﴾ ......تا ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ بلاشبہ غزوۂ اُحد میں تمہیں تکلیف پہنچی، مگر تمہیں یاد ہونا چاہیے کہ تم اس سے پہلے بدر میں دشمن کو دُوگنی تکلیف پہنچا چکے ہو۔ تمہارے شہید ستر کے قریب ہیں، جبکہ ان کے ستر لوگ قتل ہوئے، اور ستر قیدی، ان کی تعداد دوگنی ہے۔ اب تم پکار اٹھے، اور تعجب و حیرانی میں رہے کہ یہ کیا ہوا؟ اور یہ ہماری شکست کہاں سے آئی؟ اور کیوں معاملہ برعکس ہوا؟ حالانکہ ہم حق پر ہیں، اور ہماری لڑائی خالص اسلام کی سربلندی کیلئے ہے، اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود ہمارے اندر موجود ہیں، ہماری یہ شکست ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

ارشاد ہوا: تعجب کیوں کرتے ہو؟ خود کردہ راعلاجے نیست، کیونکہ تمہاری یہ تکلیف خاص تمہارے ہی نفسوں کی طرف سے ہے، تم نے حکمِ عدولی کی، اور مقرر کردہ مورچے سے باہر آئے، جس کی وجہ سے جنگ کا رُخ تبدیل ہوا۔ یہ سب کچھ تمہاری اپنی غلطی کا نتیجہ ہے۔

اور یہ بھی یاد رکھو، کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، وہ مالک الملک فتح بھی دے سکتا ہے، جیسے میدان بدر میں ہوا، اور اپنے بندوں کی حکمِ عدولی پر انہیں شکست بھی دے سکتا ہے، جیسے کہ اُحد میں ہوا، اور تمہیں تمہاری غلطیوں پر تنبیہ بھی کرسکتا ہے۔ آگے اس شکست کی حکمت کا بیان ہے:

﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ﴾......تا......﴿وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا﴾ دونوں جماعتوں، یعنی اہلِ اسلام اور اہلِ کفر کے آمنے سامنے ہونے کے دن جو تکلیف تمہیں پہنچی ہے، اس میں کفار نے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی ایسا ہوا، اور یہ نوشتۂ تقدیر کا کرشمہ ہی رہا، جو اللہ تعالیٰ کو منظور تھا۔ اس کی حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ معلوم کرے کہ مؤمن کون لوگ ہیں، یعنی دنیا والوں کو بتائے، اور ظاہر و نمایاں کرے کہ کھرے کون ہیں، اور کھوٹے منافق کون ہیں۔

یہ فرق تب ہی ظاہر ہوگا جب امتحان و آزمائش کا مرحلہ سامنے ہو۔ فارسی کہاوت ہے کہ: "دوست راوقت سختی بیاز ما"۔ دوست و دشمن کی پہچان سختی اور امتحان میں ہوتی ہے، آسانی میں تو ہر شخص دوستی کا دم بھرتا ہے۔ اب پتہ چلا، اور کھرے کھوٹے میں خوب امتیاز ہوگیا۔ وہ اس طرح کہ:

﴿وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾......تا......﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ﴾ اور جب ان منافقون سے کہا گیا کہ آؤ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرو، یا دفاع کرو۔ یعنی اوّل تو یہ ہے کہ اقدامی جنگ کا حصہ بنو۔ یعنی جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ مل کر پہل کرو، بصورت دیگر دفاعی جنگ کا حصہ بنو، کم ازکم مسلمانوں کے ساتھ مل کر ان کی تعداد بڑھا دو، تاکہ دشمن کی نظر میں وہ زیادہ معلوم ہوں، اور دشمن مرعوب ہو، یا یہ کہ ان کا حملہ روک دو۔

اس پر منافقین نے یہ زہریلا جواب دے کر جان چھڑانے کا حیلہ تراشا، اور کہا کہ اگر ہم جانتے کہ یہ کسی ڈھنگ، ڈھب، قرینے کی لڑائی ہے تو ضرور تمہارا اتباع کرتے، اور تمہارے ساتھ چلتے، مگر یہ تو کسی قرینے کی لڑائی نہیں ہے، دشمن کی تعداد زیادہ ہے، اور ہماری تعداد کم ہے، یہ تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، یہ صاف ظاہر خودکشی کے مترادف ہے، لہٰذا ہم ایسی جنگ میں شرکت کرنے سے معذور ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آج ان کا نفاق وکفر کا پول کھل گیا، اور وہ اس حالت میں رہے کہ وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے قریب ہو گئے۔ پہلے ان کا کفر چھپا ہوا تھا، آج ان کا کفر طشت از بام ہو کر بالکل ظاہر ہو گیا، کیونکہ ان کی خصلت یہ رہی ہے کہ مؤمنوں سے ایسی بات کہتے رہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے، زبان سے تو اسلام کی صداقت اور مؤمنوں کی حمایت کا دم بھرتے ہیں، مگر دل میں کفر و نفاق بھرا ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جس چیز کو وہ چھپاتے ہیں۔

آگے ان کی ایک اور خصلت کا بیان ہے، جس کا تذکرہ گزشتہ آیات میں بھی آچکا تھا:

﴿اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا﴾......تا......﴿اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ وہ لوگ جنہوں نے اپنے بھائی بندوں (یعنی وہ مسلمان جو ان کے نسب شریک ہیں) کے متعلق یوں کہا، اور خود گھروں میں بیٹھے رہے: اگر یہ ہمارے بھائی ہماری بات مان لیتے، اور میدان جنگ میں باہر جا کر جہاد میں شریک نہ ہوتے، بلکہ ہماری طرح گھروں میں رہتے، تو نہ مارے جاتے، نہ شہید ہوتے، بلکہ موت سے بچ جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے دندان شکن جواب دے کر انہیں خبردار کیا، اور فرمایا: قُلْ: اے پیغمبر! ان سے کہہ دیں: پس روک لو (ہٹاؤ) اپنے آپ سے موت کو، گھروں میں رہتے ہوئے۔

یعنی اے منکرینِ تقدیر! موت کا وقت مقرر ہے، وہ اپنے وقت پر آئے گی، اگر اس کا وقت پورا ہے تو وہ گھر میں بھی آکر رہے گی، اس کو کوئی نہیں روک سکتا۔ ﴿اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ﴾ [النساء:۷۸] (جہاں بھی تم ہو گے موت تمہیں جا پکڑے گی، چاہے تم مضبوط قلعوں میں کیوں نہ رہ رہے ہو)۔ اگر اس کا وقت پورا نہ ہو تو وہ میدان کارزار میں گولیوں کی بوچھاڑ میں بھی نہیں آئے گی۔ تمہارا یہ کہنا کہ میدان میں جانے والا ہر حال میں مرے گا، اور گھر میں رہنے والا خواہ مخواہ بچ جائے گا، غیر دانشمندانہ فیصلہ ہے۔ موت اپنے وقت کی تابع ہے، نہ کسی مکان ومحل کا۔ اس کی تفصیل پہلے گزر گئی ہے۔ واللہ اعلم

......❁......❁......❁......

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ
يُرْزَقُوْنَ ﴿١٦٩﴾ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ

لَمۡ يَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ مِّنۡ خَلۡفِهِمۡ ۙ اَلَّا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾

يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِنِعۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضۡلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۷۱﴾

ترجمہ: اور نہ خیال کریں آپ ان لوگوں کے بارے میں جو مارے گئے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مردے، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے پاس ان کو روزی دی جاتی ہے ﴿۱۶۹﴾ وہ خوش ہونے والے ہیں اس پر جو اللہ تعالیٰ نے ان کو دیا ہے اپنے فضل سے، اور وہ بشارت حاصل کرتے ہیں ان لوگوں کے بارے میں جو ابھی تک ان سے نہیں ملے ان کے پیچھے سے، یہ کہ نہیں ہوگا ان پر کوئی خوف، اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۱۷۰﴾ وہ خوشخبری حاصل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کے فضل سے، اور یہ کہ بیشک اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا ایمان والوں کے اجر کو ﴿۱۷۱﴾

معارف ومنازل

یہاں سے اس خوش قسمت جماعت کے مناقب وفضائل اور خصوصی کرامات کا بیان ہو رہا ہے، جو زندۂ جاوید ہیں، جن کا مرتبہ وشرف اتنا اونچا اور بلند ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوقات پر انہیں ایک خاص اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ یعنی قربِ الٰہی کے اعزازی مناصبِ عالیہ میں پہلا مرتبہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ہے، دوسرے نمبر پر صدیقین کا مقام ہے۔

صدّیق اسی ہستی کا نام ہے جس کا منشا ومزاج نبوت کا عکس اور پرتَو ہوتا ہے۔ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو کہ سارے کے سارے صدیقین تھے۔ روئے زمین پر انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد اسی پاکیزہ جماعت کا مقام ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے لئے کیا ہوا ہے۔ یہ منتخب شدہ جماعت ہے۔ تیسرے نمبر پر شہداء کا مقام ہے، جو اللہ تعالیٰ عزّ وجل کے لئے سب سے بڑی محبوب چیز اپنی جان کی قربانی پیش کرتے ہیں، بلکہ جنت اور رضائے الٰہی کے لئے، اور اس کے بدلے میں جان کی سودا بازی لگاتے ہیں۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰى مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَاَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ فَيَقۡتُلُوۡنَ وَيُقۡتَلُوۡنَ وَعۡدًا عَلَيۡهِ حَقًّا فِى التَّوۡرٰٮةِ وَالۡاِنۡجِيۡلِ وَالۡقُرۡاٰنِ﴾ [التوبۃ:۱۱۱] (بیشک اللہ نے خرید لئے ہیں مؤمنوں سے ان کی جانیں، اور ان کے مال، اس بات کے بدلے کہ جنت انہی کی ہے۔ وہ اللہ کے راستے میں جنگ کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں مارتے بھی ہیں، اور مرتے بھی ہیں۔ یہ ایک سچا وعدہ ہے جس کی ذمہ داری اللہ نے

تورات اور انجیل میں بھی لی ہے، اور قرآن میں بھی)۔

چوتھے نمبر پر صالحین حضرات کا مقام ہے، اور یہ علماء ربانی کی جماعت ہے، جن کو انبیاء علیہم السلام کی وراثت اور امورِ دین وعلمی مسائل کے اندر جانشینی کا درجہ حاصل ہے، جنہوں نے اس اُمت کے لئے وہی کام انجام دیئے جو بنی اسرائیل کے لئے ان کے پیغمبروں علیہم السلام نے انجام دیئے تھے۔

اسی بنیاد پر اس اُمت کے علماء کو سارے انبیاء علیہم السلام کا وارث کہا گیا۔ قَوْلُهٗ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وسَلَّم: اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ. یہ نہیں فرمایا کہ میری اُمت کے علماء میرے وارث ہیں، بلکہ فرمایا: سارے انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث ہیں، کیونکہ سارے انبیاء علیہم السلام کا مشترک دین اسلام ہی ہے، اور شریعتیں الگ الگ ہیں۔

یہ علماء ربانی وہ لوگ ہیں جنہوں نے علیٰ منہاج النبوت علم وعمل پر کام کئے، اور قائم رہے، انہی کے مساعی اور جدوجہد کے طفیل قرآن وحدیث کے زرّیں اصول سارے عالم میں پھیل گئے، اور پوری اُمت میں مذہبی علوم جاری رہے۔ علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا: (بحوالہ یتیمۃ البیان حضرت بنوریؒ) اس وقت دنیا میں دو لاکھ تفاسیر قرآن موجود ہیں۔ یہ بات آج سے نوّے سال پہلے کی ہے۔ اللہ جانے آج یہ تعداد شاید اس سے کہیں زیادہ ہے۔

حضرت خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ بغداد جلد اوّل میں، اور حضرت مولانا سید شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ نے دروس القرآن میں ایسی کتب تفاسیر کا حوالہ دیا ہے جو ایک ہزار جلدوں میں ہیں، اور ہر جلد ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ سارے کام علماء ربانی نے انجام دیئے۔

اسی طرح دس لاکھ احادیث، اور پانچ لاکھ احادیث کے راویوں کی جمع وتدوین، اور ان رواۃ کی مکمل تاریخ وحالات پر ہزاروں کتابیں انہی علماء اُمت نے تالیف کی ہیں۔

حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر اکسٹھ سال نو ماہ ہے، اس مختصر عمر میں پانچ سو سے زائد کتابیں لکھی ہیں، جن کی فہرست عام دستیاب ہے۔ فقہ حنفی میں فقہی مسائل کی تعداد تقریباً تیرہ لاکھ مسائل ہیں۔ مشت نمونہ خروار کے طور پر یہ چند کلمات ناظرین کی طبع آرائی کے لئے لکھے گئے، ورنہ یہ سلسلہ اتنا وسیع اور عالمگیر ہے، جس کا احاطہ قطعاً ناممکن ہے۔

اور لطف یہ کہ یہ کام اب بھی جاری ہے، اور ان شاء اللہ نزول مسیح علیہ السلام تک جاری رہے گا۔ اور یہ سب قرة العینین، سید الکونین، نبی الحرمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زندہ وتابندہ معجزہ کہلائے گا۔ مزید تفصیلات کے لئے کتب

حدیث وتاریخ علماء حدیث کا مطالعہ کیا جائے۔

آیت کریمہ میں شہداء کے مناقب وفضائل کا تذکرہ ہے۔ ان آیات کا تعلق یا توشہداء اُحد سے ہے، یا شہداء بئر معونہ سے ہے، جن کو بیر معونہ کے مقام پر عامر بن طفیل کے لوگوں نے شہید کیا تھا۔ یہ ستر آدمی تھے، اور سب کے سب فقراء اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کے قراء تھے۔ ان کے بارے میں قرآن مجید کی آیت نازل ہوئی تھی: "بَلِّغُوا عَنَّا قَوْمَنَا اِنَّا قَدْ لَقِيْنَا رَبَّنَا فَرَضِيَ عَنَّا وَرَضِيْنَا عَنْهُ"۔ جو بعد میں اس کی تلاوت منسوخ ہوگئی۔ [بخاری]

بہر حال! عوام الناس اور منافقین کے خیالات اور عقائد کی اصلاح کے لئے یہ آیات نازل ہوئیں، کہ یہ لوگ [شہداء] بڑے پایہ کے خوش قسمت لوگ ہیں، تم ان کی موت کو حقیر اور معمولی مت سمجھو۔ یہ لوگ عام انسانوں اور مردوں کی طرح مرے ہوئے نہیں ہیں، یہ زندہ ہیں، اور ایک خاص زندگی انہیں میسر ہے، اگر چہ ان کی زندگی کی کیفیت کسی کو سمجھ میں نہیں آتی، مگر موت وحیات کے خالق نے انہیں ایک بلند وبالا مخصوص زندگی کے ساتھ نوازا ہے۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ جو کہ سلسلۂ مجددیہ کے بہت بڑے مشائخ میں سے گزرے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کے معاصر تھے، بیہقی وقت، مفسر قرآن، مؤلف تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ ہیں، فرماتے ہیں کہ میں کشفی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں کہ شہداء پر ربّ العزّت سبحانہ کی ذاتی تجلیات پڑ رہی ہیں، انہیں یہ انعام اس لئے حاصل ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی سب سے قیمتی متاع، یعنی جان اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کردی۔ یہ عنایت صرف شہداء تک ہی محدود ہے، جبکہ مقربین فرشتوں پر بھی خداوند تعالیٰ کی ذاتی تجلیات نہیں پڑتیں۔ ان پر صفاتی تجلیات پڑتی ہیں، ذاتی تجلیات صرف انسانوں، انبیاء علیہم السلام، صدیقین اور شہداء کے ساتھ خاص ہیں۔

پہلا درجہ انبیاء کرام علیہم السلام کا ہے، دوسرا درجہ صدیقین کا، اور تیسرا شہداء کا۔ اور یہ مرتبہ بلند وبالا قیامت تک آنے والے سارے شہداء کے لئے ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں اسلام کی سربلندی کیلئے لڑکر جان کی قربانی پیش کرتے ہوں۔

البتہ اس کی بنیاد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رکھ کر ساری اُمت پر سبقت حاصل کی، اور سب پر احسان فرمایا۔

حضور سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: شہید کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں چھ انعامات ہیں: پہلے اور اوّل لمحہ میں اس کی بخشش ہوتی ہے، وہ جنت میں اپنا ٹھکانا دیکھ لیتا ہے، اسے عذاب قبر سے بچالیا جاتا ہے، اور وہ فزع اکبر، یعنی قیامت کے دن کے خوف سے محفوظ و مامون رہتا ہے، اور اس کے سر پر وقار وعزت کا تاج رکھا جاتا ہے، جس کا

ایک موتی دنیا و مافیہا سے بہتر اور قیمتی ہوتا ہے، اور بہتر (۷۲) حور عین سے اس کی شادی کرادی جاتی ہے، اور اس کے عزیز و اقارب میں سے ستر کے حق میں اس کی شفاعت قبول کی جاتی ہے۔ [قرطبی]

بئر معونۃ کے شہداء بھی ستر ہیں۔ ان کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ امام احمد، بخاری، مسلم اور بیہقی رحمہم اللہ، سب نے حضرت انس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ کچھ لوگوں نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہمارے ساتھ کچھ لوگوں کو بھیج دیں کہ ہم کو قرآن وسنت کی تعلیم دیں۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ ستر انصاری، جن کو قراء کہا جاتا تھا، اور یہ سب قرآن کے قاری تھے، بھیج دیئے۔

بنیادی مقام پر پہنچنے سے پہلے ہی یہ درخواست کرنے والے لوگ ان قاریوں کے درپے ہو گئے، اور بیر معونۃ کے مقام پر ان سب کو شہید کر دیا۔ شہداء نے کہا: اے اللہ تعالیٰ! ہماری شہادت کی خبر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دے۔ اس پر یہ آیتیں اتریں، اور ان کے اس پیغام کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی پہنچا دی: بَلِّغُوا عَنَّا قَوْمَنَا... الآیۃ۔ بعد میں یہ آیت منسوخ ہو گئی۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو لوگ مر جائیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بہتری اور جنتی درجات پائیں، وہ دنیا میں ہرگز واپس آنا پسند نہیں کریں گے، مگر شہید، کہ وہ تمنا کرتا ہے کہ اسے دوبارہ دنیا میں لوٹا دیا جائے، اور دوبارہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو، کیونکہ وہ شہادت کے درجات کو دیکھ کر پھر یہی تمنا کرے گا۔ [مسند احمد]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا، اور فرمانے لگے: جابر! کیا بات ہے کہ تم مجھے غمگین نظر آتے ہو؟ میں نے کہا: یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے والد اُحد میں شہید ہو گئے، جن پر بہت سے قرض ہیں، اور میرے چھوٹے چھوٹے بہن بھائی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سن! میں تجھے بتاؤں، جس کسی سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا حجاب (پردے) کے پیچھے کلام کیا، لیکن تیرے باپ سے آمنے سامنے بات چیت کی۔ فرمایا مجھ سے مانگو جو مانگے گا دیدوں گا۔ تیرے باپ نے کہا: اے اللہ تعالیٰ! میں تجھ سے یہ مانگتا ہوں کہ آپ مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج دیں، تا کہ میں تیری راہ میں دوسری مرتبہ شہید ہو جاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یہ بات تو پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ کوئی بھی لوٹ کر دنیا میں نہیں جائے گا۔ پھر کہنے لگا: یا اللہ تعالیٰ! میرے بعد والوں کو ان مراتب عالیہ کی خبر پہنچا دیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ [ابن کثیر]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم نے اس آیت کا مطلب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے

پوچھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ شہداء کی روحیں سبز رنگ پرندوں کے قالب میں ہیں، اور جہاں چاہیں جنت کی سیر کریں، اور چریں، عرش کے نیچے قندیلوں میں آرام کریں۔ [مسلم]

مسند احمد کی روایت میں ہے کہ شہداء جنت کے دروازے پر نہر کے کنارے سبز گنبد میں ہیں، صبح وشام انہیں جنت کی نعمتیں پہنچ جاتی ہیں۔ دونوں احادیث میں تطبیق یہ ہے کہ بعض شہداء وہ ہیں جن کی روحیں پرندوں کے قالب میں ہیں، اور بعض وہ ہیں جن کا مستقر سبز گنبد ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ جنت میں پھرتے پھراتے یہاں جمع ہوتے ہوں، اور یہ کھانے یہاں کھلائے جاتے ہوں۔ [ابن کثیر]

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ جولوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہوگئے، انہیں عام لوگوں کی طرح مردہ گمان مت کرو۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ﴾ [البقرة:۱۵۴] (جولوگ اللہ کے راستے میں قتل کردیئے جائیں ان کو مرے ہوئے مت کہو)۔

دونوں آیتوں کو ملا کر یہ مطلب ہوا کہ شہیدوں کو مردہ نہ کہو، اور مردہ گمان بھی نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کی راہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ، اعلاء کلمۃ اللہ، دین کی عظمت وسربلندی کی خاطر جہاد کرنا، اور شہادت حاصل کرنا ہے۔ جب یہ مقام بلند وبالا کسی کو نصیب ہوا، تو سمجھو اس نے سب کچھ پالیا۔ قیامت کے دن ویسے تو سب مسلمان ابدی حیات کے ساتھ سرفراز ہوجائیں گے، مگر ان خوش قسمت لوگوں نے قبل از وقت قیامت سے پہلے پہلے یہ عظم سعادت حاصل کرلی۔

این سعادت بزور بازو نیست ☆ تا نہ بخشند خدائے بخشندہ

فرمایا: شہداء کی زندگی اربوں زندگیوں سے بلند ہے، مگر تم اس مقام کے ادراک سے عاجز ولاشعور ہو، کیونکہ تمہارے سامنے مرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، مگر ربّ العزّت کی بارگاہ میں زندۂ جاوید ہیں۔ اور زندگی بھی عجیب نرالی ہے کہ عام آدمی اس کا ادراک نہیں کرسکتا، اور جنتوں میں ان کو روزی دی جارہی ہے۔ یہ شہداء کی خصوصیت ہے کہ وہ عالیشان مقامات میں رہتے ہیں، اور ہر قسم کی خوراک کھاتے رہتے ہیں۔ پھر عرش معلیٰ کے نیچے جنۃ الفردوس میں لٹکی ہوئی قندیلوں میں آرام کرتے ہیں۔

﴿فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ﴾ ...... تا ﴿وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾

اللہ تعالیٰ نے انہیں جو کچھ اپنے فضل سے عطاء کیا ہے، اس پر خوشی کرنے والے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف

سے انہیں دو بشارتوں سے نواز اجاتا ہے:

☆......پہلی بشارت یہ ہے کہ وہ بشارت حاصل کرتے ہیں اپنے ان لوگوں کے لئے جو ابھی ان سے نہیں ملے، یعنی ان کے عزیز واقارب، رشتہ دار جو ایماندار مؤمن ہیں، اور ابھی تک وہ دنیوی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے متعلق انہیں یہ خوشخبری ملتی ہے کہ مرنے کے بعد ان پر بھی خوف نہیں ہوگا، اور وہ بھی غمگین نہیں ہوں گے، جب وہ مرکر تمہارے پاس آئیں گے، تو اللہ تعالیٰ کی مغفرت پائیں گے، اور تمہاری طرح جنت کی نعمتوں سے سرفراز ہو جائیں گے۔ یہ بات بڑی بشارت ہے کہ انہیں دوستوں کے بارے میں جنت اور مغفرت کی قبل از وقت بشارت ہو۔

☆......دوسری بشارت یہ ہے کہ: ﴿يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ﴾ انہیں اللہ تعالیٰ جل شانہ کی طرف سے نعمت اور احسان کی خوشخبری دی جارہی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا فضل بھی قیامت کے بعد تو سارے مسلمانوں کو فضل ونعمت سے نواز اجائے گا، مگر شہداء کو یہ انعام واکرام فی الوقت عطاء کیا جارہا ہے، اور اب انہیں یہ یقین حاصل ہو گیا ہے کہ: ﴿وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ ایمانداروں کے اجر وثواب کو ضائع نہیں کرتا۔ اہلِ ایمان اور محسنین ومتقین جو بھی نیک کام انجام دیں گے، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے اعمال کی قدردانی ہوگی، اور انہیں پورا پورا بدلہ عطا کیا جائے گا۔

حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ کافروں کے ہاتھوں شہادت پانے والے شہیدوں کو غسل دینے کا حکم نہیں ہے، ان کو اسی طرح خون میں لت پت قبر میں اتارا جائے۔ شہدائے احد کے متعلق سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کے ہتھیار، سلاح وغیرہ زائد لباس کے حکم میں آتے ہیں، یہ ان کے جسم سے اتار دو، اور ان کے اصل لباس کرتہ، قمیص، تہبند، پاجامہ سمیت انہیں دفن کر دو۔

فرمایا: شہداء کا خون قیامت کے دن دوبارہ تر و تازہ ہو جائے گا۔ اللَّوْنُ لَوْنُ الدَّمِ وَالرِّيحُ رِيحُ الْمِسْكِ. سرخ رنگ کا تازہ خون ظاہر ہوگا، جس کی مہک وخوشبو کستوری کی ہوگی، اور وہ اسی حالت میں بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوں گے۔

البتہ فقہاء کرام، محدثین اور مفسرین حضرات رحمۃ اللہ علیہم کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ اگر شہید جنابت کے ساتھ ہو تو اسے غسل دے دیا جائے، یا نہیں؟

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جنابت کی حالت میں بھی شہید کو غسل دینے کی ضرورت

نہیں ہے۔ البتہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جُنبُ شہید کے لئے غسل ضروری ہے، کیونکہ غزوۂ اُحد میں حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ جنابت کی حالت میں شہید ہوئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں نے دیکھا ہے کہ فرشتے بارش کے پاکیزہ پانی سے چاندی کے برتن میں زمین وآسمان کے درمیان حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو غسل دے رہے تھے، لہٰذا ثابت ہوا کہ جُنب شہید کا غسل ضروری ہے۔

شہداء کے جنازہ کے متعلق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کا جنازہ پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ان کی مغفرت تو ہو چکی ہے، اور وہ پاک ہو گئے ہیں۔ تاہم امام اعظم، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ جنازہ پڑھا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ جنازہ صرف گناہوں کی معافی کے لئے نہیں ہے، بلکہ درجات کی بلندی کے لئے بھی ہے۔ دیکھیں! شیر خوار بچوں پر جنازہ پڑھا جاتا ہے، حالانکہ وہاں گناہ کا تصور نہیں ہوتا۔ اور یہ بات بھی ہو سکتی ہے کہ شہادت پانے کے ساتھ شہید کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، مگر حقوق العباد معاف نہیں ہوتے، تو شہادت کے ساتھ مکمل تطہیر نہیں ہوئی۔ واللہ اعلم

یہاں تک شہید فی الدنیا والآخرت کا بیان ہوا۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے شہداء بھی ہیں جنہیں شہید فی الآخرت کہا جاتا ہے۔ یعنی دنیوی زندگی کے اعتبار سے وہ اگرچہ شہید نہیں کہلاتے ہیں، انہیں غسل کے ساتھ کفن بھی دیا جاتا ہے، مگر برزخی زندگی اور آخرت کے لحاظ سے وہ بھی شہید شمار ہوتے ہیں۔

شہداء فی الآخرۃ کی اقسام، اور ان کی فہرست کا بیان:

(۱) پیٹ کی بیماری میں مرنے والے۔ (۲) طاعون کی بیماری میں مرنے والے۔ (۳) زلزلہ میں مرنے والے۔ (۴) کسی دیوار کے نیچے دب کر مرنے والے۔ (۵) سل ودق کے مرض میں مرنے والے۔ (۶) جگر کے مرض استسقاء جلندھر میں مرنے والے۔ (۷) بندوق، تلوار، خنجر، لاٹھی کے ساتھ مرنے والے۔ (۸) زہر پلانے اور کھلانے سے مرنے والے۔ (۹) بغیر قصور وجرم کے قید وجیل میں مرنے والے۔ (۱۰) مرگی اور صرع کے مرض میں مرنے والے۔ (۱۱) پانی میں ڈوب کر مرنے والے۔ (۱۲) آگ میں جلنے سے مرنے والے۔ (۱۳) بچے کی پیدائش پر مرنے والی عورت۔ (۱۴) کسی پہاڑ یا مکان کی چھت سے گر کر مرنے والے۔ (۱۵) کسی زوردار صدمے سے مرنے والے، جیسے ایکسیڈنٹ یا جانور اونٹ وگائے کے مارنے سے مرنے والے۔ (۱۶) سیلاب کے پانی میں گر کر مرنے والے۔ (۱۷) کنواری عورت یا مرد شادی سے پہلے اگر مر جائے۔ (۱۸) اپنی جان و مال، عزت و آبرو کی

حفاظت پر مرنے والے۔(۱۹) چوروں کے ہاتھوں مرنے والے۔(۲۰) ناحق بلاوجہ ظلم کے ساتھ مرنے والے۔ (۲۱) کسی زخم کے خون زیادہ بہنے سے مرنے والے۔(۲۲) لو لگنے اور پیاس وبھوک کی وجہ سے مرنے والے۔ (۲۳) پاگل شخص کی موت شہادت ہے۔(۲۴) وہ لوگ جو صدق دل سے شہادت مانگتے ہوں، وہ اگرچہ بستر پر مریں گے، مگر شہادت پائیں گے۔(۲۵) وہ لوگ جنہیں سحر و جادو کیا گیا ہو۔(۲۶) ذات الجنب کی بیماری میں مرنے والے۔(۲۷) عرصۂ دراز تک دائمی مرض میں مرنے والے۔(۲۸) حج وعمرہ یا تبلیغی سفر میں مرنے والے۔(۲۹) دورانِ تعلیم (دینی) مرنے والے طالب علم۔(۳۰) پاگل کتے کے کاٹنے سے مرنے والے۔(۳۱) سانپ اور بچھو کے زہر سے مرنے والے۔(۳۲) جنگلی درندوں کے چیر پھاڑ سے مرنے والے۔(۳۳) سواری پر سے گر کر مرنے والے۔(۳۴) غربت کی موت پر مرنے والے۔(۳۵) تپ محرقہ کی شدت کی وجہ سے مرنے والے۔ (۳۶) پاکدامنی کے ساتھ کسی کے عشق میں مرنے والے۔(۳۷) گلا گھوٹنے پر مرنے والے۔(۳۸) بجلی کی کرنٹ سے مرنے والے۔ یہ موتِ مفاجات کا حصہ ہے۔(۳۹) متواتر قئی اور متلی سے مرنے والے۔(۴۰) علاج، یعنی ڈاکٹری آپریشن کے دوران مرنے والے۔(۴۱) عورت اپنے شوہر اور سوکن کے ظلم سے دل برداشتہ ہو کر مرے۔ (۴۲) مرد اپنی بیوی کی زیادتی اور بے رغبتی سے تنگ آکر وفات پائے۔(۴۳) جو شخص اپنے حلال مال سے چالیس مردوں کی تجہیز وتکفین کرے۔(۴۴) جو شخص متواتر یتیموں کی کفالت کرے۔(۴۵) جو شخص زندگی بھر والدین کی خدمت کرے، اور انہیں اُف تک نہ کہے۔(۴۶) جو شخص قبرستان کے لئے زمین وقف کردے۔(۴۷) جو شخص ۷ سال تک بغیر تنخواہ واُجرت اذان دیدے۔(۴۸) حفاظ القران الکریم۔(۴۹) عالم باعمل جو ہمیشہ مذہبی خدمت کرے۔(۵۰) جو شخص کسی کافر کو مسلمان بنائے۔(۵۱) جو شخص روزانہ ایک ہزار آیت تلاوت کرے۔(۵۲) جو شخص فسادِ اُمت میں اتباعِ سنت کرے۔(۵۳) جو شخص کسی مردہ سنت کو زندہ کرے۔(۵۴) جو شخص ۲۵ مرتبہ روزانہ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لِیْ فِی الْمَوْتِ وَ فِیْمَا بَعْدَ الْمَوْتِ. پڑھا کرے۔(۵۵) جو شخص روانہ ۲۵ یا ۲۷ مرتبہ یہ دعا پڑھے: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلِجَمِیْعِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمَاتِ الْأَحْیَاءِ مِنْھُمْ وَ الْأَمْوَاتِ. (۵۶) جو شخص ۷ سال تک کسی مسجد کی بلا معاوضہ خدمت کرے۔(۵۷) جو شخص اپنے تمام عزیز و اقارب کی دلجوئی اور صلہ رحمی کا پورا حق ادا کرے۔(۵۸) جو شخص اپنے حلال مال سے دینی مرکز مدرسہ بنائے، یا مسجد ومدرسہ دونوں بنائے، اور وقف کر کے مسلمانوں کے سپرد کرے۔(۵۹) جو شخص ہمیشہ باوضو رہے، اور وضو کے ساتھ

سوجائے، اور صبح وشام خاص کرسوتے وقت سید الاستغفار کو پڑھا کرے۔(۶۰) جو شخص ہر وقت باوضو رہے، اور ہر وضو کے بعد سورۃ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ کو صرف تین مرتبہ پڑھ لے۔(۶۱) جو شخص فجر کی نماز کے بعد سورۃ یٰسین پڑھ لے، اور عشاء کے بعد سورۃ یٰسین اور سورۃ الملک بلا ناغہ پڑھا کرے۔(۶۲) جو شخص روزانہ پابندی کے ساتھ کلمہ طیبہ اور درود شریف ہزار ہزار مرتبہ پڑھے۔(۶۳) سورۃ اخلاص روزانہ بلا ناغہ ہزار مرتبہ پڑھے۔(۶۴) صبح وشام اَعُوْذُ بِاللهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيطَانِ الرَّجِيم تین مرتبہ، اور سورۃ الحشر کی آخری تین آیات پڑھنے سے شہادت کا درجہ ملتا ہے۔(۶۵) نماز تہجد کی پابندی، اور صلوٰۃ الضحٰی پر مداومت بھی اس مطلب کے لئے اکسیر ہے۔(۶۶) ہر فرض نماز کے بعد بلا ناغہ الحمد شریف، آیت الکرسی ﴿ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ [آل عمران] پڑھنے سے یہی رتبہ ملے گا۔(۶۷) عصر کی نماز سے پہلے چار نفل، مغرب کی نماز کے بعد چھ رکعت، اور ایامِ بیض کے تین روزے رکھنا، یہ نہایت اونچا عمل ہے۔(۶۸) کسی مجاہد کے اخراجات اور اس کی بیوی بچوں کی نگہداشت بھی شہادت کا پیغام ہے۔(۶۹) جو شخص میدان جہاد میں اسلامی لشکر کے لئے چوکیداری کرے۔(۷۰) جو تاجر اپنی تجارت میں مکمل امانتداری اور دیانتداری اختیار کرے، اور قرضداروں کو تنگ نہ کرے۔(۷۱) جو شخص ان بارہ گناہوں سے مکمل پرہیز کرے:

☆ شرک ☆ ظلم ☆ رشوت ☆ بہتان وغیبت ☆ سود ☆ جھوٹ ☆ خیانت ☆ وعدہ خلافی ☆ زنا بدکاری ☆ شراب نوشی ☆ حرام خوری ☆ کبر وغرور۔

یہ وہ اعمال ہیں جو لوگ ان پر پابندی کے ساتھ اگر عامل رہیں گے تو ان کو مرنے کے بعد شہادت کا درجہ ملے گا، اور ان کے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے۔(حقوق العباد) (أبواب السعاة في أسباب الشهادة، تأليف علامة سيوطي علیہ الرحمۃ اور دیگر متفرق کتب سے استفادہ کیا گیا۔ الحمد للہ علی ذٰلک)

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا
مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ

فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ
مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾
اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

ترجمہ: وہ لوگ جنہوں نے حکم مانا اللہ تعالیٰ کا اور رسول کا، بعد اس کے کہ ان کو زخم پہنچا، ان لوگوں کے لئے جنہوں نے نیکی کی ہے، اور ڈرتے رہے ہیں، بہت بڑا اجر ہے ﴿۱۷۲﴾ وہ لوگ جن کے لئے لوگوں (یعنی کافروں) نے کہا کہ بیشک لوگوں (یعنی مکہ والوں) نے تمہارے لئے (لشکر) اکٹھا کیا ہے، پس ان سے ڈرو، پس (اس بات نے) ان کے ایمان کو زیادہ کیا، اور انہوں نے کہا: کافی ہے ہم کو اللہ تعالیٰ، اور وہ بہتر کارساز ہے ﴿۱۷۳﴾ پس وہ لوٹے اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل لے کر، نہ پہنچی ان کو کوئی برائی، اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی پیروی کی، اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے ﴿۱۷۴﴾ بیشک یہ شیطان ہے جو ڈراتا ہے اپنے دوستوں کو، پس ان سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو، اگر تم ایمان والے ہو ﴿۱۷۵﴾

معارف ومنازل

مفسرین حضرات کے ان آیات کے بارے میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ ان کا تعلق غزوۂ حمراء الاسد سے ہے، جو مدینہ منورہ سے تقریباً آٹھ میل دور ہے۔ اور دوسرا قول حضرت مجاہد اور حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہما کی طرف منسوب ہے، وہ یہ ہے کہ ان آیات کا تعلق بدر صغریٰ سے ہے، جو تقریباً غزوۂ اُحد کے ایک سال بعد واقع ہوا، چونکہ حسن اتفاق سے یہ دونوں غزوے آپس میں یکساں اور ملتے جلتے ہیں اس لئے دونوں قول زیر بحث آگئے۔

غزوۂ حمراء الاسد میں بھی مسلمان زخم خوردہ تھے، بلکہ تازہ زخم خوردہ تھے، اور بدر صغریٰ میں تازہ زخم خوردہ اگرچہ نہیں تھے، مگر پھر بھی ایک سال پہلے کے زخموں کا اثر باقی تھا۔ قرآن کریم کی عمومیت کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم کا مقصد شاید دونوں غزووں کی طرف اشارہ کرنا ہو۔ یہ کچھ مستبعد نہیں۔ واللہ اعلم

غزوۂ حمراء الاسد میں بھی ابوسفیان نے قبیلہ عبدالقیس کے قافلہ والوں کو سمجھا بجھا کر بھیجا تھا کہ مسلمانوں کو مرعوب کرنا، اور کہنا کہ ابوسفیان پوری قوت کے ساتھ واپس آرہا ہے۔ اور بدر صغریٰ کے موقع پر نعیم بن مسعود کو اس مقصد کے لئے مدینہ منورہ بھیجا تھا کہ جاکر مسلمانوں کو مرعوب کرو، اور ان سے کہو: بدر صغریٰ کا معرکہ بڑا زبردست ہوگا، اور اب

ابوسفیان بڑی تیاری سے آرہا ہے۔

پھر جس طرح ابوسفیان اور اس کے ساتھی حمراء الاسد میں مرعوب و بزدل ہو گئے، اور مقابلہ کی ہمت نہ کر سکے، یہی حشر مشرکین کا بدر صغریٰ میں بھی ہوا۔ اور حمراء الاسد میں جس طرح مسلمانوں نے کچھ تجارت کا مال خرید کر نفع کمایا، اسی طرح بدر صغریٰ پر بہت سارا مال فروخت کر کے خوب نفع کمایا، کیونکہ وہاں ہر سال تجارت و کاروباری کا میلہ لگتا تھا، جو کہ چار دن تک جاری رہتا تھا۔

ان اسباب کے پیش نظر مفسرین کرام کی دو رائے ہو گئیں: اکثر کی رائے یہی ہے کہ غزوۂ حمراء الاسد مراد ہے، جس کا جزوی تذکرہ پہلے ہو چکا ہے، اور یہاں اس کے تتمہ کا بیان ہے۔ اور بعض کی رائے یہ ہے کہ نہیں، بلکہ بدر صغریٰ کا واقعہ مراد ہے۔ اور چونکہ دونوں واقعے آپس میں ملتے جلتے ہیں، اس لئے مزید الجھنے کی ضرورت نہیں ہے، جو بھی واقعہ مراد لیا جائے آیت پر منطبق ہی رہے گا۔

غزوۂ حمراء الاسد کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ابوسفیان اُحد کی جنگ سے واپس لوٹا، اور وادی روحا پہنچا، تو اس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہم عجلت میں سب کچھ چھوڑ کر روانہ ہو گئے، اگر ہم ایک اور زبردست حملہ کرتے تو شاید مسلمانوں کا قصہ ہی ختم کر تے، ابھی یہ لوگ زخم خوردہ، تھکے ہوئے ہیں، اگر ہم یہاں سے واپس ہو کر دوبارہ حملہ کریں تو شاید وہ مقابلہ نہ کر سکیں، اور انہیں ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر کے رکھ دیں۔ چنانچہ اس نے دوبارہ واپسی کا قصد کیا، اور یہ بات جب سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو جمع کر کے انہیں ابوسفیان کے تعاقب کا حکم دیا۔

اگرچہ مسلمان زخموں سے چور ہو رہے تھے، لیکن انہوں نے اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر بصد خوشی لبیک کہتے ہوئے روانہ ہو گئے، اور حمراء الاسد پہنچے۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے دلوں میں رعب ڈال دیا، اور وہ بے ہمت ہو کر وہاں سے مکہ روانہ ہوا، اور واپسی کا ارادہ ترک کر دیا، اور راستے میں اس کو قبیلہ عبدالقیس کا ایک قافلہ ملا، قافلہ والوں سے یہ کہتا گیا کہ تم مدینہ سے گزرتے ہوئے مسلمانوں کو ہماری طرف سے خوف دلانا، اور کہنا کہ ابوسفیان بڑی تیاری کر رہا ہے، اور اب کی دفعہ اس کا ارادہ ہے کہ مسلمانوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دے۔

مسلمانوں نے یہ سب کچھ سن کر کہا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔

اس قافلہ سے مسلمانوں نے کچھ مال بھی خریدا، اور انہیں کچھ نفع بھی ہوا۔ یاد رہے کہ قبیلہ عبدالقیس کے لوگ

اس وقت کافر تھے۔ تین سال بعد وہ سب کے سب دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ الحمد للہ

غزوۂ بدر صغریٰ کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ ابوسفیان نے اُحد سے لوٹتے وقت کہا تھا کہ آئندہ سال بدر صغریٰ میں سالانہ میلہ کے موقع پر تم کو ختم کر دیں گے۔ وہاں ہماری اور تمہاری لڑائی ہوگی، تو سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیلنج کو قبول کیا، لیکن آئندہ کے موسم میں مکہ میں قحط پڑ گیا، ابوسفیان کا لشکر "مَرَّ الظُّهران" تک آ بھی گیا، لیکن پھر بے ہمت ہو گیا۔

اس موقع پر ایک شخص نعیم بن مسعود کو کچھ مال دے کر اس خدمت پر مقرر کر دیا کہ تم جا کر مسلمانوں کے سامنے ہماری قوت اور ساز و سامان کا خوب چرچا کرو، تاکہ وہ مرعوب و خوفزدہ ہوں، اور مقام بدر میں نہ آئیں، اور ہماری بات بن جائے۔ بہر حال نعیم بن مسعود کی باتیں پورے علاقے میں پھیل گئیں۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے انہیں واضح طور پر بتا دیا کہ صورت حال یہ ہے، اور میں اکیلا اس منحوس لشکر کے مقابلے کے لئے تیار ہو رتعالیٰ کی نصرت میرے ساتھ ہے۔

مسلمان تو مسلم ، کہنے لگے: ہم آپ کے ہر حکم پر قربانی کے لئے تیار ہیں، اور سب نے حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کا ورد شروع کیا، اور ان کا کمالِ ایمان زیادہ ہوا، چنانچہ روانہ ہوئے، اور مقامِ بدر میں پہنچ گئے، دشمن نہیں آیا، اور موسم کی وجہ سے جو بازار وہاں لگتا تھا وہاں خوب تجارت کی، اور نفع کمایا، اور چند روز قیام کے بعد واپس مدینہ منورہ پہنچے۔

آیت کریمہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان کی پختگی اور اعتماد علی اللہ کا بیان ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ﴾ جنہوں نے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو مانا تھا، بعد اس کے کہ وہ زخم خوردہ تھے، ان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے کہ خود زخموں کی وجہ سے نہیں چل سکتے تھے، دوسروں کے سہارے پر چلتے تھے، وہ بھی تیار ہو گئے، اور سہارے سہارے پر روانہ ہو گئے۔ انہی میں وہ دونوں بھائی بھی تھے جو ایک دوسرے کے سہارے پر چلتے تھے۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُم۔ [ابن کثیر]

یہی لوگ تو تھے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہوا تھا، اور احسان کے درجے پر فائز رہ کر اجر عظیم حاصل کر چکے تھے۔ ان کے بارے میں ارشاد ہے کہ ان کو لوگوں نے کہا کہ مشرکینِ مکہ نے تمہارے مقابلے کے لئے ہر قسم کا اسلحہ، جنگی حربے، طرح طرح کے ساز و سامان اور افرادی قوت جمع کی ہوئی ہے، تمہاری حالت یہ ہے کہ نہتے کمزور، زخم

خوردہ، معذور ہو، اور عددی لحاظ سے بھی قلیل ہو، ان کے مسلح جرار لشکر کے مقابلہ سے عاجز ہو، پس یہی ایک صورت ہوسکتی ہے کہ ہتھیار ڈال کران کی بالادستی تسلیم کرو۔

یہ پروپیگنڈہ پورے مدینے میں عام ہورہا تھا، تاکہ مسلمان خوفزدہ ہوکر کفار کی اطاعت پر مجبور ہوجائیں، مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اعتماد علی اللہ، اور پختہ ایمان کے سامنے یہ سارے پروپیگنڈے ریت ثابت ہوئے، اوران کے ایمان واخلاص کے سیلاب نے ان سارے جھوٹے پروپیگنڈوں کوخس وخاشاک کی طرح بہا کرلے گیا، اوران کے جوش ایمانی اور جرأت ایمانی میں اضافہ ہوا، اور انہوں نے حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ کہنا شروع کیا کہ ہمارے لئے ہمارا اللہ کافی ہے، وہ بہترین کارساز ہے، اس کے ہوتے ہوئے ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔

آج ہمارا زمانہ جوکہ جمہوریت کا زمانہ ہے، سارے کام اسی ناروا پروپیگنڈے سے چل رہے ہیں۔ یہ ایک خطرناک شیطانی حربہ ہے، جس کے ذریعہ لوگ اپنے مخالفین پر کمند ڈالنے، اورانہیں زیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ پروپیگنڈہ مشرکین وکفار منافقین، یہودونصاریٰ کا بہت بڑا ہتھیار ہے، اسی کے ذریعہ وہ اپنے مذموم ارادوں کواقوام اور جماعتوں پر مسلط کرکے انہیں تباہ وبرباد کرتے ہیں۔

یہ ان کا سب سے بڑا خطرناک اسلحہ شمار ہوتا ہے۔ مغرب یورپ اس کا سب سے پہلا اور بڑا بانی ہے۔ پہلے عراق کے خلاف اتنا زوردار بین الاقوامی پروپیگنڈہ کیا گیا کہ اس کے پاس خطرناک مہلک ہتھیاروں کا کیپ ہے، ساری اقوام کو باور کرایا، پھراسی بہانے سے اس کی اینٹ سے اینٹ بجاکراسے تباہ کیا، اور جب اپناہدف مکمل کرلیا تو اعلان کیا کہ ہائے افسوس یہ سب کچھ غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔

ہر زمانے میں مغرب اپنے مخالفین خاص کر مسلمان ملکوں اور مسلم تنظیموں کے خلاف یہ چال چلاتا ہے، اور لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ بیوقوف لوگ مال، پیسہ بکثرت خرچ کرکے اپنے دشمن کو مارنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ابلیس کے شاگرد کارندے پروپیگنڈے کو بطورِ اسلحہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ پروپیگنڈہ کیا ہے؟

اس کا آسان ترجمہ یہ ہے کہ زوروشور سے خالص جھوٹ کو سچ، اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنا۔ آج ساری دنیا میں اسی پروپیگنڈے کا اقتدار اوراس کی حکمرانی ہے، جس سے اسلام اور اسلامی تعلیمات قطعاً پاک اور بری ہیں۔ اسلام روئے زمین پر واحد سچا دینِ الٰہی ہے کہ اس کا دامن ہر قسم کے غلط عقائد، اور باطل نظریات وخیالات، اور گندے اعمال سے منزہ وپاک ہے۔

اور مشہور ہے کہ بکثرت و بے تحاشا خوب جھوٹ بولنے سے جھوٹ سچ ثابت ہوتا ہے۔ اس فن میں روافض سب سے آگے ہیں۔ آیت کریمہ میں لفظ اَلنَّاس دو جگہ مذکور ہے۔ پہلے اَلنَّاس سے مراد قبیلہ عبدالقیس کے لوگ مراد ہیں، یا صرف نعیم بن مسعود مراد ہے، جو بہت سے لوگوں کی ترجمانی کررہا تھا۔ (یہ شخص بعد میں مشرف باسلام ہوا)۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں: عربی زبان سے اَلنَّاس کا اطلاق واحد اور جماعت دونوں پر ہوتا ہے۔

دوسرے اَلنَّاس سے مشرکین مراد ہیں۔

﴿اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾

ایمان کی زیادتی سے مراد تصدیقِ قلبی نہیں ہے، کیونکہ تصدیق میں زیادتی و کمی نہیں ہوتی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جوش و جذبہ اور ہمت میں اضافہ ہوا، جو کہ آثارِ ایمان ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ آخری جملہ ہے جو انہوں نے آگ میں ڈالے جانے کے وقت کہا تھا۔ اور یہ کلمہ ایک بہترین وظیفہ ہے۔ مشائخ اسے صبح و شام پڑھا کرتے ہیں، اور لوگوں کو پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ پڑھنے کی تعداد ساڑھے چار سو بتاتے ہیں، اور مہمات میں ایک ہزار مرتبہ پڑھا کرتے ہیں۔ اس کے بہت سے فوائد وخواص مشائخ سے منقول ہیں۔

حضرت ابوالحسن شاذلی مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ "اَلْقَوْلُ الْجَلِيْلُ فِىْ خَوَاص حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ" میں تفصیل کے ساتھ اس کے خواص بیان کئے ہیں۔ یہ بہت عمدہ جامع رسالہ ہے۔ واللہ اعلم

﴿فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ﴾ ...... تا ...... ﴿وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ﴾

پس وہ لوگ اللہ تعالیٰ کا انعام اور فضل لے کر واپس مدینہ منورہ لوٹے۔ اس سے مراد آخرت کے اجر و ثواب اور تجارتی منافع اور سرخروئی سب مراد ہیں۔ اور انہیں کوئی تکلیف بھی نہیں پہنچی، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضوان و رضامندی کے باعث کامیاب رہے۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی والے جہاد میں گئے تو وہ اللہ کی مرضی کے اتباع کرنے والے بن گئے۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہوئی، اور مدح و ثناء کے وہ مستحق ٹھہرے۔

یہ بدر صغریٰ پر جانے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد پندرہ سو تھی۔ بیشک اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے، اس نے دنیا میں اپنے بندوں کو غالب کیا، اور ان کے دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال کر انہیں "مَرَّالظَّهْرَان" سے واپس کیا، اور اپنے بندوں کے لئے اخروی اجر و ثواب کا وعدہ کر کے انہیں جنت کا حقدار بنا دیا۔

﴿اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾

یہ شیطان ہے جو اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے۔ یعنی اس جھوٹے پروپیگنڈے سے شیطان کے اپنے دوست کمزور ایمان والے منافق تو ڈر سکتے ہیں، مگر اہلِ اسلام پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوسکتا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ شیطان نے اپنے دوستوں کے ذریعہ جھوٹا پروپیگنڈا کروایا، تاکہ مسلمان ڈر جائیں، اور مشرکین کی اطاعت قبول کرلیں، مگر وہ ناکام ہوئے، اور اللہ تعالیٰ نے مؤمنین سے فرمایا کہ: ﴿فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ تم کافروں سے اور شیطان کے حواریوں سے ہرگز خوف نہ کرو، صرف اپنے ربّ سے اور اس کی نافرمانی وحکم عدولی سے ڈرو۔ تمہارے سچے ایمان کی یہی نشانی اور علامت ہے، بلکہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لئے یہی پیغام ہوگا کہ صرف خوفِ الٰہی کے سایہ میں اپنی زندگی گزاریں، غیر اللہ سے نہ طمع واُمید رکھیں نہ خوف وخطرہ، زندگی بھر حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ پر بھروسہ رکھیں، اور وظیفہ پڑھیں جیسے ارشاد ہے: اُذْكُرُوا اللّٰهَ يَذْكُرْكُمْ. واللہ اعلم

✿ ✿ ✿

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ
اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ
بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا
اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾

ترجمہ: اور آپ کو وہ لوگ غم میں نہ ڈالیں جو کفر کی طرف دوڑتے ہیں، بیشک یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ بنائے، اور ان لوگوں کے لئے بڑا عذاب ہے ﴿۱۷۶﴾ بیشک وہ لوگ جنہوں نے ایمان کے بدلے کفر کو خریدا، اللہ تعالیٰ کو ہرگز کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۱۷۷﴾ اور نہ گمان کریں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ بیشک جو مہلت ہم ان کو دے رہے ہیں وہ ان کے نفسوں کے لئے بہتر ہے، بیشک ہم مہلت دیتے ہیں تاکہ وہ مزید گناہ کرتے رہیں، اور ان کے لئے ذلّت والا عذاب ہے ﴿۱۷۸﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

ان آیات میں ان منافقین کا تذکرہ ہے جو مشرکین کے غلط پروپیکنڈہ سے متاثر ہوکر کفر کی طرف دوڑتے ہیں، تاکہ ان کے ساتھ تعلقات استوار کر کے کسی آئندہ خطرہ ومصیبت سے مامون رہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کے زیادہ سے زیادہ ایمان لانے سے خوشی ہوتی، اور کفر ونفاق اختیار کرنے سے اضطراب وقلق ہوتا۔ اور پریشانی اس لئے ہوتی کہ کہیں اس سے دین کو کوئی نقصان نہ ہو، اور دوسرے مسلمانوں پر کوئی برا اثر نہ ہو۔ ان آیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا جارہا ہے کہ یہ منافق کفر کی طرف دوڑ کر اللہ تعالیٰ کے دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم مطمئن رہیں، پریشان نہ ہوں، تو ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ﴾ وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غم میں نہ ڈالیں جو کافروں کی طرف دوڑ کر جاتے ہیں تاکہ ان کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کریں، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ جدھر جانا چاہتے ہیں انہیں جانے دو۔

﴿اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا﴾ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ یہ نسبت قرآن کریم میں ہر موقع پر استعمال ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی خیانت کرتے ہیں، یا مومنوں سے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کرو۔ مطلب سب کا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی نصرت کرو، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے دین کو نقصان نہ پہنچاؤ، اور دین میں خیانت سے بچو، وغیرہ۔

یاد رہے کہ اس آیت میں بہت بڑی خوشخبری، اور اہلِ اسلام کے لئے تسلی ہے کہ اگر تم صراط مستقیم پر مضبوطی سے قائم رہو، تو اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت تمہارے شاملِ حال رہے گی، کوئی دشمن خواہ مشرک ہوں یا یہود ونصاریٰ، یا کوئی اور، تمہیں ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، بشرطیکہ تم استقامت پر رہو۔ اگر تم نے اپنے دین کے ساتھ وفاداری اور استقامت چھوڑ دی، اور اغیار کے نقشِ قدم پر چلے، یا ان کے ساتھ دوستی ومحبت اختیار کی، تو اس کے ذمہ دار تم خود ہو۔ فَلَا تَلُوْمُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَكُمْ۔

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو۔ واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نہ کفر کو پسند کرتا ہے، اور نہ نفاق کو، اور نہ ہی کسی معصیت کو، اور نہ ہی کسی کے لئے دوزخ کو، جب تک خود اپنے لئے ان گناہوں اور عذابوں کو لوگ اختیار نہ کریں۔ اس مسئلے کی پوری

وضاحت سورۂ بقرہ کی آیت: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ﴾ [البقرۃ:۷] کے تحت گزر چکی ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ بیشک! وہ لوگ جنہوں نے ایمان کے بدلے میں کفر خریدا، یعنی ایمان کو چھوڑ کر کفر اختیار کیا، مجازاً اشراء سے تعبیر کیا گیا ہے، بمعنی مَبَادَلَةُ الشَّيْءِ بِالشَّيْءِ وَهُوَ اخْتِيَارُ الشَّيْءِ بِالشَّيْءِ حَيْثُ تَرَكُوا الْإِيْمَانَ وَاخْتَارُوا الْكُفْرَ مَكَانَهُ. پس انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکیں گے۔

یہاں ''لَنْ يَّضُرُّوا'' کو دو مرتبہ تاکید کے لئے تکرار کیا گیا، تاکہ انہیں تعریض ہو کہ تمہارے کفر کا وبال تم ہی پر پڑے گا، جیسے كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ کا محاورہ ہے، جیسا کرو گے ویسا بھرو گے (بھگتو گے)۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ﴾۔[البقرۃ:۱۶] (یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی ہدایت کے بدلے خرید لی ہے، تو ان کی تجارت نفع نہیں دے گی، اور وہ راستہ پانے والے نہیں تھے)۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل وحواس ظاہری و باطنی پندرہ کے قریب قوتیں عطاء کی ہیں، انسانی بدن اپنی استعداد و قوتوں کے ساتھ ایک پونجی (رأس المال اور سرمایۂ تجارتِ اُخروی) ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اُسے وجود کے ساتھ عطاء فرمائی ہیں، اور حکم دیا ہے کہ اس زندگی کی پونجی (سرمایہ) کو ایک ایسی تجارت میں لگاؤ جو تمہارے لئے نفع بخش ہو، اس پونجی کو آخرت کی تجارت میں لگا کر اس سے ایمان اور جنتی سامان نیکیاں خریدو، جو تمہیں رضائے الٰہی اور جنت تک پہنچادے۔ دیکھو! دنیا کی تجارت کا دارومدار مال پر ہے، اور مال ہر شخص کے پاس نہیں ہوتا۔

پھر دنیوی تجارت خسارہ سے خالی نہیں ہوتی، بسا اوقات اتنا خسارہ ہوتا ہے کہ اصل سرمایہ بھی کالعدم (ضائع) ہوجاتا ہے۔ پھر دنیوی تجارت کا تعلق انسانوں کے ساتھ ہے، ہر انسان اپنے فائدہ کو سوچتا ہے، نہ کہ دوسروں کے فائدے کا، اس کے علاوہ دنیوی تجارت کے لئے دور دراز ملکوں اور شہروں کا سفر اور سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے، اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ منافع محدود ہوتے ہیں۔

بخلاف اُخروی تجارت کے، اس میں ان باتوں میں سے ایک بھی نہیں ہوتی۔ پس عقلمند انسان وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تجارت کرے۔ یہ تجارت سراسر نفع بخش ہے، اور ایک ایک عمل کا ثواب لاکھوں میں ہے، اور ہر قسم کے خسارے سے پاک ہے۔

نفع اور فائدہ اتنا قیمتی اور اعلیٰ ہے، اور پائیدار بھی کہ جنت کی سرزمین کی ایک بالشت جتنا ٹکڑا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ اسی تجارت کے پیش نظر ارشاد ربانی ہے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ۟ وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ ؕ وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ﴾۔[التوبۃ:۱۱۱] (بیشک اللہ نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس بات کے بدلے خرید لئے ہیں کہ جنت انہی کی ہے۔ وہ اللہ کے راستے میں جنگ کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں مرتے ہیں اور مارتے ہیں۔ یہ ایک سچا وعدہ ہے، جس کی ذمہ داری اللہ نے تورات اور انجیل میں بھی لی ہے، اور قرآن میں بھی۔ اور کون ہے جو اللہ سے زیادہ اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا ہو؟ لہٰذا اپنے اس سودے پر خوشی مناؤ جو تم نے اللہ سے کرلیا ہے۔ اور یہی بڑی زبردست کامیابی ہے)۔

وکفار ومشرکین اور دیگر باطل مذاہب والوں نے اس اُخروی نفع بخش تجارت سے فائدہ نہیں اٹھایا، تب ہی تو سعادتوں سے محروم رہے، اور خسارے میں رہے، جن کے خسارے کا قرآن کریم نے متعدد مقامات پر تذکرہ فرمایا ہے، تو مسلمانوں سے یہی مطالبہ ہے کہ دو دن کی زندگی کا کھوٹا سرمایہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لگا کر ابدی راحتوں والی زندگی کماؤ، اور حاصل کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ایک تولہ مٹی کے عوض اربوں ٹن جواہرات خرید لے، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اس لئے سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت کا سودا مہنگا ہے۔ [ترمذی]

مہنگائی کے ایک معنیٰ یہ ہیں کہ جنت بہت قیمتی ہے، اس کا حصول کسی قیمت سے ممکن ہی نہیں، وہ محض فضلِ الٰہی پر موقوف ہے۔

دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ اس کی قیمت پوری محنت اور پوری زندگی کی طاعات وعبادات کے ساتھ مربوط ہے۔ ﴿وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ﴾ [الحجر:۹۹] ساری زندگی طاعات میں صرف کرو موت تک۔

﴿وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَھُمْ﴾...... تا...... ﴿وَلَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ﴾ کافر لوگ یہ گمان نہ کریں کہ ہماری عطاء کردہ مہلت ان کے حق میں بہتر ہے، ہم انہیں مہلت اس لئے دے رہے ہیں تا کہ وہ مزید گناہوں کا ارتکاب کرلیں، اور پھر یکبارگی ہماری گرفت میں آجائیں گے، کیونکہ جب وہ بہت بکثرت گناہوں میں مبتلا ہوجائیں گے تو فرعون کی طرح ان کی پکڑ بھی سخت مثالی ہوگی۔ فرعون چار سو بیس سال زندہ رہا، کبھی اس کے سر میں

درد بھی نہ ہوا۔﴿اِنَّ بَطۡشَ رَبِّكَ لَشَدِيۡدٌ﴾[البروج:۱۲] (بیشک تمہارے رب کی پکڑ بہت سخت ہے)۔

مفسرین کی اصطلاح میں اسے اِمۡهَالُ الۡمُجۡرِمِين کہتے ہیں، کہ مجرموں کو اللہ تعالیٰ مہلت دیتا رہتا ہے، لیکن جب انہیں سختی سے پکڑتا ہے تو بے انتہا ذلیل کر کے رکھ دیتا ہے، کیونکہ انہوں نے عمرِ گرانمایہ کے قیمتی لمحات ضائع کئے، اور زندگی کی قیمتی پونجی بجائے ایمان و طاعات کے کفر و معاصی میں لگا کر عذابِ الٰہی کو دعوت دی۔ پس عذابِ مہین ان کے مقدر کا پیغام ثابت ہوا۔ نعوذ باللہ منہ

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ عَلٰى مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَيۡهِ حَتّٰى يَمِيۡزَ الۡخَبِيۡثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطۡلِعَكُمۡ عَلَى الۡغَيۡبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجۡتَبِىۡ مِنۡ رُّسُلِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ۖ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنۡ تُؤۡمِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَلَكُمۡ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۷۹﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ مؤمنوں کو اس حالت میں چھوڑ دے جس پر تم ہو، یہاں تک کہ جدا کر دے خبیث کو پاک سے، اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ تم کو غیب پر مطلع کرے، مگر اللہ تعالیٰ منتخب فرماتا ہے جس کو چاہے اپنے رسولوں میں سے۔ پس ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ شانہ پر، اور اس کے رسولوں پر، اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ اختیار کرو گے (گناہوں سے بچتے رہو گے) پس تمہارے لئے بہت بڑا اجر ہے ﴿۱۷۹﴾

معارف ومنازل

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اُحد کی جنگ میں جو مصائب تم پر نازل ہوئے، ان کی بعض حکمتوں سے تم کو آگاہ کر دیا گیا، اور ان کے علاوہ ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین مخلصین اور منافقین میں تمیز کرے، تا کہ خبیث اور طیّب جو پہلے مخلوط تھے، اب الگ الگ ان کی تمیز اور شناخت ہو جائے۔

بہر حال! اللہ تعالیٰ کا مقصد اس تمیز کے تحت یہ ہے کہ تکالیف اور مصائب کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے جب تک مکمل یہ مقصد پورا نہ ہو۔ دوسرا طریقہ جدائی اور تمیز بین المؤمنین والمنافقین کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم میں سے ہر ایک کو منافقین کے نام سے آگاہ کر دے، اور منافقین کے پوشیدہ قلبی خیالات سے تم کو مطلع کر دے۔

خوب سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں ہے کہ وہ غیب کی باتوں سے ہر کس و ناکس کو آگاہ کر دے، کیونکہ امورِ

غیب میں ہر شخص کو آگاہ کرنا قاعدہ کے خلاف ہے۔ البتہ اس قاعدۂ عمومی سے وہ صورت مستثنیٰ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی حکمت وضرورت کے ساتھ چاہے تو اپنے منتخب بندوں میں سے جو رسول ہیں، اور رسالت کے مرتبے پر فائز ہیں، جتنا چاہے، اور جس طرح چاہے انہیں آگاہ کردے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ابتداء میں منافقین مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے۔ اکثر اوقات یہ امتیاز نہیں ہوتا تھا کہ مخلص مسلمان کون ہے، اور منافق کون ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ تم کو اس حالت پر رکھنا نہیں چاہتا، جس حالت پر تم اب ہو، بلکہ اللہ پاک کی طرف سے ایسے مصائب اور شدائد پیش آتے ہیں، اور پیش آتے رہیں گے کہ ناپاک خبیث منافقین، پاکیزہ مخلص مؤمنین سے خود بخود ممتاز ہو جائیں گے، کیونکہ مصیبت کے وقت وہ تمہاری صفوں سے علیحدہ ہو کر بھاگ جائیں گے، جس سے ان کا نفاق جو چھپا ہوا تھا ظاہر ہو جائے گا، جیسے کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر ان کے تین سو آدمی تم سے الگ ہو گئے تھے۔ ارشاد فرمایا:

﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ...﴾ [الآیۃ] اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو اس حالت پر چھوڑنا نہیں چاہتا جس پر تم اب ہو، جب تک کہ ناپاک کو پاک سے جدا نہ فرمادے۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شانہ تمہیں منافقین کے نفاق پر اس طرح مطلع فرمادے کہ تم ان کے قلوب کو جان لو، اور ان کے قلبی ارادوں پر مطلع رہو، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے۔ حکمت یہ ہے کہ عملی طور پر، ظاہری طریقے پر منافقین کا نفاق کھل جائے، اور وہ اس طرح سے واضح ہو کہ جب مصیبتیں پیش آجائیں، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان و مال خرچ کرنے کے مواقع آئیں، تو منافقین بھاگ نکلیں، جیسے غزوۂ اُحد کے موقع پر ہوا تھا کہ وہ بھاگ گئے، اور زبانی طور پر ایسے کلمات کہے جن سے قطعی طور پر وہ معلوم ہوئے۔

پس اگر مسلمانوں کو (خلافِ حکمت) منافقوں کے قلوب کا حال بتادیا جاتا، اور مسلمان حضرات اپنے علم کی بنیاد پر انہیں کہتے کہ تم منافق ہو، تو وہ ہرگز تسلیم نہ کرتے۔ اور اس کے برعکس وہ تمہیں یا منافق کہتے یا فتنہ بازی، اور عداوت شروع کرتے، تو اس طرح فضاء مکدر ہو کر اختلاف پیدا ہو جاتا، لہٰذا مصلحت یہی معلوم ہوئی کہ وہ تم سے خود بخود کھلتے ہوئے الگ ہو جائیں، جس کا واحد ذریعہ مصائب اور شدائد کا نزول ہے۔ پس مصیبتوں کے نزول کی حکمت اچھی طرح معلوم ہوئی۔

﴿وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَجۡتَبِیۡ مِنۡ رُّسُلِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ﴾ بلکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں میں سے جس کو چاہتا ہے غیب کی حسبِ ضرورت باتوں کے لئے انتخاب کرلیتا ہے، اور بعض غیبی علوم پر بھی مطلع کردیتا ہے، جیسا کہ سید الانبیاء ﷺ کو منافقین کے احوال پر مطلع ہونے کا نورِ فراست عطاء فرمایا تھا۔ اسی کی مثل ہے سورۂ جن کی یہ آیت: ﴿عٰلِمُ الۡغَیۡبِ فَلَا یُظۡہِرُ عَلٰی غَیۡبِہٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰی مِنۡ رَّسُوۡلٍ﴾[الجن] (غیب کا علم رکھنے والا ہے، اپنے غیب پر کسی کو اطلاع نہیں دیتا، سوائے کسی پیغمبر کے جسے پسند فرمالیا ہو)۔ علمِ غیب کی تشریح سورۂ جن کی اسی آیت کی ذیل میں ہم نے کی ہے۔[مظہری]

﴿فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ﴾ پس اخلاص کے ساتھ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھو۔ یہی اخلاص والا ایمان منافقین سے تمہیں ممتاز کرنے کی کسوٹی اور جدا کرنے والا ہے۔

﴿وَاِنۡ تُؤۡمِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَلَکُمۡ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ﴾ اگر تم کما حقہ اخلاص کے ساتھ ایمان لاؤ، اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو، کفر وشرک، نفاق وبدعت، اور ہر قسم کے معاصی سے بچو، اور حدودِ شریعت کی پاسداری کرو، تو تمہارے اجرِ عظیم وثوابِ کبیر کا بڑا درجہ ہوگا۔

آیاتِ کریمہ کا خلاصہ:

- جس طرح اہلِ کفر پر جلدی عذاب نہ آنے سے شبہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک واقعی مردود ہوتے تو ضرور ان پر عذاب نازل ہوجاتا۔ اوپر کی آیت نے واضح کردیا کہ عذاب کا نہ آنا کوئی مقبولیت کی دلیل نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اِمہال اور استدراج ہے، اور اِمہال میں بہت ساری حکمتیں ہیں، جیسے لِیَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا۔ تاکہ وہ کفر میں خوب ترقی کریں، اور یکبارگی عذاب سے تباہ کئے جائیں۔

اسی طرح بعض اوقات مؤمنینِ مخلصین پر مصائب وشدائد کے آنے سے جیسا کہ جنگِ اُحد میں پیش آیا تو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ یہ لوگ اگر اللہ تعالیٰ کے محبوب ومقبول بندے ہوتے، تو ان پر مصائب اور حوادث نہ آتے، تو آیتِ کریمہ ﴿مَا کَانَ اللّٰہُ لِیَذَرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ﴾ [الآیۃ]۔ میں اہلِ ایمان پر مصائب اور شدائد کے آنے کی حکمتیں اور مصلحتیں بیان فرماتے ہیں، تاکہ یہ شبہ دور ہوجائے۔

اس میں علمِ غیب کے متعلق فرمایا کہ غیب کا علم انبیاء علیہم السلام کا خاصہ ہے، جو انہیں وحی کے ذریعے جزوی طور پر معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ بھی بواسطۂ فرشتہ۔ یہ ان کا ذاتی کمال نہیں ہوتا۔ علمِ ذاتی کلی اور محیط صرف اللہ تعالیٰ کی مخصوص

صفت ہے، جو شخص اُسے کلیۃً ومحیط ہونے کی صفت کے ساتھ انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے ثابت کرے، وہ کافر ہوگا، کیونکہ اس سے نصِ قرآنی قطعی کا انکار لازم آئے گا۔ وہ یہ ہے: ﴿قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [النمل: ۶۵] (کہہ دیجئے کہ اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کسی کو بھی غیب کا علم نہیں ہے)۔

……۞……۞……۞……

وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَیْرًا
لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ
وَلِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۱۸۰﴾

ترجمہ: اور ہرگز خیال نہ کریں وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے انہیں دی ہے کہ یہ بخل کرنا ان کے لئے بہتر ہے، بلکہ وہ ان کے لئے برا ہے، جس چیز کے ساتھ انہوں نے بخل کیا عنقریب قیامت کے دن ان کو اس کا طوق پہنایا جائے گا، اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے وراثت آسمانوں اور زمین کی، اور اللہ تعالیٰ ان کاموں کی خبر رکھتا ہے جو تم کرتے ہو ﴿۱۸۰﴾

معارف ومنازل

سلسلۂ کلام چونکہ جہاد کے بارے میں تھا، جس سے منافقین جان چھڑاتے تھے، اسی طرح جہاد میں مالی امداد سے جان چھڑاتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے بخل کرتے تھے، اس لئے آیت میں بخل کی مذمت بیان فرماتے ہیں۔

سو انفاق فی سبیل اللہ اسی طرح اہم ہے جس طرح جہاد بالنفس۔ سورۃ البقرہ میں اس کے متعلق فرمایا: ﴿وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾۔ [البقرۃ: ۱۹۵] (اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرو، اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو)۔ اب اس آیت میں بخل کرنے والوں کی مذمت کا بیان ہے فرمایا:

﴿وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ﴾ بخیل لوگ بخل کر کے یہ گمان نہ کریں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے دیا ہے اس میں بخل کرنا ان کے لئے بہتر ہے۔

﴿بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ﴾ بلکہ یہ بخل اور کنجوسی ان کے لئے بہت ہی برا ہے۔ یہاں ''بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ'' کے

الفاظ نہایت اہم اور قابلِ غور ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جتلاتے ہیں کہ جس مال کے خرچ کرنے کا تم کو حکم دیا جارہا ہے، وہ تمہارا ذاتی نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا عطاء کردہ ہے، کیونکہ انسان کا جسم و بدن اور قویٰ وحواس بھی ذاتی نہیں ہیں، چہ جائیکہ مال وسرمایہ ذاتی ہو ﴿وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ﴾ [النحل: ۵۳] یعنی تمہاری اس ظاہری، باطنی، مادی، روحانی جتنی نعمتیں ہیں، سب اللہ تعالیٰ کی بخشش وعطاء کردہ ہیں۔

تمہیں کسی بھی نعمت پر غرہ ہونے کی گنجائش نہیں ہے۔ ان عطاء کردہ نعمتوں کو اپنے علم وہنر کا ثمرہ ونتیجہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ پس اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے راستے میں تمہیں کچھ خرچ کرنے کا حکم دیدے، تو تمہیں کسی بھی چون وچرا کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس کے دیئے ہوئے مال کے خرچ کرنے سے ہچکچاہٹ محسوس کرنا سراسر نادانی اور ناقدری کے سوا کچھ بھی نہیں۔

دیکھو! یہ ایک آزمائش ہے، اگر کوئی اس پر پورا نہیں اترتا تو یاد رکھیں، جو ذات سب کچھ دینے پر قادر ہے، اسی طرح وہ سب کچھ لینے پر بھی قادر ہے۔ اور اس میں دیر نہیں لگتی ﴿وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ [المائدۃ: ۱۲۰] (وہ ہر چیز پر قادر ہے)۔ بخل و کنجوسی سے بچ کر سب کچھ خواہ جان و اولاد ہو، یا مال وسرمایہ ہو، اس کی راہ میں بطیبِ خاطر خرچ کرنا ضروری ہے، کیونکہ بخل ایک ایسی مہلک بیماری ہے، جس کی وجہ سے انسان نہ صرف نیکیوں سے محروم ہوجاتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا قارون کی طرح انکار کرکے ابدی ہلاکت کے کنویں میں گرسکتا ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ بخیل اللہ کا دشمن ہے، اگرچہ عبادت گزار اور عالم کیوں نہ ہو۔ دوسری حدیث میں ہے کہ بخیل اللہ تعالیٰ سے دور ہے، لوگوں سے دور ہے، جنت سے دور اور دوزخ سے نزدیک ہے۔ [مشکوٰۃ]

قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ [التغابن: ۱۶] (جس شخص کو اس کے نفس کے بخل سے بچالیا گیا، یقیناً جانو وہ کامیاب ہوگیا)۔ حدیث میں ہے: لَا يَجْتَمِعُ الشُّحَّ وَالْإِيمَانُ فِي قَلْبِ عَبْدٍ أَبَداً. [نسائي] یعنی کسی مؤمن بندے کے دل میں ایمان اور بخل جمع نہیں ہوسکتے، جو سچا مؤمن ہوگا وہ بخیل نہیں ہوگا، یا نہیں ہوسکتا۔ اگر بخیل ہے تو ضرور ناقص الایمان ہی ہے۔

ہم متعدد مقامات میں بیان کرآئے ہیں کہ سخاوت مؤمن کی اصلی نشانی ہے، اور بخل دوزخ کے درختوں میں سے ایک ناپاک درخت ہے، جو بخیل کو دوزخ تک پہنچائے گا۔ جس طرح سخاوت ایک جنتی درخت کی شاخ ہے جو سخی کو جنت کے محلات تک پہنچائے گی۔ پھر سخاوت وبخل کا مفہوم اتنا عام ہے کہ صرف مال کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ علم و

دیگر صنعتوں، حرفتوں، انسانی کمالات تک اس کی رسائی عام ہے۔ خاص کر علم میں بخل کرنا اتنا مہلک شمار ہوگا کہ مال کے بخیل کے گناہ اور اس کی سزا سے علم کے بخیل کے گناہ اور سزا ہزار گنا زیادہ سخت ہے۔

قرآن وحدیث میں علم کے بخیل کی بہت ہی مذمت کا بیان وارد ہے۔ ارشاد ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ﴾ [البقرة:۱۵۹] جولوگ ہماری نازل کردہ واضح باتوں اور ہدایات کو چھپاتے ہیں، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت کرتا ہے، اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ اور اسکی ساری مخلوقات کی لعنتوں کی زد میں ہیں، اور ملعون ہیں۔

آیت کریمہ میں پوری اُمت کے لئے عموماً، اور اہلِ علم حضرات کے لئے خصوصاً بڑی تنبیہ ہے۔ اگر حقیقی علماء کے لئے آسمانی فرشتے اور زمینی مخلوقات حتی کہ سمندر کی مچھلیاں اور زمینی کیڑے مکوڑے اور چیونٹیاں دعاء اور استغفار پر مأمور ہیں، تو سمجھنا چاہئے کہ تمہیں علم اور علمی فیوض و برکات میں بخیلی کرنے والوں کے لئے یہی ساری مخلوقات بجائے استغفار کے لعنت کرتے ہوئے ہوں گی۔ تو چاہئے کہ اہلِ علم وفضل انبیاء علیہم السلام کی وراثت کا حق پورا پورا ادا کریں، اور ان کے مشن کو کامیاب بنائیں۔

بنی اسرائیل کے احبار ورُہبان اور ان کے علماء کیوں مبغوض اور ملعون قرار پائے؟ اور ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا﴾. [الجمعة:۵] (گدھے طرح کتابیں لادے ہوئے) انہیں کہہ کر مردار جانور، بیوقوف گدھے کے ساتھ انہیں کیوں تشبیہ دی گئی؟ وہ یہ وجہ ہے کہ انہوں نے کتاب اللہ میں تحریف کے علاوہ کتمانِ حق جیسے گناہ کا ارتکاب کیا، اور حق کو حطامِ دنیا کے عوض چھپائے رکھا۔

مختصر ایمان کی شاخوں کا بیان:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کی کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلْإِيمَانُ بِضْعٌ وَ سَبْعُونَ شُعْبَةً فَأَفْضَلُها لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَ أَدْناها إِمَاطَةُ الْأَذىٰ عَنِ الطَّرِيقِ وَ الْحَياءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ. [متفق علیه] سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان کے ستر سے کچھ اوپر شعبے ہیں، اور ان میں افضل لَا إِلٰهَ إِلَّا الله کا اقرار ہے، اور ادنیٰ درجہ راستہ سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا ہے، اور حیاء بھی ایمان کا شعبہ ہے۔

اس حدیث میں ایمان کو ایک درخت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، اور ایمان کے ساتھ متعلق اعمال کو درخت

کی شاخ بتایا گیا ہے، جس طرح درخت کی شاخ چھوٹی اور بڑی مختلف سائز کی ہوتی ہیں، اسی طرح یہ متعلقہ اعمال بھی چھوٹے بڑے ہر قسم کے ہوتے ہیں۔

یہ متعلقہ اعمال دراصل سب کے سب بنیادی اصولی ہیں، اوران میں بعض کی جزئیات دس سے بیس تک شمار ہوتے ہیں۔ ان اصول کی جزئیات کو علماء کرام نے ترتیب دیکر شمار کیا ہے، تو یہ تقریباً سات سوشعبے تک پہنچ جاتے ہیں۔ پھران کی تین اقسام ہیں: بعض کا تعلق قلب کے ساتھ، بعض کا زبان کے ساتھ، اور بعض کا جوارح کے ساتھ ہے۔

ان شعبوں میں علم کو بہت بڑی خصوصیت حاصل ہے، کیونکہ اس کے فوائد نہایت زیادہ ہیں۔ پھر علم کے شعبے جو کہ بیس اکیس کے قریب ہیں، وہ اس لئے اہم ہیں کہ وہ ذاتی اور شخصی کم ہیں، عمومی اور اجتماعی حیثیت کے اعتبار سے زیادہ ہیں۔ مثلاً یہ کہ نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ کا فائدہ صرف اسی شخص کو حاصل رہے گا جو اعمال کو بجالائے گا، کسی نمازی کی نماز کا فائدہ دوسرے مسلمانوں کو حاصل نہیں ہوگا، علیٰ هذا القیاس۔

مگر علم ایک ایسا جامع شعبہ ہے جس کی افادیت جہاد کی طرح تمام اُمت کے لئے قیامت تک عام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باقی اعمال کے ادا کرنے والے مسلمان نبوت کی وراثت کے حقدار نہیں بنادئے گئے، اور علم والوں کو انبیاء کرام علیہم السلام کی میراث کا وارث بنادیا گیا، کیونکہ ایمان کے سارے شعبوں کی بقاء وترقی علم ہی پر موقوف ہے، چونکہ انبیاء کرام علیہم السلام اپنی ذاتی حیثیت میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہوتے ہیں، اور مخلوق کے لئے تکوینی فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ایام پورے کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں، اور دینِ الٰہی چونکہ مخلوق نہیں ہے، اور اس پر فناء کا ورود ونزول نہیں ہوتا، وہ قیامت تک باقی رہے گا، اور یہی شان وحیثیت قرآن مجید کی بھی ہے۔ پس ضروری ہے کہ قیامت تک ان شعبہ ہائے دینی کے تحفظ کے لئے علم اور علماء باقی رہیں، کیونکہ علم بذات خود ایک عرض ہے، اور عرض قائم بالذات نہیں، وہ لامحالہ کسی غیر کے ساتھ ہی قائم وموجود رہے گا، وہ غیر جس کے ساتھ علم کا قیام ہوتا ہے، وہ ورثۃ الانبیاء علماء کرام ہیں، جن کو وراثت کے عظیم منصب پر فائز کیا گیا ہے۔

اور وہ جب دنیا میں موجود رہیں گے تو ان کے وجود کے ساتھ دینِ الٰہی مع اپنے شعبوں کے باقی رہے گا۔ اسی خاطر دریا کی مچھلیاں، اور دھرتی کی چیونٹیاں ان کے لئے استغفار کریں گی۔ پھر اس وراثت نبوت کے اہم پہلو دو ہی ہیں: ایک علم ہے، دوئم اس کی تبلیغ ہے۔ یعنی علم کے ذریعہ خلقِ خدا کی اصلاح اور تزکیہ کرنا، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کرنا۔

جس طرح مال اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، اسی طرح علم کو بھی اللہ تعالیٰ کا فضل کہا گیا ہے۔ اسی علم کی بدولت عالم کا درجہ عابد وزاہد لوگوں پر بہت ہی زیادہ ہے، تو جس طرح بخل مال میں جائز نہیں، اس طرح علم میں بھی بخل ناجائز اور حرام ہے۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے علم جیسی دولت عطا فرمائی ہے، اور وہ اس کو آگے لوگوں تک نہیں پہنچاتا، اور وہ بے اعتنائی سے اپنے علم میں بخل کرتا ہے، آیت کریمہ نے علم کے چھپانے والوں کو ملعون بتادیا، اور سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَنْ سُئِلَ عِلْماً فَكَتَمَهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيمَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ. [مشکوٰۃ] جس شخص سے کوئی علم کی بات پوچھی گئی، جس کو وہ جانتا تھا، مگر اس نے وہ بات چھپادی، بخل ولا پرواہی سے کام لیا، قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔

اگر کوئی سائل علم کا محتاج تھا، مگر عالم نے اس کی ضرورت کو پورا نہ کیا، تو جس طرح بے زکوٰۃ کا مال سانپ بن کر اس کے گلے کا طوق بن جائے گا، اسی طرح عالم کا علم آگ کی لگام بن کر اس کے منہ میں ڈال دی جائے گی۔ اسی خاطر علماء محققین نے فرمایا کہ اس آیت اور احادیث کے پیش نظر علماء اُمت پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ علم کی تبلیغ کریں، اور خلقِ خدا کے عقائد واعمال کی اصلاح میں شب وروز جدوجہد کریں، اور اپنے علم کے تمام ترفیوض و برکات کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچائیں۔ اس طرح گویا وہ نبوت کی نیابت کا پورا پورا حق ادا کریں گے، ورنہ وہ روزِ قیامت سخت مؤاخذے کا شکار ہوجائیں گے۔

اور بعض علماء کرام جو کہا کرتے ہیں کہ ہم لوگوں کے غلام تو نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ انہیں تبلیغ کریں، یہ بہت بری بات ہے، اگر وہ عوام کے غلام نہ سہی، مگر اپنے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم، اور اس کے علم، نیز قرآن حکیم کے ضرور غلام ہیں۔ قطب الاقطاب شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سارے جہاں کی بادشاہتوں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی مجھے بہتر اور افضل معلوم ہوئی، تب ہی تو میں نے ان کی اُمت کی اصلاح کے لئے ہمہ تن خود کو وقف کیا، اور ان کے علم کی تبلیغ کو ہر چیز سے بلند وبالا تصور کیا۔ [مکتوبات]

اس وقت پورے عالم میں اس درخشندہ نعمت علمِ نبوت کے حامل صرف مسلمان قوم ہے۔ دنیا کی سات ارب آبادی میں چھ ارب لوگ اس نعمتِ عظمیٰ، ورثۂ نبوت، کتاب اللہ سے محروم ہیں۔ انہیں ہدایت کی اشد ضرورت ہے۔ اگر قرآن وحدیث کا علم ان تک نہ پہنچے اور وہ کفر، شرک ومعاصی میں مبتلا رہیں تو اس کے ذمہ دار مسلمان اور علماء اسلام ہی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کتاب وسنت جیسی عظم نعمت سے نوازا، مگر انہوں نے اسے چھپائے رکھا. اور اسی

طرح موجودہ مسلم آبادی مسلمان ہوتے ہوئے کتاب وسنت کے احکام سے ناواقف اور بے خبر ہے۔ ان کا معاشرہ غیر اسلامی ہے، انہیں سہارا دینا، اور ان کے گھروں، حجروں کی دہلیز تک کتاب وسنت کو پہنچانا ہمارے علماء کا اسلامی، علمی، اخلاقی فرض بنتا ہے۔

ہمیں اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہیئے کہ ہم نے اپنے اس فرض کو کہاں تک ادا کیا؟ کیا روزِ قیامت ہم سے باز پرس نہیں ہوگی؟ اسی نکتہ کے پیش نظر ہمارے علماء دیو بند قدس اللہ أسرارہم نے ضرورت محسوس کرتے ہوئے ایک عالمی جماعت کی بنیاد رکھ کر تبلیغی جماعت کے نام سے اُسے متعارف کرایا، اور دیو بند کے نابغۂ روزگار شیوخ، جو کہ علمِ کتاب وسنت کے امام مانے جاتے تھے، اس جماعت کی سرپرستی کی، اور ان کی رہنمائی فرمائی، اور باقاعدہ ان کے لئے کتاب وسنت کی روشنی میں ایک تبلیغی نصاب مرتب فرمایا، اور انہیں بے سروسامانی کے عالم میں پوری دنیا کی طرف مبلغ بنا کر چاردانگ عالم میں گشت لگانے کا حکم دے دیا۔

یہ نَونہال پودا میوات کے دیہاتوں سے نکل کر حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ کا وِرد کرتا ہوا پورے عالم میں پھیل گیا۔ روئے زمین کے چپہ چپہ، بستی بستی، اور شہروں، ملکوں میں نبوتِ عظمٰی کے پیغام کو پہنچا کر وراثت نبوی کا حق ادا کیا۔ ایک صدی کے اندر اندر وہ ننھا پھول اور پودا آج شجرۂ طوبیٰ کی طرح سارے عالم پر سایہ فگن نظر آرہا ہے، جس کی عظیم کوششوں، قربانیوں کی بدولت سارے جہاں پر اتمام حجت ہوگیا۔

ہم جیسے خشک مزاج وخام خیال قسم کے مولانا صاحبان منطقی بات بناتے رہے، اور وہ نبوت کی مقدس محفلوں میں پہنچ کر دونوں جہاں کے آقا کی گود میں پہنچ گئے۔ **فَرَحِمَهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى مَا أَكْرَمَهُمْ وَمَا أَسْعَدَهُمْ.**

میرا اشارہ شارحِ علوم حدیث، قطب الاقطاب، حضرت الحجۃ محمد زکریا قدس سرّہ کی طرف ہے۔

﴿هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ حدیث شریف میں ارشادِ ربانی ہے (حدیث قدسی): اے ابن آدم! اگر تمہارے پاس ضرورت سے زیادہ مال ہے، تو اُسے خرچ کردو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، اور اگر خرچ نہیں کروگے روکوگے تو یہ تمہارے لئے برا ہے۔ [مسلم] کیونکہ خیر وشر کا تعین عقلی نہیں ہے، عقل اچھے برے کے تعین سے سراسر عاجز ہے، یہ سب کچھ وحی الٰہی کا وظیفہ ہے کہ تمام امور میں خیر وشر کا فیصلہ کرسکتی ہے۔

آگے ارشاد ہے کہ قیامت کے دن بخیلوں کے گلے میں اس مال کو طوق بنا کر ڈالا جائے گا، جس کے ساتھ

انہوں نے بخل کیا۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے سونے چاندی کی دولت عطاء کی، اور اس نے اس کی زکوۃ ادا نہیں کی، قیامت کے دن یہ مال سانپ بن جائے گا، اور اس کے گلے میں طوق کی طرح ڈالا جائے گا، اور اس کے چہرہ اور ہونٹوں کو کاٹے گا، اور کہے گا کہ: میں تمہارا مال اور کنز ہوں، جسے تم نے سمیٹ کر رکھا، اور زکوۃ نہیں دی۔

اسی طرح اس کے دیگر مال مویشی، اونٹ، بھیڑ بکری بھی حاضر ہوں گے، اس کو لٹا کر یہ سارے جانور اس کے اوپر سے مسلسل گزریں گے، اپنے پاؤں اور سینگوں سے اُسے روندیں گے، اور کاٹیں گے، مار مار کر اس کو بدحال کریں گے۔ یہ سلسلہ قیامت کے پچاس ہزار سال کے دن میں بدستور جاری رہے گا۔ [بخاری]

فرمایا: یہ مال جسے تم نے ذاتی میراث سمجھ کر اللہ تعالیٰ کا احسان تصور نہیں کیا، یہ بہت ہی برا کیا، حالانکہ ﴿وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾۔ زمین و آسمان اور ان کے اندر کی ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی میراث، اور اس کی ملکیت ہیں۔ تم ماں کے پیٹ سے خالی ہاتھ پیدا ہوئے، اور اب موت کے بعد خالی ہاتھ جا رہے ہو۔ اگر یہ مال تمہارا اپنا ہوتا تو ساتھ لے جاتے، مگر ایسا نہیں ہے۔

تم نے غلطی کی، اور ناعاقبت اندیشی کا شکار ہوئے۔ اگر تم چاہتے تو اَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ. [القصص: ۷۷] (نیکی کرو، جیسے اللہ نے تمہارے ساتھ نیکی کی ہے)۔ پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی طرح عامل رہتے، پھر تو مزہ کرتے، مگر تم نے قارون کی سنت پر عمل کیا، اور تباہ ہوئے۔ بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے مکمل باخبر ہے، اسی کے مطابق سزا و جزا دینے والا ہے۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ
مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾
ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾

ترجمہ: بیشک تحقیق اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی بات سنی ہے، جنہوں نے کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ فقیر ہے اور ہم مالدار ہیں، ہم ضرور لکھیں گے اس چیز کو جو انہوں نے کہی ہے، اور ان کا نبیوں کو ناحق قتل کرنا بھی، اور پھر ہم

(جزائے عمل کے وقت) کہیں گے کہ چکھو جلانے والے عذاب کا مزہ۱۸۱ اور یہ اس وجہ سے جو آگے بھیجا تمہارے ہاتھوں نے، اور بیشک اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے ۱۸۲

معارف ومنازل

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ [البقرۃ:۲۴۵] (وہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے؟) کی آیت نازل ہوئی تو یہود نے کہا: اے محمد! تیرا ربّ فقیر ہوگیا، بندوں سے مانگنے لگا۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ [ابن مردویہ، ابن ابی حاتم]۔

دوسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ ہے کہ ایک روز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہود کے بیت المدراس میں تشریف لے گئے، وہاں بہت سے یہودی اپنے بڑے عالم فخاص بن عازوراء کے پاس جمع تھے، وہاں یہود کا ایک اور عالم بھی موجود تھا، جس کا نام اشیع تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے فخاص! تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اسلام قبول کرو، تم خوب جانتے ہو کہ حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر ہیں، اور توراۃ میں ان کی صفات اور حقانیت سب موجود ہیں۔

اس پر فخاص نے کہا کہ اے ابوبکر! ہم کو اللہ کا کوئی احتیاج نہیں ہے، بلکہ خدا خود ہمارا محتاج ہے، اور ہم مالدار غنی ہیں، وہ ہمارا محتاج ہے۔ اگر وہ غنی ہوتا تو وہ کیوں سود دیتا، اور سود پر قرض لیتا۔ اس گستاخی پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فخاص کے منہ پر طمانچہ مارا، اور کہا کہ اگر تمہارے اور ہمارے درمیان معاہدہ نہ ہوتا تو خدا کی قسم میں آج تجھے قتل ہی کر دیتا، تم اگر ہماری تکذیب کر سکتے ہو کرو، مگر اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی نہ کرو۔

پھر فخاص سید الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں آکر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شکایت کی، جب سید الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بلا کر دریافت کیا تو انہوں نے پورا ماجرا بیان کیا۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ [مظہری، ابن ابی حاتم، بیضاوی وغیرہ]

یہود وہ نافرمان قوم ہے، جس نے نہ اللہ تعالیٰ کو معاف کیا، نہ ہی انبیاء کرام علیہم السلام کو۔ ان کا سارا سرمایہ استہزاء بالدین رہا ہے، جیسے گندے خیالات وخبیث عقائد میں وہ لت پت رہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہی ان کا غلط اور باطل عقیدہ بھی ہو، جیسے کہ ان کے عام دوسرے باطل عقائد ہیں، جن کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گزری، اور باقی سورۂ

مائدہ میں آئیں گے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کی بات ہے، اسے یہودی اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے شاید نہ سمجھ سکے۔ اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ) نہ تو فقیر ہے، اور نہ اسے اپنی مخلوق سے قرض لینے کی ضرورت ہے، اس نے جس قرض حسن کا ذکر کیا ہے، اس سے مراد محتاجوں، یتیموں، مسکینوں، بیواؤں، غازیوں اور دیگر مستحقین پر خرچ کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال میں سے مستحقین پر خرچ کرو، اور جو مال تمہارے پاس ہے درحقیقت وہ تمہارا نہیں ہے، تم اور تمہارے اموال اللہ تعالیٰ ہی ملکیت ہیں، اور آسمانوں وزمینوں میں جتنی چیزیں ہیں سب اسی کی ملک ہیں۔ جب تم اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا مال اس کی راہ میں خرچ کروگے تو وہ تمہیں دنیا وآخرت دونوں میں اس کا زیادہ سے زیادہ اجر دس گناہ سے لے کر سات سو گنا، یا اس سے زیادہ عطاء فرمائے گا۔[بخاری]

اللہ تعالیٰ کے حق میں تمہاری یہ سوچ کہ وہ (معاذ اللہ) فقیر ہے، اور ہم مالدار ہیں، نہایت احمقانہ ہے۔ حضرت باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ‌ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِىُّ الْحَمِيْدُ﴾[الفاطر: ۱۵] (اے لوگو! تم محتاج ہو اللہ کے، اور اللہ غنی، تعریفوں والا ہے)۔

اس کی ذات بے نیاز ہے، تم اور سارا جہاں اس کے سامنے فقیر اور محتاج ہو۔ یہودیت کا بیڑا غرق ہو ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ﴾[الأنعام:۹۱] (انہوں نے اللہ کی صحیح قدر نہیں پہچانی)۔ اُنہیں کوئی پہچان نہیں، یا ہٹ دھرمی کی وجہ سے وہ خالق عزّ شانہ کو اپنی طرح محتاج کہتے ہیں۔ اگر وہ اپنے اسلاف اور ماضی پر نظر رکھتے، فرعون کی غلامی کا زمانہ یاد کرتے، تو شاید کچھ شرم محسوس کرتے، مگر وہ ایسا نہیں کرتے، تب ہی تو ملعون ومبغوض ہوئے۔

اسی بے راہی اور گمراہی کی وجہ سے کبھی وہ یہ بھی کہتے تھے:﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ﴾ [المائدۃ: ۶۴] (یہود نے کہا کہ (نعوذ باللہ) اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں) یعنی جب وہ شدتِ احتیاج کا شکار ہو کر ذلت ومسکنت ان پر مسلّط ہو جاتی، اس وقت یہی خود کو غنی اور اللہ تعالیٰ شانہ کو فقیر کہنے والے چیخ اٹھتے، اور گلہ و شکوہ کر کے کہتے:﴿يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ﴾ ہم لوگ محتاج اور پریشانی کے عالم میں خدا سے رزق وفراخی مانگتے ہیں، اس کے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود ہم کو نہیں دیتا، اس کے ہاتھ جکڑے ہوئے ہیں۔ یعنی (معاذ اللہ) بخل کرتا ہے، دیتا کچھ نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں اس گستاخی پر تنبیہ کر کے جواب دیا:﴿وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ

﴿يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ﴾ [المائدۃ: ۶۴] (جو کچھ انہوں نے کہا اس کی وجہ سے ان پر لعنت لگ پڑی ہے، ورنہ اللہ کے دونوں ہاتھ پوری طرح کشادہ ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے)۔ان بدقسمت بدنصیبوں کے اپنے ہاتھ جکڑے ہوئے ہیں، اوران پر اللہ تعالیٰ کی لعنت برس رہی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ تو کشادہ ہیں، اوراپنی فیاضی کی بارش ہرلحہ نازل فرمارہے ہیں۔اگراس کی نظرِ عنایت وکرم ایک لحہ کے لئے رک جائے تو پوری کائنات درہم برہم ہوکرآپس میں ٹکرائے،اورتباہ ہوجائے۔

بہرحال! اس گستاخ قوم کی کفریات کی فہرست بڑی طویل ہے۔فرمایا:

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ﴾ بیشک ان لوگوں کی بات سن لی جنہوں نے کہا (معاذ اللہ) کہ اللہ تعالیٰ فقیر ہے، اورہم مالدار ہیں۔

﴿سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا﴾ ہم اس بات کوضرور لکھیں گے، ان کے نامۂ اعمال میں درج کر کے ضبط کرلیں گے، اور روزِ قیامت حساب وکتاب کا جب مرحلہ شروع ہوگا تو ان کا دفتر کھول کران کے سامنے رکھ دیں گے، اگر وہ انکارکریں توان کے اعضاءان کے خلاف گواہی دیں گے۔اسی کے ساتھ ان کی یہ احمقانہ ظالمانہ خصلت ﴿وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾۔انبیاءکرام علیہم السلام کے قتلِ ناحق کاانہوں نے ارتکاب کیا، وہ بھی ہم نے لکھا ہے۔

ہم ان سب لکھی ہوئی باتوں پرانہیں سخت سزادیں گے، جب کسی عام انسان کاقتل اکبرالکبائر کے زمرہ میں ہوگا، اورقاتل مغضوب وملعون ابدی جہنمی ہوگا، توانبیاءکرام علیہم السلام کاقتل کانہایت ثقیل اورناقابلِ معافی جرم متصور ہوگا، اورنبی کے قاتل سے بے شمار مرتبہ قصاص لیاجائے گا۔

حجاج بن یوسف ثقفی ظالم کوکسی نے خواب میں دیکھا، اورپوچھا بتاؤتم پرکیاگزرا؟ کہنے لگا: ہرمقتول شخص کے عوض ایک دفعہ مجھے قتل کیاگیا،مگرسعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کے عوض سومرتبہ قتل ہوا۔اس سے اندازہ ہوگا کہ نبی کے قاتل پر کیاگزرے گا۔اوراللہ تعالیٰ اگرنبی کے قاتل کولاکھوں مرتبہ قتل کرے تو یہ عین انصاف ہوگا۔نبی اسرائیل یہودیوں نے تقریباچارسونبیوں کوناحق قتل کیا۔پس انبیاءکرام علیہم السلام کے قاتلوں پراربوں لعنت اورپھٹکارہوں۔آمین

سیدالانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے سخت سزاکامستحق وہ شخص ہوگا جس نے اللہ تعالیٰ کے نبی کوقتل کیاہوگا، یاوہ شخص سب سے زیادہ ملعون ہوگاجسے اللہ تعالیٰ کانبی قتل کردے۔ایسے شخص کی مثال اُبی بن خلف کی ہے، جوغزوۂ اُحد میں خاتم الانبیاء صلے اللہ علیہ وسلم کے نیزہ کی زد میں آکرواصلِ جہنم ہواتھا۔

﴿وَنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴾ پھر ہم جزائے عمل کے وقت کہیں گے: جلانے والے عذاب کا مزہ چکھو، کہ تم اللہ تعالیٰ کی شان میں بیہودہ گستاخانہ کلمات کہتے تھے، کہ اللہ تعالیٰ فقیر ہے، اور ہم لوگ مالدار ہیں۔فرمایا: ہماری یہ سخت سزا تمہارے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی، بلکہ:

﴿ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ﴾ یہ اس گستاخی کی سزا ہے، جسے تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجا، جیسا عمل ویسا انجام۔سورۂ بقرہ میں فرمایا: ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ [البقرة:۲۸۶] (اس کو فائدہ ان اعمال کا ہوگا جو کئے ہیں، اور اس کو نقصان بھی ان اعمال کا ہوگا جو کئے ہیں)۔تمہاری اپنی کمائی متشکل ہو کر تمہارے سامنے آئے گی۔اور یہ ضرور یاد رکھو:

﴿وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر زرہ بھر بھی ظلم نہیں کرتا۔اس کی تشریح پہلے گزر چکی ہے۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَاۗءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۝ كُلُّ نَفْسٍ ذَاۗىِٕقَةُ الْمَوْتِ ۭ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝

ترجمہ: وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ہم سے عہد کر رکھا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ وہ ہمارے پاس ایسی قربانی لائے جس کو آگ کھا جائے، اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے: تحقیق تمہارے پاس مجھ سے پہلے رسول آئے واضح نشانیاں لے کر، اور اس چیز کو لے کر جو تم نے کہی ہے، پس تم نے ان کو کیوں قتل کیا؟ اگر تم سچے ہو ۝ پس اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلائیں تو بیشک آپ سے پہلے بہت سے رسول جھٹلائے گئے ہیں، جو لائے تھے کھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشن کتابیں ۝ ہر ایک نفس موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے، اور بیشک تم کو تمہارا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا قیامت کے دن، پس جو شخص دوزخ کی آگ سے دور کر دیا گیا، اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو

بیشک وہ کامیاب ہوگیا، اور نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر دھوکے کا سامان ﴿۱۸۵﴾

معارف ومنازل

امام کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ کعب بن اشرف، حی بن اخطب، خاص بن عاذورا، وہب بن یہودا، مالک بن ضیف وغیرہ سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر کہنے لگے کہ: تم دعویٰ کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیغمبر بنا کر ہمارے پاس بھیجا ہے، اور تم پر کتاب اُتاری ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو تورات میں حکم دیدیا ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی طرف پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرے تو تم اس پر ایمان نہ لانا، تاوقتیکہ وہ ایسی قربانی تمہارے سامنے نہ لائے، جس کو آگ خود بخود آسمان سے اتر کر نہ کھالے۔

پس اگر تم ایسی قربانی پیش کروگے تو ہم تمہاری تصدیق کریں گے، اور ایمان لے آئیں گے۔ اس پر یہ آیت اتری۔ پس یہاں یہودی لوگوں کے دو قول ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں ہم سے عہد لیا ہے۔ دوئم یہ کہ قربانی قبول ہونے کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں معجزہ دکھائیں تو ہم ایمان لے آئیں گے۔

دراصل انہوں نے بہانہ بنا کر یہ مطالبہ پیش کیا۔ ان کے آباء واجداد نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کن کن معجزات کو مانا تھا جو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزہ کو ماننا تھا۔ یہ وہ بڑے نافرماں لوگ ہیں، جنہوں نے ﴿لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً﴾ کارٹ لگا کر موسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور تورات کے کلامِ الٰہی ہونے سے انکار کیا تھا۔

رہا ان کا یہ کہنا کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيۡنَا﴾ یہ سراسر افتراء اور جھوٹ ہے، جیسے انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق کہا تھا کہ نبوت قیامت تک بنی اسرائیل میں رہے گی، غیر اسرائیلی کوئی نبی ہرگز نہیں آئے گا۔ اگر ان کے پاس کوئی ثبوت ہے تو پیش کریں، حالانکہ وہ اس سے عاجز رہے۔ اور وجہ اس افتراء کی یہ ہے کہ جس طرح کسی دعویٰ کی صداقت پر مطلقاً گواہ پیش کرنا کافی سمجھا جاتا ہے، اور عدالت گواہوں پر مدّعی کے حق میں فیصلہ صادر کرتی ہے، پھر کسی کو یہ کہنے کا حق ہرگز نہیں رہتا کہ ہم تو فلاں شخص کی گواہی مانیں گے، لہٰذا اسی کو پیش کیا جائے۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو اپنی نبوت کی صداقت پر کوئی بھی معجزہ، یا ایسی نشانی پیش کرنی کافی ہوتی ہے جو اس کے دعویٰ کی سچائی کے لئے ثبوت ہوجائے، کسی کو یہ حق نہیں رہتا کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے کسی خاص معجزہ یا مخصوص نشانی کا مطالبہ کرے کہ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری فرمائش والا معجزہ نہیں دکھائیں گے، اس وقت تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

نبوت کی تصدیق نہیں کریں گے۔

پس اگر لوگوں کے فرمائشی معجزات پر دار و مدار ہو، تو لوگوں کی فرمائشیں لامحدود ہوں گی، اور ہر شخص کی فرمائش الگ، اور ہر طبقہ کی الگ، تو معجزات بھی لازماً غیر محدود ہوں گی۔ اس طرح معجزات ایک بازیچۂ اطفال کی شکل اختیار کریں گے، اور یہ ممکن نہیں ہے۔ جیسے اہلِ مکہ نے کئی ایسی ناممکن باتوں کا مطالبہ کیا تھا، جنہیں قرآن کریم نے مسترد کردیا۔

دوسرے حصے کا جواب قرآن کریم نے یہ دیا کہ: اچھا اگر واقعی تمہیں قربانی کی قبولیت کے معجزہ کا انتظار ہے تو پھر تم، یعنی تمہارے بڑے ان انبیاء کرام علیہم السلام پر کیوں ایمان نہیں لائے؟ جنہوں نے تمہارا یہ مطلوبہ معجزہ پیش کیا تھا، بلکہ ان انبیاء علیہم السلام کی تکذیب، اور تکذیب سے بڑھ کر تم نے ان ہستیوں کو شہید کیا، پھر آج کیسے یہ فرمائش کررہے ہو؟

البتہ! یہ فرمائش ایسے لوگوں کیلئے شاید صحیح ہو جنھوں نے کبھی اس فرمائش کے پورے کرنے والوں کی تصدیق کی ہو، نہ کہ تمہارے مکذّبین کے لئے۔ چنانچہ بائبل میں ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام نے بعل بت کے بجاریوں کو للکارا تھا، کہ مجمع عام میں ایک بیل کی قربانی تم کرو، اور ایک کی میں کرتا ہوں، پس غیبی آگ جس کی قربانی قبول کرے وہ حق پر ہوگا، چنانچہ ایک بڑے مجمع کے سامنے حضرت الیاس علیہ السلام کی قربانی قبول ہوئی، مگر نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت کے زن پرست بادشاہ کی بعل پرست ملکہ (بیوی) حضرت الیاس علیہ السلام کی دشمن ہوگئی، جس کی وجہ سے وہ ملک سے نکل کر جزیرۂ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لے لی۔ پس کہاں گئی تمہاری حق پرستی؟ اب کس منہ سے یہ معجزہ مانگتے اور مطالبہ کرتے ہو؟

حاصل یہ کہ یہود کا یہ کہنا کہ ﴿عَهِدَ اِلَيْنَا﴾ والا دعویٰ چونکہ محض افتراء تھا، اس لئے قرآن کریم نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ انہیں کے مطالبہ قربانی کا مسلم مُسکِت جواب دے کر ان کی خباثت وہٹ دھرمی واضح فرمائی۔ مفسرین حضرات کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں یہ دستور چلا آرہا تھا (جیسے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں ہابیل وقابیل کی قربانی کا تذکرہ سورۂ مائدہ میں مذکور ہے) کہ جب قربانی کسی مقصد کیلئے دی جاتی تھی، یا مال غنیمت جمع کر کے کسی مقام پر رکھتے تھے، تو اس زمانہ کے پیغمبر دعا کرتے تھے، اس پر آسمان سے ایک سفید بادل نمودار ہو کر اس میں بغیر دھواں آگ ہوتی تھی، اس قربانی کو جلادیتی، اور یہ اس قربانی کی مقبولیت کی علامت ہوتی تھی، مگر یہ دستور بقول امام

سدی رحمۃ اللہ علیہ کے حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں موقوف ہوگیا۔ [مظہری، کبیرہ وغیرہ]

﴿اَلَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ عَہِدَ اِلَیۡنَاۤ﴾ یہی وہ بہانہ تراش، گستاخ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے توارات میں ہم کو حکم دیا ہے، اور ہدایت کی ہے: ﴿اَلَّا نُؤۡمِنَ لِرَسُوۡلٍ حَتّٰی یَاۡتِیَنَا بِقُرۡبَانٍ تَاۡکُلُہُ النَّارُ﴾ کہ جو بھی شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرے ہم اس کی تصدیق نہ کریں، تاوقتیکہ وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی پیش نہ کرے جس کو آسمانی آگ کھا جائے۔

﴿قُلۡ قَدۡ جَآءَکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِیۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیۡ قُلۡتُمۡ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیجئے کہ: اے گروہ یہود! مجھ سے پہلے بہت سے پیغمبر واضح اور کھلے معجزات تمہارے پاس لے کر آئے، اور تمہاری مطلوبہ قربانیوں کو پیش کیا، جیسے حضرت زکریا، حضرت یحیٰ، حضرت الیاس علیہم السلام وغیرہ۔ یعنی اپنے دعویٰ کی صداقت کیلئے معجزات بھی پیش کئے، اور قربانی بھی، جسے آسمانی آگ نے جلا کر ان کی تصدیق کی، مگر تم نے تکذیب کی۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان انبیاء علیہم السلام میں سے اکثر کو شہید کیا۔

﴿فَلِمَ قَتَلۡتُمُوۡہُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ﴾ پھر تم نے انہیں کیوں قتل کر ڈالا؟ تمہارے اسلاف نے تو قتل کر ہی ڈالے، اور تم ان کی اس مذموم حرکت پر راضی رہ کر اس جرم میں ان کے شریک رہے، اور اپنے اسلاف کی مذمت تک بھی نہ کی، اور نہ ہی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اگر تم اپنے اس مطالبہ میں سچے ہو۔ جواب محذوف ہے۔ یعنی پس کیوں تم ایسے پیغمبروں پر ایمان نہیں لائے؟

معلوم ہوا کہ اب بھی اگر بالفرض تمہاری مطلوبہ قربانی ظاہر اور پوری ہو، تو ہرگز تم ایمان نہیں لاؤ گے، کیونکہ یہ مطالبہ ایمان لانے کے لئے نہیں ہے، بلکہ تعصب وعناد پر مبنی ہے۔ آگے تسلی ہے:

﴿فَاِنۡ کَذَّبُوۡکَ فَقَدۡ کُذِّبَ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِکَ جَآءُوۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الۡکِتٰبِ الۡمُنِیۡرِ﴾ اب اگر یہود نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی، تو رنجیدہ خاطر پریشان نہ ہونا، اَلۡبَلِیَّۃُ اِذَا عَمَّتۡ سَہُلَتۡ. انہوں نے اور ان جیسے دیگر لوگوں نے صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب کی تکذیب نہیں کی، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بڑے بڑے اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کی بھی تکذیب ہو چکی ہے، جو کھلے معجزات لائے تھے، اور عظیم بابرکت صحیفے لے کر آئے تھے، اور واضح روشن کتاب لے کر آئے تھے۔

اگر گہری نظر اور عمیق سوچ کے ساتھ دیکھا جائے تو یہی معلوم ہو جائے گا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے

بابرکت قافلہ پر ہر زمان وہر مکان، ہر موقع نافرماں اقوام، ابلیسی گماشتے، شیطانی کارندوں نے شب خون مار کران کی تکذیب کی ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبیدۂ خاطر نہ ہوں۔ ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الأحقاف:۳۵] (صبر کریں، جیسے اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا ہے)۔

رہی یہ بات کہ ایسے عادی مجرموں کو ویسے ہی چھوڑ دیا جائے گا، اور انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے جانشینوں کی کوئی اشک شوئی نہیں ہوگی، تو یہ بات نہیں ہے، بلکہ تم سب کو مرنا اور موت کا چکھنا ضرور ہے، اور قیامت کے دن تم میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے عمل کا میٹھا یا کڑوا پھل چکھنا ہے، اور اپنے کئے کا بہتر جزاء یا بدتر سزا بھگتنا ہے، اور اس روز کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ کوئی شخص اگر دوزخ سے بچا کر جنت میں داخل کیا جائے یہی حقیقی سعادت اور کامیابی ہے۔ اس کی اوّلین صورت یہ ہوگی کہ میدان محشر کے حساب وکتاب کے بعد دوزخ سے بچا کر سیدھا جنت چلا جائے۔ دوسری صورت یہ کہ چند وقت کے لئے دوزخ میں جا کر پھر خلود فی النَّارِ سے بچا کر جنت میں داخل کر دیا جائے۔ اسی کے لئے فرمایا:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ ہر شخص مؤمن ہو یا کافر موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، تو زمین نے اللہ تعالیٰ سے شکوہ کیا کہ میرا ایک جز لیا گیا، اور اس سے آدمؑ کو بنایا گیا، تو اللہ تعالیٰ نے زمین سے وعدہ کرلیا کہ جو کچھ تجھ سے لیا گیا ہے وہ تجھے واپس کیا جائے گا، چنانچہ جو شخص جس مٹی سے بنا ہے وہ اسی مٹی میں واپس دفن کیا جاتا ہے۔

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ دنیوی زندگی اور اس کی آسائشیں واطاعت اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا نتیجہ نہیں ہیں، بلکہ: ﴿وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ قیامت کے دن تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اِنْ خَيرٌ فَخَيرٌ وَاِنْ شَرٌّ فَشَرٌّ. جیسا عمل ویسا بدلہ۔ مسلمانوں کو صبر اور طاعت کی جزا ملے گی، کافروں کو تکذیب کی سزا ملے گی۔

﴿تُوَفَّوْنَ﴾ کا کلمہ اس بات پر بھی گواہی دے رہا ہے کہ کچھ حسنات کا فائدہ اور معاصی کا ضرور دنیا میں بھی ملے گا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے: ﴿وَآتَيْنَاهُ أَجْرَهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ﴾ [العنکبوت:۲۷] (اور ہم نے اس کا اجر دنیا میں بھی دیا، اور یقیناً آخرت میں وہ صالحین میں سے ہوں گے)۔
دنیوی جزئی مکافات کے متعلق بکثرت احادیث مروی ہیں۔ اسی طرح برزخ جو کہ دنیوی اور اخروی زندگی کے درمیان

ایک حد فاصل ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رحمۃ للعالمین صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے، یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔[ترمذي و رواه الطبراني أيضاً عن أبي هريرة رضي الله عنه]

﴿فَمَنۡ زُحۡزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدۡخِلَ الۡجَنَّةَ فَقَدۡ فَازَ ؕ وَمَا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ﴾ پس جو شخص دوزخ سے دور رکھا گیا، اور جنت میں داخل کیا گیا، وہ کامیاب وبامراد ہوا، اور دنیوی زندگی تو کچھ بھی نہیں، مگر صرف دھوکہ کا سامان ہے، جیسے ایک ردی ناکارہ چیز میں ملمع سازی کر کے بائع نے بیچا، مشتری ظاہری شکل وصورت دیکھ کر دھوکہ کھایا، اور رقم دیکر خریدا، جب گھر پہنچا تو ناکارہ ناقابل استعمال پایا، اور کچرہ دان میں پھینک دیا۔ اسی وجہ سے ربّ العزّت سبحانہ نے اپنے خاص بندوں کو اس ناکارہ دنیا سے دور رکھا، اور اس کی محبت وطلب سے ان کے قلوب کو خالی کر دیا، اور اس کے بدلے آخرت کی محبت سے ان کے پاکیزہ قلوب کو بھر دیا۔

سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے پوری دنیا کی قیمت مچھر کے پَر سے کم بتا کر اپنی اُمت کو اس سے دور رہنے کی ہدایت فرمائی۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: دنیا گھاس کی مانند ہے، یا بچیوں کی گڑیوں کی طرح ہے، جس کا کوئی حاصل نہیں ہے۔ مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: دنیا برائیوں اور ناکارہ چیزوں کا مجموعی خلاصہ ہے، جو اس کو طلب کرے گا وہ اپنی جان اور اہل وعیال کا دشمن ہوگا، اور جو اسے طلاق دے گا وہ بڑا عقلمند کہلائے گا، اور اپنے پورے کنبے کا خیر خواہ شمار ہوگا۔

تو مسلمانوں سے یہی کہا جا رہا ہے کہ دنیا اور دنیوی زندگی سے فریب مت کھاؤ، اس کو اپنی آخری منزل مت سمجھو، کہیں دھوکے میں پڑ و کہ امن وسکون اور راحت حاصل کریں گے، جتنا کسی کا ایمان پختہ ہوگا اتنا ہی وہ یہاں خوار و پریشان ہوگا۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت اور زندگی کو مشعل راہ بنا کر زندگی گزارو۔

یہ فریب خوردہ شاہین جو پلا ہو کرگسوں میں ☆ اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ ورسم شہبازی

لَتُبۡلَوُنَّ فِيۡۤ اَمۡوَالِكُمۡ وَاَنۡفُسِكُمۡ ۟ وَلَتَسۡمَعُنَّ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَ

مِنَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡۤا اَذًى كَثِيۡرًا ؕ وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ۱۸۶

ترجمہ: البتہ تحقیق تم ضرور آزمائے جاؤ گے اپنے مالوں اور جانوں میں، اور البتہ ضرور سنو گے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تم سے پہلے، اور ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا بہت سی تکلیف دہ باتیں، اور اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ کی راہ پر قائم رہو گے تو بیشک یہ مقصودی کاموں میں سے ہے ﴿۱۸۶﴾

معارف منازل

ابھی یہ بات طے ہوئی کہ دنیاوی زندگی غرور دھوکے کا سامان ہے، جس کی مستقل کوئی حقیقت نہیں، خاص کر تمہارے مسلمانوں کے لئے دارالابتلاء، امتحانوں اور آزمائشوں کا گھر قرار پایا، تو مستقل نہ ہوا۔ یہاں تمہیں مال و اولاد دے کر آزمایا جاتا ہے، اور کبھی یہ چیزیں واپس لے کر آزمایا جاتا ہے۔ صحت میں اور بیماری میں، مالداری اور فقیری میں، امن اور خوف میں، راحت وسکون اور بے آرامی، کھانے پینے اور رزق وروزی میں، غرض یہ کہ زندگی کے ہر موڑ پر تمہاری آزمائش ہوتی رہے گی، اور دیکھا جائے گا اور پرکھا جائے گا کہ کون مخلص وفادار ہے، اور کون بے صبرو ناشکرا ہے۔

جنگ بدر میں فتح وکامیابی کے ساتھ، غزوہ اُحد میں شکست وناکامی کے ساتھ تمہارا امتحان ہوا تھا اور آئندہ قیامت تک تمہیں امتحانات کی چکی میں ڈال کر طرح طرح سے آزمایا جائے گا، تاکہ جنتی زندگی میں تمہارے درجات بلند سے بلند تر ہوں۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ﴾۔ [البقرة:۱۵۵] (اور ہم تمہیں آزمائیں گے ضرور خوف سے، اور بھوک سے، اور مال وجان اور پھلوں میں کمی کر کے، اور جو لوگ صبر سے کام لیں ان کو خوشخبری سنا دو)۔ ﴿وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً﴾ [الأنبياء:۳۵] (اور ہم تمہیں مبتلا کریں گے بری اور بھلی حالت میں آزمانے کے لئے)

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "وَيُبْتَلَى الرَّجلُ عَلى قَدْرِ دِينِهِ". انسان اپنے دین کے مرتبے اور مقدار کے مطابق آزمایا جاتا ہے۔ أشدّ البلاء الأنبياء ثم الأمثلُ فالأمثل. ابتلاء پر پورا اترنا لازم ہوگا، اور صبر کا تلخ پیالہ پینا ضروری ہوگا۔ تب مرض کا خاتمہ ہو کر ابدی صحت جنتی زندگی کے مراتب نصیب ہوں گے۔

آیت کریمہ میں عمومی ابتلاء کے علاوہ ایک خصوصی ابتلاء کا بھی ذکر ہے کہ یہود ونصاریٰ اور مشرکین طرح طرح سے تم کو ایذاء دینے کی کوشش کریں گے، مثلاً یہودیوں کا یہ کہنا کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ﴾۔ اسی طرح

وہ کہتے تھے: ﴿يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ﴾ [المائدة:۶۴] (اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں (نعوذ باللہ)) یا ان کا یہ کہنا کہ حضرت عزیز علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، وغیرہ۔ اور نصاریٰ کا یہ کہنا کہ خدا تین ہیں، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ثالث ثلاثہ اور اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، وغیرہ۔ اور مشرکین کا یہ کہنا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، اور تین سو ساٹھ بتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک مانتے تھے، اور تمہارے مقابلے میں ان کی فوج کشی اور لڑائیاں وغیرہ۔ اس کے علاوہ یہودی سرداروں کا سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف مشرکین کی مالی مدد کرنا، اور انہیں اسلحہ فراہم کرنا، انہیں مالی امداد دینا، اور تمہارے دین کے خلاف ان کے باطل دین اور بت پرستی کو اسلام کے مقابلے میں برحق کہنا، اور سمجھنا۔ اور اس کے ساتھ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ہرزہ سرائی، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مذاق اڑانا، اور محفلوں میں ان کی ہجو اور بے بنیاد مزمتی اشعار پڑھنا، اور مسلمانوں کو تنگ کرنا، اور انہیں لعن طعن کرنا وغیرہ۔

کعب بن اشرف یہودیوں کا بڑا با اثر مالدار سردار تھا، تین چار مرتبہ مدینہ سے مکہ گیا، اور مشرکین کو مسلمانوں کے خلاف اکسایا، اور انہیں مال واسلحہ دیتا رہا ہے۔ اس کا بہت بڑا قلعہ ہوتا تھا جو کہ ابھی تک اس کے آثار محفوظ ہیں، مسجد قباء کے نزدیک یہ شخص اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ابو جہل کی طرح سخت مخالف تھا۔ روزانہ رات کو اس کے گھر پر عشاء سے آدھی رات تک مجلس ہجوم منعقد ہوتی تھی، جس میں آنحضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجو ومذمت میں شعراء اپنا کلام پیش کرتے تھے۔

اور یہ خود بھی شاعر تھا، آخر میں یہ اپنا کلام مذمتوں سے بھرا ہوا پیش کرتا تھا، اور جو شاعر حد سے زیادہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجو ومذمت میں غلو کرتا تھا، یہ اسے انعام دیتا تھا۔

ایک دن فجر کی نماز کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہا: مَنْ لِكَعْبِ بْنِ أَشْرَفَ؟ فَإِنَّهُ آذَى اللّٰهَ وَرَسُولَهُ. تمہارے اندر کوئی ہے کہ کعب بن اشرف کا کام تمام کردے؟ جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت ایذاء پہنچائی۔ حضرت محمد بن مسلمہ جو کہ کعب بن اشرف کے رضاعی بھائی تھے کہنے لگے: یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں تیار ہوں، کیا میں اسے قتل کردوں؟

فرمایا: ہاں! پس وہ اس مہم کو لے کر روانہ ہوئے، اور عہد کیا کہ جب تک کعب کو قتل نہیں کروں گا اُس وقت تک کوئی دانہ پانی نہیں کھاؤں گا، چنانچہ تیسرے دن عشاء کے بعد کعب کے گھر کے دروازہ پر اسے قتل کر کے جہنم رسید کیا۔ مہم میں اس نے چار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تعاون بھی حاصل کیا۔

چوتھے روز نماز فجر کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مژدہ سنایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے خوش ہوئے، اوران کے لئے اوران کے ساتھیوں کیلئے دعاء فرمائی۔ [بخاری باختصار]

کعب بن اشرف کے قتل کے ساتھ اگر چہ کچھ سکون حاصل ہوا، مگراس کے دوسرے رفیق جو کہ کعب سے کہیں زیادہ مسلمانوں کے لئے خطرناک تھا وہ تھا ابورافع بن ابی الحقیق۔ یہ شخص بہ نسبت کعب کے زیادہ مالدار تھا، اور رتبہ میں قوم یہود کے اندر بڑے مرتبہ والا تھا۔ بیت المقدس اور شام کے یہودیوں کا بھی سردار تھا۔ مدینہ منورہ سے ستر اسی میل دور خیبر میں رہتا تھا۔

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عتیک کی سرپرستی میں دس آدمی روانہ فرمائے، یہ وہاں پہنچے کسی وادی میں اتر گئے، اور ٹھہر گئے، صرف حضرت عبداللہ نے اکیلا جا کر اس کے گھر میں بیوی بچوں کے درمیان اس کا کام تمام کیا، اوراسے جہنم رسید کیا۔ [بخاری مختصراً]

﴿لَتُبْلَوُنَّ فِيٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ﴾ اے مسلمانو! ضرور البتہ تم آزمائے جاؤ گے۔ یعنی لازمی طور پر تمہاری آزمائش ہوگی، تمہارے مالوں میں بھی اور جانوں میں بھی۔ یہ خطاب اگر چہ براہ راست صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہورہا ہے، مگر یہ اپنے عموم کے ساتھ قیامت تک سارے دیندار مسلمانوں کو شامل ہے، جیسے کہ ہم اپنے اس زمانے میں مشاہدہ کررہے ہیں، اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا، جیسا کہ کتاب الفتن کی حدیثوں میں ہے۔

﴿وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا﴾ اور تم ضرور سنو گے ان لوگوں کی طرف سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دیگئی (یہود ونصاریٰ) اوران لوگوں سے بھی جنہوں نے شرک کیا (قیامت تک آنے والے مشرک، خواہ مکہ کے ہوں یا ہندو و بدھ مت، اس میں سارے مشرک شامل ہیں) بہت سی تکلیف دہ باتیں۔

مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب اور دیگر مشرک اقوام کی طرف سے تمہیں حد سے زیادہ اذیت ناک باتیں سننا پڑیں گی، ایسی تکلیف دہ باتیں وہ پہلے بھی کرتے آئے ہیں، اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے، وہ اپنی زبانی اور قولی عملی اذیتوں سے کبھی باز نہیں آئیں گے۔ تمہاری دل آزاری ایک اعتبار سے ان کی فطرت خبیثہ اور منشور کا لازمی عنصر ہی ہے، اور ہمیشہ رہے گی، تا قیامت، لہٰذا تمہیں ذہنی طور پر ان اذیتوں کے لئے تیار رہنا ہوگا، اور سہنا پڑے گا۔ تم یہ سب کچھ آئے دن دیکھتے رہو گے، اور صبر واستقامت کے ساتھ برداشت کرتے رہو گے۔

چنانچہ ہم نے ہر موقع اور ہر محاذ پر دیکھا، اور اب بھی ہمارے مشاہدہ میں ہے کہ ان اقوام نے جہاں کہیں کسی بھی مادی ذرائع سے غلبہ حاصل کیا تو اہل ایمان پر بے دریغ طعن وتشنیع اور ظلم وستم شروع کیا، اور ان کی تذلیل کے درپے ہوئے، اور ان پر عرصہ حیات تنگ کرنے کی پوری کوشش کی۔

غرضیکہ ان کفار سے خواہ اہل کتاب ہوں یا ہندو، یا عام مشرک، چائنا کے بدھ مت ہوں، یا ہندوستان کے ہندو، یا روس کے دہریہ، یا مغرب کے یہود ونصاریٰ وغیرہ، یہ سارے مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ یہ مذہبی سطح پر کبھی آپس میں نہیں الجھتے، مگر مسلمان کی دل آزاری اور کرۂ ارض سے مٹانے اور ختم کرنے پر سب متفق ہیں۔ ان لوگوں سے جیسا بھی بن پڑے گا اسلام اور مسلمانوں کی تذلیل ودل آزاری میں کوئی موقع ضائع نہیں کریں گے۔

سلطان نورالدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں ان کے گماشتے ایجنٹ جنید بغدادی کی شکل، وضع وقطع کے ساتھ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ایک زمینی سرنگ کے ذریعہ پہنچنے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے احترامی کی کوشش کی، جو کہ ناکام ہوئے۔ پورا واقعہ سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں لکھ چکا ہوں، وہاں دیکھا جائے۔

کبھی ایسا بھی ہوا کہ ان بدبختوں نے اپنے کتوں پر ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام رکھا، کبھی قرآن مجید کی ناجائز تفسیر لکھ کر کسی مسلمان عالم کی طرف نسبت کی، اور شائع کردیا، کبھی بڑے خوبصورت کتابت وعمدہ کاغذ پر قرآن مجید کو غلط سلط چھپوا کر شائع کیا۔

کئی مرتبہ بڑے بڑے اجتماعات میں برسر بازار قرآن مجید کے سیکڑوں نسخوں کو نذر آتش کردیا، اور یہ سلسلہ ابھی بھی امریکی پادریوں کے بھیانک کردار کے ذریعہ جاری ہے۔ کبھی ان کی کمپنیوں نے بڑے پیمانے پر جوتے بنائے، جن کے نیچے اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام اور کلمہ طیبہ لکھے ہوئے پائے گئے۔ شراب کی بوتلوں پر کلمہ شریف اور بسم اللہ شریف لکھے ہوئے پکڑے گئے۔ قالینوں پر اور جائے نمازوں پر قرآنی آیات اور خلفاء راشدینؓ کے نام لکھوائے گئے، تاکہ پاؤں کے نیچے آجائیں۔

غیر ملکی کپڑوں پر پوری مہارت کے ساتھ اسمائے حسنیٰ اور سورۂ فاتحہ وآیت الکرسی اور سورۂ اخلاص لکھی گئیں، اور متعدد مسلمان ممالک میں بھیجے گئے تاکہ بیٹھنے پر یہ سارے کلمات شرمگاہ اور سرین کے نیچے آجائیں۔ اسی طرح دل آزار فلم جو کہ آئے دن نیٹ پر آرہی ہیں، اور نہایت بیباکی کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین اطہر، اور قرآن مجید کے دلخراش نمونے ان فلموں کے ذریعہ عالم اسلام کی دل آزاری کیلئے پھیلا رہے ہیں۔ ان سب

کے باوجود امۃ مسلمہ اور اسلامی صحیح مذہبی دیندار قیادت سے محرومی کی وجہ سے کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی، سوائے مروجہ عوامی احتیاج و احتجاج کے۔

علامہ امیر شکیب ارسلان رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یورپ اور امریکہ کے عیسائیوں نے قرآن کریم اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف تقریباً چھ لاکھ کتابیں شائع کی ہیں۔ برطانیہ کے برصغیر پر قبضہ کے بعد یہاں کے مسلمانوں نے یا خوف یا لالچ کی بنیاد پر برطانوی شہری بن گئے، اس مکار ظالم نے سوائے اسلام کے اور کسی مذہب کو نہیں چھیڑا، اور اسلام کی اصلی خدوخال اور صورت کے بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

مصنوعی مشائخ اور جھوٹے نبیوں کی پوری کھیپ تیار کی۔ آج ہر قصبہ وہر بستی اور ہر علاقے میں بزرگوں کے مزاروں کا راج ہے، اور بلا خوف وخطرہ قبروں پر بے تحاشا سجدے ہو رہے ہیں۔ جس کعبۃ اللہ کے پاس مسلمان جا کر اس کا طواف کرتے تھے، آج ۱۲ ربیع الاوّل کو پورے برصغیر میں کعبۃ اللہ یہاں آکر گلی کوچوں اور بازاروں کا طواف کر رہا ہے۔

یہ سب کچھ کس کی کارستانی ہے؟ اسی عیسائیت کی۔ براین عقل وایمان بباید گریست۔ اگر یہ دین یا دین کا حصہ ہوتا تو دیگر اسلامی ممالک میں بھی اسکا رواج ہوتا، مگر ایسا نہیں ہے یہ صرف برصغیر کیلئے عیسائی تحفہ ہے۔

ایک برطانوی انگریز نے لکھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا خدا بدو تھا، جو اونٹ چراتا تھا، کیونکہ مسلمانوں کے قرآن میں ہے ''نَاقَةُ اللهِ'' یعنی اللہ کی اونٹنی۔ آج انہی دشمنان خدا، دشمنان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دشمنان اسلام کی گود میں بیٹھ کر ہمارا تعلیم یافتہ مسٹر فخر ہی محسوس کرتا ہے۔ یہ ہے ہماری دینی حمیت۔ کیا اسلام اور اسلامی تعلیمات ہمارے لئے کافی نہیں؟ اور ہمارے امراض کے وافی وشافی علاج نہیں؟ کہ جسے چھوڑ کر ہم دشمنوں کی مکارانہ چال چل رہے ہیں۔ تو مطلب یہ ہوا کہ اسلام دشمنی میں یہود ونصاریٰ، مشرک، صابی، بدھ مت، ہندو مت سب ایک جیسے برابر کے شریک ہیں، اور مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے میں کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

پس اسی کے پیش نظر ربّ العزّت، حلیم وخبیر جل جلالہ نے فرمایا کہ ایسی ناشائستہ باتیں تم پہلے بھی سن چکے ہو، اور آئندہ بھی سنو گے، لہٰذا تیار رہو، اور جان لو کہ لوگ ہمیشہ میوہ دار درخت پر پتھر پھینکا کرتے ہیں، اور مخالفت ہمیشہ شخصیت کی ہوتی ہے، بے کمال شخص یا ناہموار مذہب کی مخالفت میں کوئی وقت ضائع نہیں کرتا۔ تمہارے ساتھ الجھنے والے خود ہی تباہ وفنا ہو جائیں گے، بشرطیکہ تم اپنے ربّ کے حکموں پر مضبوط ایمان اور صبر وتقویٰ کے زیور سے آراستہ

و پیراستہ رہو۔

اور جو تاج اللہ تعالیٰ نے تمہارے سروں پر رکھا ہے اسے اتارنے یا تبدیل کرنے کی سعی نہ کرو۔ تمہارا یہی تاج جو کہ عبارت ہے، ایمان وتقویٰ اور صبر سے اسے تھامے رکھو، تو فرمایا: ﴿وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا﴾ اگر تم صبر کرو گے، اور تقویٰ اختیار کرو گے، یعنی محض صبر نہیں، بلکہ ﴿وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ﴾ [البقرة:۴۵] (اور مدد حاصل کرو صبر اور نماز کے ذریعے) پر عامل رہو، اور عُجلت و نا اُمیدی سے پرہیز کرو، اور جہاد جیسے بابرکت پیشہ پر کاربند رہو، اور احکام شریعت پر قائم رہو، اور نتیجہ اپنے پروردگار پر چھوڑ دو۔

﴿فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ﴾ پس یہی مقصودی اور پختہ امور میں شمار ہوگا۔ یعنی مطلوب ومقصد تک پہنچانے والا یہی اَمر ہے کہ صبر وتقویٰ کا دامن تھامے رکھو۔ واللہ اعلم

……۞……۞……۞……

وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكۡتُمُوۡنَهٗ ۚ فَنَبَذُوۡهُ وَرَآءَ ظُهُوۡرِهِمۡ وَاشۡتَرَوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ فَبِئۡسَ مَا يَشۡتَرُوۡنَ ۝۱۸۷

ترجمہ: اور (اس بات کو یاد کرو) جب کہ اللہ تعالیٰ نے پختہ عہد لیا، ان لوگوں سے جن کو کتاب دیگئی کہ اس کو تم ضرور لوگوں کے سامنے ظاہر کرو گے، اور اس کو چھپاؤ گے نہیں، پس انہوں نے اسے پس پشت پھینک دیا، اور اس کے بدلے میں خریدی تھوڑی سی قیمت، پس بہت بری چیز ہے جو انہوں نے خریدی ۝۱۸۷

معارف ومنازل

میثاق کے معنی ہیں مضبوط پختہ (باندھنا) عہد وپیان۔ ارشاد ہے: ﴿فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى﴾ [البقرة:۲۵۶] (یقیناً اس نے پکڑلیا مضبوط کڑے کو) بمعنی مضبوط ومحکم کے۔ فرمایا: ﴿فَشُدُّوا الۡوَثَاقَ﴾ [محمد:۴] (مضبوط باندھ لو) بمعنی باندھنے کے۔

اور آیت کریمہ میں بمعنی عہد کے ہے۔ قریب قریب تینوں معانی میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ میثاق اس پختہ عہد کو کہتے ہیں جس کا پورا کرنا ضروری ہو، اور ترک عہد شکنی اور جرم ہو۔ یہ میثاق کبھی اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان ہوتا ہے، جیسے "عهد اَلَست" کا ازلی میثاق۔ کبھی پیغمبر اور اس کی اُمت کے درمیان ہوتا ہے۔ کبھی دو قوموں کے

درمیان ہوتا ہے، اور کبھی دو شخصوں کے درمیان۔

بہرحال! میثاق کوئی بھی ہو عقلاً، شرعاً، اخلاقاً اس کا پورا کرنا ضروری ہے، اور عہد شکنی ناجائز ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے میثاق ازلی کے ساتھ متعدد مقامات پر میثاق النبیین اور میثاق اہل کتاب وغیرہ، سب کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ سورہ بقرہ اور آل عمران میں میثاقوں کا تفصیلی بیان گزر چکا ہے۔

﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ﴾ یعنی یاد کرو اس وقت کو جب اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے پختہ عہد لیا تھا، یعنی تورات وانجیل کے اندر اللہ تعالیٰ نے علماء اہل کتاب سے عہد لیا تھا کہ لوگوں کے سامنے ان کتابوں کے احکام کو کھول کر ضرور بیان کرو گے یہاں ''ہٗ'' کی ضمیر کتاب اور عہد دونوں کو راجع ہوسکتی ہے۔ یعنی کتاب کے احکام بھی مراد ہیں، اور نفس میثاق کا لوگوں کے سامنے اظہار بھی مراد ہوسکتی ہے۔

فرمایا: تم بغیر کسی کمی بیشی کے بیان کرو گے، اور چھپاؤ گے نہیں، مگر ان بدنصیبوں نے جہاں دوسرے احکام کے اظہار سے پہلوتہی کر کے من مانی کی، وہاں اس عہد کو بھی پشت پیچھے ڈال کر اسے چھپایا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ﴾ انہوں نے کتاب کو یا عہد کو پس پشت پھینک دیا، اور پرواہ تک نہ کی۔ سب سے اہم اور کلیدی عہد اس کا تھا کہ تم نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان لاؤ گے، انکی نصرت کرو گے، اور ان کے دین کا اتباع کرو گے، انکی کتاب کی تصدیق کرو گے۔

تورات وانجیل میں انکی جو صفات ہیں لوگوں کے سامنے علی الاعلان ان کا اظہار کرو گے، جیسے فرمایا: ﴿الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ﴾ [الأعراف:۱۵۷] (وہ جن کو وہ اپنے ہاں لکھا ہوا پاتے ہیں تورات اور انجیل میں)۔ اسی طرح: ﴿يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ [البقرة:۱۴۶] (آپ کو جانتے ہیں، جیسے اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں، بیشک ان میں سے ایک گروہ حق کو چھپاتے ہیں، اور وہ جانتے ہیں)۔

یہ اہل کتاب آخری پیغمبر ﷺ کی صفات وحقانیت کو تورات وانجیل میں دیکھتے ہیں۔ اب آپ ﷺ کی بعثت کے بعد آپ ﷺ کو اسی طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنی اولادوں کو پہنچانتے ہیں۔ اور کبھی تنہائی میں اپنی مجلسوں میں اقرار بھی کرتے ہیں کہ یہ وہی آخری پیغمبر ہے، اور یہ کتاب وہی آخری کتاب ہے جسکا تذکرہ ہماری کتابوں میں ہے۔

اہل کتاب کی طرف سے کتمان حق کے بہت سے اسباب تھے۔

☆......اوّل یہ کہ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ نبوت اولاد اسحاق (بنی اسرائیل) سے نکل کسی بنی اسماعیلی خاندان میں منتقل ہو۔

☆......دوئم یہ کہ وہ نبوت کو جدی میراث سمجھتے تھے۔

☆......سوئم یہ کہ اگر وہ اس عہد و میثاق کا اظہار کرتے، اور ایمان لاتے تو ان کی سرداری ہمیشہ کے لئے ختم ہوجاتی، اور ان کی حیثیت و بڑائی برباد ہوجاتی ہے۔ یہ بات عام مشاہدہ ہے کہ اگر ایک بادشاہ کسی دوسرے بادشاہ کا تابع بن جاتا ہے تو اسکی اپنی بادشاہت کی حیثیت ختم ہوجاتی ہے۔

اگر اہل کتاب کے علماء اظہار حق کر کے آخری نبوت کو تسلیم کرتے ہیں تو عبداللہ بن ابی بن سلول کی طرح ان کا شمار عام لوگوں میں ہوگا، اور ان کی برتری کا نام ونشان نہیں رہے گا۔ اور یہ سارے شکرانے، عیش و تنعم، خرمستیاں ختم ہوجائیں گی۔

آج ہمارے زمانے کے قبر پرست مزاروں کے مجاور علماء گیارہویں اور عرسوں کے شکرانوں پر پلنے والے اچھی طرح ہم سے زیادہ جانتے ہیں کہ ہمارا یہ قبروں کا مسلک باطل اور شرک پر مبنی ہے۔ وہ بیچارے اپنے عوام معتقدین کے سامنے اگر اس کا اظہار کریں گے تو ان پر قیامت آئے گی۔ یہ ساری گاؤ مستیاں، شکرانے، تیجے، چالیسویں ختم ہوجائیں گے، اور چودھراہٹ و سرداری بھی تباہ ہوجائے گی۔

پس وہ یہودی علماء کی طرح بے یار و مددگار رہیں گے، اور دراصل یہ ورثہ انہیں یہود و نصاریٰ کے علماء سے ملا ہے۔ سرور عالم رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض وفات میں ارشاد فرمایا تھا: لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارىٰ اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَاءِهِمْ وَصَالِحِيهِمْ مَسَاجِداً. پھر فرمایا: اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُعْبَدُ. [بخاري]

ہمارے زمانہ کے مزار و گنبد پرست بیچاروں نے یہ ورثہ یہود و نصاریٰ سے حاصل کیا، اور انہی کے نقش قدم پر چل کر اپنی آخرت تباہ کردی۔ اب بھی ان کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہے، مگر جہل مرکب میں پھنسا ہوا شخص خواہ مشرک ہو، خواہ بدعتی ہدایت ہرگز حاصل نہیں کرسکتا۔ یہود و نصاریٰ کے علماء نے حقیر دنیا کی خاطر کتمان حق کر کے ہدایت کو بیچا، اس کے عوض ضلالت خریدی، اور حق و آخرت بیچ کر عوض میں باطل اور حطام دنیا خریدا۔ یہ بہت برا سودا ہے۔ فرمایا:

﴿فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ﴾ پس بری ہے وہ چیز جو وہ (حق کے چھپانے کے عوض) معاوضہ میں لے رہے ہیں۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: یہ عہد اللہ تعالیٰ نے علماء سے لے لیا تھا کہ جو شخص کچھ جانتا ہو وہ دوسروں کو بتائے، چھپا کر نہ رکھے۔ علم کی باتوں میں بخل نہ کرے، کیونکہ اخفاء علم موجب ہلاکت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی شخص سے ایسی علم کی بات پوچھی جائے جس کو وہ جانتا ہو اور وہ چھپائے رکھے تو قیامت کے دن اسکے منہ میں آگ کی لگام دیجائے گی۔ [رواہ الحاکم] اور ابن ماجہؒ نے یہ حدیث حضرت انس کی روایت سے نقل کی ہے۔ [مظہری]

فائدہ:

مدینہ منورہ میں یہود کے دس بڑے عالم تھے۔ اگر یہ دس اسلام قبول کرتے تو سارے یہودیوں کو اسلام کی سعادت حاصل ہو جاتی، جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث ہے، مگر یہ سارے محروم رہے، صرف حضرت عبداللہ بن سلام کو یہ شرف حاصل ہوا کہ انہوں نے پہلی فرصت میں اسلام قبول کیا۔

﴿ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ کا مطلب یہ ہے کہ پوری دنیا، اور اسکی راحتیں اور اموال، آخرت کی کسی ادنیٰ نعمت کے مقابلے میں حقیر اور بے قیمت ہیں، جیسے ارشاد ہے: ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ﴾ [النساء: ۷۷]۔ (کہہ دیں کہ دنیا کا ساز و سامان تھوڑا ہے)۔ دنیا کا سارا مال بھی قلیل ہے آخرت کے مقابلے میں، اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص سمندر میں سوئی ڈبو کر نکال لے، سوئی کے ذریعہ وہ کتنا پانی حاصل کرے گا؟ فرمایا: آخرت کی نسبت پوری دنیا ایک سوئی کے برابر ہے۔ [ترمذی]

اگر کوئی شخص پوری دنیا کا مال و متاع بھی سمیٹ کر رکھ لے تو کتنے روز اس کے پاس رہے گا؟ آخری اُمت کی تو عمر ہی تھوڑی ہے، ستر و اسی سال کے قریب۔ پہلی اُمتوں کے لوگ پانچ پانچ چھ چھ سو سال تک یا کچھ زائد عمریں پاتے تھے، مگر وہ بھی دنیا کا مال دنیا ہی میں چھوڑ کر چلے گئے۔ فارس کے اوّلین بادشاہوں نے نو نو سو یا ہزار سال تک حکمرانی کی، عیش و عشرت میں رہے، لہٰذا اس دنیا کے بڑے سے بڑے مال یا حکمرانی کی بھی کوئی حقیقت نہیں، یہ بچیوں کی گڑیوں کا کھیل ہے۔

- مگر بے سمجھ لوگ اس پر بھروسہ کر کے ایمان جیسی ابدی نعمت کو دنیا پر قربان کر رہے ہیں، اور ہمہ وقت دنیا کے حقیر مال کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ عزّت و شرافت، علم و تقویٰ، ننگ و حیا جیسی نعمتوں کو حقیر مال کے عوض بیچ رہے

ہیں۔ سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا: ہر اُمت کا کوئی نہ کوئی فتنہ ہوتا ہے، اور میری اُمت کا فتنہ مال ہے۔ [ترمذی] دوسری حدیث میں فرمایا: مجھے اپنی اُمت پر فقر و ناداری کا ڈر نہیں، بلکہ مجھے یہ خوف ہے کہ تم پر دنیا اور مال کی فراوانی ہوگی، اور تم اس کی رغبت کرو گے، اور اسکی محبت میں پھنس جاؤ گے، اور یہ تمہیں اسی طرح تباہ کردے گی، جس طرح پہلے لوگوں کو دنیا کی فراوانی اور ہوس نے تباہ کردیا۔ [متفق علیہ]

پس واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیوی مال کوئی پسندیدہ مقبول چیز نہیں ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام اور مقبول بارگاہ لوگوں کو اس سے باز اور دور رکھا، جیسے کہ کوئی اپنے مریض کو مضر اشیاء سے باز رکھتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے مال کی جگہ اپنے دوستوں کو علم دین کی نعمت سے نوازا، اور اپنے محبوب رسول اکرم ﷺ کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا: ﴿وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ [النساء: ۱۱۳] (اور آپ پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے)۔

پھر اس فضل عظیم کی زیادتی اور برکت کی خاطر آپ ﷺ کو حکم دیا کہ یہ کہو: ﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا﴾ [طٰہٰ: ۱۱۴] (کہہ دیں: اے میرے ربّ میرے علم میں اضافہ فرما)۔ خیر القرون کا زمانہ دنیا اور دنیوی مال و متاع کی طلب و ہوس سے بیگانہ رہا، وہاں حکمران، امراء اور عوام کے دلوں کا دھڑکن صرف علم ہی رہا۔ ہر گھر مدرسہ بنا ہوا تھا۔ ہر محفل کی سجاوٹ علم سے ہوتی۔ مرد، عورت، نابالغ بچے، بچیاں علم ہی کے سایہ میں پرورش پاتے تھے۔

صبح سے ظہر تک بازاروں میں کاروباری مشغلہ جاری رہتا تھا، شام کو یہ سارے تجار علماء کی محفلوں میں پہنچ کر علم سیکھتے تھے۔ حکمرانوں، اِمراء، وزراء، بڑے بڑے مالداروں کے جوان بچے علماء حدیث وفقہ کی کفش برداری کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اگر کسی شخصیت کو وزارت کا قلمدان سونپا جاتا تو اس سے علم قرآن وسنت کا امتحان لیا جاتا۔ جب تک کوئی تاجر دکاندار فقہی مسائل کا امتحان پاس نہ کرتا وہ بازار میں دکان نہیں کھول سکتا تھا۔ علماء کرام مسند حدیث وفقہ پر بیٹھ کر درس دیتے تھے تو ہزاروں لوگوں کا اجتماع ہوتا تھا، سارے وزراء درس حدیث کی محفلوں میں بیٹھ کر علم سیکھتے تھے۔ علماء کے بڑے بڑے وظائف بیت المال سے جاری ہوتے۔

تصنیف وتالیف پر خلیفہ کی طرف سے وظائف جاری ہوتے تھے، یہ سلسلہ وہاں سے چلا برصغیر میں پہنچ کر وہی پزیرائی حاصل کی۔

ایک عالم دین نے مرہٹی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا، مغل بادشاہ نے اسے سونے کے ساتھ تولا، اور

سارا سونا اس کو بخش دیا، اور سات پشت تک اس کے پورے خاندان کے لئے پنشن مقرر کیا۔ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ کو سالانہ دہلی کے شاہ جہان مغل بادشاہ سونے چاندی کے ساتھ تولا کرتے تھے۔ جب مجمع بحار الانوار کے مؤلف علامہ محمد طاہر پٹنی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کتاب لکھی تو بادشاہ کی طرف سے پورے شہر کے باشندوں کیلئے پر تکلف دعوت کا انتظام ہوا، اور شیخ کو سونے سے تولنے کا پروگرام طے پایا، مگر نابغۂ روزگار حضرت علامہ نے معذرت کی۔ رحمۃ اللہ علیہ پھر بادشاہ نے بجائے حضرت شیخ کے حکم دیا کہ ان کی کتاب کو سونے کے ساتھ وزن کر کے سارا سونا حضرت شیخ کے حوالہ کیا جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اس اُمت کے بادشاہوں، وزراء، امراء، سرداروں، مالداروں کے لئے یہ پیشکش نہیں ہوتی ہے کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث ہوں گے۔ یہ قرعہ فال اور سرمایہ حسن و جمال کا اعلان علم والوں کے نام پر نکلتا ہے کہ اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ. [متفق علیه]

یہ شرف علم ہی کو حاصل رہا کہ اس کے حاملین سارے انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث مقرر ہوئے۔ پس اگر علماء نے علم کا تحفظ، اور اسکی پاسداری کی، علم کے میدان میں عمل کے شہسوار بنے، علم کی پرورش کی، درس وتدریس، تصنیف و تالیف اور تبلیغ کے ذرائع سے علم کی تشہیر و اشاعت کی، علم کے شرف ومزایا، اور احکام و برکات سے خلق خدا کو دل کھول کر بلاکم وکاست آگاہ کیا، پڑھایا، بتایا، اور یہود ونصاریٰ کے علماء والوں کی طرح کتمان علم سے پرہیز کیا، اور اظہار حق کے ساتھ پروردگار عالم جل شانہ کے بندوں کے تاریک دلوں کو روشن کیا، اور اپنے مورث اعلیٰ انبیاء کرام علیہم السلام کے نقش قدم پر چل کر علم کی خدمت کی، تو یقیناً وہ کامیاب ہوں گے، اور اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ط [الفاطر: ۲۸] (بیشک اللہ کے بندوں میں سے علماء ہی اس سے ڈرتے ہیں) کے مصداق بنیں گے۔

قیامت کے روز مشک وعنبر اور کستوری کے ٹیلوں پر براجماں ہوں گے، اور وہ سعادت پائیں گے، اور حاصل کریں گے کہ تمام جنتی ان پر رشک کریں گے۔ لیکن اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا، اور اپنے علم پر عامل نہ رہے، اور کتمان علم کا پیشہ اختیار کیا، حکمرانوں اور مالداروں، امراء کے دروازوں پر حاضری دے کر ان کے ظلم وستم پر راضی اور خاموش رہے، تو روز قیامت یہ علم سانپ اور اژدہا بن کر ان کے گلے کا طوق ہوگا، اور ان کے منہ میں جہنم کی آگ کی لگام بنے گی۔

علم را برتن زنی مارے بود ☆ علم را بردل زنی یارے بود (مثنوی)

مگر افسوس ہے کہ آج چند نا عاقبت اندیش، طالب دنیا، مذہب فروش، نام نہاد علماء سوء کی وجہ سے یہ علم نبوی تعویذ گنڈے، جادو، شرک، قبر پرستی، عرسہائے بزرگان، بدعت وفال بینی کی نذر ہو رہا ہے، اور گاجر، مولی، آلو اور پیاز کی طرح برائے نام خانقاہوں اور حجروں میں بک رہا ہے۔ اور حقیر دنیا کے عوض فروخت ہو رہا ہے۔ پیروں، فقیروں، سیدوں اور تعویذ گروں کی لونڈی بنا ہوا ہے۔

یہ علم جس مقصد کیلئے آیا تھا اس مقصد سے سیکڑوں میل دور پریشان نظر آ رہا ہے، اور جن گناہوں، تاریکیوں، اور معاصی کے مٹانے کیلئے اترا تھا، آج بد قسمتی سے ان معاصی کی گود کی زینت بنا ہوا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رٰجِعُونَ۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حسن بن عمارہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ میں امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اُس زمانہ میں گیا، جب انہوں نے حدیث بیان کرنا چھوڑ دیا تھا، میں نے ان کو گھر کے دروازہ پر پایا، اور کہا: اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھ سے کوئی حدیث بیان کر دیں۔

انہوں نے فرمایا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں نے حدیث بیان کرنا چھوڑ دیا ہے؟ میں نے کہا: یا تو آپ بیان کریں، یا پھر میں آپ سے ایک حدیث بیان کروں۔ بولے تم بیان کرو۔ میں نے کہا: مجھ سے حکم بن عیینہ نے یحیٰ جزار کے حوالے سے بیان کیا، جزار نے کہا: میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سنا، آپ رضی اللہ عنہ فرما رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جاہلوں سے علم سیکھنے کا عہد اس وقت تک نہیں لیا جب تک علماء سے علم سکھانے کا وعدہ نہ لیا۔ پھر امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے چالیس حدیثیں بیان کیں۔

امام ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں یہ حدیث حارث کی سند سے ابو اسامہ کی روایت سے لکھی ہے، اور مسند الفردوس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہ حدیث مرفوعاً منقول ہے۔ [مظہری]

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۸۸﴾

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۸۹﴾

ترجمہ: نہ گمان کریں آپ ان لوگوں کے بارے میں جوخوش ہوتے ہیں اس چیز پر جوانہوں نے کی ہے، اور پسند کرتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے ان باتوں پر جوانہوں نے نہیں کیں، پس نہ گمان کریں آپ کہ ان کو عذاب سے کامیابی حاصل ہوگی، اور ان کے لئے تو دردناک عذاب ہے ﴿۱۸۸﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ﴿۱۸۹﴾

معارف ومسائل

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک روز مروان نے اپنے دربان سے کہا: جا کر ابن عباسؓ سے پوچھو کہ جب ہم میں سے ہر شخص اپنے کئے پر خوش ہوتا ہے، اور ناکردہ نیکی پر تعریف کئے جانے کو پسند کرتا ہے، اور ایسے شخص کو عذاب دیا جانا یقینی ہے تو کیا پھر ہم سب کو عذاب دیا جائے گا؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تمہارا اس آیت سے کیا تعلق؟ اس کا واقعہ تو یہ ہے کہ سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو طلب فرمایا، اور ان سے کوئی بات پوچھی، یہودیوں نے اصل بات چھپالی، اور کوئی دوسری بات بتائی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظاہر یہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دریافت کیا تھا ہم نے وہی بتایا، اور اس فعل پر انہوں نے مستحق تعریف بننا چاہا، لیکن اپنی جگہ پر وہ اس امر سے خوش تھے کہ ہم نے وہ اصلی بات چھپالی جو سید عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے دریافت کی تھی۔ اس بیان کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے یہ آیت تلاوت کی: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ...... تا...... بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا﴾

شیخین (بخاری ومسلم) نے حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ کچھ منافق ایسے تھے کہ جب سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کسی جہاد پر جاتے تھے تو وہ بہانہ بنا کر شرکت نہیں کرتے تھے، پیچھے رہتے تھے، تو یہ لوگ قسمیں کھا کر معذرت پیش کرتے تھے، اور ناکردہ نیکی پر تعریف کے طلبگار ہوتے تھے، اس پر یہ آیت: ﴿لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ﴾ اتری۔

علامہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت کا نزول یہود اور منافقین دونوں کے حق میں ہوا۔ یہی دونوں روایتوں میں تطبیق ہے، کیونکہ دونوں واقعات کا ایک ہی زمانہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنے کئے پر خوش ہوتے ہیں، اور ناکردہ عمل پر مدح وتعریف کے خواستگار رہتے ہیں، وہ یہ گمان نہ کریں کہ عذاب سے بچ جائیں گے۔ اب رہا یہ سوال کہ انہوں نے کیا کیا، اور کیا نہ کیا؟ وہ یہ کہ جو کچھ اہل کتاب اور منافقین نے کیا وہ یہ ہے کہ حق بات کو چھپایا اور اس کے بدلے میں دنیا کا حقیر مال وصول کیا، اور ہر قسم کا فریب ودھوکہ کیا، وہ اس پر بھی خوش ہو رہے ہیں۔

اسی طرح جہاد پر نہیں گئے، اس پر بھی خوش ہوئے؛ اور جو کام نہیں کیا وہ نیکی کا کام ہے، حق بات کو ظاہر نہیں کیا۔ آنحضرت ﷺ کی صفات اور قرآن کی حقانیت کو ظاہر نہیں کیا۔ اسی طرح جہاد پر نہیں گئے، اب وہ چاہتے ہیں کہ ان کے ناکردہ عمل پر بھی لوگ ان کی تعریف کریں کہ یہ بہت اچھے سمجھدار لوگ موقع شناس ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ ان کی جہالت اور خام خیالی ہے، وہ اس قسم کی شرارت اور فریب بازی سے اللہ تعالیٰ کی گرفت اور عذاب سے ہرگز بچ نہیں سکتے، بخلاف مؤمنون مخلصوں کے کہ اس قسم کے غلط خیالات سے پاک ہیں کہ وہ کسی ناکردہ عمل تو درکنار وہ اپنی نیکیوں پر بھی کسی مدح وتعریف کے انتظار میں نہیں ہوتے۔ اگر وہ ہزاروں اعمال حسنہ اور طاعات بجالاتے ہیں تو صرف رضائے الٰہی ان کا مقصد ومطلوب ہوتی ہے۔ نیکیوں اور اعمال صالحہ کی بجا آوری کے باوجود ڈرتے اور کانپتے ہیں کہ کہیں کسی کوتاہی اور غلطی سے گرفت نہ ہو، اور اجر وثواب ضائع نہ ہو۔ وہ اکثر اپنے اعمال حسنہ کو لوگوں سے چھپا کر انجام دیتے ہیں کہ شرک اصغر یا اور نام ونمود کا مرض لاحق نہ ہو۔

اس کے باوجود اگر کوئی ان کی طہارت ودینداری کی تعریف کرے تو وہ خوش نہیں ہوتے، اور کبر وغرور کا شکار بھی نہیں ہوتے۔ البتہ یہ ایک طبعی بات ہے کہ اعمال حسنہ کے انجام دینے پر روحانی سکون واطمینان انہیں حاصل ہوتا ہے، جیسے کہ حدیث میں ارشاد ہے: اِذَا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَسَاءَتْکَ سَیِّئَتُکَ فَاَنْتَ مُؤْمِن. یعنی مؤمن کی علامت یہ ہے کہ نیکیوں پر اسے خوشی اور گناہوں پر غم محسوس ہو، اگر وہ روزہ، نماز، زکوٰۃ وصدقہ دیدے تو روحانی مسرت وخوشی محسوس کرے، اگر کبھی اس سے کوئی غیر اختیاری گناہ سرزد ہو تو غم وپریشانی محسوس کرے۔ یہ عین ایمان ہے، اور یہ خوشی روحانی اور طبعی ہے، جو کہ جائز اور مستحسن ہے، جیسے کہ آپ اگر چار سال کے بچے کو شاباش دیں گے تو بہت خوش ہوگا، اگر غصہ کریں گے تو وہ رونے لگے گا، اور پریشان ہوگا، یہ ایک طبعی امر ہے، حالانکہ بچہ کبر وغرور اور نفسانی خیالات سے دور ہے۔

﴿لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ﴾ آپ ان لوگوں کے بارے میں گمان نہ کریں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت اور عذاب سے بچ جائیں گے، اور انہیں کوئی کامیابی حاصل ہوگی۔ وہ کون لوگ ہیں؟ وہ یہ ہیں کہ اس چیز پر خوش ہو رہے ہیں جو انہوں نے کی ہے، اور چاہتے ہیں کہ ان کے ناکردہ کاموں پر بھی لوگ ان کی مدح وتعریف کریں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب مقرر ہے۔

﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، ساری کائنات اس کی ملکیت ہے۔ یہ لوگ کتنے احمق ہیں کہ سارے جہاں کے ربّ، مالک الملک، مختار کو فقیر کہتے ہیں، اور اس کے عہد و میثاق کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے کیسے بچ سکیں گے جو کہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کی وسیع وعریض سلطنت جو آسمانوں اور زمین پر محیط ہو اس کا مجرم کہیں چھپ نہیں سکے گا۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾
الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

ترجمہ: بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے، اور رات دن کے اختلاف میں البتہ نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لئے ﴿۱۹۰﴾ وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہوں، بیٹھے ہوں یا کروٹوں کے بل لیٹے ہوں، اور وہ غور و فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور کہتے ہیں:) اے ہمارے ربّ! تو نے نہیں پیدا کیا اس کو باطل (بے مقصد) پاک ہے تیری ذات، پس بچا تو ہمیں آگ کے عذاب سے ﴿۱۹۱﴾۔

معارف ومنازل

اوپر کی آیت ﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ایک دعویٰ تھی، یہ آیت ﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اس کی دلیل ہے۔ فرمایا: یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور بنانے میں، اور رات اور دن کے آگے پیچھے، نیز چھوٹے اور بڑے ہونے کے ساتھ، یکے بعد دیگرے آنے جانے میں اہل عقل وخرد اور صحیح عقل رکھنے والے لوگوں کے لئے توحید الٰہی کے بڑے بڑے واضح دلائل ہیں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں شکوک وشبہات کرنے والے لوگ دو قسم کے ہیں: ایک تو وہ جو خدا تعالیٰ کے وجود ہی کے منکر ہیں۔ اور دوسری وہ جو اس کے وجود کو تسلیم تو کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ کسی نہ کسی مخلوق کو شریک کرتے ہیں۔ پہلی قسم کے لوگوں کو ملحد یا دہریہ کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم کے لوگوں کو مشرک کہتے ہیں۔ اس دوسری قسم کے مشرکوں کی بہت ساری اقسام ہیں۔ آج کل مغرب یورپ میں بکثرت لوگ ملحد اور اللہ تعالیٰ کے

وجود کے منکر ہیں۔ اور ایشیا میں بکثرت لوگ مشرک ہیں، خالص موحد لوگ نہایت قلت میں ہیں۔

قرآن کریم عام طور سے توحید کے دلائل بیان کرنے میں ان ہر دو فریق کو سامنے رکھتا ہے، اور جہاں تک انسانوں کے اعتقادیات کا تعلق ہے یہی چند مسائل ہیں جن میں دنیا بھر کے کافر اور مشرک ایک طرف ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ماننے والے اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھنے والے ایک طرف ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا وجود، اس کی توحید، اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر، قرآن کریم اور دیگر کتب سماویہ، قیامت، مرنے کے بعد دوبارہ زندگی، حساب وکتاب، جنت ودوزخ وغیرہ پر یقین رکھنا۔

چونکہ یہ مسائل نہایت اہم ہیں، اور یہی ایمان کی حقیقت اور اس کے بنیادی ستون ہیں، اس لئے قرآن کریم نے ایمان کے بنیادی مباحث اعتقادیہ میں ان چیزوں سے بار بار مختلف انداز میں بحث کی ہے، چنانچہ اس موقع پر بھی انہی اہم مسائل پر مدلل بحث ہو رہی ہے۔

پس سمجھ لیجئے کہ یہ عالم امکان اپنے وجود میں جس طرح ایک واجب الوجود کا محتاج ہے اسی طرح وہ واجب الوجود ہر ممکن کی شرکت سے بھی پاک ہے، واجب الوجود کا تعدد بدیہی طور پر محال ہے۔ آسان مطلب یہ کہ کوئی ممکن و موجود بغیر صانع کے نہیں ہوا کرتا۔ جب آپ کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو فوراً ذہن اس کے بنانے والے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، خواہ وہ چیز کتنی معمولی یا غیر معمولی ہو۔ جب بدون بنانے والے کے کوئی چیز خود بخود نہیں بن سکتی تو یہ عالم کبیر خود بخود کیسے اور کس طرح بن سکتا ہے؟ اور اس کی مصنوعات کے آثار وخواص خود بخود کیسے موجود ہو سکتے ہیں؟

جو لوگ کائنات کے صانع اور پیدا کرنے والے کے منکر ہیں، انہیں چاہئے کہ اپنے لئے خود محنت کر کے مکان نہ بنائیں، سڑکیں اور شہر تعمیر نہ کریں، کھانے پینے کی اشیاء پر محنت نہ کریں، نیز دیگر تمام ضروریات زندگی پر محنت ترک کریں، کیونکہ بقول ان کے جب یہ عالم بغیر صانع کے پیدا ہوا ہے تو ان کی یہ چیزیں بھی بغیر صانع کے خود بخود تیار ہوں۔ اور یہ عقل وبداہت سے کوسوں دور ہے۔ جب ایک روٹی بغیر محنت وکاریگر کے تمہارے لئے خود بخود تیار نہیں ہو سکتی، تو یہ وسیع وعریض کائنات بغیر خالق کے کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟

ہیچ چیزے خود بخود چیزے نشد ☆ ہیچ آہن خود بخود تیغے نشد

عقل فاسد از وجودش قاصر ست ☆ قعر دریا از وجودش روشن ست

(مثنوی)

لوگوں نے ایک دہریہ کو کشتی میں بٹھایا، جب دریا کے وسط میں پہنچے تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دریا میں ڈالنے لگے، وہ فوراً بول اٹھا: خدا کیلئے مجھے دریا میں غرق نہ کرو، لوگوں نے کہا: کون ہے وہ خدا جس کا تم ہمیں واسطہ دیتے ہو؟ کہنے لگا: جو ہمارا تمہارا اور تمام عالم کا خالق ہے۔ یہی مطلب ہے اس شعر کا کہ قعر دریا نے اسے خدا کے ماننے پر مجبور ہی کر دیا، جیسے مشرکین کا حال ہوتا تھا۔ ﴿فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ [العنکبوت:۶۵] (پس جب کشتی میں سوار ہو جاتے ہیں تو اللہ ہی بلاتے ہیں، خالص کر کے اس کے لئے دین)۔

مطلب یہ ہے کہ اگر لوگ، عوام الناس، جہلاء، غیر تعلیم یافتہ ہی سہی کہیں ایک جھونپڑی کو دیکھیں تو فوراً یہی فیصلہ کریں گے کہ اس کا بنانے والا مالک ضرور کوئی ہے۔ آپ ہزار دفعہ انہیں قسم کھا کر سمجھائیں کہ یہ بغیر کسی بنانے والے کے خود تیار ہوا ہے شاید کسی کو یقین نہ آئے، اور ہم وثوق سے کہتے ہیں کہ ہرگز کوئی یقین نہیں کرے گا۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے: الْبَعْرُ تَدُلُّ عَلَى الْبَعِيرِ وَالأَقْدَامُ تَدُلُّ عَلَى الْمَسِيرِ فَكَيفَ السَّمٰواتُ الْعُلٰى ذَاتُ أَبْرَاجٍ وَالأَرْضُونَ ذَاتُ فِجَاجٍ كَيفَ لَا تَدُلُّ عَلَى اللَّطِيفِ الْخَبِيرِ. جب پڑا ہوا گوبر دلالت کرتا ہے اونٹ پر، اور پاؤں کے نشان دلالت کرتے ہیں کسی چلنے گزرنے والے پر، تو کیوں یہ بلند و بالا برجوں والے آسمانوں اور بچھی ہوئی راستوں اور گزرگاہوں والی زمیں دلالت نہ کریں اپنے بنانے والے لطیف وخبیر خالق کائنات پر؟ جل سبحانہ۔

مطلب یہ ہے کہ ایک عارضی قدم کا نشان اور اونٹ کا گوبر اپنے مدلول پر دلالت کرسکتا ہے، تو یہ ہزاروں لاکھوں سالوں سے قائم کارخانہ قدرت جس کا آج تک اور تا قیام قیامت نہ کوئی احاطہ کر سکا ہے اور نہ ہی آئندہ کر سکے گا، اپنے مالک وخالق کے وجود پر کیسے دلالت نہیں کرے گا؟

اگر کسی کے پاس ایک ذرہ برابر عقل سلیم ہو وہ بغیر کسی منطقی حجت و برہان کے یہی کہے گا کہ: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾۔ پس جو لوگ سب کچھ دیکھتے ہوئے مشاہدہ کرتے ہوئے اس عظیم کائنات کے مالک وخالق کا حقیقی وجود تسلیم نہیں کرتے تو یہ عناد وہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں۔ کسی شاعر نے صحیح کہا کہ...... ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ☆ چشمہ آفتاب را چہ گناہ

ایک انگریز پروفیسر نے کسی عام آدمی سے پوچھا کہ خدا کے وجود پر تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟ کہنے لگے: پانی کی ٹینکی کے نیچے جب ادنیٰ سوراخ ہو تو وہاں سے پانی ٹپکنا شروع ہوتا ہے، شام تک سارا پانی ٹپک کر ختم ہو جاتا

ہے، ٹینکی خالی ہوجاتی ہیں، جبکہ تمہاری ٹینکی (پیٹ) ہر وقت بھری رہتی ہے، جس کے نیچے دوانچ کا بڑا سوراخ ہے، بغیر بلٹ کے اس سے کچھ بھی نہیں ٹپکتا ہے، یہی دلیل ہے خالق کائنات کے وجود پر کہ اس نے انسانوں اور حیوانات میں اپنے وجود وقدرت کی ایک اعلیٰ نظام کی تخلیق کی۔ اس دیہاتی کے جواب سے پروفیسر لاجواب اور شرمندہ ہوکر کہا: یہ جواب صحیح اور برمحل ہے۔ فَفِي كُلِّ شَيءٍ لَهُ آيَةٌ تَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ وَاحِدٌ.

کائنات کی ہر چیز اور ہر ہر ذرہ میں اس کی حقانیت اور توحید کا مظہر واضح اور نمایاں ہے، دنیا کے سارے عقلاء مل کر ایک مکھی مچھر پیدا نہیں کرسکتے، اور نہ آئندہ کرسکیں گے، لہٰذا وہی ذات پاک کائنات کا خالق ومالک ہے، اور اس میں اس کا کوئی شریک ہے ہی نہیں۔ عالم کائنات کے بنانے میں کسی کی شرکت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب کوئی تھا ہی نہیں تو شرکت کیسی؟ اس عالم امکان کا ہر ہر ذرہ اپنے وجود اور اپنی ذات میں واجب الوجود کا محتاج ہے اور جو چیز اپنے وجود وثبوت میں محتاج ہوگی وہ چیز اپنے دیگر لوازمات میں بھی محتاج ہوگی، لہٰذا ایک طرف احتیاج ہی احتیاج، اور دوسری طرف وجوب ہی وجوب، تو ایسی حالت میں شرکت باری تعالیٰ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مگر یہ سب کچھ سمجھتے، اور باور کرتے ہیں وہ لوگ جن کو عقل سلیم کی نعمت سے نوازا گیا۔ عقل سقیم اور عقلِ فاسد والوں کے لئے یہ وسیع میدان تنگ وتاریک ہی ہوگا، وہ لَا يَعْقِلُوْنَ وَلَا يَشْعُرُوْنَ رہیں گے۔ باقی رہے مادہ پرست لوگ، یہ دنیا کا کتنا ہی علم حاصل کرلیں کہ وہ اللہ تعالیٰ شانہ کی مصنوعات کی تاروں میں ہی الجھ کر رہ جاتے ہیں، اور صانع کی صحیح معرفت ہرگز حاصل نہیں کرسکتے۔ معرفت الٰہی کا دروازہ ان پر بند ہے۔ ایسے لوگ بڑے بڑے سائنس دان تو ہوسکتے ہیں، بڑے بڑے فلاسفر تو کہلا سکتے ہیں، محقق اور دانشور بھی ہوسکتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی معرفت تک ان کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ یہ ظاہر بین دانشور انسانوں میں اگر چہ بڑے قیمتی لوگ شمار ہوتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی حیثیت گدھے کتوں سے بھی کم ہے۔ ﴿إِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِندَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ [الأنفال: ۲۲] (بیشک جانوروں میں سے بدترین وہ ہیں جو بہرے گونگے ہیں، عقل نہیں رکھتے)۔ بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ گدھے کتے اپنے مالک کو پہچانتے ہیں، اور مالک کے فرمان بردار رہتے ہیں، حکم مانتے ہیں، مگر یہ لوگ اس سے بھی پست ہیں۔ فرمایا:

﴿إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ﴾

بیشک زمین وآسمانوں کی تخلیق میں، اور رات دن کے آگے پیچھے آنے جانے میں، اسی طرح گھٹنے بڑھنے

میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ سورۃ البقرہ: آیت ۱۶۴ کے تحت اس پر تفصیل سے کلام ہو چکا ہے، وہاں ملاحظہ ہو۔ عقل اللہ تعالیٰ کی وہ بڑی نعمت ہے جو اشرف المخلوقات انسانوں کو باقی تمام مخلوقات اور جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ دراصل انسان کی دیگر مخلوقات پر فضیلت و برتری کا اصلی سبب یہی عقل ہے، اور یہ عقل اپنی ذات کے لحاظ سے ایک اعلیٰ روشن صفت ہے، جس کے ذریعہ انسان اپنی زندگی، اعمال و کردار اور معاشرہ کو سنوار کر اپنے لئے کامیابی و سرخروئی کا راستہ ہموار کر سکتا ہے۔

مگر جس طرح انسان کے بدن کو بیماری لگ سکتی ہے، اور اس کی صحت کو ناکارہ کر جاتی ہے، اسی طرح اس کی عقل کو بھی ضد، حسد، کبر و غرور، ناعاقبت اندیشی کا مرض تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ پھر عقل مریض اور فاسد ناکارہ ہو جاتی ہے، اور خیر و شر، نفع و نقصان کے ادراک سے عاجز ہو جاتی ہے، اور اس کی حرکات و سکنات، کردار و اعمال جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں۔ پس ایسے لوگوں کے پاس معرفت الٰہی اور ایمان و صلاح کی استعداد نہیں ہوتی، اگرچہ وہ مادیات کے متعلق ہزار درجہ عقلمند و دانشور متصور ہوں گے، مگر روحانیات اور اُخروی نجات کا دروازہ ان پر ہمیشہ کیلئے بند ہو جاتا ہے۔ ﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ﴾۔ [الأعراف: ۱۷۹] (ان کے لئے دل ہیں ان سے سمجھتے نہیں، اور ان کے لئے آنکھیں ہیں، ان سے دیکھتے نہیں، اور ان کے لئے کان ہیں، ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھٹکے ہوئے ہیں، وہی ہیں غافل)۔

ان کے تمام ظاہری اعضاء تندرست ہیں، مگر حق و ہدایت والی قوت اور معرفتِ الٰہی والی استعداد کی کمی، بلکہ فقدان ہے، تب تو جانوروں سے بھی بدتر بے عقل ہیں، جو اپنے خالق و مالک کی پہچان سے عاجز و نابلد ہیں۔ ﴿يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ﴾۔ [الروم: ۷] (دنیا کی ظاہری زندگی میں سے کچھ جانتے ہیں، اور وہ آخرت سے غافل ہیں)۔ وہ اپنی اصلی منزل آخرت سے بے خبر اور بے گانہ ہیں۔ ان کی ساری کوششیں ایک چندروزہ فانی زندگی پر صرف ہو رہی ہیں، اور یہی ان کی نادانی و بے عقلی کا واضح ثبوت ہے کہ سونے کے عوض مٹی خرید رہے ہیں۔

﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾

یہ عقلمندوں کی پہلی اور دوسری صفات ہیں، جو کہ اللہ تعالیٰ کا ہر حال میں ذکر کرتے ہیں، کھڑے ہوں یا بیٹھے ہوں، یا اپنی

کروٹوں کے بل لیٹے ہوں، ہر حالت میں زبان اور دل دونوں کے ساتھ اپنے خالق و مالک کو یاد کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ غفلت شعار نہیں ہیں، بلکہ ہر حالت میں بیدار رہ کر ذکر اللہ کے عمل میں مشغول رہتے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ سید الذاکرین صلی اللہ علیہ وسلم یَذْکُرُ اللهَ فِی کُلِّ أحْیانِہٖ. [متفق علیہ] آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام اوقات میں اپنے ربّ کو یاد کرتے رہتے تھے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ جنت میں کسی قسم کی عبادت نہیں ہوتی، کیونکہ جنت دار التکلیف نہیں ہے، وہ صرف دار الجزاء ہے، البتہ جنت میں ذکر کا عمل بلا تکلف جاری رہے گا، اور ایسا جاری رہے گا جیسے کہ دنیوی زندگی میں ہر شخص بلا تکلف فرحت و سرور کے ساتھ سانس لیتا رہتا ہے۔ یہی سانس جنت میں ذکر کا قائم مقام ہوگا۔ اسکی تفصیل سورۃ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

اور یہ جو فرمایا کھڑے بیٹھے اور لیٹے ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں، اس ذکر سے مراد ذکر لسانی اور ذکر قلبی دونوں ہیں، بلکہ نماز جو سرتاپا ذکر ہے اس کو بھی یہ شامل ہے، جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے اس ذکر اللہ سے نماز مراد لی ہے۔ [درمنثور] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابولدردا کا قول ہے کہ ایک گھڑی کا تفکر پوری شب کی عبادت سے بہتر ہے۔ [دیلمی] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن ایک پکارنے والا پکارے گا: عقل والے اولوا الالباب کہاں ہیں؟ تو لوگ کہیں گے کہ تو کون سے عقل والے چاہتا ہے؟ تو وہ کہے گا: ﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ......﴾

ان کو ایک جھنڈا دیا جائے گا، ساری جماعت اس جھنڈے کے پیچھے جائے گی، اور ان سے کہا جائے گا جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ۔ [درمنثور] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کی کہ سید کائنات صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک گھڑی کی فکر ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ اسی طرح ابو ہریرہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ ایک شخص لیٹا ہوا آسمان اور ستاروں کو دیکھ رہا تھا، اس نے کہا: میں خوب جانتا ہوں کہ اس کائنات کا ایک خالق پروردگار ہے، یا اللہ مجھ کو بخش دے، اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر نظر رحمت ڈالی، اور اس کو بخشدیا۔ ابن المنذر نے حضرت عون کا قول روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا تھا کہ افضل عبادت کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: تفکر اور اعتبار، یعنی غور و فکر کرنا، اور عبرت حاصل کرنا۔

فکر کسے کہتے ہیں؟ اس کے لفظی معنی ہیں سوچنا۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ کسی چیز کو جاننے کے لئے غور

سے کام لینا فکر ہے۔ جوہری نے صحاح میں لکھا ہے: فکر وہ قوت ہے جو معلوم تک پہنچنے کے لئے علم کا راستہ بتاتی ہے۔ اور تفکر کے معنی ہیں قوت فکر کی حرکت، جو عقلی نظر کے موافق ہو، اور یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے، دیگر حیوانات تفکر کی نعمت سے محروم ہیں، کیونکہ حیوانات میں قوت عقلیہ نہیں ہوتی، وہاں صرف حس ہے۔ تفکر کا تعلق صرف انہی چیزوں سے ہوتا ہے جن کی صورت کا دماغ میں آنا ممکن ہو، اسی لئے حدیثوں میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات اور بے شمار نعمتوں اور صنعتوں میں غور وفکر کرو، اور اللہ تعالیٰ کی ذات پاک میں غور نہ کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر صورت سے پاک ہے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ہر شئے میں غور وخوض کرو مگر اللہ تعالیٰ کی ذات عالی میں غور وفکر نہ کرو، کیونکہ ساتویں آسمان سے اللہ تعالیٰ کی کرسی تک سات ہزار نور ہیں (بعض روایات میں ستر ہزار) اور اللہ تعالیٰ اس سے بھی بالا ہے۔ [مظہری] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی دوسری روایات کے یہ الفاظ ہیں: خلق میں غور کرو، اور خالق کی ذات میں غور نہ کرو، کیونکہ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی خلق میں غور کرو، اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور نہ کرو، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

اس کے علاوہ اور بہت سی روایات اسی معنی میں وارد ہیں۔ مطلب سب کا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات ان کے معانی میں اور اس کے اسماء حسنیٰ اور تمام مخلوقات میں، اسی طرح اس کی ظاہری وباطنی نعمتوں میں غور کرو، جس سے ایمان وعقائد میں قوت وپختگی پیدا ہوگی، اور عبادات سہل ہو جائیں گی، محبت الٰہی میں اضافہ ہو جائے گا، شکر کے مواقع آسان ہو جائیں گے۔ انہی باتوں کی خاطر تفکر کو حدیث شریف نے ساٹھ سالہ عبادت سے بہتر وبرتر قرار دیا ہے۔

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ وہ کہتے ہیں: اے ہمارے ربّ! تو نے اس جہاں کو بے کار، بے حقیقت، بے مقصد پیدا نہیں فرمایا۔ باطل حق کی ضد ہوتا ہے، حق کا اطلاق تین معانی پر ہوتا ہے:

(۱)...... وہ موجود جس کا وجود اصلی ہو، یعنی خود بخود ہو، وہ اپنے وجود اور تحقق بلکہ کسی بھی چیز میں دوسرے کا محتاج نہ ہو، بایں معنی حق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

(۲)...... وہ موجود جس کا وجود محض وہمی، تراشیدہ اور خیالی نہ ہو، بلکہ ذہن سے باہر واقع میں بھی ہو، خواہ وہ اپنے تحقق) میں موجود حق بمعنی اوّل سے خوشہ چین ہو جیسے آسمان، زمین، انسان، ہوا، پانی، حیوان اور نباتات وغیرہ۔

(۳)......وہ موجود جس کا وجود پر حکمت، پر مصلحت اور مفید ہو، بے کار، بے حکمت، بے فائدہ اور بیہودہ نہ ہو۔

حق کے تین معانی ہیں، اور ہر معنی کے مقابل لفظ باطل آتا ہے۔ اوّل معنی کے اعتبار سے سرور عالم ﷺ نے فرمایا ہے کہ سب سے اچھا قول لبید بن ربیعہ کا یہ قول:

اَلَا کُلُّ شَیءٍ مَا خَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ ★ وَ کُلُّ نَعِیمٍ لَا مَحَالَۃَ زَائِلٌ

آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز باطل ہے، یعنی اپنے وجود، لوازم وجود اور ہر وصف میں محتاج ہے، کسی چیز کا وجود اصلی اور خود بخود نہیں ہے۔ باطل کے دوسرے معنی بھی شعر میں مراد ہو سکتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا ہر معبود کی معبودیت خیالی زائیدہ اور وہمی تراشیدہ ہے، واقعی نہیں ہے۔

تیسرے معنی کے لحاظ سے باطل کا اطلاق شیطان پر ہوتا ہے جیسے فرمایا: ﴿لَّا یَأْتِیهِ الْبَاطِلُ مِن بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنزِیلٌ مِّنْ حَكِیمٍ حَمِیدٍ﴾ [فصلت: ۴۲] (باطل اس کے آگے سے اور اس کے پیچھے سے نہیں آسکتا، اتارا گیا ہے حکمت والے تعریف والے کی طرف سے)۔ اس کے آگے پیچھے کسی طرف سے شیطان نہیں آتا۔

آیت کریمہ ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ میں باطل بمعنی دوئم، اور بمعنی سوئم مراد ہو سکتا ہے۔ اگر بمعنی دوئم مراد ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ آسمان و زمین بے حقیقت نہیں، ان کا وجود خارجی واقعی ہے، محض خیال و وہم نہیں۔

اہلِ حق اشاعرہ نے صانع کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے اسی مسئلہ کو اساس قرار دیا ہے، اور صراحت کی ہے کہ حقائق اشیاء یعنی کائنات ارضی و سماوی کی حقیقتیں ثابت ہیں، صرف وہم کے آفریدہ اور خیال کی تراشیدہ نہیں ہیں، اور ان کا علم واقعی ہے، محض اختراعی اور فرضی نہیں ہے۔ البتہ سوفسطائیہ کا قول اس کے خلاف ہے، ان کے نزدیک سارا عالم ایک فریب اور وہم ہے، کسی چیز کی کوئی واقعی حقیقت اور خارجی وجود نہیں ہے۔ اس آیت میں اہل حق کے قول کی صراحت ہے۔

اور اگر آیت میں باطل کے معنی سوئم مراد ہوں، تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے اس عالم کو محض کھیل اور بے کار و بے مقصد نہیں بنایا، بلکہ اسکی تخلیق میں تیری حکمت عظیمہ کارفرما ہے، اور اس کا وجود تیری معرفت کی دلیل، اور تیری عظمت واطاعت کا موجب ہے۔

﴿سُبْحٰنَكَ﴾ تیری ذات تمام عیوب ونقائص، اور ہر قسم کی کمزوریوں سے پاک ومنزہ ہے۔ اے ہمارے

ربّ! تو ہر مذاق سے، اور بے مقصد باطل کام کرنے سے پاک ہے، تیرا ہر کام مبنی بر حکمت و مصلحت ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات کی پیدائش تیری عظیم و بے مثال قدرتوں کا زندہ جاوید شاہکار ہے۔

﴿فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ پس ہم کو بچا دوزخ کے عذاب سے۔ یعنی اگر ہمارے تفکر اور غور وفکر میں کوئی کمی اور نقصان یا خرابی ہو جائے، اور ہم تیری کائنات میں غور وفکر کا تقاضا پورا نہ کر سکیں، اور عذاب کے مستحق قرار پائیں تو ہم پر نظر کرم فرما ہم، تیرے در کو چھوڑ کر کہاں جائیں؟ لہٰذا ہم آپ ہی سے اُمید والتجاء کرتے ہیں، اور کہتے ہیں: اِصْنَعْ بِنَا مَا أَنْتَ لَهُ أَهْلٌ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ يَا رَبَّ الْعٰلَمِينَ. یہ عقلمندوں کی پہلی دعاء تھی، باقی دعاؤں کا سلسلہ اگلی آیتوں میں آنے والا ہے، وہ یہ ہے:......

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿١٩٢﴾
رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ڰ رَبَّنَا
فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿١٩٣﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا
مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰي رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿١٩٤﴾

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! بیشک تو نے جس کو دوزخ کی آگ میں داخل کر دیا پس بیشک تو نے اس کو رسوا کر دیا، اور نہیں ہوگا ظالموں کے لئے کوئی مدد کرنے والا ﴿۱۹۲﴾ اے ہمارے پروردگار! بیشک ہم نے سنا ہے ایک پکارنے والے کو، جو پکارتا ہے ایمان لانے کے لئے کہ ایمان لاؤ اپنے پروردگار پر، پس ہم ایمان لے آئے ہیں، اے ہمارے پروردگار! بخش دے ہم کو ہمارے گناہ، اور مٹا دے ہم سے ہماری برائیاں، اور موت دے ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ ﴿۱۹۳﴾ اے ہمارے پروردگار! اور دے دے ہمیں جو تو نے وعدہ کیا ہے ہم سے، اپنے رسولوں کی زبانوں پر، اور نہ رسوا کر تو ہمیں قیامت والے دن، بیشک تو وعدہ کا خلاف نہیں کرتا ﴿۱۹۴﴾

معارف ومنازل

تخلیق ارض وسماء سے اور ان میں تفکر وغور کرنے سے جو مقصد حاصل ہوتا ہے وہ ربّ العزت کی معرفت اور توحید ہے۔ ساتھ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ معرفت توحید کے بعد دو ہی راستے ہیں:

(۱)......اطاعت وفرمانبرداری۔ (۲)......یا انکار ومعصیت۔ اوّل گروہ کیلئے ابدی سعادت وکامیابی کا

وعدہ ہے، دوئم گروہ کے لئے ابدی خسران اور عذاب کی وعید ہے۔ اسی عذاب کی رسوائی سے بچنے کی خاطر اور اوّل گروہ کی سعادتوں میں شامل ہونے کی خاطر دعاؤں کا اور تضرّع والتجاؤں کا سلسلہ شروع فرمایا، گویا کہ یہ سب اسی کا نتیجہ ہوا کہ قدرت کے ہمہ گیر مستحکم نظام عالم میں تدبر وتفکر بھی اسی طرح عبادت ہے جس طرح نماز اور دیگر عبادات۔

کیوں نہیں، جبکہ تخلیق کائنات کے سلسلے میں جب انسان اللہ تعالیٰ کی مصنوعات میں غور وفکر کرتا ہے تو اس پر ہزاروں سربستہ مخفی راز کھل جاتے ہیں، اور اس کا علم الیقین مزید مستحکم ہوجاتا ہے، حتی کہ وہ عین الیقین اور حق الیقین تک رسائی حاصل کرتا ہے، بمصداق كُنتُ كَنزاً مَخفِياً فأرَدتُ أن أعرف فخلقتُ الخَلق.

یہ بے انتہا وسیع وعریض کائنات کی تخلیق صرف انسان کیلئے ہے، جبکہ انسان کی تخلیق براستہ کائنات ربّ العزّت تک پہنچنے کے لئے ہے۔ اسی خاطر اسے عقل وادراک کی نعمت سے نوازا گیا، تاکہ وہ فکر وغور کرکے منزل مقصود تک یعنی قرب الٰہی تک پہنچنے کی سعادت حاصل کرے۔ انسان کے بود وباش، رہائش اور منافع حاصل کرنے کیلئے یہی محدود چھوٹی زمین کافی تھی، مگر منزل مقصود تک رسائی کی خاطر یہ لامحدود کائنات کی پیدائش کا فیصلہ اسی لئے ہوا کہ وہ اس میں غور کرے۔

ساتھ ساتھ تاکہ ربّ العزّت کی لامتناہی بے مثال قدرت تخلیق کا جلوہ ظاہر ہوجائے۔ یہ بیچارہ انسان ابھی تک عالم اصغر یعنی اپنے بدن کے کوائف وعوارض تک رسائی اور پہنچ حاصل نہیں کرسکا ہے، آئے دن اس کے بدن میں نئے نئے پیچیدہ ایسے ایسے امراض پیدا ہورہے ہیں جن سے اس کا سر چکراتا ہے، اور وہ پریشان ہوتا ہے کہ یہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ کس چیز کی وجہ سے ہوا؟ پس اس مرض کے دفاع اور طریقہ علاج کیلئے ہاتھ پاؤں مارکر تدبیر سوچتا ہے۔

ابھی تک وہ اس معمہ کے حل سے فارغ نہیں ہوا ہے کہ دوسرا عالمی مرض اس کے جسم واعضاء پر حملہ آور ہوجاتا ہے، علیٰ ہذا القیاس وہ کائنات کی بلندیوں پر کیوں اور کیسے پہنچ سکتا ہے؟ یا انہیں سر کرسکتا ہے؟ جبکہ وہ ابھی تک اپنے بدن کے اصول صحت وتندرستی کے تعین سے عاجز وناتوان ہے، اور اپنے گھر کے معاملات میں بری طرح الجھا ہوا ہے، پس اس کے لئے سلامتی اور کامیابی کا یہی واحد راستہ ہے کہ سرتسلیم خم کرکے معبود حقیقی کے حضور سربسجود رہے، اور قرآن وحدیث کی تعلیمات کے سامنے ہتھیار ڈالدے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو زندگی بھر خوار رہے گا، اور آخرت کی سعادتوں سے محروم رہے گا، اور خسر الدنیا والآخرت کا جہنمی طوق اس کے گلے میں ڈالا جائے گا۔

قرآن کریم نے نافرمان انسانوں کے متعلق فرمایا: ﴿وَكَأَيِّن مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ

عَلَيۡهَا وَهُمۡ عَنۡهَا مُعۡرِضُونَ﴾۔[یوسف:۱۰۵] (اور کتنی نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں جن پر گزرتے رہتے ہیں؟ اور وہ ان سے اعراض کرنے والے ہیں)۔لوگ زمین وآسمان کی بے شمار قدرتی نشانیوں کے قریب سے گزر جاتے ہیں، مگر ان میں غور وفکر کر کے کوئی نتیجہ اور عبرت اخذ نہیں کرتے، بلکہ غافل رہتے ہیں، حالانکہ یہ کوہ وجبال، اور ان کے مختلف رنگ وساخت، یہ درخت اور ان کے مختلف اجناس اور شکل وصورت، پھل میوے، اور مختلف خواص، یہ حیوانات اور ان کے مختلف انواع، اور جڑی بوٹیوں کی ہزاروں اقسام اور ان کے خواص علیٰ ہذا القیاس، یہ مختلف ہوائیں، اسی طرح سات آسمان اور مختلف قسم کے ستارے اور سیارے، ہر وقت انسان کو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔

پھر جس نظام شمسی میں ہم رہتے ہیں اس کے سات مشہور سیارے، زہرہ، قمر، شمس، عطارد، مریخ، مشتری، اور زحل ہیں۔موجودہ سائنسدانوں کے نزدیک ان کی بڑی شہرت ہے، اور وہ ان کے متعلق بڑی ایڑی چوٹی کی تحقیقات کررہے ہیں۔ خلا پیما سائنس دان ان پر کمند ڈالنے میں رات دن مصروف ہیں، ہر پیچھے آنے والے ماضی کے سائنسدانوں کی قبروں پر مٹی ڈالنے کے عمل میں مصروف ہیں، اور ان کی تحقیقات کو غلط ثابت کرنے میں بڑی تندہی سے کام کررہے ہیں۔

یونانی سائنسدانوں نے کہا تھا کہ سارے سیارے ستارے آسمانوں کی چھت کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، جیسے آج کل پنکھے یا بلب چھتوں میں کیل کی طرح پیوست رہتے ہیں، جبکہ موجودہ سائنسدان یہ کہتے ہیں کہ ستارے سیارے آسمانوں سے بہت نیچے اپنے اپنے افلاک میں مختلف سمتوں میں گھوم رہے ہیں، اور وہ اپنی حرکت ذاتی کے ساتھ رواں دواں ہیں، آسمان ان سے بہت ہی بلند وبالا ہیں، اور وہ آسمان غیر متحرک اور ساکن ہیں، جبکہ قدیم یونانی حکماء بطلیموس وارسطاطالیس وغیرہ آسمانوں کو متحرک مانتے ہیں۔مزید تفصیل سورۃ الملک کی تفسیر میں لکھ چکے ہیں۔

آج کل ان سات سیاروں میں سے قریبی سیارہ قمر پر انسان پہنچ چکا ہے، اور اسکی وضع قطع معلوم کر چکا ہے۔ اسی چاند پر سرد ترین علاقہ بھی معلوم ہو چکا ہے۔ اگر انسان وہاں پہنچ جائے تو برف کا ٹکڑا بن جائے۔ اسی طرح وہاں پر اڑھائی سو سینٹی گریڈ تک گرم ترین علاقہ بھی موجود ہے۔ جو لوگ چاند پر پہنچتے ہیں وہ اس زمینی لباس میں نہیں گئے، یہ تو فوراً جل جائے گا، وہاں پر خلائی لباس پہن کر ہی جانا پڑے گا، اور یہ ایسا لباس ہے جسکی تیاری پر تین لاکھ سے چار لاکھ روپیہ تک خرچ کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ چاند پر انسانی رہائش قریباً ناممکن ہے، اور خلابازوں نے

بھی یہی کہا ہے۔ اگر انسان وہاں پہنچا ہے تو محدود وقت بہ مشکل گزارا ہے۔ ماہرین فلکیات بتاتے ہیں کہ چاند پر ایک پونڈ انسانی خوراک پہنچانے پر تیس ہزار پونڈ خرچ آئے گا۔ تو ظاہر ہے کہ اسقدر فضول عیاشی کی کون جرأت کرے گا؟ یہ اس سیارے چاند کی بات ہے جو زمین سے قریب ترین ہے۔ نظام شمسی کا دوسرا سیارہ سورج ہے، جو زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ یہ اپنی پیدائش سے لے کر پورے نظام شمسی کو گرمی اور روشنی پہنچا رہا ہے۔ اس کی روشنی ہم تک سات منٹ اور آٹھ سیکنڈ میں پہنچتی ہے۔ مگر ربّ العزّت مالک الملک نے فرمایا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا ﴿اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ﴾ جب یہ آفتاب عالمتاب اور اس کی روشنی لپیٹ دی جائے گی، اور فرشتے اس کو سمندر میں گرائیں گے، جس سے سمندروں میں آگ لگ جائے گی، جس سے پورا عالم جل کر فنا ہو جائے گا، اور پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا، اور ایک جدید نظام آخرت کا قائم ہو جائے گا، جسے حشر کا نظام کہتے ہیں، اور ساری مخلوقات کی اپنے خالق کے پاس پیشی شروع ہو جائے گی۔ ﴿يَوۡمَئِذٍ تُعۡرَضُوۡنَ لَا تَخۡفٰى مِنۡكُمۡ خَافِيَةٌ﴾ [الحاقة: ۱۸] (اس دن تمہاری پیشی اس طرح ہوگی کہ تمہاری کوئی چھپی ہوئی چیز چھپی نہیں رہے گی)۔

آج کسی کا عمل پوشیدہ نہیں رہے گا، ساری خرمستیاں ختم ہو جائیں گی، ﴿اَصۡحٰبُ الۡيَمِيۡنِ﴾ کی ساری ٹھکاٹوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ستاروں سے متعلق علم کی دو قسمیں ہیں: ایک علم نجوم ہے، جسمیں ستاروں کے تغیر اور تبدل کے حساب سے کسی شخص کی قسمت، سعادت اور شقاوت کا حال معلوم کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے علم کو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شرک کا حصہ قرار دیا ہے، اور سحر کی طرح حرام بتایا ہے، کیونکہ ستاروں کی تخلیق اس مقصد کے لئے ہے ہی نہیں، اور نہ ہی کوئی ستارہ اس مقصد کے لئے وضع آیا ہے، اور نہ ہی کسی ستارے میں یہ تاثیر ہے اور جو کوئی کسی منجم کے پاس آکر قسمت کا حال معلوم کرے گا، اور اس پر اعتماد جمائے گا، تو سمجھو کہ اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیمات کا انکار کر بیٹھا ہے۔ [الحدیث]

پس ایسے لوگوں کے لئے تجدید ایمان اور توبہ ضروری ہے۔ قرآن کریم میں ایک ایسے بڑے ستارے کا ذکر ہے جسکی عرب مشرکین پوجا کرتے تھے، ﴿وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعۡرٰى﴾ [النجم: ۴۹]۔ (اور یہ کہ وہ شعریٰ کا ربّ ہے)۔ یعنی شعریٰ ستارے کا مالک بھی وہی ربّ العلمین ہے، جو چاند اور سورج سے بیس ہزار گنا بڑا ہے۔

ستاروں سے متعلق دوسرا علم علم فلکیات ہے۔ اس علم کے ذریعہ قدیماً وحدیثاً ماہرین فلکیات ستاروں کے متعلق معلومات حاصل کرتے رہتے ہیں۔ آج کل یورپ میں اس کا بہت بڑا چرچا ہے۔ شعریٰ ستارہ اور ہزاروں دیگر

ستاروں کے حجم ورفتار، فلک اور جہت وغیرہ ہر قسم کی معلومات اسی یورپی علم پر مبنی ہیں۔ یہ علم دراصل مسلمانوں کا ورثہ تھا، اور وہی اس کے بانی وموجد تھے، بدقسمتی سے اندلس غرناطہ کے سقوط کے بعد مسلمانوں کے اس موروثی علم پر اقوام یورپ کا قبضہ ہوگیا، اور لاکھوں علمی ذخیرے سب ان کے ہاتھ لگ گئے۔ آج جرمنی، اسپین، برطانیہ، فرانس وغیرہ کی لائبریریوں میں بیش قیمت نایاب لاکھوں کی تعداد میں قلمی نسخے کتابیں موجود ہیں، نہ وہ خود ہی ان کو شائع کرتے ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کے حوالہ کرتے ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم نے کہا ہے۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی ☆ جو دیکھا ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

پھر ماہرین فلکیات یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہماری یہ زمین سورج سے اسقدر چھوٹی ہے کہ اس کے حجم کی نسبت ایک اور تیرہ لاکھ کی ہے، گویا زمین سورج سے تیرہ لاکھ گنا چھوٹی ہے، مگر بہت دوری (۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کا فاصلہ) کی وجہ سے اتنا بڑا فرق نظر نہیں آتا، پھر چاند زمین سے بھی چھوٹا ہے۔

بہر حال! ان سب چیزوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانیاں رکھی ہیں، مؤمن موحّد ان میں غور کر کے فوراً خدا تعالیٰ کی توحید کا قائل ہو جاتا ہے کہ جس مالک الملک نے یہ سارا نظام بے عدیل وبے مثال طرز پر قائم کیا ہے وہ وحدہ لاشریک ہے۔ یہ ایک نظام شمسی ہے، اس کے اوپر عالم بالا اور پھر ملأ اعلیٰ، حظیرۃ القدس عالم آخرت کا نظام ہے۔ یہ سارے نظام اس کے قبضہ قدرت میں ہیں، اور سب پر اسکا تصرف ہے۔

خلاصہ یہ ہے کے جب انسان تخلیق کائنات میں غور وفکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ تو وہ اس حقیقت کو بھی پالیتا ہے کہ لامحالہ یہ تمام نظام آخرت پر منتج ہونے والا ہے۔ اس لئے وہ ربّ العزّت سے دعاء کرتا ہے: فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اے ہمارے پروردگار! آخرت میں پیش آنے والے دوزخ کے عذاب سے ہمیں بچالے۔ وہ سمجھ چکا ہے کہ دوزخ کا عذاب کس قدر ہولناک تباہ کن ہے، اس لئے وہ مزید دعاء کرتا ہے: ﴿رَبَّنَا اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ﴾۔ اے اللہ تعالیٰ! جس کو تو نے دوزخ کے عذاب میں داخل کیا تو نے اس کو رسوا ذلیل کر دیا۔

کافروں کی رسوائی تو واضح ہے، کیونکہ وہ ابدی دوزخی ہیں، تاہم بعض مؤمنین بھی کچھ عرصہ کے لئے دوزخ میں جائیں گے، اگر چہ ان کا یہ قید وبند دوامی نہیں ہوگا، بلکہ ان کے تزکیہ کیلئے ہوگا تا کہ گناہوں کی وجہ سے جو میل کچیل ان پر جم چکا ہے اسے صاف کر کے ان کو پاک مقام پر جانے کا اہل بنایا جا سکے، جیسا بھی ہو مگر رسوائی ضرور ہوگی، جیسا

عمل ویسا پھل۔ فرمایا:﴿وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾۔ ان ظالموں کے لئے وہاں کوئی یار و مددگار نہ ہوگا۔

آگے ارشاد ہے، اور مؤمن کی دعاء بھی ہے:﴿رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ﴾ اے ہمارے پروردگار! بیشک ہم نے ایک منادی کرنے والے کی آواز سنی کہ وہ لوگوں کو ایمان کی دعوت دے رہا تھا، جیسے کہ مؤذن لوگوں کو نماز کی دعوت دیتا ہے کہ اپنے ربّ پر ایمان لاؤ۔ پس اسکی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہم ایمان لے آئے۔ وہ منادی کرنے والی جناب حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس ہے۔ اوّلاً و بالذات، ثانیاً وہ منادی قرآن کریم بھی ہے، جو کہ خاموش منادی ہے۔

اگرچہ علامہ قرطبیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ منادی سے مراد قرآن کریم ہے، مگر اکثر مفسرین یہی کہتے ہیں کہ اس سے مراد خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ حضرت ابن عباس و حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا بھی یہی قول ہے۔ مگر محققین علماء نے کہا کہ دونوں مراد ہیں۔ واللہ اعلم

البتہ! اتنا اور معلوم ہونا چاہئے کہ یہ دعوت وندا حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کرام محسنین اُمت کے واسطہ سے دوسرے لوگوں تک پہنچائی۔ یہ دعوت بالواسطہ ہوگئی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین حضرات، تبع تابعین، اولیاء کرام، علماء کرام، مشائخ عظام، محدثین، مفسرین، مفکرین اس دعوت کو ہر زمانہ، ہر قرن، ہر علاقہ میں لوگوں تک پہنچا کر، خصوصاً ہمارے زمانہ میں تبلیغی جماعت کے حضرات نے دعوت کا حق ادا کیا، اور کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، اور انہی کے ساتھ ہمیں مبعوث فرمائے۔

﴿رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ﴾۔ اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو معاف فرمادے۔ ذُنُوب سے مراد بڑے گناہ ہیں، اور ہمارے سَیِّاٰت (چھوٹے گناہ) بھی مٹادے، اور ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ ہی وفات دے۔ مرنے کے بعد ہمیں نیک بندوں کی رفاقت نصیب فرمادے۔ سیدنا حضرت یوسف نے بھی یہی دعا کی تھی ﴿تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ﴾ اسی طرح دوسرے مقام پر ارشاد ہے:﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾۔ [النساء]

زہے سعادت، اگر کسی کو ان بابرکت طبقات کی رفاقت حاصل ہو۔﴿رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴾ اے ہمارے پروردگار! اور ہم کو عطاء فرما جو تو نے ہم سے وعدہ کیا

ہے، یعنی ثواب جنت، اپنا دیدار اور مرتبہ قرب آخرت میں، اور دشمنوں پر فتح دنیا میں، اپنے پیغمبر ﷺ پر ایمان لانے کے بدلہ میں یا، اپنے پیغمبروں کے زبانی کئے ہوئے وعدے پر، یا یہ مطلب ہے کہ پیغمبروںؑ پر جو وعدہ آپ نے نازل کیا تھا وہ عطاء فرمائے، اور ہمیں قیامت کے دن رسوا اور ذلیل نہ کرنا، بیشک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا، بلکہ وعدہ سے زیادہ ہی دیتا ہے کرم کر کے۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ
بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ
سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

ترجمہ: پس قبول فرمائی اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ان کی دعاء کہ بیشک میں ضائع نہیں کرتا عمل کرنے والے کے عمل کو، تم میں مرد ہو یا عورت، بعض تمہارے بعض سے ہیں، پس وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی، اور وہ اپنے گھروں سے نکالے گئے، اور میرے راستے میں ستائے گئے، اور انہوں نے لڑائی کی، اور شہید کئے گئے، تو میں ان کی برائیاں ان سے مٹا دوں گا، اور البتہ ضرور میں ان کو جنتوں میں داخل کروں گا، جن کے سامنے نہریں بہتی ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بدلہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کے پاس بہت اچھا بدلہ ہے ﴿۱۹۵﴾

معارف ومنازل

﴿فَاسْتَجَابَ وَاَجَابَ﴾ بعض علماء کے نزدیک ہم معنی ہیں۔ یہاں بڑی بشارت کا اعلان ہو رہا ہے کہ تمہاری گزشتہ دعائیں سب قبول ہو چکی ہیں، جن کا صلہ تمہیں روز قیامت مل ہی جائے گا، اسلئے مزید وضاحت ہو رہی ہے کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، مرد ہو یا عورت، اعمال کا ثواب سب کو ملے گا، جو بھی فرد ایمان قبول کرے گا، اور اعمال صالحہ بجالائے گا، اور دعائیں کرے گا، اس کا کچھ بھی عمل قلیل ہو یا کثیر، کسی بھی نوعیت کا ہو ضائع نہیں ہوگا۔

جس طرح مردوں کے اعمال صالحہ مقبول ہیں، اسی طرح عورتیں اگر اعمال صالحہ بجالائیں تو ان کے اعمال

بھی قبول ہوں گے۔ قرآن کریم اور احادیث میں جا بجا مسلمانوں کے اعمال کی قبولیت کا تذکرہ و وعدہ موجود ہے، اور قبولیت کے ساتھ جنت اور اُخروی نعمتوں کے ملنے اور بخشش و مغفرت کا وعدہ ہے، البتہ! کفار و مشرکین اس سعادت سے محروم رہیں گے، وہ لوگ بالفرض اگر عدل و انصاف، غریب پروری، صدقات و خیرات اور دیگر کارِ خیر اگر انجام دیں گے تو قیامت کے دن یہ اعمال اُنہیں ایمان نہ ہونے کی وجہ سے کام نہیں آئیں گے۔ ہاں! ان کے اعمال کا بدلہ بصورت مال اور تندرستی اُنہیں دنیا ہی میں ضرور ملے گا، اور آخرت کا ثواب ﴿هَبَآءً مَّنثُورًا﴾ ہی ہوگا۔

اگر ابو طالب اور ابولہب کے اُخروی عذاب میں کچھ تخفیف کا ذکر صحیح احادیث میں مذکور ہے تو یہ صرف سردار انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (فِدَاہُ اَرْوَاحنا) کی خصوصیت ہی ہے کہ اس میں ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی شریک نہیں کہ وہ اپنے باپ آزر کے لئے تخفیفِ عذاب کی شفاعت نہیں کرسکیں گے۔ ان دونوں باتوں کا تذکرہ صحیح بخاری میں ہے۔

﴿بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ﴾ تم میں سے بعض بعض سے ہیں۔ امام کلبیؒ نے کہا: یعنی دین میں، باہم مدد کرنے میں، دوستی میں۔ بعض نے کہا: انسانیت اور نسب میں۔ بعض نے کہا کہ تقویٰ و اعمالِ خیر میں۔ بعض نے کہا: مخلوقات میں غور و فکر کرنے اور دعاء مانگنے میں۔ امام ضحاکؒ نے کہا: اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں مرد عورتوں کی طرح اور عورتیں مردوں کی طرح ہیں، نیز اعمالِ خیر میں مرد عورتوں کے اور عورتیں مردوں کے معاون و مددگار ہیں، اور ایک دوسرے کے لئے خیر کا سبب ہیں، جیسے سورۃ توبہ میں ارشاد ہے، فرمایا: ﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ [التوبۃ: ۷۱] (مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں بعض بعض کے معاون اور مددگار ہیں)۔ تقریباً سارے معانی کا یہی ایک ہی مطلب ہے۔

﴿فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي﴾ پھر جن لوگوں نے گھر یا وطن چھوڑ کر ہجرت کی، اور اپنی بستیوں اور گھروں سے نکالے گئے، اور میری راہ میں ان کو ایذاء دی گئی، دشمنوں نے انہیں صرف ایمان لانے کی وجہ سے اذیت پہنچائی ﴿وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَن يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ﴾ [البروج: ۸] (اور ایمان والوں کو صرف اس بات کی سزا دے رہے تھے کہ وہ اللہ پر ایمان لائے ہیں)۔ جنہوں نے صرف اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لئے کفار کے ساتھ جہاد و قتال کیا، اور شہید ہوئے۔

﴿لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ﴾ میں ضرور بالضرور ان کی برائیوں کو مٹا دوں گا، اور اُنہیں ایسے عمدہ جنتی باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ روزِ قیامت

ایسی قربانی دینے والے مخلصین کا زبردست اکرام ہوگا، کیونکہ انہوں نے ایسے اعمال اور کارنامے انجام دیئے جنہیں بڑی پزیرائی ہوئی۔ یہ لوگ ایمان لائے، پھر اپنے ایمان کے تحفظ کی خاطر گھر بار، بیوی بچے، جائیداد وسرمایہ، مال ومنال سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کی، اور بزور وقوت اپنے گھروں سے بیدخل کر کے نکالے گئے، پھر اعلاء کلمۃ اللہ، اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لئے جہاد کیا، اسی کے ساتھ انہیں طرح طرح کی ایذائیں دی گئیں، اور اللہ تعالیٰ کی رضا، اور اپنے دین پر استقامت کی خاطر ساری تکلیفوں کو سہا، اور برداشت کیا، مگر صبر واستقامت کے ساتھ رہ کر پھر شہید بھی ہوئے، تو ربّ العزت نے مذکورہ اعمال خیر کے بدلے انہیں یہ انعام عطاء فرمایا کہ ان کی ساری سیّئات گناہوں کو معاف فرمایا، اور یہ تکفیر سیّئات دخول جنت کی صورت میں انہیں نصیب فرمائے گا۔

﴿ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ‌ؕ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ﴾ یہ تکفیر سیّئات ودخول جنت ان کے اعمال خیر کا ثواب واچھا بدلہ ہوگا اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص اور اس کے شایان شان ہے اپنے نیک بندوں کو اچھا بدلہ دینا۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فِى الۡبِلَادِ ؕ‏ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيۡلٌ ثُمَّ مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَنَّمُ‌ ؕ وَبِئۡسَ الۡمِهَادُ‏ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ لَهُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا نُزُلًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ‌ ؕ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ لِّلۡاَبۡرَارِ‏ ﴿۱۹۸﴾

ترجمہ: ہرگز دھوکہ میں نہ ڈالے آپ کو کافروں کا شہروں میں آنا جانا ﴿۱۹۶﴾ یہ تھوڑا سا نفع ہے، پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ برا بچھونا ہے ﴿۱۹۷﴾ لیکن وہ لوگ جو اپنے پروردگار سے ڈرتے رہے، ان کے لئے باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہ مہمانی ہوگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے بہتر ہے نیک بندوں کے لئے ﴿۱۹۸﴾

معارف ومنازل

اس چند روزہ مادی دنیا کے رنگ وبو اور غیر یقینی خوشحالیوں میں فریفتہ ہونا، اور نظر الجھائے رکھنا سوائے

حماقت و نادانی کے کچھ نہیں، عوام تو کیا بڑے بڑے نامور بادشاہ و سلاطین جن کے اشاروں سے دنیا کا رنگ بدل جاتا تھا ہزاروں غموں اور حسرتوں کے ساتھ دنیا کو چھوڑ کر چلے گئے، آج ان کا نام اور رعب و دبدبہ لوگوں کے ذہنوں سے مٹ چکا، اس تکوینی نظام میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دشمنوں کو اتنا مال و دولت اور عیش و خوشحالی عطاء کی ہوئی ہے کہ وہ اس استدراج اور آزمائش سے بجائے ایمان و اصلاح کے مسلسل گمراہیوں میں محو رہتے ہیں۔ شاید ان کی اس بے پناہ دولت و ثروت اور خوشحالیوں سے کسی کو مغالطہ ہو کہ اگر واقعی یہ لوگ عنداللہ مبغوض و ملعون ہیں تو انہیں کیوں اسقدر ظاہری مادی نعمتوں کے ساتھ نوازا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ان بے پناہ نعمتوں سے سراسر کیوں محروم ہیں؟ آیت کریمہ میں اسی تکوینی فیصلے کا جواب دیا جا رہا ہے۔

﴿لَا یَغُرَّنَّکَ﴾ آپ کو ان کافروں کا شہر بشہر تجارت اور دنیوی فوائد، سیر و سیاحت کے فوائد کے لئے چلنا پھرنا اور آنا جانا کسی غلطی اور دھوکے میں مبتلا نہ کردے، کیونکہ یہ سب کچھ استدراج کے طور پر ہو رہا ہے، اور ان پر اتمام حجت قائم کرنے کیلئے ہو رہا ہے۔ اگر یہ سب کچھ دنیوی عیش و عشرت انہیں دستیاب نہ ہو تو یہ روز قیامت اللہ تعالیٰ کے حضور استغاثہ کر سکتے ہیں کہ ہم لوگ نافرمان کافر ہی سہی، مگر آپ کی مخلوق تو تھے، تو پھر کیا ہوا کہ آپ کی خالقیت کے سایہ میں ہم نے دونوں جہانوں میں سوائے تباہی اور محرومی کے کچھ بھی نہ پایا؟ لٰہذا اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کو ان کے لئے جنت بنا کر ان کو ہر قسم کی سہولت و خوشحالی عطاء فرمائی، کیونکہ اللہ تعالیٰ ربّ العٰلمین ہے، اور کفار کے لئے بھی اس کی ربوبیت عام ہے، اور حدیث شریف اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَ جَنَّۃٌ لِلْکَافِرِ. کا مفہوم و مطلب بھی یہی ہے۔

﴿لَا یَغُرَّنَّکَ﴾ میں اوّلاً براہ راست خطاب سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سے بعید ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی مغالطہ ہو، تو مراد اس سے پوری اُمت کے لوگ ہیں، جیسا کہ عام طور پر خطاب قوم کے سردار کو ہوتا ہے، مگر مراد متبعین ہوتے ہیں۔ البتہ اُمت کے لوگوں کو ہر زمانہ میں یہ مغالطہ درپیش رہتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نافرمان لوگ تو دنیا بھر کے مزے لوٹتے پھرتے ہیں، اور ہم لوگ اہل ایمان ہر قسم کے مصائب میں مبتلا ہیں، تو فرمایا کہ تم مغالطہ میں نہ رہو، کافروں کا یہ عیش عارضی چندروزہ ہے، اور یہ آخرت کے مقابلہ میں نہایت قلیل ہے، جیسے کوئی شخص سمندر میں انگلی ڈبو کر نکالے اور دیکھے کہ اس کی انگلی پر کتنا پانی آیا، یہ سارا جہاں اس سے بھی کم ہے بمقابلہ آخرت کے۔ [ترمذی] اور نانِ شبینہ کے محتاج بھوکے مسلمان جب جنت کی سیر کریں گے تو تمام دنیوی تکالیف اور پریشانیوں کو یک لخت فراموش کریں گے۔

﴿تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ﴾ کفار کا مختلف شہروں میں جانا پھرنا، سیاحت کرنا آپ کو غلط فہمی اور دھوکے میں نہ ڈالے۔ سبحان اللہ، کتنی بڑی پیشین گوئی ہے۔ آج کی دنیا اور اس کی آبادی اور غیر مسلموں کی دنیا کے ہر شہر، ہر قصبہ، ہر ملک وخطہ میں سیر سیاحت اور چل پل، ہر محاذ پر اتنی بکثرت ہے جس کا اندازہ نہ ہو۔

امریکا جیسے ملک نے پوری دنیا پر اپنا قبضہ جمایا ہوا ہے، اور پورے ربع مسکون پر اس کا تسلط ہے، سمندروں، صحراؤں، جنگلوں، دریاؤں حتیٰ کہ اوپر کی فضاؤں پر بھیانک قبضہ ہے، موبائل اور کمپیوٹر کے نظام نے سارے دنیا کو ایک گھر بنا دیا ہے، اور انسانی عقل ودماغ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ جہازوں کا ایسا محیر العقول، حیران کن نظام جاری ہے کہ صبح ایک شخص ایشیاء میں ہے مغرب کو یورپ اور عشاء کو افریقہ میں پہنچا ہوا ہے۔ ایک ہی دن میں بیسیوں ہزار میلوں کا سفر طے ہو رہا ہے، یہ سارے کفار وغیر مسلموں کی ایجادات کی ایک مختصر جھلک ہے۔

انہی چیزوں کی بنیاد پر انسان اپنے ربّ کے ساتھ ہمسری کا دعویدار معلوم ہوتا ہے، اس پوری ترقی و مصنوعات کو قرآن کریم ﴿مَتَاعٌ قَلِيْلٌ﴾ سے تعبیر کر رہا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان تمام چیزوں کی حقیقت متاع قلیل سے کچھ اور پر نہیں ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَا يَغْبِطَنَّ فَاجِرًا فَإِنَّكَ لَا تَدْرِي مَاهُوَ لَاقٍ بَعْدَ مَوْتِهِ فَإِنَّهُ لَهُ عِنْدَ اللّٰهِ قَاتِلًا لَا يَمُوْتُ. تم کسی فاجر اور نافرمان کافر کی حالت پر ہرگز رشک نہ کرنا، کیونکہ تم نہیں جانتے کہ مرنے کے بعد وہ کس چیز سے ملنے والا ہے، کیونکہ اسکے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک ایسا قاتل ہے جو کبھی نہیں مرے گا۔ قاتل سے مراد جہنم اور اس کی ہلاکت ہے، جو کافر سے کبھی جدا نہیں ہوگا، اسی کو فرمایا: ﴿ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا، اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ اب تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھئے:

﴿لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ﴾ مگر وہ لوگ جو اپنے پروردگار سے ڈرتے رہے شرک وکفر اور معاصی سے بچتے رہے، ایمان وتقویٰ کے راستوں پر قائم رہے ﴿لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے متقی پرہیز گاروں کیلئے جنتوں کی خوشخبری ہے، البتہ روز قیامت جب کافروں سے کہا جائیگا: جاؤ جہنم کی تاریکیوں میں داخل ہو جاؤ، آج تمہیں اللہ کی نعمتوں سے اس لئے محروم رکھا جا رہا ہے کہ تم نے ایمان اور تقویٰ حاصل نہیں کیا، اور اس لئے بھی کہ تم نے اپنا حصہ دنیا میں کھا پی کر ضائع کیا۔ ﴿اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا

وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ﴾[الأحقاف: ۲۰] (تم نے اپنے حصے کی اچھی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں ختم کرڈالیں، اوران سے خوب مزہ لے لیا، لہٰذا آج تمہیں بدلے میں ذلّت کی سزا ملے گی، کیونکہ تم زمین میں ناحق تکبر کیا کرتے تھے، اور کیونکہ تم نافرمانی کے عادی تھے)

بخلاف متقیوں کے کہ وہ ایمان وعمل صالح کے ساتھ رہے، اور دنیوی لذتوں سے ناآشنا اور بیگانہ رہے۔

﴿نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی مہمانی ہوگی۔نزل اس اچھی سے اچھی چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے جومہمان کی آمد پر سب سے پہلے پیش کی جاتی ہے۔دوسرے مقام پر اس مہمانداری کے اسباب کا تذکرہ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَأَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۰﴾ نَحْنُ أَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿۳۱﴾ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ﴾. [حم السجدة]

ترجمہ:۔ بیشک وہ لوگ جنہوں نے اقرار کیا کہ ہمارا رب اللہ تعالیٰ ہے پھر اس پر ثابت قدم رہے نازل ہوتے ہیں ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے کہ نہ ڈرو اور غم نہ کرو اور خوش ہوجاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ہم تمہارے ساتھی ہیں دنیاوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور تمہیں وہاں ہر وہ چیز ملے گی جس کو چاہے گا تمہارا جی، اور تمہارے لیے ہوگا اس میں ہر وہ چیز جو تم چاہو گے، یہ غفور رحیم کی مہمانی ہوگی۔

جس چیز نے متقین کو اللہ تعالیٰ کے مہمان ہونے کا عظیم شرف وعزّت بخشا وہ ایمان اور استقامت ہے، إِسْتِقَامَةٌ عَلَى الدِّيْنِ وَعَلٰى جَمِيْعِ الطَّاعَاتِ وَعَلَى الْجِهَادِ وَعَلٰى تَرْكِ الْمَعَاصِيْ وَتَرْكِ اللَّذَّاتِ. وہ اعلیٰ منصب ومنقبت ہے، جو کہ قرب الٰہی کے سارے اسباب کا خلاصہ ونتیجہ ہے، جس کے متعلق سید کائنات ﷺ کو حکم دیا جارہا ہے:﴿فَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ﴾[هود: ۱۱۲]۔(استقامت اختیار کریں جیسے آپ کو حکم دیا گیا ہے، اور جو لوگ توبہ کریں)۔

پس جنتیوں کیلئے کتنا بڑا شرف واعزاز ہوگا کہ انکا میزبان حق تعالیٰ شانہ ہوں گے، اور وہ کتنے عظیم المرتبت خوش قسمت کہلائیں گے کہ جنہیں اللہ تعالیٰ اپنا مہمان کہیں گے، اور اپنے عظیم مہمان خانہ خلد برین میں اتاریں گے، اور ملائکہ کرام انہیں سلامی پیش کر کے دخول جنت کی مبارکباد پیش کریں گے۔ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ [الحجر:

۴۶] (جنت میں داخل ہوجایئے سلامتی کے ساتھ، بے خوف ہوکر)۔اسی طرح فرمایا:﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝﴾[الرعد:۲۳] (اور فرشتے ان کے پاس ہر دروازے سے داخل ہوں گے۔(اور کہتے ہوں گے کہ:) تم نے جو صبر سے کام لیا تھا اس کی بدولت اب تم پر سلامتی ہی سلامتی نازل ہوگی، اور اصلی وطن میں یہ تمہارا بہترین انجام ہے)۔

فرمایا: وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ﴾ جو چیز اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، یعنی ثواب اور قرب کے درجات اور دائمی حیات ورحمت، وہ دنیا کے حقیر فانی مال ومتاع اور دنیوی ناقص لذتوں سے بہت ہی بہتر ہے۔اَبْرَار کا مطلب ومعنی بار بار بیان ہوا، وہ نیکوکار لوگ جنہوں نے حقوق اللہ وحقوق العباد کا حق ادا کیا۔اَللّٰھُمَّ بِرَحْمَتِکَ الْوَاسِعَةِ اِجْعَلْنَا مِنَ الْأَبْرَارِ وَادْخِلْنَا الْجَنَّةَ مَعَ الْأَبْرَارِ. آمین.

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۱۹۹

ترجمہ: اور بیشک بعض اہل کتاب میں سے البتہ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں، اور اس چیز پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی، اور اس چیز پر جو ان کی طرف اتاری گئی، وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنے والے ہیں وہ نہیں خریدتے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے بدلے کم قیمت، یہی لوگ ہیں جن کے واسطے ان کے پروردگار کے پاس بدلہ ہے، بیشک اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے ۝۱۹۹

معارف ومنازل

﴿لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ جو گزر چکی جس میں منصف مزاج نیک بخت اہل کتاب میں سے چند لوگوں کا بیان ہوا، اب یہ آیت کریمہ اسی کا تتمہ ہے۔حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حبشہ کے بادشاہ اصحمہ نجاشی کا جب اپنے ملک حبشہ میں انتقال ہوا تو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا کہ تم اپنے بھائی کیلئے استغفار کرو، اسپر بعض لوگوں نے کہا: یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حبشی کے لئے جو کہ حبشہ میں رہتا تھا ہمیں استغفار کا حکم کرتے ہیں؟ اسپر یہ آیت اتری۔

پھر آپ ﷺ نے باہر نکل کر اس پر نماز جنازہ پڑھائی، چار تکبیروں کے ساتھ۔ [درمنثور، بخاری، ابن جریر وغیرہ] اگرچہ بعض مفسرین نے چند مخصوص لوگوں کے متعلق آیت کا نزول بتایا ہے، جنہوں نے یہودیت و نصرانیت چھوڑ کر اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے تھے، مگر امام مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ کسی تخصیص کی ضرورت نہیں، قیامت تک جتنے یہودی و نصرانی اسلام قبول کریں گے آیت کریمہ کا عموم سب کو شامل رہے گا۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ عمومی معنی بہتر ہی رہے گا، کیونکہ زمانہ نزول آیت کے بعد ہزاروں لوگوں نے عیسائیت سے تائب ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو چکے ہیں، اور آئندہ بھی اُمید یہی ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ہمارے زمانے کے بعض علماء کرام نے مستقل تاریخی کتابیں تالیف کی ہیں، جن میں سیکڑوں ایسے لوگوں کے حالات درج ہیں۔ فجزاھم اللہ تعالیٰ

﴿وَاِنَّ مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ لَمَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاللّٰهِ﴾ بیشک اہل کتاب میں سے کچھ لوگ اللہ تعالیٰ پر اور اس کی صفات پر صحیح ایمان رکھتے ہیں، اور اس قرآن پر بھی ایمان رکھتے ہیں، جو تمہاری طرف اتارا گیا، اور اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ان کی طرف بھیجا گیا، یعنی تورات، انجیل اور زبور۔

﴿خٰشِعِيۡنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشۡتَرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيۡلًا﴾ اللہ تعالیٰ کے سامنے خشوع اور عاجزی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی آیات یعنی تورات وانجیل کی وہ آیات جن میں محمد رسول اللہ ﷺ کے اوصاف کریمہ، صفات حمیدہ کا بیان ہے نہیں چھپاتے ہیں، بلکہ ظاہر کرتے ہیں، ان کے عوض حقیر مال لے کر چھپانا نہیں چاہتے، جیسے کہ دیگر علماء یہود چھپا کر مال وصول کیا کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ایسے منصف مزاجوں کیلئے انعام کا اعلان فرما کر کہا:

﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ﴾ یہی لوگ ہیں جن کا خصوصی اجر ان کے ربّ پاس ہے، یعنی ان کے لئے دوہرا اجر ہے، جو کہ دوسروں کے اجر سے دوگنا ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ يُؤۡتَوۡنَ اَجۡرَهُمۡ مَّرَّتَيۡنِ﴾ [القصص: ۵۴] (ان کو ان کا اجر دو مرتبہ دیا جائے گا)۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سید کائنات ﷺ نے فرمایا: تین شخص ہیں جن کا اجر دوہرا ہے، ایک وہ اہل کتاب شخص جو پہلے اپنے پیغمبر پر ایمان لایا، پھر حضرت محمد ﷺ پر ایمان لایا۔ [متفق علیه]

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ﴾ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے، کیونکہ وہ اعمال اور ان کے جزاء سے واقف ہے، اس کو سوچنے کی ضرورت نہیں۔ روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نصف یوم کی بقدر مدت میں ساری

خلقت کے حساب سے فارغ ہوجائے گا، اور آدھا دن بھی دنیا کے ایک دن کے آدھے کے برابر، اور سرعت حساب کا مطلب یہ بھی ہے کہ بدلہ دینے میں دیر نہیں کرے گا۔

سورۃ آل عمران کے شروع میں اسی (۸۰) آیتوں تک وفد نجران کے عیسائیوں کا، اور ان کے عقائد باطلہ کا تذکرہ ہوا۔ سورۃ کی ان آخری آیات میں انہی عیسائیوں کے اچھے یعنی ان کے مؤمنین کا بیان ہوا، یہی ربط ہے اوّل سورۃ کا آخر سورۃ کے ساتھ، آئندہ ایک آخری آیت کے بعد سورۃ النساء شروع ہونے والی ہے۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ أَوَّلاً وَآخِرًا وَظَاهِرًا وَبَاطِنًا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۲۰۰

ترجمہ: اے ایمان والو! صبر کرو، اور مقابلہ میں مضبوط رہو، اور نیکیوں میں لگے رہو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ ۝۲۰۰

معارف ومسائل

یہ سورۃ آل عمران کی آخری جامع آیت ہے، جو پوری سورت کا خلاصہ ہے، مؤمن کی پوری زندگی صبر سے عبارت ہے، اس سے قبل سورۂ بقرہ وآل عمران دونوں میں صبر کے فوائد واقسام متعدد مقامات میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوچکے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کے لئے کامیابی کے چار اصول بیان ہوچکے ہیں: صبر، مصابرہ، مرابطہ، اور تقویٰ۔

﴿صَبْر﴾ کے لفظی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں۔ حدیث شریف میں وارد ہے: نَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ تُصْبَرَ الْبَهَائِمُ. [بخاری] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جانوروں کو باندھ کر گولی مارنے سے منع فرمایا کہ یہ تعذیب حیوان ہے۔ اصطلاح شریعت میں نفس کو خلاف طبع چیزوں پر جمائے رکھنے کو صبر کہا جاتا ہے، جیسے کہ ماہ رمضان میں ماکولات ومشروبات سے نفس کو باز رکھا جاتا ہے۔

صبر کی تین قسمیں ہیں: اَوّلاً الصبرُ عَلَى الطَّاعَاتِ. یعنی جن کاموں کا اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے ان کی پابندی طبیعت پر کتنی بھی شاق ہو اس پر نفس کو جمائے رکھنا۔

دوسرے اَلصبرُ عَنِ الْمَعَاصِي. یعنی جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا

ہے، وہ نفس کے لئے کتنا ہی مرغوب ولذیذ ہوں نفس کو ان سے منع کرنا، اور روکنا۔

تیسرے اَلصَّبرُ عَلَی الْمَصَائِبِ. یعنی دکھ، تکلیف، مصیبتوں پر صبر کرنا۔ جزع فزع سے اجتناب کرنا، اور ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر تقدیر پر راضی رہنا، اور نفس کو بے قابو نہ ہونے دینا۔

مُصَابَرَۃ اسی صبر سے ماخوذ ہے، اس کے معنی ہیں دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا۔ البتہ صبر عام ہے، اور مصابرۃ خاص ہے۔ اِصْبِرُوا میں مُصابرۃ کا مفہوم اگرچہ داخل ہے، مگر اہتمام شان کی وجہ سے بطور تَخْصِيص بَعْدَ التَّعْمِيمِ اسے ذکر فرمایا، جیسے: ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ﴾ [البقرة: ۹۸] کیونکہ قتال کے وقت مصابرہ کی اہمیت وفضیلت بہ نسبت عام صبر کے زیادہ ہے۔ [روح المعانی]

﴿مُرَابَطَة﴾ یہ لفظ رَبطٌ سے ماخوذ ہے، بمعنی باندھنے، اور مضبوط کرنے اور جمانے کے، جیسے اصحاب کہف کے بارے میں ہے: ﴿وَرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ [الکهف: ۱۴] (اور ہم نے باندھ لیا ان کے دلوں کو)۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے بارے میں ہے: ﴿لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا﴾ [القصص: ۱۰] (اگر ہم ان کے دل کو مضبوط نہ کرتے)۔

رباط فی سبیل اللہ کی اقسام:

قرآن کریم اور احادیث نبوی میں رِباط کا لفظ دو معنی کے لئے استعمال کیا گیا ہے: اوّل اسلامی سرحدوں کی حفاظت، جس کے لئے گھوڑے اور جنگی ساز وسامان کے ساتھ مسلح اور تیار رہنا لازمی ہے تاکہ دشمن اسلامی سرحد کی طرف پیشقدمی کی جرأت نہ کرسکے۔ اسی طرح رات کے وقت مسلمان لشکریوں کے تحفظ کے لئے پہرہ دینا، اور چوکیداری کرنا بھی رِباط ہے۔ اور دشمن پر کڑی نظر رکھنا۔

دوسرے نماز باجماعت کی ایسی پابندی کہ ایک نماز کے بعد ہی سے دوسری نماز کے انتظار اور تیاری میں رہے۔ اسی طرح اس معنی میں مزید توسیع کی جاسکتی ہے۔ کہ کوئی شخص اپنے آپ کو ا[illegible] اہم دینی عبا[illegible] کے لئے محبوس رکھے، جو رات دن مسلسل اس کی ادائے گی میں مشغول وپابند ر[illegible]، یہ[illegible] رِباط شمار ہوگا، جیسے کہ طلباء کرام، علماء کرام، تبلیغی حضرات، حفاظ وق[illegible] ا[illegible] رام، جو ہر وقت تحصیل علم، درس وتدریس، تالیف وتصنیف، تلاوت وحفظ قرآن، وعظ وخطابت، تبلیغ وموعظت کے مبارک عمل میں مشغول رہتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے دم وقدم اور مساعی جمیلہ سے اسلامی تعلیمات کی آبیاری اور اشاعت ہو رہی ہے۔ فَجَزَاهُمُ اللهُ۔

رِباط کی پہلی قسم اسلامی سرحدوں کی حفاظت:

اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لئے جنگ کی تیاری کے ساتھ وہاں چوکیداری، اور مسلح تیاری کے ساتھ قیام کرنے، اور دشمن پر کڑی نظر رکھنے کو رِباط یامُرابطہ کہتے ہیں۔ اس کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ کسی جنگ کا خطرہ سامنے نہیں، اسلامی سرحد مامون ومحفوظ ہے، محض حفظ ماتقدّم، یعنی پیشگی حفاظت کے طور پر اس کی نگرانی کرنا ہے۔ ایسی حالت میں تو یہ بھی جائز ہے کہ آدمی وہاں اپنے اہل وعیال کے ساتھ اقامت کرے، اور رہائش رکھے، اور اپنی زمین کی کاشت یا ذریعہ معاش، تجارت ومزدوری، مالداری وغیرہ کرتا رہے، مگر اصل نیت وارادہ سرحد کی حفاظت کا رکھے۔ یہ دوسرے امور تبعاً ہوں، جیسے حاجی کا اصلی ارادہ حج کا ہوتا ہے، مگر ضمناً کبھی تجارت کا کاروبار بھی انجام دیتا ہے۔ یہ تجارت اس کا اصلی مقصد نہیں ہوتا۔ تو ہم خُرما اور ہم ثواب کے بمصداق اس کو رِباط فی سبیل اللہ کا ثواب ملے گا، خواہ کسی جنگ کی نوبت ہی نہ آئے۔

لیکن اگر اصل نیت سرحد کی حفاظت کی نہ ہو، بلکہ وہاں اپنا گزارہ ہی مقصد ہو، خواہ اتفاقی طور پر سرحد کی حفاظت کی بھی نوبت آجائے، تو یہ شخص مُرابِط فی سبیل اللہ نہ ہوگا، اور ثواب سے محروم ہوگا۔ یہی حال دیگر بہت سی عبادات کا بھی ہے۔ اِنّما الأعْمالُ بِالنّیاتِ۔ کے لحاظ سے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اسلامی سرحد پر دشمن کے حملہ کا خطرہ ہو، ایسی حالت میں عورتوں، بچوں کو وہاں رکھنا درست نہیں، صرف وہ لوگ رہیں جو دشمن کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ [قرطبی]

ان تمام صورتوں میں رِباط کے فضائل بے شمار ہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت سہل بن سعد ساعدی سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دن کا رِباط تمام دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے ان سب سے افضل ہے۔ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ ایک دن رات کا رِباط ایک مہینے۔ کے مسلسل روزے، اور تمام شب عبادت میں گزارنے سے بہتر ہے، اور وہ اگر اسی حال میں مرگیا تو اس کے رِباط والے عمل کا روزانہ ثواب ہمیشہ کے لئے جاری رہے گا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا رزق جاری رہے گا، اور وہ شیطان سے مامون ومحفوظ رہے گا۔ [مسلم] اور ابوداؤد نے بروایت فضالہ بن عبید نقل کیا ہے کہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ ہر ایک مرنے والے کا عمل اس کی موت کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے، بجز مُرابط کے کہ اس کا عمل قیامت تک بڑھتا ہی رہتا ہے، اور قبر میں حساب وکتاب لینے والوں سے مامون ومحفوظ رہتا ہے۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل رِباط ہر صدقہ جاریہ سے بھی زیادہ افضل ہے، کیونکہ صدقہ جاریہ کا ثواب تو اسی وقت تک جاری رہتا ہے جب تک اس کے صدقہ کئے ہوئے مکان، یا زمین، مسجد، مسافر خانہ، وقف کردہ دینی کتب، وقف کردہ اسلحہ وسامان جہاد سے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں، جب یہ فائدہ منقطع ہو جائے، اور چیز باقی نہ رہے تو ثواب بند ہو جاتا ہے، مگر مُرابط فی سبیل اللہ کا ثواب قیامت تک بدستور جاری رہے گا، اور منقطع نہیں ہوگا، کیونکہ مُرابط کے عمل سے اسلامی ملک اور سارے مسلمانوں کو تحفظ حاصل ہو جاتا ہے۔

اور اس کے علاوہ وہ جتنے نیک کام دنیا میں کیا کرتا تھا اس کا ثواب بھی بغیر عمل کئے ہمیشہ قیامت تک جاری رہے گا، جیسا کہ ابن ماجہ میں باسناد صحیح حضرت ابوہریرہ سے منقول ہے کہ سید عالم ﷺ نے فرمایا: جو شخص حالت رِباط میں مر جائے تو وہ جو کچھ عمل صالح دنیا کی زندگی میں کیا کرتا تھا، ان سب اعمال کا ثواب برابر جاری رہے گا، اور اس کا رزق بھی جاری رہے گا، اور شیطان (یا سوال قبر سے) سے محفوظ رہے گا، اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو ایسا مطمئن اٹھائیں گے کہ محشر کا کوئی خوف اس پر نہیں ہوگا۔ [قرطبی]

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رحمۃ للعلمین ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی کمزور سرحد کی حفاظت اخلاص کے ساتھ صرف ایک دن، ماہ رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں میں کرنے کا ثواب سو سال کے مسلسل روزوں اور شب بیداری سے افضل ہے، اور رمضان میں ایک دن کا رِباط اعلیٰ وافضل ہے ایک ہزار سال کے صیام وقیام سے (اس لفظ میں راوی نے کچھ تردد کا اظہار کیا ہے) پھر فرمایا: اور اگر اللہ تعالیٰ نے اس کو صحیح سالم اپنے اہل وعیال کی طرف لوٹا دیا تو ایک ہزار سال تک اس پر کوئی گناہ نہیں لکھا جائے گا، اور نیکیاں بدستور لکھی جاتی رہیں گی، اور اس کے عمل رِباط کا اجر قیامت تک جاری رہے گا۔ [قرطبی]

بہر حال! رِباط کے متعلق روایات بہت اور بکثرت ہیں۔ ابن کثیر، درمنثور اور حدیث کی مشہور کتاب "الترغیب" میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ وَاللهُ تَعَالٰی وَلِیُّ التَّوفِیقِ.

نماز باجماعت کے متعلق حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ سید کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تم کو ایسا عمل بتاؤں جس سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹاتا ہے، اور درجات کو بلند کرتا ہے؟ وہ ہے پورا پورا وضو کرنا باوجود مکروہات کے (یعنی سخت سردی اور برفباری کے دونوں میں) اور مسجدوں تک جانے کے لئے اپنے قدموں سے زیادہ مسافت طے کرنا، اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں لگا رہنا، یہی تمہارا رِباط ہے، یہی تمہارا رِباط

ہے، یہی تمہارا رِباط ہے، تین مرتبہ تکرار فرمایا۔[رواہ مسلم والترمذی والبغوی عن ابیھریرۃ رضی اللہ عنہ]

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی رُو سے اُمید ہے کہ جو شخص ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں رہے اس کو بھی اللہ تعالیٰ وہ ثواب عظیم عطاء فرمائیں گے جو رِباط فی سبیل اللہ کے لئے احادیث میں مذکور ہے۔

سورۃ آل عمران کی تلاوت کے فضائل:

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شخص سورۃ آل عمران کا آخری حصہ (دس آیات) رات کو تلاوت کرے گا، اس کے لئے قیام شب کا ثواب لکھا جائے گا۔[دارمی] حضرت ابوامامہ کی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: زہراوین، یعنی سورۂ بقرہ وسورۂ آل عمران کو پڑھو، قیامت کے دن یہ دونوں پڑھنے والے کے سر پر سائبان ہوں گی، جیسے دو بدلیاں، یا دو سائبان، جن کے اندر روشنی کی چمک ہو جیسے چھائے ہوئے پرندوں کی دو جھنڈ یہ دونوں سورتیں اپنے پڑھنے والوں کی حمایت وحفاظت کریں گی۔[مسلم]

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے خود سنا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمارہے تھے کہ قیامت کے دن قرآن اوران قرآن والوں کو پیش کیا جائے گا جو قرآن پر عمل کرتے تھے، سب سے آگے سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران ہوں گی، یہ دونوں ایسی ہوں گی جیسے دو بدلیاں، یا دو سیاہ سائبان، جن کے اندر روشنی کی چمک ہو، یا ایسے چھائے ہوئے پرندوں کے دو جھنڈ، یہ دونوں سورتیں اپنے پڑھنے والے کی حمایت کریں گی۔[مسلم]

امام مکحول رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جمعہ کے دن جو شخص سورۂ آل عمران پڑھتا ہے رات تک اس کے لئے فرشتے دعاء کرتے ہیں۔[رَوَاہُ دَارِمِي]

تَـمّتْ سورَۃ آلِ عِمران وَمِنَ اللهِ تَعالٰی الْهِدَايَةُ وَالْبرهَانُ، وهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحْمٰن، ذُو الْعَظَمَۃِ والسلْطَانِ، وَ هُو الْحَنَانُ الْمَنَانُ۔ رَبنا تَقبلْ مِنا سَعْيَنا وَ وِفِّقْنا لِمَرْضَاتِکَ وَارْزُقْنا حُسنَ الْخَاتِمَۃِ۔ آمین!